قصص القرآن

تالیف

مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی
رفیق ندوۃ المصنفین

مکتبہ رحمانیہ
MAKTABA-E-REHMANIA

Marfat.com

قصص القرآن

جلد سوم

جس میں انبیاء علیہم السلام کے سوانح حیات کے علاوہ باقی قصص قرآنی، اصحاب القریہ، اصحاب الجنہ، حضرت لقمان رضی اللہ عنہ، اصحاب سبت، اصحاب الرس، بیت المقدس اور یہود، ذوالقرنین، سدِ سکندری، اصحاب الکہف والرقیم، سباء اور سیل عرم، اصحاب الاُخدود، اور اصحاب الفیل وغیرہ کی مکمل اور محققانہ تفسیر و تشریح کی گئی ہے۔

تالیف

مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی رفیقِ اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی

تخریج و تصحیح

مولانا محمد عرفان فاضل جامعہ مدنیہ، لاہور

مکتبہ رحمانیہ

MAKTABA-E-REHMANIA

اقرأ سنٹر۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار لاہور

Marfat.com

مکتبہ رحمانیہ
اِقرأ سنٹر۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار، لاہور

جملہ حقوق ملکیت بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب .... قصص القرآن
تالیف .... مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی
رفیق اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی
تخریج وتصحیح .... مولانا محمد عرفان فاضل جامعہ مدنیہ، لاہور
ناشر .... مکتبہ رحمانیہ
اِقرأ سنٹر۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار، لاہور
مطبع .... خضر جاوید پرنٹرز

ضروری وضاحت

ایک مسلمان جان بوجھ کر قرآن مجید، احادیث رسول ﷺ اور دیگر دینی کتابوں میں غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا بھول کر ہونے والی غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کے لیے بھی ہمارے ادارہ میں مستقل شعبہ قائم ہے اور کسی بھی کتاب کی طباعت کے دوران اغلاط کی تصحیح پر سب سے زیادہ توجہ اور عرق ریزی کی جاتی ہے۔ تاہم چونکہ یہ سب کام انسانوں کے ہاتھوں ہوتا ہے اس لیے پھر بھی غلطی کے رہ جانے کا امکان ہے۔ لہٰذا قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اگر ایسی کوئی غلطی نظر آئے تو ادارہ کو مطلع فرما دیں تا کہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو سکے۔ نیکی کے اس کام میں آپ کا تعاون صدقہ جاریہ ہوگا۔ (ادارہ)

Marfat.com

فہرست مضامین (جلد سوم)

پیش لفظ ۹

اصحابُ الجنہ

سورۃ القلم اور اصحابُ الجنہ ۱۲
واقعہ سے متعلق اقوال ۱۳
تشریح ۱۳
موعظت ۱۴

مومن وکافر

سورۂ کہف اور مومن وکافر کا واقعہ ۱۶
واقعہ کی تشریح ۱۷
بصائر ۱۹

اصحابُ القریہ (یا) اصحاب یٰسین

اصحاب قریہ اور قرآن عزیز ۲۲
واقعہ ۲۲
واقعہ سے متعلق اقوال ۲۵
نقد وتبصرہ ۲۵
رجحان ۲۷
موعظت ۲۷

حضرت لقمان

لقمان ۲۹
قرآن عزیز اور حضرت لقمان ۳۱
نبوت یا حکمت ۳۳
چند تفسیری مطالب ۳۳
حسن خلق ۳۴
تواضع ۳۵
کبر وغرور ۳۵
حکمت لقمان ۳۷
مواعظ ۳۸

اصحاب سبت

قرآن عزیز اور اصحاب سبت ۳۹
سبت اور اس کی حرمت ۳۹
واقعہ کی تفصیلات ۴۱
تعین مقام ۴۵
زمانہ حادثہ ۴۵
چند تفسیری حقائق ۴۶
حقیقت مسخ ۴۷

Marfat.com

حضرت ابن عباس اور عکرمہ کا مکالمہ ۵۲
مسخ شدہ اقوام کا انجام دنیوی ۵۳
بصائر ۵۴

اصحاب الرس

رس ۵۷
قرآن عزیز اور اصحاب الرس ۵۷
اصحاب الرس ۵۷
قول فیصل ۶۱
موعظت ۶۲

بیت المقدس اور یہود

تمہید ۶۳
بیت المقدس ۶۴
شرارت یہود کا پہلا دور ۷۱
غلامی سے نجات ۷۴
شرارت یہود کا دوسرا دور ۷۹
حضرت یحییٰ علیہ السلام کا قتل ۸۰
پاداش عمل ۸۰
تیسرا زریں موقعہ اور یہود کی روگردانی ۸۱
ابدی ذلت وخسران ۸۲
بصائر ۸۳

ذوالقرنین

تمہید ۸۴
زیر بحث مسائل اور علماء اسلام ۸۴
ذوالقرنین ۸۷
ذوالقرنین سے متعلق سوال کی نوعیت ۸۷
ذوالقرنین اور سکندر مقدونی ۸۸
کیا ذوالقرنین سکندر مقدونی ہے؟ ۹۰
مسلم؟ ۹۱
یروشلم اور سکندر ۹۲
ذوالقرنین اور اذ وایمن ۹۳
سکندر مشرک تھا ۹۶
سکندر کا ظلم وجبر ۹۷
سکندر کا مغرب کی طرف اقدام ۹۷
علماء سلف کی رائے ۱۰۰
متاخرین کی رائے ۱۰۴
یہود وقریش اور انتخاب سوالات ۱۰۵
ذوالقرنین اور انبیاء بنی اسرائیل کی پیشین گوئیاں ۱۰۷
خورس اور تاریخی شواہد ۱۱۰
مغربی مہم ۱۱۱
مشرقی مہم ۱۱۲
تیسری (شمالی) مہم ۱۱۲
فتح بابل ۱۱۳
خورس کا مذہب ۱۱۴
ایران قدیم کا مذہب ۱۱۷
ایران اور مذہب رودشت ۱۱۷
ذوالقرنین اور قرآن عزیز ۱۲۰
یاجوج وماجوج ۱۲۶
سد ۱۳۷
یاجوج وماجوج کا خروج ۱۴۵
کیا ذوالقرنین نبی تھے؟ ۱۶۰
بصائر ۱۶۲

Marfat.com

اصحاب الکہف والرقیم

قرآن عزیز اور اصحاب الکہف والرقیم ۱۶۴
کہف ورقیم ۱۶۷
واقعہ ۱۷۲
واقعہ کی تاریخی حیثیت ۱۷۳
تفسیری حقائق ۱۷۵
نتائج وعبر ۱۸۵

سباء اور سیل عرم

تمہید ۱۸۹
سباء ۱۹۰
نام یا لقب ۱۹۵
زمانہ حکومت ۱۹۵
سباء اور طبقات حکومت ۱۹۶
مکارب سباء وملوک سباء ۱۹۸
وسعت حکومت ۱۹۸
طرز حکومت ۱۹۹
سباء کی عمارات ۱۹۹
سباء کا تمدن ۲۰۰
سد مارب ۲۰۱
جنتان عن یمین وشمال ۲۰۳
اہل سبا اور خدا کی نافرمانی ۲۰۴
سیل عرم ۲۰۴
پہلی سزا ۲۰۴
دوسری سزا ۲۰۸
تاریخی مباحث ۲۱۱
چند تفسیری مباحث ۲۱۳
نتائج وعبر ۲۱۶

اصحاب الاخدود (یا) قوم تُبّع

اخدود؟ ۲۱۸
اصحاب اخدود اور قرآن حکیم ۲۱۸
واقعہ کی تفصیلات ۲۲۰
انتقاد ۲۲۵
تبع ۲۲۸
عرب کی دو حکایتیں ۲۲۹
چند تفسیری نکات ۲۳۰
بصائر وعبر ۲۳۴

اصحابُ الفیل

۵۷۱ء وسنہ ولادت باسعادت صلی اللہ علیہ وسلم عام الفیل ۲۳۶
حبش ۲۳۶
حکومت ۲۳۶
نجاشی ۲۳۷
مذہب وتمدن ۲۳۷
حبش ویمن کی کشمکش ۲۳۷
ابرہۃ الاشرم ۲۳۸
القلیس ۲۳۹
اصحاب الفیل ۲۳۹
قرآن اور اصحاب فیل ۲۴۲
سورہ فیل اور بعض دیگر تفسیریں ۲۴۵
چند تشریحی مطالب ۲۶۲
بصائر وعبر ۲۶۳

Marfat.com

بسم الله الرحمن الرحیم

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

پیش لفظ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الۡعَلِیِّ الۡاَکۡبَرِ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مُحَمَّدِ نِالۡمَبۡعُوۡثِ اِلَی الۡاَسۡوَدِ وَالۡاَحۡمَرِ وَ عَلٰی اٰلِهٖ وَ اَصۡحَابِهٖ الَّذِيۡنَ هُمۡ هُدَاةُ الدِّيۡنِ الۡاَزۡهَرِ۔

قصص القرآن کی تالیف کے وقت یہ خیال تھا کہ اس موضوع سے عہدہ برآ ہونے کے لیے چند سو صفحات کا ایک جز کافی ہوگا لیکن اس وادی میں قدم رکھنے کے بعد میدان کی وسعت نے اس خیال میں انقلاب برپا کر دیا اور رہوارِ قلم جس قدر آگے بڑھتا گیا میدانِ موضوع وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا، تاہم تیسرے جز پر اس موضوع کو مکمل کر دینے کا حتمی ارادہ تھا مگر سعی بلیغ کے باوجود ناکام رہا اور اس تیسری جلد پر بھی حد تکمیل کو نہ پہنچ سکا اور چوتھی جلد کے اضافہ پر مجبور ہونا پڑا جو عنقریب انشاء اللہ ہدیہ ناظرین ہوگی۔

قصص القرآن کا یہ تیسرا حصہ ہدیہ ناظرین ہے، پہلے اور دوسرے حصہ کو افادیت اور قدیم و جدید علمی طبقوں میں ان کی مقبولیت، خدائے برتر کا وہ فضل و کرم ہے جس کے اظہار شکر کے لیے میرے قلب و زبان دونوں قاصر ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قصص القرآن کی اس جدید ترتیب و تدوین کے ساتھ اہل علم کا شغف مصنف کی محنت و کاوش کا نتیجہ نہیں بلکہ قرآن عزیز کی برکت و عظمت کا ثمرہ ہے، مسلمانوں کا کلام الٰہی کے ساتھ والہانہ ذوق اگر اس محنت کو مفید اور پسندیدہ سمجھتا اور اس کاوش کو بہ نظر استحسان دیکھتا ہے تو فَالۡحَمۡدُ لِلّٰهِ عَلٰی ذٰلِكَ وَ ذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ وَ اللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِيۡمِ۔

قصص القرآن کے اس تیسرے جزء میں وہ تمام تاریخی واقعات سپرد قلم ہوئے ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی سیرت طیبہ اور ان کی رشد و ہدایت کے سلسلہ میں قرآن عزیز نے عبرت و بصیرت اور پند و موعظت کے لیے بیان کیے ہیں۔

ان میں بعض وہ واقعات ہیں جن کے متعلق حریف اہل قلم خصوصاً متعصب مستشرقین یورپ "اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ" کہہ کر ان کو بے سروپا داستان اور غیر تاریخی قصے ظاہر کرتے ہیں۔

اس لیے ان کے علی الرغم صحیح اور مستند اسلامی و غیر اسلامی تاریخی نقول کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن عزیز کے بیان کردہ یہ وقائع تاریخی حقائق ہیں اور ان کا انکار علمی حقائق کا انکار ہے۔ اس سلسلہ میں ذو القرنین اصحاب الکہف والرقیم، اصحاب الرس اور

اصحاب الفیل کے واقعات خصوصی حیثیت رکھتے ہیں۔

قرآن عزیز تاریخ کی کتاب نہیں ہے بلکہ ہدایت ثقلین کے لیے معاد و معاش کا مکمل نظام اور دین و دنیا کی رشد و ہدایت کا قانون کامل ہے اس لیے اس نے قوموں کے عروج و زوال اور مبدا و انجام سے متعلق اسی قدر حصہ بیان کیا ہے جو اس مقصد "تذکیر" و "موعظت" کے لیے مناسب تھا لیکن جب ایک تاریخ عالم کا طالب علم ان قوموں کی تاریخ کا مکمل مطالعہ کرتا یا صفحات عالم پر ان کے آثار و نشانات کو دیکھتا اور پڑھتا ہے تو اس کو بے ساختہ یہ اقرار کرنا ہوتا ہے کہ قرآن نے ان اقوام کے متعلق جو کچھ بھی کہا ہے سرتاسر حقیقت اور ان کی حیات ماضی کا صحیح مرقع ہے۔

اور ان میں بعض واقعات وہ بھی ہیں جو درحقیقت ایک "مثال" کی حیثیت رکھتے ہیں، یعنی قرآن نے ان کو صرف اس لیے بیان کیا ہے کہ موعظت و نصیحت کی جس نوع کا ذکر کیا جا رہا ہے اس کے قبول کرنے اور نہ کرنے والوں کی یہ "مثال" ہے اور ظاہر ہے کہ "مثال" کے لیے واقعہ کا پیش آنا ضروری نہیں ہے۔ اگرچہ وہ واقعہ کی شکل میں ہی کیوں نہ پیش کی جائے اور یہ حقیقت کسی بھی زبان کی فصیح و بلیغ ادیب سے مستور نہیں ہے اور وہ جانتا ہے کہ مثال کا یہ طریقہ موعظت و نصیحت کے لیے کس درجہ مفید اور دل نشین ہوتا ہے؟ مگر بعض مفسرین نے ان واقعات کو بھی ماضی میں ہو گزرے واقعات کے سلسلہ میں منسلک کر دیا ہے۔ لہٰذا ہم نے ایسے مواقع پر یہ واضح کر دینا ضروری سمجھا کہ اس واقعہ کی حقیقت ایک "مثال" سے زیادہ نہیں ہے لیکن اگر کوئی شخص اس کو واقعات ماضی کی ہی ایک کڑی سمجھتا ہے تب بھی ان واقعات کو واقعات تسلیم کر لینے میں نہ کسی اچھنبی بات کو تسلیم کرنا لازم آتا ہے اور نہ ایسے واقعات کا غیر تاریخی ہونا ان کے لیے "مثال" بننے میں حارج ہو سکتا ہے۔ مثلاً "مومن و کافر" یا اصحاب الجنہ باغ والوں کا واقعہ کہ قرآن کا مقصد ان کے بیان کرنے سے صرف حسب حال ایک "مثال" دینا ہے خواہ وہ ماضی میں گزرا واقعہ ہو یا نہ ہو۔

قصص القرآن کے دوسرے اجزاء کی طرح اس جز میں بھی واقعات کے تاریخی حقائق و مطالب کو روشنی میں لانے کے علاوہ ان سے متعلق "تفسیری و حدیثی مباحث" اور "تحقیقی مباحث" پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور ساتھ ہی ان سے حاصل شدہ نتائج و ثمرات کو "بصائر و عبر" اور "مواعظ و بصائر" کے مختلف عنوانات سے بیان کیا گیا ہے کہ ان واقعات کے بیان کرنے کا حقیقی مقصد قرآنی "عبرت و بصیرت" ہی ہے۔

موضوع کتاب سے متعلق واقعات کو اس طرح زیر بحث لانے سے آپ کو یہ حقیقت جگہ جگہ ابھری ہوئی نظر آئے گی کہ مستشرقین یورپ نے "کہ جن کی ریسرچ اور فلسفہ تاریخ کی موشگافیوں سے ہم بہت جلد مرعوب ہو جاتے ہیں، کس طرح فلسفہ تاریخ کے نام پر اپنے مخالف واقعات کو غیر تاریخی ظاہر کرنے اور اپنے موافق واقعات کے غیر تاریخی پہلوؤں کو کس طرح تاریخی حیثیت دینے کی سعی کی ہے اور پھر اس زہر ہلاہل کو کس خوبصورتی سے "تریاق" کی شکل میں پیش کیا ہے؟ ان اہم خصوصیات کے علاوہ اپنے دوسرے اجزاء و مجلدات کی طرح یہ جلد بھی حسب ذیل خصوصیات کی حامل ہے۔

① کتاب میں واقعات کی اساس و بنیاد قرآن عزیز کو بنایا گیا ہے اور صحیح احادیث و مستند تاریخی واقعات سے اُن کی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔

② کتب عہد قدیم اور قرآن عزیز کے "یقین محکم" کے درمیان جس جگہ تعارض نظر آتا ہے، تو یا روشن دلائل و براہین کے ذریعہ دونوں

کے درمیان تطبیق دے دی گئی ہے اور یا پھر قرآن عزیز کی صداقت کو واضح براہین اور مسکت دلائل کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے۔

۳ اسرائیلی روایات کی خرافت ومعاندین کے اعتراضات کی بطالت کو حقائق کی روشنی میں ظاہر کر دیا گیا ہے۔

۴ تفسیری، حدیثی اور تاریخی مسائل اور ان سے متعلق مباحث واشکالات پر بحث ونظر کے بعد سلف صالحین کے مسلک قویم کے مطابق ان کی تحقیق اور ان کا حل پیش کیا گیا ہے۔

۵ واقعہ کا ذکر قرآن میں کتنی جگہ ہوا ہے اور اس کو دوران بحث میں بیان کر دیا گیا ہے۔

مصنف کو ان خصوصیات کے متعلق کس حد تک کامیابی نصیب ہوئی اس کا فیصلہ اصحاب نظر اور اہل ذوق کی صوابدید پر ہے۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْ إِلَّا بِاللّٰهِ وَهُوَ حَسْبِيْ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ

خادم ملت

محمد حفظ الرحمٰن صدیقی سیوہاروی

شعبان ۱۳۶۳ھ

ڈسٹرکٹ جیل، مراد آباد

Marfat.com

اصحاب الجنہ

○ سورۃ القلم اور اصحاب الجنہ ○ واقعہ سے متعلق اقوال ○ تشریح ○ موعظت

سورۃ القلم اور اصحاب الجنہ:

سورۂ القلم میں اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ کے حسب حال ایک مثال بیان فرمائی ہے اور یہ بتایا ہے کہ جس طرح باغ والوں نے خدا کی نعمت کو ٹھکرایا اور اس کا حق ادا کرنے کے لیے شکر نعمت نہ کیا اسی طرح مکہ کے مشرکین کا حال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین (ﷺ) کو مبعوث فرما کر ان پر اپنی نعمت کاملہ کا اظہار فرمایا اور ان کے ارشاد و ہدایت کے لیے ہادی اعظم بھیج کر عظیم الشان احسان کیا لیکن انہوں نے اس کی کوئی قدر نہ کی اور انکار و مخالفت کے ساتھ اس نعمت کو رد کرنے لگے تو اب ان کا بھی وہی نتیجہ ہونے والا ہے جو باغ والوں کا ہوا، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَاۤ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۚ اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ ۙ﴿۱۷﴾ وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ ﴿۱۹﴾ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ۙ﴿۲۰﴾ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ۙ﴿۲۱﴾ اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ ﴿۲۲﴾ فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ۙ﴿۲۳﴾ اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ ۙ﴿۲۴﴾ وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ﴿۲۵﴾ فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْۤا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ۙ﴿۲۶﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ﴿۳۱﴾ عَسٰى رَبُّنَاۤ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَاۤ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ﴿۳۲﴾ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾﴾ (القلم:۱۷-۳۳)

"بے شبہ ہم نے ان (کفار مکہ) کو اسی طرح آزمایا ہے جس طرح باغ والوں کو آزمایا جبکہ انہوں نے یہ قسم کھائی کہ ہم صبح ہوتے ان (کے پھلوں) کو کاٹ لیں گے اور وہ انشاء اللہ بھی نہ کہتے تھے پس ابھی وہ سو ہی رہے تھے کہ (ان کے باغ) پر تیرے پروردگار کی جانب سے پھرنے والا پھر گیا (یعنی عذاب الٰہی سے وہ باغ برباد ہو گیا) پس صبح کو ایسا ہو گیا گویا جڑ سے کاٹ کر پھینک دیا گیا ہو۔ (صبح ہوئی) تو انہوں نے ایک دوسرے کو پکارا کہ اگر کھیتی کاٹنا چاہتے ہو تو سویرے چلے چلو اور چلتے چلتے آپس میں چپکے چپکے باتیں کرتے جاتے تھے (کہ جلدی کرو) ایسا نہ ہو کہ کاٹتے وقت تم کو فقیر آ گھیریں اور

Marfat.com

اپنے بخل کی وجہ سے بہت سویرے (باغ کھیت) پر پہنچے اندازہ لگا کر (کہ اس وقت تک فقیر نہ پہنچ سکیں گے) پس جب اس کو (اس حال میں دیکھا تو کہنے لگے: یقیناً ہم راہ بھول گئے ہیں (یہ وہ مقام نہیں ہے، مگر جب غور سے دیکھا تو کہنے لگے) بلکہ ہم (باغ کے نفع سے) محروم رہ گئے۔ ان میں سے ایک بھلے آدمی نے کہا: کیا میں نے تم سے پہلے ہی نہیں کہا تھا کہ (اے نعمت الٰہی پر) کیوں خدا کی پاکی بیان نہیں کرتے (اب انجام بد کے بعد) کہنے لگے: ہمارے پروردگار کے لیے پاکی ہے بیشک ہم نے خود ہی اپنے نفس پر ظلم کیا اور آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے (یہ کہ تو نے ہی ہم کو پہلے سے کیوں نہ سمجھایا) اور کہنے لگے ہائے بدقسمتی! بلاشبہ ہم سرکش تھے جلد توقع ہے کہ ہمارا پروردگار ہم کو اس سے بہتر بدل عطاء فرمائے۔ بے شبہ (اب) ہم اپنے پروردگار ہی کی جانب متوجہ ہیں (اے مکہ والو!) خدا کا عذاب اسی طرح (اچانک) آجاتا ہے اور آخرت کا عذاب تو بہت ہی ہولناک ہے، کاش کہ وہ جان لیتے"۔

واقعہ سے متعلق اقوال:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ کفار مکہ کے حالات کے مناسب قرآن نے ایک مثال دی ہے کوئی واقعہ نہیں ہے[1] اور سعید بن جبیر فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ ہے جو یمن کی ایک بستی ضروران میں پیش آیا جو کہ صنعاء سے چھ میل پر واقع تھی۔[2] چنانچہ مفسرین نے اس واقعہ کی تفصیل یہ بیان فرمائی ہے۔

اہل کتاب میں سے ایک شخص بہت مالدار، صاحب زمین واملاک اور مرد نیک تھا، اپنی پیداوار میں سے فقراء ومساکین پر کافی خرچ کرتا رہتا تھا، اس کا جب انتقال ہوگیا تو اس نے چند لڑکے وارث چھوڑے، جب پھلوں اور کھیتوں کے کاٹنے کا وقت آیا تو ان لڑکوں نے آپس میں کہا: "ہمارا باپ تو بہت ہی بے وقوف تھا کہ اپنی یہ کثیر دولت فقراء ومساکین میں لٹا دیتا تھا، ہم ایسے پاگل نہیں ہیں کہ اپنی محنت کو اس طرح رائیگاں کردیں اور صلاح یہ ٹھہری کہ پھل اتارنے اور کھیتی کاٹنے کے لیے منہ اندھیرے چلو اور اتنی عجلت کرو کہ فقراء اور مساکین کو معلوم ہی نہ ہوسکے کہ کھیتوں پر آکر ہم کو تنگ کریں۔

یہاں تو یہ خدا ناترس، بخیل، یہ مشورہ کر رہے تھے کہ ساری دولت کو ذخیرہ کر کے "کنز" بنالیں اور اس میں سے نہ خدا کا حق ادا کریں اور نہ خدا کے بندوں کا، اور دوسری جانب خدا کے حکم سے رات ہی میں ان کی تمام سرسبز وشاداب کھیتی اور باغ تیز اور گرم ہوا سے جل کر خاک ہوگئے، اب جو مشورہ کے مطابق یہ منہ اندھیرے وہاں پہنچے تو معاملہ دگرگوں پایا اور کچھ نہ سمجھے اور آگے نکل گئے کہ شاید یہ وہ جگہ ہی نہیں ہے مگر دوسرے نشانات دیکھ کر چونکے اور اب سمجھے کہ یہ ہمارے بخل اور مشورہ کا نتیجہ ہے جو ہم نے شب گزشتہ میں حکم الٰہی کے خلاف غریبوں اور مسکینوں کا حق تلف کرنے کے لیے کیا تھا۔ اب حسرت سے بدقسمتی کا شکوہ کرنے اور خدا کو پکارنے لگے، مگر وقت نکل جانے اور پاداش عمل پالینے کے بعد یہ پکار بے سود ثابت ہوئی۔

تشریح:

یہ مثال ہو یا واقعہ، قرآن عزیز نے اس کے بیان میں تذکیر وتنذیر کا جو پہلو رکھا ہے وہ بہرحال اپنی جگہ ہے، اس لیے کہ ان آیات سے قبل قریش مکہ کی نافرمانیوں اور رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے انکار اور کفران کا ذکر کرتے ہوئے خصوصیت کے ساتھ ان

---

[1] تفسیر ابن کثیر سورۃ القلم [2] ایضاً

Marfat.com

کے ایک سردار ولید بن مغیرہ کی بداعمالیوں کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ اب ان کو ایک مثال دے کر یا واقعہ سنا کر یہ بتایا جا رہا ہے کہ پیغمبر ﷺ اور خدا کی نعمت (قرآن) کے خلاف باہم سرگوشیاں کرنے، قرآن کی عطاء کردہ تعلیم کے متعلق حقوق اللہ وحقوق العباد سے گریز کر کے اپنی قوت وشوکت پر اتراتے اور گھمنڈ کرتے ہوئے پیغمبر معصوم ﷺ اور مسلمانوں کی تحقیر کرنے کا انجام وہی ہونے والا ہے جو "باغ والوں" کا ہوا اور یہ اس لیے کہ اوّل خدا کی جانب سے قانون امہال (مہلت دینے کا قانون) متکبروں کو ڈھیل دیتا اور اصلاح حال کے لیے موقعہ عطاء کرتا ہے مگر جب کوئی قوم اس سے فائدہ نہیں اٹھاتی بلکہ خدا کی اس مہلت کو اپنی باطل پرستی کے لیے صداقت کی دلیل ٹھہرا کر صادقین اور ان کی صداقت کی تحقیر وتذلیل پر آمادہ ہو جاتی ہے تو پھر اچانک قانون گرفت اپنا سخت پنجہ ان پر جما دیتا اور ان کو ہلاک وبرباد کر کے کائنات کی عبرت وبصیرت کا سامان مہیا کر دیتا ہے، پھر اس وقت نہ حسرت کام آتی ہے نہ ندامت اور اس گھڑی نہ ایمان لانا مفید ہوتا ہے اور نہ خدا کی انقیاد واطاعت کا اعلان:

﴿وَ اِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ۝﴾ (بنی اسرائیل: ۱٦)

"اور جب ہمیں منظور ہوتا ہے کہ کسی بستی کو ہلاک کریں تو ایسا ہوتا ہے کہ اس کے خوش حال لوگوں کو حکم دیتے ہیں (یعنی وحی کے ذریعہ پیغام حق پہنچا دیتے ہیں) پھر وہ (بجائے اس کے کہ اس کی تعمیل کریں) نافرمانی میں سرگرم ہو جاتے ہیں، پس ان پر عذاب کی بات ثابت ہو جاتی ہے اور (پاداش عمل میں) ہم انہیں برباد وہلاک کر ڈالتے ہیں۔

موعظت:

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات ہست وبود میں انسان کو اجتماعی حیات کے لیے پیدا کیا ہے اور حاجات انسانی کو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مربوط کر دیا ہے کہ یہ کارخانہ باہمی اشتراک واعانت کے بغیر نہیں چل سکتا اور چونکہ اجتماعی زندگی افراد ہی سے بنتی اور سنورتی ہے اس لیے ازبس ضروری ہے کہ ان کی نشوونماء اور بقاء حیات کا ایسا قانون مقرر کیا جائے جس کی بدولت افراد انسانی کے درمیان رشتہ اخوت ومودت قائم ہو سکے اور کسی وقت بھی رقابت اور تنافس پیدا نہ ہونے پائے۔ لہٰذا حق تعالیٰ نے اس نظام کی تکمیل کے لیے معاشی زندگی سے متعلق دو حقوق مقرر فرمائے ایک حق معیشت اور دوسرا درجات معیشت۔

حق معیشت کا قانون یہ ہے کہ اس عالم میں ایک جاندار بھی ایسا نہیں رہنا چاہیے جو حق معیشت سے محروم ہو، یہ ہر شخص کا انفرادی حق ہے کہ وہ زندہ رہے اس لیے حق معیشت میں یہاں سب مساوی ہیں اور کسی کو کسی پر تفوق وبرتری حاصل نہیں۔

دوسرا درجات معیشت کا مسئلہ ہے یعنی یہ ضروری ہے کہ معاشی زندگی کے لیے سب کو ملے مگر یہ ضروری نہیں کہ سب کو برابر ملے ﴿وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ﴾ لیکن درجات معیشت کی اس کمی وبیشی اور تفاضل کا یہ مطلب نہیں کہ اس نے جو کچھ کمایا ہے وہ سب اس کا انفرادی حق ہے، نہیں بلکہ جو جس قدر زیادہ کمائے گا اسی قدر اس کی دولت میں اجتماعی حق زیادہ ہوگا اور پھر یہ اجتماعی حق دو قسم پر تقسیم ہو جاتا ہے، ایک حق اللہ اور دوسرا حق العباد۔ پس جو شخص اپنی دولت وثروت کو صرف انفرادی ملک سمجھتا اور اس میں حق اللہ اور حق العباد دونوں کا انکار کرتے ہوئے اس کے نشہ میں مست ہو کر احکام الٰہی سے بے پروا ہو جاتا ہے اس کا انجام

Marfat.com

کبھی بخیر نہیں ہوتا اور وہ خدا کے غضب کا مستحق قرار پاتا ہے:

﴿وَالَّذِیْنَ یَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۙ۝۳۴﴾

(التوبة: ٣٤)

"اور جو لوگ چاندی سونا اپنے ذخیروں میں ڈھیر کرتے رہتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اسے خرچ نہیں کرتے تو ایسے لوگوں کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو"۔

ولید بن مغیرہ اور قریشی سرداروں کو خدا نے ہر قسم کی نعمتیں عطاء فرمائی تھیں اور پھر ان مادی ترقیات کے ساتھ ساتھ خاتم الانبیاء ﷺ کی بعثت فرما کر ان کی روحانی نعمت کو بھی کامل و مکمل کر دیا تھا، لیکن ان بدبختوں نے شکر ادا کرنے کی بجائے کفران نعمت کیا، آخرت نتیجہ یہ نکلا کہ جس طرح باغ والے اپنے باغ کی نعمتوں سے محروم ہو گئے اسی طرح کفار مکہ بھی مادی اور روحانی نعمتوں سے محروم ہو کر ابدی ذلت و خسران کے ماسوا اور کچھ نہ پا سکے۔ فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ۔

Marfat.com

مومن وکافر

○ سورۂ کہف اور مومن وکافر کا مذاکرہ ○ واقعہ کی تشریح ○ بصائر

سورۂ کہف اور مومن وکافر کا واقعہ:

اللہ تعالیٰ نے سورۂ کہف میں اصحاب کہف کے واقعہ کے بعد ایک اور واقعہ کا ذکر فرمایا ہے، یہ واقعہ دو انسانوں کے درمیان مناظرانہ گفتگو کی شکل میں ذکر ہوا ہے اور ساتھ ہی اس کا نتیجہ اور ثمرہ بھی مذکور ہے۔ یعنی ایک کا طریق زندگی مال کے اعتبار سے کامیاب رہا اور دوسرے کو ندامت وحسرت کا منہ دیکھنا پڑا۔

اس کے متعلق بعض مفسرین کا خیال ہے کہ قرآن عزیز نے اس واقعہ کو مثال کے طور پر کفار مکہ اور مسلمانوں کی جماعت کے حالات کو سامنے رکھ کر تذکیر اور نصیحت کے لیے بیان کیا ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ اس طرح کا واقعہ درحقیقت دو آدمیوں (مومن وکافر) کے درمیان زمانہ ماضی میں پیش آیا تھا۔

اور ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جمہور کا قول یہ ہے کہ جس طرح اصحاب کہف کا واقعہ پیش آیا ہے اسی طرح نزول قرآن سے قبل دو انسانوں کے درمیان یہ واقعہ بھی پیش آیا ہے اور قرآن نے ان دونوں واقعات کو مشرکین مکہ کی تذکیر وتنذیر کے لیے بیان کیا ہے۔

قرآن عزیز نے جس انداز میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کتب احادیث وسیر اور تاریخ میں اس سے زیادہ کچھ اور موجود نہیں ہے لہٰذا وہی قابل مراجعت ہے:

﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّ حَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّ جَعَلْنَا
بَيْنَهُمَا زَرْعًا ؕ ۳۲ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَ لَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ وَّ فَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۙ ۳۳ وَّ كَانَ
لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَ هُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّ اَعَزُّ نَفَرًا ۳۴ وَ دَخَلَ جَنَّتَهٗ وَ هُوَ ظَالِمٌ
لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ۙ ۳۵ وَّ مَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّ لَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ
لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ۳۶ قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَ هُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ
مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ؕ ۳۷ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَ لَاۤ اُشْرِكُ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا ۳۸ وَ لَوْ لَاۤ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ
قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّ وَلَدًا ۚ ۳۹ فَعَسٰى رَبِّيْۤ اَنْ يُّؤْتِيَنِ

Marfat.com

خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَ يُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ۝ اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ۝ وَ اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ۝ وَ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ مَا كَانَ مُنْتَصِرًا ۝ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ عُقْبًا ۝ (الکہف:۳۲-۴۴)

"اور (اے پیغمبر ﷺ!) لوگوں کو ایک مثال سنا دو۔ دو آدمی تھے، ان میں سے ایک کے لیے ہم نے انگور کے دو باغ مہیا کر دیئے گرداگرد کھجور کے درختوں کا احاطہ تھا، بیچ کی زمین میں کھیتی تھی، پس ایسا ہوا کہ دونوں باغ پھلوں سے لد گئے اور پیداوار میں کسی طرح کی بھی کمی نہ ہوئی ہم نے ان کے درمیان (آب پاشی کے لیے) ایک ندی جاری کر دی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ آدمی دولت مند ہو گیا۔ تب ایک دن (گھمنڈ میں آ کر) اپنے دوست سے (جسے خوش حالیاں میسر نہ تھیں) باتیں کرتے کرتے بول اٹھا "دیکھو میں تم سے زیادہ مالدار ہوں اور میرا جتھا بھی بڑا طاقت ور جتھا ہے" پھر وہ (یہ باتیں کرتے ہوئے) اپنے باغ میں گیا اور وہ اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر رہا تھا۔ اس نے کہا "میں نہیں سمجھتا کہ ایسا شاداب باغ کبھی ویران ہو سکتا ہے مجھے توقع نہیں کہ قیامت کی گھڑی برپا ہوگی اور اگر ایسا ہوا بھی کہ میں اپنے پروردگار کی طرف لوٹایا گیا تو (میرے لیے کیا کھٹکا ہے) مجھے ضرور وہاں بھی اس سے بہتر ٹھکانا ملے گا"۔ یہ سن کر اس کے دوست نے کہا اور باہم گفتگو کا سلسلہ جاری تھا "کیا تم اسی ہستی کا انکار کرتے ہو جس نے تمہیں پہلے مٹی سے اور پھر نطفہ سے پیدا کیا اور پھر آدمی بنا کر نمودار کر دیا لیکن یہ تو یقین رکھتا ہوں کہ وہی اللہ میرا پروردگار ہے اور میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا اور پھر جب تم اپنے باغ میں آئے (اور اس کی شادابیاں دیکھیں) تو کیوں تم نے یہ نہ کہا کہ وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے، اس کی مدد بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا؟ اور یہ جو تمہیں دکھائی دے رہا ہے کہ میں تم سے مال اور اولاد کم تر رکھتا ہوں تو (اس پر مغرور نہ ہو) کیا عجب ہے میرا پروردگار مجھے تمہارے اس باغ سے بھی بہتر باغ (جنت) دے دے اور تمہارے باغ پر آسمان سے ایسی اندازہ کی ہوئی بات اتار دے کہ وہ چٹیل میدان ہو کر رہ جائے یا پھر (بربادی کی کوئی اور صورت نکل آئے مثلاً) اس کی نہر کا پانی بالکل نیچے اتر جائے اور تم کسی طرح بھی اس تک نہ پہنچ سکو اور پھر (دیکھو) ایسا ہی ہوا کہ اس کی دولت (بربادی کے) گھیرے میں آ گئی، وہ ہاتھ مل مل کر افسوس کرنے لگا کہ ان باغوں کی درستگی پر میں نے کیا کچھ خرچ کیا تھا (وہ سب برباد ہو گیا) اور باغوں کا حال ہوا کہ ٹٹیاں گر کے زمین کے برابر ہو گئیں اب وہ کہتا ہے اے کاش میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا اور دیکھو کوئی جتھا نہ ہوا کہ اللہ کے سوا اس کی مدد کرتا اور نہ خود اس نے یہ طاقت پائی کہ بربادی سے جیت سکتا۔ یہاں سے معلوم ہو گیا کہ فی الحقیقت سارا اختیار اللہ ہی کے لیے ہے وہی ہے جو بہتر ثواب دینے والا ہے اور اسی کے ہاتھ بہتر انجام ہے"۔

واقعہ کی تشریح:

ان آیات سے قبل یہ ذکر ہو رہا ہے کہ جو لوگ منکر ہیں ان کے لیے جہنم کی آگ ہے اور جو مومنین ہیں ان کے لیے ہمہ قسم کی

Marfat.com

خوش عیشیاں اور ابدی باغ (جنت) ہے اس کے بعد آیات زیر بحث میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو منکرین ہیں ان کے لیے صرف آخرت ہی کی محرومیاں نہیں ہیں بلکہ وہ اس دنیا میں بھی عنقریب ناکامیوں اور بدبختیوں سے دوچار ہونے والے ہیں ان کا یہ گھمنڈ کہ ان کو ہر قسم کی رفاہت اور خوش عیشی حاصل ہے اور وہ مال و دولت کے مالک ہیں اور ان کا جتھا بھی بہت طاقتور ہے بہت جلد خاک میں مل جانے والا ہے اور مومن اپنی موجودہ تنگ حالی پر دل گیر اور بددل نہ ہوں کہ وقت آ پہنچا ہے کہ ان کی یہ بے چارگی و بے بسی ہمہ قسم کی عزت وطاقت سے بدل جائے گی، نیز یہ کہ دنیا کی خوش عیشی چلتی پھرتی چھاؤں ہے اس پر بھروسہ بے کار ہے وہ جب مٹنے پر آتی ہے تو لمحوں کی بھی دیر نہیں لگتی اور دنیا کی کوئی طاقت بھی اس کو نہیں بچا سکتی۔

چنانچہ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے قرآن نے یہ مثال دی کہ یوں سمجھو کسی جگہ دو آدمی تھے ایک کو خدائے تعالیٰ نے دنیوی عیش وعشرت کے کل سامان دے رکھے تھے اور دوسرا تنگ دست اور پریشان حال تھا، وہ خدا کا منکر اور دولت کے نشہ میں چور اپنے نادار دوست سے غرور ونخوت کے ساتھ یہ کہتا رہتا کہ میری یہ دولت وحشمت پائیدار ہے کوئی طاقت نہیں کہ اس کو مجھ سے چھین لے اور ایک تو ہے کہ افلاس اور تنگی میں بسر کر رہا ہے۔ مفلس دوست اگرچہ تنگ دست تھا مگر خدائے برتر کا سچا پرستار تھا اس نے جواب میں کہا: "اپنی دولت کے نشہ میں اس درجہ مغرور نہ ہو، کون جانتا ہے کہ لمحوں میں کیا سے کیا ہو جائے اور کس کو خبر ہے کہ وہ مجھ کو ان بخشائشوں سے نواز دے جس پر آج تو غرور کر رہا ہے آخر کار یہی ہوا کہ اس کے وہ تمام باغ جن کی شادابیوں اور عطر بیزیوں پر اس کو گھمنڈ تھا اچانک جل بھن کر خاک ہو گئے اور کل جہاں چمن زار تھا آج وہاں ویرانی کے سواء اور کچھ باقی نہ رہا۔

اس مثال میں حق تعالیٰ نے مشرکین مکہ اور مسلمانوں کی جماعت سے متعلق وہی نقشہ کھینچا ہے جو عرب کے ماحول کے ٹھیک ٹھیک مطابق تھا، کیونکہ ان کے یہاں اس سے بڑھ کر کوئی دولت نہ تھی کہ تاکستان کے بہتر سے بہتر باغ ہوں، ان کے چاروں طرف کھجور کے گنجان درخت لگے ہوں، درمیان میں نہر ہو اور نہر کے اردگرد سرسبز وشاداب کھیتیاں ہوں اور یہ سب کچھ مشرکین مکہ کو میسر تھا اور مسلمان اس وقت ان ظاہری نعمتوں سے محروم تھے۔

بہرحال یہ واقعہ ہو یا مثال، تذکیر وتنذیر کے جس مقصد کی خاطر بیان کی گئی ہے اس کے پیش نظر مشرکین مکہ اور مسلمانوں کے باہمی تقابل کا نہایت ہی جامع اور کامل نقشہ ہے، قریش مکہ کے غرور ونخوت کا یہ حال تھا کہ اول تو پیغام ہدایت پر کان ہی نہ دھرتے تھے اور اگر کبھی سننے پر آمادگی ظاہر بھی کرتے تو یہ شرط لگاتے کہ جب تک ہم محمد ﷺ کے پاس بیٹھیں اس وقت تک ان خستہ حال مسلمانوں میں سے کوئی ہمارے برابر آ کر نہ بیٹھے، کیونکہ ان کے ساتھ بیٹھنا ہماری سخت توہین ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہماری یہ دولت وحشمت غیر فانی اور ہمارا یہ کروفر ابدی ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو کمزور اور تنگ دست دیکھ کر ان کا مضحکہ کرتے اور حقیر وذلیل سمجھتے تھے۔

پس قرآن عزیز نے لطیف اور معجزانہ اسلوب کے ساتھ مسلمانوں کے حق میں ایسے ناسازگار حالات کے وقت ان کی کامرانی اور مشرکین کی ناکامی کے اس انجام کی خبر دی ہے جو کچھ عرصہ بعد ہونے والا تھا، چنانچہ جو سعید روحیں تھیں انہوں نے سمجھا اور حق کی آغوش میں خود کو سپرد کر دیا اور جن کی شقاوت وبدبختی پر مہر لگ چکی تھی ان کا تھوڑے عرصہ بعد ہی وہ حسرت ناک انجام ہوا جس کے لیے یہی کہا جا سکتا ہے۔ اور شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ ان آیات کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"پہلے وقت میں ایک شخص مالدار مر گیا، دو بیٹے رہے برابر مال بانٹ لیا، ایک نے زمین خرید کی دو طرف میوؤں کے باغ لگائے

بیچ میں کھیتی اور ندی کاٹ کر ان پر لا ڈالی کہ مینہ نہ ہو تو بھی نقصان نہ آئے اور عمدہ جگہ بیاہ کیا اولاد ہوئی اور نوکر رکھے، تدبیر دنیا درست کر کے آسودہ گزران کرنے لگا، دوسرے نے سب مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور آپ قناعت سے بیٹھ رہا"۔ ❶

معلوم نہیں کہ حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ نے واقعہ کی یہ تفصیل کہاں سے اخذ فرمائی ہے کتب سیر و روایات اور تاریخ کے اوراق تو اس بارہ میں خاموش ہیں "اور چھوٹا منہ بڑی بات" حضرت شاہ صاحب نے اس واقعہ میں جس طرح دونوں کا تقابل ظاہر فرمایا ہے قرآن کا ظاہر سیاق اس کی تائید نہیں کرتا، اس لیے کہ مرد مومن نے کافر کے غرور کا جو جواب دیا اور کافر نے جو اس کے افلاس پر طعنہ دیا وہ ہرگز اس صورت حال کے مناسب نہیں ہیں کہ مومن حقیقتاً مالدار تھا مگر اس نے اپنا سارا مال راہ خدا میں خرچ کر دیا تھا، اگر ایسا ہوتا تو مومن و کافر کے سوال و جواب کا اسلوب دوسرا ہی ہوتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بصائر:

① دنیوی نعمتیں دو گھڑی کی دھوپ اور چار دن کی چاندی ہیں، ناپائیدار اور فانی پس عقل مند وہ ہے جو ان پر گھمنڈ نہ کرے اور ان کے بل بوتہ پر خدا کی نافرمانی پر آمادہ نہ ہو جائے اور تاریخ کے ان اوراق کو پیش نظر رکھے جن کی آغوش میں فرعون، نمرود، ثمود اور عاد کی قاہرانہ طاقتوں کا انجام آج تک محفوظ ہے:

﴿سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝﴾ (النمل:٦٩)

"زمین کی سیر کرو اور پھر دیکھو کہ نافرمانوں کا انجام کیا ہوا؟"

② حقیقی عزت ایمان باللہ اور عمل صالح سے بنتی ہے، دولت و ثروت اور سطوت و حشمت دنیوی سے حاصل نہیں ہوتی، قریش مکہ کو ثروت و سطوت دونوں حاصل تھے، مگر بدر کے میدان میں ان کا انجام بد اور دین و دنیا کی رسوائی کو کوئی روک نہ سکا، مسلمان دنیا کے ہر قسم کے سامان عیش سے محروم تھے مگر ایمان باللہ اور عمل صالح نے جب ان کو دینی و دنیوی عزت و حشمت عطاء کی تو اس میں کوئی حائل نہ ہو سکا۔

﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (المنافقون:٨)

"حقیقی عزت اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں کے لیے ہی ہے مگر منافقین اس حقیقت سے نا آشنا ہیں"۔

③ مومن کی شان یہ ہے کہ اگر اس کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی نعمتوں سے نوازا ہے تو غرور اور تکبر کی بجائے درگاہ الٰہی میں جبین نیاز جھکا کر اعتراف نعمت کرے اور دل و زبان دونوں سے یہ اقرار کرے کہ خدایا! اگر تو یہ عطاء نہ فرماتا تو ان کا حصول میری اپنی قوت و طاقت سے باہر تھا، یہ سب تیرے ہی عطاء و نوال کا صدقہ ہے: ﴿وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ﴾۔ صحیح حدیث میں ہے کہ نبی اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: ((الکنز من کنوز الجنة لاحول ولا قوة الا باللہ)) "جنت کے پوشیدہ خزانوں میں سے ایک خزانہ یہ ہے کہ بندہ اعتراف کرے کہ بھلائی کرنے کی طاقت اور برائی سے بچنے کی قوت اللہ کی مدد کے بغیر ناممکن

---

❶ موضح القرآن

Marfat.com

ہے"۔ یعنی جس شخص نے زبان سے اس کا اقرار کیا اور دل میں اس حقیقت کو جاگزیں کر لیا اس نے گویا جنت کے مستور خزانوں کی کنجی حاصل کر لی۔

اس کے برعکس کافر کی حالت یہ ہے کہ ان کو جب دولت وثروت اور جاہ وجلال میسر آ جاتے ہیں تو خودی میں آ کر مغرور ہو جاتا ہے اور جب کوئی خدا کا نیک بندہ اس کو سمجھاتا ہے کہ یہ سب خدا کا فضل ہے اس کا شکر ادا کر تو وہ اکڑ کر کہتا ہے:

﴿اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ مِّنْ عِنْدِيْ﴾

"یہ خدا کا دیا ہوا نہیں ہے بلکہ میری اپنی دانائی اور علم کا نتیجہ ہے"۔

پس مومن اور کافر کے لیے خدا کی جانب سے بھی الگ الگ جواب ملتا ہے، جن کو سورہ مومنون میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

﴿اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّ بَنِيْنَ ۝ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ۝ وَ الَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَاۤ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ هُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ۝﴾ (المؤمنون:۵۵-۶۱)

"کیا یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ہم مال اور اولاد سے اس لیے ان کی امداد کر رہے ہیں کہ بھلائی پہنچانے میں سرگرمی دکھائیں؟ نہیں مگر وہ شعور نہیں رکھتے (کہ ان کے بارے میں حقیقت حال دوسری ہے یعنی قانون امہال کام کر رہا ہے) اور جو لوگ اپنے پروردگار کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں جو اپنے پروردگار کی نشانیوں پر یقین رکھتے ہیں جو اپنے پروردگار کے ساتھ کسی ہستی کو شریک نہیں ٹھہراتے جو اس کی راہ میں جتنا کچھ دے سکتے ہیں، بلا تامل دیتے ہیں اور (پھر بھی) ان کے دل ترساں رہتے ہیں کہ اپنے پروردگار کے حضور لوٹنا ہے، تو بلاشبہ یہ لوگ ہیں جو بھلائیوں کے لیے تیز گام ہیں اور یہی ہیں جو اس راہ میں سب سے آگے نکل جانے والے ہیں"۔

④ سعید وہ ہے جو انجام سے قبل حقیقت انجام کو سوچ لے اور انجام کار سعادت ابدی وسرمدی پائے اور شقی و بدبخت وہ ہے جو انجام پر غور کیے بغیر اول غرور ونخوت کا اظہار کرے اور اس انجام بد کو دیکھنے کے بعد ندامت وحسرت کا اظہار کرے اور یہ ندامت و حسرت اس وقت کچھ کام نہ آئے۔ چنانچہ اس واقعہ یا مثال میں بھی منکر کو وہی شقاوت پیش آئی:

﴿وَ اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَاۤ اَنْفَقَ فِيْهَا وَ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا ۝﴾ (الکہف:۴۲)

"اور اس کی دولت (ثمرات) گھیرے میں آ گئی اور جب کہ اس کے باغ کی ٹٹیاں زمین پر گر کے برابر ہو گئیں تو ہاتھ مل مل کر کہتا رہ گیا "افسوس میں نے ان پر کتنی کثیر دولت صرف کی تھی وہ سب برباد ہو گئی" اور حسرت کے ساتھ کہتا تھا "کاش کہ میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا"۔

Marfat.com

اور یہی روز بد فرعون کو دیکھنا پڑا کہ وقت گزرنے پر اس نے وہی کہا کہ اگر عذاب کے مشاہدے سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی نصیحت مان لیتا تو اس دردناک عذاب کی نذر نہ ہوتا:

﴿حَتّٰۤی اِذَاۤ اَدۡرَکَہُ الۡغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنۡتُ اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا الَّذِیۡۤ اٰمَنَتۡ بِہٖ بَنُوۡۤا اِسۡرَآءِیۡلَ وَ اَنَا مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۹۰﴾ آٰلۡـٰٔنَ وَ قَدۡ عَصَیۡتَ قَبۡلُ وَ کُنۡتَ مِنَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۹۱﴾﴾ (یونس: ۹۰، ۹۱)

"یہاں تک کہ جب وہ غرق ہونے لگا تو اس نے اب کہا: میں اقرار کرتا ہوں کہ کوئی خدا نہیں ہے سواء اس ایک ذات کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں مسلمانوں میں سے ہوتا ہوں۔ (اللہ نے جواب دیا) اور اس سے پہلے نافرمانی کرتا رہا اور تو فسادیوں میں سے تھا"۔

اصحاب القریہ (یا) اصحاب یٰسین

○ اصحاب قریہ اور قرآن عزیز ○ واقعہ ○ واقعہ سے متعلق اقوال ○ نقد و تبصرہ ○ موعظت

اصحاب قریہ اور قرآن عزیز:

قرآن عزیز (سورہ یٰسین) میں ایک بہت ہی مختصر واقعہ مذکور ہے جو آیت ﴿وَاضۡرِبۡ لَهُمۡ مَّثَلًا اَصۡحٰبَ الۡقَرۡيَةِ ۘ﴾ سے شروع ہو کر ﴿فَاِذَا هُمۡ خٰمِدُوۡنَ﴾ پر ختم ہوتا ہے اور سورۃ کی نسبت سے اس کو "واقعہ اصحاب یٰسین" اور آیات کے اسلوب بیان کے مطابق "واقعہ اصحاب قریہ" کہتے ہیں۔

واقعہ:

قرآن عزیز نے اس واقعہ کے متعلق صرف اس قدر بتایا ہے کہ گزشتہ زمانہ میں ایک بستی میں کفر و شرک اور فساد کو دور کرنے اور رشد و ہدایت کا سبق دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے دو پیغمبروں کو مامور کیا، انہوں نے اہل قریہ کو حق کی تلقین کی اور صراط مستقیم کی جانب دعوت دی، لیکن بستی والوں نے ان دونوں کو جھٹلایا، تب ہم نے ایک ہادی کا اور اضافہ کر دیا اور وہ تین مل کر ایک جماعت ہو گئے، اب ان تینوں نے ان کو یقین دلایا کہ بے شبہ ہم خدا کے بھیجے ہوئے ہیں، مگر انہوں نے نہ مانا اور ان کا مذاق اڑایا کہ تم بھی آدمی اور ہم بھی آدمی پھر تمہارے اندر وہ کون سی عجیب بات ہے کہ تم پیغمبر بنا دیئے گئے؟ یہ سب تمہارا جھوٹ اور تمہاری سازش ہے۔ انہوں نے کہا کہ خدا اس کا شاہد ہے کہ ہم جھوٹے نہیں، وہ دانا و بینا اس کو خوب جانتا ہے مگر تم پھر بھی نہیں مانتے تو ہمارا کام اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ خدا کا پیغام تم تک پہنچا دیں اور راہ حق دکھا دیں۔ بستی والے کہنے لگے کہ ہم تو تم کو منحوس سمجھتے ہیں کہ تم نے خواہ مخواہ ہمارے یہاں آ کر گڑبڑ پیدا کر دی اور اگر تم اس سے باز نہ آئے تو ہم تم تینوں کو مار ڈالیں گے یا سخت قسم کی تکالیف میں مبتلاء کر دیں گے۔ انہوں نے جواب دیا خدا کی نافرمانی کر کے نحوست تو تم خود اپنے اوپر لا چکے ہو اس سے زیادہ نحوست اور کیا ہو سکتی ہے کہ تم نصیحت اور خیر خواہی تک کو قبول نہیں کرتے بلکہ اور زیادہ حد سے گزرتے جاتے ہو؟

بستی کے آخری کنارے پر ایک نیک مرد رہتا تھا، اس نے جب سنا کہ بستی والے خدا کے رسولوں کو جھٹلا رہے ہیں اور طرح طرح کی دھمکیاں دے رہے ہیں تو عجلت کے ساتھ وہاں آ پہنچا جس جگہ یہ گفتگو ہو رہی تھی اور کہنے لگا: اے قوم! خدائے تعالیٰ کے پیغمبروں کی پیروی کر، ان مقدس لوگوں کی پیروی سے کیوں منہ موڑتی ہے جو تجھ سے اس خدمت حق کا کوئی معاوضہ تک نہیں طلب کرتے اور جو خدا رسیدہ اور ہدایت مآب انسان ہیں، بتاؤ میں کیوں اس ایک خدا کی ہی پرستش نہ کروں جس نے مجھ کو نیست سے

Marfat.com

ہست کیا ہے اور مرنے کے بعد میں اور تم سب اس کی جانب لوٹ جانے والے ہیں، تم جوان برگزیدہ انسانوں کی تکذیب کر رہے ہو تو میں دریافت کرتا ہوں کہ کیا مجھ کو خدائے واحد کے سوائے معبودانِ باطل کو اپنا خدا مان لینا چاہیے کہ اگر وہ ذات واحد جو نہایت ہی مہربان اور رحم والا ہے مجھے کسی قسم کا نقصان پہنچانے کا ارادہ کرلے تو ان معبودانِ باطل کی نہ سفارش کارگر ہو سکے اور نہ وہ اس نقصان سے مجھ کو بچا سکیں، اگر تمہارا مقصد یہ ہے تو ایسی صورت میں بلاشبہ میں تو سخت گمراہی میں پھنس جاؤں گا، لہٰذا کان کھول کر سن لو کہ تم ان مقدس انسانوں کی بات مانو میں تو اس ذات پر ایمان لے آیا جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے۔

قوم نے اپنی تکذیب اور مقدس رسولوں کی تصدیق میں نیک مرد کی یہ پر از ہدایت گفتگو سنی تو غیظ و غضب میں آ گئی اور اس کو شہید کر ڈالا۔

واقعہ کا اس حد تک ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے جرأت حق کی جزاء میں اس کو جنت عطاء کی اور جب اس نے اپنا پاک مقام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو وجد آفریں انداز میں کہنے لگا: "کاش کہ میری قوم کے لوگ یہ جان سکتے کہ میرے پروردگار نے مجھ کو مغفرت کا کیسا بیش بہا تحفہ عطا فرمایا اور میرا کس درجہ اعزاز و اکرام کیا"۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اس مرد نیک کی قوم کی بدکرداری پر ان کو ہلاک کرنے اور سزا دینے کے لیے ہمیں آسمان سے کسی لشکر بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی، فقط ایک ہولناک چیخ نے ان سب کا کام تمام کر دیا اور وہ جہاں کے تہاں بجھ کر رہ گئے، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شاید ان بدبختوں نے خدا کے رسولوں کو بھی شہید کر ڈالا تھا، جیسا کہ انہوں نے ان کو دھمکی دی تھی اور اگرچہ قرآن عزیز میں یہ مذکور نہیں ہے مگر اس مرد شہید کے ذکر کے بعد چونکہ ان رسولوں کا کوئی مذکور نہیں ہے اس لیے قرینہ یہی شہادت دیتا ہے:

﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۳﴾ اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا
فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ
شَيْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ﴿۱۵﴾ قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ
الْمُبِيْنُ ﴿۱۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸﴾
قَالُوْا طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ ۭ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ
يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۰﴾ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْئَلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمَا لِيَ لَآ
اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۲﴾ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ
عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ﴿۲۳﴾ اِنِّيْٓ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾ اِنِّيْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ﴿۲۵﴾
قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ۭ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿۲۷﴾ وَمَآ
اَنْزَلْنَا عَلٰي قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ﴿۲۸﴾ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً
فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ﴿۲۹﴾﴾ (یٰسین: ۱۳-۲۹)

Marfat.com

"(اے پیغمبر!) ان (مشرکین مکہ) سے بستی والوں کا واقعہ بیان کر جب کہ ان کے پاس خدا کے رسول آئے۔ جب یہ صورت ہوئی کہ ہم نے اوّل ان کے پاس دو بھیجے تھے تو انہوں نے ان کو جھٹلایا تب ہم نے ان دونوں کو تیسرے کے ذریعہ سے قوت و عزت عطاء کی، اب ان تینوں نے بستی والوں سے کہا: "ہم یقین دلاتے ہیں کہ ہم کو خدا نے تمہارے پاس بھیجا ہے" بستی والوں نے کہا: "بجز اس بات کے کہ تم بھی ہماری طرح ایک انسان ہو کون سی ایسی خوبی ہے کہ تم خدا کے رسول ہو اور رحمٰن نے تم پر کچھ بھی نازل نہیں کیا اس لیے تم صاف جھوٹے ہو"۔ ان تینوں نے کہا: "ہمارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ ہم یقیناً خدا کے فرستادہ ہیں اور ہمارے ذمہ صرف واضح اور صاف طور پر خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے (زبردستی قبول کرا دینا ہمارا کام نہیں ہے)۔ بستی والے کہنے لگے: "ہم تو تم کو منحوس سمجھتے ہیں پس اگر تم اس (تبلیغ) سے باز نہ آئے تو ہم تم کو سنگسار کر دیں گے اور سخت قسم کا عذاب چکھائیں گے"۔ انہوں نے کہا: تمہاری نحوست تو خود تمہارے ساتھ وابستہ ہے کہ تم کو جو نصیحت کی جاتی ہے اس کو نحوست کہتے ہو بلکہ تم تو حد سے گزر رہے ہو اور شہر کے آخری کنارے سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور اس نے کہا "اے قوم تم خدا کے رسولوں کی پیروی کرو، ان کی پیروی کرو جو تم سے اپنی نیکی ہدایت پر کوئی اجرت طلب نہیں کرتے اور مجھے کیا بات مانع ہے کہ میں صرف اپنے پیدا کرنے والے ہی کی پرستش نہ کرو، اس کی پرستش جس کی جانب ہم تم کو لوٹ جانا ہے، کیا میں اس ذات واحد کے سوائے باطل معبودوں کو خدا بنالوں کہ اگر رحمٰن مجھ کو کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو ان باطل معبودوں کی نہ کچھ سفارش چل سکے اور نہ وہ اس مضرت سے بچا سکیں میں اگر ایسا کروں تو کھلا گمراہ ہوں۔ بیشک میں تو اپنے اور تمہارے پروردگار پر ایمان لے آیا۔ تم خوب کان لگا کر سن لو"۔ تب اس کو (ہماری جانب سے) کہا گیا جنت میں بے خطر داخل ہو جا، اس نے کہا "کاش کہ میری قوم جان لیتی کہ میرے پروردگار نے مجھے مغفرت کا کیسا اچھا تحفہ دیا اور مجھ کو ان لوگوں میں شامل کر لیا جن کو اس نے اعزاز و اکرام سے نوازا ہے اور ہم نے اس کی موت کے بعد اس کی قوم پر آسمان سے کوئی لشکر سزا دینے کے لیے نہیں اتارا اور ہم کو ایسا کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی (ان کی سزا کے لیے) اور کچھ نہیں تھا مگر ایک ہولناک چیخ پس وہ وہیں بجھ کر رہ گئے (یعنی ہلاک ہو گئے)"۔

مفسرین اور ارباب سیرت اس واقعہ کے زمانہ اور تفصیلات میں اس درجہ مشکوک اور متردد نظر آتے ہیں کہ ان کے بیانات اور روایات سے واقعہ کی تعیین ناممکن ہو جاتی ہے اس لیے ہم یہی کہہ سکتے ہیں قرآن عزیز نے اپنے مقصد عظمٰی "موعظت و عبرت" کے پیش نظر جس قدر بیان کیا ہے وہ ایک صاحب بصیرت کے لیے کافی و شافی ہے۔ خدا کی اس سرزمین پر حق و باطل کے جہاں بہت سے واقعات ہو گزرے ہیں اور اس پیر فلک نے اس سلسلہ میں جتنے ورق بھی الٹے ہیں ان میں ایک یہ واقعہ بھی اسی آسمان کے نیچے اور اسی زمین کے اوپر ہو گزرا ہے، بستی، نیک مرد اور مقدس رسولوں کے نام معلوم ہوئے تب اور نہ ہوئے تب نفس واقعہ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں پڑتا، کیونکہ تاریخ کے جن اوراق نے نوح علیہ السلام اور قوم نوح، ہود اور عاد، صالح اور ثمود، ابراہیم، لوط اور قوم لوط، موسیٰ اور فرعون، عیسیٰ اور بنی اسرائیل کے معرکہ حق و باطل کے تفصیلی حالات و واقعات کو اپنے سینہ میں آج تک محفوظ رکھا ہے، اس میں اگر اس واقعہ کا بھی اضافہ ہو جائے جس کا مختصر و مجمل ذکر قرآن عزیز نے کیا ہے تو کون سی حیرت کی بات اور تعجب کا مقام ہے۔

واقعہ کا حاصل یہی تو ہے کہ چند مقدس پیغمبروں نے ایک بے راہ رو مخلوق کو سیدھا راستہ دکھانے کی کوشش کی اور اس نے ازراہ

Marfat.com

عناد و گمراہی ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا، حتیٰ کہ خدا رسیدہ ہادیوں کو قتل کر دینے سے بھی باز نہ رہے تو اس قسم کے واقعات کو تاریخ نے صرف بنی اسرائیل ہی میں اتنی بار دہرایا ہے کہ تاریخ اقوام و ملل کا حق آگاہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے متعلق تردد نہیں کر سکتا۔

واقعہ سے متعلق اقوال:

ابن اسحاق بروایت کعب احبار و وہب بن منبہ و عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نقل کرتے ہیں کہ یہ واقعہ شہر انطاکیہ (شام) کا ہے، اس شہر کے لوگ بت پرست تھے اور ان کے بادشاہ کا نام انطخیس بن انطخیس تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت کے لیے تین پیغمبروں صادق، صدوق اور شلوم کو بھیجا اور شہر کی آخری سمت سے جو نیک مرد ان کی تائید کے لیے آیا اس کا نام حبیب تھا پھر کوئی کہتا ہے کہ یہ عابد و زاہد اور مرتاض تھا اور شہر کے کنارے عبادت میں مصروف رہتا تھا اور کسی کا قول ہے کہ وہ ریشمی یا سوتی کپڑا بننے کا کام کرتا تھا اور صاحب صدقات و خیرات تھا۔[1] غرض ان کے نزدیک یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بہت قدیم زمانہ کا ہے اور قتادہ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ کا ہے اور شہر انطاکیہ ہی کا واقعہ ہے، حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے تین حواری شمعون، یوحنا اور پولس کو وہاں بھیجا تھا کہ جا کر ان کو حق کی دعوت دیں اور پیغام الٰہی سنائیں مگر اہل شہر نے قبول نہ کیا اور ان کی ہی بستی کے ایک نیک مرد نے جب ان کو قبول حق کی ترغیب دی تو انہوں نے اس کو قتل کر ڈالا اور پاؤں سے کچل کر اس کی نعش کی توہین کی اس شخص کا نام حبیب تھا اور یہ نجاری (بڑھئی) کا پیشہ کرتا تھا، تب اللہ تعالیٰ نے اس بستی پر چیخ کا عذاب مسلط کر دیا، کہتے ہیں کہ جبرائیل فرشتہ نے ایسی ہولناک چیخ کی کہ اہل بستی اس کو سن کر جس حالت میں بھی تھے اسی حالت میں مر کر رہ گئے۔[2]

نقد و تبصرہ:

یہ روایات یا اقوال کعب احبار اور وہب بن منبہ کی اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہیں، حتیٰ کہ ابن اسحٰق کے پاس ان کے لیے مکمل و مسلسل سند بھی نہیں ہے اس لیے "بلغنی" کہہ کر بیان کرتا ہے اور اس قسم کی روایات میں خواہ مخواہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا نام آ جانا اور تفسیری قصص و حکایات کو بغیر سند ان کی جانب منسوب کر دینا تو ایک عام بات ہوگئی ہے۔

یہ ہم نے اس لیے کہا کہ ہر دو واقعات اپنے تفصیلی جزئیات کے لحاظ سے غیر تاریخی ہیں بلکہ بعض تاریخی مسلمات کی تردید کرتے ہیں اور قرآن عزیز کے ظاہر سیاق کے بھی خلاف ہیں۔ چنانچہ مشہور محدث و مؤرخ حافظ عماد الدین بن کثیر تحریر فرماتے ہیں کہ پہلے اور دوسرے واقعہ پر تو یہ مشترک اعتراض واقع ہوتا ہے کہ شہر انطاکیہ ان چار مسیحی شہروں میں سے ہے جن کے متعلق باتفاق علماء سیر و تاریخ یہ ثابت ہے کہ وہ دعوت مسیح کے مرکز شمار کیے جاتے ہیں اس لیے کہ باختلاف زمانہ ان شہروں میں جس وقت دعوت مسیح علیہ السلام پہنچی ہے انہوں نے برضا و رغبت اس پر لبیک کہا ہے اور وہ مسیحی پیغام کے لیے مدد و معاون ثابت ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ مسیحیوں کا یہ اعتقاد ہے کہ یہ چار مقامات مقدس مقامات ہیں اور بطریق (پاپائے اعظم) کا دار الخلافہ ① القدس (بیت المقدس) ② انطاکیہ، ③ اسکندریہ اور ④ روما (اٹلی) بیت المقدس اس لیے کہ وہ مسیح علیہ السلام کا وطن ہے اور انطاکیہ اس لیے کہ یہ پہلا شہر ہے جس کی کل آبادی ایک ہی وقت میں حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان لائی اور اسکندریہ اس لیے کہ یہ پہلا شہر ہے جس کے باشندوں نے صلح و آشتی کے ساتھ یہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۴ و تاریخ ابن کثیر ج ۱ ص ۲۲۹۔ [2] تفسیر ابن کثیر ج ۳ و تاریخ ابن کثیر ج ۱ ص ۲۲۹، ۲۳۰۔

Marfat.com

منظور کیا کہ مسیحی مقدسین بطریق (پوپ) مطران، اسقف، قسیس، شماس اور راہب ❶ یہاں اپنے اختیارات کے ساتھ قیام کریں گے اور روما اس لیے کہ قسطنطین اعظم کا دار السلطنت تھا کہ جس نے عیسائی مذہب کو نئے سانچے میں ڈھال کر فروغ دیا اور دعوت مسیح علیہ السلام سے قبل بھی کسی تاریخی شہادت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ انطاکیہ کسی زمانہ میں غضب الٰہی سے برباد و تباہ کر دیا گیا تھا اور بعد میں پھر بارونق شہر بن گیا۔ لہٰذا ہر دو اقوال کے مطابق اس واقعہ کو انطاکیہ سے وابستہ کرنا صحیح نہیں ہے۔

اور قتادہ کی روایت پر مسطورہ بالا اعتراض کے علاوہ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ قرآن کا ظاہر سیاق یہ بتا رہا ہے کہ معذب بستی کی ہدایت کے لیے جو برگزیدہ انسان بھیجے گئے تھے وہ حضرت مسیح علیہ السلام یا کسی دوسرے نبی کے فرستادہ یعنی رسول خدا کے قاصد و ایلچی نہ تھے بلکہ براہِ راست خدا کے پیغمبر اور نبی تھے اس لیے کہ اگر وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے فرستادہ ہوتے تو قرآن عزیز ضرور اس جانب کوئی اشارہ کرتا مگر ایسا نہیں ہے، بلکہ تمام آیات میں ان کے متعلق لفظ اَرْسَلْنَا (ہم نے ان کو بھیجا) استعمال کیا گیا ہے بلکہ رسولوں اور شہر کے باشندوں کے مکالمے کے جملے تو جب ہی بغیر کسی تاویل کے واضح مطلب ادا کرتے ہیں جب کہ ان کو براہِ راست خدا کا رسول مانا جائے۔

وہ یہ کہ ان برگزیدہ انسانوں نے جب خود کو رسول ظاہر کیا تو اہل شہر ان پر وہی پرانا اعتراض وارد کرنے لگے جو ہمیشہ منکرین رسول کہتے چلے آئے ہیں۔ انہوں نے کہا تم تو ہم ہی جیسے انسان ہو پھر رسول کیسے ہو سکتے ہو اور رحمان نے تم پر کچھ بھی نازل نہیں کیا تم جھوٹ کہتے ہو کہ تم پر خدا کا پیغام نازل ہوتا ہے پس اگر وہ خود خدا کے رسول نہیں تھے بلکہ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواری تھے تو بلاغت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ جواب میں یہ نہ کہتے "اللہ خوب جانتا ہے کہ ہم تمہاری جانب رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں" بلکہ جواب یہ دیتے کہ "ہم تو خدا کے پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام کے قاصد ہیں اور تم کو دعوت حق دینے آئے ہیں۔ رہا انسان ہونے کا معاملہ تو اللہ کے پیغمبر انسان ہی ہوتے ہیں، فرشتے یا کسی اور مخلوق میں سے نہیں ہوتے"۔ ❷

ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس موقع پر ایک تیسرا اعتراض بھی کیا ہے مگر وہ چونکہ ہمارے نزدیک خود محل نظر ہے اس لیے نظر انداز کر دیا گیا۔

طبرانی نے معجم میں ایک روایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ تین ہستیاں ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی نقیب کہلاتی ہیں ایک موسیٰ علیہ السلام کے نقیب یوشع علیہ السلام دوسرے اصحاب یٰسین حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نقیب اور تیسرے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقیب علی رضی اللہ عنہ۔

تو اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں سے ہی وابستہ ہے مگر محدثین کے نزدیک یہ حدیث ضعیف بلکہ نا قابل اعتماد ہے۔ اس لیے کہ اس کی سند میں ایک راوی حسین الاشقر ہے اور یہ کذاب اور متروک الحدیث ہے۔ ❸

امام بخاری رحمہ اللہ نے اگرچہ اس واقعہ سے متعلق کوئی روایت نہیں بیان فرمائی مگر انبیاء علیہم السلام کے تذکرہ میں اس واقعہ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مقدم رکھا ہے اور آیت کو نقل کر کے صرف حل لغات کر دیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن کثیر اور امام بخاری

---

❶ پادریوں کے مناصب اور عہدے ہیں۔
❷ تفسیر ابن کثیر سورۂ یٰسین ج ۳ و فتح الباری ج ۶۔
❸ فتح الباری ج ۶۔

Marfat.com

کا رجحان یہ ہے کہ یہ واقعہ حضرت مسیح علیہ السلام سے قبل [1] کا ہے اور غالباً یہی صحیح ہے۔

الحاصل واقعہ کی جزئی تفصیلات کچھ بھی ہوں قرآن نے اس سلسلہ میں جو حصہ نقل کیا ہے وہ اس مقصد عظمیٰ کو پورا کرتا اور اہل مکہ اور ارباب بصیرت کو عبرت بصیرت کی دعوت دیتا ہے کہ وہ اس سے فائدہ اٹھائیں اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام رشد و ہدایت سے اصحاب قریہ کی طرح منہ موڑ کر خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ کا سبب نہ بنیں، اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَلْبَابِ۔

رحمان:

اصحاب قریہ اگرچہ مشرک اور بت پرست تھے مگر ان میں مذہب حق کی کچھ جھلک موجود تھی اور ان کے یہاں رحمان کا تصور پایا جاتا تھا کیا عجب ہے کہ بمصداق آیت: ﴿وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ﴾ (الفاطر: ٢٤) کوئی قوم ایسی نہیں کہ جہاں ہمارا نذیر نہ پہنچا ہو وہ اس دعوت سے قبل عرصہ تک کسی پیغمبر صادق کے پیرو رہے اور آہستہ آہستہ زمانہ دراز کے بعد شرک میں مبتلاء ہو گئے ہوں۔

موعظت:

① ہدایت وضلالت کے معاملہ میں ہمیشہ سے اہل باطل کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ خدا کا پیغمبر انسان نہیں ہونا چاہیے بلکہ کسی مافوق الفطرت ہستی کو "رسول اللہ" ہونا چاہیے اسی لیے قوم نوح علیہ السلام سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت دعوت تک ہر ایک گروہ نے سب سے پہلے اسی پر تعجب یا نفرت کا اظہار کیا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہماری ہی طرح کا انسان اور لوازمات بشری کا محتاج انسان خدا کا پیغمبر ہو۔ چنانچہ اصحاب قریہ کی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکین مکہ نے بھی یہی کہا:

﴿مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ﴾ (الفرقان: ٧)

"یہ کیسا رسول ہے کہ ہماری طرح کھاتا پیتا اور ہماری ہی طرح بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔"

﴿اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا﴾ (التغابن: ٦)

"کیا انسان ہماری ہدایت کریں گے۔"

﴿وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى اِلَّا اَنْ قَالُوْا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا﴾

(بنی اسرائیل: ٩٤)

"اور حقیقت یہ ہے کہ جب کبھی اللہ کی ہدایت (دنیا میں) ظاہر ہوئی تو صرف اسی بات نے لوگوں کو ایمان لانے سے روکا کہ متعجب ہو کر کہنے لگے کیا اللہ نے (ہماری طرح کا) ایک آدمی پیغمبر بنا کر بھیج دیا ہے۔"

مگر ان کے اس جاہلانہ سوال کا قرآن عزیز نے یہ فیصلہ کن جواب دے کر ہمیشہ کے لیے اس بحث کا خاتمہ کر دیا:

---

[1] فتح الباری ج ٦ وتفسیر ابن کثیر ج ٣۔

Marfat.com

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۝﴾

(بنی اسرائیل: ۹۵)

"اے پیغمبر! کہہ دے کہ اگر ایسا ہوتا کہ زمین میں انسانوں کی جگہ فرشتے بسے ہوتے اور اطمینان سے چلتے پھرتے ہوتے تو ہم ضرور آسمان سے ایک فرشتہ پیغمبر بنا کر اتار دیتے"۔

یعنی اس سوال کی بنیاد ہی بے وقوفی پر مبنی ہے اس لیے کہ جب دنیا میں انسان بس رہے ہیں اور فرشتوں کی آبادیاں نہیں ہیں تو پھر ان کی ہدایت کے لیے رسول اور پیغمبر بھی انسان ہی ہونا چاہیے نہ کہ فرشتہ۔

(۲) جہاں شر و فساد اور فتنہ و گمراہی کے جراثیم بہ کثرت موجود ہوتے ہیں وہاں خیر و سعادت کی بھی کوئی روح ضرور نکل آتی ہے اور وہ کلمہ حق کی تائید میں جان کی بازی لگا دینے سے بھی گریز نہیں کرتی چنانچہ جس طرح اصحاب یٰسین کی حمایت میں شہر کے آخری حصہ سے ایک نیک مرد نکل آیا اور اس نے اپنی قوم کو نصیحت کی اور اس صلہ میں جان دی اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قیام مصر کے زمانہ میں بھی شہر کے دور دراز سے ایک نیک مرد بھاگ کر آیا تھا اور اس نے موسیٰ علیہ السلام کی حفاظت جان کے لیے نیک صلاح دے کر اپنا فرض ادا کیا تھا، ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝﴾۔

(۳) حق و باطل کے معرکہ میں حق کی حقانیت اور باطل کی بطالت کا ایک کھلا ہوا مظاہرہ یہ ہوتا ہے کہ حق جوں جوں دلائل و براہین کی روشنی میں اپنی صداقت کو جلوہ گر کرتا جاتا ہے باطل اسی درجہ زیادہ مشتعل ہو کر اور حق کی روشنی سے خیرہ ہو کر دلائل کی جگہ جنگ و جدل پر آمادہ ہو جاتا ہے مگر حق کے پرستار اس کی مطلق پرواہ نہیں کرتے بلکہ وفور جوش اور والہانہ شوق کے ساتھ حق پر جان قربان کر دیتے ہیں، چنانچہ اصحاب قریہ کا واقعہ اس کی بولتی ہوئی شہادت ہے۔

حضرت لقمان

(۳۰۰۰ ق م)

○ لقمان ○ قرآن عزیز اور حضرت لقمان ○ نبوت یا حکمت چند تفسیری مطالب ○ حکمت لقمان ○ مواعظ

لقمان:

لقمان یا حکیم لقمان، اہل عرب کے یہاں ایک مشہور شخصیت ہے لیکن اس کے باوجود ان کے حالات اور خاندان ونسب سے متعلق مختلف اقوال پائے جاتے ہیں اور اس اتفاق کے علاوہ کہ وہ ایک بہت بڑے دانا (حکیم) تھے اور ان کے حکیمانہ اقوال صحیفہ لقمان کے نام سے ان کے درمیان معروف ومشہور تھے ان سے متعلق باقی امور میں متضاد آراء پائی جاتی ہیں۔

اور یہ اس لیے کہ تاریخ قدیم میں لقمان نام کی ایک اور شخصیت کا پتہ چلتا ہے جو عاد ثانیہ (قوم ہود علیہ السلام) میں ایک نیک بادشاہ ہوگزرا ہے اور خالص عرب نژاد ہے۔ ابن جریر، ابن کثیر، سہیلی جیسے مؤرخین کی رائے یہ ہے مشہور لقمان حکیم افریقی النسل تھا اور عرب میں ایک غلام کی حیثیت میں آیا تھا، چنانچہ یہ حضرات اس کا نسب نامہ اور حلیہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

ھو لقمان بن عنقا بن سندون او لقمان بن ثار بن سندون۔ ❶

"وہ لقمان بن عنقا یا ثار بن سندون ہے"۔

اور کہتے ہیں کہ وہ سوڈان کے نوبی قبیلہ سے تھا اور پستہ قد، بھاری بدن، سیاہ رنگ تھا۔ ہونٹ موٹے اور ہاتھ پیر بھدے تھے، مگر نہایت نیک، عابد وزاہد، صاحب حکمت اور دانا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو حکمت سے حصہ وافر عطاء فرمایا تھا اور بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں عہدہ قضاء پر مامور ہو گیا تھا۔

عن ابن عباس قال کان عبدًا حبشیًا نجارًا وعن جابر بن عبد الله، قال کان لقمان قصیرًا افطش من النوبة۔ ❷

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے فرماتے تھے کہ لقمان حبشی غلام تھے اور نجاری کا پیشہ کرتے تھے اور جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لقمان پستہ قد، موٹے ہونٹ والے نوبہ کے قبیلے سے تھے"۔

وعن سعید بن المسیب کان لقمان من سودان مصر ذو شافر اعطاه الله الحکمة ومنعه النبوة۔ ❸

"اور سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لقمان مصری سوڈانی تھے اور ان کے ہونٹ بہت موٹے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو اگرچہ نبوت نہیں عطاء کی مگر حکمت ودانائی سے حصہ وافر عطا فرمایا تھا"۔

---

❶ روض الانف ج ۱ وابن کثیر ج ۲ وتفسیر ابن کثیر ج ۳ ❷ ایضاً ❸ تاریخ ابن کثیر ج ۲

عن عبد الرحمن بن حرملہ قال جاء اسود الی سعید بن المسیب یسألہ فقال لہ سعید لا تحزن من اجل انك اسود فانہ کان من اخیر الناس ثلثۃ من السودان بلال و مھجع مولیٰ عمر و لقمان الحکیم کان اسود نوبیًا ذا شافر. ❶

"عبد الرحمان بن حرملہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک حبشی سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کے پاس آنکلا اور کچھ سوال کیا، انہوں نے فرمایا تو اس بات سے دل گیر نہ ہو کہ کالا حبشی ہے اس لیے کہ سوڈانیوں میں تین آدمی دنیا کے بہترین انسان ہوئے ہیں: بلال رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ کا غلام مہجع اور لقمان حکیم جو سوڈانی نوبی تھے اور ان کے لب بہت موٹے اور بھدے تھے۔"

اور مشہور مؤرخ اور صاحب مغازی محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ لقمان حکیم عرب کے مشہور قبیلہ عاد سے یعنی عرب بائدہ کی نسل سے تھے اور غلام نہ تھے بلکہ بادشاہ تھے۔

قال وھب فلما مات شداد بن عاد صار الملك الی اخیہ لقمان بن عاد و کان اعطی اللہ لقمان مالم یعط غیرہ من الناس فی زمانہ اعطاہ حاسۃ مائۃ رجل و کان طویلًا لا یقارب اھل زمانہ.

"وہب بن منبہ کہتے ہیں کہ جب شداد بن عاد کا انتقال ہو گیا تو حکومت اس کے بھائی لقمان بن عاد کو ملی اور اللہ تعالیٰ نے لقمان کو وہ چیز عطاء فرمائی جو اس زمانہ کے انسانوں میں کسی کو نہیں عطا کی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کو سو انسانوں کے برابر ادراک و حاسہ عطاء فرمایا تھا اور وہ اپنے زمانہ کے لوگوں میں سب سے زیادہ طویل قامت تھے۔"

قال ابن وھب قال ابن عباس کان لقمان بن عاد بن الملطاط بن السلك بن وائل بن حمیر نبیًا غیر مرسل. ❷

"وہب کہتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ لقمان بن عاد کا نسب نامہ یہ ہے: ملطاط بن سلک بن وائل بن حمیر اور وہ نبی تھے مگر رسول نہیں تھے۔"

اور لطف یہ ہے کہ ابن جریر اور ابن کثیر بھی اپنی تائید میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہی کا قول نقل کرتے ہیں اور ابن اسحاق بھی ان ہی کے قول کو اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں اور معاصر مؤرخین میں سے مصنف ارض القرآن یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ لقمان حکیم اور لقمان بادشاہ ایک ہی شخصیت ہے اور وہ بلاشبہ عاد ثانیہ کے نیک بادشاہوں میں اور بہت بڑے حکیم و دانا تھے اور عرب میں لقمان کے نام سے جو "صحیفہ" منسوب تھا وہ ان ہی لقمان عاد کا ہے اور وہ اپنے اس دعوے کے مختلف دلائل میں سے ایک دلیل یہ دیتے ہیں کہ شاعر جاہلی سلمی بن ربیعہ کے یہ اشعار اس حقیقت کو بخوبی واضح کرتے ہیں:

اھلکن طسما و بعدہ غذی بھم و ذا جدون ۔۔۔ واھل جاش و مارب "وحی لقمان" والتقون

"حوادث زمانہ نے قبیلہ طسم کو اور اس کے بعد ذا جدون شاہ یمن کو اہل جاش و مارب کو اور قبیلہ لقمان کو مٹا دیا۔"

اس کے بعد فرماتے ہیں:

"اس دوسرے شعر سے نہ صرف لقمان کا عرب ہونا ظاہر ہوتا ہے بلکہ ایک قبیلہ کا مالک، یمن کا باشندہ اور عظمت و شوکت میں سبا کا مقابل اور یہ تمام باتیں لقمان عاد پر صادق آتی ہیں۔"

---

❶ کتاب التیجان ص ۰۰ ❷ ۰۰۰۰

Marfat.com

عاد کا ایک کتبہ جو ۱۸ھ میں ملا تھا، اس میں چند حسب ذیل فقرے ہیں:

"ہم پر وہ بادشاہ حکومت کرتے ہیں جو کمینہ خیالات سے بہت دور اور شریروں کو سزا دینے والے تھے اور ہود علیہ السلام کی شریعت کے مطابق ہمارے واسطے پیدا ہوتے تھے اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے جاتے تھے"۔

"کیا ہم ان آخری الفاظ سے جو کاغذ پر نہیں پتھر پر لکھے پائے گئے ہیں یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے ہیں کہ صحیفہ لقمان، لقمان کے اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے ہوئے تھے"۔ [1]

قرآن عزیز اور حضرت لقمان:

حضرت لقمان کا ذکر قرآن عزیز نے بھی کیا ہے اور قرآن کی ایک سورۃ کا نام اسی تقریب سے سورہ لقمان ہے اور اگرچہ اس نے اپنے پیش نظر مقصد کی خاطر ان کے نسب وخاندان کی بحث میں جانا پسند نہیں کیا تاہم ان کے حکیمانہ مقولات کا جس انداز میں ذکر کیا ہے اس سے لقمان کی شخصیت پر ایک حد تک روشنی ضرور پڑتی ہے، اس لیے مناسب ہے کہ اس کو بیان کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا جائے کہ مسطورہ بالا ہر دو راویوں میں سے کون سی رائے صحیح یا قرین قیاس ہے:

﴿وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَ مَنْ یَّشْكُرْ فَاِنَّمَا یَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ۝۱۲ وَ اِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَ هُوَ یَعِظُهٗ یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕؔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ۝۱۳ وَ وَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰی وَهْنٍ وَّ فِصٰلُهٗ فِیْ عَامَیْنِ اَنِ اشْكُرْ لِیْ وَ لِوَالِدَیْكَ ؕ اِلَیَّ الْمَصِیْرُ ۝۱۴ وَ اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰۤی اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ صَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا ۫ وَّ اتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ ۚ ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۱۵ یٰبُنَیَّ اِنَّهَاۤ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِیْ صَخْرَةٍ اَوْ فِی السَّمٰوٰتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ ۝۱۶ یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَ اْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ انْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ اصْبِرْ عَلٰی مَاۤ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝۱۷ وَ لَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَ لَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝۱۸ وَ اقْصِدْ فِیْ مَشْیِكَ وَ اغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ؕ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ ۝۱۹﴾ (لقمان:۱۲-۱۹)

"اور بلاشبہ ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی (اور کہا کہ) اللہ کا شکر ادا کرو پس جو شخص اس کا شکر ادا کرتا ہے وہ اپنے نفس کے فائدہ کے لیے کرتا ہے اور جو کفر کرتا ہے تو اللہ بے پرواہ ہے مالک حمد ہے اور جس وقت لقمان نے اپنے بیٹے سے نصیحت کرتے ہوئے کہا اے میرے بیٹے اللہ کا شریک نہ ٹھہرا بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے اور ہم نے حکم کیا انسان کو اس کے

[1] ارض القرآن ج ۱ ص ۱۸۱، ۱۸۲

ماں باپ کے بارے میں " کہ اٹھاتی ہے اس کو اس کی ماں تکلیف در تکلیف جھیل کر اور دو برس کے اندر دودھ پلاتے رہنا" یہ کہ میرا شکر گزار بن اور اپنے والدین کا شکر گزار ہو، آخر میری ہی جانب لوٹنا ہے اور اگر تیرے ماں باپ تجھ پر سختی کریں اس بارہ میں کہ میرا شریک ٹھہرا کہ جس کے متعلق وہ نادانی اور جہالت میں ہیں تو اس میں ان دونوں کی پیروی نہ کر اور دنیوی زندگی میں ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کر اور پیروی اس شخص کی کر کہ جو صرف میری ہی جانب رجوع کرتا ہے پھر میری ہی جانب تم سب کو لوٹنا ہے۔ پس میں اس وقت تم کو تمہارے کیے کی خبر دوں گا"۔ اے میرے بیٹے! بلاشبہ اگر رائی کے دانہ کے برابر بھی کوئی چیز چھوٹی ہوتی ہے اور وہ پتھر کے اندر یا آسمانوں یا زمینوں میں کہیں بھی ہو اللہ اس کو لے آتا ہے۔ بے شک اللہ دقیق مشاہدہ کرنے والا اخبردار ہے۔ اے میرے بیٹے! قائم کر نماز کو اور حکم کر بھلائی کا اور برائی سے منع کر اور جو تجھ پر پڑے اس پر صبر کر، بلاشبہ یہ عزائم امور میں سے ہے اور تو اپنے رخساروں کو لوگوں سے (از راہ تکبر) نہ پھیر اور زمین پر اترا کر نہ چل بے شبہ اللہ تعالیٰ کسی تکبر اور شیخی کرنے والے کو دوست نہیں رکھتا اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر و اور اپنی آواز کو نرم و پست کر۔ بے شبہ گدھے کی آواز بہت ہی ناپسندیدہ آواز ہے"۔

ان آیات میں لقمان نے اپنے بیٹے کو جو نصائح کی ہیں اور حکمت و دانائی کی باتیں بتائی ہیں ان میں ان باتوں پر بھی زور دیا ہے کہ ① لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق کے ساتھ پیش آنا چاہیے یہ نہ ہو کہ از راہ غرور منہ موڑ لیا جائے۔ ② اور نہ خدا کی زمین پر اکڑ کر چلو، یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ خدائے تعالیٰ مغرور اور اکڑنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ ③ ہمیشہ رفتار میں متواضعانہ میانہ روی قائم رہنی چاہیے۔ ④ اور آواز کو گفتگو میں نرم رکھو اس لیے کہ چیخنا چلانا انسانوں کا کام نہیں ہے، اگر کرخت اور بے وجہ بلند آواز پسندیدہ چیز ہوتی تو گدھے کی آواز قابل ستائش سمجھی جاتی حالانکہ اس کی آواز بدترین آواز شمار ہوتی ہے۔

حکیم لقمان اگر غلام ہوتے تو اپنے بیٹے غلام زادہ کو یہ نصائح نہ کرتے اس لیے کہ غرور و نخوت، خود بینی و شیخی، کرختگی و خشونت ایسے اوصاف ہیں جو بادشاہوں، شاہزادوں، متمول و صاحب اقتدار انسانوں کے اندر ہی کثرت سے پائے جاتے ہیں اور یہ ناخدا ترس اور نشہ دولت میں چور دولت مندوں ہی کا شیوہ ہو سکتا ہے اور یہ وہ تمام اوصاف و عادات ہیں جو عموماً متکبرین اور جبابرہ کے لیے مخصوص ہیں، غلام اور غلام زادہ کے لیے نہ ان کا موقع ہے اور نہ فرصت، کیونکہ ان کا وقت عزیز تو دوسروں کی نیاز مندی اور خدمت گزاری ہی کے لیے وقف ہوتا ہے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی لیے یہ فرمایا ہے:

تواضع زگردن فرازاں نکوست — گدا اگر تواضع کند خوئے اوست

اس تفصیل کے بعد جو کہ قرآن عزیز سے ماخوذ ہے اب ہم بھی یہ کہتے ہیں کہ بلاشبہ لقمان حکیم اور لقمان عاد ایک ہی شخصیت ہے اور وہ عاد ثانیہ کے نیک نفس بادشاہ اور حضرت ہود علیہ السلام کے پیرو تھے اور حبشی الاصل نہیں بلکہ عربی الاصل تھے اور صاحب سیرت محمد بن اسحاق کی نقل اور شاعر جاہلی سلمی بن ربیعہ کی شہادت اس مسئلہ میں صحیح اور راجح ہیں اور عاد ثانیہ کے زمانہ کے حجری کتبہ میں جو کہا گیا ہے اس سے مراد وہی صحیفہ لقمان ہے جو عرب میں مشہور و معروف تھا۔

ممکن ہے کہ اس موقعہ پر ان مرفوعہ روایات کو پیش کر کے ہمارے دعوے کی تردید کی جائے جن میں نبی اکرم ﷺ سے یہ منقول ہے کہ لقمان حکیم حبشی الاصل تھے۔ مگر واضح رہے کہ صاحب جرح و تعدیل محدثین نے ان روایات کے رفع کو صحیح تسلیم نہیں کیا

Marfat.com

اوران میں سے بعض کو ضعیف اور منکر قرار دیا ہے یعنی محدثین کے نزدیک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ منقول نہیں ہے کہ لقمان حبشی غلام تھے۔

نبوت یا حکمت:

اگرچہ محمد بن اسحاق کی روایت "عن ابن عباس رضی اللہ عنہ" میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت لقمان نبی تھے لیکن قرآن عزیز کا اسلوب بیان اس کی موافقت نہیں کرتا۔ اس لیے کہ سورۂ لقمان میں باوجود اس امر کے کہ ان کی بعض حکیمانہ نصائح اور بلیغانہ وصایا کا ذکر بصراحت مذکور ہے لیکن کسی ایک جملہ میں بھی ایسا اشارہ نہیں پایا جاتا کہ جو ان کی "نبوت" پر دلالت کرتا ہو اسی لیے جمہور کی رائے اس کے خلاف ہے بلکہ خود حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی دوسرا قول اس قول کے خلاف مذکور ہے، چنانچہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اپنی تاریخ میں فرماتے ہیں:

والمشهور عن الجمهور انه كان حكيمًا وليًا و لم يكن نبيًا و قد ذكره الله تعالىٰ فى القران فاثنى عليه وحكى من كلامه فيما وعظ به ولده الذى هو احب الخلق اليه۔ [1]

"اور جمہور کا مشہور قول یہ ہے کہ لقمان خدا کے ولی اور حکیم دانا تھے نبی نہیں تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کا قرآن میں ذکر کیا ہے اور ان کی تعریف کی اور ان کے اس کلام کو بیان کیا جس میں انہوں نے اپنے بیٹے کو جو کہ خدا کی مخلوق میں ان کے لیے سب سے زیادہ محبوب تھا نصیحت کی ہے"۔

﴿وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ﴾ قال يعنى الفقه والاسلام ولم يكن نبيا ولم يوح اليه و هكذا نص على هذا غير واحد من السلف منهم مجاهد و سعيد بن المسيب و ابن عباس. والله اعلم۔ [2]

"﴿وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ﴾ یعنی دانائی اور اسلام اور وہ نبی نہیں تھے اور نہ ان پر وحی نازل ہوئی اور بہت سے سلف سے یہی ثابت ہے مثلاً مجاہد سعید بن مسیب اور ابن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ"۔

چند تفسیری مطالب:

① حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو سب سے پہلے جو اہم نصیحت کی وہ شرک باللہ سے اجتناب اور توحید کا التزام ہے کیونکہ "دین حق" میں یہی وہ حقیقت ہے جو حنیف کو مشرک سے ممتاز کرتی ہے اور شرک ہی ایسا گناہ ہے جو کسی حالت میں بھی قابل بخشش نہیں مگر یہ کہ اس سے تائب ہو جائے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ﴾ (النساء: ۴۸)

"بے شک جو خدا کے ساتھ شریک کرتا ہے اس کو خدائے تعالیٰ نہیں بخشے گا اور کفر و شرک کے علاوہ گناہ جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا"۔

② حضرت لقمان نے شرک کو "ظلم عظیم" فرمایا ہے۔ اس سلسلہ میں بخاری کی ایک روایت ہے، وہ یہ کہ جب یہ آیت نازل ہوئی:

---

[1] ابن کثیر ج ۲ ص ۱۲۵ [2] ایضاً

Marfat.com

﴿ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ ﴾ (سورۃ الانعام:۸۲)

"خدا کی مغفرت ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ خلط ملط نہیں کیا"۔

تو صحابہ رضی اللہ عنہم پر یہ بات بہت شاق گزری اور انہوں نے خدمت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ایسا تو کوئی شخص بھی نہ ہوگا جس نے خدائے تعالیٰ کے احکام کے پیش نظر کچھ نہ کچھ ظلم نہ کیا ہو، تب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انہ لیس بذالك الم تسمع الی قول لقمان ﴿ یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۚ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ۝۱۳ ﴾ [1]

آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کیا تم نے لقمان کا یہ قول نہیں سنا: "اے میرے بیٹے! اللہ کے ساتھ شریک نہ ٹھہرا بلاشبہ شرک بہت بڑا ظلم ہے"۔

مطلب یہ ہے کہ آیت ﴿ لَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ ﴾ میں ظلم سے مراد "شرک" ہے نہ کہ معصیت صغائر و کبائر۔

۳ سورہ لقمان میں ﴿ وَ اِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ ﴾ سے ﴿ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴾ تک اور پھر ﴿ یٰبُنَیَّ ﴾ سے ﴿ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ ﴾ تک حضرت لقمان کے مقولات بیان کیے گئے ہیں اور درمیان میں ﴿ وَ وَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ ﴾ سے ﴿ اُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ تک بطور جملہ معترضہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے تو اس کے لیے وجہ مناسبت یہ ہے کہ جب قرآن نے ایک ایسے واقعہ کا ذکر کیا جس میں باپ نے بیٹے کو پند و نصائح کیے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے امت مرحومہ کو یہ نصیحت کرنا ضروری سمجھا کہ جب کہ باپ اور ماں کی محبت کا یہ عالم ہے کہ وہ دنیوی اور اخروی کسی معاملہ میں بھی اولاد کو بے راہ دیکھنا نہیں چاہتے تاکہ انجام کار اولاد کو دکھ جھیلنا نہ پڑے تو اولاد کے لیے از بس ضروری ہے کہ وہ خدا کی صحیح اور حقیقی معرفت کے بعد سب سے زیادہ والدین کی خدمت اور ان کی رضاء جوئی کو مقدم سمجھے حتیٰ کہ اگر والدین کافر و مشرک ہوں تب بھی اس کا فرض ہے کہ ان کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک تواضع اور نیاز مندی کو ہاتھ سے نہ دے۔ البتہ اگر وہ دین حق سے اعراض اور شرک کے اختیار پر اصرار کریں تو اس کو قبول نہ کرے اس لیے کہ خدا کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت بھی درست نہیں ہے، چنانچہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ((لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق)) لیکن اس معاملہ میں بھی اپنے انکار کے وقت نرمی اور حسن خطابت کو نہ چھوڑے اور درشت کلامی اختیار نہ کرے۔

۴ سورہ لقمان میں جو نصائح مذکور ہیں ان میں حسن خلق اور تواضع کی ترغیب اور کبر، شیخی اور بدخلقی کی مذمت کی گئی ہے۔ حضرت لقمان نے امر و نہی میں ان باتوں کو خصوصیت کے ساتھ اس لیے انتخاب فرمایا ہے کہ کائنات میں جس قدر بھی بھلائی اور برائی پیش آتی ہے ان سب کی جڑ اور بنیاد یہی امور ہیں، چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی امت مرحومہ کو ان امور کی اہمیت پر بہت زیادہ توجہ دلائی ہے۔

حسن خلق:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعثت لاتمم حسن الاخلاق۔ [2]

---

[1] بخاری کتاب التفسیر [2] موطا امام مالکؒ

Marfat.com

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "بے شبہ میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ محاسن اخلاق کو درجہ کمال تک پہنچاؤں"۔

عن ابن عمر رضی اللہ عنهما قیل یا رسول اللہ ﷺ ای المؤمن افضل قال احسنهم خلقاً عن انس قال رسول اللہ ﷺ ان العبد لیبلغ بحسن خلقه درجات الآخرة و شرف المنازل و انه لضعیف العبادة و انه لیبلغ بسوء خلقه درك جهنم وهو عابد.

"حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ کون سا مسلمان سب سے زیادہ صاحب فضیلت ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جوان میں سب سے زیادہ حسن اخلاق رکھتا ہے وہی سب سے زیادہ افضل ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بلاشبہ ایک بندہ باوجود عبادت میں کمزور ہونے کے اپنے حسن اخلاق کی وجہ سے آخرت کے بلند درجات اور منازل علیا کو حاصل کر لیتا ہے اور عابد ہونے کے باوجود بد خلقی کی وجہ سے جہنم پاتا ہے"۔

وقال میمون بن مهران عن رسول اللہ ﷺ ما من ذنب اعظم عند اللہ من سوء الخلق.

"میمون بن مہران نبی اکرم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے نزدیک بد خلقی سے زیادہ بڑا کوئی گناہ نہیں ہے"۔

تواضع:

قال رسول اللہ ﷺ طوبی للاتقیاء الاثریاء الذین اذا حضروا لم یعرفوا و اذا غابوا لم یتفقدوا و اولئك مصابیح مجردون من كل فتنة غبرآء مشتته.

"رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بشارت ہے نیکوکار بے نفس لوگوں کے لیے جن کی حالت یہ ہے کہ مجلس میں موجود ہوں تو کوئی تعارف نہ کرے اور جب غائب ہو جائیں تو کوئی تلاش نہ کرے۔ یہی ہیں روشن چراغ اور ہر تاریک و پراگندہ فتنہ سے محفوظ"۔

کبر و غرور:

عن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: ((لا یدخل الجنة من كان فی قلبه مثقال ذرة من كبر)).

"عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جنت میں وہ شخص ہرگز داخل نہ ہوگا جس کے قلب میں ذرہ کی مقدار بھی غرور و کبر ہوگا"۔

عن عبداللہ بن عمرو قال رسول اللہ ﷺ من كان فی قلبه مثقال ذرة من كبر اكبه اللہ علی وجهه

بیہقی ✿ معجم طبرانی مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۵، تفسیر ابن کثیر

تفسیر ابن کثیر ج ۳ ✿ اصحاب السنن

فی النار۔ ❶

"حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی کبر ہے اس کو اللہ تعالیٰ جہنم میں اوندھے منہ گرادے گا"۔

عن بریدۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من جر ثوبہ خیلاء لم ینظر اللہ الیہ۔ ❷

"حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص اپنے لباس کو از راہِ غرور زمین پر کھینچتا ہوا چلتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی جانب نظر رحمت سے نہ دیکھے گا"۔

⑤ حضرت لقمان نے درشت اور کرخت آواز سے بات چیت کرنے کو بھی منع فرمایا ہے اور یہ بھی واضح بات ہے اس لیے کہ نرم گفتاری حسن خلق کا شعبہ اور درشت و کرخت لہجہ بدخلقی کا جز ہے، اور اسی بناء پر اس طرز گفتگو کو "صوت حمار" سے مشابہ بتایا گیا اور نہیق حمار کے متعلق یہ حدیث بہت معروف و مشہور ہے:

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا سمعتم صیاح الدیکۃ فاسئلوا اللہ من فضلہ و اذا سمعتم نہیق الحمیر فتعوذوا باللہ من الشیطان فانہا رات شیطانًا۔ ❸

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم مرغ کی آواز سنو تو اللہ تعالیٰ سے فضل طلب کرو اور گدھے کی آواز سنو تو شیطان سے پناہ مانگو اس لیے کہ وہ شیطان کو دیکھ کر آواز کرتا ہے"۔

یعنی مرغ کی آواز ملائکۃ اللہ کے نزول کی دلیل ہے کیونکہ وہ سحر میں تسبیح کا عادی ہے اور حمار کی آواز نزول شیطان کا پتہ دیتی ہے اس لیے کہ ہر مکروہ اور فطرت سلیم کو ناگوار شے شیطان کے لیے محبوب ہے۔

⑥ حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو جو نصائح کی ہیں ان میں یہ بھی کہا ہے کہ "زمین پر اکڑ کر نہ چلو" اس مضمون کو قرآن عزیز نے دوسری جگہ عجیب انداز سے بیان کیا ہے:

﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۚ إِنَّكَ لَن تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَن تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا ۝﴾ (بنی اسرائیل:۳۷)

"اور زمین پر اتراتا ہوا نہ چل تو اپنے اس انداز رفتار سے نہ زمین کو پھاڑ سکے گا اور نہ پہاڑوں کی چوٹیوں تک طویل ہو جائے گا"۔

مغرور انسان کے انداز رفتار کو کس معجزانہ بلاغت کے ساتھ ادا کیا ہے گویا وہ اس طرح چلتا ہے کہ اپنی اکڑی ہوئی بلند گردن کے ذریعہ پہاڑوں کی بلندی سے بھی اونچا ہو جانا چاہتا ہے اور قدم کو اس طرح زمین پر رکھتا ہے کہ گویا اس کو پھاڑ ڈالے گا۔ مگر یہ نہیں سمجھتا کہ وہ ان میں سے کوئی بات بھی نہ کر سکے گا پھر بلاوجہ اکڑ کر چلنے کے کیا معنی؟

اور اس کے برعکس متواضع اور بااخلاق انسانوں کی یہ کیفیت ہے کہ

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمَٰنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا ۝﴾ (الفرقان:۶۳)

---

❶ اصحاب السنن ❷ مسلم ❸ تفسیر ابن کثیر ج ۸ ص ۱۱

Marfat.com

"اور جو رحمان کے بندے (یعنی حکم بردار بندے) ہیں وہ زمین پر وقار اور تواضع کے ساتھ چلتے ہیں اور جب ان سے جاہل لوگ مخاطب ہوتے ہیں تو وہ (جہالت سے بچنے کے لیے) السلام کہہ کر الگ ہو جاتے ہیں"۔

حکمت لقمان:

گزشتہ سطور میں یہ ذکر آچکا ہے کہ عرب میں حکمت لقمان کا کافی چرچا تھا اور وہ اکثر مجالس میں ان کے حکیمانہ اقوال کو نقل کرتے رہتے تھے چنانچہ تابعین صحابہ بلکہ نبی اکرم ﷺ سے بھی اس سلسلہ کے بعض اقوال منقول ہیں اور ان میں سے چند حسب ذیل ہیں:-

① حکمت و دانائی مفلس کو بادشاہ بنا دیتی ہے۔ ② جب کسی مجلس میں داخل ہو تو اوّل سلام کرو پھر ایک جانب بیٹھ جاؤ اور جب تک اہل مجلس کی گفتگو نہ سن لو خود گفتگو شروع نہ کرو، پس اگر وہ خدا کے ذکر میں مشغول ہوں تو تم بھی اس میں سے اپنا حصہ لے لو اور اگر وہ فضولیات میں مشغول ہوں تو وہاں سے علیحدہ ہو جاؤ اور دوسری کسی عمدہ مجلس کو حاصل کرو۔ ③ اللہ تعالیٰ جب کسی کو امانت دار بنائے تو امین کا فرض ہے کہ اس امانت کی حفاظت کرے۔ ④ اے بیٹے! خدا تعالیٰ سے ڈر اور ریاکاری سے خدا کے ڈر کا مظاہرہ نہ کر کہ لوگ اس وجہ سے تیری عزت کریں اور تیرا دل حقیقتاً گنہگار ہے۔ ⑤ اے بیٹے! جاہل سے دوستی نہ کر کہ وہ یہ سمجھنے لگے کہ تجھ کو اس کی جاہلانہ باتیں پسند ہیں اور دانا کے غصہ کو بے پرواہی میں نہ ٹال کہ کہیں وہ تجھ سے جدائی نہ اختیار کر لے۔ ⑥ واضح رہے کہ داناؤں کی زبان میں خدا کی طاقت ہوتی ہے، ان میں سے کوئی کچھ نہیں بولتا مگر یہ کہ اس بات کو اللہ تعالیٰ اسی طرح کرنا چاہتا ہو۔ ⑦ اے بیٹے! خاموشی میں کبھی ندامت اٹھانی نہیں پڑتی اور اگر کلام چاندی ہے تو سکوت سونا ہے۔ ⑧ بیٹا ہمیشہ شر سے دور رہو تو شر تم سے دور رہے گا، اس لیے کہ شر سے ہی شر پیدا ہوتا ہے۔ ⑨ بیٹا غیظ و غضب سے بچو اس لیے کہ شدت غضب دانا کے قلب کو مردہ بنا دیتی ہے۔ ⑩ بیٹا! خوش کلام بنو، طلاقت وجہ اختیار کرو تب تم لوگوں کی نظروں میں اس شخص سے بھی زیادہ محبوب ہو جاؤ گے جو ہر وقت ان کو داد و دہش کرتا رہتا ہے۔ ⑪ نرم خوئی دانائی کی جڑ ہے۔ ⑫ جو بوؤ گے وہی کاٹو گے۔ ⑬ اپنے اور اپنے والد کے دوست کو محبوب رکھو۔ ⑭ کسی نے لقمان سے دریافت کیا سب سے زیادہ صابر کون شخص ہے؟ کہا جس کے صبر کے پیچھے ایذاء نہ ہو۔ پھر دریافت کیا سب سے بڑا عالم کون ہے؟ جواب دیا جو دوسروں کے علم کے ذریعہ اپنے علم میں اضافہ کرتا رہے۔ پھر سوال کیا: سب سے بہتر آدمی کون ہے؟ فرمایا: "غنی"۔ سائل نے پھر کہا: غنی سے مالدار مراد ہے؟ جواب میں کہا: نہیں! بلکہ غنی وہ ہے جو اپنے اندر خیر کو تلاش کرے تو موجود پائے ورنہ خود کو دوسروں سے مستغنی رکھے۔ ⑮ کسی نے دریافت کیا بدترین انسان کون سا ہے؟ فرمایا: جو اس کی پرواہ نہ کرے کہ لوگ اس کو برائی کرتا دیکھ کر برا سمجھیں گے۔ ⑯ بیٹا تیرے دسترخوان پر ہمیشہ نیکوکاروں کا اجتماع رہے تو بہتر ہے اور مشورہ صرف علمائے حق ہی سے لینا۔ ❶

---

❶ تفسیر ابن کثیر ج ۳، تاریخ ابن کثیر ج ۳، ماخوذ از امام احمد

Marfat.com

مواعظ:

① انسان اگر نبی معصوم اور پیغمبر بھی نہ ہو مگر حکمت و دانائی سے مشرف ہو تب بھی خدا کے نزدیک اس کا مرتبہ عظیم الشان ہے، اسی لیے حضرت لقمان کو یہ عزت ملی کہ خدائے تعالیٰ نے قرآن عزیز میں ان کی ثناء و توصیف فرمائی اور امت مرحومہ کے لیے ان کی بعض ان نصائح اور وصایا کو نقل فرمایا جو انہوں نے اپنے بیٹے کو کی تھیں حتیٰ کہ قرآن کی ایک سورۃ ان کے نام سے منسوب ہوئی۔

② شرک باللہ تمام بھلائیوں کو مٹا کر انسان کو خدا کے سامنے خالی ہاتھ لے جاتا ہے اس لیے ہمیشہ اس سے پرہیز لازم ہے۔ شرک جلی کی طرح شرک خفی بھی اعمال انسانی کو اس طرح کھالیتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھالیتی ہے اور شرک خفی میں ریاء، نمائش اور شہرت پسندی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

③ والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی عظمت کو اسلام میں اس درجہ اہمیت حاصل ہے کہ قرآن عزیز نے ان کو رب مجازی کہا ہے اور ان کی خدمت اور ان کے سامنے سر نیاز جھکا دینے کو والدین کے اسلام و کفر دونوں حالتوں میں ضروری قرار دیا ہے اور اسی اہمیت کے پیش نظر جگہ جگہ اپنے حق یعنی توحید باللہ کے ساتھ ساتھ حقوق والدین کا ذکر کیا اور ان کو تمام حقوق پر مقدم رکھا۔ چنانچہ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے:

﴿وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّ لَا تَنْهَرْهُمَا وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ۝﴾ (بنی اسرائیل: ۲۳-۲۵)

"اور حکم کر چکا تیرا رب کہ اس کے سوا کسی کو نہ پوجو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو، اگر پہنچ جائے تیرے سامنے بڑھاپے کو ان میں سے ایک یا دونوں تو ان کو "اُف" بھی نہ کہو اور نہ ان کو جھڑکو اور ان سے ادب کے ساتھ بات کرو اور ان کے سامنے عاجزی کے ساتھ کاندھے جھکا دو نیاز مندانہ طریقہ پر اور کہو اے ربّ! ان پر رحم کر جس طرح پالا انہوں نے مجھ کو چھوٹا سا۔ تمہارا رب خوب جانتا ہے جو تمہارے جی میں ہے اگر تم نیک نفس ہو گے تو وہ رجوع ہونے والوں کو بخشتا ہے"۔

اور والدین کے ساتھ حسن سلوک سے متعلق احادیث تو بہت کثرت سے ذخیرۂ حدیث میں پائی جاتی ہیں حتیٰ کہ یہ کہا گیا ہے کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ [1]

---

[1] نسائی شریف

Marfat.com

اصحاب سبت

(۱۱۰۰ ق۔م تخمیناً)

○ قرآن عزیز اور اصحاب سبت ○ سبت اور اس کی حرمت ○ واقعہ کی تفصیلات تعین مقام ○ زمانہ حادثہ ○ چند تفسیری حقائق ○ حقیقت مسخ ○ مسخ شدہ اقوام کا انجام دنیوی ○ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور عکرمہ کا مکالمہ ○ بصائر

قرآن عزیز اور اصحاب سبت:

قرآن عزیز میں اصحاب سبت کا ذکر سورۂ بقرہ، نساء، مائدہ اور اعراف میں کیا گیا ہے جس کی تفصیل ذیل کے نقشہ سے ظاہر ہوتی ہے:

شمار	سورہ	آیات	عدد
۱	بقرہ	۶۵، ۶۶	۲
۲	نساء	۴۷	۱
۳	مائدہ	۶۰	۱
۴	اعراف	۱۶۳، ۱۶۶	۴، ۸

سبت اور اس کی حرمت:

قصص القرآن کے گذشتہ مباحث میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے "دین حنیف" یعنی خدا کے سچے دین کی تعلیم کا سلسلہ ان کی دو شاخوں بنو اسمٰعیل اور بنو اسحاق کے ذریعہ قوموں اور ملکوں میں پھیلا ہے اس لیے ان دونوں سلسلوں میں "شعائر اللہ" کے متعلق یکساں اصول پائے جاتے ہیں مگر حضرت اسحاق علیہ السلام کے صاحبزادہ اسرائیل (یعقوب) علیہ السلام کی اولاد نے جو کہ بنی اسرائیل کہلاتی ہے اپنے زمانہ کے انبیاء علیہم السلام سے اختلاف اور جھگڑے کر کے بعض معاملات میں تشدد اور سختی کے احکام اور بعض معاملات میں ملت ابراہیمی سے جدا احکام کا بار اپنے کاندھوں پر ڈال لیا تھا۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی امت میں عبادت الٰہی کے لیے ہفتہ کے سات دنوں میں سے جمعہ کا دن مقرر فرمایا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں یہود، بنی اسرائیل نے اپنی روایتی کج روی کی بنا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ اصرار کیا کہ ان کے لیے ہفتہ (سنیچر) کا دن "عبادت" و برکت کا دن مقرر کر دیا جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلے تو ان کو ہدایت فرمائی کہ وہ اپنے غلط اصرار سے باز آ جائیں اور ملت ابراہیمی کے اس امتیاز کو جو

Marfat.com

خدائے برتر کے نزدیک پسندیدہ ومقبول ہے" ہاتھ سے ضائع نہ ہونے دیں لیکن جب ان کا اصرار حد سے متجاوز ہو گیا تو وحی الٰہی نے موسیٰ علیہ السلام کو یہ اطلاع دی کہ خدائے تعالیٰ ان کے اصرار بے جا کے نتیجہ میں جمعہ کی سعادت و برکت کو ان سے واپس لے لیتا اور ان کے مطالبہ کو منظور کرتے ہوئے ان کے لیے ہفتہ (سنیچر) کو جمعہ کا قائم مقام بنائے دیتا ہے۔ لہٰذا اب آپ ان کو مطلع کر دیں کہ وہ اپنے اس مطلوبہ دن کی عظمت کا پاس ولحاظ کریں اور اس کی حرمت کو قائم رکھیں، ہم اس دن میں ان کے لیے خرید وفروخت زراعت وتجارت اور شکار کو حرام کرتے اور اس کو صرف عبادت کے لیے مخصوص کیے دیتے ہیں۔

قرآن عزیز نے بھی مختصر الفاظ میں اس اختلاف کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے ہفتہ میں عبادت کے لیے ایک دن مخصوص کرنے کے متعلق اپنے پیغمبر (موسیٰ علیہ السلام) کے ساتھ کیا تھا:

﴿اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝﴾ (النحل: ١٢٤)

"بیشک سبت کا دن ان لوگوں کے لیے (عبادت کا دن) مقرر کیا گیا جو اس کے متعلق جھگڑا کرتے تھے اور یقیناً تیرا رب ضرور قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ کر دے گا کہ جس کے متعلق وہ اختلاف کرتے تھے اس میں حق کیا تھا اور باطل کیا؟"

چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے تقرر سبت (سنیچر) کے بعد بنی اسرائیل سے عہد و میثاق لیا کہ وہ اس کی حرمت کو برقرار رکھیں گے اور عبادت الٰہی کے سوا ان باتوں کو اس دن میں اختیار نہیں کریں گے جن کو اللہ تعالیٰ نے ان پر حرام کر دیا ہے:

﴿وَ قُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَ اَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝﴾ (النساء: ١٥٤)

"اور ہم نے ان (بنی اسرائیل) سے کہا: سبت (ہفتہ) کے بارہ میں حد سے نہ گزرنا (خلاف ورزی نہ کرنا) اور ہم نے ان سے اس کے متعلق بہت سخت قسم کا عہد و پیمان لیا"۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہم دنیا میں سب سے آخر آنے والے آخرت میں سب سے مقدم ہوں گے خصوصاً اہل کتاب سے جو کہ ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں اور یہ (جمعہ کا دن) ہم سب سے پہلے ان اہل کتاب پر فرض کیا گیا تھا مگر انہوں نے اس کے متعلق اختلاف ظاہر کیا اور ہم کو اللہ تعالیٰ نے اس (جمعہ کے دن) کو قبول کر لینے کی ہدایت و توفیق دی سو دنیا میں بھی وہ اس معاملہ میں ہم سے پیچھے رہ گئے اس لیے کہ یہود کا روز عبادت جمعہ سے ایک دن بعد (سنیچر) ہے اور نصاریٰ کا اس کے بعد (اتوار) کا دن ہے۔ ❶

عن ابی هريرة و حذيفة رضی الله عنهما قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ((اضل الله عن الجمعة من كان قبلنا فكان لليهود يوم السبت و كان للنصارٰى يوم الاحد فجاء الله بنا فهدانا الله ليوم الجمعة فجعل الجمعة والسبت والاحد و كذٰلك هم تبع لنا يوم القيٰمة نحن الاخرون من اهل الدنيا والاولون يوم القيٰمة

❶ بخاری۔ شاہ ولی اللہ نے اس حدیث کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ منجانب اللہ تو یہ حکم ہوا تھا کہ ہفتہ میں سے ایک روز عبادت کے لیے مقرر کرلو اور تعیین ام کی فطرت پر چھوڑ دی گئی تھی چنانچہ تمام امم کے مقابلہ میں صرف ہم نے ہی جمعہ کا انتخاب کیا۔

Marfat.com

والمقضی بینھم قبل الخلائق))۔ ❶

"حضرت ابوہریرہ اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہما نے فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو ہم سے پہلے گزر چکے جمعہ کے دن سے محروم کر دیا۔ سو یہود کے لیے سبت (سنیچر) کا دن ٹھہرا اور نصاریٰ کے لیے اتوار کا، پھر اللہ تعالیٰ نے ہم کو دنیا میں بھیجا اور جمعہ کے دن کے متعلق ہماری راہنمائی فرمائی اور اس طرح جمعہ سنیچر اور اتوار علیحدہ علیحدہ امتوں کے لیے مقرر ہو گئے لہٰذا اسی طرح یہ سب امتیں قیامت کے دن ہماری تابع ہوں گی اور ہم جو دنیا میں آخر میں ہیں قیامت میں پاداش عمل کے اعتبار سے مقدم ہوں گے اور تمام مخلوق سے قبل ہمارا ہی فیصلہ ہوگا"۔

سبت کی حرمت کے متعلق موسوی قانون میں بنی اسرائیل کو کیا ہدایات تھیں وہ تورات کے اس بیان سے بھی ظاہر ہوتی ہیں:

"پھر خداوند نے موسیٰ سے ہم کلام ہو کے کہا تو بنی اسرائیل کو فرما اور ان کو کہہ کہ تم میرے سبتوں کو مانو اس لیے کہ یہ میرے اور تمہارے درمیان تمہارے قرنوں میں نشانی ہے تاکہ تم جانو کہ خداوند تمہارا پاک کرنے والا ہوں پس تم سبت کو مانو اس لیے کہ وہ تمہارے لیے مقدس ہے جو کوئی اس کو پاک نہ جانے وہ ضرور مار ڈالا جائے جو اس میں کچھ کام کرے وہ اپنی قوم سے کٹ جائے۔ چھ دن کام کرنا لیکن ساتواں دن آرام کے لیے سبت ہے وہ خداوند کے لیے مقدس ہے۔ پس بنی اسرائیل سبت کو مانیں اور اسے اپنی پشت در پشت عہد ابدی جان کے اس میں آرام کریں میرے اور بنی اسرائیل کے درمیان یہ علامت ابدی ہے"۔ ❷

واقعہ کی تفصیلات:

غرض ایک طویل مدت تک یہود بنی اسرائیل اپنے مطلوبہ روز عبادت (سبت) کی عزت و حرمت میں خدا کے لیے ہوئے عہد و پیمان پر قائم رہے اور جن باتوں کو اس دن میں حرام کر دیا گیا تھا ان سے بچتے رہے، مگر آہستہ آہستہ ان کی کج روی اور متمردانہ سرکشی بروئے کار آتی گئی اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ان احکامات کی "جو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت سبت سے متعلق ان پر لازم کیے گئے تھے" خلاف ورزی شروع کر دی اور اگرچہ شروع میں یہ خلاف ورزی انفرادی اور خفیہ طریق پر ہوتی رہی مگر رفتہ رفتہ اس نے علی الاعلان جماعتی حیثیت اختیار کر لی اور بے خوفی اور بے باکی کے ساتھ اس کو کیا جانے لگا، بلکہ بہانے حیلے تراش کر اپنی اس بدعملی پر فخر کیا جانے لگا، تب خدا کے عذاب نے ان کو آ پکڑا اور وہ ذلت و رسوائی کے ساتھ ہلاک کر دیے گئے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد مبارک سے عرصہ دراز کے بعد بنی اسرائیل کی ایک جماعت بحر قلزم کے کنارے آباد ہو گئی تھی چونکہ یہ لوگ ساحل کے باشندے تھے اس لیے مچھلی ان کا قدرتی شکار تھا اور وہ اس کو بہت محبوب مشغلہ سمجھتے اور اس کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتے تھے، یہ لوگ ہفتہ کے چھ دن مچھلی کا شکار کھیلتے اور سبت کا روز عبادت الٰہی میں صرف کرتے۔ اس لیے قدرتی طور پر مچھلیاں چھٹے روز جان بچانے کی خاطر پانی کی تہہ میں پوشیدہ رہتیں اور سبت کے روز پانی کی سطح پر تیرتی نظر آتی تھیں۔ ساتھ ہی خدائے تعالیٰ نے اس طریقہ سے ان کو آزمایا اور ان کی قوت ایمانی کا امتحان لیا حتیٰ کہ سبت کے علاوہ ہفتہ کے

❶ مسلم شریف
❷ خروج باب ۳۱ آیات ۱۲-۱۷

Marfat.com

باقی دنوں میں مچھلیوں کا حاصل ہونا مشکل تر ہو گیا اور چھٹے دن یہ کیفیت رہنے لگی کہ گویا قلزم میں مچھلی کا نام ونشان باقی نہیں رہا مگر سبت کے روز وہ اس کثرت سے پانی پر تیرتی نظر آتیں کہ جال اور کانٹے کے بغیر ہاتھوں سے باآسانی گرفت میں آسکتی تھیں۔

کچھ دنوں تک تو یہود اس حالت کو صبر آزما طریقہ پر دیکھتے رہے، آخر نہ رہ سکے اور ان میں سے بعض نے خفیہ طریقوں سے ایسے حیلے ایجاد کر لیے کہ جس سے یہ بھی ظاہر نہ ہو سکے کہ وہ سبت کے احکام کی خلاف ورزی کر رہے ہیں اور سبت کے دن مچھلیوں کی کثرت آمد سے بھی فائدہ اٹھا لیں۔ چنانچہ بعض تو یہ کرتے کہ جمعہ کی شام کو قلزم کے قریب گڑھے کھود لیتے اور دریا سے ان گڑھوں تک نہر کی طرح ایک گول نکال لیتے اور جب سبت کے روز سطح آب پر مچھلیاں تیرنے لگتیں تو وہ دریا کے پانی کو کھول دیتے تاکہ پانی گڑھوں میں چلا جائے اور اس طرح مچھلیاں بھی پانی کے بہاؤ سے ان میں چلی جائیں اور جب سبت کا دن گزر جاتا تو یک شنبہ (اتوار) کی صبح کو ان مچھلیوں کو گڑھوں میں سے نکال کر کام میں لاتے۔

اور بعض یہ کرتے کہ جمعہ کے روز دریا میں جال اور کانٹے لگا آتے تاکہ سبت کے روز ان میں مچھلیاں پھنس جائیں اور اتوار کی صبح کو ان جالوں اور کانٹوں میں گرفتار مچھلیوں کو پکڑ لاتے اور یہ سب اپنی ان ترکیبوں پر بے حد مسرور نظر آتے تھے، چنانچہ جب ان کے علمائے حق اور مخلصین امت نے ان کو اس حرکت سے روکا تو انہوں نے معترضین کو یہ جواب دیا کہ خدا کا حکم یہ ہے کہ سبت کے دن شکار نہ کرو لہٰذا ہم اس کی تعمیل میں سبت کے دن شکار نہیں کرتے بلکہ اتوار کے روز کرتے ہیں، باقی یہ ترکیبیں منع نہیں ہیں اور اگرچہ ان کا دل اور ضمیر ملامت کرتا تھا کج روی یہ جواب دے کر ان کو مطمئن کر دیتی تھی کہ ہمارا یہ حیلہ خدا کے یہاں ضرور چل جائے گا۔

اصل بات یہ تھی کہ وہ دین کے احکام پر صداقت وسچائی کے ساتھ عمل نہیں کرتے تھے اور اسی لیے شرعی حیلے نکال کر ان کے امتثال سے بچنا چاہتے تھے، گویا خود فریبی میں مبتلا تھے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے تھے، چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ ان چند حیلہ جو انسانوں کی ان حرکات کا علم دوسرے حیلہ ساز افراد کو بھی ہوا اور انہوں نے بھی ان کی تقلید شروع کر دی اور آخر کار بستی کی ایک بہت بڑی جماعت بہ بانگ دہل ان حیلوں کی آڑ میں سبت کی حرمت کی خلاف ورزی کرنے لگے۔

اس جماعت کی یہ ذلیل حرکات دیکھ کر بستی ہی میں سے ایک سعادت مند جماعت نے کر ہمت چست کی اور ان کے مقابل آ کر ان کو اس بدعملی سے باز رکھنے کی کوشش کی اور اس طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ادا کیا مگر انہوں نے کچھ پرواہ نہیں کی اور اپنی حرکت پر قائم رہے، تب سعادت مند جماعت کے دو حصے ہو گئے، ایک نے دوسرے سے کہا کہ ان لوگوں کو نصیحت کرنا اور سمجھانا بے کار ہے اور یہ باز آنے والے نہیں، کیونکہ یہ اس کام کو اگر گناہ سمجھ کر کرتے تب تو یہ توقع تھی کہ شاید کسی وقت باز آ کر تائب ہو جائیں۔ لیکن جب کہ یہ شرعی حیلے تراش کر اپنی بدعملی پر نیکی کا پردہ ڈالنا چاہتے ہیں تو ہم کو یقین ہوتا جاتا ہے کہ اس جماعت پر بہت جلد خدا کا عذاب آنے والا ہے، یا یہ ہلاک کر دیے جائیں گے اور یا کسی سخت عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے۔ لہٰذا اب ان سے کوئی تعرض نہ کرو۔

یہ سن کر سعادت مند جماعت کے دوسرے حصہ نے کہا کہ ہم اس لیے ان کو برابر نصیحت کرتے رہنا چاہتے ہیں کہ فردائے قیامت میں اپنے پروردگار کے سامنے یہ عذر پیش کر سکیں کہ ہم نے آخر وقت تک ان کو سمجھایا اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ادا کیا، لیکن انہوں نے کسی طرح نہیں مانا، ہم مایوس نہیں ہیں بلکہ توقع رکھتے ہیں کہ عجب نہیں کہ ان کو توفیق نصیب ہو جائے اور یہ اپنی بدعملی سے باز آ جائیں۔

Marfat.com

بہر حال حیلہ جو جماعت اپنے حیلوں پر قائم رہی اور سبت کی حرمت اور اس دن میں شکار کی ممانعت کے احکام سے قطعاً غافل اور بے پروا ہو کر نڈر اور بے باک ہو گئی، تب اچانک غیرت حق کو حرکت ہوئی اور مہلت کے قانون نے گرفت کی صورت اختیار کر لی، یعنی خدائے تعالیٰ کا حکم ہو گیا کہ جس طرح تم نے میرے قانون کی اصل صورت و شکل کو حیلوں کے ذریعہ مسخ کر دیا قانون پاداش عمل کے مطابق اسی طرح تمہاری صورت و شکل بھی مسخ کر دی جاتی ہے تاکہ "پاداش عمل از جنس عمل" کے مظاہرے سے دوسرے لوگ بھی عبرت و بصیرت حاصل کریں، چنانچہ حق جل مجدہٗ نے "کُنْ" کے اشارہ سے ان کو بندر اور خنزیر کی شکلوں میں مسخ کر دیا اور وہ انسانی شرف سے محروم ہو کر ذلیل و خوار حیوانوں میں تبدیل ہو گئے۔

مفسرین کہتے ہیں کہ سعادت مند جماعت کا جو حصہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتا رہا اس نے جب یہ دیکھا کہ متمرد اور سرکش جماعت کسی طرح حق پر کان نہیں دھرتی تو مجبور ہو کر اس نے ان سے ترک تعاون کر لیا اور کھانا پینا اور خرید و فروخت غرض ہر قسم کا اشتراک عمل ختم کر دیا حتیٰ کہ اپنے مکانوں کے دروازوں تک کو ان پر بند کر دیا تاکہ کسی قسم کا بھی اشتراک باقی نہ رہے چنانچہ جس دن بدکرداروں پر عذاب الٰہی نازل ہوا تو ان کے معاملہ کی اس جماعت کو گھنٹوں خبر نہ ہوئی۔ لیکن جب کافی وقت گزر گیا اور اس جانب سے کسی انسان کی نقل و حرکت محسوس نہ ہوئی تب ان کو خیال ہوا کہ معاملہ دگرگوں ہے، لہٰذا وہاں جا کر دیکھا تو صورت حال اس درجہ عجیب تھی کہ جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، یعنی وہاں انسانوں کی جگہ بندر اور خنزیر تھے جو اپنے ان عزیزوں کو دیکھ کر قدموں میں لوٹتے اور اپنی حالت زار کا اشاروں سے اظہار کرتے تھے۔ سعادت مند جماعت نے باحسرت و یاس ان سے کہا کہ کیا ہم تم کو بار بار اس خوفناک عذاب سے نہیں ڈراتے تھے۔ انہوں نے یہ سنا تو حیوانوں کے طرح سر ہلا کر اقرار کیا اور آنکھوں سے آنسو بہاتے ہوئے اپنی ذلت و رسوائی کا دردناک نظارہ پیش کیا:

﴿وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ۝۶۵ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۶۶﴾ (البقرۃ: ۶۵، ۶۶)

"اور (اے گروہ یہود) تم بلاشبہ (اپنے پیش رووں میں سے) ان لوگوں کو اچھی طرح جانتے ہو جو سبت کے بارہ میں احکام الٰہی کی حدود سے متجاوز ہو گئے تھے اور ہم نے ان کے لیے کہہ دیا تم ذلیل بندر ہو جاؤ پس ہم نے اس بستی کے ان بدبخت لوگوں کو گردوپیش کے لوگوں کے لیے عبرت اور خدا سے ڈرنے والوں کے لیے نصیحت و موعظت بنا دیا"۔

﴿وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۚ كَذٰلِكَ ۚ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝۱۶۳﴾

"اور (اے پیغمبر!) بنی اسرائیل سے اس شہر کے بارہ میں پوچھو جو سمندر کے کنارے واقع تھا اور جہاں سبت کے دن لوگ خدا کی ٹھہرائی ہوئی حد سے باہر ہو جاتے تھے سبت کے دن ان کی (مطلوبہ) مچھلیاں پانی پر تیرتی ہوئی ان کے پاس آ جاتیں مگر جس دن سبت نہ مناتے نہ آتیں۔ اس طرح ہم انہیں آزمائش میں ڈالتے تھے بہ سبب اس نافرمانی کے جو وہ کیا

کرتے تھے"۔ (الاعراف:۱۶۳)

﴿وَ اِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا
مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖۤ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ
وَ اَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَـِٔيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۵﴾ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ
كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۱۶۶﴾﴾ (الاعراف:۱۶۴-۱۶۶)

"اور جب اس شہر کے باشندوں میں سے ایک گروہ نے (ان لوگوں سے جو نافرمانوں کو وعظ و نصیحت کرتے تھے) کہا تم ایسے لوگوں کو (بیکار) نصیحت کیوں کرتے ہو جنہیں (ان کی شقاوت کی وجہ سے) یا تو خدا ہلاک کر دے گا یا نہایت سخت عذاب میں مبتلاء کرے گا انہوں نے کہا" اس لیے کرتے ہیں تاکہ تمہارے پروردگار کے حضور معذرت کر سکیں (کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا) اور اس لیے بھی کہ شاید یہ لوگ باز آ جائیں" پھر جب ایسا ہوا کہ ان لوگوں نے وہ تمام نصیحتیں بھلا دیں جو انہیں کی گئی تھیں تو ہمارا مواخذہ نمودار ہو گیا ہم نے ان لوگوں کو تو بچا لیا جو برائی سے روکتے تھے مگر شرارت کرنے والوں کو ایک ایسے عذاب میں ڈالا کہ محرومی و نامرادی میں مبتلاء کرنے والا عذاب تھا بہ سبب ان نافرمانیوں کے جو وہ کیا کرتے تھے پھر جب وہ اس بات میں حد سے زیادہ سرکش ہو گئے جس سے انہیں روکا گیا تھا تو ہم نے کہا بندر ہو جاؤ ذلت و خواری سے ٹھکرائے ہوئے"۔

﴿قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيْهِ وَ جَعَلَ مِنْهُمُ
الْقِرَدَةَ وَ الْخَنَازِيْرَ وَ عَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿۶۰﴾﴾ (المائدہ:۶۰)

"(اے پیغمبر!) کہہ دیجئے کیا میں تم کو بتاؤں کہ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک جزاء کے اعتبار سے کون سب سے بدتر ہو گا، وہ شخص ہو گا جس پر خدا نے لعنت کی اور اس پر غضبناک ہوا اور وہ جس میں سے اس نے بندر اور خنزیر کی شکل میں مسخ کر دیئے اور جس نے ان میں سے شیطان (یا بت) کی پوجا کی۔ یہی ہیں بدترین مرتبہ والے اور سیدھے راستہ سے بہت دور بھٹکے ہوئے (یعنی اے بنی اسرائیل ہم بدترین جزاء کے مستحق نہیں ہیں بلکہ تم ہو جن کے یہ کچھ اعمال و اطوار ہیں)"۔

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا
عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾﴾ (النساء:۴۷)

"اے اہل کتاب تم اس کتاب پر ایمان لاؤ جو ہم نے تم پر اتاری ہے جو اس کی تصدیق کرنے والی ہے جو تمہارے پاس ہے (یعنی توراۃ) اس سے پہلے ایمان لاؤ کہ ہم چہروں کو مٹا ڈالیں اور ان کی پیٹھ پر ان کو لگا دیں یا ہم ان پر لعنت کریں جس طرح ہم نے سبت والوں پر لعنت کی اور اللہ کا حکم پورا ہو کر رہنے والا ہے"۔

Marfat.com

تعیین مقام:

جس بستی پر یہ حادثہ گزرا اس کا نام کیا ہے؟ قرآن عزیز، سورۂ اعراف میں صرف یہ بیان کرتا ہے کہ وہ ساحل بحر پر واقع تھی "القریة التی کانت حاضرة البحر" مگر مفسرین نے اس کی تعیین میں متعدد نام لیے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت یہ نقل کی جاتی ہے کہ یہ مدین کا واقعہ ہے اور ابن زید کہتے ہیں کہ اس کا نام متنا تھا اور یہ مدین اور عینونا کے درمیان واقع تھا۔ [1]

اور عکرمہ، مجاہد، قتادہ، سدی، کبیرا اور ایک روایت میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ منقول ہے کہ اس بستی کا نام ایلہ تھا اور یہ بحر قلزم کے ساحل پر واقع تھی، عرب جغرافیہ داں کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص طور سینا سے گزر کر مصر کو روانہ ہو تو طور سینا کی جانب ساحل بحر پر یہ بستی ملتی تھی یا یوں کہہ لیجیے کہ مصر کا باشندہ اگر مکہ کا سفر کرے تو راہ میں یہ شہر پڑتا تھا، یہی قول راجح ہے۔ [2]

زمانہ حادثہ:

شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہٗ) اور ان کے اتباع میں بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں پیش آیا ہے لیکن ابن جریر، ابن کثیر، ابوحیان اور امام رازی (رحمہم اللہ) جیسے جلیل القدر مفسرین کے طرز بیان اور خود قرآن عزیز کے اسلوب سے یہ قول صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس لیے کہ قرآن عزیز نے اس واقعہ کو سورۂ اعراف میں قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے اور وہاں یہ بتایا ہے کہ جب یہ واقعہ پیش آیا تو اہل بستی تین جماعتوں میں تقسیم ہو گئے تھے اور ان میں سے ایک جماعت سرکش اور حیلہ جو نافرمانوں کو راہ ہدایت پر قائم رکھنے کی سعی کر رہی تھی پس اگر یہ واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں پیش آیا تو یہ بات بعید از قیاس اور بعید از اسلوب قرآن تھی کہ وہ ایسے موقعہ پر جب کہ انسانوں کی ایک بہت بڑی جماعت پر مسخ کا عذاب مسلط ہونے کا ذکر کر رہا ہو اس زمانہ کے پیغمبر کا اس سلسلہ میں قطعاً کوئی ذکر نہ کرے اور یہ نہ بتائے کہ نافرمان قوم کے اور ان کے درمیان کیا معاملہ پیش آیا نیز سلف صالحین سے بھی کوئی ایسی روایت موجود نہیں ہے کہ جس سے یہ واضح ہوتا ہو کہ یہ واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں پیش آیا اور نہ تاریخ ہی اس کے لیے کوئی مواد بہم پہنچاتی ہے۔ اس لیے مذکورۃ الصدر جلیل المرتبت مفسرین نے بھی اس واقعہ سے متعلق چاروں مقامات میں سے کسی ایک مقام کی تفسیر میں بھی یہ ذکر نہیں کیا کہ یہ واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں پیش آیا ہے۔ پھر نہیں معلوم کہ حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے یہ کس جگہ سے اخذ فرمایا کہ یہ واقعہ داؤد علیہ السلام کے زمانہ کا ہے ممکن ہے کہ انہوں نے سورۂ مائدہ کی اس آیت سے یہ اندازہ لگایا ہو:

﴿لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝﴾ (المائدہ: ۷۸)

"داؤد اور عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی زبانی بنی اسرائیل میں سے وہ لوگ لعنت کیے گئے جنہوں نے کفر کیا اس لیے کہ وہ نافرمانی کے خوگر تھے اور حد سے گزرے ہوئے تھے۔"

---

[1] تفسیر ابن کثیر سورۂ اعراف و تاریخ ابن کثیر ج ۲ [2] ایضاً فتح الباری ج ۶

Marfat.com

مگر اس آیت سے استدلال صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ اوّل تو اس مقام پر بنی اسرائیل کی عام گمراہی کا تذکرہ ہے۔ خاص سبت کا واقعہ زیر بحث نہیں ہے۔ دوسرے اس میں صرف داؤد علیہ السلام ہی کا ذکر نہیں ہے بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بھی تذکرہ ہے۔ چنانچہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

یخبر تعالٰی انه لعن الکافرین من بنی اسرائیل من دهر طویل فیما انزله علٰی داؤد نبیه علیه السلام و علٰی لسان عیسٰی ابن مریم علیه السلام بسبب عصیانهم لله و اعتدائهم علٰی خلقه قال العوفی عن ابن عباس لعنوا فی التوراة والانجیل و فی الزبور و فی الفرقان.... الخ. ❶

"اللہ تعالیٰ خبر دیتا ہے کہ بنی اسرائیل میں سے کفر کرنے والوں پر داؤد علیہ السلام کی زبانی زبور میں عرصۂ دراز کے بعد لعنت کی گئی اور عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی زبانی بھی انجیل میں اس لیے کہ خدا کی نافرمانیوں، مسلسل سرکشیوں اور مخلوق خدا پر ظلم کرنے کی وجہ سے اسی قابل تھے کہ ان پر لعنت ہوتی رہے (تاکہ دوسرے لوگ عبرت پکڑیں)۔ عوفی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے وہ آیت کی تفسیر میں فرمایا کرتے تھے کہ بنی اسرائیل میں سے کفر کرنے والوں پر توراۃ، انجیل، زبور اور قرآن سب ہی کتابوں میں لعنت کی گئی ہے۔"

الحاصل قرآن کے اسلوب بیان اور جلیل القدر مفسرین کی شرح و تفصیل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اصحاب سبت کا یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کے درمیانی زمانہ میں کسی ایسے وقت پیش آیا جب کہ ایلہ میں کوئی نبی موجود نہیں تھے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ وہاں کے علماء حق ہی کے سپرد تھا اس لیے قرآن عزیز نے صرف ان ہی کا تذکرہ کیا اور کسی نبی یا پیغمبر کا ذکر نہیں کیا۔

چند تفسیری حقائق:

① سورۂ بقرہ میں اصحاب سبت کے تذکرہ میں ہے ﴿نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا﴾ تو ﴿مَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا﴾ سے کیا مراد ہے اس کے جواب میں مفسرین کے متعدد اقوال میں سے بہتر قول حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے یعنی اس سے وہ بستیاں مراد ہیں جو ایلہ کے گردو پیش آباد تھیں اور مشہور تابعی سعید بن جبیر کے قول سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔

عن ابن عباس لما بین یدیها من القرٰی و ما خلفها من القرٰی. ❷

"ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ ایلہ کے سامنے اور پیچھے جو بستیاں ہیں ان کے لیے ہم نے اس کو عبرت بنا دیا"۔

و قال سعید بن جبیر ای من بحضرتها من الناس یومئذٍ. ❸

"اور سعید بن جبیر فرماتے ہیں مراد یہ ہے کہ اس زمانہ میں جو لوگ تھے ایلہ کو ہم نے ان کے لیے سامان عبرت بنا دیا"۔

② اسی واقعہ سے متعلق سورۂ اعراف میں ہے ﴿كَذٰلِكَ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ﴾ یعنی ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ہم نے ان کو امتحان و آزمائش میں مبتلاء کر دیا یہ اس طرف اشارہ ہے کہ جب بنی اسرائیل نے جمعہ کو یوم عبادت تسلیم کرنے سے انکار کر

---

❶ تفسیر ابن کثیر ج ا ❷ ایضاً ❸ ایضاً

Marfat.com

دیا اور سبت (سنیچر) کے یوم عبادت بنائے جانے پر موسیٰ علیہ السلام سے جھگڑا کیا تو ہم نے اگرچہ ان کی بات مان لی لیکن سبت کے معاملہ میں ہم نے ان کو کڑی آزمائش میں ڈال دیا اور آزمائش کا یہ معاملہ مچھلی کے شکار سے متعلق تھا جس کی تفاصیل تم سن چکے ہو۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی یہی تفسیر بیان فرمائی:

ان الله انما افترض علی بنی اسرائیل الیوم الذی افترض علیکم فی عیدکم الیوم الجمعة فخالفوا الی السبت فعظموه و ترکوا ما امروا به کلما ابوا الالزوم السبت ابتلاهم الله فیه. ✿

"اللہ تعالیٰ نے ابتداء میں بنی اسرائیل کی عبادت کے لیے اسی طرح جمعہ کو فرض کیا تھا جس طرح ہم پر فرض کیا ہے مگر انہوں نے مخالفت کر کے اس کو سنیچر کے دن سے بدل لیا اور اس کی عظمت کرنے لگے اور جمعہ کے بارہ میں جو حکم ان کو ملا تھا اس کو نہ مانا پس جب وہ سبت پر اڑ گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سلسلہ میں آزمائش میں ڈال دیا"۔

③ اسی سورہ میں ہے ﴿بِعَذَابٍۭ بَئِيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ﴾ اس آیت کی تفسیر میں دو احتمال بیان کیے جاتے ہیں ایک یہ کہ یہ اجمال ہے اس تفصیلی عذاب کا جو اگلی آیت ﴿كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ﴾ میں بیان ہوا ہے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ اوّل اہل بستی پر ایک نوع کا عذاب آیا تا کہ ان کی آنکھیں کھلیں اور وہ یہ سمجھیں کہ وہ ان حیلوں سے خدا کے احکام کی تعمیل نہیں کر رہے بلکہ اس کے حکم کو منسوخ کر رہے ہیں مگر انہوں نے اس عذاب سے کوئی عبرت حاصل نہیں کی تب ان پر "مسخ" کا عذاب آ گیا۔ جمہور پہلے قول کو ترجیح دیتے ہیں۔

④ سورہ مائدہ میں ہے ﴿جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ﴾ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ معذب گروہ کے نوجوان "بندر" کی شکل میں مسخ کیے گئے اور بوڑھے "خنزیر" کی صورت میں مسخ ہوئے۔ ✿

حقیقت مسخ:

⑤ سورہ بقرہ، مائدہ اور اعراف میں ہے ﴿كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ﴾، ﴿وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ﴾ تو انسان کے بندر یا خنزیر ہو جانے کے کیا معنی ہیں؟ جمہور کی رائے یہ ہے کہ اس سے مسخ حقیقی (صوری) مراد ہے اور مشہور تابعی مجاہد کہتے ہیں کہ اس سے مسخ معنوی مراد ہے یعنی وہ حقیقتاً بندر کی شکل میں تبدیل نہیں ہو گئے تھے بلکہ ان کے قلوب مسخ ہو گئے تھے۔

قال مسخت قلوبهم ولم یمسخوا قردة و انما هو مثل ضربه الله ﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ و هذا سند جید من مجاهد و قول غریب خلاف الظاهر من السیاق فی هذا المقام و فی غیره. ✿

مجاہد کہتے ہیں کہ ان کے قلوب مسخ ہو گئے تھے اور وہ واقعی بندر نہیں بن گئے تھے اور دراصل یہ ایک مثل ہے جیسا کہ قرآن [illegible]ں یہ مثل ہے ﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ یعنی اہل کتاب کے تورات و انجیل پڑھنے اور پھر اس کے مطابق عمل نہ [illegible]رنے کی مثال ایسی ہے کہ گویا گدھے پر کتابیں لدی ہوئی ہیں مجاہد کا یہ قول ان کی جانب صحیح سند سے ثابت ہے مگر یہ غریب انوکھا اور [illegible]را قول ہے اور قرآن کے ان تمام مقامات کے ظاہر کے خلاف ہے جو مختلف سورتوں میں اس سلسلہ میں بیان کیے گئے ہیں۔

✿ [تف]سیر ابن کثیر ج ۱ ✿ ایضاً ✿ ایضاً سورۂ بقرہ

Marfat.com

جمہور کے خلاف مجاہد اپنے اس قول میں منفرد ہیں اور یہ قول ظاہر قرآن کے بھی خلاف ہے اس لیے کہ سورہ بقرہ میں واقعہ مسخ کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ یہ عذاب جس طرح سرکش اور نافرمان لوگوں کی پاداش عمل کے لیے ضروری تھا اسی طرح اس میں یہ بھی حکمت و مصلحت تھی کہ یہ لرزہ براندام کر دینے والا واقعہ گرد و پیش کے رہنے والوں کے لیے بھی سامان عبرت بن جائے، چنانچہ ارشاد ہے: ﴿فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا﴾ پس اگر مسخ کا یہ عذاب صرف مسخ قلوب تک محدود تھا تو گرد و پیش کے بسنے والے کے لیے یہ کس طرح سامان عبرت وخوف بن سکتا تھا کیونکہ قلب کے مسخ ہو جانے کا مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ وہ رشد و ہدایت کے قبول سے محروم ہو جائے اور یہ بات دوسروں کی نگاہ میں مشاہد اور محسوس نہیں ہوا کرتی بلکہ ایک معنوی شے ہے جس کو دوسرا انسان ثمرہ یا نتیجہ اور یا کافی تجربہ کے بعد ہی معلوم کر سکتا ہے۔ نیز عدم قبول ہدایت اور انکار ہدایت کا معاملہ تو کچھ ان ہی لوگوں کے لیے مخصوص نہیں ہے یہ تو ہر پیغمبر کی دعوت و تبلیغ کے وقت پیش آتا رہتا ہے، لہٰذا اگر اصحاب سبت کی پیہم سرکشی کی وجہ سے ان کے قلوب مسخ کر دیے گئے یعنی ان سے قبول ہدایت سلب کر لی گئی تو ان میں وہ کیا خاص بات پیدا ہو گئی تھی کہ جس کی وجہ سے مسخ قلوب کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ تعبیر اختیار فرمائی "كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ"۔

علاوہ ازیں اگر اس تعبیر سے صرف مسخ قلوب ہی مراد ہوتا تو بلحاظ بلاغت یہ کہہ دینا کافی تھا کہ "كُوْنُوْا قِرَدَةً" "تم بندر کی طرح ہو جاؤ" یعنی جس طرح "بندر" انسان نما شریر و خبیث حیوان ہے اسی طرح تم بھی ہو کہ صورت انسانوں کی مگر قلب میں شرارت و خباثت بندر کی سی ہے اور قِرَدَةً کی صفت خٰسِـِٕيْنَ۔ "ذلیل و رسوا بندر" کے اضافہ کی قطعاً ضرورت نہیں تھی اس لیے کہ جب ان کی صورتیں بندر کی شکل میں مسخ ہو کر تبدیل نہیں ہو گئی تھیں تو پھر یہ حکمت صحیح نہیں ہو سکتی کہ اگر فقط قِرَدَةً (بندر) کہا جاتا تو ممکن تھا کہ کسی کے دل میں یہ شبہ باقی رہ جاتا کہ جب کہ بعض پالتو بندر پالنے والوں کی نظروں میں پیارے لگتے ہیں تو کسی انسان کے لیے صرف یہ کہہ دینا کہ وہ بندر سا لگتا ہے مذمت کے موقع پر کافی نہیں ہے اس لیے ضروری ہوا کہ "خٰسِـِٕيْنَ" کہہ کر یہ بتا دیا جائے کہ وہ محبوب بندر نہیں بلکہ ذلیل و رسوا بندر بنا دیے گئے۔

حکمت تو جب ہی صحیح ہو سکتی ہے کہ ان انسانوں کو حقیقی طور پر بندر کی شکل میں مسخ کر دیا گیا ہو اور چونکہ بعض لوگ بندر کی حرکات سے خوش ہو کر ان کو پالتے اور محبوب رکھتے ہیں لہٰذا ان معذب انسانوں کو بندر کی شکل میں بھی اس طرح مسخ کیا گیا کہ دیکھنے والا ان سے گھن کھائے اور ان کا اپنے قریب آنا بھی گوارا نہ کرے۔

مجاہد کا یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ یہ اسی طرح ایک مثل ہے جس طرح ﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ عالم بے عمل کے لیے مثل ہے، یہ قول اس لیے درست نہیں ہے کہ قرآن عزیز نے بعض مواقع میں جو مثالیں بیان کی ہیں یا تو وہ "مثل" کہہ کر ہی بیان ہوئی ہیں مثلاً مسطورہ بالا مثال یا ﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا﴾ منافقین کی مثال یا ﴿مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا﴾ جیسی مثال اور یا وہاں ایسا صاف اور واضح قرینہ موجود ہوتا ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ اس جگہ حقیقت حال کو "مثل" کے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً آیت ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ﴾ میں بتایا گیا ہے کہ جو شخص ہدایت کو سمجھنے کے باوجود قبول نہیں کرتا وہ کانوں سے سنتا ہے مگر اس پر توجہ نہیں کرتا وہ حق کو آنکھوں سے دیکھتا ہے مگر اس سے آنکھیں پھیر لیتا ہے اور اپنی زندگی کو مسلسل ایسی کجروی اور بغاوت پر قائم رکھتا ہے تو اس کی مثال ایسی ہے گویا اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا

Marfat.com

دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے پس یہاں یہ واضح قرینہ موجود ہے کہ مشرکین مکہ کے نہ کانوں پر مہر لگی ہوئی تھی اور نہ دلوں پر اور نہ ان کی آنکھوں پر پردے لٹکے ہوئے تھے لہٰذا آیت کا مطلب یہ ہے کہ عادت اللہ یہ جاری ہے کہ جو سمجھ رکھنے کے باوجود ناسمجھ بنتا، شنوا ہونے کے باوجود ناشنوا ہو جاتا اور بینا ہونے کے باوجود حق سے نابینا بنتا ہے اور اس حالت پر مصر رہتا ہے تو خدائے تعالیٰ کی پاداش عمل کا قانون اس کے قلب، سمع اور بصر کی اس استعداد کو سلب کر لیتا ہے جو قبول حق کے لیے اس کو خلقت و پیدائش کے وقت عطا ہوئی تھیں۔

لیکن زیر بحث مقام پر ﴿كُونُوا قِرَدَةً﴾ کو نہ صاف الفاظ میں مثل کہا گیا ہے اور نہ یہاں کوئی ایسا قرینہ موجود ہے جو "مسخ معنوی" پر دلالت کرتا ہو۔ بلکہ ﴿خٰسِئِيْنَ﴾ کو ﴿قِرَدَةً﴾ کے لیے صفت لانا اس کا قرینہ ہے کہ یہاں بلاشبہ "مسخ حقیقی" مراد ہے۔

نیز یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اگر اصحاب سبت کا معاملہ محض مسخ معنوی کی حیثیت رکھتا ہے تو اس سے متعلق مثل بیان کرنے کے لیے قِرَدَةً (بندر) اور خنزیر (خوک) میں سے کسی ایک حیوان کا ذکر کافی تھا اور ان دونوں میں سے شرارت اور خباثت میں جو زیادہ سمجھا جاتا ہو مثال کے طور پر صرف اسی کو بیان کر دینا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں کیا گیا بلکہ سورۂ مائدہ میں یہ بتایا کہ اصحاب سبت میں سے کچھ تو بندر بنا دیئے گئے اور کچھ خنزیر کی شکل میں مسخ کر دیئے گئے، ﴿وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ﴾۔

یہ ہیں وہ وجوہ جن کی بناء پر ابن کثیر، ابن جریر، ابن حیان، ابن تیمیہ، رازی، آلوسی (رحمہم اللہ) جیسے متقدمین و متاخرین جلیل القدر مفسرین، مجاہد کے انفرادی قول کو قرآن عزیز کے سیاق و سباق کے خلاف قرار دیتے ہوئے جمہور کے قول کی تائید کرتے اور اصحاب سبت سے متعلق آیات میں مسخ حقیقی مراد لیتے ہیں۔ چنانچہ ابن کثیر رحمہ اللہ حضرت عبداللہ بن عباس، قتادہ، ربیع بن انس، ابوالعالیہ، ضحاک رضی اللہ عنہم اور جمہور کے اقوال نقل کرنے کے بعد یہ تحریر فرماتے ہیں:

> قلت والغرض من هذا السياق عن هؤلاء الائمة بيان خلاف ما ذهب اليه مجاهد رحمه الله من ان مسخهم انما كان معنويا لا صوريا بل الصحيح انه معنوي صوري. والله اعلم.
>
> "میں کہتا ہوں ائمہ تفسیر کے بیانات کو ذکر کرنے سے یہ مقصد ہے کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ یہ تمام بالاتفاق مجاہد کے اس قول کے مخالفت ہیں کہ "بنی اسرائیل کی زیر بحث جماعت کا مسخ صرف معنوی تھا حقیقی نہ تھا" کیونکہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ مسخ معنوی اور حقیقی دونوں حیثیت سے تھا"۔

مسئلہ کا یہ پہلو نقل سے تعلق رکھتا ہے، رہا عقلی نقطہ نظر سو اس کے پیش نظر بھی باآسانی کہا جا سکتا ہے کہ ایسا ہو جانا عقلاً ناممکن اور محال نہیں ہے اس لیے کہ اس مسئلہ میں اگر عقلی استعجاب ہو سکتا ہے تو صرف یہی کہ ایک حقیقت کس طرح دوسری حقیقت میں تبدیل ہو سکتی ہے، لیکن تبدیلی حقائق کا یہ مسئلہ قدیم و جدید فلسفہ مسلمات میں سے شمار کیا گیا ہے اور جدید فلسفہ کے نظریہ ارتقاء (The Theory of Evolution) کی اساس و بنیاد تو صرف اسی پر موقوف ہے کہ ایک حقیقت کا دوسری حقیقت میں تبدیل ہو جانا صرف ممکن بلکہ کائنات ہست و بود میں واقع اور درجات ارتقاء کے لحاظ سے ایک حقیقت کا دوسری حقیقت اختیار کر لینا ہمیشہ ہوتا رہتا ہے، پس اگر نظریہ ارتقاء کے اصول پر ایک گوریلا شمپازی قسم کا بندر اپنی حقیقت سے منتقل ہو کر انسانی حقیقت میں بدل سکتا ہے تو انسان کا بندر کی حقیقت میں بدل جانا کیوں محال نظر آتا ہے۔

کیا وہ یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ ہر شے کا ردعمل (Reaction) ممکن بھی ہے اور واقع و مشاہد بھی تو اس اصول پر اگر یہ بھی ثابت ہو جائے کہ جس طرح ایک ادنیٰ حقیقت اعلیٰ حقیقت میں تبدیل ہو جاتی ہے اسی طرح کبھی خصوصی حالات و ناموافق اثرات کی بناء پر اعلیٰ حقیقت، ادنیٰ حقیقت میں منقلب ہو جاتی ہے۔ تو عقلاء جدید کے پاس اس نظریہ کے انکار کے کون سے دلائل ہیں اور یہاں ردعمل (ری ایکشن) کیوں اپنا اثر نہیں کر سکتا؟

آج کی دنیا میں ایک حقیقت کا دوسری حقیقت میں بدل جانا نہ صرف نظریہ اور تھیوری تک محدود ہے بلکہ روزمرہ لاکھوں کی تعداد میں ہوتا رہتا اور مشاہدہ میں آتا رہتا ہے اور یہ اس طرح کہ یہ مسئلہ صدیوں تک پیچیدہ رہا ہے کہ انسان کی پیدائش کا ابتدائی تخم (نطفہ) کن کن مدارج سے گزر کر انسان کی شکل اختیار کرتا ہے اور قرآن عزیز نے اس سلسلہ میں جن مدارج کا ذکر کیا ہے مفسرین قدیم ان مدارج کے حقائق بیان کرنے میں یا اجمال سے کام لیتے رہے ہیں اور یا وقت کی تحقیقات علمی جہاں تک قرآن کا ساتھ دیتی رہی ہیں اس کے مطابق کچھ تفصیلات دیتے رہے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ سب کچھ نظری اور عملی حدود میں محدود تھا اس لیے قرآن عزیز کے بیان کردہ حقائق کی پوری تشریح سامنے نہیں آئی تھی لیکن اب اس مسئلہ میں نظریات سے آگے بڑھ کر علم تحقیقات نے مشاہدہ تک ترقی کر لی ہے اور رحم مادر میں انسانی تخم پر انسان بننے تک جو تطوارت و تحولات گزرتے ہیں ان کو سائنس اور علم طب کے جدید آلات کے ذریعہ مشاہدہ کر کے صحیح طور پر معلوم کر لیا گیا ہے اور یہ ثابت ہو گیا ہے کہ قرآن عزیز نے اس سلسلہ میں نطفہ، علقہ، مضغہ ﴿فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۗ﴾ کی جو تعبیرات ایک نبی امی ﷺ کی معرفت سنائی تھیں حرف بحرف وہی صحیح اور حقیقت نفس الامر کے مطابق ہیں گویا علمی تحقیقات کو صدیوں تک اپنی جگہ سے حرکت کرتے کرتے مشاہدہ کی حد میں پہنچ کر آخر اسی جگہ ٹھہرنا پڑا جو قرآن واضح کر چکا تھا اور اس طرح علمی تحقیق کی اپنی جگہ سے ہٹنا پڑا اور جب تک قرآن کے دیئے ہوئے علم الیقین کے ساتھ مطابقت نہ کر لی اپنی جگہ قائم نہ رہ سکی۔

"پیدائش جنین" کا یہ مسئلہ نشوو ارتقاء کے جن نظریات پر قائم اور عالم مشاہدہ میں آ چکا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ نطفہ جب علقہ، مضغہ اور اسی طرح کے درجات طے کرتا ہے تو یہ اپنے ہر درجہ ادنیٰ میں ایک خاص حقیقت ہوتا ہے اور درجہ عالی میں منتقل ہو کر بالکل دوسری حقیقت بن جاتا ہے اور اسی طرح حقائق کا تحول و انقلاب ہوتا رہتا ہے لیکن یہ تمام انقلابات ایک مہینہ کے اندر اندر اس طرح ہوتے ہیں کہ گویا اس ابتدائی دور میں ایک انسان کا جنین بھی درجات کے لحاظ سے ویسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ نباتات کا جنین، ایک مچھلی کا، ایک چار پائے کا اور ایک بندر کا اور اسی دور کے آخر میں وہ بندر کی اعلیٰ قسم گوریلا اور شمپازی کے جنین کے بالکل مشابہ ہوتا ہے۔

اس کے بعد دوسرے مہینے کے شروع میں ان تمام درجات نباتاتی وحیوانی میں ایک ایسا عظیم الشان انقلاب پیدا ہو جاتا ہے کہ کل تک جو جنین حیوانات کی اعلیٰ قسم کے جنین کے مشابہ تھا یک بیک انسانی حقیقت میں تبدیل ہونے لگتا اور ﴿ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۗ﴾ کا مظاہرہ کر کے اعلان کرتا ہے ﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾ اور پھر پورے سات مہینے تک اس جنین میں قدرت مختلف قسم کی نقاشیاں کرتی رہتی اور اس انسانی ڈھانچہ کو مکمل انسان بناتی رہتی ہے اور "جنین انسانی" میں جو انقلابات حقائق ہوتا رہتا ہے اور وہ ادنیٰ حقیقت چھوڑ کر اعلیٰ حقیقت اختیار کرتا رہتا ہے اگر بعض مرتبہ قدرت الٰہی اپنے مصالح کی بناء پر ﴿خَلْقًا اٰخَرَ﴾ کا پورا مظاہرہ نہیں کرتی

تو آپ سنتے ہیں کہ فلاں شخص کے ایسا بچہ پیدا ہوا ہے جو بیل یا بندر یا بن مانس کی شکل ہے بلکہ بعض مرتبہ بعینہٖ ان حیوانات کی ہی شکل کا بچہ عالم وجود میں آ جاتا ہے تو یہ دلیل ہے اس امر کی قدرت کی صناعی نے اس کو اس لیے ادھورا چھوڑ دیا اور مکمل انسانوں کی شکل میں اس حقیقت کو تبدیل نہیں کیا کہ چشم عبرت اس سے عبرت حاصل کرے اور خدا کا شکر ادا کرے کہ اس نے ہم کو انسان بنایا اور عقل وخرد عطاء فرما کر کائنات سے ممتاز ومشرف فرمایا ورنہ خدا چاہتا تو ہم بھی رحم مادر میں اسی طرح ہو کر رہ جاتے۔ نیز اس حقیقت کی جانب بھی توجہ ہو سکے کہ خود انسان کا جنین بھی کن کن جامہائے حقائق کو ترک کر کے انسانی جامہ پہنتا اور تب "انسان" کہلانے کے قابل بنتا ہے۔

پس اگر تبدیلی حقائق کا یہ مظاہرہ روز وشب کائنات بحر وبر میں ہوتا رہتا ہے تو اگر ایک انسان کے متعلق یہ ثابت ہو جائے کہ خاص حالات وتاثرات نے اس میں یہ ردعمل (ری ایکشن) پیدا کر دیا کہ وہ انسانی شکل وصورت کو چھوڑ کر جو کہ اس کی تخلیق کا سب سے بلند اور آخری انقلاب تھا اپنی خلقت کے اس پچھلے درجہ میں منقلب ہو گیا جو کہ حیوانی شکل سے متعلق ہے تو عقل وفلسفہ کا کونسا نظریہ اس کی تردید کر سکتا ہے؟

بہر حال ایک حقیقت کا دوسری حقیقت اختیار کر لینا عقلاً کوئی مستبعد بات نہیں ہے جو مسئلہ مسخ پر وارد ہو سکے۔ البتہ یہ امر کہ یہ واقعہ درحقیقت پیش آیا یا نہیں، سو اس کا تعلق عقل سے نہیں ہے بلکہ علم تاریخ اور نقل صحیح سے متعلق ہے اور جب کہ قرآن کے علم یقین نے اس واقعہ کا بصراحت اظہار کیا اور جمہور سلف وخلف اس واقعہ کی تفسیر میں مسخ حقیقی کا اعتراف کرتے چلے آتے ہیں تو محض اس لیے کہ عام طور پر ہم ایسے واقعات کا مشاہدہ نہیں کرتے اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ کسی شے کے مشاہدہ نہ کرنے یا اس کے زیر نظر نہ آنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقعہ میں وہ شے موجود نہیں ہے یا نہیں ہو سکتی۔

علاوہ ازیں مشہور طبیب اور ماہر فن زکریا رازی نے جذام (Leprosy) پر بحث کرتے ہوئے اس کی مختلف اقسام میں سے سب سے ردی اور خراب قسم یہ بتائی ہے کہ جسم میں زہر پھیل کر خون اس درجہ فاسد ہو جاتا ہے کہ وہ اعصاب اور شرائین میں تشنج پیدا کر دیتا ہے اور اس کی وجہ سے مریض کا جسم ایک گھناؤنے اور مکروہ صورت بندر کی طرح نظر آنے لگتا ہے اور اس درجہ پر پہنچ کر مرض لاعلاج ہو جاتا ہے۔

زکریا نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ مرض جذام کے متعلق ان کی یہ تحقیق ذاتی کاوش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اطبائے یونان اور قدیم اہل فن نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

لہٰذا کیا عجب ہے کہ بنی اسرائیل کی اس جماعت پر خدائے تعالیٰ کا عذاب اس طرح نازل ہوا کہ ایک جانب تو ان کے قلوب مسخ ہو کر قلوب انسانی کے خواص سے محروم کر دیئے گئے اور دوسری جانب ان کے جسم بدترین جذام کے ذریعہ اس درجہ خراب کر دیئے گئے کہ وہ بندر اور خنزیر کی شکل میں تبدیل نظر آنے لگے، ﴿ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴾۔

اور غالباً یہی وجہ ہے کہ صحیح احادیث میں یہ آتا ہے کہ جو قومیں حیوانات کی شکل میں مسخ ہوئی ہیں وہ تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہیں۔ [1] یعنی مسخ کا عذاب ان کے اندر وظاہر کو اس درجہ فاسد اور گندہ کر دیتا ہے کہ وہ پھر جانبر نہیں ہو سکتیں اور جلد ہی موت کی

---

[1] مسند احمد

Marfat.com

آغوش میں چلی جاتی ہیں۔

اس مقام پر یہ شبہ پیدا نہیں کرنا چاہیے کہ اگر مسخ کو معنی اور صورۃ دونوں حیثیت سے تسلیم کرلیا جائے تو اس سے تناسخ (آواگون) لازم آجاتا ہے حالانکہ یہ باطل اور فاسد عقیدہ ہے، یہ شبہ اس لیے صحیح نہیں ہے کہ تناسخ میں روح (جیو) ایک قالب (کالبد) کو چھوڑ کر دوسرے قالب میں چلی جاتی ہے اور انسانی اعمال نیک و بد کی پاداش میں جون بدلنے کا یہ سلسلہ ازل سے ابدتک یوں ہی قائم ہے اور رہے گا لیکن مسخ کی صورت میں نہ روح بدلتی ہے او نہ قالب بدلتا ہے بلکہ وہی قالب (جسم) ایک خاص ہیئت اور حقیقت سے دوسری حقیقت ہیئت میں تبدیل ہوکر موت کی نذر ہو جاتا اور دوسرے مردہ انسانوں کی طرح مالک حقیقی کے سامنے اپنے اعمال کے جواب دہ ہونے کے لیے عالم برزخ کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔

حضرت ابن عباس اور عکرمہ کا مکالمہ:

عکرمہ رضی اللہ عنہ جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگرد رشید، ذکی وفہیم اور جلیل القدر تابعی ہیں، فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خدمت میں حاضر ہوا، دیکھا کہ ان کی گود میں قرآن عزیز کھلا ہوا رکھا ہے اور ان پر گریہ طاری ہے، یہ دیکھ کر کچھ دیر تو میں ان کی عظمت کی وجہ سے دور بیٹھا رہا مگر جب اس حالت میں ان پر کافی وقت گزر گیا تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے قریب جا کر بعد سلام عرض کیا: اللہ تعالیٰ مجھ کو آپ پر قربان کرے یہ تو فرمایئے کہ آپ کس لیے اس طرح رو رہے ہیں؟ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرمانے لگے: میرے ہاتھ میں جو یہ ورق ہیں مجھ کو رلا رہے ہیں۔ میں نے دیکھا تو سورۂ اعراف کے ورق تھے، پھر مجھ سے فرمایا: تم ایلہ کو جانتے ہو؟ میں نے عرض کیا: جانتا ہوں، اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ اس بستی میں بنی اسرائیل رہتے تھے ان کے یہاں سبت کے دن مچھلیاں پانی کی سطح پر آجاتی تھیں اور سبت کے بعد پانی کی تہہ میں بیٹھ جاتی تھیں اور بمشکل ایک دو ہاتھ آتی تھیں، کچھ دن گزرنے پر شیطان نے ان میں سے بعض کو یہ سکھایا کہ اللہ تعالیٰ نے سبت میں مچھلی کھانے کو منع فرمایا ہے، مچھلی کے شکار کو نہیں منع فرمایا اس لیے انہوں نے یہ کیا کہ سبت کے دن خاموشی کے ساتھ مچھلیاں پکڑ لیتے اور دوسرے دن کھا لیتے۔ جب یہ حیلہ عام ہوگیا تو اہل حق نے ان کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ سبت کے دن مچھلی پکڑنا، شکار کرنا اور کھانا سب منع ہے، لہٰذا تم اس حیلہ جوئی کو چھوڑ دو ورنہ خدا کا عذاب تم کو برباد کر ڈالے گا۔ مگر جب انہوں نے نہ مانا تو اس دوسری جماعت میں سے ایک جماعت اگلے ہفتہ ان سے جدا ہوگئی اور وہ مع اپنے اہل وعیال ان سے دور جا بسے اور ایک اور جماعت نے سبت کی خلاف ورزی کو برا تو جانا مگر مخالفین کے ساتھ ہی رہے سہے اور ان سے ترک تعلق نہیں کیا۔ چنانچہ داہنے بازو (ایمنون) یعنی ترک تعلق کرنے والوں نے جب نافرمانوں کو ڈانٹا اور عذاب الٰہی سے ڈرایا تو بایاں بازو (ایسرون) کہنے لگا: ﴿لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۨ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ﴾ تب (ایمنون) نے جواب دیا: ﴿مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ﴾ بالآخر ایک روز امر بالمعروف کرنے والی جماعت نے مخالفین کو مخاطب کر کے کہا کہ یا تو تم باز آجاؤ ورنہ ہم یقین کرتے ہیں کہ کل تم پر ضرور کوئی عذاب نازل ہوکر رہے گا۔

اس کے بعد سرکشوں پر عذاب نازل ہونے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ میں دو جماعتوں کے مآل اور انجام کا ذکر فرمایا ہے ایک سرکش اور متمرد انسانوں کی جماعت جو ہلاک اور مسخ کر دی گئی اور دوسری (ایمنون) امر بالمعروف

ونہی عن المنکر کرنے والی جماعت کہ اس نے نجات پائی اور عذاب سے محفوظ رہی۔ لیکن تیسری جماعت یعنی ساکتین (ایسرون) کا کوئی ذکر نہیں فرمایا اور میرے دل میں ان کے متعلق ایسے خیالات آتے ہیں کہ میں ان کو زبان سے کہنا پسند نہیں کرتا (یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے چونکہ باز رہے اگرچہ خود خلاف ورزی کے مرتکب نہیں ہوئے لہٰذا وہ بھی کہیں عذاب کے تو مستحق نہیں قرار دیئے گئے اور سرکشوں کے زمرہ میں تو داخل نہیں کر لیے گئے) تب میں نے عرض کیا: میں آپ پر فدا ہو جاؤں آپ اس بارہ میں اس قدر پریشان نہ ہوں بلاشبہ یہ تیسری جماعت بھی نجات پانے والوں میں ہی رہی اس لیے کہ خود قرآن عزیز ان کے متعلق یہ کہتا ہے کہ انہوں نے نصیحت کرنے والوں سے کہا" کہ تم ایسی جماعت کو کس لیے نصیحت کرتے ہو جس کی بداعمالیوں کی بناء پر خدائے تعالیٰ یا ان کو ہلاک کرنے والا ہے اور یا کسی سخت عذاب میں ڈالنے والا ہے"۔ تو ان کے متعلق قرآن عزیز کی یہ تعبیر صاف صاف بتا رہی ہے کہ وہ ہلاک نہیں کیے گئے ورنہ تو ان کا ذکر بھی ہلاک ہونے والوں ہی کے ساتھ کیا جاتا نجات پانے والوں کے ساتھ نہ ہوتا نیز یہ جماعت اس عمل بد کے بدکرداروں کی حرکات سے مایوس ہو کر ایسا کہتی تھی اس لیے بھی مستحق عذاب نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ سنا تو بے حد مسرور ہوئے اور آیات کی اس تفسیر پر مجھ کو خلعت بخشا۔

مسخ شدہ اقوام کا انجام دنیوی:

جو قومیں خدائے تعالیٰ کے عذاب سے مسخ کر دی جاتی ہیں وہ زندہ باقی نہیں رکھی جاتیں، بلکہ تین دن کے اندر اندر ان کو فنا کر دیا جاتا ہے تاکہ ان کی نسل کا سلسلہ جاری نہ ہو اور دنیا میں ان کا وجود خود ان کے لیے بھی عرصہ تک باعث ذلت وخواری نہ رہے، چنانچہ صحیح روایات میں یہ بصراحت موجود ہے:

عن ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال سألنا رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم عن القردة والخنازير من نسل اليهود فقال لا ان الله لم يلعن قوما قط فيمسخهم فكان لهم نسل و لكن هذا خلق كان فلما غضب الله على اليهود فمسخهم مثلهم۔ [1]

"حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم نے دریافت کیا کہ یہ بندر وخوک مسخ شدہ یہود کی نسل میں سے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نہیں! اللہ تعالیٰ جب کسی قوم پر مسخ کی لعنت مسلط کرتا ہے تو اس کی نسل نہیں چلاتا لیکن یہ جانور خدا کی مستقل مخلوق ہیں لہٰذا جب خدا کا غضب یہود پر نازل ہوا تو ان کو ان جانوروں کی شکل میں مسخ کر دیا گیا"۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

لم يمسخ قومًا فيجعل لهم نسلًا ولا عقبًا و ان القردة والخنازير كانت قبل ذلك۔ [2]

"اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو مسخ کرتا ہے تو نہ ان کو باقی چھوڑتا ہے اور نہ ان کی نسل چلتی ہے اور بندر اور خوک تو مسخ کے واقعہ سے قبل بھی موجود تھے"۔

---

[1] مسند احمد ابو داؤد طیالسی، مسلم۔ [2] ایضاً

عن ابن عباس قال ولم یمش مسخ قط فوق ثلث ایام ولم یاکل ولم یشرب ولم ینسل.

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مسخ شدہ انسان تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہے اور نہ انہوں نے اس درمیان میں کھایا پیا اور نہ ان کی نسل کا سلسلہ چلا"۔

بصائر:

① "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" عظیم الشان فریضہ ہے اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد عظیم بھی اسی فرض کو پورا کرنا ہے اور جب کسی قوم اور امت میں کوئی نبی یا رسول موجود نہ ہو تو پھر علمائے امت کے ذمہ واجب ہے کہ وہ اس فرض کو انجام دیں۔ چنانچہ قرآن عزیز اور صحیح احادیث نے بھی امت مرحومہ کو اس فرض کی جانب بہت زیادہ اہمیت کے ساتھ توجہ دلائی ہے اور تعمیل کرنے والے کے اجر و ثواب کی بشارت اور ترک کرنے والے کو مستحق عقاب و وعید قرار دیا ہے:

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ﴾ (ال عمران:۱۱۰)

"تم دنیا کی بہترین امت ہو جو کائنات انسانی کے لیے پیدا کی گئی ہے تاکہ ان کو بھلی باتوں کا حکم کرو اور بری باتوں سے باز رکھو"۔

﴿لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ لِسَانِ دَاوُودَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۚ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ ۝ كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَن مُّنكَرٍ فَعَلُوهُ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝﴾ (المائدہ:۷۹،۷۸)

"بنی اسرائیل میں سے جنہوں نے کفر اختیار کیا ان پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبانی لعنت کی گئی اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے اور خدا کی حدود سے تجاوزت کرتے تھے، وہ بری باتوں سے لوگوں کو نہیں روکتے تھے اور ان کے یہ کردار بہت ہی برے تھے"۔

عن عدی بن عمیرہ یقول سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ لا یعذب العامة بعمل الخاصة حتی یر والمنکر بین ظہر اینہم وہم قادرون علی ان ینکروہ فلا ینکرونہ فاذا فعلوا ذلک عذب اللہ الخاصة والعامة.

"عدی بن عمیرہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: بلاشبہ اللہ تعالیٰ خاص خاص لوگوں کی بداعمالیوں پر عام لوگوں پر عذاب نازل نہیں کرتا البتہ جب ان لوگوں کے سامنے کہ جو ان برائیوں کے روکنے پر قدرت رکھتے ہیں علی الاعلان معاصی ہونے لگیں اور وہ نہ روکیں تو بے شک اس وقت خدا اپنا عذاب عام و خاص سب پر نازل کر دیتا ہے"۔

عن ابی سعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من رائی المنکر فلیغیرہ بیدہ و من لم یستطع فبلسانہ و من لم یستطع فبقلبہ و ذلک اضعف الایمان.

"حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص کسی کو برا عمل کرتا دیکھے تو اس کو چاہیے کہ ہاتھ سے روک دے اور جو اس کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ زبان سے روکے اور جو اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو وہ دل ہی میں اس

Marfat.com

کو برا جانے اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے"۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث اس جانب بھی توجہ دلاتی ہے کہ مسلمانوں میں اتنی قوت اور حاکمانہ اقتدار ضرور ہونا چاہیے کہ وہ اگر کسی کو برے عمل اور بدکرداری میں مبتلاء دیکھیں تو طاقت وقوت سے اس کو روک دیں اور اگر انہوں نے یہ درجہ اپنی کوتاہیوں کی بدولت کھو دیا ہے تو اس درجہ قوت ایمانی ضروری ہے کہ وہ زبان سے اس عمل بد کے خلاف جہاد کر سکے اور اگر اس درجہ سے بھی محروم ہے تو اس کے بعد سوائے اس کے ایمان کا کوئی اور درجہ نہیں ہے کہ وہ کم از کم اس عمل بد کو برا سمجھے اور اس پر اظہار رضا نہ کرے۔ لہٰذا اس حدیث کے الفاظ سے کسی کو یہ شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ جب ایک شخص کو پہلا یا دوسرا درجہ حاصل ہی نہیں تو پھر دوسرا یا تیسرا جو درجہ بھی حاصل ہے اس کے اختیار کر لینے پر وہ ضعیف یا ضعف الایمان کیوں قرار پاتا ہے۔

(۲) انسان کی مختلف گمراہیوں میں سے بہت بڑی گمراہی یہ بھی ہے کہ احکام الٰہی سے بچنے کے لیے حیلے اور بہانے تراش کر حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانے کی سعی کرے کیونکہ اس طرح وہ شریعت حقہ کے اوامر ونواہی کو مسخ کرنے کا مرتکب ہوتا ہے، قرآن اور توراۃ دونوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود اس گمراہی میں بھی پیش پیش اور اس اقدام پر بہت جری تھے اور اسی لیے ان پر مسخ کا عذاب نازل ہوا۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے بیان کردہ اس واقعہ کی روشنی میں امت مرحومہ کو سخت تاکید فرمائی ہے کہ وہ ایسی گمراہی پر ہرگز اقدام نہ کریں اور اپنا دامن عمل اس سے بچائے رکھیں:

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا ترتکبوا ما ارتکبت الیھود فتستحلوا محارم اللہ بادنی الحیل۔ [1]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایسی گمراہی کا ہرگز ارتکاب نہ کرنا جس کا یہود نے ارتکاب کیا کہ اللہ کی حرام کی ہوئی باتوں کو معمولی حیلوں کے ذریعہ حلال کر لیتے تھے (حالانکہ وہ حلال نہیں ہو جاتی تھیں)"۔

مگر افسوس کہ ہم نے آج اس کو بھی اپنا لیا اور یہود کی طرح ہم نے بھی اللہ کے فرائض سے بچنے کے لیے تراش لیے ایسے تمول اور سرمایہ داری کے باوجود کہ جس پر خدا کا حکم ﴿وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ وارد ہوتا صرف زکوٰۃ سے بچنے کے لیے یہ حیلہ نکال لیا کہ اس سرمایہ پر پورا ایک سال اپنی ملکیت نہ ہونے دیا جائے تاکہ "حولان حول" کی شرط پوری نہ ہونے پائے اور چھ ماہ بعد اس کو بیوی کے نام منتقل کر دیا اور اس سلسلہ کو برابر جاری رکھا اور اس طرح ﴿اَلَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ﴾ کا لطف اٹھاتے ہیں۔ اعاذنا اللہ من ذالک۔

البتہ فقہائے امت نے حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانے کی غرض سے نہیں بلکہ امت کو کسی ضیق اور تنگی سے نکالنے کے استنباط اور اجتہاد صحیح کے ذریعے جو بعض آسانیاں ہم پہنچائیں اور جو دراصل صاحب شریعت کے اوامر ونواہی کے مقاصد کو فوت ہونے دیتیں تو وہ اس وعید کا مصداق نہیں ہیں مگر ان مسائل کے لیے "کتاب الحیل" کی تعبیر صحیح نہیں ہے بلکہ ان کا عنوان "باب التسھیل" ہونا چاہیے تھا۔

قرآن عزیز کے مطالعہ سے یہ بآسانی معلوم ہوسکتا ہے کہ خدائے تعالیٰ کی حکمت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہمیشہ "پاداش عمل از جنس عمل" ہو جیسا کہ مسئلہ زیر بحث میں بھی موجود ہے کہ اصحاب سبت نے حیلوں اور بہانوں کے ذریعہ سبت کے قانون کو مسخ اور محرف کر

Marfat.com

دیا تھا لہٰذا ان کے لیے سزا بھی "مسخ" ہی تجویز کی گئی، حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اس حقیقت کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں:

فلما فعلوا ذٰلك مسخهم الله الیٰ صورة القردة وهی اشبه شئ بالاناسی فی الشکل الظاهر و لیست بانسان حقیقة فلذٰلك اعمال هٰؤلاء وحیلتهم لما کانت مشابهة للحق فی الظاهر و مخالفة فی الباطن کان جزاء هم من جنس العمل.[1]

"پس جب یہود نے یہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بندروں کی شکل میں مسخ کر دیا اور یہ اس لیے کہ ظاہر شکل میں بندر انسان سے زیادہ مشابہ ہے اگرچہ حقیقت میں وہ انسان نہیں ہے پس جب کہ ان یہود کے یہ اعمال بد اور حیلے ظاہر میں حق کے مشابہ اور باطن میں اس کے مخالف ہیں تو ان کو سزا بھی جنس عمل ہی سے دی گئی ہے"۔

۴ اداء فرض میں اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے کہ جن کے مقابلہ میں فریضہ ادا کیا جا رہا ہے وہ اس کو قبول کرتے ہیں یا نہیں اس لیے کہ اس کا اداء فرض کی جزاء میں یہ کیا کم سعادت ہے کہ وہ شخص بہرحال اجر و ثواب اور رضاء الٰہی سے معزز و مفتخر ہوتا ہے۔

﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ﴾۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر

Marfat.com

اصحاب الرس

(تقریباً ۶۳۰ ق۔م (یا مدت نامعلوم)

○ رس ○ قرآن عزیز اور اصحاب الرس ○ اصحاب الرس ○ قول راجح ○ موعظت

رس:

لغت میں "رس" کے معنی پرانے کنوئیں کے ہیں، اس لیے اصحاب الرس کے معنی ہوئے "کنوئیں والے"۔ قرآن عزیز نے اس نسبت کے ساتھ ایک قوم کی نافرمانی اور سرکشی کی پاداش میں اس کی ہلاکت و بربادی کا ذکر کیا ہے۔

قرآن عزیز اور اصحاب الرس:

قرآن عزیز نے سورۂ فرقان اور "ق" میں ان کا ذکر کیا ہے اور جن قوموں نے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب و استہزاء کے سبب ہلاکت وتباہی مول لی ان کی فہرست میں صرف ان کا نام بیان کر دیا ہے اور حالات وواقعات سے کوئی تعرض نہیں کیا۔

﴿وَّ عَادًا وَّ ثَمُوْدَاۡ وَ اَصْحٰبَ الرَّسِّ وَ قُرُوْنًۢا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا۝۳۸ وَ كُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ٘ وَ كُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا۝۳۹﴾ (الفرقان: ۳۸، ۳۹)

"اور عاد ثمود اور اصحاب الرس کو اور ان کے درمیانی زمانہ کی بہت سی (قوموں) کو (ہم نے ہلاک کر دیا) اور ہم نے ہر ایک کے واسطے مثالیں بیان کیں اور ہم نے ان سب کو ہلاک کر دیا"۔

﴿كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ اَصْحٰبُ الرَّسِّ وَ ثَمُوْدُ۝۱۲ وَ عَادٌ وَّ فِرْعَوْنُ وَ اِخْوَانُ لُوْطٍ۝۱۳ وَّ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَ قَوْمُ تُبَّعٍ١ؕ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ۝۱۴﴾ (ق: ۱۲، ۱۴)

"ان سے پہلے بھی نوح کی قوم نے اور کنوئیں والوں نے اور ثمود، عاد، فرعون، برادران لوط، اصحاب ایکہ اور تُبّع کی قوم کے (رسولوں کو جھٹلایا، ان میں سے) ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا، پس ان پر عذاب لازم ہوا"۔

اصحاب الرس:

ان کو اصحاب الرس کیوں کہتے ہیں؟ اس کے جواب میں علمائے تفسیر کے اقوال اس درجہ مختلف ہیں کہ حقیقت حال بجائے منکشف ہونے کے اور زیادہ مستور ہوگئی ہے۔

Marfat.com

① ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ چونکہ رس کے معنی "غار" کے بھی آتے ہیں اس لیے اصحاب اخدود (گڑھوں والے) ہی کو اصحاب الرس بھی کہتے ہیں۔
لیکن یہ اس لیے صحیح نہیں ہے کہ سورۂ ق میں اصحاب الرس کا ذکر ان قوموں کے ساتھ کیا گیا ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل ہو گزری ہیں، اور سورۂ فرقان میں عاد، ثمود اور اصحاب الرس کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا ہے ﴿وَ قُرُوْنًۢا بَیْنَ ذٰلِكَ كَثِیْرًا﴾ اور ان کے درمیانی زمانہ کی بہت سی قوموں کو ہلاک کر دیا"۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ اصحاب الرس کا زمانہ کم از کم حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل ہونا چاہیے اور اصحاب الاخدود کا زمانہ عیسیٰ علیہ السلام سے صدیوں بعد ہے۔ علاوہ ازیں قرآن کے ان بیانات میں تصریح ہے کہ اصحاب الرس ہلاک شدہ قوموں میں سے ہیں اور اصحاب الاخدود کے متعلق قول صحیح یہ ہے کہ وہ اپنے مشہور ظلم کے بعد فوراً ہلاک نہیں کیے گئے اور ان کو مہلت اور ڈھیل دی گئی کہ وہ باز آ جائیں ورنہ پاداش عمل کے لیے تیار رہیں، جیسا کہ عنقریب واقعہ تفصیل سے ظاہر ہو جائے گا۔

② ابن عساکر نے تاریخ میں اپنا رجحان اس روایت کی جانب ظاہر کیا ہے کہ اصحاب الرس عاد سے بھی صدیوں پہلے ایک قوم کا نام ہے، یہ جس جگہ آباد تھے وہاں اللہ تعالیٰ نے ایک پیغمبر حنظلہ بن صفوان کو مبعوث کیا تھا، انہوں نے ان میں رہ کر تبلیغ اسلام کی مگر اصحاب الرس نے کسی طرح حق کو قبول نہیں کیا اور پیغمبر خدا کو قتل کر دیا، اس پاداش میں وہ سب ہلاک کر دیئے گئے۔[1] لیکن اس روایت سے یہ بات صاف نہیں ہوتی کہ ان کو "کنویں والے" کیوں کہا گیا اور یہ "نسبت" واقعہ کے ساتھ کیا تعلق رکھتی ہے؟

③ ابن ابی حاتم بروایت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نقل کرتے ہیں کہ آذربیجان کے قریب ایک کنواں تھا یہ قصہ چونکہ اس سے تعلق رکھتا ہے اس لیے وہاں کے بسنے والوں کو اصحاب الرس کہتے ہیں۔ عکرمہ کہتے ہیں کہ اس کنوئیں کے قریب آباد قوم نے اپنے نبی کو چونکہ مسطورۂ بالا کنوئیں میں ڈال کر زندہ دفن کر دیا تھا اس لیے ان کو "اصحاب الرس" کہا گیا۔[2]

④ اور قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یمامہ کے علاقہ میں فلج نام کی ایک بستی تھی، اصحاب الرس وہیں آباد تھے اور یہ اور اصحاب یاسین (اصحاب القریہ) ایک ہی ہیں اور یہ مختلف نسبتوں سے پکارے جاتے ہیں۔[3] ایک روایت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے بھی اس کی تائید میں موجود ہے لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ ابن ابی حاتم اور عکرمہ دونوں کی روایت کا ایک ہی مطلب ہے مگر یہ دونوں رائیں بھی مشکوک ہیں اس لیے کہ قرآن عزیز نے اصحاب القریہ (اصحاب یاسین) اور اصحاب الرس کا تذکرہ جدا جدا کیا ہے اور دونوں تذکروں میں کسی ایک جگہ بھی یہ اشارہ نہیں ہے کہ یہ دونوں ایک ہیں۔ حالانکہ یہ طرز بیان، اصول بلاغت کے خلاف ہے کہ ایک ہی معاملہ کو جدا جدا نسبتوں اور کیفیتوں کے ساتھ بیان کیا جائے اور ان میں سے کسی ایک میں بھی یہ اشارہ موجود نہ ہو کہ یہ مختلف نسبتیں اور تعبیریں ایک ہی معاملہ سے تعلق رکھتی ہیں اور نہ نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ایسی کوئی تفسیر مذکور ہے جو دونوں کو ایک ظاہر کرتی ہو۔ خصوصاً جب کہ قرائن یہ بتا رہے ہیں کہ اصحاب الرس کا معاملہ قبل مسیح علیہ السلام ہے اور تاریخ اور تحقیق یہ ثابت کر چکی ہے کہ اصحاب القریہ کا معاملہ مسیح علیہ السلام کے بہت بعد کا ہے۔[4]

---

[1] تفسیر ابن کثیر سورۂ فرقان و تاریخ ابن کثیر ج ۱ [2] تفسیر ابن کثیر سورۂ فرقان و تاریخ ابن کثیر ج ۱
[3] ایضاً [4] یہ بحث عنقریب آنے والی ہے۔

Marfat.com

⑤ ابوبکر عمر بن حسن نقاش، اور سہیلی کہتے ہیں کہ اصحاب الرس کی آبادی میں ایک بہت بڑا کنواں تھا جس کے پانی سے وہ پینے اور کھیتی سیراب کرنے، دونوں کا کام لیتے تھے۔ اس بستی کا بادشاہ بہت عادل تھا اور لوگ اس سے بے حد محبت کرتے تھے، اس کا جب انتقال ہوگیا تو اہل شہر اس کی موت سے سخت غمگین اور حزین تھے کہ ایک دن شیطان بادشاہ عادل کی شکل بنا کر پہنچا اور اہل شہر کو جمع کر کے تقریر کی کہ میں تم سے کچھ دنوں کے لیے جدا ہوگیا تھا مرا نہیں تھا، اب آ گیا ہوں اور ہمیشہ زندہ رہوں گا۔ لوگوں نے انتہاء محبت میں یقین کر لیا اور اس کی آمد پر جشن منایا۔ تب شیطان نے ان کو حکم دیا کہ وہ ہمیشہ مجھ سے پس پردہ باتیں کیا کریں، چنانچہ اس کے حکم کی تعمیل کی گئی اور وہ پس پردہ بیٹھ کر گمراہی پھیلانے لگا۔ اس وقت بقول سہیلی صاحب "روض الانف" ایک شخص حنظلہ بن صفوان کو خواب میں یہ بتایا گیا کہ ان کو اس آبادی میں راہ ہدایت دکھانے کے لیے پیغمبر بنا دیا گیا۔ صفوان نے ان کے پاس جا کر توحید کی تعلیم اور شرک سے اجتناب کی تلقین کی اور بتایا کہ یہ تمہارا بادشاہ نہیں ہے بلکہ پس پردہ شیطان ہے۔ لوگوں کو یہ بات سخت ناگوار گزری اور قبول حق کی بجائے پیغمبر خدا پر حملہ کر کے ان کو قتل کر دیا، اس پاداش میں ان کو خدا کے عذاب نے تباہ و برباد کر دیا اور کل جس بستی میں چہل پہل تھی اور باغات اور نہروں سے جنگل میں منگل ہو رہا تھا آج وہ جل بھن کر چٹیل میدان نظر آنے لگا، جس میں کتوں بھیڑیوں اور شیروں کے مسکن کے سواء کچھ باقی نہ رہا۔

یہ روایت اصول روایت و درایت دونوں اعتبار سے ساقط الاعتبار ہے اور من گھڑت داستان سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ [1]

⑥ محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((ان اول الناس يدخل الجنة يوم القيامة العبد الاسود)).

"جنت میں سب سے پہلے جو شخص داخل ہوگا وہ ایک سیاہ غلام ہوگا"۔

اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بستی میں اپنا پیغمبر بھیجا مگر اس کالے کلوٹے غلام کے علاوہ کسی نے اس کو قبول نہیں کیا اور کوئی ایمان نہیں لایا، پھر اہل شہر نے اسی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ نبی کو ایک کنوئیں میں بند کر دیا اور کنوئیں کے منہ پر بہت بھاری پتھر رکھ دیا تاکہ کوئی کھول نہ سکے۔ مگر یہ سیاہ فام غلام جنگل سے لکڑیاں لاتا، بازار میں فروخت کرتا اور ان کی قیمت سے کھانا خرید کر روزانہ کنوئیں پر پہنچ کر پتھر کو ہٹاتا اور خدا کے پیغمبر کی خدمت میں کھانا پیش کرتا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس پر جنگل میں نیند طاری کر دی اور یہ چودہ سال تک اسی حالت میں پڑا رہا۔ یہاں تک تو یہ ہوا اور ادھر قوم کو اپنی نازیبا حرکت پر افسوس آیا اور انہوں نے پیغمبر خدا کو کنوئیں سے نکال لیا اور توبہ کے بعد ایمان قبول کر لیا اور اسی مدت کے اندر پیغمبر کا انتقال ہوگیا۔ چودہ سال کے بعد جب غلام کی آنکھ کھلی تو اس نے سمجھا کہ میں چند گھنٹے سویا ہوں، جلدی سے لکڑیاں چن کر شہر پہنچا، دیکھا تو حالات بدلے ہوئے ہیں، دریافت کیا تو سارا واقعہ معلوم ہوا۔ اسی غلام کے متعلق نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں سب سے پہلے ایک سیاہ فام غلام جائے گا۔ [2]

یہ روایت اپنی سند کے لحاظ سے بھی قابل جرح ہے اور درایت کے اعتبار سے بھی۔ چنانچہ محدثین کہتے ہیں کہ یہ طویل

---

[1] تفسیر ابن کثیر سورۂ فرقان البدایہ والنہایہ ج ۱

[2] مروج الذہب ص ۸۶ حاشیہ الکامل ج ۱

داستان خود محمد بن کعب کی جانب سے ہے جس کو انہوں نے اسرائیلیات سے اخذ کر کے بیان کیا ہے۔ نبی معصوم ﷺ کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ علاوہ ازیں قرآن عزیز میں صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ اصحاب الرس بھی ہلاک شدہ قوموں میں سے ہیں اور یہ روایت اس کے خلاف ان کو نجات یافتہ بیان کرتی ہے، اس لیے قطعاً غلط ہے اور روایت کا وہ جملہ جو قوسین میں "عبداسود" سے متعلق ہے اگر بسند صحیح نبی اکرم ﷺ سے ثابت بھی ہو جائے تو بھی اس کا اصحاب الرس کے واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اس روایت کو نقل کرنے کے بعد اس پر اسی قسم کی جرح وارد کی ہے۔

⑦ مشہور مؤرخ مسعودی کہتا ہے کہ اصحاب الرس حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں اور یہ دو قبیلے تھے ایک قید ماں (قید ماہ) اور دوسرا یامین یا رعویل اور یہ یمن میں آباد تھے۔

لیکن مسعودی نے صرف اسی قدر تعارف پر اکتفاء کیا ہے اور تاریخی حیثیت سے نہیں بتایا کہ وہ کن وجوہ کی بناء پر قید ماہ اور رعویل کو اصحاب الرس کہتا ہے اور ان کو "رس" کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹوں میں سے ایک کا نام قید ماہ بھی ہے لیکن توراۃ اور تاریخ دونوں اس بات سے خاموش ہیں کہ اس کی اولاد کو اصحاب الرس بھی کہا جاتا ہے، لہٰذا مسعودی کا قول دلیل کا محتاج ہے۔

مگر صاحب ارض القرآن نے صرف اس بناء پر کہ مسعودی نے اپنی رائے تذبذب اور تردد کے ساتھ بیان نہیں کی اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ [1]

⑧ مصر کے ایک مشہور معاصر عالم فرج اللہ زکی کردی کہتے ہیں کہ لفظ رس "ارس" کی تخفیف ہے اور یہ اس مشہور شہر کا نام ہے جو قفقاز کے علاقہ میں واقع ہے۔ اس وادی ارس میں اللہ تعالیٰ نے ایک نبی کو مبعوث فرمایا جس کا نام ابراہیم زردشت تھا، انہوں نے اپنی قوم کو دین حق کی دعوت دی مگر قوم نے انکار کیا اور ان کی دعوت وارشاد کے مقابلہ میں اور زیادہ سرکشی اور بغاوت اختیار کر لی چنانچہ قوم نے اس کی سزا پائی اور ہلاک کر دی گئی۔ اس کے بعد ان کی دعوت کا میدان عمل اس مخصوص علاقہ قفقاز (آذربائیجان وغیرہ) سے کل ایران تک وسیع ہو گیا، زردشت کا صحیفہ اگرچہ محرف ہو چکا ہے مگر اس کا ایک حصہ اب بھی قدیم فارسی میں مکتوب موجود ہے۔ [2] اور اس صحیفہ میں اب بھی نبی اکرم ﷺ کی بعثت اور دین اسلام کی بشارت کا ذکر پایا جاتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے:

"عنقریب عرب میں ایک "نبی عظیم" مبعوث ہو گا اور جب اس کی شریعت پر ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ گزر جائے گا اور دوسرا ہزار شروع ہو گا تو اس دین میں ایسی باتیں پیدا ہو جائیں گی کہ یہ پہچاننا مشکل ہو جائے گا کہ کیا یہ دین وہی دین ہے جو اپنے قرن اوّل میں تھا (یعنی بدعات واہوا اور رسوم قبیحہ پیدا ہو جائیں گی)"۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زردشت کی اصل اور حقیقی تعلیم "حق" تھی اور اسی لیے انہوں نے بعثت محمد ﷺ کی بشارت دی اور بعض ایسی تفصیلات کا بھی ذکر کیا جو آج حرف بحرف صحیح ثابت ہو رہی ہیں، مگر دوسرے ادیان وملل کی طرح ان کی تبعین نے

---

[1] ارض القرآن ج ۲ ص ۵۶

[2] اوستا کی جانب اشارہ ہے۔

Marfat.com

بھی اس تعلیم حق کو مسخ و محرف کر ڈالا، ان کے متبعین مجوس (پارسی) اب بھی ایران و ہند میں پائے جاتے ہیں۔ ❶

علامہ زکی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ کتب تفسیر میں ایک قول ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی منقول ہے کہ اصحاب الرس آذربائیجان کے قریب ایک کنوئیں کی نسبت سے مشہور تھے لہٰذا ممکن ہے کہ یہ "نہر ارس" ہی سے مراد ہو اور ابن کثیر میں ہے:

واصحاب الرس قال بیربآذربائیجان.

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ آذربائیجان میں ایک پرانا کنواں "رس" تھا اس وادی میں رہنے والے اسی وجہ سے اصحاب الرس کہلاتے تھے۔

بلکہ خود ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں اس آیت ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ﴾ (النساء: ۱۵۰) کے تحت میں زردشت کے متعلق یہ تحریر فرمایا ہے:

والمجوس یقال انھم کانوا یؤمنون بنی لھم یقال لہ زرادشت ثم کفروا بشرعہ فرفع من بین اظھرھم. ❷ واللہ اعلم.

"اور مجوس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے اندر مبعوث پیغمبر زردشت پر اوّل ایمان لے آئے تھے اس کے بعد انہوں نے کفر کی راہ اختیار کر لی۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس پیغمبر کو ان کے درمیان سے اٹھا لیا"۔ واللہ اعلم

ادیان و ملل کی تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ابراہیم زردشت کی اصل تعلیم انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیم حق ہی کے مطابق تھی اور وہ یرمیاہ علیہ السلام یا دانیال (اکبر) علیہ السلام کے تلمیذ اور فیض یافتہ تھے۔ ذوالقرنین کے واقعہ میں ان شاء اللہ تعالیٰ قدرے تفصیل سے اس پر روشنی ڈالی جائے گی۔

قول فیصل:

اس مسئلہ میں قرآن کا ظاہر یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ واقعہ یقیناً حضرت مسیح علیہ السلام سے قبل ہو گزرا ہے۔ اب رہا یہ امر کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان کے زمانہ کی کسی قوم کا تذکرہ ہے یا کسی قدیم العہد قوم کا تو قرآن نے اس سے تعرض نہیں کیا اور مسطورہ بالا تفسیری روایات سے اس کا قطعی فیصلہ ناممکن ہے، البتہ میرا وجدان آخری قول کو راجح سمجھتا ہے۔

بہرحال قرآن کا جو مقصد موعظت و عبرت ہے وہ اپنی جگہ صاف اور واضح ہے اور یہ تاریخی تعینات و مباحث اس کے لیے موقوف علیہ نہیں ہیں بلکہ ایک عبرت نگاہ اور گوش حق نیوش کے لیے یہ کافی و شافی ہے کہ جو قومیں اس دنیا میں خدائے برتر کے پیغام حق کو ٹھکراتی اور اس کے خلاف بغاوت و سرکشی کا علم بلند کرتی ہیں اور مسلسل مہلت اور ڈھیل دینے کے باوجود وہ اپنی متکبرانہ اور مفسدانہ زندگی کو ترک کر کے صالح اور پاک زندگی بسر کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتیں تو پھر ان پر خدائے تعالیٰ کی سخت گرفت "بطش شدید"

---

❶ حاشیہ تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۴۲، ۴۳، ۴۴ مختصراً

❷ تفسیر ابن کثیر ص ۵۵۲

Marfat.com

آ جاتی ہے اور وہ بے یار و مددگار ہلاک و برباد کر دی جاتی ہیں۔

موعظت:

① کائنات انسانی کے پاس جس وقت سے اپنی تاریخ کا ذخیرہ موجود ہے وہ اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہے کہ دنیا کی جس قوم نے بھی خدا کے پیغام حق کے ساتھ استہزاء کا معاملہ کیا اور خدا کے پیغمبروں اور ہادیوں کے ساتھ سرکشی اور شرارت کو جائز رکھا ان کو زبردست طاقت و شوکت اور عظیم الشان تمدن کے باوجود قدرت کے ہاتھوں نے ہلاک و برباد کر کے ان کا نام و نشان تک مٹا دیا اور آسمانی یا زمینی عبرتناک عذاب نے صفحۂ عالم سے ان کو حرف غلط کی طرح محو کر دیا مگر یہ عجیب بات ہے کہ اپنے پیشروؤں کے ہیبت ناک انجام کو دیکھنے اور سننے کے باوجود ان کی وارث قوموں نے پھر تاریخ کو دہرایا اور اسی قسم کی حرکات کو اختیار کیا جن کے انجام میں ان کے پیشروؤں کو روز بد دیکھنا پڑا تھا ﴿إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيبٌ﴾۔

② ایک حساس دل و دماغ کے لیے یہ تازیانہ عبرت کافی ہے کہ اس دنیا میں جب کہ کسی شے کو بقاء نہیں ہے اور ہر شے کے لیے فنا لازم ہے تو پھر کبر و نخوت اور انانیت کے کیا معنی؟ اور جو مقدس ہستیاں اپنے اوصاف کریمانہ اور اخلاق حسنہ کے ساتھ خدمت خلق اور ہدایت و رشد کو بغیر کسی دنیوی لالچ و توقع کے انجام دیتی ہیں ان کے ساتھ تحقیر و تضحیک کا برتاؤ عقل کے کس فیصلہ کے مطابق ہے؟

اگر انسان اس زندگی میں ان دو حقیقتوں کی معرفت حاصل کرے تو حیات ابدی و سرمدی میں کبھی ناکام نہیں رہ سکتا اور یہی وہ رموز زندگی ہیں جن پر گامزن ہو کر قومیں "اصحاب الجنۃ" کہلائیں اور ان سے غافل رہ کر "اصحاب النار" کہلانے کی سزاوار ہوئیں۔

Marfat.com

بیت المقدس اور یہود

(۶۰۴ ق م تا ۵۶۱ ق م و ۷۰ء تا ۱۸ھ)

○ تمہید ○ بیت المقدس (یروشلم) ○ قرآن عزیز اور شرارت یہود کے دو اہم معاملے ○ شرارت یہود کا پہلا دور ○ غلامی کے بعد نجات ○ شرارت یہود کا دوسرا دور ○ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا قتل ○ پاداش عمل ○ تیسرا زریں موقعہ اور یہود کی روگردانی ○ ابدی ذلت وخسران ○ بصائر

تمہید:

جن اصحاب نے قصص القرآن جلد اوّل و دوم کا مطالعہ فرمایا ہے ان کی نظر سے یہ پوشیدہ نہ رہا ہوگا کہ قرآن عزیز اقوام ماضیہ کے تاریخی واقعات یعنی ان کے رشد وہدایت کے قبول وانکار اور اس کے نیک و بد نتائج وثمرات کے حالات پیش نظر لانے اور ان سے عبرت وبصیرت حاصل کرنے کی جگہ جگہ ترغیب دیتا ہے اور خود بھی اسی لیے گزشتہ قوموں کے ان واقعات کو بکثرت بیان کرتا ہے جو اس مقصد عظیم کے لیے مفید اور عبرت آموز ہیں اور اگر ان وقائع میں حقائق کے ساتھ غلط اور دور از کار داستانیں شامل ہوگئی ہیں تو ان کی اصلاح بھی کرتا جاتا ہے۔ چنانچہ بہت سی وہ پیچیدگیاں جو گزشتہ اقوام وامم، ان کے مواطن ومساکن، اور ان سے متعلق حالات میں صحیح اور غلط واقعات کے خلط ملط سے پیدا ہو چکی تھیں قرآن عزیز نے ان کو اس طرح بیان کیا ہے کہ تمام پیچیدگیاں دور ہو کر حقیقت حال روشن سے روشن تر نظر آنے لگی، چنانچہ ان واقعات سے متعلق اصل حقائق کا اظہار ہو جانے کے صدیوں بعد جب علم الآثار (Archaeology) علم طبقات الارض (Geology) اور تاریخی مشاہدات وتجربات کے ذریعہ ان اقوام وامم کے حالات ناقابل انکار درجہ تک روشنی میں آئے تو دنیا کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ قرآن عزیز نے ان سے متعلق جو کچھ کہا تھا وہ حرف بحرف صحیح نکلا اور اس کے بیان میں حقیقت سے سرمو تجاوز ثابت نہیں ہوا۔ رقیم (پیٹرا) کی تاریخ ماضی اصحاب الحجر کے واقعات، عاد وثمود کا تمدن اور مقام تاریخ، موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل اور فرعون مصر کی آویزش کے واقعات اور سدعرم کے حالات، غرض یہ اور اسی قسم کے دوسرے تاریخی وقائع ہیں جو مسطورہ بالا حقیقت کے لیے زندہ جاوید شہادت ہیں۔

پس کیا یہ قرآن عزیز کے کلام الٰہی ہونے کی ایک ناقابل تردید شہادت نہیں کہ ایک "اُمّی" انسان ایک ایسے ملک میں جہاں ہر قسم کے علمی ذرائع مفقود ومعدوم ہیں دنیا کی قوموں کو رشد وہدایت کے سلسلہ میں اقوام ماضیہ اور امم سابقہ کے ایسے تاریخی واقعات سناتا ہے جن کے ایک حرف کی بھی تردید نہیں ہو سکی اور صدیوں تک علمائے تحقیق نے کروڑوں اور اربوں روپیہ اور اپنے قیمتی وقت اور عمر صرف کر کے جب ان حالات کو جدید "علوم اکتشاف" کے ذریعہ مشاہدہ کی حد تک حاصل کیا تو ان کو بالآخر یہ اقرار کرنا پڑا کہ قرآن

نے ان سے متعلق جو کچھ کہا اور جس قدر کہا بلاشبہ علم تحقیق اس کے آگے ایک شوشہ بھی اضافہ نہیں کر سکا، چہ جائیکہ اس کے خلاف ثابت کر سکتا۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ اپنے پیغمبر ﷺ پر گزشتہ اقوام کے حالات ظاہر کر کے عبرت آموز قلب اور بصیرت افروز نگاہ کے لیے بہت کچھ سامان رشد و ہدایت عطاء فرمایا تا کہ موجودہ امم و اقوام، سرکش اور مفسد قوموں کے نتائج بد اور ہولناک پاداش عمل سے عبرت حاصل کریں اور نیکو کار و خیر اندیش قوموں کے حالات و واقعات اور ان کے ثمرات خیر کو اختیار کر کے دین و دنیا کی فوز و فلاح کو اپنا سرمایہ بنائیں اور چونکہ قرآن عزیز کا مقصد صرف موعظت و تذکیر ہے نہ کہ اقوام و امم کی مکمل تاریخ اس لیے اس نے نہ دنیا کی تمام قوموں کی تاریخ بیان کی ہے اور نہ جن قوموں کی تاریخ سے تعرض کیا ہے ان کی پوری تاریخ کو پیش کیا ہے، کیونکہ یہ اس کے موضوع اور مقصد سے خارج ہے اور رشد و ہدایت اقوام کے لیے بلاشبہ ایک مکمل صحیفہ قانون ہے مگر تاریخ و جغرافیہ یا فلسفہ و سائنس کی کتاب نہیں ہے کہ اس میں وہ سب کچھ بھی موجود ہو جس کا فلسفہ و تاریخ کی کتابوں میں ہونا ضروری ہے۔

الحاصل امم ماضیہ کے ان حالات و واقعات میں سے جو بدکردار اور نیک کردار انسانوں کے درمیان امتیاز پیدا کرتے اور قوموں کی انفرادی و اجتماعی اصلاح و انقلاب کے لیے سرمایہ عبرت و بصیرت ثابت ہوتے ہیں ایک اہم واقعہ وہ بھی ہے جو یہود بنی اسرائیل کی پیہم شرارتوں اور فساد انگیزیوں کی بنا پر دو مرتبہ مقدس ہیکل اور یروشلم (بیت المقدس) کی تباہی و بربادی اور خود ان کی غلامی و رسوائی کی شکل میں ظاہر ہوا اور جس نے ان کی قومی ذلت اور اجتماعی ہلاکت پر ہمیشہ کے لیے مہر لگا دی۔

بیت المقدس:

بیت المقدس کی تعمیر کا واقعہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعات کے ضمن میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکا ہے، یہ پاک جگہ اپنے ہیکل (مسجد) کی وجہ سے بنی اسرائیل کا قبلہ رہی ہے اور یہ مقدس مقام بے شمار انبیاء بنی اسرائیل کا مہبط و مدفن ہے اور اس کی عظمت نہ صرف یہود و نصاریٰ ہی کی نگاہ میں ہے بلکہ اس کو مسلمان بھی مقام مقدس مانتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے واقعہ اسراء (معراج) نے اس کے تقدس کو اور بھی زیادہ چار چاند لگا دیئے ہیں اور جب بھی کوئی مسلمان سورہ اسراء کو تلاوت کرتا ہے اس کے قلب میں اس مقام کا تقدس و جلال اثر کیے بغیر نہیں رہتا:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ۝﴾ (بنی اسرائیل: ۱)

"پاکی ہے اس ذات کے لیے جس نے اپنے بندہ (محمد ﷺ) کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک سیر کرائی وہ مسجد اقصیٰ جس کے اطراف کو ہم نے بڑی برکت دی ہے اور اس لیے سیر کرائی کہ اپنی نشانیاں دکھائے بلاشبہ وہی ذات ہے جو دیکھنے والی سننے والی ہے"۔

بیت المقدس کی اس مسجد کو "مسجد اقصیٰ" اس لیے کہتے ہیں کہ وہ مکہ (حجاز) سے بہت دور فاصلہ پر واقع ہے۔
معراج کے واقعہ میں جب قرآن نے "بیت المقدس" کا ذکر کیا تو ساتھ ہی اس جانب بھی توجہ دلائی کہ بنی اسرائیل کی

دعوت وتبلیغ کا یہ مقام اور بنی اسرائیل کا قبلہ صلوٰۃ جو تمہارے نزدیک بھی عظمت وتقدیس سے معمور ہے یہود کی مفسدانہ سرگرمیوں اور احکام الٰہی کے خلاف مسلسل بغاوتوں اور شرارتوں کی وجہ سے دو مرتبہ تباہی و بربادی اور اہانت سے دو چار ہو چکا ہے اور نہ صرف یہ مقام بلکہ خود یہ بھی مشرکوں اور عیسائیوں کے ہاتھوں حد درجہ ذلیل و رسواء ہو چکے ہیں، مگر ان کو پھر بھی عبرت و بصیرت حاصل نہیں ہوئی اور آج جب کہ نبی اکرم ﷺ کی دعوت عامہ ان کو رشد و ہدایت اور دین و دنیا کی عزت وعظمت کا پیغام سنا رہی ہے یہ اس کے ساتھ نفرت وحقارت ہی کا معاملہ کر رہے ہیں اور پہلے سانحوں کی طرح اب بھی غفلت اور سرکشی اختیار کر کے ابدی ذلت وخسران کو دعوت دے رہے ہیں۔

قرآن عزیز کہتا ہے کہ ہم نے کتاب (صحف انبیاء علیہم السلام) میں پہلے سے بنی اسرائیل کو آگاہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ سخت فتنہ وفساد اور سرکشی و بغاوت کرو گے اور خدا کے اس مقدس مقام میں فتنہ ساماں بنو گے اور اس کی پاداش میں دونوں مرتبہ تم کو ذلت و ہلاکت کا منہ دیکھنا پڑے گا اور جس سرزمین کو تم بہت زیادہ محبوب رکھتے ہو یہ بھی دو مرتبہ ظالموں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوگی۔

اس کے بعد ہم پھر ایک مرتبہ تم پر رحم کریں گے اور سعادت وفلاح کی طرف دعوت دیں گے۔ پس اگر تم نے گزشتہ واقعات سے عبرت وموعظت حاصل کر کے اس دعوت حق پر لبیک کہا اور اس کو بطیب خاطر قبول کیا تو دنیا کی کوئی طاقت تمہاری اس سعادت کو نہیں سلب کر سکتی اور اگر تمہاری تاریخی کجروی اور سرکشی اور حق کے ساتھ بغاوت اور مخالفت نے تمہارا ساتھ نہ چھوڑا اور گزرے ہوئے واقعات کی طرح اس مرتبہ بھی تم نے فساد و گمراہی کو اپنایا تو ہماری جانب سے بھی پاداش عمل کا قانون اس طرح پھر دہرایا جائے گا اس کے بعد تم پر ابدی ذلت و رسوائی کی مہر لگا دی جائے گی اور یہ سب کچھ تو دنیا کا معاملہ ہے اور ایسے سرکشوں کے لیے آخرت میں بہت برا ٹھکانا "جہنم" ہے۔

﴿وَ قَضَيْنَاۤ اِلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَ لَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا۝ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَاۤ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ وَ كَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا۝ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَ اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَ جَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا۝ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَ لِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ لِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا۝ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ وَ اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا وَ جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا۝﴾ (بنی اسرائیل: ۴ تا ۸)

"اور ہم نے کتاب (صحف انبیاء) میں بنی اسرائیل کو اس فیصلہ کی خبر دے دی تھی کہ تم ضرور ملک میں شر وفساد پھیلاؤ گے اور بڑی ہی سخت درجہ کی سرکشی کرو گے پھر جب دو وقتوں میں سے پہلا وقت آ گیا تو اے بنی اسرائیل ہم نے تم پر اپنے ایسے بندے بھیج دیئے جو بڑے ہی خوفناک تھے۔ پس وہ تمہاری آبادیوں کے اندر پھیل گئے اور اللہ کا وعدہ تو اسی لیے تھا کہ پورا ہو کر رہے۔ پھر (دیکھو) ہم نے زمانہ کی گردش تمہارے دشمنوں کے خلاف اور تمہارے موافق کر دی اور مال و

Marfat.com

دولت اور اولاد کی کثرت سے تمہاری مدد کی اور تمہیں پھر ایسا بنا دیا کہ بڑے جتھے والے ہو گئے اگر تم نے بھلائی کے کام کیے تو اپنے ہی لیے کیے اور اگر برائیاں کیں تو بھی اپنے ہی لیے کیں۔ پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا (تو ہم نے اپنے دوسرے بندوں کو بھیج دیا تھا کہ تمہارے چہروں پر رسوائی کی کالک پھیر دیں اور اسی طرح (ہیکل) مسجد میں داخل ہو جائیں جس طرح پہلی مرتبہ حملہ آور گھسے تھے اور جو کچھ پائیں توڑ پھوڑ کر برباد کر ڈالیں کچھ عجب نہیں کہ تمہارا پروردگار تم پر رحم فرمائے (اگر اب بھی باز آ جاؤ) لیکن اگر تم پھر سرکشی فساد کی طرف لوٹ آؤ گے تو ہماری طرف سے پاداش عمل لوٹ آئے گی اور ہم نے منکرین حق کے لیے جہنم کا قید خانہ تیار کر رکھا ہے"۔

اس مقام پر "الکتاب" سے مراد انبیاء بنی اسرائیل کے وہ صحیفے ہیں جن میں یہود کے دو مرتبہ سخت فساد اور سرکشی کرنے اور اس کی بدولت بیت المقدس کی بربادی اور ان کے ہلاک اور غلام بن کر ذلیل رسواء ہونے کے متعلق وہ پیشین گوئیاں کی گئی تھیں جو بذریعہ الہام و وحی ان کو خدا کی جانب سے معلوم ہوئی تھیں، چنانچہ موجودہ توراۃ میں یسعیاہ، یرمیاہ، حزقیل [1] اور زکریا (علیہم السلام) کے صحیفوں میں وہ اب بھی مذکور ہیں اور ان صحیفوں کا پیشتر حصہ اسی قسم کی پیشین گوئیوں پر مشتمل ہے اور ان تینوں صحیفوں میں دو مرتبہ کے ان فسادات اور فسادات سے متعلق خدائے تعالیٰ کی جانب سے سخت سزا کا جس تفصیل کے ساتھ ذکر ہے اس سے حرف بحرف قرآن عزیز کے ارشاد کی تصدیق ہوتی ہے۔ یسعیاہ کی کتاب میں یہود کی پہلی شرارت وفساد کا ذکر اس طرح شروع ہوتا ہے:

"رویا یسعیاہ بن اموص کی جو اس نے یہوداہ اور یروشلم کی بابت یہوداہ کے بادشاہوں عزیاہ اور یوکان اور آخز اور حزقیا کے دنوں میں دیکھی۔ سنو اے آسمانوں اور کان لگا اے زمین کے خداوند یوں فرماتا ہے کہ لڑکوں کو میں نے پالا اور پوسا پھر انہوں نے مجھ سے سرکشی کی بیل اپنے مالک کو پہچانتا ہے اور گدھا اپنے مالک کی چراگاہ کو مگر بنی اسرائیل نہیں جانتے میرے لوگ کچھ نہیں سوچتے آہ خطا کار گروہ ایک قوم جو گناہوں سے لدی ہوئی ہے بدکاروں کی نسل، خراب اولاد کہ انہوں نے خداوند کو ترک کیا اسرائیل کے قدوس کو ہلاک جانا اور اس سے بالکل پھر گئے تھے"۔ [2]

اور پھر ان کی بدکاروں کی وجہ سے جو سزا ان کو ملنے والی تھی اس کا ذکر اسی مکاشفہ میں اس طرح ہے:

"تمہارا ملک اجاڑ ہے، تمہاری بستیاں جل گئیں، پردیسی لوگ تمہاری زمین کو تمہارے سامنے نگلتے ہیں، وہ ویران ہے گویا کہ اسے اجنبی لوگوں نے اجاڑا ہے اور صیہون کی بیٹی چھوڑی گئی ہے"۔ [3]

اور یرمیاہ کتاب میں یہ پیشین گوئی ان الفاظ سے شروع کی گئی ہے:

"کیونکہ خداوند فرماتا ہے کہ دیکھ میں اتر کے بادشاہوں کے سارے خاندانوں کو بلاؤں گا اور وہ آئیں گے اور ہر ایک اپنا اپنا تخت یروشلم کے پھاٹکوں میں داخل ہونے کی راہ پر اور اس کے سب دیواروں کے گرداگرد اور یہوداہ کے تمام شہروں کے

---

[1] یہ یحییٰ علیہ السلام کے والد ہیں، دوسرے نبی ہیں۔

[2] باب ا آیات ۴-۱

[3] صیہون شام کے ملک میں مشہور پہاڑ ہے۔ باب ا آیت ۷-۸۔

مقابل قائم کرے گا اور میں ان (یہود) کی ساری شرارت کی بابت کہ انہوں نے مجھے چھوڑا ہے اور بیگانے خداؤں کے سامنے لوبان جلایا اور اپنے ہی ہاتھوں کے کاموں کو سجدہ کیا اپنی عدالت ظاہر کر کے ان پر حکم کروں گا۔ ❁

دیکھو! تم جھوٹی باتوں پر جو سود مند نہیں ہو سکتیں اعتماد کرتے ہو۔ کیا تم چوری کرو گے خون کرو گے زناء کاری کرو گے، جھوٹی قسمیں کھاؤ گے اور بعل (بت) کے آگے لوبان جلاؤ گے اور غیر معبودوں کی جنہیں تم نہیں جانتے پیروی کرو گے؟ اور میرے حضور اس گھر میں جو میرے نام کا کہلاتا ہے آ کے کھڑے ہو گے اور کہو گے کہ ہم نے خلاصی پائی تاکہ نفرت کے کام کرو۔ ❁

اے یروشلم (بیت المقدس) اپنے بال منڈا اور پھینک دے اور اونچی جگہوں پر جا کے نوحہ کر کیونکہ خداوند نے اس نسل کو جس پر اس کا قہر پڑا تھا مردود کیا اور ترک کر دیا ہے کہ بنی یہوداہ نے میری نظروں میں برائی کی خداوند کہتا ہے اس گھر میں جو میرے نام کا کہلاتا ہے انہوں نے اپنی مکروہات رکھیں کہ اسے ناپاک کریں۔ ❁

اس لیے رب الافواج یوں کہتا ہے لہٰذا تم نے میری باتیں نہ سنیں دیکھ میں اتر کے سارے گھرانوں کو اور شاہ بابل بنوکد نذر کو بلا بھیجوں گا"۔

اور حزقیل علیہ السلام کی کتاب میں یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے:

"خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے: یہی یروشلم ہے میں نے اسے قوموں اور مملکتوں کے درمیان جو اس کے آس پاس ہیں رکھا ہے لیکن اس نے میری عدالتوں کو شرارت کر کے قوموں کی بہ نسبت زیادہ ٹال دیا اور میری شریعتوں کو آس پاس کی مملکتوں کی بہ نسبت زیادہ عدول کیا کہ، ہوں نے میری عدالتوں کو حقیر جانا اور میری شریعتوں پر عمل نہیں کیا سو خداوند یہوداہ یہ کہتا ہے ازبس کہ تم نے ان قوموں کی نسبت سے جو تمہارے گرد و پیش ہیں زیادہ بغاوت کی اور میری شریعتوں پر نہ چلے، سو خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے کہ دیکھ میں ہاں میں ہی تیرا مخالف ہوں اور تیرے درمیان سب قوموں کی آنکھوں کے سامنے تجھے سزا دوں گا"۔

اور زکریاہ نبی کی کتاب میں یہود کے دوسرے فساد اور بیت المقدس کی دوبارہ تباہی کے متعلق یہ پیشین گوئی درج ہے:

"دیکھو خداوند کا دن آتا ہے اور تیری لوٹ کا مال تیرے درمیان بانٹا جائے گا اور میں ساری قوموں کو فراہم کروں گا کہ یروشلم پر چڑھیں اور لڑیں اور شہر لے لیا جائے گا اور گھر کے گھر لوٹے جائیں گے اور عورتیں بے حرمت کی جائیں گی اور آدھا شہر اسیر ہو کے جائے گا پھر وہ جو باقی رہی جائیں گے شہر میں کاٹے نہ جائیں گے تب خداوند خروج کرے گا اور ان قوموں کے ساتھ جنگ کرے گا جس طرح سابق میں جنگ کے دن لڑا تھا"۔ ❁

یہ ہے خلاصہ ان مکاشفات یا پیشین گوئیوں کا جو انبیاء بنی اسرائیل کے صحیفوں میں بڑی تفصیلات کے ساتھ مذکور ہیں اور جن کا اجمال تذکرہ قرآن عزیز (سورہ بنی اسرائیل) میں بھی بصورت تصدیق موجود ہے۔

❁ باب ۱ آیات ۱۵-۱۶ ❁ باب ۷ آیات ۸-۱۱
❁ باب ۲۵ آیات ۸-۹ ❁ باب ۱۴ آیات ۱-۳

Marfat.com

اب سوال یہ ہے کہ ان مکاشفات اور پیشین گوئیوں کا ظہور کس کس زمانہ میں ہوا اور کس طرح ہوا تو مفسرین میں سے ابن کثیر کے طرز بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہود کی ان دو شرانگیزیوں میں سے ایک کو بعثت محمد (ﷺ) سے قبل زمانہ سے متعلق سمجھتے ہیں اور دوسری کو زمانہ بعثت ﷺ پر محمول فرماتے ہیں اور پھر پہلے واقعہ کے متعلق اپنی جانب سے فیصلہ دیتے ہوئے مفسرین کے تین قول نقل کرتے ہیں:

① قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہود کی پہلی شرارت کی سزا میں جالوت کا حملہ ہوا جس نے یہود کو بہت مصیبت میں ڈال دیا تھا مگر داؤد علیہ السلام کی بدولت اس کے فتنہ سے ان کو نجات ملی یہ واقعہ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔

② سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ پہلا وعدۂ الٰہی جو پاداش عمل میں یہود پر نافذ ہوا موصل و نینویٰ کے مشہور قاہر بادشاہ سنجاریب کے حملہ کی شکل میں ظاہر ہوا جس نے فلسطین کے اکثر شہروں پر قبضہ کر لیا تھا اور بیت المقدس کا محاصرہ کیے ہوئے تھا مگر جب یہود اور شاہ یہود خرقیاہ نے اپنے زمانہ کے نبی یسعیاہ علیہ السلام کے ہاتھ پر توبہ و انابت کی اور وہ سچائی کے ساتھ اپنی بداعمالیوں اور بدکاریوں سے باز آ گئے تب خدائے تعالیٰ نے ان پر سے اس بلا کو ٹال دیا اور محاصرہ ترک کر کے واپس ہوا۔

③ سعید بن جبیر ہی سے دوسری روایت یہ ہے کہ اس سے مراد بخت نصر (بنوکدنذر) شاہ بابل کا وہ مشہور حملہ ہے جس نے نہ صرف فلسطین اور شام کے تمام علاقے کو تاراج کر دیا تھا اور بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی بلکہ یہود کی قومیت و نسل کو بھی برباد کر ڈالا اور ہزاروں بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور مردوں کو غلام بنا کر بابل لے گیا تھا مگر یرمیاہ علیہ السلام کی پیشین گوئی کے مطابق ستر برس کے بعد یہود کو خورس شاہ فارس نے بابل کی غلامی سے نجات دلائی اور ان کو دوبارہ آزادی، شادمانی اور خوش عیشی نصیب ہوئی اور خورس کے حکم سے بیت المقدس بھی دوبارہ تعمیر ہوا اور اس نے حضرت دانیال علیہ السلام کو ان کا سردار بنا کر یروشلم واپس کر دیا۔[1]

اور قاضی بیضاوی اور بعض دوسرے مفسرین نے پہلی مرتبہ کے معاملہ کو سنجاریب یا بخت نصر سے متعلق کیا ہے اور دوسرے واقعہ کے متعلق یہ کہا ہے کہ یہ فارس کے ملوک الطوائف میں سے ہردوس بادشاہ کے زمانہ میں پیش آیا جب کہ اس نے بیت المقدس پر سخت حملہ کیا اور یہود اس کی مقاومت سے عاجز رہے مگر جب انہوں نے اپنے زمانہ کے پیغمبر کے سامنے سچی توبہ کی اور نیک کردارانہ زندگی اختیار کرنے کا پختہ عہد و پیمان کیا تو ان سے یہ مصیبت ٹال دی گئی اور یہود کی شرانگیزیوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ ان پر یہ تباہیاں اس وقت لائی گئیں جب کہ وہ اپنی شرارت میں اس درجہ بڑھ گئے تھے کہ انبیاء علیہم السلام کے قتل سے بھی باز نہیں رہتے تھے، چنانچہ پہلی مرتبہ میں یسعیاہ یا یرمیاہ[2] کو قتل کیا تھا اور دوسری مرتبہ زکریا یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل پر بھی آمادہ تھے اور ﴿وَإِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا﴾ میں اس تیسرے واقعہ کا تذکرہ ہے جو نبی اکرم ﷺ کے ساتھ پیش آیا یعنی یہود نے اپنی الہامی کتابوں میں آپ کی نبوت و رسالت کے حالات و علامات جان لینے کے باوجود آپ کا انکار کیا اور بدعہدیاں کر کے آپ کو اور مسلمانوں کو ہر قسم کی ایذائیں پہنچائیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس مرتبہ جب ٹھکرائے گئے تو پھر کبھی نہ ابھرے اور نہ قیامت تک کبھی صاحب حکومت ہوسکیں گے۔[3]

---

[1] تفسیر ابن کثیر ۲ و تاریخ ابن کثیر ج ۲ [2] ان ہر دو انبیاء میں سے کوئی بھی قتل نہیں کیے گئے۔

[3] بیضاوی سورۂ اسراء

Marfat.com

دوسری رائے یہ ہے کہ یہود کی پہلی شرارت اور اس کی پاداش کا معاملہ بخت نصر کے حملہ بیت المقدس سے تعلق رکھتا ہے اور دوسری مرتبہ کا معاملہ طیطوس (ٹیٹس) رومی کے حملہ سے متعلق ہے اور یہی رائے صحیح اور قرآن عزیز کی آیات اور تاریخی نقول کے مطابق ہے اور یہ اس لیے کہ قرآن عزیز نے اس معاملہ کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس سے حسب ذیل باتیں خصوصیت کے ساتھ ظاہر ہوتی ہیں۔

① "الکتاب" میں یہ خبر دے دی گئی تھی کہ یہود دو مرتبہ سخت شر انگیزی اور فساد کریں گے:

﴿وَ قَضَيْنَاۤ اِلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَ لَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا۝﴾

(بنی اسرائیل: ۴)

② جب انہوں نے پہلی مرتبہ شر و فساد کیا تو ہم نے ان پر ایسی قاہر طاقت مسلط کر دی کہ اس نے ان کی بستیوں میں گھس کر ان کو اور ان کے گھروں کو تباہ و برباد کر ڈالا:

﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَاۤ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ وَ كَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا۝﴾ (بنی اسرائیل: ۵)

③ اس تباہی کے بعد (ان کی توبہ و انابت پر) ہم نے ان کو سابق کی طرح پھر حکومت و طاقت بخشی اور مال و متاع کی بہتات سے بھی مستفیض کیا:

﴿ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَ اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَ جَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا۝﴾ (بنی اسرائیل: ۶)

④ اور اس کو یہ بھی بتا دیا کہ سرکشی اور فساد سے پرہیز اور امن و آشتی اور خدائے تعالیٰ کی فرمانبرداری کے قبول کا باز اثر ہم کو کوئی فائدہ یا نقصان نہیں پہنچاتا بلکہ اس کی خلاف ورزی میں تمہارا اپنا ہی نقصان ہے اور اس کی اطاعت و انقیاد سے تم ہی کو فائدہ پہنچتا ہے:

﴿اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا﴾ (بنی اسرائیل: ۷)

⑤ مگر انہوں نے دوسری مرتبہ پھر بدعہدی کی اور خدا کی نافرمانی و رفساد فی الارض میں دوبارہ بے باک ہو گئے تو ہم نے بھی پہلے کی طرح ان پر ایک ظالم طاقت کو مسلط کر دیا جس نے سابق ظالم حکمران کی طرح دوبارہ بیت المقدس اور اس کے ہیکل (مسجد) کو بھی برباد کیا اور ان کو بھی ذلیل و رسوا کر کے ان کی سرکشی کا سر کچل دیا:

﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَ لِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ لِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا۝﴾ (بنی اسرائیل: ۷)

اور اگرچہ یہود کی یہ تباہی بظاہر حال ابدی معلوم ہو لیکن خدا تعالیٰ کی رحمت تیسری مرتبہ اور موقعہ دے گی کہ وہ عزت و سربلندی حاصل کریں اور ان کی مایوسی مبدل بہ کامرانی ہو جائے لیکن اگر انہوں نے اس کو بھی ٹھکرا دیا تو بے شک پھر اس کا قانون "پاداش عمل" بھی ان کو ضرور سزا دے گا اور وہ جیسا کریں گے ویسا بھریں گے اور پھر یقیناً رہتی دنیا تک ذلیل و خوار ہی رہیں

Marfat.com

گے اور دار آخرت میں تو جہنم ایسے ہی متکبروں کے لیے تیار کی گئی ہے:

﴿عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝﴾ (بنی اسرائیل:۸)

ان تفصیلات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہود کی شر انگیزیوں پر بصورت سزا و عذاب جب جابر و قاہر بادشاہوں کو مسلط کیا گیا انہوں نے دونوں مرتبہ بیت المقدس (یروشلم) کو ضرور تباہ و برباد کیا:

﴿وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝﴾ (بنی اسرائیل:۷)

اس لیے جن اقوال میں پہلے واقعہ کا مصداقہ آشوری حکمران "سنجاریب" یا "جالوت" کو بتایا گیا ہے وہ غلط ہے کیونکہ ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی بیت المقدس میں داخل نہیں ہو سکا چہ جائیکہ وہ اس کو تباہ برباد کرتا چنانچہ جالوت کے متعلق تو قرآن کی تصریحات بھی اس کی تائید کرتی ہیں اور سیر و تاریخ کی نقول بھی جیسا کہ ہم حضرت شموئیل علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعات میں بیان کر چکے ہیں اسی طرح سنجاریب کے متعلق "یسعیاہ کی کتاب" میں یہ موجود ہے۔

پس شاہ حزقیاہ کے ملازم یسعیاہ کے پاس آئے۔ تب یسعیاہ نے انہیں فرمایا تم اپنے آقا سے کہو خداوند یوں فرماتا ہے کہ تم ان باتوں سے جنہیں شاہ آشور (سنجاریب) کے جوانوں نے کہہ کے میری تکفیر کی ہراساں مت ہو دیکھ میں اِس میں روح ڈالوں گا اور وہ ایک افواہ سن کے اپنی مملکت کو پھر جائے گا اور میں اِس سے اِس ہی کی سرزمین میں تلوار سے مروا ڈالوں گا۔ سو خداوند شاہ آشور (سنجاریب) حق میں یوں فرماتا ہے کہ وہ اس شہر (یروشلم) میں نہ آئے گا نہ اس کے اندر تیر چلائے گا نہ پھر پکڑ کے اس کے سامنے ظاہر ہوگا اور نہ اس کے مقابل دمدمہ باندھے گا بلکہ جس راہ سے وہ آیا اسی راہ سے پھر جائے گا اور اس شہر میں نہ آ سکے گا۔ تب سنجریب (سنجاریب) شاہ آشور نے کوچ کیا اور چلا گیا اور پھر گیا اور نینوی میں آ رہا۔ ❁

اور قاضی بیضاوی کا یہ قول بھی صحیح نہیں ہے کہ یہود سے متعلق دوسرے حادثہ کا مصداق فارس کے ملوک الطوائف میں سے شاہ ہردوس ہے اس لیے کہ تاریخ و سیر میں ملوک الطوائف کے عہد میں کسی ایسے بادشاہ کا ذکر نہیں پایا جاتا جس نے بیت المقدس پر چڑھائی کر کے اس کو فتح کیا اور اس کو تباہ و برباد کر ڈالا ہے۔

ان اقوال کے برعکس توراۃ (صحائف انبیاء) اور سیر و تاریخ کی نقول سے باتفاق یہ ثابت ہوتا ہے کہ فلسطین اور سرزمین یہوداہ کی تباہی اور ہیکل کی بربادی صرف دو بادشاہوں کے ہاتھوں ہوئی ہے اور نہ صرف شہروں کی بربادی بلکہ یہودی قومیت کی وہ تباہی و بربادی جو دنیا کے انقلابات کی تاریخ میں اہم جگہ رکھتی ہے۔ ایک بابل کے قاہر بادشاہ بنوکدنذر (بخت نصر) کے ہاتھ سے اور یہ تقریباً ۶۰۴ ق م کا واقعہ ہے اور دوسری طیطوس رومی کے ہاتھوں سے اور یہ واقعہ رفع مسیح علیہ السلام سے تقریباً ستر سال بعد پیش آیا اور ان ہی دو حادثوں میں یہود، یہودی قومیت اور یہودی مذہب پر وہ سب کچھ ہو گزرا جس کی اطلاع پہلے سے توراۃ (صحف انبیاء) میں دے دی گئی تھی اور جس کی تصدیق کے لیے قرآن عزیز بھی شہادت دے رہا ہے۔

❁ باب ۳۷ آیات ۵-۷ و آیات ۳۱-۳۳ و آیات ۳۷-۳۸

Marfat.com

اس لیے بلاخوف تردید یہ کہنا صحیح ہے کہ یہود کی بدکرداریوں کے نتیجہ میں جابر و قاہر بادشاہوں کے ہاتھوں ان کی تباہی و بربادی کے جو دو سامنے پیش آئے اور جن کا ذکر سورہ اسراء (بنی اسرائیل) میں ہے وہ بلاشبہ بخت نصر اور طیطوس (ٹیٹس) ہی سے تعلق رکھتے ہیں تو اب از بس ضروری ہے کہ ان ہر دو واقعات کی تفصیلات بیان کر کے یہ دکھایا جائے کہ اس زمانہ میں یہود کی شرانگیزیاں اور مفسدانہ کارگزاریاں اس حد تک بڑھ گئی تھیں کہ ان دونوں تباہ کن حوادث میں ان پر جو کچھ گزرا وہ ان کی بداعمالیوں ہی کا ثمرہ اور نتیجہ تھا اور پاداش عمل ہی نے ان دو طاقتوں کی شکل میں نمود و ظہور کیا تھا۔

شرارت یہود کا پہلا دور:

اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانون قدرت کا ہمیشہ سے یہ اٹل فیصلہ رہا ہے کہ جب بداخلاقی، فتنہ و فساد، خون ریزی، جبر و ظلم اور حق کے مقابلہ میں بغض و حسد کسی جماعت کا قومی مزاج بن جاتے ہیں اور چند افراد میں نہیں بلکہ پوری قوم کے اندر یہ امور نشو و نماء پا جاتے ہیں۔ تو پھر قبول حق کی صحیح استعداد ان سے سلب کر لی جاتی ہے اور وہ اس درجہ بے خوف اور بے باک ہو جاتے ہیں کہ اگر ان کے پاس خدا کے سچے پیغمبر (دعوت حق اور پیغام الٰہی سنانے آتے ہیں تو وہ صرف اس دعوت سے منہ ہی نہیں موڑ لیتے بلکہ ان انبیاء و رسل کو قتل تک کر دینے سے گریز نہیں کرتے اور شرک و طغیان کی راہ عمل بنا کر اولیاء الرحمان کی جگہ اولیاء الشیطان بن جاتے ہیں جب ان کی حالت اس درجہ تک پہنچ جاتی ہے تو اب خدائے برتر کا قانون "پاداش عمل" بروئے کار آتا ہے اور آخرت کے عذاب الیم کے علاوہ دنیا میں ہی ان کو ایسی ہلاکت و بربادی سے دوچار کر دیتا ہے کہ اس قوم کا تمام کبر و غرور اور شر و فساد کی شعلہ سامانیاں ذلت و خواری کے ساتھ خاک کر دی جاتی ہیں اور ان کی قومی زندگی کو قعر مذلت میں پھینک دیا جاتا ہے تا کہ ان کی آنکھیں مشاہدہ کر لیں اور عبرت آموز قلب بھی یہ سمجھ لیں کہ حقیقی عزت و سربلندی کے مالک تم نہیں ہو اور ذلت و عزت تمہارے اپنے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ اس قادر مطلق ہستی کے قبضہ میں ہے جو کائنات ہست و بود کا خالق و مالک ہے اور جس کا یہ اعلان ہے کہ بدکاروں کے لیے انجام کار ذلت و رسوائی کے سواء اور کچھ نہیں ہے اور حقیقی عزت نیکوکاروں ہی کے لیے ہے اور وہی اس حقیقت کے پیش نظر جس کو چاہتا ہے عزت بخشتا اور جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے:

﴿وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۝٢٦﴾ (آل عمران: ٢٦)

پس جب ہم اس قانون فطرت کو پیش نظر رکھ کر یہود بنی اسرائیل کے اس عہد کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں جو زیر بحث واقعات سے متعلق ہے تو یہ بات روز روشن کی طرح نمایاں نظر آتی ہے کہ ان کی قومی زندگی کا قوام مسطورہ بالا بداخلاقیوں سے ہی بنا اور وہ اپنی اس زندگی پر فخر و مباہات کرتے تھے چنانچہ حضرت داؤد اور سلیمان (علیہما السلام) کے بعد ان کی مذہبی اور اخلاقی پستی کا یہ عالم کہ جھوٹ، فریب، ظلم و سرکشی اور فساد و فتنہ انگیزی ان کا شعار بن گئے تھے حتیٰ کہ شرک و بت پرستی تک ان میں رچ گئی تھی لیکن اس کے باوجود عرصہ دراز تک خدائے تعالیٰ کے "قانون مہلت" نے ان کو مہلت دی کہ وہ اپنی حالت کی اصلاح کریں اور اس کی صفت "رحمت" نے ان سے منہ نہیں موڑا بلکہ ان کی رشد و ہدایت اور اصلاح اخلاق و اعمال کے لیے نبیوں اور پیغمبروں کا سلسلہ قائم رکھا جو ان کو نیکوکاری کی ترغیب دیتے اور بدکاری سے اجتناب کی تلقین کرتے رہتے تھے تا کہ ان کو دین و دنیا کی سربلندی حاصل ہو اور

وہ انبیاء ورسل علیہم السلام کی اولاد ہونے کی حیثیت سے دوسروں کے لیے اسوۂ حسنہ بن سکیں مگر یہود پر ان کے ارشاد وتبلیغ کا مطلق کوئی اثر نہیں ہوا اور ان کی سرکشی اور نافرمانی ترقی پذیر ہوتی گئی اور ان کے علماء واحبار نے سیم وزر کی خاطر خدائے برتر کے احکام میں تلبیس شروع کر دی اور حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانے میں بے خوف ہو گئے اور عوام نے کتاب الٰہی کو پس پشت ڈال کر گمراہی کو اپنا امام بنالیا اور بے باکی کے ساتھ ہر قسم کی بداخلاقی کو اپنالیا اور آخر کار ان کے خواص وعوام اس انتہائی شقاوت وبدبختی پر اتر آئے کہ خدا کے معصوم پیغمبروں کو قتل کرنا شروع کر دیا اور ان کی تکذیب کر کے ان کے خون ناحق پر فخر ومباہات کرنے لگے۔ چنانچہ یسعیاہ نبی کی کتاب میں جگہ جگہ ان کی بدکرداریوں اور نافرمانیوں کا اس طرح ذکر موجود ہے:

"بنی اسرائیل نہیں جانتے، میرے لوگ کچھ نہیں سوچتے آہ خطا کار گروہ ایک قوم جو گناہوں سے لدی ہوئی ہے بدکرداروں کی نسل، خراب اولاد کہ انہوں نے خدا کو ترک کیا، اسرائیل کے قدوس کو حقیر جانا اس سے بالکل پھر گئے"۔ ✿

"اے میری امت تیرے پیشواء تجھ کو گمراہ کرتے ہیں اور تیرے راہ گیروں کی راہ مارتے ہیں خداوند کھڑا ہے کہ مقدمہ پیش کرے اور وہ لوگوں کی عدالت کرنے پر مستعد ہے"۔ ✿

"کیونکہ وہ جوان کے پیشواء ہیں ان سے خطا کاری کراتے ہیں اور وہ جوان کی پیروی کرتے ہیں نگلے جائیں گے سو خداوند ان کے جوانوں سے خوشنود نہیں اور وہ ان کے یتیموں اور ان کی بیواؤں پر رحم نہ کرے گا کہ ان میں ہر ایک بے دین ہے اور بدکردار ہے"۔ ✿

اور یرمیاہ نبی کی کتاب میں اس طرح مذکور ہے:

"اور خداوند نے اپنے سارے خدمت گزار نبیوں کو تمہارے پاس بھیجا، صبح سویرے اٹھ کر بھیجا، پر تم نے نہ سنا نہ سننے کو اپنا کان لگایا، انہوں نے کہا کہ ہر ایک اپنی بری راہ سے اور اپنے کاموں کی برائی سے باز آؤ اور اس سرزمین میں جسے خدا نے تم کو اور تمہارے باپ داداؤں کو ہمیشہ کے لیے دیا بستے رہو اور تم بیگانے باطل معبودوں کا پیچھا نہ کرو کہ ان کی بندگی اور ان کو سجدہ کرنے لگو اور اپنے ہاتھوں کے کاموں سے مجھے غصہ نہ دلاؤ اور میں تم پر کچھ ضرر نہ پہنچاؤں گا۔ پھر تم نے میری نہ سنی، خداوند کہتا ہے تاکہ اپنے ہاتھوں کے کاموں سے اپنے زیان کے لیے مجھے غصہ دلاؤ"۔ ✿

اور ایسا ہوا کہ جب یرمیاہ ساری باتیں کہہ چکا جو خداوند نے اسے حکم دیا تھا کہ ساری قوم سے کہے تب کاہنوں اور نبیوں (جھوٹے مدعیان نبوت) اور ساری قوم نے اس کو پکڑا اور کہا کہ تو یقیناً قتل کیا جائے گا۔ تو نے خداوند کا نام لے کر کس لیے نبوت کی ہے اور یہ کہا کہ یہ گھر (یروشلم) سیلا کی مانند ہو جائے گا اور یہ شہر ویران کیا جائے گا۔ ✿

کیونکہ اے یہوداہ جتنے تیرے شہر ہیں اتنے ہی تیرے معبود ہیں تم کاہے کو مجھ سے محبت کرو گے تم سب مجھ سے پھر گئے ہو خداوند کہتا ہے میں نے تمہارے لڑکوں کو عبث مارا پیٹا ہے اور وہ تربیت پذیر نہیں ہوئے، تمہاری ہی تلوار پھاڑنے والے شیر ببر کی مانند تمہارے نبیوں کو کھا گئی ہے (یعنی تم نے اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے سچے پیغمبروں کو قتل کیا ہے)۔

✿ باب ا آیت ۳-۴ ✿ باب ۳ آیات ۱۲-۱۳ ✿ باب ۹ آیات ۱۶-۱۷
✿ باب ۲۵ آیات ۴-۷ ✿ باب ۲۱ آیات

Marfat.com

یہود کی سرکشی اور خدا سے بغاوت کے یہ افسوس ناک حالات تھے جن پر خدا کی جانب سے بار بار ان کو تنبیہ کی جاتی اور مہلت سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دی جاتی رہی لیکن ان پر الٹا ہی اثر ہوتا رہا اور ان کی بے حیائی اور بیجا جسارت بڑھتی ہی رہی، تب یکایک غیرت حق نے قہر اور بطش شدید کی شکل اختیار کر لی اور اس کا زبردست ہاتھ ان کی جانب پاداش عمل کے لیے بڑھا۔

ساتویں صدی قبل مسیح کے آخری دور میں بابل (عراق) کی حکومت پر ایک زبردست جری اور ظالم و جابر بادشاہ سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اس کا نام بنوکدنذر یا بنوکدزار تھا اور عرب اس کو بخت نصر کہتے تھے اگرچہ اس زمانہ میں بابل کی حکومت بذات خود ایک متمدن اور زبردست حکومت شمار ہوتی تھی مگر اس سے قریب نینوی کی مشہور طاقت کی تباہی کے بعد تو اس کو اور زیادہ قوت و شوکت حاصل ہوگئی اور وہ ایک عظیم الشان شہنشاہیت تسلیم کر لی گئی۔ حتیٰ کہ ایران کی مختلف قبائلی حکومتیں بھی اس کی باج گزار اور ماتحت حکومتیں سمجھی جانے لگیں۔

بنوکدنذر کی شمشیر کشورستان نے اس پر بھی اکتفا نہیں کیا اور اس کی نظریں شام و فلسطین کے علاقوں پر بھی پڑنے لگیں جو یہودیا کا علاقہ کہلاتا اور بنی اسرائیل کے مذہب اور قومیت کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ وہ اس کی جانب بڑھا، جب یہودیا کی سرزمین کے باشندوں نے یہ سنا تو ان کے ہوش و حواس جاتے رہے اور بادشاہ سے لے کر رعایا تک سب کو موت کا نقشہ نظر آنے لگا اور اب وہ سمجھے کہ یسعیاہ اور یرمیا (علیہما السلام) نے ہماری بدکاریوں پر متنبہ کرتے ہوئے جس سزا اور عذاب الٰہی کا ذکر کیا تھا اور جس سے ناراض ہو کر ہم نے یرمیاہ (علیہ السلام) کو قید خانہ میں ڈال رکھا ہے وہ وقت آ پہنچا مگر شومی قسمت دیکھیے کہ انہوں نے اس حالت کو دیکھ کر اپنی بداعمالیوں اور بدکرداریوں پر اظہار ندامت اور درگاہ الٰہی میں توبہ و انابت کی جانب پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی مادی طاقت کے اسباب و وسائل پر بھروسہ کیا اور شاہ بابل کی مقاومت کے لیے آمادہ ہوگئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ فلسطین و شام کے شہروں اور آبادیوں کو ویران اور مسمار کرتا ہوا بیت المقدس (یروشلم) کے دروازے پر آ کھڑا ہوا۔ اب شاہ یہودا یکونیا [1] بن یویقیم کو بجز اطاعت کوئی چارہ نہ رہا۔ بنوکدنذر، یروشلم میں لشکر سمیت داخل ہوا اور بادشاہ، سردار اور تمام امراء کو قید کر لیا اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ لشکریوں نے تمام مال و متاع اور ہیکل کی تمام اشیاء کو لوٹ لیا اور توراۃ کے تمام نسخوں کو آگ میں جلا کر خاک کر دیا اور ہزار ہا انسانوں کو قتل اور باختلاف روایت ایک لاکھ سے زائد یہودیوں کو (جن میں بوڑھے، بچے، عورتیں اور مرد سب ہی تھے) بھیڑ بکری کی طرح ہنکاتا ہوا پیادہ بابل لے گیا اور ان سب کو غلام و باندی بنا لیا، علاقہ فلسطین و شام کے لاکھوں انسانوں کی قتل و غارت کرنے کے علاوہ صرف دمشق میں اس نے بے تعداد یہودیوں کو تہ تیغ کیا۔ حتیٰ کہ خود یہودیوں کی زبان پر یہ تھا کہ یہ انبیاء علیہم السلام کے ناحق قتل کرنے کی سزا ہے جو ہم کو شاہ بابل کی شمشیر براں کے ذریعہ دی جا رہی ہے۔

غرض شاہ بابل کے اس حملہ نے یہود کا ملک ہی ویران نہیں کیا بلکہ ان کے مذہب اور قوم کو بھی پارہ پارہ کر دیا، چنانچہ یہود کے ان قیدیوں میں حضرت دانیال (اصغر) حضرت عزیر اور بعض دوسرے وہ بزرگ بھی تھے جن کو خدائے تعالیٰ کی جانب سے قیام بابل کے زمانہ میں یہود کی اصلاح کے لیے نبوت سے سرفراز کیا گیا تاکہ وہ اس بت پرست شہنشاہی کی غلامی میں طاقت و آزادی سے محرومی کے ساتھ ساتھ دین و مذہب سے بھی محروم نہ ہو جائیں۔ [2]

---

[1] باب ۲۴ آیت ۱ [2] تاریخ ابن کثیر ج ۲

Marfat.com

ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے کہ جب بنوکدنذر (بخت نصر) بیت المقدس میں داخل ہو کر سب کچھ برباد کر چکا تو اس کو اطلاع دی گئی کہ یہود نے اپنے ایک نبی یرمیاہ علیہ السلام کو اس بنیاد پر قید کر رکھا ہے کہ انہوں نے تیری آمد اور حملہ سے قبل اپنی قوم کو ان تمام باتوں کی خبر دے دی تھی جو آج پیش آئیں، یہ سن کر شاہ بابل نے ان کو زندان سے نکالا اور ان سے بات چیت کر کے بے حد متاثر ہوا اور اصرار کیا کہ اگر وہ بابل چلنے پر آمادہ ہوں تو ان کو حکومت میں منصب جلیل دیا جائے گا اور ان کی کیاست و فراست سے فائدہ اٹھایا جائے گا، مگر حضرت یرمیاہ علیہ السلام نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ تیرے ہاتھوں میری بدقسمت قوم کا جو حال ہوا ہے اس کے بعد میرے لیے بابل جانا میری زندگی کا سب سے بدترین سانحہ ہوگا۔ میں تو اب ان ہی کھنڈرات پر زندگی گزاروں گا۔ پس اے بادشاہ! تو مجھ سے اس بارہ میں اصرار نہ کر۔ شاہ بابل یہ سن کر خاموش رہا اور بابل کو روانہ ہو گیا۔ [1]

غلامی سے نجات:

بابل کی غلامی کا یہ زمانہ یہود کے لیے کس درجہ یاس انگیز حسرت زا اور عبرت ناک رہا ہوگا، اس کا حقیقی اندازہ ہمارے اور آپ کے لیے بہت مشکل ہے بظاہر کوئی سہارا نہیں تھا کہ جس کے بل بوتہ پر وہ اپنی اس حالت میں انقلاب پیدا کر سکتے البتہ جب کہ وہ یسعیاہ اور یرمیاہ علیہما السلام کے مکاشفوں اور پیشینگوئیوں کی ابتدائی صداقت [2] کا تجربہ کر چکے بلکہ اپنی زندگی پر ان کو گزرتا ہوا دیکھ چکے تو ان کے لیے امید کی ایک یہ جھلک ضرور باقی تھی کہ ان مکاشفوں اور پیشین گوئیوں میں ساتھ ہی یہ بھی خبر دی گئی تھی کہ یہود بابل میں ستر برس غلام رہیں گے اور ستر برس گزرنے پر فارس سے ایک بادشاہ کا ظہور ہوگا جو خدا کا مسیح اور اس کا چرواہا کہلائے گا اور وہ یہود اور یروشلم کا نجات دہندہ ہوگا۔

یہ پیشین گوئی حضرت یسعیاہ نے واقعہ سے تقریباً ایک سو ساٹھ برس اور حضرت یرمیاہ نے ساٹھ برس قبل یہوداہ کو ان کی تباہی و بربادی کی پیشین گوئی کے ساتھ ساتھ سنا دی تھی حتیٰ کہ قیام بابل کے دوران میں پیشین گوئی کے ظہور سے تھوڑے زمانہ قبل دانیال علیہ السلام نے اپنے مکاشفہ میں اس شاہ فارس کو ایک ایسے مینڈھے کی شکل میں دیکھا تھا جس کے دو سینگ (قرنین) ہیں اور

---

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۲

[2] شاہ بابل نے یہود اور یروشلم کے ساتھ جو کچھ کیا اس کی خبر یہود کو پہلے سے دے دی گئی تھی اور بتا دیا گیا تھا کہ تمہاری بدکاریوں کا اگر یہی حال رہا تو تم ایک بت پرست بادشاہ بنوکدنزر کے ہاتھوں ذلیل و رسوا کیے جاؤ گے، یہ پیشین گوئی بھی یسعیاہ اور یرمیاہ کے صحیفوں میں آج تک موجود ہے۔
تب یسعیاہ نبی نے حزقیاہ بادشاہوں کے پاس آ کر اس سے کہا کہ ان شخصوں نے کہا اور وہ کہاں سے تیرے پاس آئے؟ حزقیاہ نے جواب دیا کہ ایک وہ (ملک بابل ہی سے میرے پاس آئے تب اس نے کہا انہوں نے تیرے گھر میں کیا کیا دیکھا؟ حزقیاہ نے جواب دیا سب کچھ کہ جو میرے گھر میں ہے انہوں نے دیکھا، تب یسعیاہ نے حزقیاہ کو کہا کہ رب الافواج کا کلام سن۔ دیکھ وہ دن آتے ہیں کہ وہ سب کچھ جو کہ تیرے گھر (یروشلم) میں ہے اور جو کچھ تیرے باپ داداوں نے آج کے دن تک ذخیرہ کر رکھا ہے اٹھا کے بابل کو لے جائیں گے۔ خداوند فرماتا ہے کوئی چیز باقی نہ چھوٹے گی اور وہ تیرے بیٹوں میں سے جو تیری نسل سے ہوں گے اور تجھ سے پیدا ہوں گے لے جائیں گے اور وہ شاہ بابل کے قصر میں خواجہ سرا ہوں گے۔ (باب ۳۹ آیات ۷-۳)
یہ پیشین گوئی حضرت یسعیاہ نے اس وقت کی تھی جب کہ بنوکدنزر سے بہت پہلے بابل کے بادشاہ مردوک نے یہودا کے بادشاہ حزقیاہ کے پاس اپنے ایلچی بھیجے تھے اسی طرح حضرت یرمیاہ کی کتاب میں ہے۔
اس لئے رب الافواج یوں کہتا ہے تم نے میری باتیں نہیں سنیں تو دیکھو میں شمال کے سارے گھرانوں کو اور بنوکدنزر کو جو کہ میرا غلام ہے بلا بھیجوں گا خداوند کہتا ہے اور میں انہیں اس سرزمین اور اس کے باشندوں پر اور ان ساری قوموں پر جو چہار جانب ہیں چڑھائی کرا لاؤں گا۔ (باب ۲۵ آیات ۹-۸)

جبرائیل علیہ السلام نے اس کی یہ تعبیر دی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ بادشاہ مادہ (میڈیا) اور فارس دو بادشاہتوں کو ملا کر بادشاہی کرے گا اور اسی مکاشفہ میں انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ ایک اور بکرا ہے جس کی پیشانی پر صرف ایک سینگ ہے اور اس نے دو سینگ والے مینڈھے کو مغلوب کر لیا ہے اور پھر جبرائیل علیہ السلام نے اس کی تعبیر یہ دی کہ یہ ایک ایسا زبردست بادشاہ ہوگا جو ایران کی اس شہنشاہی کا خاتمہ کر کے اس پر قابض ہو جائے گا (یعنی سکندر یونانی)۔ چنانچہ یرمیاہ کی کتاب میں بصراحت یہ مدت مذکور ہے۔

اور یہ ساری سرزمین ویرانہ اور حیرانی کا باعث ہو جائے گی اور یہ قومیں ستر برس تک بابل کے بادشاہ کی غلامی کریں گی۔ ❶

اور ایسا ہوگا "خداوند کہتا ہے" کہ جب ستر برس ہوں گے میں بابل کے بادشاہ کو اور اس کی قوم کو اور کدیوں (بابلیوں) کی زمین کو ان کی بدکرداری کے سبب سزا دوں گا اور میں اسے ایسا اجاڑوں گا کہ ہمیشہ تک ویرانہ رہے۔ ❷

خداوند یوں کہتا ہے کہ جب بابل میں ستر برس گزر چکیں گے تو میں تمہاری خبر لینے آؤں گا اور تمہیں اس مکان میں پھر لانے سے اپنی اچھی بات تم پر قائم کروں گا۔ ❸

اور ان ہی پیشین گوئیوں میں یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ یہود کو بابل کی غلامی سے نجات دینے والی ہستی کا ایران سے ظہور ہوگا اور اس کا نام خورس ہوگا اس کی حکومت اور شہنشاہیت کا فروغ خداوند اسرائیل کی کرشمہ سازیوں کا نتیجہ ہوگا اور جو بات ان کے گزشتہ بادشاہوں کو نصیب نہیں ہوئی اس کو نصیب ہوگی کیونکہ وہ خداوند کا چرواہا، مسیح (مبارک) اور بنی اسرائیل کا نجات دہندہ ہوگا۔ چنانچہ یسعیاہ کی کتاب میں اس کے ظہور کی خبر صاف الفاظ میں اس طرح دی گئی ہے۔

(میں خداوند بنی اسرائیل کا خدا) یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ آباد کی جائے گی اور یہوداہ کے شہروں کی بابت کہتا ہوں کہ وہ بنائے جائیں گے اور میں اس کے ویران مکانوں کو تعمیر کروں گا جو سمندر کو کہتا ہوں کہ سوکھ جا اور میں تیری ندیاں سوکھا ڈالوں گا۔ جو خورس کے حق میں کہتا ہوں کہ وہ میرا چرواہا ہے اور وہ میری ساری مرضی پوری کرے گا اور ہیکل کی بابت کہ اس کی بنیاد ڈالی جائے گی خداوند اپنے "مسیح" خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ میں نے اس کا داہنا ہاتھ پکڑا کہ امتوں کو اس کے قابو میں کروں اور بادشاہوں کی کمریں کھلوا ڈالوں اور دوہرائے ہوئے دروازے اس کے لیے کھول دوں اور وہ دروازے بند نہ کیے جائیں گے۔ میں ہی خداوند ہوں اور کوئی نہیں، میرے سوا کوئی خدا نہیں، میں نے تیری کمر باندھی اگرچہ تو نے مجھے نہ پہچانا تا کہ لوگ سورج نکلنے کی اطراف سے اور سورج کے غروب ہونے کی اطراف تک جانیں کہ میرے سوا کوئی نہیں میں ہی خداوند ہوں۔ میں نے اس کو صداقت کے لیے برپا کیا ہے اور میں اس کی ساری راہیں آراستہ کروں گا وہ میرا شہر بنائے گا اور میرے اسیروں کو بغیر قیمت اور عوض لیے چھڑائے گا۔ اے اسرائیل کے خدا، اے نجات دینے والے وہ سب کے سب پشیمان اور سراسیمہ بھی ہوں گے وہ جو بت تراش (اہل بابل) میں سب کے سب گھبرا جائیں گے پھر اسرائیل خداوند میں ہو کے ابدی نجات کے ساتھ رہائی پائے گا۔ ❹ گزرو آستانہ پر سے گزرو، لوگوں کے لیے راہ راست کرو اور شاہراہ اونچی کرو، پتھر سرکا دو قوموں کے لیے جھنڈا کھڑا کرو، دیکھو خداوند دنیا کی سرحدوں تک منادی کرتا ہے کہ صیہون کی بیٹی کو کہو دیکھو تیرا نجات دینے والا آتا ہے دیکھ اس کا اجر اس کے ساتھ اور اس کا کام اس کے آگے ہیں۔ ❺

---

❶ باب ۲۵ آیات ۱۱ ❷ باب ۲۵ آیات ۱۲-۱۳ ❸ باب ۲۹ آیات ۱۰-۱۱

❹ یسعیاہ باب ۴۰ آیات ۲۶-۲۸ باب ۴۱ آیات ۱-۱۳ ❺ باب ۱۲ آیات ۱۰-۱۱

Marfat.com

بابل کی بابت وہ الہامی بات جسے اموص کے بیٹے یسعیاہ نے رویا میں دیکھا، میں نے اپنے مخصوص کیے ہوؤں کو حکم کیا۔ میں نے اپنے بہادروں کو جو میری خداوندی سے مسرور ہیں کہ وہ میرے قہر کو انجام دیں۔ رب الافواج جنگی لشکر کی موجودات لیتا ہے، وہ دور ملک سے آسمان کی انتہاء کی طرف سے آتے ہیں۔ دیکھو! میں مادیون (میڈیا والوں کو) ان پر چڑھاؤں گا جو کہ روپیہ کو خاطر میں نہیں لاتے اور سونے سے خوش نہیں ہوتے۔ ✿

اور یرمیاہ کی کتاب میں مذکور ہے:

دیکھ! میں اتر کی سرزمین سے بڑی قوموں کے ایک گروہ کو برپا کروں گا اور بابل پر لے آؤں گا۔ کدستان (بابل) لوٹا جائے گا سب جو اسے لوٹیں گے آسودہ ہوں گے۔" خداوند کہتا ہے" اس لئے خداوند یوں کہتا ہے دیکھ میں تیری حجت ثابت کروں گا اور تیرا انتقام لوں اور اس (بابت) کے دریا سکھا دوں گا اور اس کے سوتے خشک کر دوں اا اور بابل کھنڈر ہو جائے گا اور گیدڑوں کا مقام اور حیرانی کا باعث ہوگا اور اس میں کوئی نہ بسے گا۔ کیونکہ حملہ آور اتر سے اس پر چڑھے ہیں۔ بابل سے رونے کی آواز اور بڑی ہلاکت کی صدا کسریوں کی سرزمین سے آتی ہے کیونکہ خداوند بابل کو غارت کرتا ہے۔ بابل کے بھاری شہر کی دیواریں سراسر ڈھائی جائیں گی اور اس کے بلند پھاٹک آگ سے جلا دیئے جائیں گے۔

توراۃ کے ان بیان کردہ واقعات کی تصدیق تاریخ کے روشن صفحات اس طرح کرتے ہیں کہ

تقریباً ۶۳۵ ق م ایران میں قبائلی طرز حکومت رائج تھا اور ایران دو حصوں پر تقسیم تھا جہاں جو چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم تھیں ان میں سے شمال مغربی حصہ میڈیا (مادہ یا مات) کہلاتا تھا اور جنوبی حصہ پارس کے نام سے موسوم تھا مگر اس دور میں چونکہ بابل و نینوٰی کی حکومتیں زبردست اور قاہر حکومتیں تھیں اس لیے یہ دونوں ریاستیں نینوٰی کی حکومت کے زیر اثر اور ماتحت سمجھی جاتی تھیں، لیکن جب ۶۱۲ ق م نینوٰی تباہ ہو گیا اور آشوری حکومت کا خاتمہ ہو گیا تو اگرچہ میڈیا کو آزادی نصیب ہوگئی اور وہاں قومی حکومت کے جذبات ابھرنے لگے اور ایک حکمران شاہی خاندان بھی پیدا ہو گیا تاہم پارس اور میڈیا دونوں ریاستوں کو آزاد سلطنت قائم کر لینے کی جرات نہ ہوسکی اور بابلی حکومت کو بے حد فروغ ہو گیا گویا نینوٰی کی تباہی نے بابل کی طاقت کو بہت بڑی شہنشاہیت میں تبدیل کر دیا جس کے سامنے یہ ریاستیں بے اثر ہی رہیں یہ کیفیت ۵۶۰ تک رہی لیکن ۵۵۹ ق م میں اچانک میڈیا کے رئیس کمبوچہ (کیقباد) کے جانشین کے ارش (خورس) نے غیر معمولی حالات کے ساتھ ظہور کیا اور چند ہی روز میں میڈیا اور فارس کی ریاستوں نے برضاء و رغبت اس کو اپنا واحد شہنشاہ تسلیم کر لیا اور وہ بغیر کسی خونریزی کے ایشیاء کوچک کے تمام علاقوں کا زبردست اور خودمختار شہنشاہ بن گیا۔

اہل فارس اس کو کے ارش اور گورش کہتے ہیں لیکن یہ یونانی میں سائرس اور عبرانی میں خورس اور عربی میں کیخسرو کے ناموں سے مشہور ہے۔

کے ارش کے ظہور سے یونانی اور یہودی دو قومیں خصوصیت کے ساتھ متعارف ہیں اس لیے کہ ان دونوں قوموں پر اس کی حکومت کا موافق اور مخالف حیثیت سے نمایاں اثر پڑا اور یہود کے لیے تو اس کا عروج و ظہور، خوش حالی، آزادی اور امن و اطمینان کا بہت بڑا سبب بنا اسی لیے وہ اس کی شخصیت کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور ان کے انبیاء کے صحیفوں میں اس کو "خدا کا چرواہا" مسیح اور بنی اسرائیل کا "نجات دہندہ" کہا گیا ہے، مگر اہل عرب قبل از اسلام اس کی شخصیت سے زیادہ متعارف نہیں تھے اور بعد از اسلام جب

Marfat.com

مسلمانوں نے ایران کو فتح کیا تب بھی ان کو اس کی شخصیت کے تعارف سے اس لیے واسطہ نہیں پڑا کہ یہ ایران کے دور اوّل کا ہیرو ہے اور مسلمانوں کی فتوحات کا تعلق تمام تر ایران کے تیسرے دور سے متعلق ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں اس کے نام اور شخصیت کے تعین میں بھی اختلاف نظر آتا ہے۔ چنانچہ بعض مؤرخین عرب نے اس کو بہمن بن اسفند یار کہا ہے اور بعض نے ذوالقرنین کی شخصیت پر بحث کرتے ہوئے اس کا نام کیقباد بیان کیا ہے، حالانکہ ایران و یونان کے وہ مؤرخین جو کے ارش کے معاصر ہیں کیقباد (کمبوچہ) اس کے باپ اور اس کے بیٹے کا نام بتاتے ہیں اور بعض عرب مؤرخین نے اس کو لہراسپ بن کشتاسپ بتایا ہے۔

غرض جب گورش یا خورس میڈیا (ماہات) اور پارس دونوں ریاستوں کو ملا کر ایک زبردست اور خودمختار بادشاہ ہو گیا تو یہ وہ وقت ہے کہ بابل کے تخت سلطنت پر بنوکدنذر (بخت نصر) کا ایک جانشین بیل شازار سریر آرائے سلطنت تھا۔

یہ بادشاہ بخت نصر کی طرح اگرچہ جری اور بہادر نہیں تھا مگر ظلم اور عیاشی میں اس سے بھی آگے تھا، حتیٰ کہ خود اس کی اپنی رعایا اس کے اعمال بد سے پریشان اور اس کے ظلم سے عاجز اور ہر وقت انقلاب کی خواہاں رہتی تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جب کہ حضرت دانیال علیہ السلام اپنی الہامی پیشین گوئیوں، کریمانہ اخلاق، عالی صفات اور غیر معمولی فہم و فراست کی وجہ سے پبلک میں اس درجہ مقبول تھے کہ حکومت کے نظام کار میں دخیل اور مشیر بن گئے تھے۔ انہوں نے بیل شازار کو ہر چند سمجھایا اور بداعمالیوں سے روکا اور ڈرایا مگر اس پر مطلق اثر نہ ہوا، اور ایک دن اس نے یہ نوبت پہنچا دی کہ اپنی محبوبہ کے اصرار پر یروشلم کے مقدس ظروف کو جو "بخت نصر لوٹ کر لایا تھا" مجلس نشاط میں منگوا کر ان میں شراب پی اور ان کی توہین کی مگر ابھی وہ شراب نوشی میں مشغول ہی تھا کہ اس نے شمع کافوری کی روشنی میں یہ منظر اپنی آنکھ سے دیکھا کہ بغیر کسی شکل و صورت کے سامنے آئے ہوئے ایک ہاتھ غیب سے ظاہر ہوا اور اس نے محل کی دیوار پر چند جملے لکھ دیئے یہ دیکھ کر بادشاہ پر بہت ہیبت طاری ہوگئی اور اس نے فوراً نجومیوں، کاہنوں، جوتشیوں اور بڑے بڑے عقلاء و حکماء کو جمع کیا اور ان سے اس واقعہ کو نقل کر کے تحریر کا مفہوم معلوم کرنا چاہا، لیکن کوئی اس عقدہ کو حل نہ کر سکا اور وہ بھی بادشاہ کی طرح حیران رہ گئے، تب ملکہ نے کہا کہ اس برگزیدہ انسان دانیال کو بلائیں جس کی باتیں ہمیشہ سچی ہوتی ہیں اور جو اپنے اعمال و کردار میں بے نظیر انسان ہے وہی اس کو حل کر سکتا ہے۔

حضرت دانیال علیہ السلام دربار میں پہنچے تو بادشاہ نے واقعہ نقل کیا اور کہا کہ اگر تم اس کو حل کر دو تو میں تم کو دولت و ثروت سے مالا مال کر دوں گا۔ دانیال علیہ السلام نے ہنس کر جواب دیا کہ مجھے بادشاہ کی دولت درکار نہیں ہے میں بغیر کسی عوض کے ہی بادشاہ کے اس عقدہ کو حل کر دوں گا۔ اے بادشاہ! گوش ہوش سے سن خدا نے تجھ کو قوت اور دولت دونوں سے حصہ وافر عطا فرمایا اور نبیوں کی اولاد تک تیرے حوالہ کر دی مگر تو نے خدا کا شکر ادا نہ کیا اور جس نیک کرداری کی تجھ سے توقع ہو سکتی تھی وہ تو نے پوری نہ کی اور حد یہ ہے کہ تو نے مجلس نشاط میں یروشلم کے ظروف کی توہین کر کے گویا یروشلم کے خدا کو چیلنج کیا، چنانچہ اس کی جانب سے تجھ کو وہ جواب ملا جو تو نے نوشتہ میں دیکھا، نوشتہ کہتا ہے کہ ہم نے تجھ کو وزن کیا مگر تو پورا نہ اترا اور کم نکلا، ہم نے تیری حکومت کا حساب کیا اور اس کو تمام کر ڈالا اور ہم نے تیری حکومت پارہ پارہ کر کے فارس اور میڈیا کے بادشاہ کو بخش دی۔ [1]

چنانچہ اس واقعہ کو چند دن بھی نہ گزرے تھے کہ بابل کی رعایا نے چند افسروں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ خورس کے پاس

---

[1] نوشتہ کے الفاظ یہ ہیں: "منی منی تقیل او فیرسین" دانی ایل کی کتاب باب ۵ آیات ۲۵-۲۸۔

جائیں اور اس سے عرض کریں کہ آپ کی ایمان داری، عدل و انصاف اور رعایا پروری کی شہرت نے ہم کو مجبور کیا ہے کہ ہم آپ کو دعوت دیں کہ آپ ہم کو بیل شازار کے مظالم سے نجات دلا کر اپنی رعایا بنا لیجئے۔ خورس کے پاس یہ وفد اس وقت پہنچا جب کہ وہ مشرق کی مہم سر کرنے میں مشغول تھا، اس نے وفد کی درخواست کو سنا اور قبول کیا اور مشرقی مہم سے فارغ ہو کر بابل پہنچا اور اس کی مستحکم اور نہ تسخیر ہونے والی دوہری شہر پناہ کو منہدم کر کے حکومت بابل کا خاتمہ کر دیا اور تمام رعایا کو امن دے کر ان کو بیل شازار کے مظالم سے نجات دلائی جس کا بابل کی رعایا نے بے حد شکریہ ادا کیا اور بخوشی اس کی اطاعت قبول کر لی۔ ❶

جب خورس بابل کے شہر میں فاتحانہ داخل ہوا تو دانیال علیہ السلام نے اس کو توراۃ (صحف انبیاء) کی وہ پیشین گوئیاں دکھائیں جو حضرت یسعیاہ اور حضرت یرمیاہ علیہما السلام نے یہود کو غلامی سے نجات دلانے والی ہستی کے متعلق کی تھیں، خورس ان کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوا اور اس نے اعلان کر دیا کہ تمام یہود آزاد ہیں کہ وہ ملک شام و فلسطین کو واپس چلے جائیں اور وہاں جا کر خدا کے مقدس گھر یروشلم (بیت المقدس) اور اس کے ہیکل (مسجد) کو دوبارہ تعمیر کریں اور اس سلسلہ کے تمام اخراجات سرکاری خزانہ سے ادا کیے جائیں اور یہ بھی اعلان کیا کہ یہی دین حق ہے اور یروشلم کا خدا ہی سچا خدا ہے۔ ❷

"عزرا کی کتاب" میں ہے کہ اگرچہ خورس کی بدولت یہود کو دوبارہ آزادی اور خوش حالی نصیب ہوئی اور ہیکل کی تعمیر بھی شاہی خزانہ سے شروع ہوگئی مگر ابھی تکمیل نہیں ہوئی تھی کہ خورس کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا کیقباد (کمبوچہ) بھی جلد مر گیا، تب آٹھ سال کے اندر ہی دارا جو خورس کا چچازاد بھائی تھا اس کا جانشین ہوا، اس درمیان میں بعض مخالف افسروں نے یروشلم کی تعمیر کو حکماً روک دیا۔ تب حجی نبی اور زکریا نبی نے دارا کے دربار میں ایک مراسلہ بھیجا جس میں تعمیر بیت المقدس کے متعلق لکھتے ہوئے اس کو بتایا تھا کہ سرکاری دفتر میں خورس کا وہ حکم نامہ ضرور موجود ہوگا جس میں بیت المقدس کی تعمیر کا حکم اور خزانہ شاہی سے اخراجات کا ذکر کیا گیا ہے، آپ اس کو نکلوائیں اور اپنے افسروں کو حکم دیں کہ جو بھی اس کی تعمیر میں حائل ہو رہے ہیں ان کو روک دیں تاکہ ہم باطمینان اس کی تعمیر کر سکیں، چنانچہ دارا نے جب خورس کا حکم نامہ دفتر سے طلب کیا تو اس میں یہ تحریر تھا:

"خورس بادشاہ کی سلطنت کے پہلے سال مجھ خورس بادشاہ نے خدا کے گھر کی بابت جو یروشلم میں ہے یہ حکم کیا کہ وہ گھر اور وہ مکان جہاں قربانیاں کرتے ہیں بنایا جائے اور اس کی بنیادیں مضبوطی سے ڈالی جائیں اور خرچ بادشاہ کے خزانہ سے دیا جائے اور خدا کے گھر کے سنہرے رو پہلے برتن بھی جنہیں بنوکدنذر (یروشلم) کی ہیکل سے نکال لایا اور بابل میں لا رکھا سو پھیر دیئے جائیں اور یروشلم کی ہیکل میں اپنی اپنی جگہ رکھ دیئے جائیں، یعنی خدا کے گھر میں رکھ دیئے جائیں"۔ ❸

پس اس حکم کے مطابق دارا نے یروشلم کی تکمیل کا حکم دیا اور افسر کو سختی کے ساتھ روک دیا کہ کوئی اس میں ہرگز مزاحم نہ ہو اور یروشلم اور خدائے یروشلم کے ساتھ اپنی اور اپنے پیشرو کی عقیدت کا ان الفاظ میں اظہار کیا:

"میں ایک اور حکم کرتا ہوں کہ جو شخص اس فرمان کو ٹال دے اس کے گھر پر سے کوئی لٹھا کھینچ کر نکالا جائے اور وہ کھڑا کیا

---

❶ تاریخ کے یہ واقعات مع حوالہ جات ذوالقرنین کی بحث میں مفصل بیان ہوں گے۔

❷ یہ زکریا علیہ السلام کے والد نہیں ہیں بلکہ دوسرے نبی ہیں۔

❸ عزرا باب ٦ آیات ١-٥۔

Marfat.com

جائے اور وہ کھڑا کیا جائے اور وہ اس پر پھانسی دیا جائے اس بات کے لیے اس کا گھر کوڑے کا ڈھیر کر دیا جائے پھر وہ خدا جس نے اپنا نام وہاں رکھا ہے سب بادشاہوں اور لوگوں کو جو اس حکم کو بدل کے خدا کا وہ گھر جو یروشلم میں ہے بگاڑنے کو ہاتھ بڑھاتے ہوں غارت کرے میں (دارا) حکم دے چکا اس پر جلد عمل کرنا چاہیے"۔ ❶

چنانچہ جلد ہی حجی اور زکریا علیہما السلام انبیاء (بنی اسرائیل) کی نگرانی میں دارا کے نہر پار کے صوبہ دار تتنی اور شتر بوزنی اور ان کے رفقاء نے اس تعمیر کو مکمل کرا دیا۔ عزرا کی کتاب میں ہے:

"چنانچہ انہوں نے اسرائیل کے خدا کے حکم کے مطابق اور فارس کے بادشاہ خورس اور دارا اور ارتخششتا کے حکم کے مطابق تعمیر کی اور کام کو انجام تک پہنچایا"۔ ❷

یہودی بنی اسرائیل کو اب پھر ایک بار امن واطمینان نصیب ہوا اور انہوں نے ارض یہوداہ میں دوبارہ اپنی حکومت کو استوار کیا اور چونکہ شاہ بابل نے توراۃ کے تمام نسخوں کو بھی جلا کر خاک کر دیا تھا اور ستر برس تک وہ خدا کی اس کتاب سے محروم رہے تھے اس لیے ان کے اصرار پر حضرت عزیر (عزرا علیہ السلام) نے اپنی یادداشت سے از سر نو اس کو تحریر کیا۔

شرارت یہود کا دوسرا دور:

یہود کی قومی خصائل وعادات سے متعلق کافی معلومات کے بعد آپ کے لیے یہ بات حیرت انگیز نہیں ہو سکتی کہ اتنی سخت ٹھوکر کھانے اور ذلت ورسوائی کی اس عبرت ناک سزا کو برداشت کرنے کے باد..ر جن کی تفصیلات ابھی سپرد قلم ہو چکی ہیں، ان کی چشم عبرت اور گوش حق نیوش میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی اور ان کی حالت اس آیت کا مصداق ثابت ہوئی:

﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ﴾ (الاعراف:۱۷۹)

یعنی آہستہ آہستہ انہوں نے پھر ظلم وفساد اور بغاوت وسرکشی پر کمر باندھ لی اور گزشتہ بداخلاقیوں اور بدکرداریوں کا مظاہرہ شروع کر دیا۔

کچھ یہ بھی نہیں تھا کہ کوئی سمجھانے اور تنبیہ کرنے والا نہیں تھا کیونکہ خدائے تعالیٰ کے سچے پیغمبروں کا سلسلہ ان میں جاری تھا اور وہ ان کو سیدھی راہ پر لگانے اور بری راہ سے بچانے کے لیے برابر پند ونصیحت اور موعظت وبصیرت کا حق ادا کرتے رہتے تھے مگر ان کے قومی مزاج کا توازن اس درجہ خراب ہو چکا تھا کہ ان پر کسی اچھی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا تھا اور بادشاہ سے لے کر رعایا تک سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے، وہ پیغمبران حق کا مذاق اڑاتے، باطل کوشی کو شیر مادر سمجھتے اور اپنی حرکات بد پر شرمندہ ہونے کے بجائے فخر کرتے رہتے تھے، پھر صورت حال اس حد پر جا کر بھی ختم نہیں ہوئی بلکہ اسی درمیان میں ایک ایسا ہوش ربا حادثہ پیش آیا جس نے یہود کی دناءت اور باطل کوشی کو دوست دشمن دونوں کی نگاہ میں بخوبی روشن کر دیا۔

---

❶ باب ٦ آیات ١١-١٢ ❷ باب ٦ آیات ١٣-١٤

حضرت یحییٰ علیہ السلام کا قتل:

اس ہوش رُبا حادثہ کی تفصیل یہ ہے کہ انبیاء بنی اسرائیل میں سے یہ عہد حضرت یحییٰ علیہ السلام کی تبلیغ و دعوت کا عہد تھا اور ارض یہودیہ میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کے مواعظ کا یہ اثر ہو رہا تھا کہ بنی اسرائیل کے قلوب مسخر ہوتے جاتے تھے اور وہ جس جانب بھی نکل جاتے تھے جماعت کثیر ان پر پروانہ وار نثار ہونے لگتی تھی ادھر تو یہ حالت تھی اور دوسری جانب یہودیہ کا بادشاہ ہیرودیس نہایت ہی بدکار اور ظالم تھا وہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی مقبولیت دیکھ دیکھ کر لرزہ براندام تھا اور خوف کھاتا تھا کہ کہیں یہودیہ کی بادشاہت میرے ہاتھ سے نکل کر اس مرد ہادی کے پاس نہ چلی جائے۔ سوء اتفاق کہ ہیرودیس کے سوتیلے بھائی کا انتقال ہو گیا اس کی بیوی بے حد حسین تھی اور ہیرودیس کی بھاوج ہونے کے علاوہ اس کی علاتی بھتیجی بھی تھی، ہیرودیس اس پر عاشق ہو گیا اور اس سے عقد کر لیا۔ چونکہ یہ عقد اسرائیلی ملت کے خلاف تھا اس لیے حضرت یحییٰ علیہ السلام نے سر دربار اس کو اس حرکت پر ملامت کی اور خدا کے خوف سے ڈرایا۔ ہیرودیس کی محبوبہ نے یہ سنا تو غم و غصہ سے بے تاب ہو گئی اور ہیرودیس کو آمادہ کیا کہ وہ یحییٰ علیہ السلام کو قتل کر دے۔ ہیرودیس اگرچہ اس نصیحت سے خود بھی بہت برافروختہ تھا مگر اس ارادہ میں متامل تھا لیکن محبوبہ کے اصرار پر اس نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر قلم کر کے اور طشت میں رکھ کر اس کے پاس بھجوا دیا۔ سخت حیرت کا مقام ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی محبوبیت عام کے باوجود کسی اسرائیلی کو یہ جرأت نہیں ہوئی کہ ہیرودیس کی اس ملعون حرکت پر اس کو روکے یا ملامت کرے۔ بلکہ ایک جماعت نے اس کے اس ملعون عمل کو بنظر استحسان دیکھا۔ اب حضرت یحییٰ علیہ السلام کی شہادت کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت و تبلیغ کا وقت آ گیا اور انہوں نے علی الاعلان یہود کی بدعات مشرکانہ رسوم ظالمانہ خصائل اور بددینی کے خلاف جہاد لسانی شروع کر دیا۔ یہود میں یہ صلاحیت کہاں تھی کہ وہ امر حق پر لبیک کہتے۔ چنانچہ مختصر سی تعداد کے ماسوا بھاری اکثریت نے ان کی مخالفت شروع کر دی، اسی درمیان میں بادشاہ حارث نے جو ہیرودیس کی پہلی بیوی کے رشتہ سے اس کا خسر تھا اس پر چڑھائی کر دی اور سخت کشت و خون کر کے ہیرودیس کو ہزیمت فاش دی جس نے ہیرودیس کی قوت کا خاتمہ کر دیا تاہم یہودیہ کی ریاست رومیوں کے بل بوتے پر قائم رہی اس وقت اگرچہ عام طور پر یہودیہ کہتے تھے کہ ہیرودیس اور اسرائیلیوں کی یہ ذلت و ہزیمت حضرت یحییٰ علیہ السلام کے خون ناحق کی پاداش میں پیش آئی لیکن اس کے باوجود انہوں نے اس حادثہ سے کوئی سبق نہیں لیا اور وہ اپنے ظالمانہ مقاصد سے باز نہ آئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مخالفت میں بغض و عناد کے ساتھ سرگرم رہے تا آنکہ شاہ یہودیہ پلاٹس سے ان کے قتل کی اجازت حاصل کر کے ان کا محاصرہ کر لیا مگر خدائے تعالیٰ نے ان کے ارادوں کو ناکام بنا کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا۔ ❶

پاداشِ عمل:

آخر پاداش عمل سامنے آئی اور اب خود یہودیوں کے باہم خانہ جنگی شروع ہو گئی، وجہ یہ پیش آئی کہ اس دور میں یہود کے تین فرقے ہو گئے تھے ایک فقہاء کی جماعت تھی اور ان کو "فریسی" کہتے تھے اور دوسری جماعت اصحاب ظاہر کی تھی جو الہامی الفاظ کے ظاہر پر جمود کرتے تھے ان کو "صدوقی" کہتے تھے اور تیسری جماعت مرتاض راہبوں کی تھی ان میں سے فریسی اور صدوقی

❶ تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۷ تا ۴۵

Marfat.com

اختلاف اس درجہ ترقی کر گیا تھا کہ ان میں سخت خونریزیاں ہونے لگیں، شاہ یہودیہ جس گروہ کا طرف دار ہو جاتا تھا وہ دوسرے گروہ کو بے دریغ قتل کرتا تھا، آخر یہ جنگ اس قدر بڑھی کہ شاہ یہودیہ کو باغیوں کے خلاف رومیوں سے مدد لینی پڑتی تھی اور بت پرستوں کے ہاتھوں یہودیوں کو قتل کرایا جاتا تھا چنانچہ اس کشمکش میں رفع عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً ستر سال بعد یہود کے دو مدعیان حق یوحنان اور شمعون کے درمیان سخت معرکہ جنگ وجدل برپا ہوا یہ وہ زمانہ تھا جب کہ تخت روم پر اس کا ایک بہادر جرنیل اسبانوس قیصری کر رہا تھا اور ارض یہودیہ میں یوحنان کو کامیابی ہوگئی تھی۔ جو نہایت سفاک اور بدکار تھا اور اس کے ظالم ساتھیوں کے ہاتھوں ارض قدس کی تمام گلی کوچوں میں خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں اس حالت میں یہود نے اسبانوس سے مدد چاہی اور اس نے اپنے بیٹے طیطوس (ٹیٹس) کو ارض مقدس کی فتح پر مامور کیا، وہ آگے بڑھا اور ارض یہودیہ کے قریب جا کر اپنے ایک قاصد نیقانوس کو صلح کے لیے بھیجا۔ یہود کا پارہ ظلم و ستم بہت چڑھا ہوا تھا، انہوں نے اس کو بھی قتل کر دیا، اب طیطوس غضب ناک ہو گیا اور اس نے کہا کہ بلا لحاظ کسی فرقہ کے تمام یہود کا استیصال کر کے جاؤں گا تاکہ ہمیشہ کے لیے اس سرزمین سے یہ جھگڑا پاک ہو جائے۔ چنانچہ بقول مؤرخین اس نے بیت المقدس پر اس قدر سخت حملہ کیا کہ شہر پناہ منہدم ہوگئی، ہیکل کی دیواریں شکستہ ہوگئیں، محاصرہ کی طوالت سے ہزاروں یہود بھوکے مر گئے اور ہزاروں فرار ہو کر بے وطن ہو گئے اور جو بچے تھے وہ تلوار کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ رومیوں نے ہیکل کی بے حرمتی کی اور جہاں خدائے واحد کی عبادت ہوتی تھی وہاں بت جا کر رکھ دیئے۔ [1]

غرض یہ وہ شکست تھی کہ پھر یہود کبھی نہ ابھرے اور اپنی کمینہ اور ظالمانہ حرکات، علانیہ فسق و فجور اور نبیوں کے قتل کی پاداش میں ہمیشہ کے لیے ذلیل وخوار ہو کر رہ گئے۔

تیسرا زریں موقعہ اور یہود کی روگردانی:

کچھ عرصہ بعد رومیوں نے بت پرستی ترک کر کے عیسائیت اختیار کر لی اور اس طرح ان کے عروج و ترقی نے یہودی قومیت اور مذہب دونوں کو مغلوب ومقہور بنا دیا۔

آپ ابھی مطالعہ کر چکے ہیں کہ جب طیطوس رومی نے بیت المقدس کو برباد کر دیا تو یہودیوں کی ایک کافی تعداد وہاں سے بھاگ کر اطراف و جوانب میں جا بسی تھی، ان ہی میں سے بعض وہ قبائل بھی ہیں جو یثرب (حجاز) اور اس کے قرب و جوار میں ساکن ہو گئے تھے، یہ اور ان سے قبل و بعد جو قبائل یہود یہاں آ کر سکونت پذیر ہوئے ان کے اس انتخاب سکونت کے متعلق مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ یہود کی توراۃ اور قدیم صحیفوں سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ یہ سرزمین نبی آخر الزماں کا دارالہجرۃ بنے گی اور یہود نبی آخر الزماں کے اس درجہ منتظر تھے اور ان کے یہاں ان کی آمد کی اس قدر شہرت تھی کہ جب حضرت یحییٰ علیہ السلام نے تبلیغ و دعوت کے ذریعہ پیغام الٰہی سنانا شروع کیا تو یہود نے جمع ہو کر ان سے صاف کہا کہ ہم تین نبیوں کا انتظار کر رہے ہیں، ایک مسیح کا دوسرے الیاس کا اور تیسرے اس مشہور و معروف نبی آخر الزماں کا جس کی آمد کی شہرت ہمارے درمیان اس قدر ہے کہ ہم اس کے نام لینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے اور صرف اس کی جانب اشارہ کر دینے سے ہر ایک یہودی اس کو پہچان لیتا ہے، چنانچہ انجیل یوحنا میں یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے:

---

[1] ابن خلدون ج ۲

Marfat.com

"اور یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن [1] اور لیوی [2] یہ پوچھنے کو بھیجے کہ تو کون ہے تو اس نے اقرار کیا، انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں انہوں نے اس سے پوچھا پھر تو کون ہے؟ کیا تو ایلیا (الیاس علیہ السلام) ہے؟ اس نے کہا: میں نہیں ہوں، کیا تو وہ نبی ہے؟ [3] اس نے جواب دیا کہ نہیں، پس انہوں نے اس سے کہا پھر تو ہے کون؟ تا کہ ہم اپنے بھیجنے والوں کو جواب دیں؟ [4]

توراۃ، انجیل، صحائف انبیاء اور تاریخ یہود میں اور بھی بہت سے شواہد موجود ہیں کہ جن سے یہ تحقیق ہوتا ہے کہ یہود کو ایسے پیغمبر کا انتظار تھا جو نبی آخر الزماں (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوگا اور حجاز میں مبعوث ہوگا، اسی وجہ سے جب بھی وہ اپنے مرکز سے منتشر ہوئے ہیں تو ان کی ایک معقول تعداد اسی کے انتظار میں یثرب میں جا بسی۔ [5]

ابدی ذلت وخسران:

پس کس کس درجہ بدبخت و بدقسمت ہے وہ جماعت جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے تقریباً پانچ سو ستر سال تو اس انتظار میں گزارے کہ یثرب کی اس زمین میں جب خدائے تعالیٰ کا وہ پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہجرت کر کے آئے گا تو ہم اس کی پیروی کر کے اپنی قومی اور مذہبی عظمت و وقار کو پھر ایک بار حاصل کریں گے حتیٰ کہ یثرب کے قبائل اوس وخزرج کے مقابلہ میں بھی اس کی نصرت و مدد کے منتظر رہتے تھے مگر جب وہ نبی برحق آیا اور اس نے موسیٰ وعیسیٰ (علیہما السلام) اور توراۃ وانجیل کی تصدیق کرتے ہوئے ان کو پیغام حق سنایا تو سب سے پہلے انہوں (یہود) نے ہی ان کے خلاف بغض وعناد کا مظاہرہ کیا اور اس کی آواز پر کان نہ دھرتے ہوئے اس کی مخالفت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا اور نتیجہ میں ابدی ذلت وحرمان نصیبی کو مول لیا۔

اللہ تعالیٰ نے تو شروع ہی میں ان کو متنبہ کر دیا تھا کہ دو مرتبہ کی سرکشی اور اس کے انجام کے بعد ہم تم کو ایک موقعہ اور عنایت کریں گے پس اگر تم اس وقت سنبھل گئے اور تم نے خدا کی فرماں برداری کا ثبوت دیا اور خدا کے پیغمبر کی صداقت کا اقرار کر کے دین حق کو قبول کر لیا تو ہم بھی تمہاری عظمت رفتہ کو واپس لے آئیں گے اور دین و دنیا کی سعادت سے بہرہ اندوز کریں گے لیکن اگر تم نے اس موقعہ کو بھی گنوا دیا اور پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی قدیم شرارتوں کا مظاہرہ کیا تو ہم بھی پاداش عمل کا قانون نافذ کر دیں گے، ﴿وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا﴾۔

غرض جب یہود نے اس مرتبہ بھی اپنی قومی سرشت کو ہاتھ سے نہ دیا تو خدائے تعالیٰ نے بھی ان کے حق میں یہ آخری فیصلہ سنا دیا:

﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (البقرۃ:۶۱)

اور یہی ہوا بھی کہ قوم یہود کو نہ پھر کبھی عزت نصیب ہوئی اور نہ حکومت اور آج بھی وہ امریکہ اور یورپ میں بڑے بڑے سرمایہ دار ہونے کے باوجود قومی عزت وحکومت سے محروم ہیں اور قیامت تک محروم رہیں گے اور دنیا کی جو حکومت و طاقت بھی اپنے ناپاک مقاصد کی خاطر مسطورہ بالا فیصلہ کو چیلنج کر کے ان کو برسر حکومت و اقتدار لانا چاہے گی وہ بھی اپنے اس مذموم مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی اور بہت ممکن ہے کہ خود بھی قہر الٰہی کا شکار ہو کر یہود ہی کی طرح ذلت وخسران میں مبتلا ہو جائے اور دوسروں کے لیے عبرت و

---

[1]، [2] یہ یہود کے مذہبی مناصب ہیں۔ [3] توراۃ میں اس کا لقب فارقلیط (احمد) ہے۔
[4] باب ۱ آیات ۱۹-۲۱ [5] یہ بحث اپنے موقعہ پر تفصیل سے آئے گی۔

Marfat.com

بصیرت ہے ﴿وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ﴾۔

بہر حال اہل ذوق ان حقائق کے بعد باآسانی یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ قرآن عزیز کی زیر بحث آیات کا مصداق جو کہ بیت المقدس کی تباہی اور یہود کی بربادی سے تعلق رکھتا ہے تاریخی اعتبار سے بخت نصر اور طیطلیس رومی سے ہی متعلق ہے اور باقی اقوال بلحاظ تاریخ آیات کا صحیح مصداق نہیں بنتے ﴿فَاعْتَبِرُوْا يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ﴾۔

بصائر:

① اگرچہ دنیا "دار العمل" ہے "دار الجزاء" نہیں ہے تاہم خدائے تعالیٰ کبھی کبھی دنیا میں بھی مجرموں کو ان کی پاداش عمل میں اس طرح کس دیا کرتے ہیں کہ خود ان کو اور ان کے معاصرین کو یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہ ان کے جرائم کی سزا ہے اور ان کی تاریخی زندگی بعد میں آنے والوں کے لیے سامان عبرت و بصیرت بن جاتی ہے خصوصاً غرور اور ظلم یہ دو ایسے سخت جرائم اور ام الخبائث ہیں کہ مغرور اور ظالم کو آخرت کے عذاب کے علاوہ دنیا میں بھی ضرور اپنی بدعملیوں کا کچھ نہ کچھ خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے فرق صرف اس قدر ہوتا ہے کہ انفرادی کبر وظلم کی پاداش شخص وفرد کی زندگی سے متعلق ہوتی ہے اور قومی و اجتماعی کبر وظلم کی پاداش قومی اور اجتماعی زندگی سے وابستہ ہوتی ہے اس لیے اوّل الذکر کی مدت میں زیادہ عرصہ نہیں ہوتا مگر ثانی الذکر کی مدت کبھی ایسی طویل نظر آتی ہے کہ مظلوم قوم اور جماعت مایوسی کی حد تک پہنچ جاتی ہے اور اس کی نظر سے یہ نکتہ اوجھل ہو جاتا ہے کہ قوموں کے عروج و زوال اور عزت و ذلت اور کامرانی و ناکامی کی عمر افراد واشخاص کی عمر کی طرح نہیں ہوتی بلکہ طویل ہوتی ہے تاہم بعض حالات میں عبرت و بصیرت کے پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے اس مدت کو کبھی مختصر بھی کر دیا جاتا ہے چنانچہ یہود کی زیر بحث تاریخ کے واقعات وحالات اس کی زندۂ جاوید شہادت ہیں اور قابل صد ہزار عبرت و بصیرت۔

② منکرین حق اور باطل پرست قوموں کو اگر عبرت و بصیرت کے پیش نظر دنیا میں کسی قسم کی سزا دی جاتی یا ان کو عذاب الٰہی میں پکڑا جاتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان پر سے آخرت کا عذاب (عذاب جہنم) ٹل جاتا اور معاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ اسی طرح قائم رہتا ہے جو اپنے وقت پر ہو کر رہے گا:

﴿وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ⑧﴾ (بنی اسرائیل:۸)

③ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو اس کی بدکرداریوں اور اس کے مظالم ومفاسد کی وجہ سے عذاب میں مبتلاء کرنا اور اپنے پاداش عمل کے قانون کو ان پر نازل کرنا چاہتا ہے تو سنت اللہ یہ جاری ہے کہ وہ بداعمالیوں کے بعد فوراً ہی ایسا نہیں کرتا بلکہ ایک عرصہ تک اس کو مہلت دیتا اور ہادیوں اور پیغمبروں کی معرفت ان کو ترغیب وترہیب کی راہ سے ہدایت پر لانے کے تمام مواقع بہم پہنچاتا ہے تاکہ خدا کی حجت ہر طرح تمام ہو جائے پس اگر اس کے بعد بھی ان کی سرکشی اور بغاوت اور ظلم وعدوان کا تسلسل اسی طرح قائم رہتا ہے تو اس کی "بطش شدید" اچانک مجرم قوم کو اس طرح دبوچ لیتی ہے کہ پھر کیفر کردار پر پہنچے بغیر رستگاری ناممکن ہو جاتی ہے اور ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مشاہدہ کی صورت میں نمودار ہو جاتا ہے:

﴿وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۝۲۲۷﴾ (الشعراء:۲۲۷)

"عنقریب ظالم جان لیں گے کہ کس طریقہ انقلاب کے ذریعہ وہ الٹ دیئے جائیں گے"۔

ذوالقرنین
(۵۶۱ ق م)

○ تمہید، ذوالقرنین سے متعلق سوال کی نوعیت.... ○ ذوالقرنین اور سکندر مقدونی ○ ذوالقرنین اور ازوار میں علمائے سلف کی رائے متاخرین کی رائے ○ یہود و قریش اور انتخاب سوالات ○ ذوالقرنین اور انبیاء بنی اسرائیل کی پیشین گوئیاں ○ خورس اور تاریخی شواہد ○ مغربی مہم ○ مشرقی مہم ○ مہم شمالی ○ مہم فتح بابل ○ خورس کا مذہب ○ ایران قدیم کا مذہب ○ ذوالقرنین اور قرآن عزیز ○ یاجوج و ماجوج ○ سد ○ یاجوج و ماجوج کا آخری خروج

تمہید:

یہ واقعہ اپنی دلچسپ تاریخی روایت کے لحاظ سے تین اہم حصوں پر منقسم ہے ذوالقرنین کی شخصیت، سد ذوالقرنین، یاجوج و ماجوج۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان ہر سہ مسائل کو جدا جدا بیان کر کے اس واقعہ کی اصل حقیقت کو واضح کیا جائے۔

زیر بحث مسائل اور علماء اسلام:

سلف میں اگرچہ مسائل زیر بحث کے متعلق ایسے اقوال بہ کثرت ملتے ہیں جو ان مسائل کی تفسیر و تفصیل کی غرض سے بیان کیے گئے ہیں لیکن علماء متاخرین نے اس سلسلہ میں دو جدا جدا راہیں اختیار کر لی ہیں، ایک جماعت سلف کے بعض اقوال کو نقل کرنے کے بعد یہ کہہ دینے پر اکتفاء کرتی ہے کہ زیر بحث مسائل سے متعلق منقول اقوال چونکہ قرآن کی بیان کردہ شخصیت ذوالقرنین کے ساتھ پوری طرح مطابقت نہیں کرتے اس لیے ہمارے لیے یہ کافی ہے ہ ایک جانب یہ یقین و اعتقاد رکھیں کہ قرآن عزیز نے جس حد تک ذوالقرنین کی شخصیت، سد اور یاجوج و ماجوج پر روشنی ڈال دی ہے وہ بلاشبہ حق ہے اور باقی تفصیلات یعنی اس کی شخصیت کا تاریخی مصداق، سد کا جائے وقوع اور قوم یاجوج و ماجوج کا تعین، سو ان کے علم کو سپرد بخدا کر دینا چاہیے، کیونکہ "تفویض" کا طریقہ ہی اسلم طریقہ ہے لیکن جب ایک تحقیق طلب طبیعت اس پر قانع نظر نہیں آتی اور وہ اضطراب و تردد میں پڑ جاتی ہے تو یہ جماعت اس کو مطمئن کرنے کے لیے اس طرح سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ جب کہ دنیوی اسباب علم اور وسائل معلومات کے اس حیرت زا دور میں بھی محققین علم الآثار (Archaeology) کو یہ اعتراف ہے کہ ابھی وہ اس دنیا کے مستور تاریخی خزانوں اور نظروں سے اوجھل تاریخی حقائق کو معلوم کرنے میں سمندر میں سے قطرہ کی مقدار حاصل کر پائے ہیں اور جب کہ ہم چند صدی قبل تک دنیا کے چوتھے براعظم امریکہ کی دریافت سے بھی قاصر رہے تھے تو کون سے تعجب کی بات ہے اگر ابھی تک دنیا اور موجودہ علوم تحقیق سد ذوالقرنین کو نہ پا سکے اور یاجوج و ماجوج کے متعلق ان کا علم تحقیق ابھی تک قاصر رہا ہو اور وہ ذوالقرنین کی شخصیت کا تعین نہ کر سکے ہوں اور ہو سکتا ہے

پہلے دو امور وقت موعود تک یعنی قریب بہ قیامت منکشف ہو کر ہمارے سامنے آ جائیں اور ان دونوں کے انکشاف سے ذوالقرنین کی شخصیت کا بھی باآسانی تاریخی تعین ہو جائے پھر کون سی وجہ ہے کہ اگر ہم ان امور کی تاریخی تفصیلات کو آج نہ بیان کر سکیں تو اس بناء پر ان امور کو محض افسانوی داستان سمجھ لیا جائے۔ خصوصاً جب کہ قرآن عزیز وحی الٰہی کے علم ویقین کے ذریعہ ان کے وجود کی اطلاع دیتا ہے اور جب کہ اہل علم کا یہ مسلمہ نظریہ ہے کہ ہمارا کسی شے کو نہ جاننا اس کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ وہ شے حقیقتاً بھی وجود نہیں رکھتی۔ پس ایک مسلمان کے لیے تو اسی قدر کافی ہے کہ نفس مسئلہ پر یقین کرتے ہوئے تفصیلات کو سپرد بخدا کر دے اور منکرین وحی الٰہی کے لیے زیادہ سے زیادہ توقف کی گنجائش ہو سکتی ہے نہ کہ انکار پر اصرار کی۔

اس کے برعکس علماء اسلام میں سے دوسری جماعت ان مسائل کی تحقیق کے درپے ہے اور وہ قرآن عزیز کی عطاء کردہ روشنی میں ان کے حقائق کی تفصیلات کو واضح کرنا نہایت ضروری جانتی اور قرآن حکیم کی اہم تفسیری خدمت پر یقین کرتی ہے، اس کا خیال ہے کہ مسائل زیر بحث میں تفویض کے طریقہ کو اختیار کر کے ہم اپنی ذمہ داری سے کسی طرح سبکدوش نہیں ہو سکتے اور یہ اس لیے کہ قرآن نے ذوالقرنین کے معاملہ کو یہود کے سوال کرنے پر بیان کیا ہے اور اسی بناء پر وہ اسلوب بیان اختیار کیا ہے جس سے سوال کرنے والی جماعت اس اقرار کرنے پر مجبور ہو جائے کہ "نبی امی" نے وحی الٰہی کے ذریعہ ان ہر سہ مسائل کے متعلق جو تفصیلات بیان کی ہیں بلاشبہ وہ صحیح ہیں اور سورہ بنی اسرائیل میں "روح" کے سوال پر قرآن کا جواب اس کے برعکس اسلوب پر مذکور ہے اور دریافت کرنے والوں کو صرف اس قدر بتا کر کہ "روح" خدا کے حکم وامر میں سے ایک ایسی شے ہے جو اس کے حکم سے جسم میں داخل ہو جاتی ہے۔ مزید تفصیلات کو ان کی عقول کے لحاظ سے غیر ضروری قرار دے دیا ہے، لہٰذا اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن عزیز ذوالقرنین سے متعلق تفصیلات کے درپے ہے اور یہود کو یا مشرکین اور یہود دونوں کو ان کی معلومات کے مطابق مطمئن کرنا چاہتا ہے بلکہ اس سلسلہ میں ان کے یہاں بعض تفصیلات نے جو افسانوی شکل اختیار کر لی تھی اس کے خلاف حقائق واقعیہ کو کھول دینا چاہتا ہے۔

نیز اس لیے بھی یہ مسائل محتاج تحقیق ہیں کہ قرآن حکیم کے اسلوب بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہود اس تاریخی حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے اور ان کی قومی اور مذہبی زندگی کا اس کے ساتھ گہرا تعلق تھا تب بھی انہوں نے اس مسئلہ کو مشرکین کی اعانت کے لیے اس لیے انتخاب کیا کہ اس سے نبی اکرم ﷺ کی صداقت کا باآسانی امتحان ہو جائے گا، پس جو معاملہ آج سے تیرہ چودہ سو سال پہلے تک لوگوں کی معلومات میں تھا اور جس کی تفصیلات وہ قومیں بخوبی جانتی تھیں اس کے متعلق یہ کہہ کر سبکدوش اور قرآن کے بیان کردہ اس اہم واقعہ کی تفسیر سے عہدہ برآ نہیں ہوا جا سکتا کہ جب کہ ہم خدا کی زمین کے بہت سے حصوں سے ابھی تک ناواقف ہیں تو ممکن ہے کہ اس واقعہ سے متعلق شخصیتیں اور مقامات بھی اسی طرح غیر معلوم ہوں اور ہم ابھی تک ان کا پتہ لگانے سے قاصر رہے ہوں، چنانچہ علماء محققین مثلاً حافظ ابن تیمیہ، ابن کثیر، ابوحیان، ابن عبدالبر، امام رازی، حافظ ابن حجر، شیخ بدرالدین عینی، ابن ہشام اور ... رحمہم اللہ ان مسائل کی تحقیق وتدقیق کے درپے نظر آتے اور اس بارہ میں اپنے رجحان کے مطابق فیصلہ دینا چاہتے ہیں۔

مسائل زیر بحث سے متعلق ہمارا خیال ان ہی علماء تحقیق کی پیروی پر آمادہ ہے بلکہ ہم ان مسائل کے متعلق اس لیے اور بھی تحقیق وتدقیق کے خواہش مند ہیں کہ جن مستشرقین یورپ نے قرآن عزیز کے الہامی کتاب ہونے کے خلاف زہر چکانی کی ہے اپنے مزعومہ دلائل سے جہاں اس کو نبی اکرم ﷺ کا کلام ثابت کیا ہے وہیں یہ بھی ہرزہ سرائی کی ہے کہ قرآن کے بعض بیان کردہ

Marfat.com

واقعات حقائق نہیں ہیں بلکہ اہل عرب کے مشہور افسانوں کو حقیقت کے نام سے بیان کر دیا گیا ہے۔

اسلامی مسائل میں مستشرقین یورپ کو یہ کمال حاصل ہے کہ وہ اکثر تاریخی حقائق کو نظر انداز کر کے اپنے اندازے اور قیاس سے چند ایسے مقدمات وضع کر لیتے ہیں جن سے ان کو اپنے مزعومات اور خیالات میں مدد ملے اور اسلام بلکہ قرآن عزیز کے بیان کردہ حقائق کی تردید کی جا سکے۔ چنانچہ اصحاب رقیم (پیڑا) کے متعلق قرآن عزیز نے جب چند حقائق کا اظہار کیا اور موعظت وعبرت کے لیے وہ ان کے حالات و واقعات کو روشنی میں لایا تو انہوں نے اپنی ناواقف وجہل کو چھپانے یا تعصب کی راہ سے قرآن کو جھٹلانے کے لیے رقیم (پیڑا) کے وجود ہی سے انکار کر دیا اور جسارت بے جا کے ساتھ یہ کہہ دیا کہ محمد ﷺ نے عرب کے سنے سنائے جھوٹے قصے کو وحی الٰہی کہہ کر بیان کر دیا ہے مگر جب قدرت کے ہاتھوں نے قرآن کا اعلان حق کے تیرہ سو سال کے بعد پیڑا کو ٹھیک اسی مقام پر ظاہر کر دیا اور اس کے عظیم الشان کھنڈر اپنے وجود کا اعلان کرنے لگے تو ان کو حقیقت کے سامنے سر جھکانا پڑا اور ندامت وشرمساری کے ساتھ قرآن عزیز کے اعلان حق کو تسلیم کیے بغیر ان کے لیے کوئی چارۂ کار نہ رہا۔

اسی طرح جب قرآن عزیز نے تفصیل کے ساتھ یہ بتایا کہ بنی اسرائیل ایک طویل عرصہ تک مصر میں فراعنہ مصر اور قبطیوں کے غلام رہے ہیں اور موسیٰ علیہ السلام نے صدیوں کے بعد ان کو خدا کے بخشے ہوئے اعجاز کے ذریعہ نجات دلائی اور اس مسئلہ میں توراۃ نے بھی ایک حد تک قرآن اور وحی الٰہی کے علم یقین کا ساتھ دیا تو اس کے باوجود ان مدعیان علم نے ایک عرصہ تک مصر میں بنی اسرائیل کی غلامی کا انکار کیا اور علم حقیقی کی تکذیب کے درپے رہ کر اس کا مذاق اڑایا مگر مصری حضریات نے جب فرعون کے مشہور سنگی کتبہ کا انکشاف کرایا اور کتبہ کی کندہ عبارت نے بنی اسرائیل کی غلامی پر ایک حد تک روشنی ڈالی تو آہستہ آہستہ جہل نے علم کے سامنے شکست قبول کر لی اور اب ان نظریات میں بھی تبدیلی ہونے لگی جو فلسفہ تاریخ کے نام پر محض ظن وتخمین سے قائم کیے گئے تھے اور جن کو علم کا درجہ دیا جاتا تھا یہاں تک کہ اب انکار اقرار کی شکل میں تبدیل ہونے لگا ہے۔

ٹھیک اسی طرح ذوالقرنین یا جوج و ماجوج اور سد کا معاملہ ہے قرآن عزیز نے سورۂ کہف میں ایک ایسے بادشاہ کا ذکر کیا ہے جس کا لقب ذوالقرنین ہے اور جس نے مشرق ومغرب تک فتوحات کیں اور دوران فتوحات میں ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں کے بسنے والوں نے اس سے یہ شکایت کی کہ یاجوج و ماجوج ہم کو ستاتے اور وحشیانہ حملے کر کے فساد مچاتے اور بربادی لاتے ہیں آپ ہم کو ان سے نجات دلائیے۔ ذوالقرنین نے یہ سن کر ان کو تسلی وتشفی دی اور لوہے اور تانبے کو پگھلا کر دو پہاڑوں کے درمیان ایک ایسی سد قائم کر دی کہ شکایت کرنے والے یاجوج و ماجوج کے فتنہ سے محفوظ ہو گئے۔

مستشرقین یورپ نے جب اس واقعہ کا مطالعہ کیا تو حسب عادت اپنے پیشرو مشرکین مکہ اور کفار عرب کی طرح فوراً یہ کہہ دیا:

﴿اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ (المؤمنون: ۸۳)

"یہ (قرآن) کچھ نہیں ہے مگر پہلے لوگوں کی من گھڑت کہانیاں"۔

اور بڑے زور وشور کے ساتھ یہ دعویٰ کیا کہ ذوالقرنین کا یہ قصہ اخبار قرآنی کے اعجاز اور عبرت وموعظت کے لیے حقیقی واقعہ نہیں ہے بلکہ عبرت کی ایک فرسودہ داستان اور بے سروپا کہانی کو وحی الٰہی کی حیثیت دے دی گئی ہے ورنہ تاریخی دنیا میں

Marfat.com

ذوالقرنین اور یاجوج وماجوج کی شخصیتیں اور سد ذوالقرنین کا وجود کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

پس ایسی صورت میں ایک مسلمان کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے ذاتی اعتقاد کی بنا پر بلکہ تاریخی نقطہ نگاہ کے مطابق یہ واضح کرے کہ دوسرے تاریخی مسائل کی طرح قرآن عزیز کا عطاء کیا ہوا علم ویقین اس مسئلہ میں بھی اپنی جگہ اٹل اور علم ویقین کے درجہ کی حقیقت ہے اور معترضین کا انکار بلاشبہ جہل، ظن وتخمین اور باطل مزعومات کا طومار ہے اور ان تاریخی حقائق کا انکار صرف بے جا تعصب پر مبنی ہے نہ کہ اظہار حقیقت کے پیش نظر۔

ذوالقرنین:

ذوالقرنین کی شخصیت پر بحث کرنے سے قبل حل طلب اہم سوال یہ ہے کہ قرآن عزیز نے اس معاملہ کی جانب کس لیے توجہ کی اور اگر از خود نہیں بلکہ کسی سوال کے جواب پر توجہ مبذول کی تو سائل کون ہیں اور کس بنیاد پر انہوں نے اس سوال کا انتخاب کیا؟ یہی وہ سوال ہے جو دراصل اس معاملہ کی کلید ہے اور اگرچہ بہ سلسلہ شان نزول مفسرین اور ارباب سیر نے اس کی جانب توجہ فرمائی ہے مگر تحقیق شخصیت کے وقت ان حضرات نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے۔

ساتھ ہی یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ذوالقرنین کی شخصیت سد کا تعین اور یاجوج وماجوج کی تحقیق اگرچہ تین مستقل مسائل ہیں تاہم یہ تینوں اس طرح باہم مربوط ہیں کہ اگر کسی ایک کے متعلق واضح تحقیق سامنے آجائے تو قرآن عزیز کی تفصیلات کی روشنی میں باقی دو مسائل کے حل میں بہت زیادہ سہولت ہو جاتی ہے۔

ذوالقرنین سے متعلق سوال کی نوعیت:

محمد بن اسحٰق نے بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کیا ہے کہ قریش مکہ نے نضر بن حارث اور عقبہ بن معیط کو علماء یہود کے پاس پیغام دے کر بھیجا کہ چونکہ تم خود کو اہل کتاب کہتے ہو اور تمہارا دعویٰ ہے کہ تمہارے پاس زمانہ سابق کے پیغمبروں کا وہ علم ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے، لہٰذا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق ہم کو یہ بتائیں کہ ان کے دعویٰ پیغمبری کی صداقت کے متعلق آپ حضرات کی کتابوں میں کوئی تذکرہ یا علامات موجود ہیں یا نہیں؟ چنانچہ قریش کے وفد نے یثرب پہنچ کر علماء یہود سے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔ احبار یہود نے ان سے کہا تم اور باتوں کو چھوڑ دو ہم تم کو تین سوالات بتائے دیتے ہیں اگر وہ ان کا صحیح جواب دے دیں تو سمجھ لینا وہ ضرور اپنے دعوے میں سچے ہیں اور نبی مرسل ہیں اور تم پر ان کی پیروی واجب ہے اور اگر وہ صحیح جواب نہ دے سکیں تو وہ کاذب ہیں پھر تم کو اختیار ہے کہ جو معاملہ ان کے ساتھ چاہو کرو، وہ سوالات یہ ہیں:

اس شخص کا حال بیان کیجئے جو مشرق ومغرب تک فتوحات کرتا چلا گیا؟

ان چند نوجوانوں پر کیا گزرا جو کافر بادشاہ کے خوف سے پہاڑ کی کھوہ میں جا چھپے تھے؟

روح کے متعلق بیان کیجئے؟

وفد، مکہ واپس آیا اور اس نے قریش کے یہودی علماء کی گفتگو سنائی، قریش نے سن کر کہا "اب ہمارے لیے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے فیصلہ کرنا آسان ہو گیا کہ یہود کے ان سوالات کے جوابات ایک امی انسان جب ہی دے سکتا ہے کہ درحقیقت اس پر خدا کی

جانب سے وحی آتی ہو"۔ چنانچہ قریش مکہ نے خدمت اقدس ﷺ میں حاضر ہو کر تینوں سوالات پیش کیے، ان ہی سوالات کے جوابات کے لیے آپ ﷺ پر سورۂ کہف کا نزول ہوا۔ ①

محدثین نے اس روایت کے مختلف طریقوں کو بیان کر کے اس کی تحسین فرمائی ہے اور سدی کے طریق روایت میں اس قدر اور اضافہ ہے:

قال قالت الیھود اخبرنا عن نبی لم یذکرہ اللہ فی التوراۃ الا فی مکان واحد قال و من قالوا ذوالقرنین. ②

"یہود نے کہا: ہم کو اس نبی کا حال بتائیے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے توراۃ میں صرف ایک ہی جگہ کیا ہے، نبی اکرم ﷺ نے دریافت فرمایا وہ "کون؟" یہود نے کہا: ذوالقرنین"۔

یہود کے اس بلاواسطہ سوال کے متعلق محدثین یہ فرماتے ہیں کہ اس جگہ راوی نے اختصار سے کام لیا ہے صحیح تفصیل یہ ہے کہ ان سوالات کا انتخاب یہود نے کیا تھا، مگر قریش کی زبان سے ادا کرائے گئے اور ہوسکتا ہے کہ سوال میں لفظ توراۃ دیکھ کر نیچے کے کسی راوی نے اپنے وہم سے ان سوالات کو بلاواسطہ یہود کی جانب سے سمجھ لیا ہو۔

غرض اس روایت سے تین اہم باتوں پر روشنی پڑتی ہے: (الف) یہ کہ ذوالقرنین سے متعلق سوال اگرچہ قریش کی زبان سے ادا ہوا لیکن اصل میں یہ یہود کی جانب سے تھا۔ (ب) یہ ایسے شخص سے متعلق سوال تھا جس کو توراۃ میں صرف ایک جگہ "ذوالقرنین" کہا گیا ہے۔ (ج) اس شخص کو قرآن نے اپنی جانب سے ذوالقرنین کا لقب نہیں دیا بلکہ سوال کرنے والوں کے سوال کے پیش نظر اس کو دہرایا ہے چنانچہ قرآن کا یہ اسلوب بیان بھی اسی جانب اشارہ کرتا ہے:

﴿وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ﴾ (الکہف: ۸۳)

"وہ تجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ ذوالقرنین کا حال بتاؤ"۔

ذوالقرنین اور سکندر مقدونی:

ذوالقرنین کس شخصیت کا لقب ہے اس بحث سے قبل یہ معلوم رہنا از بس ضروری ہے کہ بعض حضرات کو یہ سخت مغالطہ ہو گیا ہے کہ سکندر مقدونی ہی وہ ذوالقرنین ہے جس کا ذکر قرآن، سورۂ کہف میں کیا گیا ہے، یہ قول باتفاق جمہور علماء سلف و خلف قطعاً باطل اور جہالت پر مبنی ہے اس لیے کہ قرآن کی تصریحات کے مطابق ذوالقرنین صاحب ایمان اور مرد صالح بادشاہ تھا اور سکندر مقدونی مشرک اور جابر بادشاہ گزرا ہے جس کے شرک و ظلم کی صحیح تاریخ خود اس کے بعض امرائے دربار نے بھی مرتب کی ہے اور تمام معاصرانہ شہادتیں بھی اس کے بت پرست اور جابر و ظالم ہونے پر متفق ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب "احادیث الانبیاء" میں ذوالقرنین کے واقعہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرہ سے قبل نقل کیا ہے اس کی شرح کرتے ہوئے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

---

① تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۷۲-۷۱ و در منثور ج ۳ ② قرطبی قلمی سورۂ کہف

Marfat.com

وفی ایرادہ المصنف ترجمۃ ذی القرنین قبل ابراھیم اشارۃ الی توھین قول من زعم انه الاسکندر الیونانی۔ [۱]

"مصنف نے ذوالقرنین کے واقعہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرہ سے قبل اس لیے بیان کیا ہے کہ وہ اس شخص کے قول کی اہانت کرنا چاہتے ہیں جو سکندر یونانی کو ذوالقرنین کہتا ہے"۔

اور پھر اپنی جانب سے تین وجوہ فرق بیان کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ سکندر یونانی کسی طرح بھی قرآن میں مذکور ذوالقرنین نہیں ہوسکتا، انہوں نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ جن حضرات نے سکندر مقدونی کو ذوالقرنین کہا ہے غالباً ان کو اس روایت سے مغالطہ ہوا ہے جو طبری نے اپنی تفسیر میں اور محمد بن ربیع جیزی نے کتاب الصحابہ میں نقل کی ہے اور جس میں اس کو رومی اور بانی اسکندریہ کہا گیا ہے مگر یہ روایت ضعیف اور ناقابل اعتماد ہے۔ [۲]

اور حافظ عماد الدین ابن کثیر ذوالقرنین کے نام کی تعیین سے متعلق مختلف اقوال نقل کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

اور اسحاق بن بشر نے بروایت سعید بن بشیر، قتادہ سے نقل کیا ہے کہ ذوالقرنین کا نام سکندر تھا اور یہ سام بن نوح علیہ السلام کی نسل سے تھا لیکن اسکندر بن فیلپس (مقدونی) کو بھی ذوالقرنین کہنے لگے ہیں جو رومی اور بانی اسکندریہ ہے مگر واضح رہے کہ یہ دوسرا ذوالقرنین پہلے سے بہت زمانہ بعد پیدا ہوا ہے کیونکہ سکندر مقدونی حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً تین سو سال قبل ہوا ہے اور مشہور فلسفی ارسطاطالیس اس کا وزیر تھا اور یہ ہی وہ بادشاہ ہے جس نے دارا بن دارا کو قتل کیا اور فارس کے بادشاہ کو ذلیل کر کے ان کے ملک پر قبضہ کرلیا، ہم نے یہ تنبیہ اس لیے کردی کہ بہت سے آدمی یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ دونوں ایک ہی شخصیت ہیں اور یہ اعتقاد کر بیٹھے ہیں کہ قرآن میں جس ذوالقرنین کا ذکر ہے وہ یہی سکندر مقدونی ہے جس کا وزیر ارسطاطالیس فلسفی تھا اور اس اعتقاد کی بدولت بہت بڑی غلطی اور بہت زیادہ خرابی پیدا ہوجاتی ہے اس لیے کہ ذوالقرنین اوّل مسلمان اور عادل بادشاہ تھا اور اس کے وزیر خضر علیہ السلام تھے جن کے متعلق ہم ثابت کر آئے ہیں کہ وہ نبی تھے اور دوسرا (مقدونی) مشرک تھا اور اس کا وزیر فلسفی تھا اور ان دونوں کے درمیان تقریباً دو ہزار سال سے بھی زیادہ کا فصل ہے پس کہاں یہ (مقدونی) اور کہاں وہ (عربی سامی) اور ان دونوں کے درمیان اس درجہ امتیازات ہیں کہ ماسوا غبی اور حقائق سے ناآشنا شخص کے دوسرا کوئی شخص ان دونوں کو ایک کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ [۳]

اور امام رازی رحمہ اللہ نے اگرچہ سکندر مقدونی کو ذوالقرنین کا لقب دیا ہے بایں ہمہ ان کو بھی یہ اقرار ہے:

کان ذوالقرنین نبیا و کان الاسکندر کافرا و کان معلمه ارسطاطالیس و کان یأتمر بامرہ وھو من الکفار بلاشك۔ [۴]

"ذوالقرنین نبی تھے اور سکندر مقدونی کافر تھا اور اس کا معلم اور وزیر بلاشبہ کافر تھا"۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس مغالطہ کی وجہ یہ نقل کی ہے کہ چونکہ قرآن میں مذکور ذوالقرنین مقتدا ہے اور وہ وسیع حکومت کا مالک رہا ہے اور سکندر یونانی بھی وسیع حکومت کا حکمران رہا ہے اس لیے اس کو بھی ذوالقرنین کہنے لگے یا اس لیے کہ وہ دو بادشاہوں روم اور فارس کا بادشاہ ہوگیا تھا اور دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے محمد بن اسحٰق نے اپنی سیرت میں ذوالقرنین کا نام سکندر نقل کردیا

---

[۱] فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۴
[۲] فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۴
[۳] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۰۵، ۱۰۶
[۴] تفسیر کبیر سورۂ کہف

Marfat.com

ہے اور چونکہ اس کی سیرت بہت مشہور ومقبول ہے اس لیے یہ نام بھی شہرت پا گیا اور حافظ عماد الدین کا خیال یہ ہے کہ چونکہ اسحٰق بن بشر کی روایت میں قرآن میں مذکورہ ذوالقرنین کا نام بھی سکندر بتایا گیا ہے اس لیے غلطی اور نادانی سے لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ سکندر مقدونی ہی ذوالقرنین ہے۔

غرض حافظ حدیث شیخ الاسلام ابن تیمیہ، ابن عبدالبر، زہیر بن بکار، ابن حجر، ابن کثیر، عینی رحمہم اللہ جیسے محققین نے اس مغالطہ کی پوری طرح تردید کر دی اور حقیقت بھی یہ ہے کہ قرآن نے ذوالقرنین کے جو محاسن ومناقب بیان کیے ہیں ان کے پیش نظر ایک بت پرست اور جابر وظالم شخص کو ان کا مصداق بنانا فاش غلطی ہے۔ ❶

---

❶ استدراک

کیا ذوالقرنین سکندر مقدونی ہے؟:

جولائی ۱۹۴۰ء کے برہان میں میرا ایک مضمون "ذوالقرنین اور سد سکندری" کے عنوان سے شائع ہوا تھا یہ مسلسل مضمون کی پہلی قسط تھی اور اگست کے برہان میں بھی، ابھی تک وہ سلسلہ ناتمام ہی تھا کہ محترم مدیر صاحب "صدق" نے پہلی قسط پر ایک "استدراک" لکھ کر برہان کی عزت افزائی فرمائی اور مجھ کو اس سلسلہ میں مزید لکھنے کا موقعہ مرحمت فرمایا جس کے متعلق صاحب موصوف کا ممنون ہوں۔

"یہ استدراک" برہان کی اشاعت سے قبل ہی ۴ اگست کے "صدق" میں قدرے اضافہ کے ساتھ طبع ہو گیا اور اب ۱۸ اگست کے "صدق" میں بھی "سد سکندری" کے عنوان سے اس کا ایک تکملہ یا ذیل شائع ہوا ہے۔

بہر حال اگست کے برہان میں جو "استدراک" شائع ہوا ہے چونکہ وہی اصل ہے اور صاحب استدراک کے دلائل کا حامل اس لیے "تنقید بر استدراک" کی بنیاد بھی اسی پر قائم کی گئی ہے اور "صدق" کے ہر دو مضامین کے اضافات کو ضمنی طور پر پیش نظر رکھا گیا ہے۔ (محمد حفظ الرحمٰن)

ذوالقرنین کی تحقیق سے متعلق میرا مضمون تحلیل وتجزیہ کے بعد دو حصوں پر تقسیم ہو سکتا ہے ایک مسئلہ کا "اثباتی پہلو" اور دوسرا "منفی پہلو"۔ اثباتی پہلو میں مضبوط دلائل کے ساتھ یہ واضح کیا گیا ہے کہ سائرس (کیخسرو یا خورس) ہی وہ شخصیت ہے جس کو قرآن عزیز نے "ذوالقرنین" کہہ کر یاد کیا ہے اور "منفی پہلو" میں ان اقوال کو مرجوح قرار دے کر جو "سائرس" کے علاوہ "ذوالقرنین" کا مصداق متعین کرتے ہیں اس کا اعتراف کیا ہے کہ یہ مسئلہ چونکہ قرآن عزیز میں منصوص اور مصرح مذکور نہیں ہے اس لیے دوسری ہستیوں کے متعلق بھی مجال گفتن باقی رہتی ہے لیکن ذوالقرنین سے متعلق قرآنی صفات اور تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ امر قطعی ہے کہ "سکندر مقدونی" کسی حالت میں بھی "قرآن کا ذوالقرنین" نہیں کہلا سکتا، اور بعض علماء حق نے اگر اس کو ذوالقرنین بتایا ہے تو سلف صالحین اور خلف صادقین کی اکثریت نے ان کے اس قول کی سختی سے تردید کی ہے اور ناقابل انکار دلائل کے ساتھ تردید کی ہے۔

علماء اسلام نے جن دلائل کی روشنی میں اس انکار پر اصرار کیا ہے اس کو تفصیل کے ساتھ زیر بحث مضمون میں نقل کیا گیا ہے لیکن محترم "صاحب استدراک" نے ان میں سے صرف تین باتوں کو منتخب فرما کر ان پر "استدراک" سپرد قلم فرمایا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان پر ترتیب وار "تنقیدی نظر" ڈالی جائے تاکہ مسئلہ زیر بحث بخوبی منقح ہو سکے۔ صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں:

مقالہ مذکور مندرجہ برہان بابت جولائی ۱۹۴۰ء ذوالقرنین کے سکندر مقدونی ہونے سے انکار دلائل ذیل کی بنا پر کیا گیا ہے:

① سکندر مقدونوی کی تاریخ کا یہ مسلمہ باب ہے کہ وہ یونانیوں کے قدیم مذہب اور دیوتاؤں کی پرستش کا مقلد تھا اور یہ کہ وہ ہرگز مسلمان نہ تھا۔

② سکندر باتفاق اصحاب تاریخ جابر وقاہر تھا نہ کہ نیک سیرت ونیک نفس۔

③ یہ بات بھی مسلمات میں سے ہے کہ اس کی فتوحات اور سیاحت کا سلسلہ مغرب کی جانب نہیں بڑھا۔ (رسالہ مذکورہ نمبر ۱۷-۱۶)

"عرض کرنے دیجئے کہ یہ تینوں دعوے مسلمات نہیں، بجائے خود مخدوش ومجروح ہیں"۔

اس کے بعد صاحب موصوف نے ان تینوں دلائل یا دعاوی کو "مخدوش" اور مجروح ثابت کرنے کے لیے بالترتیب دلائل پیش فرمائے ہیں، چنانچہ مضمون نگار کی

Marfat.com

....

پہلی دلیل کی تردید فرماتے ہوئے ارشاد ہے:

"نزول قرآن سے قبل والا ذوالقرنین ظاہر ہے کہ اصطلاحی معنی میں تو مسلمان ہو ہی نہیں سکتا تھا، اس کے مومن ہونے سے مراد صرف یہی ہو سکتی ہے کہ موحد (مسلم) اور اپنے زمانہ کے نبی کا مطیع تھا"۔ (برہان ماہ اگست)

مسلم؟:

مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ "صاحب استدراک" کا سکندر کے مسلمان ہونے کی بحث میں یہ فرمانا کہ "اصطلاحی معنی میں تو وہ مسلمان ہو ہی نہیں سکتا تھا" کیا معنی رکھتا ہے؟ اگر مراد یہ ہے کہ اصطلاحی معنی میں صرف وہی شخص "مسلمان" کہلایا جا سکتا ہے جو نبی اکرم ﷺ کی امت میں ہو اور دوسرے کسی نبی کی امت کو "مسلم" نہیں کہہ سکتے تو ظاہر ہے کہ یہ اصطلاح "قرآن کی اصطلاح" نہیں ہے کیونکہ وہ صاف یہ اعلان کرتا ہے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر محمد رسول اللہ ﷺ کے زمانہ تک خدا کے ہر نبی و رسول کا دین اسلام اور اس کی امت اجابت "امت مسلمہ" ہے اور اس کا سچا مطیع "مسلمان"۔

﴿أَمْ كُنتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِن بَعْدِي قَالُوا نَعْبُدُ إِلَٰهَكَ وَإِلَٰهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَٰهًا وَاحِدًا وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ﴾ (البقرۃ: ۱۳۳)

"کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب کی وفات کا وقت آ پہنچا اس نے اپنی اولاد سے کہا میرے بعد تم کس کی پرستش کرو گے؟ انہوں نے جواب دیا ہم تیرے اور تیرے باپ ابراہیم، اسمٰعیل اور اسحٰق کے ایک خدا کی پرستش کریں گے اور ہم تو اس کے فرمانبردار ہیں"۔

حافظ عماد الدین ابن کثیر اس کی تفسیر کرتے ہوئے، تحریر فرماتے ہیں:

وَالْإِسْلَامُ هُوَ ملة الانبياء قاطبه وان تنوعت شرائعهم واختلفت مناهجهم. (تفسیر ج۱ ص ۳۲۴)

"اور "اسلام" یہی تمام انبیاء علیہم السلام کی ملت ہے بلا تخصیص، اگرچہ ان کی شریعتیں اور ان کے طریقے مختلف ہیں"۔

اور اگر صاحب استدراک کی "مراد اصطلاحی معنی یہ ہے کہ سکندر اگرچہ موحد اور مسلم تو تھا مگر چونکہ نبی اکرم ﷺ کے زمانہ سے بہت پہلے تھا اس لیے عرف عام میں "مسلمان" نہیں ہو سکتا تو گستاخی معاف پھر اس کے لیے اصطلاحی معنی" کی تعبیر صحیح نہیں ہے اور نہ اس ارشاد کی یہاں کوئی ضرورت تھی جب کہ متکلم مخاطب دونوں پر یہ عیاں ہے کہ یہ اس سکندر کا ذکر ہے جو تقریباً تین سو سال قبل مسیح تھا۔

آگے چل کر "صاحب استدراک" ارشاد فرماتے ہیں:

"سو روایات یہود میں سکندر کو اسی حیثیت سے (یعنی موحد اور اپنے زمانہ کے نبی کا مطیع تھا) پیش کیا گیا ہے، چنانچہ جوزیفس (یہ حواریان مسیح کا ہم عصر ہے) کی قدیم تاریخ یہود میں بصراحت موجود ہے کہ سکندر نے ہیکل یروشلم میں آ کر وہاں عبادت کی۔ وہاں کے پیشواؤں کی تعظیم و تکریم کی اور جب دانیال کی یہ پیشین گوئی اسے دکھائی گئی کہ "ایک رومی فاتح ایران کی شہنشاہیت کو برباد کر دے گا وہ اس پیشین گوئی کا مصداق اپنے ہی کو سمجھا"۔ جیوش انسائیکلو پیڈیا میں تصریح لکھی چلی آتی ہے کہ اس وقت کے یہود اسے مسیح موعود ماننے کو تیار تھے"۔ (ج ۸ ص ۵۰۷)

ظاہر ہے کہ یہ معاملہ کسی مشرک کے ساتھ روا نہیں رکھا جا سکتا تھا اور نہ کوئی مشرک فرمانروا خود یہ معاملہ مرکز توحید کے ساتھ روا رکھتا۔ (برہان ماہ اگست)

"موحد" اور "مسلم" کی غلط تشریح کے علاوہ صاحب استدراک نے سکندر کو اس کا مصداق ثابت کرنے میں جو سند اور دلیل پیش کی ہے، وہ بھی صحیح نہیں ہے اس لیے کہ "صاحب استدراک" کے اس ارشاد میں ایک دعویٰ ہے اور دوسری اس کی دلیل، دعویٰ یہ ہے کہ "روایت یہود" میں سکندر کو موحد اور اسرائیلی نبی کے مطیع کی حیثیت میں پیش کیا گیا ہے اور دلیل یہ ہے کہ قدیم تاریخ یہود کے مصنف جوزیفس (جو کہ حواریان مسیح کا ہم عصر ہے) نے سکندر کے متعلق وہ سب کچھ لکھا ہے جو صاحب استدراک کی عبارت سے ابھی نقل ہو چکا اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ سکندر کے مسلمان (موحد) ہونے کا زبردست شاہد جوزیفس ہے۔ مگر جوزیفس کا یہ حال ہے کہ وہ خود یہود کے نزدیک قابل تسلیم نہیں۔

جوزیفس؟ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جوزیفس "یہود کے نزدیک" غیر معتبر اور ناقابل احتجاج و اعتماد ہے اور اس کی کتاب "قدیم تاریخ یہود" ان میں غیر

Marfat.com

مقبول ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جوزیفس میں دو خرابیاں ہیں جو کسی طرح یہود کی روایات کی صحت باقی نہیں رہنے دیتیں ایک یہ کہ وہ "مؤرخ" نہیں ہے بلکہ داستان سرا اور قصہ گو ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ اس درجہ جھوٹا ہے کہ واقعات کو طبع زاد گھڑ کر بیان کر دینے اور اصل واقعہ میں اپنی جانب سے من گھڑت اضافے کرنے کا عادی ہے۔

دوسرا عیب یہ ہے کہ اس کی دلی خواہش یہ تھی کہ یہودیوں، یونانیوں اور رومیوں کے درمیان جو نفرت قائم تھی اس کو کسی طرح مٹائے اور دونوں قوموں کے درمیان رابطہ اتحاد پیدا کرے اس لیے وہ یونانی و رومی روایات میں خصوصیت کے ساتھ ایسی داستانیں اختراع اور ایجاد کرتا رہتا اور ان کو تاریخی حیثیت میں پیش کرتا تھا جن کے ذریعہ سے وہ اپنے مسطورہ بالا مقصد کو پورا کرے اس لیے یونانیوں سے متعلق جس قدر روایات وہ بیان کرتا ہے خصوصیت کے ساتھ وہ قطعاً ناقابل اعتماد ہیں، اور کسی طرح لائق احتجاج نہیں۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجین اینڈ اتھکس میں ہے:

"یہ بات یقینی ہے کہ جوزیفس نہ تو اعلیٰ درجہ کا مؤرخ ہے اور نہ ایک ایماندار اور بے تعصب محقق جسے صرف حقیقت کی تلاش ہو بلکہ وہ ایسا مصنف ہے جس کی غرض و غایت صرف ایک مخصوص اثر پیدا کرنا ہے"۔ (ج ۷ ص ۵۷۴)۔

جوزیفس کا مقصد اور منتہائے نظر کیا ہے؟ آگے چل کر اسی کتاب میں اس کو اس طرح ظاہر کیا گیا ہے:

"اس کی منتہائے تمنا یہ ہے کہ یہودیوں کے خلاف جو تعصب پھیلا ہوا ہے اسے دور کرے اور ان پر جو الزامات عائد کیے جاتے ہیں ان سے ان کو بری ثابت کرے اور یہودیوں اور یونانیوں کے درمیان پیدا شدہ دشمنی کو مٹا دے"۔ (ج ۷ ص ۵۷۴)

جوزیفس کا یہ مقصد برا نہیں تھا اگر تاریخی حقائق پر مبنی ہوتا اور صحیح واقعات کی روشنی میں اس کو کامیاب بناتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس یہ کیا:

"اس کا یہ حمایتی مقصد اس امر سے بالکل آشکارا ہو جاتا ہے کہ وہ ایسے ماخذوں کا انتخاب کرتا ہے اور ایسے ٹکڑوں کا حوالہ دیتا ہے جن میں یہودیوں کے ساتھ قدیم بادشاہوں اور رومیوں کے الطاف و اکرام کا تذکرہ ہے اور صداقت کو اپنے میلان اور رجحان کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھاتا ہے اگرچہ وہ اس بات کا مدعی ہے کہ حقیقت اور مکمل حقیقت کے سوا کچھ نہیں لکھے گا لیکن وہ ایفاء وعدہ نہ کر سکا اس لیے کہ وہ اپنے مسطورہ بالا مقصد کو پورا کرنے کے لیے کہیں تو بعض چیزوں کو قصداً قلم انداز کر جاتا ہے اور کہیں اپنی طرف سے اضافہ کر دیتا ہے اور جگہ جگہ نہایت بے پروائی اور بے ضابطگی کے ساتھ ماخذوں کے حوالے دیتا ہے"۔ (ج ۷ ص ۵۷۴)

جوزیفس کی تاریخ بددیانتی کا معاملہ صرف یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ مقصد کی تکمیل کے لیے اپنی مقدس کتاب بائبل کے واقعات کو بھی توڑ مروڑ کیے بغیر نہیں چھوڑتا:

"اور یہی وجہ ہے کہ بائبل کے واقعات بھی کبھی کبھی اس کے قلم سے بالکل نئے معنی اور نئے پہلو اختیار کر لیتے ہیں"۔ (انسائیکلو پیڈیا ریلیجین ج ۷ ص ۵۷۴)

جوزیفس کی اس غیر مؤرخانہ روش اور بددیانتی کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنی تاریخی تصانیف کو خود اپنی قوم "یہود" میں بھی مقبول نہ کر سکا اور ان میں بھی اپنا اعتماد کھو بیٹھا:

"اس کی تاریخی تصانیف اس کی قوم میں سب سے کم مقبول ہوئیں اس کی قوم اس کو بے وفا اور غدار سمجھتی ہے"۔ (انسائیکلو پیڈیا ریلیجن ج ۷ ص ۵۷۷)

یروشلم اور سکندر:

اور یہ واضح رہے کہ "جیوش انسائیکلو پیڈیا" کا مضمون بھی اسی کی تاریخ سے ماخوذ ہے۔ جوزیفس کے متعلق یہ حوالجات تو اس کی عام مؤرخانہ حیثیت اور اس کی تاریخی کتابوں کی قدر و قیمت سے متعلق تھے اب ریلیجین انسائیکلو پیڈیا کی زبانی ان واقعات خصوصی کی حقیقت کو بھی سن لیجئے جن کو صاحب استدراک نے سکندر کے موحد اور (مسلمان) ہونے کی دلیل میں ذکر فرمایا ہے (یعنی اس کا یروشلم میں جانا، جا کر عبادت کرنا اور یہودی پیشواؤں کی تعظیم کرنا وغیرہ):

"ایسر (Esthar) کی کتاب اور عہد ارٹا سرزز (Artazerxes) کے تذکرہ کے بعد جوزیفس جب قصص تورات کے آخری حصہ پر پہنچتا ہے تو اسی جگہ سے اس کی کتاب انٹی کوئیٹس جوڈیکو (Antiqaitetas Judacio) کے دوسرے باب کا آغاز ہوتا ہے اس باب کے شروع ہی میں روایات کا تسلسل جاتا رہتا اور ان میں ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے جو "مکابیین بغاوت" (Maceabbsn Revolt) کے دور تک برابر قائم رہتا ہے اور تین صدی تک چلا جاتا ہے۔ اور اسی کے اندر سکندر مقدونی، ٹولیمی اور سلیولیائڈ (Seleueidat) وغیرہ کے عہد حکومت بھی آ جاتے ہیں ان ادوار ہائے حکومت کے متعلق جوزیفس صرف بے ربط قصے بیان کرتا ہے جو سکندر کے آخری دور کے ماخذ سے لیے گئے ہیں اس غیر مسلسل اور بے ربط سلسلہ کی سب سے پہلی چیز

Marfat.com

ذوالقرنین اوراذ وایمن:

ایک جو یاء حق کو یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ وسعت حکومت اور زبردست سطوت وصولت کے لحاظ سے جس طرح بعض حضرات نے سکندر مقدونی کو ذوالقرنین کا لقب دے دیا ہے اسی طرح یمن کے بعض تبابعہ کو بھی اہل عرب وسعت حکومت کی بنیاد پر ذوالقرنین کہتے آئے ہیں، مثلاً ابوکرب تبع نے اپنے دادا کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے:

قد کان ذوالقرنین جدی مسلما ملکا تدین له الملوك و تسجد

"میرا دادا ذوالقرنین مسلمان تھا اور ایسا پر شوکت بادشاہ تھا کہ بہت سے بادشاہ اس کے تابع فرمان اور اس کے سامنے پست تھے"۔

اور عرب کے مشہور شعراء امراء القیس، اوس بن حجر اور طرفہ بن عبدہ وغیرہ کے کلام میں بھی حمیری بادشاہوں کو ذوالقرنین کہا گیا ہے۔ [1]

اسی طرح ایرانی بادشاہوں میں سے اہل عرب کیقباد اور فریدوں کو بھی ان کی قاہرانہ فتوحات کی وجہ سے ذوالقرنین کہتے تھے۔ [2]

مگر یہ سب مسطورہ بالا وجہ کی بنیاد پر ہی ذوالقرنین کہلاتے رہے ہیں اور قرآن میں مذکورہ ذوالقرنین ان میں سے کوئی نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت استاذ محقق عصر علامہ سید محمد انور شاہ رحمہ اللہ نے اس حقیقت کو بخوبی واضح کر دیا ہے، فرماتے ہیں: ذوالقرنین کے

اسکندر کا یروشلم جانا ہے اور اس کے ساتھ وہ تمام واقعات بھی ہیں جو اس کے وہاں جانے سے پہلے اور جانے کے بعد سے وابستہ ہیں، کیونکہ یہ واقعہ جوزیفس نے ایک ایسے ماخذ سے لیا ہے جو غیر معتبر اور غیر موثق ہے اور "دانیال نبی کی کتاب" کے بعد کی کتاب سے ماخوذ ہے"۔ (انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس ج ۷ ص ۵۷۴)

یہ حقیقت ہے اس حوالہ کی جو جیوش انسائیکلوپیڈیا سے نقل کر کے "صاحب استدراک" نے ایسے اہم تاریخی مسئلہ کے متعلق تحریر فرمائے ہیں کہاں یہ من گھڑت اور بے دلیل قصہ جس کا ماخذ تک غیر معتبر اور غیر مستند ہے اور کہاں سائرس کے یروشلم بنانے اور خدا کے مسیح ہونے کے وہ ناقابل تردید تاریخی واقعات جو کتاب مقدس اور صحیح تاریخی حوالوں سے ثابت ہیں۔

بہرحال جوزیفس اس کی کتب تاریخ اور اس کے تاریخی ماخذوں کے متعلق مسطورہ بالا محققانہ حوالہ جات کے بعد آپ خود کتاب مقدس کی طرف رجوع کیجئے اور معلوم کیجئے کہ داستان سرا اور قصہ گو جوزیفس کی یروشلم والی داستان اور یہود کا سکندر کو مسیح موعود مان لینے کا قصہ یہ دونوں کیا حقیقت رکھتے ہیں۔

خدا کا مسیح ابھی بابل کے بادشاہ بخت نصر (بنوکدرزار) نے بیت المقدس پر چڑھائی نہیں کی تھی کہ حضرت یسعیاہ نبی علیہ السلام نے وحی الٰہی سے خبر پا کر یہود کو مطلع کیا کہ وقت آنے والا ہے کہ بابل کی حکومت کے ہاتھوں یروشلم کا ہیکل برباد ہوگا اور اس کی توہین کی جائے گی اور اس کے بعد یہ بشارت سنائی کہ وہ پھر خورس (سائرس) کے ہاتھوں بنایا جائے گا اور اس کی عزت وحرمت برقرار کی جائے گی اور یہود بابل کی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے، چنانچہ پیشین گوئی کے الفاظ یہ ہیں:

"خداوند تیرا نجات دینے والا جس نے تجھے رحم میں بنا ڈالا یوں فرماتا ہے: یروشلم کی بابت کہتا ہے کہ وہ آباد کی جائے گی اور یہوداہ کے شہروں کی بات کہ وہ بنائے جائیں گے اور میں اس کے ویران مکانوں کو تعمیر کروں گا جو سمندر کو کہتا ہوں کہ سوکھ جا اور میں تیری ندیاں سوکھا ڈالوں گا جو خورس کے حق میں کہتا ہوں کہ وہ میرا چرواہا ہے اور وہ میری ساری مرضی پوری کرے گا اور یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ بنائی جائے گی اور ہیکل کی بابت کہ اس کی بنیاد ڈالی جائے گی"۔ (یسعیاہ باب ۴۴ آیت ۲۳-۲۸)

[1] فتح الباری ج ۶ [2] تاریخ ابن کثیر ج ۲

Marfat.com

معاملہ میں ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو وہ اہل مشرق میں سے تھا جیسا کہ بعض کا خیال فغفور چین کی جانب ہے اس لیے کہ اگر وہ مشرقی ہوتا تو قرآن عزیز اس کے سفر مغرب کے بعد یہ کہتا کہ وہ پھر مشرق کو لوٹ گیا یعنی اپنے وطن کی جانب واپس ہو گیا یہ نہ کہتا اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ اور نہ وہ اہل مغرب میں سے تھا بلکہ مشرق و مغرب کے درمیانی علاقہ کا باشندہ تھا۔

والراجح انه ليس من اذواء اليمن لا كيقاد بن ملوك العجم ولا هو اسكندر بن فيلقوس بل ملك اخر من الصالحين ينتهي نسبه الى العرب الساميين الاولين ذكره صاحب الناسخ. ❶

"اور راجح یہ ہے کہ ذوالقرنین (مذکور فی القرآن) نہ یمن کے بادشاہوں میں سے تھا اور نہ شاہان عجم میں سے کیقباد ذوالقرنین تھا اور نہ سکندر بن فیلفوس (مقدونی) ہی ذوالقرنین تھا بلکہ وہ ان سب سے جدا ایک نیک بادشاہوں میں سے تھا جن کا نسب قدیم سامی عرب تک پہنچتا ہے ناسخ التواریخ نے ایسا ہی کہا ہے۔"

---

❶ عقیدۃ الاسلام فی حیوۃ عیسیٰ علیہ السلام ص ۱۹۵۔

﴿اٰیٰتٌ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ﴾ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ (نور اللہ مرقدہٗ) نے ذوالقرنین کے مسئلہ کو ضمنی طور پر بیان فرمایا ہے کیونکہ اس مقام پر ان کا مطمح نظر ذوالقرنین کی شخصیت کی تحقیق نہیں ہے بلکہ مرزا غلام احمد قادیانی کی ان ہفوات کی تردید مقصود ہے جو یاجوج و ماجوج سد، دجال کے خروج اور مسیح بن مریم علیہ السلام کے نزول سے متعلق ہیں اور جن پر قادیانی نے اپنی نبوت اور یسوع مسیح ہونے کے دعوے کی بنیاد قائم کی ہے۔ اور یہ ثابت کرنا چاہے کہ یورپ کی موجودہ متمدن اقوام ہی وہ یاجوج و ماجوج ہیں جن کا ذکر قرآن عزیز نے کیا ہے اور یہ کہ دجال ان کے پادری ہیں اور میں ہی یسوع مسیح ہوں، احادیث میں جس کے نزول کی خبر دی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ وہ قرب قیامت میں آکر ان سب کا استیصال کرے گا۔

حالانکہ قادیانی مشن کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اس نے اقوام یورپ کے الحاد و زندقہ، فساد فی الارض اور دجل و مکر کی زبردست وبا کو روکنے یا ختم کر دینے کی بجائے ممالک اسلامیہ کو یورپ کی بعض حکومتوں کے استعماری عزائم کے حوالہ کرنے اور غلام بنانے جہاد جیسے فریضہ اسلامی کی منسوخی کا اعلان کر کے اپنے مزعومہ یاجوج و ماجوج کو خوش کرنے اور اپنے منکرین پر کفر کا عام فتویٰ دے کر کروڑوں پرستارانِ توحید کو کافر اور خارج از اسلام قرار دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا اور نام نہاد تبلیغ اسلام کے پردہ میں بھی اپنے مشن کی کامیابی کے علاوہ اور اسلام کی کوئی خدمت انجام نہیں دی:

"خداوند اپنے مسیح خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ میں نے اس کا داہنا ہاتھ پکڑا کہ امتوں کو اس کے قابو میں کروں اور بادشاہوں کی کمریں کھلوا ڈالوں۔ اور میں گاڑے ہوئے خزانے اور پوشیدہ مکانوں کے گنج تجھے دوں گا تاکہ تو جانے کہ میں خداوند اسرائیل کا خدا ہوں جس نے تیرا نام لے کے بلایا ہے"۔ (باب ۴۴ آیت ۳۱)

حضرت یسعیاہ علیہ السلام نبی کی یہ پیشین گوئی خورس (سائرس) کے فتح بابل سے ایک سو ساٹھ برس پہلے یہود کو سنائی گئی اور فتح بابل کے صرف ساٹھ برس پہلے اس کی تائید میں حضرت یرمیاہ نبی نے یہود کو یہ پیشین گوئی سنائی تھی:

"وہ کلام جو خداوند نے بابل کی بابت اور کسدیوں کی سرزمین کی بابت یرمیاہ نبی کی معرفت فرمایا۔ تم قوموں کے درمیان بیان کرو اور اشتہار دو اور جھنڈا کھڑا کرو۔ منادی کرو، مت چھپاؤ۔ لکھو کہ بابل لے لیا گیا بعل رسوا ہوا مردوک سراسیمہ کیا گیا ہے اس کے بت خجل ہوئے اس کی مورتیں پریشان کی گئیں کیونکہ اتر سے قوم اس پر چڑھتی ہے جو اس کی سرزمین کو اجاڑ کرے گی الخ"۔ (یرمیاہ باب ۵ آیت ۱-۳)

اور عزرا نبی کی کتاب میں بصراحت موجود ہے کہ خورس (سائرس) نے یروشلم کی ہیکل کو تعمیر کیا اور اس نے اس کی تعمیر اور عزت و حرمت کا اپنی قوم میں اعلان کرایا اور اس طرح یرمیاہ نبی کی بشارت پوری ہوئی:

"اور شاہ فارس خورس کی سلطنت کے پہلے برس میں اس خاطر کہ خداوند کا کلام جو یرمیاہ کے منہ سے نکلا تھا پورا ہوا۔ خداوند نے شاہ فارس خورس کا دل ابھارا کہ اس نے اپنی تمام مملکت میں منادی کرائی اور اسے قلمبند بھی کر کے یوں فرمایا شاہ فارس خورس یوں فرماتا ہے کہ خداوند آسمان کے خدا نے زمین کی ساری

Marfat.com

مملکتیں مجھے بخشیں اور مجھے حکم کیا ہے کہ یروشلم کے بیچ جو یہوداہ میں ہے اس کے لیے ایک مسکن بناؤں پس اس کی ساری قوم میں سے کون کون ہے اس کا خدا اس کے ساتھ ہو اور وہ یروشلم کو جو شہر یہوداہ ہے جائے اور خداوند اسرائیل کے خدا کا گھر بنائے کہ وہی خدا ہے جو یروشلم میں ہے الخ"۔

(عزرا باب ۱ آیت ۱-۳)

یسعیاہ نبی اور یرمیاہ نبی کی پیشین گوئیوں سے اور عزرا نبی کی کتاب میں اس بیان کردہ منادی سے جو خورس (سائرس) کی جانب سے کی گئی تین صاف اور صریح طور پر ظاہر ہوتی ہیں:

① توراۃ کی پیشین گوئیاں خورس کو خدا کا چرواہا اور خدا کا مسیح بتا رہی ہیں نہ کہ سکندر کو۔

② یروشلم (بیت المقدس) کے ہیکل کی تعمیر، اس کی عزت و حرمت کا اعلان، اس کے خدا کے گھر ہونے کا اقرار اور یہود کی آزادی، خورس (سائرس) کے ہاتھوں ہوئی نہ سکندر کے۔

③ یرمیاہ نبی کی پیشینگوئی میں اگرچہ نام نہیں ہے لیکن یہ تصریح ہے کہ بابل کا تباہ کرنے والا اور یروشلم کو آباد کرنے والا اتر (شمال) سے اٹھے گا۔ سو یہ فارس و میڈیا کا بادشاہ خورس ہی ہو سکتا ہے نہ کہ سکندر جو یونان سے (بابل کی جانب مغرب سے) اٹھا اور عزرا نبی کی تصدیق بھی اس کی تائید کرتی ہے۔

④ یہ تمام پیشین گوئیاں متفق ہیں کہ خورس کی فتوحات جابرانہ و قاہرانہ انداز کی نہیں تھیں بلکہ ایک صالح اور باخدا انسان کی حیثیت سے تھیں اور کتاب مقدس کے ان صاف اور صریح بیانات کے علاوہ تاریخی حقائق بھی ان نتائج کی زبردست تردید کرتے ہیں، چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں سائرس کے متعلق یہ تصریحات موجود ہیں۔

"بابل پر جب سائرس حملہ آور ہوا تو وہاں کے یہودیوں نے ایرانیوں کو نجات دہندگان اور موحدین کہہ کر پکارا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہود کی مدد کے صلہ میں سائرس نے یہودیوں کو یروشلم اور ان کا معبد (ہیکل) واپس کر دیا اور انہیں فلسطین لوٹنے کی اجازت دے دی"۔ (ج ۶ ص ۵۲۷ ایڈیشن ۹)

اب کتاب مقدس اور اس کے ان روشن تاریخی حوالوں پر نظر کیجیے اور پھر جوزیفس کی اس بددیانتی کی داد دیجیے کہ اس نے یروشلم کی تعمیر علماء یہود کی تعظیم و تکریم اور خدا کے مسیح کے ہاتھوں یہود کی بابل سے نجات کے تمام ان معاملات کو جو کتاب مقدس نے خورس (سائرس) کے لیے مخصوص کیے تھے کس جرأت کے ساتھ سکندر مقدونی پر اس غرض سے چسپاں کر دیے کہ کسی طرح اس کا یہ مقصد کہ یہودیوں اور یونانیوں اور رومیوں کے درمیان منافرت کی خلیج کو پاٹ دیا جائے، پورا ہو جائے مگر اس کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور یہودیوں نے ان تحریفات کی بنا پر (جیسا کہ ابھی حوالہ گزر چکا ہے) اس کو خائن اور غدار کہہ کر اس کی تاریخی کتابوں کو بھی غیر مقبول قرار دے دیا اور اگر ہم بالفرض سکندر کے معاملہ زیر بحث میں جوزیفس کی روایت کو صحیح بھی مان لیں تو اس کی حقیقت زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتی ہے (جیسا کہ تاریخ شاہد ہے) کہ سکندر کی یہ عادت تھی کہ جس ملک کو فتح کرتا وہاں کی پبلک کو اپنا بنانے کے لیے ملکی رسم و رواج کے مطابق عبادت کر کے یہ ثابت کرتا کہ مجھ کو بھی ان عقائد و عبادات سے ایسا ہی تعلق ہے جیسا کہ اس ملک کے رہنے والوں کو پھر کیا عجب ہے کہ یہودیوں کو متاثر کرنے کی خاطر اس نے یروشلم میں بھی یہ ڈھونگ رچایا ہو یا سائرس کی نقل اتار کر یہودیوں میں ذوالقرنین بننے کی کوشش کی ہو اگرچہ وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا:

"چنانچہ بستانی کی انسائیکلو پیڈیا میں ہے کہ سکندر جب مصر پہنچا تو لیبیا کے کاہنوں اور باشندوں کو خوش کرنے کے لیے ان کے معبود (مشتری) کی پرستش کی"۔ (ملاحظہ ہو ج ۳ ص ۵۴۶)

اور انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ہے:

بابل میں سکندر نے وہاں کے مقامی دیوتاؤں کو بھینٹ چڑھائی جیسا کہ اس نے دوسرے مقامات پر بھی اسی طرح کیا تھا (یعنی دیوتاؤں کی پرستش کی تھی) اور یہ تمام ملکوں کے مذاہب کی آمیزش آگے چل کر یونانی الحاد و بے دینی پر بڑی حد تک اثر انداز ہوئی"۔ (ج ۱۵ ص ۱۴۱ ایڈیشن ۹)

ہاں یہ صحیح ہے کہ کتاب مقدس کی مسطورہ بالا پیش گوئیوں کی صحت پر بعض عیسائی مؤرخوں نے یہ شبہ ظاہر کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ یہ پیشین گوئیاں جن میں خورس کا نام تک مذکور ہے، واقعات کے وجود پذیر ہونے کے بعد بنائی گئی ہوں لیکن اول تو اپنے اس دعوے یا شبہ پر انہوں نے قیاس و تخمین کے سوائے کوئی دلیل نہیں دی دوسرے یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بابل کی غلامی کے دور اور بخت نصر کے توراۃ جلا ڈالنے کے واقعہ ہائلہ کے بعد کے اس قسم کے تمام ذخیرے کے متعلق علماء یہود و

Marfat.com

•••••••••••

نصاریٰ کا اس پر کلی اتفاق ہے کہ یہ اضافات و تحریفات سے محفوظ ہیں اور ان میں رد و بدل کے لیے کوئی سبب وجود پذیر نہیں ہوا یعنی توراۃ کے قدیم حصہ کی طرح اس پر کوئی حادثہ نہیں گزرا مگر علماء یہود و نصاریٰ کے اس جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم یہ تسلیم کیے لیتے ہیں کہ ان کی طرح اس پر کوئی حادثہ نہیں گزرا مگر علماء یہود و نصاریٰ کے اس جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم یہ تسلیم کیے لیتے ہیں کہ ان پیشین گوئیوں میں خورس کے نام کی تصریح بعد کو داخل کر دی گئی یا ان پیشین گوئیوں کو واقعات کے مطابق بنا لیا گیا تب بھی ہمارا مطلب حاصل ہے اس لیے کہ ان پیشین گوئیوں سے یہ بات تو بغیر کسی خدشہ کے ثابت ہوگئی کہ یہودیوں میں "خورس" کے یروشلم تعمیر کرنے، یہود کو آزاد کرانے اور مذہب یہود کی عظمت کرنے اور یہود کا اس کو خدا کا مسیح سمجھنے کی روایات کو اس درجہ تواتر حاصل تھا کہ "شبہ کرنے والوں کے بقول" یہود نے سائرس کے ساتھ خوش اعتقادی کی وجہ سے ان ثابت شدہ حقائق کو کتاب مقدس میں وحی الٰہی کی بشارت بنا ڈالا لیکن اس کے برعکس سکندر مقدونی کو کسی طرح یہ حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔

بہرحال کس قدر حیرت کی بات ہے کہ یروشلم سے متعلق جن واقعات کو صدیوں تک کتاب مقدس اور یہودیوں کی متواتر روایات میں خورس (سائرس) سے وابستہ ظاہر کیا گیا وہ چار سو برس کے بعد یک بیک جوزیفس کی زبانی سکندر کے حق میں ہو جاتے ہیں، ﴿إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ﴾۔

سکندر مشرک تھا:

سکندر کے مذہب کا ذکر اگرچہ پہلے گزر چکا ہے مگر آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ وہ صرف دیوتاؤں کی پوجا نہیں کرتا تھا بلکہ اس درجہ مغرور و متکبر تھا کہ یونان اور اسیا یان کے لوگوں کو اپنے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیتا اور اپنے تئیں معبود کہلاتا تھا۔ (دائرۃ المعارف للبستانی ج ۲ ص ۵۴۷)

اور انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ہے:

"جب سکندر باختر (Bactra) لوٹ آیا اور اوکریانس کی بیٹی رواکزانا (Roxana) سے شادی کی تو شادی کی دعوت کے موقعہ کو غنیمت جان کر اس نے اپنے یونانی اور مقدونی پیرووں سے اپنی خدائی کا اعتراف کرانا چاہا۔۔۔ الخ"۔ (ج ۱ ص ۴۸۴)

اور مشہور محدث حافظ عماد الدین بن کثیر نے اپنی تاریخ البدایہ والنہایہ میں بروایت قتادہ رحمہ اللہ سکندر ذوالقرنین اور سکندر بن فیلپس میں فرق کرتے ہوئے سکندر مقدونی کو مشرک کہا ہے۔ (ج ۲ ص ۱۰۶)

اسی طرح حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام رازی رحمہ اللہ کے قول کو بہ طور سند پیش کرتے ہوئے سکندر مقدونی اور اس کے وزیر ارسطاطالیس دونوں کو کافر کہا ہے۔ (ملاحظہ ہو فتح الباری جدید ایڈیشن ج ۶ ص ۲۹۴)

اور اسلام کے ان جلیل القدر ائمہ دین کی مزید تائید انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا سے بھی ہوتی ہے چنانچہ مقالہ نگار لکھتا ہے:

"جب سکندر دریائے ستلج کے کنارہ پہنچا تو اس نے اپنی فوج کو دریا کے عبور کرنے کا حکم دیا لیکن فوج نے عبور کرنے سے انکار کر دیا، اس پر سکندر نے اپنے افسروں کے سامنے مزید فتوحات کی اسکیم پیش کی لیکن یہ بے سود ثابت ہوئی۔ تب سکندر نے حسب دستور دریا کے سامنے دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھائی اور (اپنے عقیدہ کے مطابق) دیوتاؤں کی اجازت نہ سمجھتے ہوئے پیش قدمی سے باز آیا اور واپس لوٹ گیا"۔ (ج ۱ ص ۴۸۴)

اور انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجین میں ہے کہ جوزیفس کی زبانی اگرچہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید سکندر یروشلم گیا تھا اور اس نے یہود کے ساتھ خصوصی مراعات بھی کیں اور محکمہ خبر رسانی میں ممتاز درجے بھی دیئے اور اس طرح یونانیوں اور یہودیوں میں ایک علاقہ قائم ہو گیا" تاہم یہ محقق ہے کہ یہودیوں نے ان کے کلچر اور ان کے عقائد و رسوم کو اپنے اندر داخل نہ ہونے دیا اور وہ ہمیشہ ان کو اس حیثیت سے نفرت و حقارت ہی سے دیکھتے رہے اور یہ اس وجہ سے ہوا کہ یہودی قوم سختی کے ساتھ توحید کی قائل تھی اور اپنے مذہبی عقائد میں بہت پختہ" اور یہی وجہ ہے کہ یونانیت اور یہودیت میں کبھی اتصال نہ ہو سکا۔ (ج ۱ ص ۳۰۹)

اور بستانی لکھتا ہے کہ سکندر مقدونی نے وفات کے وقت جو وصیت کی وہ یہ تھی کہ اس کو بتوں کے درمیان دفن کیا جائے:

ثم لما رأى ان لا رجاء بالشفاء و ان ساعته دنت نزع خاتمه من اصبعه و سلمه الى الامير برديكاس و اوصاه ان ينقل حيثة الى هيكل المشترى بواحات سيرة ليدفن هناك بين الاصنام. (ج ۳ ص ۵۴۸)

"پھر جب سکندر نے دیکھا کہ اب زیست کی کوئی امید باقی نہیں رہی اور اس کی موت کا وقت قریب آ لگا تو اس نے اپنی انگلی سے شاہی مہر نکال کر اپنے امیر بردیکاس کو دی اور اس کو وصیت کی کہ مجھ کو سیوہ کے اطراف میں مشتری دیوتا کے ہیکل میں بتوں کے درمیان دفن کیا جائے"۔

اب ان تمام حقائق کو پیش نظر رکھئے اور فیصلہ کیجئے کہ "مضمون نگار" کا یہ کہنا صحیح ہے کہ "سکندر مقدونی" کی تاریخ کا یہ مسلمہ باب ہے کہ وہ یونانیوں کے قدیم مذہب اور دیوتاؤں کی پرستش کا مقلد تھا اور یہ کہ وہ ہرگز مسلمان نہ تھا یا محترم "صاحب استدراک" کا یہ ارشاد کہ دعویٰ (کہ سکندر مشرک تھا) بجائے خود مخدوش و مجروح ہے۔

اور یہ بھی انصاف طلب بات ہے کہ "صاحب استدراک" کے اس حوالہ کی "جو کہ جوزیفس کی قدیم تاریخ یہود سے دیا گیا ہے" محققین بلکہ کتاب مقدس کی نگاہ میں کیا قدر و قیمت ہے؟ کہاں مدلل واقعات و حقائق اور کہاں محض ظن و تخمین ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

سکندر کا ظلم و جبر:

محترم صاحب استدراک مضمون نگار کے دوسرے دعوے کی تردید فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

"سکندر کا جابر و قاہر ہونا مسلم نہیں بہت کچھ مختلف فیہ ہے تاریخ میں دونوں قسم کے اقوال ملتے ہیں کم از کم شک کا فائدہ تو اسے ملتا ہی ہے"۔

(برہان ماہ اگست ۱۹۴۱ء)

اس سلسلہ میں عرض کرنے دیجئے کہ قدیم و جدید مسلم اور عیسائی مؤرخین نے سکندر کی جو سیرت پیش کی ہے بحیثیت مجموعی ان سب کا حاصل یہ ہے کہ وہ جابر و قاہر تھا اور اس کو نیک سیرت اور صالح بادشاہ نہیں کہا جا سکتا، لہٰذا کم از کم ایک قول تو ایسا تحریر کیا جاتا جس میں اس کو نیک، عادل اور صالح تسلیم کیا گیا ہو۔

رہی یہ بات کہ اس کی تاریخ میں کوئی ایک واقعہ بھی عدل یا رحم کا موجود نہیں ہے تو اس کا انکار تو کوئی بھی نہیں کر سکتا مگر ان چند گنتی کے واقعات سے کسی کی سیرت، عادل رحیم اور صالح نہیں کہی جا سکتی ورنہ تو پھر چنگیز خان ہلاکو خان اور حجاج بن یوسف کو بھی یہی مقام دیا جانا چاہیے۔ سکندر کی جابرانہ حیثیت کا اندازہ ان چند حوالوں سے کیا جا سکتا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ہے:

"درحقیقت اس کے دماغ کا توازن شروع ہی سے بگڑ گیا تھا، یہ ظالم اور جابر انسان جو اپنے کو خدا سمجھتا تھا، جو اپنے دوست کے سینہ میں برچھی گھونپ کر مسرور ہوتا تھا جو ایک دوسرے دوست کو سخت ترین جسمانی ایذا پہنچا کر اس کی چیخ پر حقارت آمیز انداز میں متبسم ہوتا تھا وہ ایک عادل دماغ فرمانروا اور مدبر ہونے سے بہت دور تھا"۔ (ج ۱ ص ۴۸۵)

"ہر شخص اس سے حد درجہ خوشامدانہ انداز میں بات کرنے پر مجبور تھا۔ پلوٹارک (Plotarop) لکھتا ہے کہ اس کو اپنی پرانی عادت یعنی انسانوں کا شکار کرنے میں بڑی تسلی و تشفی اور سکون حاصل ہوتا تھا"۔ (ج ۱)

"آخرکار وہ پسرگیڈا (Pasargadae) پہنچا اور سائرس کی قبر کا پتہ لگا کر اسے کھدوایا اور لوٹا اور اس کی توہین کی"۔ (ج ۱ ص ۴۸۴)

"(قابض ہو جانے کے بعد) پسرگیڈا میں اس کو بے شمار دولت مال و اسباب ہاتھ آیا جس کی قیمت کا اندازہ ایک کروڑ تیس لاکھ پونڈ کے قریب کیا جاتا ہے اس دولت کو لوٹنے کے بعد اس نے شہر کے تمام مردوں اور اولاد ذکور کو تہ تیغ کیا اور عورتوں اور اولاد اناث کو باندیاں بنالیا"۔ (ج ۱ ص ۴۸۳)

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے علاوہ بستانی اور وہ تمام مسلمان مؤرخین جو اس کو زبردستی "ذوالقرنین" بنانے پر آمادہ نہیں ہیں سکندر سے متعلق اسی قسم کی روایات جبر و قہر بیان کر رہے ہیں پس ضرورت تھی کہ ان روایات کے مقابلہ میں کسی محقق مؤرخ کو ایک روایت ایسی بھی سامنے آ جاتی جو تخمین و قیاس سے جدا تاریخی روشنی میں اس کو نیک، صالح اور عادل بادشاہ ثابت کر سکتی، مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہے اور تمام ذخیرہ تاریخ اس سے یکسر خالی ہے۔

رہا "شبہ کا فائدہ" تو اول تاریخی حقائق کے بعد شبہ کے فائدہ کا سوال ہی کیا ہے اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس کو زیادہ سے زیادہ یہ فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے کہ سکندر کو جابر و قاہر کہنے میں سکوت اختیار کر لیا جائے نہ کہ یہ فائدہ کہ ایسی ہستی کو جس کا نیک، صالح اور عادل ہونا تک مشتبہ ہو قرآن عزیز کا ذوالقرنین بنا دیا جائے کہ جس کی منقبت میں قرآن عزیز رطب اللسان ہے اس کو تو بلاشبہ تاریخی صحائف میں روز روشن کی طرح صالح و عادل ثابت ہونا چاہیے۔

سکندر کا مغرب کی طرف اقدام:

تیسری بات "مضمون نگار" نے یہ کہی تھی کہ سکندر کی تاریخی مہمات کے متعلق یہ مسلمات میں سے ہے کہ وہ مغرب کی جانب نہیں بڑھا" چنانچہ "صاحب استدراک" کو بھی مخدوش و مجروح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

Marfat.com

....

"سکندر کی ابتدائی فتوحات تاریخ کو مسلم ہے کہ شمال و مغرب ہی کی جانب حاصل ہوئی تھیں"۔ (برہان ماہ اگست ۱۹۴۱ء)

اور اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ سکندر کی شمالی جانب میں فتوحات کا انکار تو "مضمون نگار" نے بھی نہیں کیا البتہ مغربی جانب میں سلسلہ فتوحات و سیاحت کے بڑھنے کا ضرور انکار کیا ہے۔ "صاحب استدراک" اس کی تردید میں ارشاد فرماتے ہیں:

"اور مقدونیہ کے کنارے مغرب میں ہی وہ جھیل ہے جس کا پانی اتنا گندہ ہے کہ سیاہی مائل ہو گیا ہے اور وہیں سورج ڈوبتا نظر آتا ہے ﴿وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ﴾ کا پورا مصداق"۔ (برہان اگست ۱۹۴۱ء)

مگر یہ دلیل "کوہ کندان و کاہ برآوردن" سے زیادہ وقیع نہیں ہے۔ اس لیے کہ "مضمون نگار" کا یہ مقصد تو ہرگز نہ تھا کہ سکندر جس نے شمال اور مشرق میں ہزار ہا میل تک زبردست فتوحات حاصل کیں اور ملکوں اور شہروں کو مسخر کیا وہ مغرب کی جانب اپنے دارالسلطنت مقدونیہ کے کنارہ تک بھی نہیں گیا۔

پس اس جھیل تک سکندر کا پہنچنا جو مقدونیہ کے کنارہ ہی پر ہے ایسی کونسی عظیم الشان مہم تھی جس کا ذکر قرآن عزیز نے اس اہمیت کے ساتھ کیا ہے اور جس سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسی مغربی مہم کا ذکر کیا جا رہا ہے جو ذوالقرنین کے مرکزی دارالسلطنت سے سینکڑوں یا ہزاروں میل دور اس سے حد پر پہنچ گئی تھی جہاں صحراؤں اور پہاڑوں کی مسافت طے کرنے کے بعد پانی کے سواء اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ مقدونیہ کے کنارہ کے جھیل اوکریڈا جس جگہ واقع ہے وہاں تو صبح و شام خدا کی ہزاروں مخلوق کا شب و روز ہی گزر ہوتا رہتا تھا اور وہ مغرب کے کسی آخری حصہ میں بھی واقع نہیں ہے بلکہ اطراف و جوانب کے شہروں اور ملکوں کے درمیان واقع ہے تو یہ کونسی ایسی جگہ تھی جس کا ذکر قرآن اس طرح کرتا ہے ﴿حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ﴾ پس محض جھیل کے پانی کے گندہ اور سیاہی مائل ہونے کی وجہ سے یہ جھیل کسی طرح بھی قرآن عزیز کی اس آیت کا مصداق نہیں بن سکتی۔

چنانچہ مفسرین قرآن بالاتفاق اس آیت کی تفسیر وہی کرتے ہیں جو ہم نے بیان کی ہے یعنی ذوالقرنین مغرب کی جانب دُور تک بڑھتا ہوا ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں صحراؤں اور پہاڑوں کا سلسلہ ختم ہو کر سمندر شروع ہو جاتا ہے البتہ سمندر کا وہ حصہ ایسا تھا جہاں پانی گدلا اور سیاہ ہو گیا تھا اور سورج غروب ہوتے وقت یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ سیاہ گدلے چشمہ پانی میں ڈوب رہا ہے۔

چنانچہ سید محمود آلوسی ﴿بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ای منھتی الارض من جھه الغرب.

"یعنی مغرب کی جانب میں زمین کے آخری حصہ تک جب پہنچا"۔

اور محدث ابن کثیر ابن جریر، امام رازی اور قدیم و جدید تمام مفسرین یہی تفسیر بیان فرما رہے ہیں پس صاحب استدراک کی یہ تفسیر نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں بلکہ قرآن عزیز کے بیان کردہ مقصد کے منافی ہے۔

درحقیقت اس آیت کا مصداق یہ ہے کہ ذوالقرنین مغرب کی جانب فتوحات کرتا ہوا جب تمام ایشیا کوچک کو بحر شام سے بحر اسود تک قبضہ میں کر چکا تو وہ آگے بڑھتا ہوا مغربی ساحل تک پہنچ گیا۔ نقشہ میں دیکھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایشیا کوچک کے مغربی ساحل میں چھوٹے چھوٹے خلیج پیدا ہو گئے ہیں اور بحر ایجین کے ساحلی مقام پر جا کر یہ گہرے سیاہ رنگ کی صورت میں نظر آتے ہیں اور ساحل پر کھڑے ہونے والے کو سورج اس کے اندر ڈوبتا نظر آتا ہے اور مغربی ساحل کی یہ مہم سائرس ہی کو نصیب ہوئی ہے۔ سکندر کو نصیب نہیں ہوئی۔ اب صاحب استدراک چاہتے ہیں کہ اسے گھر بیٹھے ہی مقدونیہ کے کنارہ اس خوش قسمتی کا مصداق بنا دیں مگر یہ کسی طرح ممکن نظر نہیں آتا۔

نیز "صاحب استدراک" آرکیڈا جھیل کا جاء وقوع مناستر سے پچاس میل مغرب میں (یوگوسلاویہ) میں بتا کر اگرچہ اس کے بعد مسافت ظاہر فرمانا چاہتے ہیں مگر بہر حال ہے وہ سکندر کے دارالسلطنت مقدونیہ کے کنارہ ہے۔

یہ ہیں وہ خدشات اور اسباب جرح جو "صاحب استدراک" نے تکلیف گوارا فرما کر "مضمون نگار" کے تین مسلمات پر عائد فرمائے ہیں۔ اب قارئین کرام بنظر انصاف خود غور فرمائیں کہ تاریخ کی روشنی میں "مضمون نگار" کے "مسلمات ثلثہ" صحیح ہیں یا "صاحب استدراک" کے "خدشات و جرح" درست ہیں۔ ﴿اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ اس کے بعد صاحب استدراک یہ تحریر فرماتے ہیں:

Marfat.com

"جرم کے ساتھ کسی کا بھی تعین کرنا دشوار ہے اس لیے کہ قرآن کی بتائی ہوئی علامات کا مصداق تمام تر اب تک کوئی نہیں ملا ہے"۔ (برہان ماہ اگست)

مضمون نگار نے بھی ذوالقرنین کی تعیین پر بحث کرتے ہوئے یہی لکھا ہے کہ اس سب کچھ لکھنے کے بعد بھی بحث وتمحیص کا دروازہ بند نہیں ہے مگر پھر تعجب یہ ہے کہ ایسی صورت میں صاحب استدراک کو مضمون نگار کے مضمون کی فوری تردید کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ شاید صاحب استدراک کے نزدیک وہ اہم ضرورت یہ تھی، فرماتے ہیں: "لیکن جہاں تک ارجحیت کا تعلق ہے، سکندر مقدونی کا نمبر، جس کی طرف ہمارے متقدمین اس کثرت سے گئے ہیں کسی سے پیچھے نہیں"۔

گویا صاحب استدراک اس غلط فہمی میں ہیں کہ علماء متقدمین کی اکثریت اس جانب ہے کہ سکندر مقدونی ہی ذوالقرنین ہے حالانکہ یہ بہت بڑا مغالطہ ہے جس کو جلد رفع ہونا چاہیے۔

اہل نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ ذوالقرنین کے متعلق مختلف اقوال میں سے علماء سلف (متقدمین) کی اکثریت کا دعویٰ کسی جانب بھی نہیں کیا جاسکتا اور اگر ان کے تمام اقوال کو جمع کر کے خلاصہ نکالا بھی جائے تو دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، ایک یہ کہ انکے نزدیک شاید راجح یہ ہے کہ وہ ایک قدیم بادشاہ تھا اور اس کا نسب سامئین اولی سے ملتا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر تھا۔ دوسری یہ کہ جن بعض علماء نے یہ کہا کہ ذوالقرنین سکندر ہے ان کی مراد سکندر مقدونی سے نہیں ہے بلکہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام سے دو ہزار برس پہلے سکندر رومی کو اس کا مصداق تسلیم کرتے اور رومی اور مقدونی کو دو جدا جدا ہستیاں مانتے ہیں اور ان دونوں باتوں کی تصدیق کے لئے تفسیر ابن کثیر (ج ۲ ص ۱۶۷) فتح الباری (ج ۶ ص ۲۹۴ و ۲۹۵) بخاری کتاب احادیث الانبیاء البدایہ والنہایہ یعنی تاریخ ابن کثیر (ج ۲ ص ۱۰۵ و ۱۰۶) اور کتاب التیجان قابل مراجعت ہیں اور حافظ عماد الدین بن کثیر نے تو البدایہ والنہایہ (ج ۲ ص ۱۰۵ و ۱۰۶) ہیں متقدمین کی اس دوسری بات کو واضح کرتے ہوئے صاف صاف تحریر فرمایا ہے:

> "حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ذوالقرنین سکندر ہی ہے اور اس کا باپ پہلا قیصر گزرا ہے اور وہ سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد سے تھا۔ لیکن دوسرا ذوالقرنین، پس وہ سکندر بن فلپس مقدونی یونانی مصری ہے جس نے اسکندریہ آباد کیا اور جو روم کی تاریخ بتاتا ہے اور یہ دوسرا اسکندر پہلے سکندر سے بہت طویل زمانہ کے بعد ہوا ہے اور ہم نے اس پر اس لیے تنبیہ کی کہ بہت سے لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ یہ دونوں سکندر ایک ہی ہیں اور یہ گمان کر بیٹھے کہ قرآن میں جس سکندر کا ذکر ہے وہ اسکندر ہے جس کا وزیر ارسطو ہے اور اس غلط سمجھ کی وجہ سے بہت بڑی خطا اور عریض وطویل فساد برپا ہو جاتا ہے، پس بلاشبہ پہلا سکندر مومن صالح اور عادل بادشاہ تھا اور اس کے وزیر خضر علیہ السلام تھے اور دوسرا اسکندر مشرک تھا اور اس کا وزیر ارسطو فلسفی تھا اور ان کے درمیان دو ہزار سال سے زائد کا زمانہ ہے اور ان دونوں کا فرق صرف غبی پر ہی مشتبہ رہ سکتا ہے جو حقائق امور سے ناواقف ہو"۔

اب صاحب استدراک غور فرمائیں کہ ان کا یہ کہنا "سکندر یونانی کی جانب ہمارے متقدمین اس کثرت سے گئے ہیں" کہاں تک درست ہے؟ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ اس سخت مغالطہ میں کہ "سکندر مقدونی ہی ذوالقرنین ہے صرف صاحب استدراک ہی تنہا نہیں ہیں بلکہ مؤرخین اسلام میں سے بعض اچھے اچھے مؤرخوں کو یہ دھوکہ ہوگیا اور انہوں نے اسکندر قدیم کو جو دراصل سکندر نہیں بلکہ حمیری سامی بادشاہ تھا سکندر مقدونی سمجھ لیا اور ذوالقرنین والا تمام قصہ اس کے ساتھ چسپاں کر دیا اور جب اس کے نظم حکومت اور شخصیت پر قباء ذوالقرنین راست نہ آسکی تو وہ رازکار تاویلات کے ذریعہ اس پر موزوں کرنے کی سعی ناکام کی اور زیادہ تعجب یہ ہے کہ امام رازی جیسا بزرگ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا اور غالباً اس کی ابتداء مشہور مفسر و مؤرخ ابن جریر سے ہوئی۔

علماء سلف اور متقدمین کی اکثریت کے مسلک کی توضیح کے بعد لائق صاحب استدراک خود غور فرمائیں کہ کیا اس کے بعد بھی اس کا ازراہ طعن یہ فرمانا کہ جب سے عقل اور روشن خیالی کا معیار ہی یہ قرار پاگیا ہے کہ اگلے ماہرین فن کے ساتھ رشتہ اتحاد وتوافق کا نہیں بلکہ انکار وتردد کا قائم رکھا جائے ذوالقرنین کے اسکندر ہونے سے مسلسل انکار ہونے لگا ہے"۔ (صدق ۴ اگست ۱۹۴۱ء) کسی حد تک بھی درست ہو سکتا ہے ہم اس کے جواب میں انہیں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ((اِیَّاکُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ)) یاد دلانا چاہتے ہیں۔

صاحب استدراک فرماتے ہیں کہ ہم نے ذوالقرنین کے سکندر مقدونی ہونے سے انکار کر کے اکابر سلف کے ساتھ انکار وتردید کا رشتہ قائم کیا ہے حالانکہ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ سکندر مقدونی کے انکار میں اکابر تفسیر وحدیث حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس، مجاہد، شعبی، حافظ ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن کثیر، ابن حیان، حافظ ابن حجر، شیخ بدرالدین عینی، امام نووی قرطبی وغیرہ سب ہی غریب مضمون نگار کے ہم نوا اور صاحب استدراک کی رائے کے مخالف ہیں البتہ صرف ابن جریر، طبری اور امام رازی ضرور مقدونی کو ذوالقرنین بتا رہے ہیں مگر ساتھ ہی امام صاحب یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس قول پر بہت قوی اعتراضات ہوتے ہیں لیکن صاحب استدراک کی نگاہ میں وہ خود تو اکابر سلف کے مؤید ہیں اور غریب مضمون نگار اکابر کا مخالف ہے۔ والی اللہ المشتکی۔

Marfat.com

اور سید محمد آلوسی نے بھی اذواء یمن میں سے کسی کو ذوالقرنین تسلیم نہیں کیا اور اس قول کو غلط قرار دیا ہے۔

ان تفصیلات کے بعد اب بسہولت یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن میں مذکور ذوالقرنین کے متعلق یہ سب اقوال نظر انداز کر دینے کے قابل ہیں اور صرف دو قول ہی قابل توجہ ہیں جن میں سے ایک قول سلف کی جانب منسوب ہے اور دوسرا متاخرین میں سے ایک محقق کی تحقیق ہے۔

علماء سلف کی رائے:

علماء سلف کی رائے یہ ہے کہ قرآن میں مذکور ذوالقرنین عربی الاصل تھا سامیہ اولی میں سے تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر بادشاہ تھا اور حج کے سفر میں دونوں کا ساتھ رہا ہے اور ایک معاملہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی عدالت میں مرافعہ کیا تھا اور اس نے ان کے حق میں فیصلہ دیا اور خضر علیہ السلام اس کے وزیر باتدبیر تھے لیکن علماء سلف کی اس تحقیق میں کئی فروگزاشتیں پائی جاتی ہیں جو اس تحقیق کو ایک متردد اور مضطرب رائے میں تبدیل کر دیتی ہیں مثلاً قرآن نے ذوالقرنین کے اوصاف میں سے ایک وصف یہ بیان کیا ہے کہ اس نے اپنی عمر میں تین تاریخی مہم سر کی ہیں۔ ایک میں وہ مطلع الشمس تک پہنچتا ہے یعنی مشرق کی جانب اس حد تک پہنچا جہاں آبادیوں کا سلسلہ ختم ہو کر سورج سامنے سے طلوع ہوتا نظر آتا تھا اور دوسرے میں وہ مغرب الشمس تک گیا ہے یعنی اس حد تک پہنچا ہے جہاں حصہ زمین ختم ہو کر سمندر کا کوئی ایسا حصہ سامنے تھا جس میں غروب کے وقت یوں معلوم ہوتا تھا گویا سورج گدلے چشمہ میں ڈوب رہا ہے اور تیسری مہم ایسے سفر سے متعلق تھی جس میں اس کو ایک ایسی قوم سے واسطہ پڑا جو اس کی زبان سے ناآشنا تھی اور جس نے یاجوج ماجوج قبائل کی تاخت وتاراج کے متعلق اس سے شکایت کی اور اس نے ان کی فرمائش پر دو پہاڑوں کے پھاٹکوں کے درمیان لوہے اور تانبے سے ایک مضبوط "سد" قائم کر کے حملہ آور یاجوج و ماجوج قبائل سے ان کو محفوظ کر دیا لیکن علماء سلف یہ بتانے سے قاصر رہے ہیں کہ جس شخص کو وہ ذوالقرنین فرما رہے ہیں کیا واقعی اس کو یہ تینوں مہم اس تفصیل کے ساتھ پیش آئیں جن کا ذکر قرآن میں موجود ہے، بلکہ وہ اس کا بھی فیصلہ نہیں فرما سکے کہ اس کا اصل نام کیا ہے؟ اس کا مرکز حکومت کہاں تھا؟ اور اس کو ذوالقرنین کیوں کہتے ہیں؟ غرض سلف رحمہم اللہ کے یہاں ان سوالات کے جواب میں اس درجہ مختلف اور مضطرب اقوال پائے جاتے ہیں کہ قرآن کے بیان کردہ اوصاف وعلامات کے پیش نظر ان کے ذریعہ کسی قدیم العہد بادشاہ کی شخصیت کا تعین ناممکن ہو جاتا اور معاملہ اپنی جگہ غیر منفصل ہو کر رہ جاتا ہے مثلاً نام کے متعلق زبیر بن بکار اور ابن مردویہ (عن ابن عباس رضی اللہ عنہما) کہتے ہیں کہ عبداللہ بن ضحاک بن معد بن عدنان ہے مگر اس کے متعلق حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ روایت بہت ضعیف ہے اس لیے کہ اس صورت میں وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر نہیں ہو سکتا، جب کہ حضرت ابراہیم اور عدنان کے درمیان چالیس واسطے ہیں۔ ابن ہشام کعب احبار اور جعفر بن حبیب کہتے ہیں کہ اس کا نام مصعب بن عبداللہ یا مصعب حمیری [1] ہے۔ حافظ ابن حجر کا رجحان بھی اسی جانب ہے لیکن ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ مصعب سے قحطان تک چودہ پشت ہوتی ہیں اور ابراہیم علیہ السلام سے فلج تک سات پشت ہیں، حالانکہ فلج اور قحطان دونوں بھائی اور عبر کے بیٹے ہیں۔ [2] لہٰذا اس حساب سے یہ شخص بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر نہیں ہو سکتا اور جعفر بن حبیب کی دوسری

---

[1] مصعب بن صعب بن عبداللہ بن قرین بن منصور بن عبداللہ بن از د فتح الباری ج ۶ و تاریخ ابن کثیر ج ۱ توراۃ پیدائش باب ۱۱ والانباہ لابن۔

[2] کتاب المعبر

Marfat.com

روایت یہ ہے کہ منذر بن ابی القیس (شاہ حیرہ) ذوالقرنین ✿ ہے لیکن یہ بادشاہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بھی بعد پیدا ہوا ہے اور ہمدانی نے کتاب الانساب میں اس کا نام ہمیسع (ابوالصعب) بن عمرو بن عرب بن زید بن کہلان بن سبا بن قحطان یا ابن یشجب بن یعرب بن قحطان بتایا ہے اگر چہ اس نام کا بادشاہ سباء کے خاندان سے ضرور ہو گزرا ✿ ہے۔ لیکن حمیری (سباء) بادشاہوں کے طبقہ اولیٰ کی تاریخ بھی ۱۲۰۰ ق م سے اوپر نہیں جاتی۔ حالانکہ معاصر ابراہیم (علیہ السلام) کو ۲۲۰۰ ق م ہونا چاہیے اور ابن ہشام نے سیرت میں دوسری روایت یہ نقل کی ہے کہ ذوالقرنین کا نام مرزبان بن مردویہ ہے اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ محمد بن اسحٰق کی روایت کی بنا پر اسی کو سکندر اوّل بھی کہتے ہیں لیکن تاریخی اعتبار سے یہ نام مجہول ہے اور اس نام کا کوئی بادشاہ تاریخوں میں مذکور نہیں ہے۔

علاوہ ازیں علماء سلف یہ صراحت کرتے ہیں کہ ذوالقرنین عربی الاصل ہے اور مرزبان اور مردویہ عربی نام نہیں ہیں بلکہ عجمی نام ہیں اس لیے اگر اس نام کا کوئی بادشاہ ہوگا تو وہ عجمی ہوگا نہ کہ عربی اور وہب بن منبہ سے منقول ہے کہ اس کا نام صعب بن مرائد (تبع اوّل) ہے۔ ✿ لیکن یہ اس لیے نہیں کہ اوّل تو کوئی تبع اوّل کا یہ نام ہی نہیں ہے بلکہ اس کا نام حارث الرائش یا زید ہے دوسرے کوئی حمیری) "تبع" حضرت ابراہیم کا معاصر نہیں ہے اور دارقطنی اور ابن ماکولا سے منقول ہے کہ اس کا نام ہرمس یا ہردس بن قیطون بن ... ✿ ہے مگر یہ سخت مغالطہ ہے اس لیے کہ یہ سکندر مقدونی کے دادا کا نام ہے اور سکندر کے مغالطہ ہی میں ذکر میں آ گیا ہے۔

اس تفصیل سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس امر پر اتفاق کے باوجود کہ قرآن میں مذکور ذوالقرنین حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر بادشاہ جو نام سلف سے منقول ہے ان میں سے نہ کوئی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر ہے اور نہ سامیہ اولیٰ میں سے بلکہ یا یمنی حمیری سلاطین کے نام ہیں اور یا عجمی بادشاہوں کے نام اور ان میں اس درجہ اختلاف ہے کہ چند علماء سلف کا کسی ایک پر بھی اتفاق نہیں اسی بنا پر حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ صرف یہ فرما کر خاموش ہو گئے کہ چند اشعار عرب اور بعض اقوال سے راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین کا نام صعب تھا لیکن خود صعب کی شخصیت کے متعلق جو اختلاف اقوال ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معاصر نہ ہونے کا جو سوال ہے اس کا کوئی حل انہوں نے نہیں کیا۔

پھر نام کی طرح اس کے لقب "ذوالقرنین" کے متعلق بھی یہی اضطراب موجود ہے اور اس لقب کی وجہ میں جس قدر بھی احتمالات ہو سکتے تھے وہ سب ہی منقول و مذکور ہیں، فہرست ملاحظہ ہو۔

ذوالقرنین اس لیے کہا گیا کہ وہ روم و فارس دو مملکتوں کا مالک تھا اور "قرن" جس کے معنی "سینگ" کے ہیں بطور استعارہ کے طاقت حکومت کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی دو حکومتوں کا والی و مالک یہ رائے اہل کتاب کی جانب منسوب ہے اور بعض مفسرین کا رجحان بھی اسی جانب ہے۔

وہ فتوحات کرتا ہوا اقصائے مشرق و مغرب تک پہنچا اور دونوں جہات میں بہت سے ممالک پر قابض و مسلط ہوا یہ زہری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

اس کے سر میں دونوں جانب سینگ کے مشابہ تانبے کے سے غدود ابھرے ہوئے تھے یہ وہب بن منبہ کی رائے ہے۔

✿ الاستیعاب لابن عبدالبر و تاریخ ابن کثیر ج ۲ ✿ قلقشندی
✿ التیجان لابن ہشام ✿ تاریخ ابن کثیر ج ۲

Marfat.com

④ اس کی زلفیں دراز تھیں اور وہ ہمیشہ اپنے بالوں کو دو حصے کرتا اور ان کی پٹیاں گوندھ کر دونوں کاندھوں پر ڈالے رکھتا تھا ان دونوں کو "قرن" سے تشبیہ دے کر اس کو یہ لقب دیا گیا یہ قول حسن بصری کی جانب منسوب ہے۔

⑤ اس نے ایک جابر بادشاہ کو یا اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی، بادشاہ یا قوم نے غضب ناک ہو کر اس کے سر کے ایک جانب ایسی سخت چوٹ لگائی کہ وہ مر گیا اس کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر پھر تبلیغ کا فرض انجام دیا، اس مرتبہ دوسری جانب چوٹ مار کر قوم نے اس کو شہید کر دیا۔ اس ضرب سے اس کے سر پر جو دو نشان پڑ گئے تھے اس وجہ سے اس کو یہ لقب دیا گیا۔ یہ توجیہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب منسوب ہے۔

⑥ وہ نجیب الطرفین تھا، اس لیے والدین کی نجابت کو قرنین کے ساتھ تشبیہ دی گئی اور ذوالقرنین لقب ہوا۔

⑦ اس نے اس قدر طویل عمر پائی کہ انسانی دنیا کے دو قرن (صدیوں) تک زندہ رہا۔

⑧ وہ جب جنگ کرتا تھا تو بیک وقت دونوں ہاتھوں سے ہتھیار چلاتا بلکہ دونوں رکابوں سے بھی ٹھوکر لگاتا تھا۔

⑨ اس نے زمین کی تاریکی اور روشنی دونوں حصوں کی سیاحت کی۔

⑩ وہ ظاہر و باطن دونوں علوم کا حامل تھا۔ [1]

لیکن پہلی توجیہ تو اس قیاس پر مبنی ہے کہ سکندر مقدونی ہی ذوالقرنین ہے اور دوسری توجیہ کی بنیاد ایک ناقابل اعتماد روایت پر ہے جو سفیان ثوری اور مجاہد سے منقول ہے اس میں ہے کہ چار بادشاہ وہ ہیں جنہوں نے تمام عالم پر حکومت کی ہے ان میں سے دو مسلمان ہیں اور دو کافر۔ حضرت سلیمان علیہ السلام ذوالقرنین اور نمرود و بخت نصر۔ [2] یہ روایت اس لیے معلول ہے کہ اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور ذوالقرنین دونوں کی حکومت تمام عالم پر رہی ہے اگرچہ تاریخی حیثیت سے یہ نہیں ہے تب بھی نمرود اور بخت نصر کے جو مفصل حالات کتب تواریخ میں محفوظ ہیں وہ اس روایت کے مضمون کا انکار کرتے ہیں اس لیے کہ ان دونوں بادشاہوں کی حکومت شام، عراق، مصر، حجاز اور فارس کے علاوہ بالواسطہ یا بلاواسطہ دنیا کے کسی حصہ پر بھی ثابت نہیں ہے اور آخر الذکر بادشاہ کا زمانہ تو بلحاظ عہد تاریخ اتنا قریب ہے کہ اس کی حکومت اور رقبہ حکومت کی تفاصیل تو معاصرانہ شہادتوں اور تاریخی روایتوں اور حضریات کے اکتشافات کی بناء پر بہت مشہور اور واضح ہیں اس لیے یہ روایت بھی قابل حجت نہیں ہے اور تیسری توجیہ سے متعلق جو روایت ہے اس کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے منکر اور ابن کثیر نے ضعیف اور ناقابل اعتماد کہا ہے۔ [3] اور چوتھی توجیہ حسن بصری کی جانب منسوب ہے محض قیاسی ہے اور پانچویں توجیہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے اس کے متعلق حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس کے دو طریق روایت میں سے ایک ضعیف اور ناقابل اعتبار ہے دوسرا طریقہ اگرچہ صحیح ہے لیکن اس کے متن پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ اس میں یہ الفاظ ہیں "لم یکن نبیا ولا ملکا" ذوالقرنین نہ نبی تھے نہ فرشتہ حالانکہ اس روایت کی ابتداء ہے "بعثه الله الی قومه" اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کی قوم کی جانب مبعوث کیا تھا، یہ جملہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ نبی تھے، ا... حافظ نے اس اشکال کے جواب میں ایک کمزور سا جواب یہ کہہ کر دے دیا "الا ان تحمل البعث علی غیر رسالة النبوة" مگر...

---

[1] فتح الباری ج ٦ تاریخ ابن کثیر ج ٢ دائرۃ المعارف للبستانی ج ٨

[2] فتح الباری ج ٦ [3] تاریخ ابن کثیر ج ٢ ص ١٠٣ و فتح الباری

Marfat.com

یوں کہہ دیا جائے کہ اس کی بعثت نبوۃ کے طور پر نہیں تھی۔ ❶

ہمارے نزدیک اس پر یہ اہم اشکال بھی وارد ہوتا ہے کہ قرآن عزیز نے ذوالقرنین کے حاکمانہ اقتدار کے متعلق جو تفصیلات دی ہیں یہ روایت ان کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی وہ کہتا ہے کہ ذوالقرنین وسیع مملکت کا مالک اور کامیاب بادشاہ ہوگزرا ہے مگر یہ روایت اس کو صرف ایک مبلغ ثابت کرتی ہے جس کی قوم تک نے اس کو نہیں تسلیم کیا اور اس کے درپے آزار رہی علاوہ ازیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس کے متعلق جو معجزانہ واقعہ مذکور ہے اگر یہ صحیح تھا تو قرآن عزیز کس طرح اس کو فروگزاشت کرسکتا تھا جب کہ یہ ذوالقرنین کی عظمت کو چند در چند بلند کرتا ہے؟ اس لیے یہ توجیہ بھی جرح اور ضعف سے محفوظ نہیں ہے اور ممکن ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول قرآن میں مذکور ذوالقرنین کے سواء کسی دوسری شخصیت سے متعلق ہو اور نیچے کے راویوں نے اپنے فہم سے اس واقعہ کے ساتھ چسپاں کر دیا ہو اور ساتویں اور نویں ہر دو توجیہات کو ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے منکر یعنی نا قابل اعتماد کہا ہے اور چھٹی آٹھویں اور نویں توجیہات محض اٹکل کے تیر اور بے سند ہیں۔ ❷

یہ ہیں وہ اقوال جو یا بلحاظ نقل ضعیف اور منکر ہیں اور یا بے سند محض اٹکل کے تیر ہیں اسی بناء پر حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ تو ان کو فقط نقل کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں اور ان اقوال میں سے بھی کسی ایک قول کو ترجیح نہیں دیتے جو ان کے نزدیک بلحاظ روایت و نقل سقم سے پاک ہیں البتہ حافظ ابن کثیر نے زہری کے قول کو راجح کہا ہے یعنی وہ چونکہ مشرق اور مغرب دونوں حدوں تک پہنچا اور ان کے درمیان کا مالک رہا ہے اس لیے ذوالقرنین کہلایا یہ بات اگرچہ کسی حد تک صحیح ہوسکتی ہے لیکن مشارق الارض و مغاربہا کے مفہوم میں وہی کلام ہے جو ہم ابھی بیان کر آئے ہیں اور آئندہ تفصیل کے ساتھ اس پر بحث کریں گے۔

علماء سلف سے ذوالقرنین کے نام اور لقب سے متعلق جو اقوال منقول ہیں اور جن سے اس کی شخصیت کے تعین میں مدد لی جاتی ہے ان کا حال تو آپ تفصیل کے ساتھ معلوم کر چکے اب ذوالقرنین کے بعض حالات کا جو تذکرہ اس ضمن میں پایا جاتا ہے وہ بھی تعارض و اضطراب سے خالی نہیں ہے، مثلاً ازرقی کہتے ہیں کہ ذوالقرنین نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ پر ایمان قبول کیا اور پھر ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کے ہمراہ کعبہ کا طواف کیا۔ ❸ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکہ میں حاضر ہو کر مسلمان ہوا اور علی بن احمد کی روایت میں ہے کہ ذوالقرنین جب حج کے ارادہ سے نکلا تو پیادہ پا روانہ ہوا اس کی اطلاع حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہوئی تو وہ اس کے استقبال کے لیے نکلے ❹ اور اس کے لیے دعائے خیر کی یہ روایت ذوالقرنین کو قدیم الاسلام ثابت کرتی ہے۔

اسی طرح تعین شخصیت میں کوئی اس کو سامیہ اولی میں سے بیان کرتا ہے اور کوئی حمیری بادشاہوں میں سے اور کوئی خضر علیہ السلام اس کا وزیر کہہ کر خضر علیہ السلام کی عمر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد تک دراز ثابت کرتا ہے حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ اس قسم کی تمام روایات غیر مستند اور اہل کتاب سے ماخوذ ہیں۔

غرض ذوالقرنین کے نام اس کے لقب کی وجہ تسمیہ اور تعین شخصیت کے متعلق علماء سلف کے یہاں اس قدر مختلف اور مضطرب روایات پائی جاتی ہیں وہ ان کو سامنے رکھ کر ذوالقرنین کی تاریخی شخصیت کا پتہ لگانا ناممکن ہو جاتا ہے اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے اس ارشاد کے باوجود:

❶ فتح الباری ج ٦ ❷ البدایہ والنھایہ ج ٢
❸ فتح الباری ج ٦ البدایہ والنھایہ ج ٦ ❹ البدایہ والنھایہ ج ٢

Marfat.com

فهذه الاثار يشد بعضه بعضا ويدل على قدم عهد ذي القرنين.

"پس یہ آثار ایک دوسرے کو مضبوط بناتے اور قوت پہنچاتے ہیں اور ذوالقرنین کے قدیم العہد ہونے پر دلالت کرتے ہیں"۔

یہ اشکال حل نہیں ہوتا کہ جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے عہد کے کافر بادشاہ نمرود کے حالات و واقعات قرآن کے علاوہ سیر و تاریخ کی کتابوں کے ذریعہ بھی بہت زیادہ روشنی میں آ چکے ہیں اور بائبل بھی اکثر حالات کو روشنی میں لاتی ہے تو اگر ذوالقرنین عہد ابراہیمی کی ایسی عظیم الشان ہستی تھی تو ان چند مختصر اور منتشر آثار کے علاوہ اس کے حالات و واقعات کیوں تاریخی حیثیت سے اس طرح سامنے نہیں آئے جس سے اس کی شخصیت صاف طور پر نمایاں نظر آتی نیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے وابستہ ایسے جلیل القدر انسان کا ذکر قرآن نے کیوں واقعات ابراہیم علیہ السلام کے سلسلہ میں نہیں کیا اور سورۂ کہف میں اس جانب کیوں اشارہ تک نہیں کیا گیا۔ کیا یہ بات قابل تعجب نہیں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مخالف کافر بادشاہ کی مخالفت اور حق و باطل کے درمیان معرکہ آرائی کا تو قرآن شدومد کے ساتھ ذکر کرے مگر مشارق و مغارب ارض پر حکمراں ایسے بادشاہ کا اس سلسلہ میں کوئی ذکر نہ کیا جائے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ پر ایمان لایا ان کی اطاعت و فرماں برداری کا اظہار کر کے ان کا موید ثابت ہوا اس لیے یہ کہنا شاید بیجا نہ ہوگا کہ قرآن، مرفوع احادیث تورات اور تاریخ میں عہد ابراہیمی کے اندر یا اس کے قریب کسی ایسے بادشاہ کا ثبوت نہیں ملتا جس کا ذکر سورۂ کہف میں "ذوالقرنین" کہہ کر کیا گیا ہے اور جو اقوال و آثار اس سلسلہ میں مذکور ہیں وہ اس شخصیت کی تاریخی حیثیت ثابت کرنے سے قاصر ہیں۔

متاخرین کی رائے:

علماء متاخرین میں سے بعض علماء نے تو اسی غلط بات کو اختیار کر لیا کہ سکندر مقدونی ہی قرآن میں مذکور ذوالقرنین ہے اور بعض علماء نے فقط علماء سلف کے قول کو نقل کرنے پر اکتفاء کیا ہے اور اس کے خطاء و صواب پر کوئی توجہ نہیں فرمائی اور بعض نے بغیر کسی دلیل کے یمن کے حمیری بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ کو زیر بحث ذوالقرنین فرما دیا۔

مگر ان سب اقوال سے جدا مولانا ابوالکلام نے اس سلسلہ میں جو تحقیق فرمائی ہے البتہ وہ ضرور قابل توجہ ہے بلکہ دلائل و براہین کی قوت کے لحاظ سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کی تحقیق بلاشبہ صحیح اور قرآن کے بیان کردہ اوصاف اور تاریخی حقائق کے مطابق کے پیش نظر ہر طرح لائق ترجیح ہے۔

تفسیری مطالب کے سلسلہ میں ہم کو موصوف کے ساتھ شدید اختلاف بھی رہتا ہے اور اتفاق بھی لیکن اس خاص مسئلہ میں چونکہ ان کی رائے علماء سلف سے بالکل مختلف تھی اس لیے کڑی تنقیدی نظر کی محتاج تھی چنانچہ کافی غور و خوض اور گہری نظر کے بعد اس کی صحت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے اور جب کہ یہ طے شدہ امر ہے کہ علماء سلف کی جلالت قدر اور علمی عظمت و برتری کے باوجود علمی تحقیق کا دروازہ بند نہیں ہے اور قرآن و حدیث کی روشنی میں علمائے متاخرین نے علمائے متقدمین سے سینکڑوں مسائل علمی میں اختلاف رائے کا اظہار کیا ہے خصوصاً تاریخی مباحث میں اور جدید ذرائع معلومات نے ایسے انکشافات کیے ہیں جن کے ذریعہ ہم بہت سے ایسے مسائل کو بآسانی حل کر لیتے ہیں جو علماء سلف کے زمانہ میں لاینحل رہے ہیں تو ہم کو مولانا آزاد کی اس تحقیق کا "خواہ تاریخی حقائق کے

Marfat.com

لحاظ سے وہ کتنی ہی وقیع کیوں نہ ہو" محض اس لیے انکار نہیں کر دینا چاہیے کہ وہ ان کی اپنی تحقیق ہے۔

مولانا آزاد نے اس سلسلہ میں جو تحقیق فرمائی ہے وہ اپنی جگہ قابل مراجعت ہے اور اس طویل مضمون کا یہاں نقل کرنا قطعاً غیر مناسب ہے البتہ ہم اپنی کاوش و تحقیق سے جس حد تک اس کے ساتھ مطابقت کر سکتے ہیں اس ہی کو سپرد قلم کرنا موزوں خیال کرتے ہیں۔ ❶

یہود و قریش اور انتخاب سوالات:

ایک مرتبہ پھر اس روایت پر غور فرمایئے جو محمد بن اسحاق اور شیخ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے نقل فرمائی ہے اور جس کا حاصل یہ ہے کہ اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے متعلق مشرکین مکہ نے جو سوالات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیے وہ دراصل یہود مدینہ کی تلقین پر کیے گئے تو اب قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہود کو ان واقعات سے ایسی کیا دلچسپی تھی کہ جس کی بنیاد پر انہوں نے ان کا انتخاب کیا اور ان کے صحیح جوابات کو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوت و رسالت کی صداقت کا معیار ٹھہرایا۔ اصحاب کہف سے متعلق تو تفصیل کے ساتھ گزشتہ صفحات میں بحث آ چکی ہے لیکن ذوالقرنین کے بارے میں کیوں سوال کیا گیا اس کا جواب یہ ہے کہ یہود نے اس سوال میں درحقیقت ایک ایسی شخصیت کا انتخاب کیا ہے جو ان کی مذہبی زندگی کے سلسلہ میں بہت ہی زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور جس کو وہ اپنی ملی و اجتماعی حیات میں کسی وقت بھی فراموش نہیں کر سکتے کیونکہ اس شخصیت کی بدولت بنی اسرائیل نے بابل کی غلامی سے نجات پائی اور ان کے قومی مرکز قبلہ صلوٰۃ اور مقدس مقام یروشلم و بیت المقدس ہر قسم کی تباہی اور بربادی کے بعد اسی کے ہاتھوں دوبارہ آباد ہوا چنانچہ ان اہم امور کی بنا پر یہود کے نزدیک وہ نجات دہندہ خدا کا مسیح اور خدا کا چرواہا کہلایا کیونکہ ان کے نبیوں کے مقدس صحیفوں میں اس کے متعلق یہی القاب درج تھے اور اس کی عظمت کا اظہار کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ انہوں نے سوالات میں اس شخصیت کے مسئلہ کو بھی منتخب کیا بلکہ اسی کو زیادہ اہمیت دی جیسا کہ قرآن کے اسلوب بیان ﴿وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ﴾ سے واضح ہوتا ہے وہ سمجھتے تھے کہ جب کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ خدا کے سچے پیغمبر ہیں اور اس کے تمام سچے پیغمبروں کے دین کو اور اپنے دین کو ایک ہی دین سمجھتے ہیں خصوصاً انبیاء بنی اسرائیل کی عظمت و عزت اور ان کی صداقت و حقانیت کا اظہار فرماتے ہیں پس اگر وہ حقیقتاً خدا کے سچے پیغمبر ہیں تو "امی" ہونے کے باوجود ضرور وحی الٰہی کے ذریعہ اس شخص کے واقعات پر روشنی ڈال سکیں گے جس کی وجہ سے مہبط انبیاء بنی اسرائیل (یروشلم) اور انبیاء بنی اسرائیل اور قوم بنی اسرائیل کو ایک بت پرست بادشاہ کی غلامی اور تباہ کاریوں سے نجات ملی اور جو خدا کے کلمہ کو بلند کرنے میں انبیاء بنی اسرائیل کا معاون و مددگار ثابت ہوا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے ۷۰۰ ق م میں عراق دو عظیم الشان حکومتیں اپنی قاہرانہ و جابرانہ تسلط کے ساتھ قائم تھیں، ایک آشوری حکومت اور اس کا دارالحکومت نینوی تھا اور دوسری بابلی حکومت اور اس کا دارالحکومت بابل تھا لیکن ۶۱۲ ق م میں نینویٰ کی حکومت کو زوال آ گیا اور اب بابلی حکومت بلا شرکت غیرے دونوں حکومتوں کے مقبوضات کی مالک اور وقت کی بہت بڑی طاقت بن

---

❶ اس مسئلہ کی پوری تحقیق میں ہم کو مولانا آزاد کے اس حصہ بیان سے سخت اختلاف ہے جو انہوں نے علماء سلف کے خلاف یاجوج و ماجوج کے آخری خروج کے متعلق تحریر فرمایا ہے اس لیے کہ یہ حصہ تحقیق بلاشبہ باطل ہے، یہ بحث عنقریب ذکر میں آئے گی۔

گئی یہی زمانہ تھا جب کہ بابل کے تخت پر بخت نصر (بنوکدنذر) [1] سریر آرائے سلطنت ہوا، یہ بادشاہ ذاتی طور پر بھی بہت بہادر اور صاحب تدبیر تھا مگر ساتھ ہی سخت جابر و ظالم بھی تھا کتب تاریخ میں مشہور ہے کہ یہ صرف ملکوں کو فتح ہی نہیں کرتا تھا بلکہ قوموں کو غلام بنا کر بھیڑوں کی طرح بابل کو لے جاتا اور بڑے بڑے متمدن اور بے نظیر شہروں کو برباد کر کے کھنڈر چھوڑ جاتا تھا۔

ادھر ایک عرصہ سے بنی اسرائیل کی روحانی، اخلاقی اور اجتماعی زندگی کو گھن لگ چکا تھا اور بداعمالیوں اور بدکرداریوں نے اس درجہ ان کو ذلیل و خوار کر دیا تھا کہ جو انبیاء علیہم السلام ان کی رشد و ہدایت کے لیے مبعوث ہوتے اور ان کی بدکرداریوں پر ان کو وعظ و نصیحت اور تنبیہ کرتے تو یہ ان کو قتل کر دینے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بخت نصر خدا کا عذاب بن کر ان پر چڑھ آیا اور ایک لاکھ سے زیادہ بنی اسرائیل کو غلام بنا کر بکریوں کے گلہ کی طرح ہنکا لے گیا اور بیت المقدس جیسے خوبصورت اور مقدس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی، یہ حادثہ بنی اسرائیل کے لیے ایسا ہوش ربا تھا کہ اس نے ان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کو تباہ و برباد کر ڈالا اور وہ انتہائی مایوسی کی حالت میں بابل کے اندر غلامانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے۔ [2]

بنی اسرائیل پر گزرے ہوئے ان واقعات کی خبر اگرچہ انبیاء بنی اسرائیل میں سے حضرت یسعیاہ (شعیا) اور حضرت یرمیاہ علیہما السلام نے وحی والہام کے ذریعہ پیش آنے سے قبل ہی سنا دی تھی مگر اس زمانہ میں وہ اپنی نافرمانیوں میں اس درجہ سرشار و سرمست تھے کہ انہوں نے ان پیشین گوئیوں کی مطلق پرواہ نہیں کی اب جب کہ یہ ہولناک واقعات سر پر سے گزرنے لگے تو ان کی آنکھیں کھلیں مگر ایسے وقت کھلیں کہ رنج و افسوس اور حزن و ملال سب بیکار تھا اور کوئی ترکیب نہیں تھی کہ وہ اس عذاب سے نجات پاسکیں۔

لیکن ان تمام مایوسیوں کی سخت اور ہولناک تاریکی میں ان کے لیے اگر کوئی شعاع امید باقی تھی تو وہ ان ہی انبیاء علیہم السلام کی پیشین گوئیوں کا وہ حصہ تھا جس میں حضرت یسعیاہ نبی نے تقریباً ایک سو ساٹھ سال قبل اور حضرت یرمیاہ نبی نے ساٹھ سال قبل یہ بشارت بھی دی تھی کہ بیت المقدس کی تباہی سے ستر سال کے بعد بنی اسرائیل دوبارہ اپنے وطن میں آزاد ہو کر واپس آ جائیں گے اور خدا کا ایک مسیح مبارک خدا کا چرواہا (نگہبان) کہ جس کا نام خورس ہوگا وہ بنی اسرائیل کی نجات اور یروشلم کی دوبارہ آبادی کا باعث بنے گا اور اس کے ہاتھوں یہود کی اجتماعی زندگی کا نیا دور شروع ہوگا۔

بخت نصر جب بیت المقدس کے تمام اسرائیلیوں کو غلام بنا کر بابل لے گیا تو ان میں بعض انبیاء بنی اسرائیل بھی تھے جو بابل جا کر اپنے حکیمانہ اقوال اور کریمانہ اخلاق کی وجہ سے اس درجہ ہر دلعزیز بنے کہ دشمن بھی ان کی عزت کرنے پر مجبور ہوا چنانچہ حضرت دانیال علیہ السلام بابلی حکومت کے آخری دور میں مشیر خاص تھے۔

اب جب کہ وہ وقت قریب آیا کہ بنی اسرائیل غلامی سے نجات پائیں تو ان ہی برگزیدہ نبی دانیال علیہ السلام کو الہام و مکاشفہ کے ذریعہ اس نجات دہندہ کو ایک تمثیل کی شکل میں دکھایا گیا اور ساتھ ہی جبرئیل علیہ السلام (ناموس اکبر) نے دانیال نبی کو اس کی تعبیر بھی بتائی جو اسی خورس کے حق میں تھی جس کا ذکر یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی میں آ چکا تھا۔

---

[1] اس نام کا املا دو طرح ہے (بنوکدزار، بنوکدنذر)۔

[2] واقعات کی تفصیلات بیت المقدس کے عنوان میں زیر بحث آ چکی ہیں۔

Marfat.com

ذوالقرنین اور انبیاء بنی اسرائیل کی پیشین گوئیاں:

یہود کے نجات دہندہ، خدا کے مسیح اور اس کے چرواہے کے متعلق وہ پیشین گوئیاں کیا ہیں جن کو دیکھ کر یہود بابل کی سرزمین میں انتہائی مایوسیوں کے باوجود اس وقت کے لیے چشم براہ تھے؟ پہلے ان کو نقل کر دیا جائے تا کہ زیر بحث مسئلہ کے لیے تحقیق کی جانب قدم اٹھایا جا سکے سب سے پہلے اس سلسلہ میں حضرت یسعیاہ علیہ السلام کی پیشین گوئی سامنے آتی ہے جو یہودیوں کے یوم نجات سے ایک سو ساٹھ سال قبل سنائی گئی تھی:

"اے اسرائیل! تجھ کو مجھے فراموش نہیں کرنا چاہیے میں نے تیری خطاؤں کو بادل کی مانند اور تیرے گناہوں کی گھٹا کی مانند مٹا ڈالا، میری طرف پھر آ کہ میں نے تیرا فدیہ دیا ہے، ارے اے آسمانو! گاؤ کہ خداوند نے یہ کیا۔ خداوند تیرا نجات دینے والا جس نے تجھے رحم میں بنا ڈالا یوں فرماتا ہے کہ میں خداوند سب کا بنانے والا ہوں میں نے ہی اکیلا آسمانوں کو تانا اور آپ تنہا زمین کو فرش کیا ہے دروغ گوؤں کے نشانوں کو باطل ٹھہراتا اور فال گیروں کو دیوانہ بناتا ہوں اور حکمت والوں کو رد کر دیتا اور ان کی حکمت کو حماقت ٹھہراتا ہوں جو اپنے بندہ کے کلام کو ثابت کرتا اور اپنے رسولوں کی مصلحت کو پورا کرتا ہوں جو یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ آباد کی جائے گی اور یہوداہ کے شہروں کی بابت کہ وہ بنائے جائیں گے اور میں اس کے ویران مکانوں کو تعمیر کروں گا جو سمندر کو کہتا ہوں کہ سوکھ جا اور میں تیری ندیاں سکھا ڈالوں گا جو خورس کے حق میں کہتا ہوں کہ وہ میرا چرواہا ہے اور وہ میری ساری مرضی پوری کرے گا اور یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ بنائی جائے گی اور ہیکل کی بابت کہ اس کی بنیاد ڈالی جائے گی۔

خداوند اپنے مسیح خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ میں نے اس کا داہنا ہاتھ پکڑ کر امتوں کو اس کے قابو میں کروں اور بادشاہوں کی کمریں کھلوا ڈالوں اور دہرائے ہوئے دروازے اس کے لیے کھول دوں اور وہ دروازے بند نہ کیے جائیں گے میں تیرے آگے چلوں گا اور ٹیڑھی جگہوں کو سیدھا کروں گا میں پیتل کے دروازوں کو جدا جدا پٹھوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا اور لوہے کے بینڈوں کو کاٹ ڈالوں گا اور میں گاڑے ہوئے خزانے اور پوشیدہ مکانوں کے گنج تجھے دوں گا تا کہ تو جانے کہ میں خداوند اسرائیل کا خدا ہوں جس نے تیرا نام لے کے بلایا ہے میں نے اپنے بندہ یعقوب اور اپنے برگزیدہ اسرائیل کے لیے تجھے تیرا نام صاف صاف لے کے بلایا میں نے تجھے مہربانی سے پکارا گو کہ تو مجھ کو نہیں جانتا۔ [1]

اور دوسری پیشین گوئی حضرت یرمیاہ علیہ السلام کی ہے جو بشارت کے وقوع سے تقریباً ساٹھ سال پہلے کی گئی تھی:

"وہ کلام جو خداوند نے بابل کی بابت اور کسدیوں کی سرزمین کی بابت یرمیاہ نبی کی معرفت فرمایا تم قوموں کے درمیان بیان کرو اور اشتہار دو اور جھنڈا کھڑا کرو منادی کرو مت چھپاؤ کہو کہ بابل لے لیا گیا، بعل رسوا ہوا، مردوک سراسیمہ کیا گیا، اس کے بت خجل ہوئے اس کی مورتیں پریشان کی گئیں کیونکہ اتر سے ایک قوم اس پر چڑھتی ہے جو اس کی سرزمین کو اجاڑ کرے گی یہاں تک کہ کوئی اس میں نہ رہے گا وہ بھاگے ہیں وہ روانہ ہوئے کیا انسان کیا حیوان ان دونوں میں اور اسی وقت خدا کہتا ہے بنی اسرائیل آئیں گے وہ اور بنی یہوداہ ایک ساتھ وہ روتے ہوئے چلے جائیں گے اور خداوند اپنے خدا کو

---

[1] یسعیاہ نبی کا صحیفہ باب ۴۵ آیت ۱-۴

Marfat.com

ڈھونڈیں گے وہ اس طرف متوجہ ہو کے صیہون کی راہ پوچھیں گے کہ آؤ ہم آپ ہی خداوند سے مل کے اس کے ساتھ ایک ابدی عہد کریں جو کبھی فراموش نہ ہو"۔ ❶

"بابل میں سے بھاگو اور کسدیون ابابلیوں کی سرزمین سے نکلو اور ان بکریوں کی مانند ہو جو گلوں کے آگے آگے جاتی ہیں کہ دیکھو میں اتر (شمال) کی سرزمین سے بڑی قوموں کے ایک گروہ کو برپا کروں گا اور بابل پر لے آؤں گا"۔ ❷

"قوموں کو مادیون (میڈیا) کے بادشاہوں کو اور اس کے عالموں کو اور اس کے حاکموں کو اور اس کی سلطنت کی ساری سرزمین کو مخصوص کرو کہ اس پر چڑھیں"۔ ❸

"رب الافواج یوں کہتا ہے کہ بابل کے بھاری شہر کی دیواریں سراسر ڈھادی جائیں گی اور اس کے بلند پھاٹک آگ سے جلادیئے جائیں گے"۔ ❹

اور دانیال علیہ السلام کا خواب یا مکاشفہ یہ تھا:

"بیل شازار (بخت نصر کا جانشین) بادشاہ کی سلطنت کے تیسرے سال میں مجھے مجھ دانی ایل کو ایک رویا نظر آئی بعد اس کے جو شروع میں مجھے نظر آئی تھی اور میں نے عالم رویت میں دیکھا اور جس وقت میں نے دیکھا ایسا معلوم ہوا کہ میں سوسن کے قصر میں تھا جو صوبہ عیلام میں ہے پھر میں نے رویت کے عالم میں دیکھا کہ میں اولائی کی ندی کے کنارہ پر ہوں تب میں نے اپنی آنکھیں اٹھا کے نظر کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ندی کے آگے ایک مینڈھا کھڑا ہے جس کے دو سینگ تھے اور وہ دو سینگ اونچے تھے لیکن ایک دوسرے سے بڑا تھا اور بڑا دوسرے کے پیچھے اٹھا ہوا میں نے اس مینڈھے کو دیکھا کہ پچھم اتر دکھن کی طرف سینگ مارتا تھا یہاں تک کہ کوئی جانور اس کے سامنے کھڑا نہ ہو سکا نہ کوئی اس کے ہاتھ سے چھڑا سکا پھر وہ جو چاہتا تھا کرتا تھا یہاں تک کہ وہ بہت بڑا ہو گیا اور میں اس سوچ میں تھا کہ دیکھا کہ ایک بکرا پچھم کی سمت سے آ کر تمام روئے زمین پر ایسا پھرا کہ زمین کو بھی نہ چھوا اور اس بکرے کے دونوں آنکھوں کے بیچوں بیچ ایک عجیب طرح کا سینگ تھا اور وہ اس دو سینگ والے مینڈھے کے پاس جسے میں نے ندی کے سامنے کھڑا دیکھا آیا اور اپنے زور کے قہر سے اس پر دوڑ گیا اور میں نے اسے دیکھا کہ وہ مینڈھے کے قریب پہنچا اور اس کا غضب اس پر بھڑکا اور مینڈھے کو مارا اور اس کے دونوں سینگ توڑ ڈالے اور مینڈھے کو قوت نہ تھی کہ اس کا سامنا کرے"۔ ❺

اور دانیال علیہ السلام کے مکاشفہ اور رویا کے تعبیر ہے:

"اور ایسا ہوا کہ جب مجھ دانی ایل نے یہ رویت دیکھی تھی اور اس کی تعبیر کو تلاش کرتا تھا تو دیکھا کہ میرے سامنے کوئی کھڑا تھا جس کی صورت آدمی کی سی تھی اور میں نے ایک آدمی کی آواز سنی کہ اولائی کے درمیان پکار کے کہا کہ اے جبرائیل! اس شخص کو اس رویت کے معنی سمجھا، چنانچہ وہ ادھر جہاں میں کھڑا تھا نزدیک آیا اور جب پہنچا تو میں ڈر گیا اور اوندھے منہ گرا پھر اس نے مجھے کہا اے آدم زاد سمجھ کیونکہ یہ رویت آخری زمانہ میں انجام ہوگی۔ ❻ اور کہا کہ دیکھ میں تجھے سمجھاؤں گا کہ

❶ باب ۵۰ آیات ۱۰۶ ❷ باب ۵۰ آیات ۸-۹ ❸ باب ۵۱ آیات ۵۰
❹ دانی ایل باب ۸ آیات ۱-۸ ❺ دانی ایل باب ۸ آیات ۱۵-۲۱ ❻ دانی ایل باب ۸ آیات ۱۵-۲۱

قہر کے آخر میں کیا ہوگا کیونکہ مقررہ وقت پر ہی کام کا انجام ہوگا، وہ مینڈھا جسے تو نے دیکھا کہ اس کے دو سینگ ہیں سو مادہ (میڈیا) اور فارس کا بادشاہ ہے اور بالوں والا بکرا یونان کا بادشاہ اور بڑا سینگ جو اس کی آنکھوں کے درمیان ہے سو اس کا پہلا بادشاہ ہے"۔ ❶

اور یرمیاہ نبی کی کتاب میں ہے:

"کیونکہ خداوند یہ کہتا ہے کہ جب بابل میں ستر برس گزر چکیں گے تو میں تمہاری خبر لینے آؤں گا اور تمہیں اس مکان میں پھر لانے سے اپنی اچھی بات تم پر قائم کروں گا۔

خداوند کہتا ہے اور میں تمہاری اسیری کو موقوف کراؤں گا اور تمہیں ساری قوموں میں سے اور سب جگہوں میں سے جن میں میں نے تم کو ہانک دیا ہے جمع کروں گا۔ خداوند کہتا ہے اور میں تمہیں اس مکان میں جہاں سے میں نے تمہیں اسیر کرا کے بھیجا پھر لے آؤں گا"۔ ❷

اور عزرا کی کتاب میں ہے:

"اور شاہ فارس خورس کی سلطنت کے پہلے برس میں اس خاطر کہ خداوند کا کلام جو یرمیاہ کے منہ سے نکلا تھا پورا ہو خداوند نے شاہ فارس خورس کا دل ابھارا کہ اس نے اپنی تمام مملکت میں منادی کرائی اور اسے قلمبند بھی کر کے یوں فرمایا شاہ فارس خورس یوں فرماتا ہے کہ خداوند آسمان کے خدا نے زمین کی ساری مملکتیں مجھے بخشیں اور مجھے حکم کیا ہے کہ یروشلم کے بیچ جو یہوداہ میں ہے اس کے لیے ایک مسکن بناؤں پس اس کی ساری قوم میں سے تمہارے درمیان کون کون ہے اس کا خدا اس کے ساتھ ہو اور وہ یروشلم کو کہ شہر یہوداہ ہے جائے اور خداوند اسرائیل کے خدا کا گھر بنائے کہ وہی خدا ہے جو یروشلم میں ہے۔ ❸

اور خورس بادشاہ ہی خداوند کے گھر کے ان برتنوں کو جنہیں بنوکدنذر یروشلم میں سے لے گیا اور اپنے دیوتاؤں کے گھر میں رکھا تھا نکال لایا اور شاہ فارس خورس نے انہیں خزانچی متردات کے ہاتھ سے نکلوایا اور اس نے انہیں یہوداہ کے امیر شیس بضر کو گن دیا"۔ ❹

اور زکریا نبی کی کتاب میں ہے:

"رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ دیکھ وہ شخص جس کا نام "شاخ" ہے اور وہ اپنی جگہ سے اگے گا اور وہ خداوند کی ہیکل کو بنائے گا ہاں وہاں خداوند کی ہیکل کو بنائے گا اور وہ صاحب شوکت ہوگا"۔ ❺

ان واضح اور صاف پیشین گوئیوں کی اگر تحلیل کی جائے تو ان سے حسب ذیل اہم امور ثابت ہوتے ہیں:

① جن ہستی نے بنی اسرائیل کو بابل کی غلامی سے نجات دی اس کا نام خورس تھا اور وہ فارس اور میڈیا دو ملکوں کا متفقہ بادشاہ تھا۔

② دانیال نبی کے مکاشفہ اور جبرائیل علیہ السلام کی تعبیر نے ان دو حکومتوں کے اتحاد کی بناء پر ہی خورس کو دو سینگوں والا (ذوالقرنین) بادشاہ

---

❶ دانی ایل باب ۸ آیات ۱۵-۲۱ ❷ یرمیاہ باب ۲۶، آیات ۱۰-۱۴ ❸ عزرا کی کتاب باب ۱ آیات ۱-۴
❹ ایضاً باب ۱ آیات ۷-۸ ❺ زکریا نبی کی کتاب باب ۶ آیت ۱۲

Marfat.com

کہا اور اسی تخیل کی بنا پر بنی اسرائیل میں اس القب ذوالقرنین مشہور ہوا۔

③ انبیاء بنی اسرائیل کے صحیفوں میں اس بادشاہ کو خدا کا مسیح بنی اسرائیل کا نجات دہندہ اور خدا کا چرواہا کہا گیا ہے۔

④ یہودیوں میں قومی عصبیت اور نسلی تعصب کے شدید سے شدید تر ہونے کے باوجود ان ہی واقعات کی بنیاد پر وہ غیر اسرائیلی شخص کو اپنے اوصاف سے یاد کرتے ہیں جو صرف اپنے انبیاء کے حق میں ہی کہنے کے عادی ہیں۔

⑤ واقعات تاریخی نے یہ ثابت کر دیا کہ انبیاء علیہم السلام کی پیشین گوئیوں کے مطابق خورس ہی نے یہودیوں کو بابل کی غلامی سے نجات دلائی اور بیت المقدس کو دوبارہ آباد کیا۔

⑥ یسعیاہ نبی کے صحیفہ میں اس کو اتر سے آنا بتایا گیا ہے خورس بابل سے اتر (شمال) ہی کی جانب (فارس ومیڈیا) سے آیا تھا اس لیے وہی اس پیشین گوئی کا مصداق ہے۔

⑦ زکریا نبی کی پیشین گوئی میں اس کو اگنے والی "شاخ" بتایا گیا ہے اس سے یہ مطلب ہے کہ اس کی نمود اور اس کا ظہور غیر معمولی صورت حالات میں ہوگا جیسا کہ عموماً ایسی شخصیتوں کے متعلق خدائے تعالیٰ کی جانب سے ہوتا رہا ہے کہ جن سے اس کو کوئی خاص کام لینا ہوتا ہے۔

خورس اور تاریخی شواہد:

ان اجزاء پر بحث کرنے سے قبل چند تاریخی شواہد بھی پیش نظر رکھنے ضروری ہیں جن کا اس معاملہ سے خاص تعلق ہے۔

محققین تاریخ نے فارس کی تاریخ کو تین عہدوں میں تقسیم کیا ہے ایک حملہ اسکندر سے پہلے کا عہد، دوسرا طوائف الملوکی کا عہد اور تیسرا ساسانی سلاطین کا عہد اور یہ بھی تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ان تینوں عہدوں میں سے فارس کی عظمت اور اس کے عروج کا عہد خورس (سائرس) کے عہد حکومت سے شروع ہوتا ہے اور اس عہد کے حالات فارس کے رقیب یونان کے مؤرخین کے ذریعہ سے ہی روشنی میں آسکے ہیں جن میں سے بعض سائرس کے معاصر بھی ہیں اس بادشاہ کو یہودی خورس، یونانی سائرس، فارسی گورش اور کے ارش اور عرب "کیخسرو" کہتے ہیں۔

عرب مؤرخین کے یہاں بھی حکومت فارس کے یہ تین عہد جدا جدا نظر آتے ہیں چنانچہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ میں ان تینوں عہدوں کے متعلق جو اشارات کیے ہیں وہ بھی اس کی تائید کرتے ہیں کیونکہ وہ طوائف الملوکی سے قبل کے حالات میں کسریٰ فارس کے درباری عظمت وشوکت کا جس طرح ذکر کرتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بلاشبہ یہ دور حکومت فارس کے عروج وعظمت کا دور تھا وہ فرماتے ہیں کہ طوائف الملوک کا وسطی عہد فارس کے لیے بہت خراب اور زوال کا عہد تھا۔ لیکن اردشیر بن بابک ساسانی نے اس کو ختم کر کے فارس کو اس عروج پر دوبارہ پہنچا دیا جس عروج پر پہلے عہد (عہد خورس) میں تھا۔

فاستمر الامر كذلك قريبًا من خمسة مئة سنة حتى كان اردشير بن بابك من بني ساسان فاعاد ملكهم الى ما كان عليه و رجعت الممالك برمتها اليه۔ [1]

---

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۸۳، ۱۸۴

Marfat.com

"اور ملوک الطوائف کا یہ عہد تقریباً پانچ سو سال تک رہا تا آنکہ اردشیر بن بابک ساسانی نے ظہور کیا تب اس نے کھوئے ہوئے ملکوں کو واپس لیا اور پہلے عہد کی حالت پیدا کر دی اور تمام تقسیم شدہ حصہ ملک پھر ایک مستقل حکومت کا جز ہو گئے"۔

اسی طرح ابن عبدالبر نے القصد والامم میں ان ہر سہ عہدوں کا ذکر کرتے ہوئے افریدوں اور منوچہر کے تذکرہ میں یہ فرمایا ہے:

وھذہ الطبقة الاولیٰ الی ان غلب الاسکندر دار اور رتب ملوك الطوائف ثم ملکت الاکاسرة اولھم ارد شیر بن بابك۔ ❶

"فارس کے بادشاہوں کا یہ پہلا طبقہ ہے جو دارا پر سکندر کے حملہ تک شمار ہوتا ہے درمیان میں ملوک الطوائف کا دور رہا اور اس کے بعد شاہان کسریٰ کا زمانہ ہے جو اردشیر سے شروع ہوتا ہے"۔

۶۲۲ ق م میں بابل و نینوئی کی حکومتیں بہت عروج و اقبال پر تھیں اور خورس سے قبل اسی دور میں ایران کی حکومت دو جدا جدا حصوں پر تقسیم تھی۔ شمال مغربی حصہ کو میڈیا (ماہات) کہتے تھے اور مغربی حصہ کو فارس اور دونوں حصوں میں قبائلی سردار حکومت کرتے تھے اور یہ قبائلی حکومتیں ان کے زیر اثر اور تابع تھیں لیکن ۶۱۲ ق م جب نینوی کی آشوری حکومت تباہ ہوگئی تو اگرچہ میڈیا آزاد ہو گیا اور قبائلی حکومت کی جگہ آہستہ آہستہ شاہی حکمرانی کی داغ بیل پڑنے لگی تھی تاہم بابل کے بادشاہ بخت نصر کے قاہرانہ اقتدار کے سامنے ایران کے ابھرنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا مگر ان ہی حالات کے اندر ۵۵۹ ق م میں قدرت نے ایکے می نیز یا بخانش خاندان کی ایک غیر معمولی ہستی کو نمایاں کیا کہ جو ابتداء میں اگرچہ ایک چھوٹی سی ریاست انشان کا رئیس تھا مگر ۵۵۹ ق م حیرت ذا طور پر اس کے عدل و انصاف، سیاست و تدبر، خدا رسی و علم نے فارس اور ماہات دونوں حکومتوں کو بغیر جنگ وجدل کے اس کے قبضہ میں دے دیا اور دونوں حکومتوں کے قبائلی حکمرانوں نے برضاء و رغبت اس کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا، یہی وہ ہستی ہے جس کو اہل فارس گورش یا کےارش اور یہود خورس کہتے ہیں۔

مغربی مہم:

خورس نے جب فارس اور میڈیا کی حکومتوں کو متحد کر کے فرماں روائی کا اعلان کیا تو اس سے قریب ہی زمانہ میں اس کو ایک "مغربی مہم" پیش آئی اور اس وجہ سے پیش آئی کہ خورس سے بہت پہلے میڈیا اور ایران کے مغرب میں واقع حکومت لیڈیا "ایشیاء کوچک" کے درمیان رقیبانہ جنگ رہتی تھی۔ مگر خورس کے معاصر لیڈیا کے بادشاہ کرڈیس کے باپ نے خورس (گورش) کے نانا اسٹیاگس کے باپ سے صلح کر لی تھی اور باہم ازدواجی رشتہ قائم کر کے مستقل طور سے جنگ کا خاتمہ کر دیا تھا لیکن اب جب کہ خورس نے فارس اور میڈیا دونوں کو متحد کر کے ایک مضبوط سلطنت قائم کر لی تو ایشیاء کوچک کا بادشاہ کرڈیس اس کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے باپ کے کیے ہوئے تمام عہد و پیمان کو توڑ کر میڈیا پر حملہ کر دیا، تب گورش بھی مجبوراً اپنے دارالحکومت ہمدان سے تیزی کے ساتھ آگے بڑھا اور دو ہی جنگوں کے بعد تمام ایشیاء کوچک پر قبضہ کر لیا چنانچہ مشہور یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس کہتا ہے کہ گورش کی یہ مہم ایسی عجیب اور معجزانہ تھی کہ پیٹریا کے معرکہ سے صرف چودہ دن کے اندر اس نے لیڈیا کے مستحکم اور مضبوط دارالحکومت کو مسخر کر لیا اور کرڈیس

---

❶ ص ۳۱

Marfat.com

قید ہو کر مجرم کی حیثیت میں اس کے سامنے کھڑا نظر آیا۔ اب اگرچہ بحر اسود تک تمام ایشیاء کوچک اس کے زیر نگیں تھا مگر پھر بھی وہ آگے بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ مغربی ساحل پر جا پہنچا، یعنی دارالحکومت سے چودہ سو میل فاصلہ طے کر کے مغربی جانب جا کھڑا ہوا۔

اہل جغرافیہ کہتے ہیں کہ لیڈیا کا دارالحکومت سارڈیس مغربی ساحل کے قریب تھا اور ایشیاء کوچک کے مغربی ساحل کی حالت یہ ہے کہ یہاں سمرنا کے قریب چھوٹے چھوٹے جزیرے نکل آنے کی وجہ سے تمام ساحل جھیل کی طرح بن گیا ہے اور بحر ایجین کے اس ساحل کا پانی خلیج کی وجہ سے بہت گدلا رہتا ہے اور شام کے وقت سورج غروب ہوتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک گدلے حوض میں ڈوب رہا ہے۔

مؤرخین کہتے ہیں کہ خورس نے اگرچہ "ایشیاء کوچک" کو مردانہ وار فتح کر لیا لیکن وقت کے دوسرے بادشاہوں کی طرح اس نے ممالک مفتوحہ پر ظلم روا نہیں رکھا اور نہ ان کو وطن سے بے وطن کیا حتیٰ کہ سارڈیس کی پبلک کو یہ بھی محسوس نہیں ہونے دیا کہ یہاں کوئی انقلاب رونما ہو گیا ہے، انقلاب ہوا مگر فقط شخصیت کا یعنی ان کو کرڈیسس کی جگہ خورس جیسا عادل بادشاہ مل گیا۔ چنانچہ ہیروڈوٹس لکھتا ہے:

"سائرس (خورس) نے اپنی فوج کو حکم دے دیا کہ دشمن کی فوج کے سوا اور کسی انسان پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے اور دشمن کی فوج میں سے بھی جو کوئی نیزہ جھکا دے اسے ہرگز قتل نہ کیا جائے اور کرڈیسس اگر تلوار بھی چلائے تب بھی اس کو کوئی گزند نہ پہنچائی جائے"۔ ❶

نیز حکومت کے متعلق اس کا عقیدہ وہی تھا جو ایک صالح اور نیک بادشاہ کا ہونا چاہیے، چنانچہ یونانی مؤرخ کی سیاز لکھتا ہے:

"اس کا عقیدہ یہ تھا کہ دولت بادشاہوں کی ذاتی عیش و آرام کے لیے نہیں ہے بلکہ اس لیے ہے کہ رفاہِ عام کے کاموں میں صرف کی جائے اور ماتحتوں کو اس سے فائدہ پہنچے"۔ ❷

مشرقی مہم:

یہی مؤرخ ہیروڈوٹس بیان کرتا ہے کہ گورش نے ابھی بابل کو فتح نہیں کیا تھا کہ اس کو ایران کے مشرق میں ایک اہم معرکہ آرائی پیش آئی کیونکہ مشرق بعید کے بعض وحشی اور صحراء نشین قبائل نے سرکشی اور بغاوت کی تھی اور یہ باختر (بکٹیریا) کے قبائل تھے اور بعض تاریخی حوالہ جات سے یہ تصریح بھی ملتی ہے کہ جس مقام کو آج کل مکران کہتے ہیں اس جگہ کے خانہ بدوش قبائل نے یہ سرکشی کی تھی یہ مقام بلاشبہ ایران کے لیے مشرق بعید کا حکم رکھتا ہے اس لیے کہ اس کے بعد پہاڑ ہیں جنہوں نے آگے بڑھنے کے لیے راہ روک دی ہے۔

تیسری (شمالی) مہم:

بابل کی فتح کے علاوہ تاریخ گورش کی ایک اور مہم کا ذکر کرتی ہے اور یہ ایران سے شمال کی جانب پیش آئی اس مہم میں وہ بحر کاسپین (خزر) کو داہنی جانب چھوڑتا ہوا کاکیشیا کے پہاڑی سلسلہ تک پہنچا ہے ان ہی پہاڑوں میں اس کو ایک درہ ملا ہے جو دو پہاڑوں کے درمیان پھاٹک کی طرح نظر آتا ہے اس مقام پر جب وہ پہنچا ہے تو ایک قوم نے اس سے یاجوج و ماجوج قبائل کے

---

❶، ❷ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا مضمون "سائرس"

Marfat.com

تاراج کی شکایت کی ہے کہ وہ اس درہ میں سے نکل کر حملہ آور ہوتے اور تاخت و تاراج کر کے ہم کو برباد و تباہ کر ڈالتے ہیں۔ چنانچہ اس نے لوہا اور تانبا استعمال کر کے اس پھاٹک کو بند کر دیا اور دھات کی ایک سد قائم کر دی جس کے آثار ونشان اس وقت بھی موجود ہیں۔ چنانچہ ہیروڈوٹس اور زنیوفن دونوں یونانی مؤرخ تصریح کرتے ہیں کہ گورش نے فتح لیڈیا کے بعد سیتھین قوم کے سرحدی حملوں کی روک تھام کے لیے خاص انتظامات کیے۔

اور یہ حقیقت عن قریب واضح ہو جائے گی کہ گورش کے زمانہ میں یاجوج و ماجوج قبائل میں سے یہی سیتھین تھے جو حملہ آور ہو کر قریب کی آبادیوں کو تاخت و تاراج کرتے رہتے تھے۔

فتح بابل:

اب جب کہ گورش یا خورس کی فتوحات اس درجہ وسیع ہو چکی تھیں کہ ایران کے مغرب اقصیٰ میں وہ بحر شمال سے لے کر بحیرہ اسود (بحر الجین) کے آخری ساحل تک قابض تھا اور مشرق اقصیٰ میں مکران کے پہاڑوں تک بلکہ دارا کے رقبہ حکومت کی تفاصیل کو مستند مان لیا جائے تو دریائے سندھ تک فتح کر چکا تھا۔ ✽ اور شمال میں کاکیشیا کے پہاڑی سلسلہ تک حکمران تھا تو اس کو عراق کی مشہور اور متمدن مگر قاہر و جابر حکومت بابل کی جانب متوجہ ہونا پڑا، چنانچہ اس کی تفصیل بھی تاریخ ہی کی زبانی سنئے۔

خورس سے تقریباً پچاس برس پہلے بابل کی حکومت پر بنوکدنذر (بخت نصر) نظر آتا ہے اور اس زمانہ کے ضمنی عقائد کے مطابق وہ نہ صرف بادشاہ تھا بلکہ بابلی اصنام میں سے سب سے بڑے صنم کا مظہر اور دیوتا بھی سمجھا جاتا تھا اور اس لیے اس کا حق تھا کہ وہ جس حکومت کو چاہے اپنے قہر و غضب کا شکر بنا کر اس کے باشندوں کو ہولناک اور سخت عذاب میں مبتلاء کرے۔ ان کو ہلاک کرے یا غلام بنا کر ان پر وحشیانہ مظالم کو روا رکھے۔ اس لیے اس بادشاہ کے مظالم بے پناہ اور اس کے تسخیر ممالک کا طریقہ سخت وحشیانہ تھا جیسا کہ گزشتہ سطور میں بیان ہو چکا ہے۔ اس نے اپنے دور حکومت میں یروشلم (بیت المقدس) پر تین حملے کیے اور فلسطین تباہ و برباد کر کے تمام باشندوں کو مویشیوں کی طرح ہنکا کر بابل لے گیا۔ ایک یہودی مؤرخ جوزیفس کہتا ہے کوئی سخت سے سخت بے رحم قصائی بھی اس وحشت و خونخواری کے ساتھ بھیڑوں کو مذبح میں نہیں لے جاتا جس طرح بنوکدنذر بنی اسرائیل کو بابل میں ہنکا کر لے گیا۔ ✽

بابل کی حکومت آشوری حکومت کی تباہی کے بعد اور بھی زیادہ مضبوط اور قاہر سلطنت ہو گئی تھی اور اس زمانہ میں قرب و جوار کی طاقتوں میں سے کسی کو بھی یہ جرأت نہیں تھی کہ وہ اس جابر حکومت کے قہر و ظلم کا استیصال کر سکیں لیکن فتح بیت المقدس کے کچھ عرصہ بعد بخت نصر مر گیا اور اس کا جانشین نابونی دس مقرر ہوا مگر اس نے حکومت کا تمام بوجھ شاہی خاندان کے ایک شخص بیل شازار پر ڈال دیا یہ شخص اگرچہ بہت عیاش اور ظالم تھا مگر بخت نصر کی طرح بہادر اور جری نہیں تھا، اس کے زمانہ میں بنی اسرائیل کے قیدیوں میں سے حضرت دانیال علیہ السلام نے اپنی حکیمانہ فراست سے بابلی شازار کو بار بار اس کے مظالم اور عیاشانہ زندگی کے خلاف تہدید و تنبیہ کی مگر اس نے کچھ شنوائی نہیں کی حتیٰ کہ انہوں نے حکومت کے معاملات سے کنارہ کشی کر لی۔

توراۃ کے بیان کے مطابق اسی زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ بیل شازار نے اپنی ملکہ کے اکسانے پر ایک شب یہ حکم دیا

✽ دائرۃ المعارف بستانی ج ۴ (ایران) ✽ دائرۃ المعارف للبستانی (بابل)

Marfat.com

کہ یروشلم سے جو ہیکل کے مقدس ظروف بنوکدنذر لوٹ کر لایا تھا وہ لائے جائیں اور ان میں شراب پلائی جائے، یہ جشن ہو ہی رہا تھا کہ کسی غیبی ہاتھ نے بادشاہ کے سامنے دیوار پر ایک نوشتہ لکھ دیا۔ توراۃ میں ہے:

"اسی گھڑی میں کسی آدمی کے ہاتھ کی انگلیاں ظاہر ہوئیں اور انہوں نے شمعدان کے مقابل بادشاہی محل کی دیوار کے گچ پر لکھا اور بادشاہ نے ہاتھ کا وہ سرا جو لکھتا تھا دیکھا تب بادشاہ کا چہرہ متغیر ہوا اور اس کے اندیشوں نے اسے گھبرا دیا۔ اور نوشتہ جو لکھا گیا سو یہ ہے: منے منے تقیل او فیرسین"۔ [1]

تب شاہ نے گھبرا کر نجومیوں اور فال گیروں کو بلایا مگر کوئی اس کا مطلب نہ بتا سکا آخر ملکہ کے مشورہ سے دانیال علیہ السلام کو بلایا، انہوں نے اوّل اس کے مظالم اور اس کی عیاشی کے خلاف پند و نصیحت فرمائی پھر بتایا کہ تو نے چونکہ بیت المقدس کے ظروف کی توہین کر کے اس ظلم کی تکمیل کر دی اس لیے نوشتہ کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے تیری مملکت کا حساب کیا اور اسے تمام کر ڈالا تو ترازو میں تولا گیا اور کم نکلا، تیری مملکت پارہ پارہ ہوئی اور مادیوں اور فارسیوں کو دے دی گئی۔ [2]

ادھر یہ واقعہ پیش آیا کہ اہل بابل عرصہ سے بیل شازار کے مظالم سے چھٹکارا پانے کی تجویزیں سوچ رہے تھے کہ ان کے بعض سرداروں نے یہ مشورہ کیا کہ قریب کی زبردست طاقت ایران سے مدد حاصل کی جائے اور اس کے عادل فرماں رواں سے یہ عرض کیا جائے کہ وہ ہم کو بیل شازار کے مظالم سے نجات دلائے اور اس کو یہ اطمینان دلایا جائے کہ اہل بابل ہر طرح اس کی مدد کرنے کو آمادہ ہیں۔ چنانچہ ۵۴ ق م بابلی سرداروں کا ایک وفد خورس کے پاس اس وقت پہنچا جبکہ وہ اپنی مشرقی مہم میں مصروف تھا، خورس نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان کو اطمینان دلایا کہ وہ اپنی اس مہم سے فارغ ہو کر ضرور بابل پر حملہ کرے گا اور ان کو بیل شازار جیسے ظالم و عیاش بادشاہ سے نجات دلائے گا۔ خورس جب اپنی مہم سے فارغ ہو گیا تو حسب وعدہ اس نے بابل پر حملہ کر دیا۔

تمام مؤرخین باتفاق رائے کہتے ہیں کہ اس عہد میں بابل سے زیادہ ناقابل تسخیر کوئی مقام نہیں تھا اس لیے کہ اس کو شہر پناہ اس درجہ بہ درجہ موٹی اور مستحکم تھی کہ کوئی فاتح اس کی تسخیر کی جرأت نہیں کر سکتا تھا لیکن خورس کی عدل گستری اور رحم کے حالات دیکھ کر بابل کی رعایا خود اس درجہ اس کی گرویدہ تھی کہ حکومت بابل کا ایک گورنر گوب ریاس خود اس کے ہمراہ تھا اور بقول ہیروڈوٹس اس ہی نے دریا میں نہر کاٹ کر اس کا بہاؤ دوسری جانب کر دیا اور دریا کی جانب سے فوج شہر میں داخل ہو گئی اور خورس کے وہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی شہر فتح ہو گیا اور بیل شازار مارا گیا۔

خورس کا مذہب:

خورس کے مذہب کے متعلق توراۃ اور تاریخ دونوں متفق ہیں کہ جس طرح اس نے ایران کے منقسم حصوں اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو متحد کر کے ایک بڑی شاہنشاہیت قائم کی اور دوسروں کی سطوت و حکومت کے تابع ہونے کی بجائے بابل و نینوئی کی

---

[1] دانیال کا صحیفہ باب ۵ آیات ۵-۲۵

[2] اس مقام پر توراۃ نے دارا کو فاتح بابل کہا ہے یہ سخت التباس ہے جو توراۃ کے بیان میں پیدا ہو گیا ہے اور جگہ جگہ خورس کی جگہ دارا اور دارا کی جگہ خورس کا ذکر کر کے معاملہ کو خلط ملط کر دیا ہے دراصل بابل کو پہلے خورس ہی نے فتح کیا ہے اس کے بعد جب اہل بابل نے بغاوت کر دی تو دارا نے دوبارہ حملہ کر کے اس بغاوت کو فرو کیا۔

Marfat.com

زبردست طاقتوں کو اپنا تابع فرمان بنایا اور جس طرح وقت کے جابر و قاہر شہنشاہوں کے برعکس اس نے عدل و رحم پر اپنی حکومت کو مستحکم اور استوار کیا اسی طرح وہ دین و مذہب کے بارے میں بھی ایران کے مروجہ مذہب کے خلاف دین حق کا تابع اور ایمان باللہ اور توحید الٰہی کا داعی تھا۔

چنانچہ عزرا (عزیر علیہ السلام) کی کتاب میں تعمیر بیت المقدس سے متعلق اس کا یہ واضح اور صاف اعلان مذکور ہے۔

اور شاہ فارس خورس کی سلطنت کے پہلے برس میں اس خاطر کہ خداوند کا کلام جو یرمیاہ کے منہ سے نکلا تھا پورا ہو خداوند نے شاہ فارس خورس کا دل ابھارا کہ اس نے اپنی تمام مملکت میں یہ منادی کرائی اور اسے قلم بند بھی کرایا، فرمایا: "شاہ فارس خورس یوں فرماتا ہے کہ خداوند آسمان کے خدا نے زمین کی ساری مملکتیں مجھے بخشیں اور مجھے حکم کیا ہے کہ یروشلم کے بیچ جو یہوداہ میں ہے اس کے لیے ایک مسکن بناؤں پس اس کی قوم میں سے تمہارے درمیان کون کون ہے؟ اس کا خدا اس کے ساتھ ہو اور وہ یروشلم کو جو شہر یہوداہ ہے جائے اور خداوند اسرائیل کے خدا کا گھر بنائے کہ وہی خدا ہے جو یروشلم میں ہے۔ ❶

مجھ خورس بادشاہ نے خدا کی بابت جو یروشلم میں ہے حکم کیا کہ وہ گھر اور وہ مکان جہاں قربانیاں کرتے ہیں بنایا جائے اور خدا کے گھر کے سنہرے اور روپہلے برتن بھی جنہیں بنوکدنذر یروشلم کی ہیکل میں سے نکال لایا وہ یروشلم کی ہیکل میں اپنی اپنی جگہ میں پہنچائے جائیں اور خدا کے گھر میں رکھے جائیں۔ ✿

خورس کی منادی اور نوشتہ کے نشان زدہ جملوں کو پڑھیے اور پھر فیصلہ کیجیے کہ ان مضامین میں صرف یہ اعلان نہیں ہے کہ یہود کو نجات دلا کر بیت المقدس کی تعمیر کی بھی اجازت دی جاتی ہے بلکہ اس سے زیادہ یہ بھی ہے کہ خدا نے یہ حکم کیا ہے کہ میں اس کا گھر دوبارہ تعمیر کروں اور یہ کہ خدا اسی ہستی کا نام ہے جو یروشلم کا خدا ہے اور بیت المقدس خدا کا مقدس گھر ہے۔

اب اسی کے ساتھ اس کے جانشین دارائے اوّل کا وہ فرمان بھی ملاحظہ ہو جو یہودیوں کی اس عرضی کے جواب میں دیا گیا ہے جس میں بعض صوبہ داروں کی شکایت کی کہ وہ بیت المقدس کی تعمیر میں آڑے آتے ہیں۔ دارا لکھتا ہے:

"پس نہر پار کے صوبہ دار تتنی اور شتر بوزنی اور ان کے افارسکی رفیق جو نہر پار ہوں تم وہاں سے دور ہو جاؤ، تم اس بیت اللہ کے کام میں دست اندازی مت کرو، یہودیوں کا ناظم اور یہودیوں کے بزرگ لوگ خدا کے گھر کو اس کی جگہ تعمیر کریں۔ پر وہ خدا جس نے اپنا نام وہاں رکھا ہے سب بادشاہوں اور لوگوں کو جو اس حکم کو بدل کے خدا کا وہ گھر جو یروشلم میں ہے بگاڑنے کو ہاتھ بڑھاتے ہیں غارت کرے، میں دارا حکم دے چکا اس پر جلد عمل کرنا چاہیے"۔ ✿

اس فرمان میں دارا نے بلند آہنگی کے ساتھ یہ ظاہر کیا ہے کہ بیت المقدس بلاشبہ بیت اللہ ہے اور وہ بددعا کرتا ہے کہ بادشاہ ہو یا معمولی شخص، جو بھی اس بیت اللہ کو خراب کرنے کا ارادہ کرے خدا اس کو غارت کر دے۔

توراۃ کی ان صاف اور واضح شہادتوں کے بعد "جو خورس کا مسلمان ہونا ظاہر کرتی ہیں" اب چند تاریخی شہادتیں بھی قابل مطالعہ ہیں۔

---

❶ باب ۱ آیات ۱-۴ ✿ باب ۶ آیات ۱-۵ ✿ عزرا باب ۶

Marfat.com

دارا نے اپنے زمانہ حکومت میں ایک اہم تاریخی کام یہ کیا ہے کہ پہاڑوں کی مضبوط چٹانوں پر کتبے نقش کرا دیے ہیں جو اس کے اور خورس کے عہد زریں کو روشنی میں لاتے ہیں ان مختلف کتبات میں سے ایک کتبہ ایران کے مشہور شہر اصطخر میں دریافت ہوا ہے یہ کتبہ قدیم تاریخ کا نادر ذخیرہ سمجھا جاتا ہے، کیونکہ اس میں دارا نے اپنے تمام مفتوحہ ممالک اور صوبوں کے نام تک گنا دیے ہیں اور ایسی تفصیلات دی ہیں جن سے اس کے مذہب وعقیدہ اور طریق حکومت تک پر روشنی پڑتی ہے، چنانچہ اسی کتبہ میں دارا کا یہ عقیدہ مذکور ہے:

"خدائے برتر اہورموزدہ ہے اسی نے زمین پیدا کی اسی نے آسمان بنایا اسی نے انسان کی سعادت بنائی اور وہی ہے جس نے دارا کو بہتوں کا تنہا حکمران اور آئین ساز بنایا"۔

اہورموزدہ نے اپنے فضل وکرم سے مجھے بادشاہت دی اور اسی کے فضل سے میں نے زمین میں امن وامان قائم کیا میں اہورموزدہ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے میرے خاندان کو اور ان تمام ملکوں کو محفوظ رکھے، اے اہورموزدہ میری دعا قبول کر!

"اے انسان! اہورموزدہ کا تیرے لیے حکم ہے کہ برائی کا دھیان نہ کر، صراطِ مستقیم کو نہ چھوڑ گناہ سے بچتا رہ"۔ ❶

دارا کے کتبات میں اصطخر کے کتبہ سے بھی زیادہ اہمیت اس کے کتبہ بے ستون کو حاصل ہے اس میں اس کے گوماتہ مجوسی کی بغاوت اور اپنے سریر آرائے سلطنت ہونے کا واقعہ تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے۔

دارا نے اس کتبہ میں گوماتہ کو موگوش (مجوسی) اور اس کے مقابلہ میں کامیابی حاصل ہونے کو اہورموزدہ کے فضل کی جانب منسوب کیا ہے اور ہیروڈٹس اور دوسرے یونانی مؤرخ یہ اور اضافہ کرتے ہیں کہ دارا کے خلاف یہ بغاوت میڈیا (ایران) کے قدیم مذہب کے پیروؤں (مجوسیوں) کی جانب سے ہوئی تھی۔ دارا کے زمانہ میں گوماتہ کے علاوہ پراورتیش اور چترت خمہ اور مجوسیوں (موگوشوں) نے علم بغاوت بلند کیا اور دارا کے ہاتھ سے پہلا ہمدان میں اور دوسرا اردبیل میں قتل ہوا۔ ❷

پھر خورس اور دارا کے "مومن" ہونے اور ایران کے قدیم مذہبی "مجوسی" سے بیزار رہنے پر سب سے بڑی شہادت دارا کا وہ تبلیغی اعلان ہے جو اس نے دانیال علیہ السلام کے دشمنوں کے خلاف اس وقت شائع کیا تھا جب کہ دانیال علیہ السلام نبی کو ان کے دشمنوں نے شیر ببر کے سامنے ڈال دیا تھا اور دانیال علیہ السلام معجزانہ طور پر صحیح وسالم بچ گئے تھے۔

تب دارا بادشاہ نے ساری قوموں اور گروہوں اور اہل لغت کو جو روئے زمین پر بستے تھے نامہ لکھا:

"تمہاری سلامتی ترقی پائے میں یہ حکم کرتا ہوں کہ میری مملکت کے ہر ایک صوبے کے لوگ دانی ایل کے خدا کے آگے ترساں ولرزاں ہوں کیونکہ یہ وہی زندہ خدا ہے جو ہمیشہ قائم ہے اور اس کی سلطنت لازوال ہے اور آخر تک رہے گی وہی چھڑاتا اور بچاتا ہے اور آسمان اور زمین میں وہی نشانیاں دکھلاتا اور عجائب وغرائب کرتا ہے اسی نے دانی ایل کو شیر ببروں کے چنگل سے چھڑایا ہے پس یہ دانی ایل دارا کی سلطنت اور خورس فارسی کی سلطنت میں کامیاب رہا"۔ ❸

---

❶ ترجمان القرآن ماخوذ حجاز البن فانو گریٹ منار یز آف دی انشنیٹ ایسٹرن

❷ دائرۃ المعارف بستانی (ایران)

❸ دانیال کی کتاب باب ۶ آیات ۲۵-۲۸

Marfat.com

ان تاریخی مصادر سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ دارا اور اس کے پیشرو خورس کا مذہب ایران کے قدیم مذہب "موگوش" (مجوسی مذہب) سے جدا اور مخالف تھا اور یہ کہ دارا جس ہستی کو اہور موزدہ کہہ کر پکارتا ہے اور اس کے جو اوصاف بیان کرتا ہے اس سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اور اس کا پیشرو دین حق پر تھے اور عربی کا "اللہ" سریانی کا الوہیم اور عبرانی کا "ایل" اور ایران کا اہور موزدہ ایک ہی مقدس ہستی کے نام ہیں، کیونکہ دارا کہتا ہے کہ وہی یکتا اور بے ہمتا ہے اور وہی خالق کائنات ہے اور خیر و شر تنہا اسی کے ہاتھ میں ہے نیز وہ توحید خالص پر ایمان کے ساتھ ساتھ آخرت پر ایمان رکھتا اور صراطِ مستقیم کی تلقین اور گناہوں سے اجتناب کی تعلیم کا اظہار کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ عقائد کی یہ تفصیلات مجوسی مذہب کے بالکل خلاف ہیں اور اسی لیے دارا مجوسیوں پر کامیابی حاصل کرنے کو اہور موزدہ کا فضل و کرم قرار دیتا ہے۔

رہا یہ امر کہ خورس اور دارا وقت کے کس مذہب حق کے پیرو تھے تو اس کا جواب مختصر سی تمہید کے بعد با آسانی دیا جا سکتا ہے۔

ایران قدیم کا مذہب:

ادیان و مذاہب کی تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وسط ایشیاء کے آرین قوموں کا مذہبی تخیل بنیادی طور پر ہمیشہ سے مشترک رہا ہے اور یہ سب مظاہر قدرت کے پرستار اور اصنام پرستی کے ذریعہ اس عقیدہ کے علم بردار نظر آتے ہیں پھر آہستہ آہستہ آسمان پر سورج کو اور زمین پر آگ کو تقدیس کا درجہ دیا جاتا ہے کیونکہ اس کی نگاہ میں یہی دونوں روشنی اور حرارت کے مبدأ ہیں اور روشنی اور حرارت ہی عالم کے تمام نظام میں کارفرما ہیں، چنانچہ قدیم یونان اور ہندوستان اور ایران وغیرہ کے مذاہب میں یہ چیز مشترک نظر آتی ہے البتہ جزئیات میں یہ فرق رہا ہے کہ مثلاً یونان اور ہندوستان کے ضمنی عقائد میں دیوتاؤں کو اچھائی اور برائی دونوں پر قدرت حاصل ہے لیکن ایران کے اصنامی عقائد کی بنیاد اس پر قائم ہے کہ کائنات کا تمام نظام دو مخالف قوتوں کی کارفرمائی میں ہے، ایک خیر اور نیکی کے دیوتا ہیں جو خیر اور تمام بھلائی کے مالک و متصرف ہیں اور دوسرے شر اور بدی کے دیوتا ہیں جن سے صرف بدی اور برائی کا صدور ہوتا ہے یعنی خالق خیر ایک جدا قوت ہے اور خالق شر دوسری قوت اور تمام عالم پر ان ہی دو متضاد قوتوں کی حکومت ہے اور ان ہی کے تصادم پر نظام کائنات میں خیر و شر کا غلبہ ہوتا رہتا ہے اس لیے ان کے یہاں خدائے واحد کا کوئی تصور ہی نہیں ہے اور چونکہ وہ خیر کو روشنی اور شر کو تاریکی خیال کرتے ہیں اس لیے آگ کو روشنی کا مبدأ قرار دے کر یزداں (خیر کا دیوتا) کی قربت حاصل کرنے کے لیے قابل پرستش سمجھا گیا اور آتش پرستی کو مذہب کا جزء اعظم بنایا گیا۔

چنانچہ فارس اور میڈیا یعنی ایران کا یہی قدیم مذہب تھا جس کے پیرو موگوش (مجوس) کہے جاتے تھے۔

ایران اور مذہب زردشت:

لیکن تقریباً ۵۵۰ ق م اور ۵۸۳ ق م کے درمیان شمال مغربی ایران یعنی قفقاز اور آذربیجان کے اس نواح میں جو وادی ارس کے نام سے مشہور ہے ایک ملہم من اللہ ہستی کا ظہور ہوا یہ ابراہیم زردشت کی شخصیت تھی انہوں نے ایران کے مجوسیوں میں دین حق کا اعلان کیا اور رشد و ہدایت اور دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دیا۔

انہوں نے بتایا کہ کائنات میں خیر و شر کے دیوتاؤں کا تصور باطل ہے بلکہ سارے عالم پر صرف ایک ہی ہستی بلا شرکت

غیرے مالک اور متصرف ہے وہ یکتا و بے ہمتا ہے، قدیر و حلیم ہے، نور و قدوس ہے اور یہ اہورموزدہ کی پاک ہستی ہے یہی تمام کائنات کی خالق ہے تم جن کو خیر کے دیوتا سمجھتے ہو وہ دیوتا نہیں بلکہ اہورموزدہ کی مخلوق اور اس کے حکم سے امور خیر کے کارپرداز امش اسپند (فرشتے) ہیں اور تم نے جن کو شر کا دیوتا سمجھ لیا ہے وہ سراسر باطل کے سوا کچھ نہیں بلکہ یہاں شر کا مرکز اسی اہورموزدہ کی مخلوق "اہرمن" (شیطان) کی ہستی ہے یہی انسانوں کے دلوں میں شر کو بھڑکا کر تاریکی کی جانب لے جاتی ہے "انسان" ان دو متضاد اثرات میں گھرا ہوا ہے اور اہورموزدہ نے اس کو اپنے سچے نبیوں کے ذریعہ روشنی اور تاریکی دونوں کے اثرات سے بخوبی آگاہ کر دیا ہے پس آگ کی پرستش محض گمراہی ہے اور انسانی شقاوت و سعادت کا معاملہ صرف اسی دنیا تک محدود نہیں ہے بلکہ اس عالم کے علاوہ ایک دوسرا عالم (آخرت) ہے اور وہاں دو جدا جدا مقامات ایک نیکوکاروں کے لیے اور دوسرا بدکاروں کے لیے ہے اس لیے ہم کو گناہوں سے پرہیز کرنا اور نیکی کو اختیار کرنا چاہیے اور اپنے اخلاق کو بہتر بنانا چاہیے۔

یہ تھی ابراہیم زردشت کی وہ تعلیم جس کے متعلق آج عرب اور یورپ کے محقق مؤرخین کا اتفاق ہے کہ اواخر چھٹی صدی قبل مسیح میں یہ آواز زردشت کی زبانی میڈیا اور فارس کے قدیم مذہب کے خلاف ایران میں سنی گئی۔ ❶

یہی مؤرخین یہ بھی کہتے ہیں کہ ابراہیم زردشت دانیال اکبر یا یرمیاہ علیہما السلام کے شاگرد اور فیض یافتہ تھے اور ایران کے قدیم مذہب کی ہدایت کے لیے مبعوث کیے گئے۔

ابراہیم زردشت کی تعلیم "دین حق کی تعلیم" تھی اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ ان پر نازل شدہ الہامی کتاب "اوستا" کے مضامین کے ابتداء ایسے ہی جملوں سے ہوتی ہے جن کا مفہوم سچی الہامی کتابوں میں مشترک پایا جاتا ہے یعنی شیطانی وساوس سے پناہ اور خدائے رحمان و رحیم کی مدح و ثناء چنانچہ قرآن سے قبل کی الہامی کتابوں کی طرح اگرچہ "اوستا" بھی محرف ہو چکی ہے تاہم اس میں یہ جملے اب بھی محفوظ ہیں جن سے مضامین کی ابتداء ہوتی ہے اور دساتیر آسمانی میں ان کو اس طرح نقل کیا گیا ہے:

① ہوزامیم فہ مزدان ہزہزماس ہرشیور ہردیور "پناہیم بہ یزداں (اہورموزدہ) ازنش رشت وخوئے بدگمارہ کنندہ براہ ناخوب برندہ، رنج دہندہ، آزار رسانندہ (یعنی شیطان)"۔

② فہ شید شمتای ہرشندہ ہرشمشگر زمرپان فراہیدور "بنام ایزد بخشایندہ بخشائش گر مہربان، دادگر"۔

ماب اگر اسی کے ساتھ خورس (کے خسرو) اور داریوش (دارا) کے ان بیانات کو بھی پیش نظر رکھا جائے جو توراۃ میں بیت المقدس کی تعمیر سے متعلق ہیں اور ان کتبات کی عبارات کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے جو دارا کی جانب سے منقوش کیے گئے ہیں اور جن میں مجوسی عقائد کے خلاف خدائے واحد کی حمد و ثنا بیان کی گئی ہے تو پھر یہ دعویٰ حقیقت بن کر سامنے آ جاتا ہے کہ خورس اس کے بیٹے کیقباد دوم ❷ (کم بی سیز) اور دارا کا مذہب بلاشبہ ایران کے قدیم مذہب (مجوسی مذہب) کے خلاف دین حق کا مذہب تھا اور جب کہ تحقیق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ابراہیم زردشت اور خورس (کے ارش) کا زمانہ ایک رہا ہے اور خورس اور دارا کے عقائد زردشت کی تعلیم کے عین مطابق ہیں تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خورس پہلا بادشاہ ہے جس نے ایران کے قدیم مذہب (مجوسی مذہب) کے خلاف

---

❶ حاشیہ تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۸ و یونیورسل ہسٹری آف دی ورلڈ مقالہ پروفیسر گرنڈی ج ۲ ص ۱۱۳

❷ کم بی سیز (کیقباد) خورس کے باپ کا نام بھی ہے اور بیٹے کا بھی۔

Marfat.com

اس دین حق کو قبول کیا اور کچھ تعجب نہیں کہ یہود کو خورس کے ساتھ اس درجہ شغف کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ خورس ایسے مذہب کا پیرو تھا جو ان کے نبی دانیال اکبر یا یرمیاہ علیہما السلام کے شاگرد اور فیض یافتہ ہادی (زردشت) کی جانب منسوب ہے۔

مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ زردشت کی تعلیم حق کو ایران زیادہ دیر تک قائم نہ رکھ سکا اور دارا پر حملہ اسکندر کے بعد یعنی ایران کے پہلے عہد تاریخی کے ختم پر وہ بھی مسخ اور محرف کر دیا گیا۔ چنانچہ مؤرخین کا بیان ہے کہ ۴۰۰ ق م کے بعد زردشتی مذہب کا انحطاط شروع ہو گیا اور ایک جانب روم و یونان کے خارجی اثرات نے اس کو متاثر کیا اور دوسری جانب ایران کے قدیم مذہب "مجوس" نے دوبارہ سر اٹھایا اور نتیجہ یہ نکلا کہ دارا کے قتل کے بعد ہی اس کے اصل خدوخال بگڑنے لگے اور اس میں تحریف و مسخ کا سلسلہ شروع ہو گیا اور آہستہ آہستہ قدیم مجوسی مذہب کے امتزاج کے ساتھ اس نے ایک نئی شکل اختیار کر لی اور اب یہی مجوسی مذہب کے نام سے موسوم ہے۔

ایرانیوں (پارسیوں) کا اپنا بیان ہے کہ جب سکندر مقدونی نے اصطخر پر حملہ کیا تو اس نے شہر کو آگ لگا دی اور اس میں زردشت کا مقدس صحیفہ "اوستا" جل کر راکھ ہو گیا گویا بیت المقدس پر حملہ کے وقت جو معاملہ بخت نصر نے یہود کی مقدس کتاب توراۃ کے ساتھ کیا وہی سکندر نے اوستا کے ساتھ کیا اور اس طرح دونوں مذاہب کے مقدس صحیفے دنیا سے مفقود ہو گئے۔

پھر تقریباً پانچ سو سال کے بعد ایران کے تیسرے تاریخی عہد میں ساسانی حکومت کے بانی اردشیر بابکانی نے از سرنو "اوستا" کو مرتب کرایا پس ظاہر ہے کہ اب یہ صحیفہ اصل "اوستا" نہیں ہے بلکہ قدیم ایرانی مذہبی یونانی مذہب اور زردشتی مذہب کا ایک معجون مرکب ہے بلکہ اس کے نمایاں عقائد و اعمال بیشتر قدیم مجوسیت ہی سے ماخوذ نظر آتے ہیں تاہم اس صحیفہ کا جو ناقص اور محرف حصہ آج پارسیوں کے ہاتھ میں ہے اس میں اصل مذہب کی جھلک اب بھی کہیں کہیں نظر آتی ہے جس کے بعض حوالہ جات ہم اصحاب الرس کے واقعہ میں نقل کر چکے ہیں۔

مسلمانوں نے جب خیر القرون کو فتح کیا تو ان کو ان ہی پیروان زردشت سے واسطہ پڑا جو صحیح دین زردشتی چھوڑ کر قدیم مجوسی مذہب پر واپس ہو چکے تھے اور ان میں ایک نبی اور اس کی کتاب کے تصور کے علاوہ کوئی بات زردشتی مذہب کی باقی نہیں رہی تھی اور اسی بناء پر قرآن نے بھی ان کو "مجوس" ہی کہہ کر ذکر کیا ہے، اس لیے متقدم عرب مؤرخین نے یہ سمجھ لیا کہ مجوسی مذہب اور زردشتی مذہب ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں، اس کے باوجود بعض متقدم محقق اور اصحاب سیرۃ اس قدر پتہ دے سکتے ہیں کہ ایران میں دو مذاہب نے یکے بعد دیگرے اپنا اثر قائم کیا ہے۔ ایران اول صابی مذہب رکھتا تھا اور اس کے بعد اس نے زردشتی مذہب قبول کر لیا عرب میں "صابی" کے معنی "بددین" کے ہیں چنانچہ قریش مکہ اسی بنا پر اپنے خیال میں مسلمانوں کو "صابی" کہا کرتے تھے۔ اس لیے "صابی" سے ان حضرات کی مراد غالباً اسی مذہب قدیم سے ہے جو آتش پرستی بت پرستی اور دیوتا پرستی پر قائم تھا۔

متاخرین علماء میں سے شاہ عبدالقادر نور اللہ مرقدہ بھی تردد کے ساتھ المجوس" کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں" مجوس آگ پوجتے ہیں اور ایک نبی کا نام بھی لیتے ہیں معلوم نہیں پیچھے بگڑے یا سرے سے غلط ہیں"۔ مگر آج عرب اور یورپ کے محققین اہل تاریخ بغیر کسی تردد کے دلائل و براہین کی روشنی میں اس حقیقت کا اعلان کرتے ہیں کہ زردشت کا مذہب ایران کے قدیم مذہب سے

کیونکہ اس جدید مرکب مذہب میں بھی آتش پرستی مذہب کی بنیاد تھی اور اس کا پجاری اور مہنت اب بھی مغ ہی کہلاتا تھا اور مغ موگوش اور جوش ایک ہی شئے ہے۔

Marfat.com

جدا "دین حق" تھا جس میں مظاہر پرستی اصنام پرستی آتش پرستی سب ممنوع تھی اور خدائے واحد کی پرستش کے سواء کسی کی پرستش جائز نہیں تھی۔

چنانچہ مصر کے مشہور عالم فرج اللہ زکی نے اس قول کی پرزور تردید کی ہے۔✽ جس میں یہ کہا گیا ہے کہ زردشت نے اوّل یرمیاہ علیہ السلام کی شاگردی کی مگر جب کسی بات پر یرمیاہ نبی اس سے خفا ہو گئے تو وہ ان سے جدا ہو گیا اور آتش پرستی کا ایک نیا مذہب ایجاد کر لیا ابن کثیر نے بھی اس قول کو "قیل" کہہ کر نقل کیا ہے یعنی وہ بھی اس کو قابل اعتماد نہیں سمجھتے۔

ذوالقرنین اور قرآن عزیز:

ذوالقرنین کی شخصیت کے بارے میں اگرچہ دو اہم مباحث یعنی ذوالقرنین سے متعلق توراۃ کی پیشین گوئیاں اور تاریخی شہادتیں سپرد قلم ہو چکیں لیکن ابھی ایک اہم مسئلہ یہ باقی ہے کہ کیا وہ شخصیت جس کے لیے توراۃ اور تاریخ سے روایات وشہادات پیش کی گئی ہیں درحقیقت قرآن میں مذکور ذوالقرنین ہی کی شخصیت ہے تو اس کے جواب سے قبل قرآن عزیز کی ان آیات کو پیش کر دینا ضروری ہے جو سورۂ کہف میں اس واقعہ سے متعلق بیان کی گئی ہیں تاکہ بعد میں تطبیق کا مسئلہ بخوبی واضح ہو سکے۔

قرآن عزیز (سورۂ کہف) میں ذوالقرنین کا واقعہ اس طرح مذکور ہے:

﴿ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ؕ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ؕ ۸۳ اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَ اٰتَيْنٰهُ مِنْ
كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ۸۴ فَاَتْبَعَ سَبَبًا ۸۵ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّ
وَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ؕ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّاۤ اَنْ تُعَذِّبَ وَ اِمَّاۤ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ۸۶ قَالَ اَمَّا مَنْ
ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ۸۷ وَ اَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ
جَزَآءَ ۨالْحُسْنٰى ۚ وَ سَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ۸۸ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۸۹ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ
وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ۹۰ كَذٰلِكَ ؕ وَ قَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ۹۱
ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۹۲ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ۹۳
قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَ مَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰۤى اَنْ تَجْعَلَ
بَيْنَنَا وَ بَيْنَهُمْ سَدًّا ۹۴ قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ رَدْمًا ۹۵
اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِيْۤ
اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ۹۶ فَمَا اسْطَاعُوْۤا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَ مَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ۹۷ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ
فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَ كَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ۹۸ وَ تَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ

✽ حاشیہ تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۴۸

﴿وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا﴾ (الکہف:۸۳-۹۹)

"اے پیغمبر! تم سے ذوالقرنین کا حال دریافت کرتے ہیں تم کہہ دو میں اس کا کچھ حال تمہیں (کلام الٰہی میں) پڑھ کر سنا دیتا ہوں ہم نے اسے زمین میں حکمرانی دی تھی نیز اس کے لیے ہر طرح کا ساز و سامان مہیا کر دیا تھا تو (دیکھو) اس نے (پہلے) ایک مہم کے لیے ساز و سامان کیا (اور پچھم کی طرف نکل کھڑا ہوا) یہاں تک کہ (چلتے چلتے) سورج کے ڈوبنے کی جگہ پہنچ گیا وہاں اسے سورج ایسا دکھائی دیا جیسے ایک سیاہ دلدل کی جھیل میں ڈوب جاتا ہے اور اس کے قریب ایک گروہ کو بھی آباد پایا ہم نے کہا اے ذوالقرنین (اب یہ لوگ تیرے اختیار میں ہیں تو چاہے انہیں عذاب میں ڈالے چاہے اچھا سلوک کر کے اپنا بنا لے)۔ ذوالقرنین نے کہا: "ہم ناانصاف کرنے والے نہیں جو سرکشی کرے گا اسے ضرور سزا دیں گے پھر اسے اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا ہے وہ (بداعمالوں کو) سخت عذاب میں مبتلاء کرے گا اور جو ایمان لائے گا اور اچھے کام کرے گا تو اس کے بدلے اسے بھلائی ملے گی اور ہم اسے ایسی ہی باتوں کا حکم دیں گے جس میں اس کے لیے راحت و آسانی ہو"۔ اس کے بعد اس نے پھر تیاری کی اور (پورب) کی طرف نکلا یہاں تک کہ سورج نکلنے کی آخری حد تک پہنچ گیا اس نے دیکھا سورج ایک گروہ پر نکلتا ہے جس سے ہم نے کوئی آڑ نہیں رکھی ہے۔ معاملہ یونہی تھا اور جو کچھ ذوالقرنین کے پاس تھا اس کی ہمیں پوری خبر ہے۔ اس نے پھر ساز و سامان تیار کیا اور تیسری مہم میں نکلا، یہاں تک کہ دو پہاڑوں کی دیواروں کے درمیان پہنچ گیا، وہاں اس نے دیکھا پہاڑوں کے اس طرف ایک قوم آباد ہے جس سے بات کہی جائے تو کچھ نہیں سمجھتی، اس قوم نے (اپنی زبان میں) کہا اے ذوالقرنین یاجوج اور ماجوج اس ملک میں آ کر لوٹ مار کرتے ہیں، کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک روک بنا دیں اور اس غرض سے ہم آپ کے لیے کچھ خراج مقرر کریں۔ ذوالقرنین نے کہا: میرے پروردگار نے جو کچھ میرے قبضہ میں دے رکھا ہے وہی میرے لیے بہتر ہے (تمہارے خراج کا محتاج نہیں) مگر تم اپنی قوت سے (اس کام میں میری مدد کرو میں تمہارے اور یاجوج و ماجوج کے درمیان ایک مضبوط دیوار کھڑی کر دوں گا۔ اس کے بعد اس نے حکم دیا) لوہے کی سلیں میرے لیے مہیا کر دو۔ پھر جب (تمام سامان مہیا ہو گیا اور دونوں پہاڑوں کے درمیان دیوار اٹھا کر ان کے برابر بلند کر دی تو حکم دیا (بھٹیاں سلگاؤ اور اسے دھونکو پھر جب (اس قدر دھونکا گیا کہ) بالکل آگ کی طرح لال ہو گئی تو کہا گلا ہوا تانبا لاؤ اس پر انڈیل دیں چنانچہ (اس طرح) ایک ایسی سد بن گئی نہ تو (یاجوج و ماجوج) اس پر چڑھ سکتے تھے نہ اس میں سرنگ لگا سکتے تھے۔ ذوالقرنین نے (تکمیل کار کے بعد) کہا یہ جو کچھ ہوا تو (فی الحقیقت) میرے پروردگار کی مہربانی ہے جب میرے پروردگار کی فرمائی ہوئی بات ظہور میں آئے گی تو وہ اسے ڈھا کر ریزہ ریزہ کر دے گا اور میرے پروردگار کی فرمائی ہوئی بات سچ ہے ٹلنے والی نہیں اور اس دن ہم ایسا کریں گے کہ ان میں سے ایک قوم دوسری قوم پر موجوں کی طرح آ پڑیں گی اور پھونکا جائے گا نرسنگھار (صور) پس اکٹھا کریں گے ہم ان کو"۔

قرآن عزیز کی ان آیات میں ذوالقرنین کا جو واقعہ مذکور ہے اگر اس کو ان واقعات کے ساتھ تطبیق دیجیے جو گزشتہ صفحات

Marfat.com

میں توراۃ اور تاریخ قدیم کے حوالہ جات سے نقل کیے گئے ہیں تو آپ خود یہ فیصلہ دیں گے کہ تاویلات تخمینی قیاس آرائیوں اور غیر معلوم احتمالات سے محفوظ رہ کر ذوالقرنین کا اطلاق خورس کے سواء اور کسی شخصیت پر نہیں ہوتا۔

مگر اس فیصلہ کی حقیقت پر عبور حاصل کرنے کے لیے ازبس ضروری ہے کہ سورۂ کہف کی زیر مطالعہ آیات کے مطابق کا تجزیہ کر کے ان کے ساتھ خورس سے متعلق تاریخی واقعات کی مطابقت کو واضح اور روشن کر دیا جائے۔

پس ذوالقرنین کے متعلق قرآن عزیز نے کن حقائق کا اظہار کیا ہے اور خورس سے متعلق واقعات کس طرح ان حقائق کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں سطور ذیل میں ترتیب وار قابل مطالعہ ہیں۔

① قرآن عزیز کا اسلوب بیان کہتا ہے کہ اس نے ذوالقرنین کا واقعہ دوسروں کے سوال کرنے پر بیان کیا ہے اور سوال کرنے والوں نے اسی لقب کے ساتھ اس کو یاد کیا ہے۔قرآن نے اپنی جانب سے یہ لقب تجویز نہیں کیا:

﴿وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ؕ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ؕ۝۸۳﴾ (الکہف:۸۳)

"(اے پیغمبر!) تم سے ذوالقرنین کا حال دریافت کرتے ہیں، تم کہہ دو میں اس کا کچھ حال تمہیں (کلامِ الٰہی) میں پڑھ کر سناتا ہوں"۔

تطبیق: صحیح روایات سے یہ ثابت ہو چکا کہ یہ سوال یہودیوں کی تلقین سے قریش مکہ نے کیا تھا اور سوال میں یہ مذکور تھا کہ ایسے بادشاہ کا حال بتاؤ جو مشرق و مغرب میں پھر گیا اور جس کو توراۃ میں صرف ایک جگہ اس لقب سے یاد کیا گیا ہے اور توراۃ یہ کہتی ہے کہ دانیال علیہ السلام کے مکاشفہ میں ایران کے ایک بادشاہ کو ایسے مینڈھے کی شکل میں دکھایا گیا جس کے دو سینگ نمایاں تھے اور جبرائیل فرشتہ نے اس دو سینگوں والے مینڈھے (ذوالقرنین) کی تعبیر یہ دی کہ اس سے وہ بادشاہ مراد ہے جو فارس اور میڈیا دو بادشاہتوں کا مالک ہوگا اور یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی اور تاریخ دونوں اس پر متفق ہیں کہ ایران کا یہ بادشاہ خورس تھا جس نے فارس اور میڈیا دونوں کو ملا کر شاہنشاہی کی۔ یہودیوں کو اس سے اس لیے دلچسپی تھی کہ ان کے انبیاء علیہم السلام کے الہامات کے مطابق وہ ان کا نجات دہندہ تھا چنانچہ یہودیوں کا دیا ہوا یہ لقب ذوالقرنین خود ایران کے شاہی خاندان میں اس درجہ مشہور و مقبول ہوا کہ انہوں نے خورس کے مرنے کے بعد اس کا مجسمہ بنایا تو اس میں بھی تاریخی یادگار کے طور پر دانیال علیہ السلام کے خواب کو مصور کر کے دکھایا اور چونکہ یسعیاہ نبی کے صحیفہ میں ایک جگہ اس کو عقاب بھی کہا گیا ہے:

"میں خدا ہوں اور مجھ سا کوئی نہیں جو ابتدا سے انتہاء تک احوال اور قدیم وقتوں کی باتیں جو اب تک پوری نہیں ہوئیں بتاتا ہوں اور جو کہتا ہوں میری مصلحت قائم رہے گی اور میں اپنی ساری مرضی پوری کروں گا جو عقاب کو پورب سے لاؤں گا اس شخص کو جو میرے ارادوں کو پورا کرے گا"۔ ✽

اس لیے اصطخر کے قریب خورس کا جو سنگی مجسمہ نکلا ہے اس کو اس مجموعی تخیل ہی پر بنایا گیا ہے کہ اس کے سر کے دونوں جانب دو سینگ ہیں اور سر پر ایک عقاب ہے اور خورس کے سواء دنیا کے کسی بادشاہ کے متعلق یہ تخیل موجود نہیں ہے۔

✽ باب ۴۶ آیات ۹-۱۱

Marfat.com

پس یہ دلیل ہے اس امر کی کہ یہود کو اپنے نجات دہندہ خدا کے مسیح اور خدا کے چرواہے کے ساتھ اس درجہ دلچسپی تھی کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی صداقت کا معیار اس بادشاہ کے واقعات کے علم کو قرار دیا اور اسی کے پیش نظر قرآن نے اس بادشاہ (خورس) کا مناسب حال ذکر کیا۔

۲ قرآن کہتا ہے کہ وہ بہت صاحب شوکت بادشاہ تھا اور خدا نے اس کو ہر قسم کے ساز و سامان حکومت سے نوازا تھا:

﴿إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ وَآتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴾ (سورة الكهف: ٨٤)

"ہم نے اس کو حکمرانی عطاء کی اور اس کے لیے ہر طرح کا ساز و سامان مہیا کر دیا تھا"۔

تطبیق: خورس (گورش) کے متعلق توراۃ اور قدیم و جدید تاریخی حوالوں سے یہ ثابت ہو چکا کہ اس نے نہ صرف ایران کی مختلف قبائلی حکومتوں کو ہی ایک شاہنشاہی میں منسلک کر دیا تھا بلکہ بابل و نینویٰ کی عظیم الشان حکومتوں پر بھی قابض ہو کر اپنی جغرافیائی حیثیت میں ایسی وسیع مملکت کا مالک ہو گیا تھا کہ خدائے تعالیٰ نے اس کو تمام ساز و سامان زندگی و حکومت سے مالا مال کر دیا۔

۳ قرآن کہتا ہے کہ ذوالقرنین نے تین قابل ذکر مہم سر کی ہیں۔

تطبیق: معتبر تاریخی شہادتیں ثابت کرتی ہیں کہ خورس نے تین قابل ذکر مہم سر کیں۔

۴ قرآن کہتا ہے کہ ذوالقرنین نے پہلے پچھم (مغرب) کی جانب ایک مہم سر کی:

﴿فَأَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتَّى إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ ﴾ (الكهف: ٨٥، ٨٦)

"پس اس نے (ایک مہم کے لیے) ساز و سامان کیا اور پچھم کی جانب نکل کھڑا ہوا۔ یہاں تک کہ چلتے چلتے سورج کے ڈوبنے کی جگہ پہنچا، وہاں اسے سورج ایسا دکھائی دیا جیسے ایک سیاہ دلدل میں ڈوب جاتا ہے"۔

تطبیق: یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس اور بعض دوسرے مؤرخین کے حوالے سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ خورس کو سب سے پہلی اور اہم مہم کی جانب پیش آئی جب کہ لیڈیا (ایشیاء کوچک) کے بادشاہ کرڈیس کے غدارانہ طرز عمل کے خلاف اس کو لیڈیا پر حملہ کرنا پڑا یہ تمام ایران سے جانب مغرب واقع ہے اور اس کا دارالحکومت "سارڈیس" ایشیاء کوچک کے آخری مغربی ساحل کے قریب تھا۔ بقول ہیروڈوٹس خورس کی یہ مہم ایسی معجزانہ انداز میں تھی کہ وہ مغرب کی جانب فتوحات کرتا ہوا چودہ روز کے اندر ایشاء کوچک کے آخری ساحل پر جا کھڑا ہوا اور سارڈیس جیسے محکم و مضبوط شہر کو تسخیر کر لیا۔ اب اس کے سامنے سمندر کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ سمرنا کے قریب بحر ایجین (Aegansea) کا یہی وہ ساحل ہے جو اپنے اندر بہت سے چھوٹے چھوٹے جزیرے رکھنے کی وجہ سے جھیل بن گیا ہے اور اس کا پانی بہت گدلا رہتا ہے اور شام کے وقت جب سورج ڈوبتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے گویا سیاہ دلدل میں ڈوب رہا ہے، ﴿تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ﴾۔

۵ قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہاں کی قوم پر ذوالقرنین کو ایسا غلبہ دے دیا تھا کہ وہ جس طرح چاہے ان کے ساتھ معاملہ کرے، چاہے ان کی بغاوت کی پاداش میں ان کو سزا دے اور چاہے تو ان کے ساتھ حسن سلوک کر کے ان کو معاف کر دے:

﴿وَوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۗ قُلْنَا يَا ذَا الْقَرْنَيْنِ إِمَّا أَنْ تُعَذِّبَ وَإِمَّا أَنْ تَتَّخِذَ فِيهِمْ حُسْنًا ﴾ (سورة الكهف: ٨٦)

Marfat.com

تطبیق: تاریخی حوالوں اور ہیروڈوٹس اور زینوفن کے تاریخی اقوال سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ خورس (کے ارش) نے لیڈیا کو فتح کر کے عام بادشاہوں کی طرح اس کو برباد نہیں کیا بلکہ عادل، نیک اور صالح بادشاہ کی طرح عفو کا اذن عام کر دیا اور ان کو بے وطن نہیں ہونے دیا۔ بلکہ کرڈیسس کی گرفتاری کے سوا یہ بھی محسوس نہیں ہونے دیا کہ یہاں کوئی انقلاب حکومت ہوا ہے، البتہ کرڈیسس کی جرأت مردانہ کے امتحان کے لیے اوّل اس کو چتا میں جلانے کا حکم دیا مگر جب وہ مردانہ وار چتا کے اندر بیٹھ گیا تو اس کو بھی معاف کر دیا اور اس کے ساتھ اعزاز واکرام کے ساتھ پیش آیا۔

⑥ قرآن نے ذوالقرنین کا جو مقولہ نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ "مومن" بھی تھا اور عادل وصالح بھی۔ وہ کہتا ہے:

﴿قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ۝٨٧ وَ اَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ِالْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ۝٨٨﴾ (سورۃ الکہف:۸۷،۸۸)

"ذوالقرنین نے کہا ہم ناانصافی کرنے والے نہیں ہیں جو سرکشی کرے گا اسے ضرور سزا دیں گے پھر اسے اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا ہے وہ (بداعمالوں کو) سخت عذاب میں مبتلا کرے گا اور جو ایمان لائے گا اور اچھے کام کرے گا تو اس کے بدلہ میں اس کو بھلائی ملے گی اور ہم اسے ایسی ہی باتوں کا حکم دیں گے جس میں اس کے لیے آسانی وراحت ہو"۔

تطبیق: توراۃ میں خورس کا یروشلم سے متعلق فرمان اور دارا کے کتبات واعلانات مذکورہ توراۃ "اوستا" کی اندرونی شہادات اور تاریخی بیانات یہ سب شہادتیں ناقابل انکار حد تک یہ ثابت کرتی ہیں کہ خورس اور دارا مومن تھے اور وقت کے سچے دین کے پیرو بلکہ اس کے مبلغ ومناد تھے۔ وہ ابراہیم زردشت کے متبع، خدائے واحد کے پرستار اور آخرت کے قائل تھے اور ان کا دین انبیاء بنی اسرائیل ہی کی تعلیم کی ایک شاخ کی حیثیت رکھتا تھا جو دارا کے بعد بہت ہی جلد محرف ومسخ ہو کر رہ گیا۔

⑦ قرآن کہتا ہے کہ ذوالقرنین نے دوسری مہم مشرق (پورب) کی جانب سرکی اور وہ چلتے چلتے جب سورج نکلنے کی آخری حد پر پہنچا تو اس کو وہاں خانہ بدوش قبائل سے واسطہ پڑا:

﴿ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝٨٩ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ۝٩٠﴾ (سورۃ الکہف:۸۹،۹۰)

"اس کے بعد اس نے پھر تیاری کی اور پورب کی طرف نکلا یہاں تک کہ سورج نکلنے کی آخری حد تک پہنچ گیا اس نے دیکھا سورج ایک ایسے گروہ پر نکلتا ہے جس سے ہم نے کوئی آڑ نہیں رکھی ہے"۔

تطبیق: تاریخ کہتی ہے کہ خورس کی دوسری قابل ذکر مہم مشرق (پورب) کی جانب پیش آئی جب کہ مکران کے خانہ بدوش قبائل نے سرکشی کی "جو کہ اس کے دارالحکومت سے اقصائے مشرق میں پہاڑی علاقہ تک آباد تھے اور جن سے متعلق مہم کی تفصیلات گزشتہ صفحات میں بیان کی جا چکیں"۔

اس جگہ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ قرآن عزیز نے ذوالقرنین کی مغربی اور مشرقی قابل ذکر مہمات کے لیے "مغرب الشمس

اور "مطلع الشمس" کی تعبیر اختیار کی ہے اس سے بعض حضرات کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ ذوالقرنین ساری دنیا کا بلاشرکت غیرے حکمران بن گیا تھا اور اس نے دنیا کے دونوں جانب کے آخری ربع مسکون تک اپنے قبضہ میں کر لیا تھا حالانکہ یہ تاریخی واقعات کے لحاظ سے کسی بھی بادشاہ کے لیے ثابت نہیں ہے اور نہ قرآن نے اس مقصد کے لیے یہ تعبیر اختیار کی ہے بلکہ اس کی صاف اور واضح مراد یہ ہے کہ ذوالقرین اپنے مرکز حکومت کے لحاظ سے اقصاء مغرب اور اقصاء مشرق تک پہنچا ہے اور مغرب میں وہ اس حد تک پہنچ گیا تھا جہاں خشکی کا سلسلہ ختم ہو کر سمندر شروع ہو جاتا ہے اور مشرق میں اس حد تک پہنچا کہ وہاں خانہ بدوش قبائل کے سوا کوئی شہری آبادی نہیں تھی یہ مطلب اس درجہ واضح ہے کہ اگر بے دلیل غلط فہمی کی وجہ سے مسطورہ بالا قول منقول نہ ہوتا تو ہر شخص زبان کے محاورہ کے لحاظ سے بھی سمجھتا جو ہم نے سمجھا ہے۔ چنانچہ آج بھی ہم ہندوستان میں رہتے ہوئے اقضاء مشرق اور اقصاء مغرب سے دور دراز ملک مراد لیتے ہیں جو ہمارے مشرق و مغرب میں واقع ہیں اور ان الفاظ کو اس بات میں منحصر نہیں کر دیتے کہ مشرق و مغرب کے وہ کنارے مراد ہیں جن کے بعد معمورہ عالم کا کوئی حصہ بھی باقی نہ رہا ہو البتہ دلائل یا قرائن کے ذریعہ کبھی کبھی یہ معنی بھی مراد ہو جاتے ہیں۔

اقصائے مغرب و مشرق کی اس اصطلاح کو جو قرآن نے ذوالقرنین کے سلسلہ میں بیان کی ہے اگر اور گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین (خورس) سے متعلق توراۃ نے چونکہ یہی تعبیر کی تھی اس لیے بہت ممکن ہے کہ قرآن نے سائلین کو اس کا واقعہ سنانے کے وقت اسی اصطلاح کو اختیار کرنا پسند کیا ہو۔ دیکھئے: یسعیاہ نبی کے صحیفہ میں خورس کے حق میں بعینہ یہی تعبیر موجود ہے۔

خداوند اپنے خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے:

"میں نے اپنے بندے یعقوب اور اپنے برگزیدہ اسرائیل کے لیے تجھے تیرا نام صاف صاف لے کے بلایا۔ میں نے تجھے مہربانی سے پکارا گو کہ تو مجھے نہیں جانتا میں ہی خداوند ہوں اور کوئی نہیں میرے سواء کوئی خدا نہیں میں نے تیری کمر باندھی اگرچہ تو نے مجھے نہیں پہچانا تاکہ لوگ سورج کے نکلنے (مطلع الشمس) کی اطراف سے سورج غروب ہونے (مغرب الشمس) کی اطراف تک جائیں کہ میرے سوا کوئی نہیں میں ہی خداوند ہوں اور میرے سواء کوئی نہیں"۔ [1]

اور زکریا نبی علیہ السلام کے صحیفہ میں بنی اسرائیل کے متعلق کہا گیا ہے:

"رب الافواج فرماتا ہے کہ دیکھ میں اپنے لوگوں کو سورج کے نکلنے (مطلع الشمس) کے ملک سے سورج کے غروب ہونے (مغرب الشمس) کے ملک سے چھڑا لوں گا اور میں انہیں لاؤں گا اور وہ (بنی اسرائیل) یروشلم کے درمیان سکونت کریں گے"۔ [2]

ظاہر ہے کہ ان دونوں مقامات میں (مطلع الشمس) اور (مغرب الشمس) سے معمورہ عالم کے دونوں جانب کے آخری کنارے مراد نہیں ہیں بلکہ جن کا ذکر ہے ان کی حکومت یا مقام سکونت سے مشرقی اور مغربی جہات مراد ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ ذوالقرنین کو تیسری قابل ذکر مہم پیش آئی اور جب وہ ایسے مقام پر پہنچا جہاں دو پہاڑوں کی پھانکیں ایک درہ

[1] باب ۴۵ آیت ۱۰۶ [2] باب ۸ آیت ۸

بناتی تھیں تو ان کے درے اس کو ایک ایسی قوم سے واسطہ پڑا جو اس کی زبان اور بولی سے ناواقف تھی، انہوں نے ذوالقرنین پر (کسی طرح) یہ واضح کیا کہ ان پہاڑوں کے درمیان سے نکل کر ہم کو یاجوج و ماجوج ستاتے اور زمین میں فساد انگیزی کرتے ہیں۔ کیا آپ ہماری اتنی مدد کریں گے کہ ہم سے مالی ٹیکس لے کر ان دو پہاڑوں کے درمیان ایک سد بنا دیں تا کہ ان کے اور ہمارے درمیان وہ حد فاصل ہو جائے ور روک بن جائے۔ ذوالقرنین نے کہا میرے پاس خدا کا دیا سب کچھ ہے اس کی مجھے اجرت کی ضرورت نہیں۔ البتہ اس کے بنانے میں میری مدد کرو۔ ان لوگوں نے ذوالقرنین کے حکم سے لوہے کے ٹکڑے جمع کیے اور ان سے ذوالقرنین نے دونوں پہاڑوں کے درمیان "سد" بنادی اور پھر تانبا پگھلا کر اس آہنی دیوار کو مستحکم کر دیا۔

تطبیق: تاریخ کی ناقابل انکار شہادتوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ خورس کو جانب شمال میں ایک قابل ذکر مہم پیش آئی جس میں کاکیشیا (جبل توقا یا کوہ قاف) کے پہاڑی سلسلے میں ایسے دو پہاڑوں کے قریب ایک قوم ملی جن کی پھانکوں کے درمیان قدرتی درہ تھا اور پہاڑ کی دوسری جانب سے سیتھین قبائل کے جنگلی اور غیر مہذب لٹیرے دَل کے دَل آ کر اس قوم پر حملہ کرتے اور لوٹ مار کر کے درہ کے راستہ واپس ہو جایا کرتے تھے۔ خورس جب اس جگہ پہنچا تو اس آبادی کے لوگوں نے حملہ آور لٹیروں کی شکایت کرتے ہوئے اس سے پہاڑوں کے درمیان "سد" (دیوار) بنا دینے کی درخواست کی۔ خورس نے ان کی درخواست کو منظور کیا اور لوہے اور تانبے سے ملا کر ایک سد قائم کر دی جس کو وقت کے گاگ اور میگاگ غیر مہذب (سیتھین) قبائل اپنی درندگی اور خونخواری کے باوجود نہ توڑ پھوڑ سکے اور نہ اس کے اوپر سے اتر کر حملہ آور ہو سکے اور اس طرح پہاڑوں کے درّے کی آبادی ان کے حملوں سے محفوظ ہو گئی۔

اگرچہ غیر مہذب قبائل کے حملوں کے تحفظ کی خاطر دنیا کے مختلف حصوں میں ایسی متعدد چھوٹی اور بڑی سد (دیواریں) بنائی گئی ہیں لیکن ایسی سد جو لوہے اور تانبے سے مخلوط دو پہاڑوں کی پھانکوں کے درمیان بنائی گئی ہو۔ خورس کی بنائی ہوئی اس سد کے سواء جو کاکیشیا (جبل توقا) میں پائی جاتی ہے کوئی سد دنیا میں اب تک دریافت نہیں ہوئی اس لیے دلائل کی روشنی میں یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن نے ذوالقرنین کی سد کے متعلق جو تفصیلات دی ہیں اس کے پیش نظر خورس ہی ذوالقرنین ہے اور درہ داریال ہی کی سد قرآن کی تفصیلات کے مطابق ہے۔

یاجوج و ماجوج کون ہیں؟ اور سد کی حقیقت کیا ہے؟ چونکہ یہ دو زیر تحقیق مسائل ابھی بحث میں نہیں آئے اس لیے ذوالقرنین سے متعلق مطابقت قرآن کا یہ پہلو ہنوز تشنہ دلیل ہے لہٰذا سطور ذیل میں ان دونوں مسائل پر سیر حاصل بحث کی جاتی ہے تا کہ اصل حقیقت اپنے تمام پہلوؤں کے اعتبار سے پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔

یاجوج و ماجوج:

ذوالقرنین کی شخصیت کو زیر بحث لانے کے بعد دوسرا مسئلہ یاجوج و ماجوج کی تعیین کا ہے۔ مفسرین اور مؤرخین اسلام نے رطب و یابس روایات کا یہ تمام ذخیرہ نقل کر دیا ہے جو اس سلسلہ میں بیان کی گئی ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ چند روایات کے علاوہ اس سلسلہ کی تمام روایات خرافات و ہفوات کا مجموعہ ہیں جو عقلاً و نقلاً کسی طرح لائق اعتماد نہیں ہیں اور اسرائیلیات کا لایعنی طومار ہیں۔

Marfat.com

ان تمام روایات میں قدر مشترک یہ ہے کہ یاجوج و ماجوج ایک ایسے قبائل کا مجموعہ ہیں جو جسمانی اور معاشرتی اعتبار سے عجیب و غریب زندگی کے حامل ہیں مثلاً وہ بالشت ڈیڑھ بالشت یا زیادہ سے زیادہ ایک ذراع کا قد رکھتے ہیں اور بعض غیر معمولی طویل القامت ہیں اور ان کے دونوں کان اتنے بڑے ہیں کہ ایک اوڑھنے اور دوسرا بچھانے کے کام میں آتا ہے۔ چہرے چوڑے چکلے اور قد کے ساتھ غیر متناسب ہیں۔ ان کی غذا کے لیے قدرت سال بھر میں دو مرتبہ سمندر سے ایسی مچھلیاں نکال کر پھینک دیتی ہے جن کے سر اور دم کا فاصلہ اس قدر طویل ہوتا ہے کہ دس روز و شب اگر کوئی شخص اس پر چلتا رہے تب اس فاصلہ کو قطع کر سکتا ہے یا ایک ایسا سانپ ان کی خوراک ہے جو پہلے قرب و جوار کے تمام بری جانوروں کو ہضم کر جاتا ہے اور پھر قدرت اس کو سمندر میں پھینک دیتی ہے اور وہ وہاں میلوں تک بحری جانوروں کو چٹ کر لیتا ہے اور پھر ایک بادل آتا ہے اور فرشتہ اس عظیم الجثہ اژدھے کو اٹھا کر اس پر رکھ دیتا ہے اور بادل اس کو ان قبائل میں لے جا کر ڈال دیتا ہے اور یہ کہ یاجوج و ماجوج ایک ایسی برزخی مخلوق ہیں جو آدم علیہ السلام کے صلب سے تو ہیں مگر حوا علیہا السلام کے بطن سے نہیں ہیں۔

ان روایات کو نقل کرتے ہوئے یاقوت نے معجم البلدان میں یہ رائے ظاہر کی ہے:

واست اقطع بصحة ما اوردته لاختلاف الروايات فيه والله اعلم بصحته وعلى كل حال فليس فى صحته امر السد ريب۔ ✽

"اور میں نے جو کچھ روایات نقل کی ہیں ان کے اختلافات کے پیش نظر میں کسی طرح ان کی صحت کو باور نہیں کر سکتا اور اس معاملہ کی اصل حقیقت کا حال خدا ہی خوب جانتا ہے اور بہر حال اس میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ جہاں تک سد کا معاملہ ہے اس کے صحیح ہونے میں مطلق شک کی گنجائش نہیں ہے"۔

اور حافظ عماد الدین ابن کثیر البدایہ والنہایہ میں یہ ارشاد فرماتے ہیں:

ومن زعم ان ياجوج و ماجوج خُلِقُوا من نطفة ادم حين احتلم فاختلط بتراب فخلقوا من ذٰلك و انهم ليسوا من حواء فهو قول حكاه الشيخ ابو زكريا النووى فى شرح مسلم وغيره ضعفوه وهو جدير بذٰلك اذلا دليل عليه بل هو مخالف لما ذكرناه من ان جميع الناس اليوم من ذريته نوح بنص القراٰن هٰكذا من زعم انهم على اشكال مختلفة و اطوال متبائينة جدًا فمنهم من هو كالنخلة اسحق و منهم من هو غاية فى القصر و منهم من نفريش ذنًا من اذنيه يتغطى بالاخرة فكل هذا بلا دليل و رجم بالغيب برهان والصحيح انهم من بنى ادم وعلى اشكالهم و صفاتهم۔ ✽

"اور جس شخص نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ یاجوج اور ماجوج حضرت آدم علیہ السلام کے ایسے نطفہ سے پیدا ہوئے جو احتلام کی حالت میں نکلا اور مٹی میں رل مل گیا اور یہ مخلوق وجود میں آ گئی اور یہ حضرت حوا کے بطن سے نہیں ہیں تو یہ ایک قول ہے جس کو شیخ ابو زکریا نووی نے شرح مسلم میں حکایت کیا ہے اور ان کے علاوہ علماء نے اس کی تغلیظ کی ہے اور بلاشبہ یہ قول اس

✽ ج ۵ ص ۵۳ ✽ ج ۲ ص ۱۱۰

Marfat.com

قابل ہے کہ اس کو صحیح نہ سمجھا جائے اس لیے کہ یہ قطعاً بے دلیل بات ہے بلکہ اس قول کے بالکل خلاف ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں کہ نص قرآن سے یہ ثابت ہے کہ کائنات کی موجودہ انسانی مخلوق کا ہر فرد حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے ہے۔ اس طرح یہ قول بھی غلط اور بے دلیل ہے کہ یاجوج و ماجوج عجیب عجیب مختلف شکلوں اور متضاد قد و قامت کی مخلوق ہیں بعض ان میں سے اتنے لمبے ہیں کہ گویا کھجور کا بہت طویل درخت ہے اور بعض بہت ہی کوتاہ قامت اور بعض کے کان ایسے ہیں کہ ایک کو وہ بچھا لیتے ہیں اور دوسرے کو اوڑھتے ہیں۔ سو یہ تمام اقوال قطعاً بے دلیل اور محض اٹکل کے تیر ہیں اور صحیح بات یہ ہے کہ وہ عام بنی آدم کی طرح ہیں اور ان ہی کی طرح شکل و صورت اور جسمانی اوصاف رکھتے ہیں"۔

اور اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

و هذا قول غريب جدًا لا دليل عليه لا من عقل ولا من نقل ولا يجوز الاعتماد منها على ما يحكيه بعض اهل الكتاب لما عندهم من الاحاديث المفتعله۔ [1]

"اور یہ قول بلاشبہ ایک اچنبھا قول ہے کہ جس کے لیے نہ عقلی دلیل ہے اور نہ نقلی اور بعض اہل کتاب نے جو اس سلسلہ میں حکایات بیان کی ہیں اس مقام پر کسی طرح ان پر بھروسہ کرنا درست نہیں ہے اس لیے کہ ان کے یہاں تو اس قسم کے من گھڑت قصوں کی کوئی کمی نہیں ہے"۔

اور دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

وقد ذكر ابن جرير منهما عن وهب بن منبه اثرًا طويلًا عجيبًا فى سير ذالقرنين و نبائه السد و كيفيتها جرى له و فيه طول و غرابة و نكارة فى اشكالهم و صفاتهم و طولهم و قصر بعضهم و اذانهم۔ [2]

"اور ابن جریر نے اس مقام پر وہب بن منبہ سے ذوالقرنین کی سیاحت اور سد کی تعمیر اور اس سے متعلق کیفیات کے بارہ میں ایک طویل و عجیب اثر نقل کیا ہے دراصل وہ ایک طویل اور اچنبھی داستان ہے اور اس میں ان یاجوج و ماجوج کی شکلوں صورتوں ان کے طویل و کوتاہ ہونے اور ان کے کانوں کے متعلق اجنبی اور غیر معقول باتیں ہیں"۔

اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ اس عجیب و غریب قول کی تردید کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

و وقع فى فتاوىٰ الشيخ محى الدين ياجوج و ماجوج من اولاد ادم لا من حواء عند جماهير العلماء فيكون اخوانا لاب كذا قال و لم نر هذا عن احد من السلف الا عن كعب الاحبار و يردهٗ الحديث المرفوع انهم من ذريته نوح و نوح من ذريته حواء قطعا۔ [3]

"اور شیخ محی الدین (نووی) کے فتاویٰ میں مذکور ہے کہ یاجوج و ماجوج حضرت آدم علیہ السلام کی نسل سے تو ہیں مگر حضرت حوا علیہا السلام کے بطن سے نہیں ہیں جمہور علماء کا یہی خیال ہے اور اس طرح وہ حوا کے بطن سے بنی آدم کے علاتی بھائی ہیں مگر ہم نے کعب احبار کے علاوہ سلف میں سے کسی ایک شخص کو بھی اس کا قائل نہیں پایا اور اس قول کو وہ حدیث مرفوع قطعاً رد کرتی

[1] ج ۶ ص ۱۷۲ الکہف [2] ج ۶ ص ۱۷۲ [3] فتح الباری ج ۱۳ ص ۹۱

ہے جس میں یاجوج اور ماجوج کو نوح علیہ السلام کی نسل سے بتایا گیا ہے اور حضرت نوح علیہ السلام بلاشبہ حضرت حواء علیہا السلام کے بطن سے ہیں"۔

اور دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

وقد ارشاد النووی وغیرہ الی حکایۃ من زعم ان ادم فاحتلم فاختلط مینہ بتراب فتولد منہ ولد یاجوج و ماجوج من نسلہ وھو قول منکرا جدا لا اصل لہ الاعن بعض اھل الکتاب۔ ❶

"اور نووی اور بعض دوسروں نے ایک ایسے شخص کی بیان کردہ حکایت کی جانب اشارہ کیا ہے جو یہ کہتا ہے کہ آدم خواب میں تھے کہ ایک مرتبہ ان کو احتلام ہوگیا اور ان کے قطرات منی مٹی میں رل مل گئے بس اس سے یاجوج اور ماجوج کی نسل مخلوق (پیدا) ہوگئی تو یہ قول ہے جو سراسر بے ہودہ اور بے اصل ہے اور بعض اہل کتاب کی حکایت کے سوائے اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے"۔

اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اپنی تاریخ میں تحریر فرماتے ہیں:

ثم ھم من ذریۃ نوح لان اللہ تعالیٰ اخبرانہ استجاب بعبدہ نوح فی دعائہ علی اھل الارض بقولہ ﴿رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا﴾ وقال تعالیٰ ﴿فَأَنجَيْنَاهُ وَأَصْحَابَ السَّفِينَةِ﴾ وقال ﴿وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِينَ﴾۔ ❷

"پھر وہ (یاجوج وماجوج) نوح علیہ السلام کی ذریت میں سے ہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو یہ اطلاع دی ہے کہ اس نے اہل زمین کے متعلق نوح کی یہ دعا قبول کر لی (اے رب تو زمین پر کسی کافر کو باقی نہ چھوڑ) اور پھر حق تعالیٰ نے فرمایا (پس ہم نے اس کو اور کشتی والوں کو نجات دی) اور پھر فرمایا اور ہم نے اس کی ذریت ہی کو باقی رہنے والوں میں چھوڑا)"۔

وجہ استدلال یہ ہے کہ جب کہ قرآن عزیز ان آیات میں یہ تصریح کرتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی بددعا کے بعد بنی آدم میں سے حضرت نوح علیہ السلام اور اصحاب کشتی یا دوسرے الفاظ میں حضرت نوح علیہ السلام کی ذریت اور چند مسلمانوں کے علاوہ کسی کو زندہ اور باقی نہیں چھوڑا اور اب دنیاء انسانی حضرت نوح علیہ السلام ہی کی اولاد ہے تو پھر یہ کہنا کہ یاجوج اور ماجوج بنی آدم میں سے ایک مستقل مخلوق ہے اور ذریت نوح میں سے نہیں ہے قطعاً بے بنیاد اور بے اصل ہے اور اس کی تائید میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ حوا کے بطن سے نہ تھے اور اس لیے ذرّیت نوح میں سے بھی نہیں تھے تو طوفان نوح میں یہ مخلوق کہاں تھی اور نص قرآن کے خلاف یہ کیسے محفوظ رہی؟

اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے جو منقول ہے وہ بھی اس قول کو ردّ کرتا ہے:

ویاجوج وماجوج قبیلتان من ولد یافث بن نوح. (الحدیث) ❸

"اور عبدالرزاق نے کتاب التفسیر میں قتادہ سے نقل کیا ہے کہ یاجوج اور ماجوج دو قبیلے ہیں جو یافث بن نوح کی نسل سے ہیں"۔

❶ فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۵ ❷ البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۱۰ ❸ فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۸

Marfat.com

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ یاجوج و ماجوج حضرت نوح علیہ السلام کی نسل سے ہیں اور اگرچہ اس کی سند میں فی الجملہ ضعف ہے مگر اس کے مطاوع اور مؤید بعض دوسری صحیح روایات ہیں چنانچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بخاری کی اس مرفوع روایت کے متعلق جو حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے یہ خیال ظاہر کیا ہے:

والغرض منه هنا ذكر ياجوج وماجوج والاشارة الى كثرتهم و ان هذه الامة بالنسبة اليهم نحو عشر عشر العشر وانهم من ذريته ادم ردا على من قال خلاف ذلك. ❶

"امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی اس روایت بیان کرنے کی غرض یہ ہے کہ یاجوج اور ماجوج کا حال بیان کیا جائے اور ان کی کثرت تعداد کی جانب اشارہ ہے اور یہ کہ امت محمدیہ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے مقابلہ میں وہ ہزاروں گناہ زیادہ ہیں اور یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کی طرح نسل آدم میں شامل ہیں اس سے ان لوگوں کا رد کرنا مقصود ہے جو اس کے خلاف ان کو عام انسانی مخلوق سے جدا مانتے ہیں"۔

یہ چند نقول ہیں ان محققین کے ذخیرہ اقوال سے جو حدیث تفسیر اور علم تاریخ کی ماہر ہستیاں ہیں ان اقوال سے یہ بات قطعاً واضح اور صاف ہو جاتی ہے کہ یاجوج و ماجوج عام دنیاء انسانی کی طرح ربع مسکوں کے باشندے اور ان کی نسل بنی آدم کی عام نسل کی طرح ہے اور وہ کوئی عجوبہ روزگار مخلوق نہیں ہیں اور نہ برزخی مخلوق اور اس قسم کی جو روایات پائی جاتی ہیں ان کا اسلامی روایات سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے بلکہ اسرائیلیات کے بے سروپا ذخیرہ کا جزو ہیں اور ان تمام روایات کا سلسلہ کعب احبار پر جا کر ختم ہوتا ہے جو یہودی النسل ہونے کی وجہ سے ان قصوں کے بہت بڑے عالم تھے اور اسلام لانے کے بعد یا تو تفریح کے طور پر ان کو سنایا کرتے تھے اور یا اس لیے کہ اس رطب و یابس میں سے جو دور از کار باتیں ہوں وہ رد کر دی جائیں اور جن سے قرآن اور احادیث نبوی کی تائید ہوتی ہو ان کو ایک تاریخی حیثیت میں لے لیا جائے مگر نقل کرنے والوں نے اس حقیقت پر نظر نہ رکھتے ہوئے اس پورے طومار کو جو غرق مئے ناب اولی کا مصداق تھا اسی طرح نقل کرنا شروع کر دیا جس طرح حدیثی روایات کو نقل کیا جاتا تھا اور اگر سلف صالحین اور متاخرین میں وہ بے نظیر ہستیاں نہ پیدا ہوتیں جنہوں نے روایات و احادیث کے تمام ذخیرے کو نقد و تبصرہ کی کسوٹی پر پرکھ کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیا تو نہ معلوم آج اسلام کو کس قدر بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔

پس اس وضاحت کے بعد اب یہ دیکھنا چاہیے کہ یاجوج و ماجوج کا مصداق کون سے قبائل ہیں اور ان کی قبائل کا کائنات انسانی کے ساتھ کیا تعلق رہا ہے؟ یہ مسئلہ درحقیقت ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہے اور اقوام عالم کی بہت سی قوموں پر اثر انداز ہے نیز سورۂ انبیاء کی آیت ﴿حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ﴾ سے اس کا گہرا تعلق ہے۔

بہرحال اس سے پہلے کہ ہم اس مسئلہ پر کچھ لکھیں مقدمہ اور تمہید کے طور پر یہ معلوم ہونا چاہیے کہ انسانی آبادی کے تمام گوشوں میں جو چہل پہل اور رونق نظر آتی ہے اور ربع مسکوں جس طرح بنی آدم سے آباد ہے اور تمدن و حضارت کی نیرنگیوں سے گلزار بنا ہوا ہے، ان کی ابتداء بدوی اور صحرائی قبائل سے ہوئی ہے اور یہی قبائل صدیوں گزر جانے اور اپنے اصل مرکز سے جدا ہو جانے کے

---

❶ فتح الباری ج ٦ ص ٢٩٨

Marfat.com

بعد تمدن وحضارت کے بانی بنتے اور متمدن قومیں شمار ہوتے رہے ہیں۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ دنیا کی قوموں کے سب سے بڑے سرچشمے کہ جہاں سے سیلاب کی طرح اُمنڈ اُمنڈ کر انسانی آبادی پھیلی اور پھلی پھولی ہے اور مختلف ملکوں اور زمین کے مختلف خطوں میں جا کر بسی ہے صرف دو ہی ایک حجاز اور دوسرا چینی ترکستان یا کاکیشیا کا وہ علاقہ جو شمال مشرق میں واقع ہے اور سطح زمین کا مرتفع اور بلند حصہ شمار ہوتا ہے۔

حجاز ان تمام اقوال وقبائل کا سرچشمہ ہے جو سامی النسل یا سمیٹک (Semetic) کہلاتی ہیں، یہ قبائل ہزاروں سال سے اس بے آب وگیاہ سرزمین سے طوفان کی طرح اٹھتے اور بگولہ کی طرح دنیا کے مختلف حصوں پر پھیلتے رہے ہیں اور بدوی اور صحرائی زندگی کے گہوارہ سے نکل کر زبردست تمدن اور عظیم الشان حضارت وشہرت کے بانی قرار پائے۔

عاد اولیٰ اور عاد ثانیہ (ثمود) اسی سرزمین سے اٹھے اور اپنی عظیم الشان صناعی اور پرسطوت حکومت وصولت کے ذریعہ صدیوں تک تمدن وحضارت کے علم بردار رہے، جدیس طسم اور اسی قسم کے دوسرے قبائل بھی جو آج امم بائدہ وہلاک شدہ کہلاتے ہیں اسی خاک کے پروردہ تھے ازوار یمن (شاہان حمیر) اور عمالقہ مصر وشام وعراق کے جلال وجبروت اور وسعت سلطنت کا یہ عالم تھا کہ ایک عرصہ تک فارس اور روم بلکہ ہندوستان کے بعض حصے بھی ان کے احکام کے محکوم اور ان کی حکومت کے باج گزار رہ چکے ہیں۔ غرض سامی النسل اقوام وقبائل خواہ بدوی اور صحرائی ہوں یا حضرمی اور متمدن شہری سب اسی خاک حجاز (عرب) کے ذرّات تھے جو اپنی وسعت کے بعد آپس میں اس قدر اجنبی ہو گئے تھے کہ بدوی اور شہری بلکہ فراعنہ مصر (عمالقہ) اور اذواء یمن (سلاطین حمیری) اور عرب مستعربہ اسماعیلی عربوں کے درمیان مطابقت پیدا کرنی بھی مشکل ہو گئی تھی اور اگر نسلی امتیازات وخصوصیات اور زبان کی بنیادی یک رنگی ان کے باہم پیوند نہ لگاتی تو تاریخ کے کسی گوشہ کی بھی یہ ہمت نہ تھی کہ وہ ابھر کر ان کی اخوت باہمی کا درس دے سکتا۔

اسی طرح قبائل واقوام عام کا دوسرا سمندر اور بحر ناپیدا کنار چینی ترکستان اور منگولیا کا وہ علاقہ رہا ہے جو شمال مشرق میں واقع ہے اور سطح زمین کا بلند اور مرتفع حصہ ہے۔

اس مقام سے بھی ہزاروں سال کے عرصہ میں سینکڑوں قبائل اٹھے اور دنیا کے مختلف گوشوں تک پہنچے اور وہاں جا کر بس گئے۔ یہیں سے انسانوں کی موجیں اٹھیں اور وسط ایشیاء میں جا گریں۔ یہیں سے یورپ پہنچیں اور یہیں سے ہندوستان اور شمال مغرب تک پھیلتی چلی گئیں۔ ہندوستان میں بس جانے والوں نے اپنا تعارف آرین کے ساتھ کرایا۔ وسط ایشیاء میں بسنے ولوں نے "ایریانہ" کہلا کر اپنے علاقہ کا نام ایران مشہور کیا۔ یورپ میں ہن گاتھ ڈانڈیال وغیرہ ان ہی قبائل کے نام پڑے اور بحر اسود سے دریا ڈینوب تک بسنے والے سیتھین کہلائے اور یورپ وایشیاء کے ایک بڑے حصہ پر چھا جانے والے رشین کے نام سے مشہور ہوئے۔

یہ قبائل جب اپنے مرکز سے چلے تھے تو صحرائی، وحشی اور بدوی تھے لیکن اپنے مرکز سے ہٹ کر جب دوسرے مقامات پر پہنچے اور حضارت وتمدن سے آشنا ہوئے یا ضرورت نے آشنا کرایا تو نئے نئے ناموں سے پکارے گئے۔ حتیٰ کہ اپنے مرکز کی ابتدائی حالت سے اس قدر بعد ہو گیا کہ مرکز میں بسنے والے وحشی قبائل اور ان کے درمیان کوئی یکسانیت باقی نہ رہی بلکہ ایک ہی اصل کی دو شاخیں ایک دوسرے کی حریف بن گئیں اور شہری اقوام کے لیے ان کے ہم نسل وحشی قبائل مستقل خطرہ ثابت ہونے لگے، جو آئے دن شہریوں پر تاخت وتاراج کرتے اور لوٹ مار کر کے پھر اپنے مرکز کی جانب واپس ہو جاتے تھے۔

Marfat.com

بہر حال تاریخ کے اوراق اس کے شاہد ہیں کہ عہد تاریخی کے قبل سے پانچویں صدی مسیح تک اس علاقہ سے جو آج کل منگولیا تا تار کہلاتا ہے اسی قسم کے انسانی طوفان اٹھتے رہے ہیں اور ان سے قریب اور ہمسایہ قوم "چینی" ان کے بڑے دو قبائل کو "موگ" اور یوچی کہتے رہے ہیں پس یہی "موگ" ہے جو تقریباً چھ سو برس قبل مسیح یونان میں میگ اور میگاگ بنا اور عربی میں ماجوج ہوا اور غالباً یہی "یواچی" یونانی میں یوگاگ اور عبرانی اور عربی میں جوج اور یاجوج کہلایا لیکن جب یہ قبائل دنیا کے مختلف حصوں میں جا کر آباد ہوئے اور بہت سے قبائل پہلے کی طرح اپنے مرکز ہی میں وحشی اور صحرائی بنے رہے تو اس اختلاف تمدن و معیشت نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ ان قبائل کے وحشی اور صحرائی جنگجو تو اسی طرح یاجوج (گاگ-Gag) اور ماجوج (میگاگ-Megag) کے نام سے موسوم رہے مگر متمدن اور شہری قبائل نے مقامی خصوصیات و امتیازات کے ساتھ ساتھ اپنے ناموں کو بھی بھلا دیا اور نئے ناموں سے شہرت پائی اور پھر یہ تقسیم اس طرح قائم ہوگئی کہ تاریخ کے عہد میں بھی اس کو باقی رکھا گیا اور وسط ایشیاء کے ایرانی ایشیائی اور یورپین روسی اور دیگر یورپین قومیں اور ہندوستان کے آرین اصل کے اعتبار سے منگولین (یعنی موگ) ماجوج اور یواگ (یاجوج) نسل ہونے کے باوجود تاریخ میں ان ناموں سے یاد نہیں کیے جاتے اور یاجوج و ماجوج کا نام صرف ان ہی قبائل کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے جو اپنی گزشتہ حالت وحشت و بربریت اور غیر متمدن زندگی میں اپنے مرکز کے اندر موجود ہیں اور مختلف صدیوں میں قتل و غارت اور لوٹ مار کرنے کے لیے اپنی ہم نسل متمدن اقوام پر حملے کرتے رہے ہیں اور ان ہی کے وحشیانہ حملوں کی حفاظت کے لیے اور مشرقی تاخت و تاراج سے بچنے کے لیے مختلف اقوام نے مختلف دیواریں اور سد قائم کیں اور ان ہی میں سے ایک وہ سد ہے جو ذوالقرنین نے ایک قوم کے کہنے پر دو پہاڑوں کے درمیان لوہے اور تانبے سے ملا کر تیار کی تاکہ وہ یاجوج اور ماجوج کے مشرقی حملوں سے محفوظ ہو جائے۔

یاجوج و ماجوج کا ذکر توراۃ میں بھی ہے، چنانچہ حزقیل علیہ السلام کے صحیفہ میں یوں کہا گیا ہے:

"اور خداوند کا کلام مجھ کو پہنچا اور اس نے کہا کہ اے آدم زاد تو جوج کے مقابل جو ماجوج کی سرزمین کا ہے اور روش اور مسک اور توبال کا سردار ہے اپنا منہ کر اور اس کے برخلاف نبوت کر اور کہہ کہ خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے کہ دیکھ اے جوج روش اور مسک اور توبال کے سردار ہیں تو تیرا مخالف ہوں اور میں تجھے سزا دوں گا اور تیرے جبڑوں میں بنسیاں دیکھ میں تیرا خالف ہوں اے جوج روش اور مسک اور توبال کے سردار اور میں تجھے پلٹ دوں گا۔ ❶

"اور میں یاجوج پر اور ان پر جو جزیروں میں بے پروائی سے سکونت کرتے ہیں ایک آگ بھیجوں گا۔ ❷ اور اس دن یوں ہوگا کہ میں وہاں اسرائیل میں یاجوج کو ایک گورستان دوں گا یعنی راہ گزروں کی وادی جو سمندر کے پورب ہے اور اس کے راہ گزروں کی راہ بند ہوگی اور وہ وہاں جوج کو اور اس کی جماعت کو گاڑ دیں گے اور اسے ہامون جوج کی وادی نام رکھیں گے"۔ ❸

ان حوالوں میں یاجوج ماجوج روش مسک اور توبال کا ذکر ہے اور ان کو خدا کا مخالف بتایا گیا ہے۔ اور مظلوموں کو یہ بشارت

---

❶ حزقیل باب ۳۸ آیت ۱-۳ ❷ حزقیل باب ۳۹ آیت ۱ ❸ حزقیل باب ۳۹ آیت ۶، ایضاً باب ۳۹ آیت ۱۱

ی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو پھرا دے گا اور ان کے جبڑوں میں بنسیاں مار دے گا تا کہ وہ پلٹ جائیں اور یہ کہ قیامت کے قریب ان شی اور ظالم قبائل کو تباہ و برباد کر دیا جائے گا اور ان کی موت سے عرصہ تک راہ گزروں کے لیے راہیں بند ہو جائیں گی۔

ان ناموں کی تفصیل میں توراۃ کے مفسرین یہ کہتے ہیں کہ جوج سے مراد گاگ (Gog) ہے اور ماجوج سے میگاگ (Megog) اور روش سے روس (Russia) اور مسک سے مراد ماسکو (Moscow) اور توبال سے بحر اسود کا بالائی علاقہ مراد ہے س کے معنی یہ ہیں کہ توراۃ کی شہادت بھی اس سے اتفاق کرتی ہے کہ لفظ یاجوج اور ماجوج ان ہی قبائل کے لیے مخصوص ہو گیا تھا جو ولیا اور کاکیشیا سے لے کر دور تک مشرق میں پھیلتے چلے گئے تھے اور یہ کہ حزقیل علیہ السلام کے زمانہ تک روس (Russia) کا علاقہ ذیب و تمدن اور حضارت سے عاری اور وحشی قبائل کا موطن اور مسکن تھا اور قتل و غارت گری کا پیشہ کرتا تھا اور ظلم و ستم ان کا روزمرہ کا مشغلہ تھا، لہٰذا حضرت حزقیل علیہ السلام کی پیشین گوئیوں میں یہ بشارت دی گئی کہ وہ وقت قریب ہے جب کہ ان قبائل کے تاخت و راج کا یہ سلسلہ ایک عرصہ تک کے لیے بند ہو جائے گا، اس پیشین گوئی میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جوج شمال کی جانب سے آئے گا کہ لوٹ مار کرے اور یہ کہ ماجوج پر اور جزیروں میں بسنے والوں پر سخت تباہی آئے گی اور یہ کہ اسرائیلی بھی ماجوج کے مقابلہ میں لیں گے۔

اب اگر تاریخ کا مطالعہ کیجیے تو آپ پر یہ بخوبی واضح ہو جائے گا کہ تقریباً ایک ہزار قبل مسیح سے بحر خزر اور بحر اسود کا علاقہ ں اور خونخوار کا مرکز بنا ہوا ہے جو مختلف ناموں کے ساتھ موسوم ہوتے رہے ہیں بالآخر ان میں سے ایک زبردست قبیلہ نمودار ہوتا ہے تاریخ میں "سیتھین" کے نام سے مشہور ہے یہ وسط ایشیا سے بحر اسود کے شمالی کناروں تک پھیلا ہوا ہے اور اطراف میں مسلسل حملے تا رہتا اور متمدن اقوام پر تباہی لاتا رہتا ہے یہ زمانہ بابل و نینوی کے عروج اور آشوریوں کے تمدن کے آغاز کا زمانہ تھا پھر تقریباً ڑھے چھ سو قبل مسیح میں ان کے ایک بڑے زبردست گروہ نے اپنی بلندیوں سے اتر کر ایران کا تمام مغربی حصہ تہ و بالا کر ڈالا۔

اب ۵۲۹ قبل مسیح میں سائرس (کیخسرو) کا ظہور ہوتا ہے اور یہی وہ زمانہ ہے جب کہ اس کے ہاتھوں بابل کی تباہی بنی ئیل کی آزادی اور میڈیا و فارس کی دو سلطنتوں کی یکجا طاقت کا نظارہ سامنے آتا ہے اور ٹھیک حزقیل علیہ السلام کی پیشین گوئی کے سی امتیازات اس کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوتے ہیں اور سیتھین قبائل کے مغربی حملوں سے حفاظت کے لیے اس کے ہاتھوں وہ سد ہوتی ہے جس کا ذکر بار بار آ رہا ہے۔

بہرحال ان تمام تاریخی مصادر سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ حزقیل علیہ السلام کی پیشین گوئی کے مطابق وہ یاجوج و جوج جن کی حفاظت کے لیے سائرس (ذوالقرنین) نے سد تیار کی، یہی سیتھین قبائل تھے جو ابھی تک اپنی وحشیانہ خصائص و خصائل ی طرح حامل تھے جس طرح ان کے پیشرو اپنے مرکز میں رہتے ہوئے ان امتیازات کے ساتھ یاجوج و ماجوج کہلاتے رہے اور یہ دراصل ایک مزید ثبوت ہے اس دعویٰ کے لیے کہ ذوالقرنین "سائرس" (کیخسرو) ہی تھے۔

یاجوج و ماجوج کے متعلق جس قدر بحث اس وقت تک کی جا چکی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ کوئی عجیب الخلقت مخلوق نہیں ہ دنیا انسانی کی عام آبادی کی طرح وہ بھی حضرت نوح علیہ السلام کی ذریت میں سے ہیں اور یہ کہ یاجوج و ماجوج منگولیا (تاتار) وحشی قبائل کو کہا جاتا رہا ہے جو یورپ اور روس کی اقوام کے منبع و منشاء ہیں اور چونکہ ان کی ہمسایہ قوم ان قبائل میں سے دو بڑے

Marfat.com

قبیلوں کو موگ اور یوچی کہتی تھی اس لیے یونانیوں نے ان کی تقلید میں ان کو میگ یا میگاگ اور یوگاگ کہا اور عبرانی اور عربی میں تصرف کر کے ان کو یاجوج و ماجوج سے یاد کیا گیا۔

اب ان تاریخی حقائق کی تائید میں عرب مؤرخین اور محقق مفسرین و محدثین کی تحقیق بھی قابل مطالعہ ہے تاکہ گزشتہ سطور میں جو کچھ لکھا گیا اس کی تصویب ہو سکے۔

حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اپنی تاریخ میں تصریح فرماتے ہیں:

و یافث ابوالترک فیاجوج و ماجوج طائفة من الترک وھم مغلول المغلول وھم اشد بأسا و اکثر فسادًا من ھؤلاء۔ [1]

"اور یافث تاتاریوں کا نسلی باپ ہے پس یاجوج و ماجوج تاتاریوں ہی کی ایک شاخ ہیں اور یہ منگولیا کے قبائل کے منگولی ہیں اور دوسرے تاتاریوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ طاقتور اور بہت زیادہ فسادی اور لوٹ مار مچانے والے ہیں"۔

اور اپنی تفسیر میں بھی اس کی تائید فرماتے ہیں یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ قبائل یافث بن نوح کی نسل سے ہیں اور ان کا مولد وطن منگولیا کا وہی علاقہ ہے جہاں سے قوموں کے طوفان اٹھے اور اٹھ کر یورپ وغیرہ میں جا کر بسے ہیں۔

اور ابن اثیر نے کامل میں یہ تحریر فرمایا ہے:

وقد اختلف الاقوال فیھم والصحیح انھم نوع من الترک لھم شوکتہ و فیھم شر وھم کثیرون و کانوا یفسدون فیما یجاورھم من الارض و یخربون ماقدروا علیہ من البلاد یوذون من یقرب منھم۔ [2]

"یاجوج و ماجوج کے متعلق مختلف اقوال ہیں اور صحیح قول یہ ہے کہ وہ تاتاریوں ہی میں سے ایک قسم کے تاتاری ہیں اور بہت طاقتور ہیں اور ان میں شر و فساد کا مادہ بہت ہے اور وہ بہت بڑی تعداد رکھتے ہیں اور قرب و جوار کی زمین میں فساد پھیلاتے اور جس بستی پر قابو پا جاتے اس کو برباد کر ڈالتے تھے اور پڑوسیوں کو ایذاء پہنچاتے رہتے تھے"۔

اور سید محمود آلوسی روح المعانی میں لکھتے ہیں:

ان یاجوج و ماجوج قبیلتان من ولد یافث بن نوح علیہ السلام و بہ جزم وھب بن منبہ وغیرہ و اعتمدہ کثیر من المتاخرین۔ [3]

"یاجوج و ماجوج یافث بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے دو قبیلے ہیں اور وہب بن منبہ اسی پر یقین رکھتے ہیں اور متاخرین میں سے اکثر کی یہی رائے ہے"۔

اور آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں:

و فی کلام بعضھم ان الترک منھم لما اخرجہ ابن جریر و ابن مردویہ من طریق السدی من اثر قوی الترک سریة من سرایا یاجوج و ماجوج۔ [4]

---

[1] البدایہ والنھایہ ج ۲ ص ۱۱۰ [2] ج ۱ ص ۶۸ [3] ج ۱۶ ص ۳۶ [4] ج ۱۶ ص ۳۶

"اور بعض کہتے ہیں کہ ترک (تاتاری) ان ہی میں سے ہیں جیسا کہ ابن جریر اور ابن مردویہ نے سدی سے ایک قوی اثر نقل کیا ہے کہ ترک (تاتاری) یاجوج وماجوج کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہیں"۔

وفی روایۃ عن عبد الرزاق عن قتادۃ ان یاجوج وماجوج ثنتان وعشرون قبیلۃ۔ ①

"اور عبدالرزاق نے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ یاجوج اور ماجوج بائیس قبائل کا مجموعہ ہیں"۔

اس کے علاوہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے فتح الباری میں یاجوج وماجوج سے متعلق جو کچھ نقل فرمایا ہے وہ بھی نقول بالا کی ہی تائید کرتا ہے، ② اور علامہ طنطاوی اپنی تفسیر جواہر القرآن میں لکھتے ہیں:

"یاجوج وماجوج اپنی اصل کے اعتبار سے یافث بن نوح کی اولاد میں سے ہیں اور یہ نام لفظ "اجیج النار" سے ماخوذ ہیں جس کے معنی آگ کے شعلہ اور شرارہ کے ہیں گویا ان کی شدت اور کثرت کی طرف اشارہ ہے اور بعض اہل تحقیق نے ان کی اصل پر بحث کرتے ہوئے یہ کہا کہ مغلوں (منگولیوں) اور تاتاریوں کا سلسلہ نسب ایک شخص "ترک" نامی پر پہنچتا ہے اور یہی شخص ہے جس کو ابوالفداء ماجوج کہتا ہے۔

پس اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یاجوج وماجوج سے مراد منگولین اور تاتاری قبائل ہی ہیں ان قبائل کا سلسلہ ایشیاء کے شمالی کنارہ سے شروع ہو کر تبت اور چین سے ہوتا ہوا محیط منجمد شمالی تک چلا گیا ہے اور غربی جانب ترکستان کے علاقہ تک پھیلا ہوا ہے۔ فالبتۃ الخلفاء اور ابن مسکویہ کی تہذیب الاخلاق اور رسائل (اخوان الصفا) ان سب نے یہی کہا ہے کہ یہی قبائل یاجوج وماجوج کہلاتے ہیں"۔ ③

اور ابن خلدون نے اپنی تاریخ کے مقدمہ میں یاجوج وماجوج کے مستقر اور اس کے جغرافیائی حیثیت کو اس طرح واضح کیا ہے۔

ساتویں اقلیم کے نویں حصہ میں مغرب کی جانب ترکوں کے وہ قبائل آباد ہیں جن کو قفچاق اور چرکس کہا جاتا ہے اور مشرق کی ب یاجوج کی آبادیاں اور ان دونوں کے درمیان کوہ قاف حد فاصل ہے جس کا ذکر گزشتہ سطور میں ہو چکا ہے کہ وہ بحر محیط سے ع ہوتا ہے جو چوتھی اقلیم کے مشرق میں واقع ہے اور اس کے ساتھ ساتھ شمال کی جانب اقلیم کے آخر تک چلا گیا ہے اور پھر بحر محیط (Atlanti) سے جدا ہو کر شمال مغرب میں ہوتا ہوا یعنی مغرب کی جانب جھکتا ہوا پانچویں اقلیم کے نویں حصہ میں داخل ہو جاتا ہے ا سے وہ پھر اپنی پہلی سمت کو مڑ جاتا ہے حتیٰ کہ ساتویں اقلیم کے نویں حصہ میں داخل ہو جاتا ہے اور یہاں پہنچ کر جنوب سے شمال ب کو ہوتا ہوا گیا ہے اور اسی سلسلہ کوہ کے درمیان "سد سکندری" واقع ہے اور ساتویں اقلیم کے نویں حصہ کے وسط ہی میں وہ "سد ری" ہے جس کا ابھی ہم ذکر کر آئے ہیں اور جس کی اطلاع قرآن نے بھی دی ہے۔

اور عبداللہ بن خرداذبہ نے اپنی جغرافیہ کی کتاب میں واثق باللہ (خلیفہ عباسی) کا وہ خواب نقل کیا ہے جس میں اس نے یہ تھا کہ "سد" کھل گئی ہے چنانچہ وہ گھبرا کر اٹھا اور دریافت حال کے لیے "سلام ترجمان" کو روانہ کیا اور اس نے واپس آ کر اسی کے حالات (اوصاف) بیان کیے۔

---

① ۱۶ ص ۳۰۶ ② ج ۱۳ ص ۹۰ ③ ج ۹ ص ۱۱۹

Marfat.com

اور ساتویں اقلیم کے دسویں حصہ میں ماجوج کی بستیاں ہیں جو مسلسل آخر تک چلی گئی ہیں یہ حصہ بحر محیط کے ساحل پر واقع ہے جو اس کے مشرقی شمالی حصہ کو اس طرح گھیرے ہوئے ہے شمال میں تو طول میں چلا گیا ہے اور بعض مشرقی حصہ میں عرض میں گیا ہے۔ [1]

ابن خلدون نے یاجوج و ماجوج اور سد کے متعلق اسی طرح اقلیم رابع، اقلیم خامس اور اقلیم سابع کی بحث میں بھی ضمناً بیان کیا ہے بلکہ اقلیم رابع میں یہ بھی تصریح ہے۔

وعلی قطعه من البحر المحيط هنالك هو جبل یاجوج ماجوج وهذه الامم كلها من شعوب الترك. [2]

"اور اقلیم رابع کے جزء عاشر کا ایک حصہ بحر محیط کے اوپر واقع ہے اور یہ جبل یاجوج و ماجوج ہے اور یاجوج و ماجوج تمام قبائل ترک ہیں"۔

گزشتہ بحث میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ منگولیا کا کیشیا کے یہ قبائل جب تک اپنے مرکز میں رہتے ہیں یاجوج و ماجوج کہلاتے ہیں اور جب وہاں سے نکل کر کہیں بس جاتے اور صدیوں بعد متمدن ہو جاتے ہیں تو پھر وہ اس نام کو بھلا دیتے ہیں اور دوسرے بھی ان کو اس وحشیانہ امتیاز سے یاد نہیں کرتے کیونکہ پھر یہ اپنے مرکز سے اس قدر اجنبی ہو جاتے ہیں کہ مرکز کے وحشی قبائل ان کو بھی اپنا حریف بنا لیتے اور ان پر غارگری کرتے رہتے ہیں اور یہ بھی اپنے ہی ہم نسل مرکزی وحشی قبائل سے اسی طرح خوف کھانے لگتے ہیں جس طرح دوسرے قبائل چنانچہ اس مسئلہ کی تائید حافظ عماد الدین ابن کثیر کی اس عبارت سے بھی ہوتی ہے، تحریر فرماتے ہیں:

﴿حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ بَیْنَ السَّدَّیْنِ﴾ وهما جبلان متنا وحان بينهما ثغرة يخرج منها ياجوج و ماجوج على بلاد الترك فيعثبون فيها فسادًا ويهلكون الحرث والنسل. [3]

"سدین سے مراد وہ دو پہاڑ ہیں جو ایک دوسرے کے مقابل ہیں اور ان کے درمیان شگاف ہے اسی شگاف سے یاجوج و ماجوج ترکوں کے شہروں پر آ پڑتے اور ان میں فساد مچا دیتے اور کھیتوں اور نسلوں کو ہلاک اور برباد کر ڈالتے تھے"۔

یعنی یاجوج و ماجوج بھی اگرچہ منگولی (تاتاری) ہیں مگر پہاڑوں کے درے جو تاتاری قبائل اپنے مرکز سے ہٹ کر آباد ہو گئے تھے اور متمدن بن گئے تھے ہم نسل ہونے کے باوجود دونوں میں اس قدرت تفاوت ہو گیا کہ ایک دوسرے سے ناآشنا بلکہ حریف بن گئے اور ایک ظالم کہلائے اور دوسرے مظلوم، اور ان ہی قبائل نے ذوالقرنین سے سد بنانے کی فرمائش کی۔

اور بعض عرب مؤرخین نے تو "ترک" کی وجہ تسمیہ ہی یہ بیان کر دی کہ یہ وہ قبائل ہیں جو یاجوج و ماجوج کے ہم نسل ہونے کے باوجود سد سے ورے آباد تھے اور اس لیے جب ذوالقرنین نے سد قائم کی اور ان کو اس میں شامل نہیں کیا تو اس چھوڑ دیے جانے کی وجہ سے وہ "ترک" کہلائے۔

یہ وجہ تسمیہ اگرچہ ایک لطیفہ ہے تاہم اس امر کا ثبوت ضرور بہم پہنچاتی ہے کہ متمدن قبائل تمدن و حضارت کے بعد اپنے ہم نسل مرکزی قبائل سے اجنبی ہو جاتے تھے اور وہ یاجوج و ماجوج نہیں کہلاتے تھے اور لفظ یاجوج و ماجوج صرف ان ہی قبائل کے لیے مخصوص ہو گئے ہیں جو اپنے مرکز میں سابق کی طرح ہنوز وحشت بربریت اور درندگی کے ساتھ وابستہ ہیں۔

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۹۷ بحث الاقلیم السادس یہ واضح رہے کہ جبل قوقایا کوہ قاف اور جبال کا کیشیا ایک ہے۔
[2] ایضاً ص ۱۷ [3] تفسیر ج ۲ ص ۱۰۳ جدید ایڈیشن [4] البدایہ والنھایہ ج ۲

Marfat.com

سد:

یاجوج و ماجوج کے اس تعین کے بعد دوسرا مسئلہ "سد" کا سامنے آتا ہے یعنی وہ "سد" کس جگہ واقع ہے جو ذوالقرنین نے یاجوج و ماجوج کے فتنہ و فساد کو روکنے کے لیے بنائی اور جس کا ذکر قرآن عزیز میں بھی کیا گیا ہے۔

تعین سد سے پہلے یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ یاجوج و ماجوج کی تاخت و تاراج اور شر و فساد کا دائرہ اس قدر وسیع تھا کہ ایک طرف کاکیشیا کے نیچے بسنے والے ان کے ظلم و ستم سے نالاں تھے تو دوسری جانب تبت اور چین کے باشندے بھی ان کی شمالی دستبرد سے محفوظ نہ تھے۔ اس لیے صرف ایک ہی غرض کے لیے یعنی قبائل یاجوج و ماجوج کے شر و فساد اور لوٹ مار سے بچنے کے لیے مختلف تاریخی زمانوں میں متعدد "سد" تعمیر کی گئیں۔ ان میں سے ایک "سد" وہ ہے جو دیوار چین کے نام سے مشہور ہے یہ دیوار تقریباً ایک ہزار میل طویل ہے اس دیوار کو منگولی اتکووہ کہتے ہیں اور ترکی میں اس کا نام بوقورقہ ہے۔

دوسری سد وسط ایشیا میں بخارا اور ترز کے قریب واقع ہے اور اس کے محل وقوع کا نام دربند ہے یہ سد مشہور مغل بادشاہ تیمور لنگ کے زمانہ میں موجود تھی اور شاہ روم کے ندیم خاص سیلا برجر جرمنی نے بھی اس کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے اور اندلس کے بادشاہ کسٹیل کے قاصد کلاچو نے بھی اپنے سفرنامہ میں کیا ہے۔ یہ ۱۴۰۳ء میں اپنے بادشاہ کا سفیر ہو کر جب تیمور صاحب قراں کی خدمت میں حاضر ہوا ہے تو اس جگہ سے گزرا ہے وہ لکھتا ہے کہ باب الحدید کی "سد" موصل کے اس راستے پر ہے جو سمرقند اور ہندوستان کے درمیان واقع ہے۔ [1]

تیسری سد روسی علاقہ داغستان میں واقع ہے یہ بھی دربند اور باب الابواب کے نام سے مشہور ہے اور بعض مؤرخین اس کو الباب بھی لکھ دیتے ہیں یاقوت حموی نے معجم البلدان میں ادریسی نے جغرافیہ میں اور بستانی نے دائرۃ المعارف میں اس کے حالات کو بہت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اور ان سب کا خلاصہ یہ ہے:

داغستان میں دربند ایک روسی شہر ہے یہ شہر بحر خزر (کاسپین) غربی کے کنارہ واقع ہے اس کا عرض البلد ۴۳.۳ شمالاً اور طول البلد ۴۸.۱۵ شرقاً ہے اور اس کو دربند انوشیرواں بھی کہتے ہیں اور باب الابواب کے نام سے بہت مشہور ہے اور اس کے اطراف و جوانب کو قدیم زمانہ سے چہار دیوار گھیرے ہوئے ہیں جن کو قدیم مؤرخین ابواب البانیہ کہتے آئے ہیں اور اب یہ خستہ حالت میں ہے اور اس کو باب الحدید اس لیے کہتے ہیں کہ اس کی سد کی دیواروں میں لوہے کے بڑے بڑے پھاٹک لگے ہوئے تھے۔ [2]

اور جب اسی باب الابواب سے مغرب کی جانب کاکیشیا کے اندرونی حصوں میں بڑھتے ہیں تو ایک درہ ملتا ہے جو درہ داریال کے نام سے مشہور ہے اور یہ کاکیشیا کے بہت بلند حصوں سے گزرا ہے یہاں ایک چوتھی سد ہے جو قفقاز یا قوقایا جبل قاف کی سد کہلاتی ہے اور یہ سد دو پہاڑوں کے درمیان بنائی گئی ہے۔ بستانی اس کے متعلق لکھتا ہے:

اور اسی کے قریب ایک اور "سد" ہے جو غربی جانب بڑھتی چلی گئی ہے غالباً اس کو اہل فارس نے شمالی بربروں سے حفاظت کی خاطر بنایا ہوگا کیونکہ اس کے بانی کا صحیح حال نہیں معلوم ہو سکا۔ بعض نے اس کی نسبت سکندر کی جانب کر دی اور بعض نے کسریٰ و

---

[1] جواہر القرآن ج ۹ ص ۱۹۸ [2] دائرۃ المعارف ج ۷ ص ۶۵۱ و معجم البلدان ج ۸ ص ۹

نوشیرواں کی جانب اور یاقوت کہتا ہے کہ یہ تانبا پگھلا کر اس سے تیار کی گئی ہے۔ ❶

اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں بھی "دربند" کے مقالہ میں اس آہنی دیوار کا حال قریب قریب اس کے بیان کیا گیا ہے۔ ❷

چونکہ یہ سب دیواریں شمال ہی میں بنائی گئی ہیں اور ایک ہی ضرورت کے لیے بنائی گئی ہیں اس لیے ذوالقرنین کی بنائی ہوئی سد کے تعین میں سخت اشکال پیدا ہوگیا ہے اور اسی لیے ہم مؤرخین میں اس مقام پر سخت اختلاف پاتے ہیں اور اس اختلاف نے ایک دلچسپ صورت اختیار کر لی ہے اس لیے کہ دربند کے نام سے دو مقامات کا ذکر آتا ہے اور دونوں مقامات میں سد یا دیوار بھی موجود ہے اور غرض بنا بھی ایک ہی نظر آتی ہے۔

تو اب دیوار چین کو چھوڑ کر باقی تین دیواروں کے متعلق قابل بحث یہ بات ہے کہ ذوالقرنین کی سد ان تینوں میں سے کون سی ہے اور اس سلسلہ میں جس دربند کا ذکر آتا ہے وہ کون سا ہے۔

مؤرخین عرب میں سے مسعودی، قزوینی، اصطخری، حموی سب اسی دربند کا ذکر کر رہے ہیں جو بحر خزر پر واقع ہے وہ کہتے ہیں کہ اس شہر میں داخل ہونے سے پہلے بھی دیوار ملتی ہے اور شہر کے بعد بھی دیوار ہے اگرچہ ایک دیوار چھوٹی ہے اور دوسری بڑی مگر شہر سد یا دیواروں سے گھرا ہوا ہے اور ایران کے لیے یہ مقام خاص اہمیت رکھتا ہے اور دیوار سے پرے بسنے والے قبائل کی زد سے بچاتا ہے البتہ ابوالفداء اور بعض اس سے ناقل مؤرخین کو یہ غلطی ہوگئی کہ انہوں نے بخارا اور ترمذ کے قریب دربند کو اور بحر خزر کی قریب دربند کو ایک سمجھ کر ایک کے حالات کو دوسرے کے ساتھ خلط کر دیا ہے۔؟

مگر ادریسی نے دونوں کی جغرافیائی حلات کو مفصل اور جدا جدا بیان کر کے اس خلط کو دور کیا اور اصل حقیقت کو بخوبی واضح کر دیا ہے۔

اس کے باوجود حال کے بعض اہل قلم کو اس غلطی پر اصرار ہے کہ سد ذوالقرنین یا سد سکندری کے سلسلہ میں جس سد کا ذکر آتا ہے اس سے بحر خزر یا بحر قزوین کا دربند مراد نہیں ہے بلکہ بخارا اور ترمذ کے قریب جو دربند حصار کے علاقہ میں واقع ہے وہ مراد ہے۔ ❸

بہر حال یہ مؤرخین بحر خزر اور کاکیشیا کے علاقہ دربند (باب الابواب) کی دیوار کے متعلق یہ واضح کرتے ہیں کہ قرآن عزیز میں جس سد کا ذکر ہے وہ یہی ہے مگر یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ کوئی اس کو سد سکندری کہتا ہے اور کوئی سد نوشیروانی غرض دربند کے متعلق جب بھی مؤرخین کو خلط ہو جاتا ہے تو کوئی نہ کوئی محقق اس کو دور کر کے یہ ضرور واضح کر دیتا ہے کہ سد ذوالقرنین کا تعلق اس دربند سے ہے جو کاکیشیا میں بحر خزر کے کنارہ واقع ہے اس دربند سے نہیں ہے جو بخارا اور ترمذ کے قریب واقع ہے۔

چنانچہ وہب بن منبہ فرماتے ہیں:

قرآن عزیز میں جو ﴿بَیْنَ السَّدَّیْنِ﴾ آیا ہے تو سدین سے مراد جبلین ہے یعنی دو پہاڑ کہ جن کے درمیان سد قائم کی گئی ہے پہاڑ کی یہ دونوں چوٹیاں بہت بلند ہیں اور ان کے پیچھے بھی آبادیاں ہیں اور ان کے سامنے بھی اور یہ دونوں منگولین سرزمین کے اس آخری کنارہ پر واقع ہیں جو آرمینہ اور آذربیجان کے متصل ہے۔ ❹

---

❶ دائرۃ المعارف ج ۷ ص ۶۵۲ ❷ نیا ایڈیشن ج ۷ لفظ دربند ص ۱۰۶

❸ صدق ۱۸ اگست ۴۱ء مضمون سد سکندری ❹ تفسیر البحر المحیط ابوحیان اندلسی ج ۶ ص ۱۶۳

Marfat.com

اور علامہ ہروی فرماتے ہیں:

"یہ دو پہاڑ کہ جن کے درمیان ذوالقرنین کی سد قائم ہے تاتاری قبائل کے ورے واقع ہیں (یعنی سد ان کو اس جانب آنے سے روکنے کے لیے بنائی گئی ہے)"۔

اور امام رازی تحریر فرماتے ہیں:

"زیادہ صاف بات یہ ہے کہ ان دو پہاڑوں کا جاء وقوع جانب شمال میں ہے اور (تعین میں) بعض نے کہا ہے کہ وہ دو پہاڑ آرمینہ اور آذر بیجان کے درمیان واقع ہیں اور بعض نے کہا کہ تاتاری قبائل کی سرزمین کا جو آخری کنارہ ہے وہاں واقع ہیں"۔

اور طبری نے اپنی تاریخ میں بیان کیا کہ

"شاہ آذر بیجان نے جب کہ وہ اس کو فتح کر چکا تھا ایک شخص کو خزر (بحر فردین) کے اطراف سے بلایا کہ وہ صاحب آذر بیجان کو بالمشافہ سد کے حالات سنائے۔ اس نے بتایا کہ وہ پہاڑوں کے درمیان ایک بلند سد ہے اور اس کے ایک جانب بہت بڑی خندق ہے جو نہایت گہری ہے"۔

اور ابن خرداد نے کتاب المسالک والممالک میں بیان کیا ہے کہ

"واثق باللہ نے ایک خواب دیکھا تھا کہ گویا اس نے اس سد کو کھول ڈالا ہے اس خواب کی بنا پر اس نے اپنے بعض عمال کو اس کی تحقیق کے لیے بھیجا تاکہ وہ اس کا معائنہ کریں سو یہ لوگ باب الابواب سے آگے بڑھے اور ٹھیک سد کے مقام پر پہنچ گئے۔ انہوں نے واثق باللہ سے آکر بیان کیا کہ یہ سد لوہے کے ٹکڑوں سے بنائی گئی ہے جس میں پگھلا ہوا تانبا شامل کیا گیا ہے اور اس کا آہنی دروازہ مقفل ہے پھر جب انسان وہاں سے واپس ہوتا ہے تو راہنما اس کو ایسے چٹیل میدانوں میں پہنچاتے ہیں جو سمرقند کے محاذات میں واقع ہیں۔ ابوریحان بیرونی کہتے ہیں کہ اس تعارف کا مقتضی یہ ہوا کہ وہ زمین کے ربع شمال مغربی میں واقع ہے"۔ [1]

اور سید محمود آلوسی روح المعانی میں لکھتے ہیں:

"یہ دو پہاڑ ارض متعین جہت شمالی میں واقع ہیں اور کتاب حزقیل علیہ السلام میں حرج کے متعلق جو یہ لکھا ہے کہ وہ شمال کی جانب سے آخری دنوں میں آئیں گے اس سے بھی یہی مراد ہے اور کاتب چلپی کا میلان بھی اسی جانب ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے آرمینہ اور آذر بیجان کے پہاڑ مراد ہیں اور قاضی بیضاوی کی رائے بھی یہی ہے اور بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی روایت ہے اگرچہ اس قول کا تعاقب کیا گیا ہے اور اس کی صحت میں کلام ہے ان اقوال سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک اس کا مصداق باب الابواب (دربند بحر قزوین) ہے حالانکہ ان ہی مؤرخین کے نزدیک اس کا بانی کسریٰ نوشیرواں ہے"۔ [2]

---

[1] تفسیر کبیر ج ۵ ص ۵۱۳ وطبری ص ۲۵۶ [2] خلاصہ روح المعانی ج ۱۶ ص ۳۵

Marfat.com

اور ابن ہشام "ترک" کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

"ان میں سے ایک جماعت مسلمان ہوگئی تھی اس لیے جب ذوالقرنین نے آرمینیہ میں (یعنی ان پہاڑوں میں جو آرمینیہ سے آگے دور تک چلے گئے ہیں) سد بنانی شروع کی تو ان کو سد کے اس جانب چھوڑ دیا پس اس ترک کرنے پر وہ "ترک" کہلائے، ترکھم فسموا الترک کذلک"۔ [1]

اور حضرت استاد علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری (نور اللہ مرقدہٗ) عقیدۃ الاسلام میں تحریر فرماتے ہیں:

"قرآن عزیز نے ذوالقرنین کے تیسرے سفر کی جہت کا ذکر نہیں کیا اور قرینہ یہ بتاتا ہے کہ وہ شمال کی جانب تھا اور اسی جانب اس کی سد ہے جو قفقاز کے پہاڑوں کے درمیان واقع ہے اور جس غرض کے لیے ذوالقرنین نے سد بنائی تھی اسی غرض کے لیے اور بادشاہوں نے بھی سد تعمیر کی ہیں۔ مثلاً چینیوں نے دیوارِ چین بنائی جس کو منگولین انکورہ اور ترک بوقورقہ کہتے ہیں۔ صاحب ناسخ التواریخ نے اس کا مفصل ذکر کیا ہے اور اسی طرح بعض عجمی بادشاہوں نے دربند (باب الابواب) کی سد کی تعمیر کی اور اسی طرح اور سد بھی ہیں جو شمال ہی کی جانب ہیں"۔ [2]

اور انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں کاکیشیا کے علاقہ یا بحر قزوین کے کنارہ واقع دربند (باب الابواب) کے متعلق جو مقالہ ہے اس میں تحریر ہے۔

یہاں جو دربند ہے یزدگرد اوّل نے دوبارہ صاف کرایا اور اس کی مرمت کرائی اس دیوار کو سکندر اعظم کی جانب منسوب کیا جاتا ہے۔ [3]

اور دوسری جگہ بحر خزر کے متعلق تحریر ہے:

"رسالہ اخوان الصفا میں جو بحر یاجوج و ماجوج کا ذکر آیا ہے تو اس سے مراد بحر کاسپین یعنی بحر خزر ہے"۔

پس عرب مؤرخین، محدثین، مفسرین اور محققین تاریخ کے ان حوالجات سے چند امور ثابت ہوتے ہیں:

① کوئی ایک مؤرخ بھی یہ صراحت نہیں کرتا کہ دربند ضلع حصار کی سد سد سکندری ہے۔

② ابوالفداء اور بعض مؤرخین کو دربند کے متعلق یہ خلط ہوگیا ہے کہ وہ بحر قزوین والے دربند کا ذکر شروع کرتے ہیں اور پھر ترمذ و بخارا والے دربند (حصار) کے ساتھ اس کو ملا دیتے ہیں۔ اور دونوں کے درمیان امتیاز کرنے سے قاصر رہے ہیں۔

③ باقی تمام محققین مؤرخین ہوں یا محدثین و مفسرین، امتیاز کے ساتھ یہ تصریح کر رہے ہیں کہ جو سد سکندری کے نام سے مشہور ہے وہ وہی ہے جو بحر قزوین کے قریب دربند (باب الابواب) میں واقع ہے۔

چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا اور انسائیکلو پیڈیا آف اسلام اور دائرۃ المعارف بستانی میں بھی (جو کہ جدید و قدیم تحقیق کا ذخیرہ ہیں) یہی ہے حتیٰ کہ برٹانیکا جلد ۱۳ ص ۵۲۶ طبع یازدہم میں جو دربند ضلع حصار کا مختصر حال بیان کیا ہے اس میں بھی اس سد کو سد سکندری نہیں بتایا بلکہ اس کے برعکس بحر قزوین والے دربند کی سد کے متعلق یہ کہا ہے کہ اس کی نسبت سکندر کی جانب کی جاتی ہے اور اس لیے سد سکندری کے نام سے مشہور ہے۔

④ وہب بن منبہ ابوحیان اندلسی صاحب ناسخ التواریخ (جو ایران کا درباری مؤرخ ہے) بستانی اور حضرت علامہ سید محمد انور شاہ

---

[1] کتاب التیجان [2] ملخص عقیدۃ الاسلام فی حیوۃ عیسٰی علیہ السلام ص ۱۹۸ [3] ص ۱۱۴۲ بحث یاجوج و ماجوج

Marfat.com

صاحب رحمہ اللہ نے دربند "بحر قزوین" کے متعلق یہ توجہ دلائی ہے کہ سد ذوالقرنین اس دربند بحر قزوین میں نہیں ہے بلکہ اس سے بھی اوپر قفقاز کے آخری کنارہ پر پہاڑوں کے درمیان واقع ہے، چنانچہ مولانا ابوالکلام نے اپنی تفسیر میں اس کا درہ داریال کے نام سے ذکر کیا ہے۔

اب ان چاروں باتوں سے تھوڑی دیر کے لیے قطع نظر کر لیجئے اور اس مسئلہ میں بھی سابق کی طرح قرآن عزیز ہی کو حکم بنایئے تاکہ معاملہ واضح سے واضح تر ہو جائے۔

سد ذوالقرنین کے متعلق قرآن عزیز نے دو باتیں صاف صاف بیان کی ہیں، ایک یہ کہ وہ سد دو پہاڑوں کے درمیان تعمیر کی گئی ہے اور اس نے پہاڑوں کے درمیان اس "درہ" کو بند کر دیا ہے جہاں سے ہو کر یاجوج و ماجوج اس جانب کے بسنے والوں کو تنگ کرتے تھے:

﴿حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ بَیْنَ السَّدَّیْنِ ❶ (ای بَینَ الجبلین) وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا یَكَادُوْنَ یَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ۝ قَالُوْا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ اِنَّ یَاْجُوْجَ وَ مَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ﴾ (سورۃ الکھف: ۹۳-۹۴)

"یہاں تک کہ جب ذوالقرنین دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا تو ان دونوں کے اس طرف ایک ایسی قوم کو پایا جن کی بات وہ پوری طرح نہیں سمجھتا تھا وہ کہنے لگے اے ذوالقرنین بلاشبہ یاجوج و ماجوج اس سرزمین میں فساد مچاتے ہیں"۔

دوسرے یہ کہ وہ سد چونے یا اینٹ گارے سے نہیں بنائی گئی ہے بلکہ لوہے کے ٹکڑوں سے تیار کی گئی ہے جس میں تانبا پگھلا ہوا شامل کیا گیا تھا:

﴿اَجْعَلْ بَیْنَكُمْ وَ بَیْنَهُمْ رَدْمًا ۝ اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا سَاوٰى بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ قَالَ انْفُخُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِیْۤ اُفْرِغْ عَلَیْهِ قِطْرًا ۝﴾ (سورۃ الکھف: ۹۵-۹۶)

"میں تمہارے اور ان کے (یاجوج و ماجوج کے) درمیان ایک موٹی دیوار قائم کر دوں گا تم میرے پاس لوہے کے ٹکڑے لا کر دو یہاں تک کہ پہاڑ کی دونوں پھانکوں (چوٹیوں) کے درمیان جب دیوار کو برابر کر دیا تو اس نے کہا کہ دھونکو یہاں تک کہ جب دھونک کر اس کو آگ کر دیا کہا لاؤ میرے پاس پگھلا ہوا تانبہ کہ اس پر ڈالوں"۔

قرآن عزیز کی بتائی ہوئی ان دونوں صفات کو سامنے رکھ کر اب ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ بغیر کسی تاویل کے ان کا مصداق کونسی سد ہو سکتی ہے اور کس سد پر یہ صفات ٹھیک صادق آتی ہیں۔

سب سے پہلے ہم اس سد پر بحث کرنا چاہتے ہیں جو دربند (حصار) میں واقع ہے۔ اس سد کے حالات ساتویں صدی کے

---

❶ ﴿السَّدَّیْنِ﴾ کی تفسیر میں امام بخاری رحمہ اللہ نے ترجمۃ الباب میں روایت کا ایک ٹکڑا نقل کیا ہے اس میں ہے ایک شخص نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے سد کو دیکھا ہی نہیں ہے جیسے یمنی چادر مثل البحر والمحبر۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو نے ضرور اس کو دیکھا ہے (قال قد رایتہ) یہ روایت بھی اس پر دلالت کرتی ہے کہ اس شخص نے لوہے تانبے سے مخلوط بنی ہوئی دیوار کو دیکھا کیونکہ "حبرۃ" کے معنی اس زردی کے آتے ہیں جو دانتوں پر جمی ہوئی نظر آتی ہے اور یمنی چادریں سیاہ اور زرد یا سیاہ اور سرخ مخلوط دھاری دار ہوتی تھیں اس روایت کے موصول ہونے نہ ہونے میں کلام ہے جو فتح الباری میں قابل مراجعت ہے۔

Marfat.com

ایک چینی سیاح نے ہی نہیں بیان کیے بلکہ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں شاہ رخ کے جرمنی مصاحب سیلد برجر اور ہسپانوی سفیر کلاؤچوں نے بھی پندرھویں صدی عیسوی کے اوائل میں اس کا مشاہدہ کیا ہے اور انہوں نے بھی یہ کہا ہے کہ یہاں آہنی پھاٹک لگے ہوئے ہیں مگر مؤرخین یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ یہ سد (دیوار) پتھر اور اینٹ کی بنی ہوئی ہے اور آہنی دروازوں کے علاوہ دیوار کسی جگہ بھی لوہے اور تانبے سے بنی ہوئی نہیں ہے اور لوہے کے پھاٹکوں کی وجہ سے اس کو بھی اسی طرح درہ آہنی کہتے ہیں جس طرح دربند (بحر قزوین) کو درہ آہنی کہا جاتا ہے۔

نیز یہ دیوار جس طرح پہاڑوں کے درمیان میں چلی گئی ہے اسی طرح اس کا ایک حصہ سطح زمین پر بھی بنایا گیا ہے، ایسا نہیں ہے کہ وہ صرف دو پہاڑوں کی پھانکوں (چوٹیوں) کے درمیان ہی میں قائم کی گئی ہو۔ پس اِس دیوار کو سد ذوالقرنین کہنا قرآنی تصریحات کے قطعاً خلاف ہے اور غالباً اِسی وجہ سے کسی ایک مؤرخ نے بھی (جو کہ دربند) حصار اور دربند (بحر قزوین) کے درمیان امتیاز کر سکے ہیں۔ اس دیوار (سد) کو سد ذوالقرنین یا سد سکندری نہیں کہا۔

مگر تعجب ہے محترم مدیر صاحب "صدق" سے کہ انہوں نے قرآنی تصریحات کو سامنے رکھے بغیر تمام مؤرخین کے خلاف یہ دعویٰ کر دیا کہ دربند (حصار) کی دیوار (سد) ہی "سد سکندری" یعنی سد ذوالقرنین ہے۔ شاید وہ اس جدت کے لیے اس لیے مجبور ہوئے ہیں کہ ایک تو ان کا مسلک یہ ہے کہ سکندر مقدونی ہی ذوالقرنین ہے اور دوسرے اس جانب میں سکندر کی فتوحات کی آخری حد اسی علاقہ تک ہے جیسا کہ ۱۸ اگست ۱۹۴۱ء کے "صدق" کی اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے:

"سکندر اعظم اپنی تیسری فوج کشی میں اسی علاقہ تک گیا تھا"۔

ظاہر ہے کہ ان دو باتوں کی صراحت کے بعد وہ مجبور ہیں کہ دربند (حصار) کی سد ہی سد ذوالقرنین تسلیم کریں، مگر اس سے زیادہ یہ ظاہر ہے کہ اس سد پر نہ قرآن عزیز کی بیان کردہ صفات ہی کا اطلاق ہوتا ہے اور نہ کوئی مؤرخ ہی اس کو سد سکندری یا سد ذوالقرنین کہتا ہے اور بالفرض اگر اس کو سکندر کی تعمیر تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی وہ سد ذوالقرنین کسی طرح نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ قرآن صفات کے مطابق نہیں ہے۔ اس کے بعد دوسرا نمبر دربند (بحر قزوین) کی دیوار (سد) کو زیر بحث لانے کا ہے، اس کے متعلق یہ تو معلوم ہو چکا کہ اس کو عرب باب الابواب الباب کہتے ہیں اور اہل فارس دربند اور درہ آہنی نام رکھتے ہیں اور اِس میں شک نہیں کہ بڑی کثرت سے مؤرخین اس دربند کی دیوار (سد) کو "سد سکندری" کہتے چلے آئے ہیں مگر محققین یہ بھی کہتے چلے آئے ہیں کہ بانی کا صحیح حال معلوم نہیں ہے، البتہ اس کو سد سکندری بھی کہہ دیتے ہیں اور کاکیشین وال (کاکیشیا کی دیوار) اور دیوار نوشیرواں بھی۔

لیکن ہم اس بحث کو مؤخر کرتے ہوئے کہ اس کے متعلق یہ اضطراب بیانی کیوں ہے اس سد کو سد ذوالقرنین جب ہی مان سکتے ہیں کہ یہ قرآن عزیز کے بیان کردہ ہر دو صفات کے مطابق پوری اترے مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہے اس لیے کہ اس دیوار کے عرض وطول اور اس کے حجم کی تفصیلات دیتے ہوئے تمام مؤرخین یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس دیوار کا بھی بہت بڑا حصہ سطح زمین پر تعمیر کیا گیا ہے اور آگے بڑھ کر پہاڑ پر بھی بنایا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی مانتے ہیں کہ اگرچہ یہ دیوار بعض جگہ دوہری بھی ہے اور اس میں متعدد لوہے کے پھاٹک بھی ہیں جن میں سے بعض بعض پہاڑوں کے درمیان قائم ہیں اور پہاڑوں پر اس کے استحکامات بھی بہت ہیں تاہم یہ دیوار لوہے کے ٹکڑوں اور تانبے سے نہیں بنائی گئی بلکہ عام دیواروں کی طرح پتھر اور چونہ ہی سے بنائی گئی ہے۔ پس اس کا بانی کوئی

Marfat.com

شخص بھی ہو اس دیوار کو سدِ ذوالقرنین کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ اب اس کو "سدِ سکندری" کہنا سو ہمیں اس سے انکار کی کوئی ضرورت نہ ہوتی اگر تاریخی حقائق اس دعوے کا ساتھ دیتے مگر حیرت اور تعجب کی بات یہ ہے کہ یہی مؤرخین جب سکندر مقدونی کا ذکر کرتے اور اس کی وسعت فتوحات کو زیر بحث لاتے ہیں تو ان میں سے کوئی ایک بھی یہ نہیں کہتا کہ سکندر اعظم کاکیشیا تک پہنچا ہے اور بقول مولانا ابوالکلام:

"لیکن جب سکندر کے تمام فوجی اعمال خود اس کے عہد میں اور خود اس کے ساتھیوں نے قلم بند کر دیے ہیں اور ان میں کہیں بھی کاکیشیا کے استحکامات کی تعمیر کا اشارہ نہیں ملتا تو پھر کیوں کر ممکن ہے کہ اس طرح کی توجیہات قابل اطمینان تسلیم کر لی جائیں"۔ [1]

یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ سکندر اعظم کی جانب یہ انتساب صحیح ہے۔

امریکہ کے ایک مشہور جغرافیہ دان کریم (Cram) نے اپنے جغرافیہ کریمس یونیورسل ایٹلس (CramesUniversal Atlas) میں سکندر اعظم کی سلطنت ۳۸۱-۳۳۱ قیام کا جو مکمل نقشہ تیار کیا ہے اس میں بھی کاکیشیا کا علاقہ اس کی فتوحات سے سینکڑوں میل دور نظر آتا ہے۔

بہرحال اکثر مؤرخین تو اس کا بانی نوشیرواں کو بتاتے ہیں اور جوزیفس سکندر کو اس کا بانی قرار دیتے ہیں مگر بیان کردہ تاریخی حقائق کے پیش نظر نہ نوشیرواں کی نسبت صحیح ہے اور نہ سکندر اعظم کی اور اگر ان دونوں میں سے کسی کی نسبت کو بالفرض صحیح بھی مان لیا جائے تب بھی اس کو سدِ ذوالقرنین کہنا حقائق قرآنی سے آنکھیں بند کر لینا ہوگا پس دربند (حصار ہو یا دربند بحر خزر) دونوں کی سد سدِ ذوالقرنین نہیں ہے۔

تیسری قابل ذکر وہ سد ہے جو دربند (قزوین) یا کاسپین وال کے مغرب جانب میں ایک درہ کو بند کرتی ہے یہ درہ بند سے مغرب کی جانب کاکیشیا کے اندرونی حصوں میں آگے بڑھتے ہوئے ملتا ہے اور درہ داریال کے نام سے مشہور ہے اور قفقاز اور تفلس کے درمیان واقع ہے، یہ درہ کاکیشیا کے بہت بلند حصوں سے ہو کر گزرا ہے اور قدرتی طور پر پہاڑ کی دو بلند چوٹیوں سے گھرا ہوا ہے اس کو فارسی میں درہ آہنی اور ترکی میں دامر کپو کہتے ہیں۔

اس درہ کے متعلق گزشتہ صفحات میں امام رازی رحمہ اللہ کی تفسیر سے اس تشریح کے بعد یہ دو پہاڑ جن کے درمیان سد واقع ہے قفقاز میں ہے ہم ابن خرداد کی کتاب المسالک کا یہ حوالہ نقل کر چکے ہیں کہ واثق باللہ نے جب اپنے خواب کی تعبیر کے پیش نظر سدِ ذوالقرنین کی تحقیق کے لیے تحقیقاتی وفد (ریسرچ کمیشن) مقرر کیا اور اس نے باب الابواب (دربند) سے آگے چل کر جب اس کا مشاہدہ کیا ہے تو یہ تصریح کی ہے کہ یہ دیوار تمام کی تمام لوہے اور پگھلے ہوئے تانبے سے بنائی گئی ہے، اصل الفاظ یہ ہیں:

ان الواثق بالله رأى فى المنام كانه فتح هٰذا الروم فبعث بعض الخدم اليه ليعانيوه فخرجوا من باب الابواب حتى وصلوا اليه و شاهدوه فوصفوا انه بناء من لبن من حديد مشدود بالنحاس المذاب و عليه

---

[1] ترجمان القرآن ج ۲ ص ۴۴۸

Marfat.com

باب مقفل۔ ❶

پس کہ آج کے مشاہدے سے بھی یہ ثابت ہے کہ داریال کا یہ درہ پہاڑوں کی دو چوٹیوں کے درمیان گھرا ہوا ہے اور تاریخی حقائق بھی اس کو تسلیم کرتے اور واضح کرتے ہیں۔ نیز واثق باللہ کے کمیشن نے اپنا یہ مشاہدہ بیان کیا ہے کہ یہ دیوار لوہے اور پگھلے ہوئے تانبے سے تیار کی گئی ہے بلاشبہ یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ یہی دیوار وہ "سد ذوالقرنین" ہے جس کا ذکر قرآن عزیز نے سورۂ کہف میں کیا ہے کیونکہ قرآن عزیز کے بتائے ہوئے دونوں وصف صرف اسی دیوار پر منطبق ہوتے ہیں اسی لیے وہب ابوحیان، ابن خرداد، علامہ انورشاہ اور مولانا آزاد جیسے محققین کی یہی رائے ہے کہ سد ذوالقرنین قفقاز کے اسی درہ کے سد کا نام ہے۔

ان تصریحات کے بعد اب ہم کو کہنے دیجئے کہ درہ داریال کی یہ سد سائرس (گورش یا کےخسرو) کی تعمیر کردہ ہے اور جیسا کہ ہم یاجوج و ماجوج کی بحث میں بیان کر چکے ہیں" یہ ان وحشی قبائل کے لیے اس نے بنائی تھی جو کاکیشیا کے انتہائی علاقوں سے آ کر اور اس درہ میں سے گزر کر قفقاز کے پہاڑوں کے اس طرف بسنے والوں پر لوٹ مار مچاتے تھے اور یہ وہی سیتھین قبائل تھے جو سائرس کے زمانہ میں حملہ آور ہو رہے تھے اور اس وقت کے یاجوج و ماجوج کا مصداق یہی قبائل تھے اور ان ہی کی روک تھام کی ضرورت سے سائرس نے ایک قوم کی شکایت پر یہ "سد" تیار کی اور ارمنی نوشتوں میں اس سد کا جو قدیم نام "پھاک کورائی" (کور کا درہ) لکھا چلا آتا ہے اس کور سے مراد غالباً گورش ہے جو سائرس ہی کا فارسی نام ہے۔

اور اس کے قریب دربند (بحر خزر) کی دیوار اس کے بعد اسی غرض سے کسی دوسرے بادشاہ نے بنوائی ہے اور نوشیرواں نے اپنے زمانہ میں اس کو دوبارہ صاف اور درست کرایا ہے جیسا کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے حوالہ سے ہم ابھی نقل کر چکے ہیں۔

اور ان تینوں دیواروں (سد) میں سے سکندر کی بنائی ہوئی کوئی ایک سد بھی نہیں ہے، اس لیے کہ سکندر کی فتوحات کی تاریخ جو کہ سامنے ہے اس سے کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سکندر کو اس غرض کے لیے کسی سد قائم کرنے کی ضرورت پیش آئی ہو کیونکہ اس کی

---

❶ دربند نامہ کاظم بک ص ۲۱۔ یہاں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ بعض معاصر بزرگ زیر بحث سد کے متعلق یہ شک ظاہر کرتے ہیں کہ یاقوت نے واثق باللہ کے تحقیقاتی وفد کی تفصیلات دیتے ہوئے یہ بیان کیا ہے کہ اس سفر کی آمد و رفت میں چھ ماہ صرف ہوئے پس اگر ذوالقرنین کی سد درہ داریال کی سد ہوتی تو بغداد سے کاکیشین (کوہ قاف) کی راہ ایسی طویل نہیں ہے کہ یہ وفد اتنی مدت میں واپس آتا۔
مگر یہ شک صرف ایک قیاسی مغالطہ ہے اس لیے کہ اوّل تو یاقوت حموی نے اس واقعہ کی تفصیلات کو خود ہی اہمیت نہیں دی اور ایک داستان کی طرح اس کا ذکر کر دیا ہے جیسا کہ سلام ترجمان سے منقول اس داستان کو نقل کرنے کے بعد کہتا ہے:
قد کتبت من خبر السد ما وجدته فی الکتاب ولست اقطع لصحة ما اوردته لاختلاف الروایات فیه. واللہ اعلم بصحته.
"میں نے سد کے حالات میں ان واقعات کو لکھ دیا ہے جن کو میں نے کتابوں میں لکھا پایا اور میں نے یہ جو کچھ بھی نقل کیا ہے میں ہرگز اس پر یقین نہیں کرتا کیونکہ اس سلسلہ میں مختلف روایات ہیں جن کی صحت پر یقین نہیں کیا جا سکتا"۔ (معجم البلدان ج ۵)
دوسرے مدت سفر کی اس تصریح پر جب کچھ کہا جا سکتا تھا کہ اس کے ساتھ یہ تفصیلات بھی بیان کی جاتیں کہ ذرائع رسل و رسائل کیا تھے درمیانی مقامات میں آمد و رفت کے موقعوں پر کس قدر قیام رہا اور مقام مطلوب میں مدت قیام کیا رہی جب کہ عراق سے کاکیشین (جبل قوقایا) کی پہاڑیوں تک تقریباً آٹھ سو نو سو میل کی ایک طرفہ مسافت ہے۔
علاوہ ازیں اس واقعہ کا ذکر ابن خلدون، ابن خردادبہ، ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ جیسے محقق مؤرخین و جغرافیہ داں بھی کرتے ہیں اور اس کے باوجود وہ یہ دعویٰ کرتے نظر آتے ہیں کہ واثق باللہ کا یہ وفد اسی زیر بحث سد تک گیا ہے اور واپس ہو کر اسی کے حالات اس نے خلیفہ کو سنائے ہیں۔

Marfat.com

حکومت کے سارے دور میں یاجوج و ماجوج قبائل کا کوئی حملہ تاریخ میں موجود نہیں ہے اور نہ دربند (حصار) تک پہنچنے پر کسی قوم کا اس قسم کے وحشی قبائل سے دوچار ہونا اور سکندر سے اس کی شکایت کرنا تاریخی حقائق میں کہیں نظر آتا ہے۔

البتہ یہ بات ضرور قابل غور ہے کہ آخر دربند (بحر قزوین یا بحر خزر) کی دیوار کے متعلق سد سکندری کیوں مشہور ہوا؟ سو اس مسئلہ کے تمام حقائق کو پیش نظر رکھنے کے بعد بآسانی اس کا یہ حل سمجھ میں آ جاتا ہے کہ چونکہ اس مسئلہ کا تعلق یہود کی مذہبی روایات سے بہت زیادہ وابستہ ہے اور اسی لیے یہوؔد کے سوال پر قرآن عزیز نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ تو اس بدعت اور غلط انتساب کی ابتداء بھی وہی سے ہوئی ہے اور سب سے پہلے جوزیفس نے اس کے متعلق یہ بلا دلیل بیان کیا کہ یہ سد سد سکندری ہے اور وہیں سے یہ روایت چل گئی اور مؤرخین اسلام میں سے محمد بن اسحاق نے بھی چونکہ سکندر یونانی کو ذوالقرنین بتایا اس لیے مسلمانوں نے بھی اس سد کو سد سکندری کہنا شروع کر دیا اور آخر کار اس انتساب نے شہرت حاصل کر لی۔

مذکورہ بالا سد کے متعلق اگرچہ اکثر عرب مؤرخین یہی کہتے جاتے ہیں کہ وہ نوشیرواں کی بنائی ہوئی ہے مگر محققین کی رائے یہ ہے کہ اس کے بانی کا صحیح علم حاصل نہیں ہو سکا، البتہ تاریخی قیاسات سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید اس کی مرمت اور درستی نوشیرواں نے اپنے زمانہ میں کرائی ہو اور اسی وجہ سے وہ نوشیرواں کی جانب منسوب کر دی گئی ہو۔ بہر حال یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس سد کو سد سکندری کہنا ایک افواہی انتساب سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ نیز سکندر مقدونی جو انگریزی تاریخوں میں گریٹ الگزینڈر کہا جاتا ہے کسی طرح "ذوالقرنین" نہیں ہو سکتا اور نہ "سد ذوالقرنین" سے اس کا کوئی تعلق ہے۔

یاجوج و ماجوج کا خروج:

ذوالقرنین یاجوج و ماجوج اور سد کی بحث کے بعد سب سے زیادہ اہم مسئلہ یاجوج و ماجوج کے اس خروج کا ہے جس کا ذکر قرآن عزیز نے کیا ہے اور اس مسئلہ کی اہمیت اس لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس مسئلہ کا تعلق علامات قیامت سے ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ خروج یاجوج و ماجوج کا مسئلہ کہ جس کی خبر قرآن عزیز نے بطور پیشین گوئی کے دی ہے ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ جس کو محض ظنی قیاسات سے حل کر لیا جائے اور جب کہ اس مسئلہ کا تعلق قرآن عزیز کے اخبار مغیبات سے ہے تو پھر اس کے متعلق فیصلہ کرنے کا حق بھی قرآن عزیز ہی کو پہنچتا ہے نہ کہ ظن و تخمین کو۔ قرآن عزیز نے اس واقعہ کو سورۂ کہف اور سورۂ انبیاء میں بیان کیا ہے اور اس مسئلہ سے متعلق جو کچھ بھی ہے وہ صرف ان دو سورتوں میں مذکور ہے۔ سورۂ کہف میں یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے:

﴿فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ۝ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ۝﴾ (الکھف: ۹۷، ۹۸)

"پس نہیں طاقت رکھتے وہ (یاجوج و ماجوج) اس سد پر چڑھنے کی اور نہ اس میں سوراخ کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ (ذوالقرنین) نے کہا یہ میرے پروردگار کی رحمت ہے پھر جب میرے رب کا وعدہ آئے گا تو اس کو گرا کر ریزہ ریزہ کر دے گا اور میرے پروردگار کی فرمائی ہوئی بات سچ ہے"۔

Marfat.com

اور سورۂ انبیاء میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

﴿حَتّٰۤى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَ مَاْجُوْجُ وَ هُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ۝ وَ اقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ۹۶، ۹۷)

"یہاں تک کہ جب کھول دیئے جائیں گے یاجوج و ماجوج اور وہ زمین کی بلندیوں سے دوڑتے ہوئے اتر آئیں گے اور خدا کا سچا وعدہ قریب آ جائے تو اس وقت اچانک ایسا ہوگا کہ جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی اور پکار اٹھیں گے ہائے کم بختی ہماری کہ ہم بے خبر رہے"۔

ان دونوں مقامات میں قرآن عزیز نے ایک تو یہ بتایا ہے کہ جس زمانہ میں ذوالقرنین نے یاجوج و ماجوج پر سد قائم کی تو اس کے استحکام کی یہ حالت تھی کہ یہ قومیں نہ اس کو پھاند کر اس جانب آ سکتی تھیں اور نہ اس میں سوراخ پیدا کر کے اس کو عبور کر سکتی تھیں اور سد کی اس مضبوطی اور پائیداری کو دیکھ کر ذوالقرنین نے خدائے تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور یہ کہا کہ یہ سب کچھ خدا کی رحمت کا کرشمہ ہے کہ اس نے مجھ سے یہ نیک خدمت کرا دی۔

اور دوسری بات یہ بیان کی ہے کہ جب قیامت کا زمانہ قریب ہوگا تو یاجوج و ماجوج بے شمار فوج در فوج نکل کر دنیا میں پھیل جائیں گے اور لوٹ مار اور تباہی و بربادی مچا دیں گے۔

ان دونوں باتوں سے عام طور پر مفسرین نے یہ سمجھا ہے کہ یاجوج و ماجوج سد ذوالقرنین میں اس طرح محصور ہو گئے ہیں کہ یہ سد قیامت تک اسی طرح صحیح و سالم کھڑی رہے گی اور جب یاجوج و ماجوج کے خروج کا وقت آئے گا اور وہ قیامت کے قریب اور علامات قیامت میں سے ہوگا تو اس وقت یکبارگی "سد" گر کر ریزہ ریزہ ہو جائے گی اور اس لیے انہوں نے دونوں مقامات میں اسی کے مطابق آیات کی تفسیر کی ہے چنانچہ انہوں نے سورۂ انبیاء کی اس آیت ﴿حَتّٰۤى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَ مَاْجُوْجُ﴾ کا یہ ترجمہ کر کے "یہاں تک کہ جب یاجوج و ماجوج سد توڑ کر کھول دیئے جائیں گے" اس ارشادِ الٰہی کو ذوالقرنین کے اس مقولہ کے ساتھ جوڑ دیا جو کہف پ ۱۶ آیت ۹۸ میں مذکور ہے ﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ﴾ "پھر میرے رب کا وعدہ آئے گا تو وہ اس کو ریزہ ریزہ کر دے گا"۔

مگر آیات کے سیاق و سباق اور ان کے مفہوم پر غائر نظر ڈالنے سے یہ تفسیر آیات قرآنی کا حق ادا نہیں کرتی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن عزیز نے سورۂ کہف میں تو صرف اسی قدر ذکر کیا ہے کہ یاجوج و ماجوج پر جب ذوالقرنین نے سد تعمیر کر دی تو اس کے استحکام کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا کہ جب میرے خدا کا وعدہ آ جائے گا تو یہ سد ریزہ ریزہ ہو جائے گی اور خدا کا وعدہ برحق ہے اور اس کے خلاف ہونا محال و ممتنع۔

مگر اس جگہ یاجوج و ماجوج کے اس خروج کا کوئی ذکر نہیں ہے جو قیامت کے قریب وقوع میں آئے گا اور ہوتا بھی کیسے کیونکہ یہ تو ذوالقرنین کا اپنا مقولہ ہے جو سد کے مستحکم اور مضبوط ہونے کے سلسلہ میں کہا گیا ہے اور خروج یاجوج و ماجوج ان اخبار مغیبات میں سے ہے جو علامات ساعت کے طور پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے بیان کیا گیا ہے اور نبی اکرم ﷺ کے ذریعہ سے اقوام عالم کے

Marfat.com

لیے ایک تنبیہ ہے کہ خدا کی یہ زمین اپنے آخری لحات میں ایک سخت اور ہولناک عالمگیر حادثہ سے دوچار ہونے والی ہے۔

اور سورۂ انبیاء میں صرف یہ مذکور ہے کہ قیامت کے قریب یاجوج و ماجوج کا خروج ہوگا اور وہ بہت سرعت کے ساتھ بلندیوں سے پستی کی جانب فساد برپا کرنے کے لیے اُمنڈ پڑیں گے اور اس جگہ سد کا اور سد کے ریزہ ریزہ ہو کر اس سے یاجوج و ماجوج کے نکلنے کا قطعاً کوئی تذکرہ نہیں ہے اور لفظ ﴿فُتِحَتْ﴾ سے ایسا سمجھنا محض قیاسی و تخمینی ہے جیسا کہ عنقریب واضح ہوگا۔

پس سورۂ کہف اور سورۂ انبیاء دونوں میں اس واقعہ سے متعلق آیات کا صاف اور سادہ مطلب یہ ہے کہ سورۂ کہف میں تو پہلے اس واقعہ کی تفصیلات سنائی گئی ہیں جن کے متعلق یہود نے نبی اکرم ﷺ سے براہِ راست خود یا مشرکین مکہ کے واسطہ سے سوال کیا تھا کہ ذوالقرنین کی شخصیت کے متعلق اگر کوئی علم رکھتے ہو تو اس کو ظاہر کرو۔ قرآن عزیز یعنی وحی الٰہی نے ان کو بتایا کہ ذوالقرنین ایک نیک اور صالح بادشاہ تھا اس نے تین مہمیں قابل ذکر سر کیں ایک مشرق اقصیٰ کی اور دوسری مغرب اقصیٰ کی اور تیسری شمال کی جانب اور اس تیسری مہم میں اس کو ایک ایسی قوم سے سابقہ ہوا جس نے یاجوج و ماجوج کی تباہ کاریوں کا شکوہ کرتے ہوئے اپنے اور ان کے درمیان سد قائم کر دینے کا مطالبہ کیا۔ ذوالقرنین نے ان کے مطالبہ کو اس طرح پورا کیا کہ اس جانب وہ جس درہ سے نکل کر حملہ آور ہوا کرتے تھے اس کو لوہے کی تختیوں اور پگھلے ہوئے تانبے سے بند کر دیا اور دو پہاڑوں کے درمیان درہ پر ایک بہترین سد قائم کر دی اور ساتھ ہی شکر خدا بجالاتے ہوئے اس نے یہ بھی ظاہر کیا کہ یہ سد اس قدر مستحکم اور مضبوط ہے کہ اب یاجوج و ماجوج نہ اس میں سوراخ کر سکیں گے اور نہ اس پر چڑھ کر ادھر آ سکیں گے لیکن میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ یہ سد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسی طرح رہے گی بلکہ خدا کو جب تک منظور ہے یہ اسی طرح قائم ہے اور جب وہ چاہے گا کہ یہ روک باقی نہ رہے تو یہ ٹوٹ پھوٹ جائے گی اور خدا کا وعدہ "یعنی ہر شے کی طرح سد کا بھی فنا ہو جانا" پورا ہو کر رہے گا۔

یہود نے چونکہ صرف ذوالقرنین کے متعلق سوال کیا تھا اس لیے سورۂ کہف میں اس کے متعلق تفصیل سے بتایا گیا اور یاجوج و ماجوج کا محض ضمنی تذکرہ آ گیا اور سورۂ انبیاء میں اللہ تعالیٰ مشرکین کا رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جو بستیاں ہلاک کر دی گئیں اب ان کے باشندے دنیا میں زندہ نہیں واپس آئیں گے ہاں جب قیامت آ جائے گی" اور وہ جب آئے گی کہ اس سے پہلے یاجوج و ماجوج کا فتنہ پیش آئے گا" تب البتہ میدانِ حشر میں سب دوبارہ زندہ کر کے رب العالمین کے سامنے جواب دہ ہونے کے لیے جمع کیے جائیں گے۔

پھر چونکہ اس جگہ یاجوج و ماجوج کے خروج کو قیامت کی علامات بیان کر کے اہمیت دی گئی ہے اس لیے اس کے نکلنے کو سد کے ٹوٹنے اور ریزہ ریزہ ہونے کے ساتھ مقید نہیں کیا بلکہ سرے سے سد کا ذکر ہی نہیں کیا بلکہ یہ کہا کہ جب اس کے خروج موعود کا وقت آ جائے گا تو سرعت کے ساتھ بلندیوں سے پستی کی جانب امنڈ پڑیں گے اور تمام اقطاع و امصار میں پھیل جائیں گے۔

پس ان مجموعہ آیات سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ "سد ذوالقرنین" یاجوج و ماجوج کے خروج سے پہلے ضرور ٹوٹ پھوٹ چکی ہوگی دوسرے یہ کہ یاجوج و ماجوج کے موعود خروج کا وہ وقت ہوگا کہ قیامت کا وقت بالکل قریب ہو جائے اور اس کے بعد نفخ صور ہی کا مرحلہ باقی رہ جائے اس وقت یاجوج و ماجوج کے تمام قبائل بے پناہ سیلاب کی طرح امنڈ پڑیں گے اور تمام کائنات میں فساد عظیم برپا کریں گے۔

Marfat.com

بہر حال ذوالقرنین کے مقولہ ﴿فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ رَبِّیۡ جَعَلَہٗ دَکَّآءَ﴾ میں وعدے سے یاجوج و ماجوج کا خروج موعود مراد نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایک وقت ایسا ضرور آئے گا کہ بلاشبہ سد کا اندکاک ہو جائے گا اور وہ ٹوٹ پھوٹ جائے گی اور سورہ انبیاء میں خدائے تعالیٰ کے ارشاد ﴿فُتِحَتۡ یَاۡجُوۡجُ وَمَاۡجُوۡجُ﴾ میں فتح سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ سد توڑ کر نکل آئیں گے بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ اس کثرت سے فوج درفوج نکل پڑیں گے گویا کہیں بند تھے اور آج کھول دیئے گئے ہیں۔

چنانچہ اہل عرب لفظ "فتح" کو جب جاندار اشیاء کے لیے استعمال کرتے ہیں تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ یہ کسی گوشہ میں الگ تھلگ پڑی ہوئی تھی اور اب اچانک نکل پڑی، اس لیے جب کوئی شخص کہتا ہے "فتح الجراد" تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ٹڈیاں کسی جگہ بند تھیں اور اب ان کو کھول دیا گیا بلکہ یہ معنی مراد ہوتے ہیں کہ ٹڈی دل کسی پہاڑی گوشہ میں الگ پڑا تھا کہ اب اچانک فوج درفوج باہر نکل پڑا۔

پس یہاں بھی یہ بتایا گیا ہے کہ یاجوج و ماجوج جیسے عظیم الشان قبائل جو عرصہ سے بایں کثرت وازدحام دنیا کے ایک الگ گوشہ میں پڑے ہوئے تھے اس دن اس طرح امنڈ آئیں گے کہ گویا بند تھے اور اب اچانک کھول دیئے گئے۔

سورۂ کہف اور سورۂ انبیاء کی زیر بحث آیات کی تفسیر راس المحدثین حضرت استاد علامہ سید محمد انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے بھی عقیدۃ الاسلام میں یہی فرمائی ہے اور بلاشبہ یہ تفسیر بغیر کسی تاویل کے صحیح اور درست ہے اور اس سلسلہ کے بہت سے خدشات کو دور کرنے کے لیے مفید۔

حضرت شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

وینبغی ان یعلم ان قول ذی القرنین ﴿هٰذَا رَحۡمَةٌ مِّنۡ رَّبِّیۡ فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ رَبِّیۡ جَعَلَہٗ دَکَّآءَ وَکَانَ وَعۡدُ رَبِّیۡ حَقًّا﴾ قول من جانبه لاقرایته علی جعله منه من اشراط الساعة ولعله لاعلم له بذالك وانما اراد وعدا انه کائن فان قوله تعالیٰ بعد ذٰلك ﴿وَتَرَکۡنَا بَعۡضَہُمۡ یَوۡمَئِذٍ یَّمُوۡجُ فِیۡ بَعۡضٍ﴾ لاستمرار التجددی نعم قوله تعالیٰ ﴿حَتّٰۤی اِذَا فُتِحَتۡ یَاۡجُوۡجُ وَمَاۡجُوۡجُ وَہُمۡ مِّنۡ کُلِّ حَدَبٍ یَّنۡسِلُوۡنَ﴾ هو من اشراط الساعة لکن لیس فیه للردم ذکر فاعلم الفرق. (ص ۲۰۱)

"اور یہ بات سمجھنے کے قابل ہے کہ ذوالقرنین کا یہ قول ﴿هٰذَا رَحۡمَةٌ مِّنۡ رَّبِّیۡ﴾ اس کا اپنا قول ہے اور کوئی قرینہ سیاق و سباق میں ایسا موجود نہیں ہے جس سے سد کے ریزہ ریزہ ہونے کے واقعہ کو علامات قیامت میں سے شمار کیا جائے اور شاید ذوالقرنین کو یہ علم بھی نہ ہو کہ اشراط ساعت میں سے خروج یاجوج و ماجوج بھی ہے اور اس نے ﴿وَعۡدُ رَبِّیۡ﴾ سے صرف اس کا کسی وقت میں ٹوٹ پھوٹ جانا مراد لیا ہو پس اس صورت میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد "ہم نے کر چھوڑا ان کو اس دن سے اس حالت میں کہ بعض بعض پر امنڈ رہی ہیں" استمرار تجددی پر دلالت کرتا ہے یعنی برابر ایسا ہوتا رہے گا کہ ان میں سے بعض قبائل بعض پر حملہ آور ہوتے رہیں گے حتیٰ کہ خروج موعود کا وقت آ جائے ہاں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد جو سورۂ انبیاء میں ہے ﴿حَتّٰۤی اِذَا فُتِحَتۡ﴾ تو البتہ یہ بلاشبہ علامات قیامت میں سے ہے لیکن اس میں سد کا قطعاً کوئی ذکر نہیں ہے پس اس،

Marfat.com

فرق کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے"۔

اور پھر اس کو تفصیل کے ساتھ بیان فرماتے ہوئے آخر میں ارشاد فرماتے ہیں:

واعلم ان ما ذکرته لیس تاویلا فی القرآن بل زیادة شئ من التاریخ والتجربة بدون احواج لفظة من موضوعه. (۲۰۳)

"اور یہ یاد رہے کہ میں نے ان آیات کی تفسیر میں جو کچھ کہا وہ قرآن میں تاویل نہیں ہے بلکہ قرآن عزیز کے کسی لفظ کو اس کے اپنے موضوع سے نکالے بغیر تاریخ اور تجربہ کے پیش نظر مزید اظہار حال ہے"۔

عام مفسرین نے بیان کردہ تفسیر سے الگ سورۂ کہف اور انبیاء دونوں کی آیات متعلقہ کے واقعات کو اشراط ساعت میں شمار کرتے ہوئے جو تفسیر فرمائی ہے غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سامنے ترمذی اور مسند احمد کی ایک مرفوع حدیث ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اور جس کا ترجمہ یہ ہے:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یاجوج و ماجوج روزانہ ذوالقرنین کی سد کو کھودتے رہتے ہیں اور جب سورج نکلنے کا وقت قریب ہو جاتا ہے تو آپس میں کہتے ہیں کہ اب کام ختم کرو اب یہ اس قابل ہو گئی ہے کہ کل تم اس کو کھود کر گرا سکو گے مگر جب وہ اگلے روز پھر اس کام پر واپس آتے ہیں تو سد کو اصلی حالت سے بھی زیادہ مضبوط اور مستحکم پاتے ہیں۔ یہ اسی طرح ہوتا رہتا ہے مگر جب ان کی معین مدت کا وقت پورا ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہوگا کہ اب وہ انسانی دنیا پر چھا جائیں تو اس روز بھی سابق کی طرح اس کو کھودیں گے اور جب سورج نکلنے کا وقت قریب ہوگا تو کام لینے والے کام کرنے والوں سے کہیں گے اب واپس جاؤ کل انشاء اللہ اس کو کھود کر برابر کریں گے اور آج چونکہ انشاء اللہ کہہ دیا اس لیے جب واپس آئیں گے تو اپنی محنت کو درست پائیں گے اور اس وقت وہ باقی محنت کر کے سد کو گرا دیں گے اور لوگوں پر نکل پڑیں گے اور تمام روئے زمین کا پانی پی جائیں گے اور لوگ ان کے خوف سے قلعوں اور پناہ گاہوں میں چھپ جائیں گے پھر وہ دنیا کو مغلوب سمجھ کر آسمان پر تیر پھینکیں گے کہ خدا اور عالم بالا سے جنگ کر کے اس کو بھی مغلوب کریں، اللہ تعالیٰ ان کے تیروں کو خون آلود کر کے واپس کرے گا تو وہ سمجھیں گے کہ ہم عالم بالا پر بھی غالب آ گئے پھر اللہ تعالیٰ ان کی گردن میں گلٹیاں پیدا کر دے گا جس سے وہ خود بخود مر جائیں گے"۔

مگر ترمذی نے اس حدیث کو بیان کر کے حدیث کی حیثیت پر یہ حکم لگایا ہے کہ

هٰذا حدیث حسن غریب انما نعرف من هٰذا الوجه مثل هٰذا. (ترمذی سورۂ کہف)

"یہ حدیث حسن غریب ہے اور اسی طریقہ سند سے ایسی ہی عجیب باتیں ہم جانا کرتے ہیں"۔

یعنی ان کے نزدیک یہ روایت اپنے اعتبار سے منکر اور اچنبھی روایت ہے اور حافظ عماد الدین ابن کثیر اس روایت کو نقل کر کے اس پر یہ حکم لگاتے ہیں:

اس حدیث میں مضمون کے لحاظ سے نکارت (اچنبھا) ہے اور اس کو مرفوع کہنا یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرنا غلط ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ٹھیک اسی قسم کی ایک اسرائیلی کہانی کعب احبار سے منقول ہے اور اس میں بھی یہ سب باتیں اسی طرح مذکور ہیں

Marfat.com

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے جو اکثر کعب احبار سے اسرائیلی قصے سنا کرتے تھے اس کو ایک اسرائیلی کہانی کے طور پر بیان کیا ہوگا جس کو نیچے کے راوی نے یہ سمجھا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، درحقیقت یہ راوی کا وہم ہے اور کچھ نہیں ہے۔

اس حدیث کے متعلق میں نے یہ جو کچھ کہا ہے میرا اپنا خیال ہی نہیں ہے بلکہ امام حدیث احمد بن حنبل رحمہ اللہ بھی یہی فرماتے ہیں۔ [1]

ترمذی، ابن کثیر اور امام احمد رحمہم اللہ کی ان تصریحات کے بعد اس روایت کی حیثیت ایک اسرائیلی قصہ سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ لہٰذا مفسرین کا محض اس روایت کی بناء پر سورۂ کہف کی زیر بحث آیات کی یہ تفسیر کرنا کہ سد ذوالقرنین ٹھیک اس وقت ریزہ ریزہ ہوگی جب کہ اشراط ساعت میں سے موعود خروج یاجوج وماجوج پیش آئے گا، صحیح نہیں ہے۔

اور اگر ان کی تفسیر کا یہ حصہ صحیح مان لیا جائے تو پھر بھی وہ مذکورہ بالا روایت کے تسلیم کر لینے کے بعد قرآن عزیز کی آیت کے تعارض سے سبکدوش نہیں ہو سکتے، اس لیے کہ قرآن عزیز (کہف) میں سد کے متعلق ذوالقرنین کا یہ مقولہ نقل کیا گیا ہے:

﴿فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ یَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ۝﴾ (الکهف:۹۷)

اور اس کا مطلب تمام مفسرین نے بالاتفاق یہ بیان کیا ہے کہ یاجوج وماجوج اس سد میں کسی قسم کے رد و بدل پر قادر نہیں ہے، چنانچہ امام احمد اور ابن کثیر رحمہما اللہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

انهم لم يتمكنوا من نقبه ولا نقب شئ منه.

"بلاشبہ اب یعنی بناء سد کے وقت یاجوج وماجوج اس میں سوراخ کرنے یا کسی حصہ کو بھی کھودنے پر قادر نہیں رہے"۔

تو اب مفسرین اس روایت کے ان جملوں کے تعارض کو کس طرح دور فرمائیں گے جن میں یہ صراحت ہے کہ وہ اس کو کھود کر یا چاٹ کر گرنے کے قریب کر دیتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ صحیح حدیث کے تعارض کو کس طرح دور کر دیں گے جن کو امام بخاری رحمہ اللہ نے بسند صحیح روایت کیا ہے۔

ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خواب راحت سے بیدار ہوئے تو یہ حالت تھی کہ چہرۂ مبارک سرخ تھا اور یہ ارشاد فرما رہے تھے:

لا اله الا الله ويل للعرب من شر قد اقترب فتح اليوم من ردم ياجوج وماجوج مثل هذا وحلق قلت يا رسول الله صلى الله عليه وسلم انهلك وفينا الصالحون قال نعم اذا كثر الخبث.

"لا الٰہ الا اللہ، عرب کے لیے ہلاکت ہے اس شر سے جو قریب آ رہا ہے، آج یاجوج وماجوج پر قائم شدہ سد اس طرح کھول دی گئی ہے اور انگوٹھے پر انگلی رکھ کر اور گول حلقہ بنا کر دکھایا۔ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ہم ایسی حالت میں ہلاک ہو جائیں گے جب کہ ہم میں صالحین امت بھی موجود ہوں گے؟ ارشاد فرمایا: بے شک ایسا ہوگا اگر امت میں خبائث کی کثرت ہو جائے گی"۔ [2] [3]

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۱۰۵ [2] البدایہ والنھایہ ج ۲ ص ۱۱۲۔ [3] بخاری ومسلم عن الزہری۔ باب الفتن

Marfat.com

اس روایت میں یہ تصریح ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ "سد" میں حلقہ انگشت کی مقدار سوراخ ہو گیا ہے اور مفسرین کی اس تفسیر کے مطابق قیامت کے موعود وقت سے قبل یہ ناممکن ہے۔

پس اگر یہ کہا جائے کہ اس صحیح بلکہ اصح روایت حدیثی میں "فتح" سے مراد شر اور فتنوں کا شیوع ہے اور اس کو استعارہ کے طور پر فتح روم کہہ دیا گیا تو سورۂ انبیاء کی آیت میں ﴿فُتِحَتْ﴾ کے معنی میں یہ اصرار کیوں ہے کہ اس سے سد ٹوٹ کر کھلنا مراد ہے؟ حالانکہ اس جگہ روم یا سد کا تذکرہ تک نہیں اور کیوں نہ اس سے بھی استعارہ مراد لیا جائے اور کیوں وہ تفسیر نہ کی جائے جو ہم ابھی نقل کر چکے ہیں۔

اور اگر حدیث میں حقیقی نقب کا ذکر ہے تو یہ سورۂ کہف کی اس تفسیر کے خلاف اور معارض ہے جو مفسرین نے عام طور پر بیان کی ہے کہ سد کا یہ استحکام قیامت کے موعود وقت تک یوں ہی رہے گا اور سد کا اس سے قبل ٹوٹنا پھوٹنا ناممکن ہے۔

لیکن عام تفسیر کے برعکس اگر حضرت شاہ صاحب کی تفسیر کے مطابق ان دونوں مقامات کی تفسیر کی جائے کہ جس کی فی الجملہ تائید امام احمد اور محدث ابن کثیر رحمہ اللہ کے اقوال سے بھی ہوتی ہے تو یہ سب مشکلات خود بخود دور ہو جاتی ہیں اور آیات کا مطلب اور حدیث کا مقصد بآسانی سمجھ میں آ جاتا ہے، چنانچہ ابن کثیر آیت ﴿وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

ای فی ذالك الزمان لان هٰذه صیغة خبر ماض فلا ینفی وقوعه فیما یتقبل باذن الله لهم فی ذالك قدرًا وتلیطهم علیه بالتدریج قلیلًا قلیلًا حتی یتم الاجل وینقضی الامر المقدور فیخرجون کما قال الله تعالٰی ﴿وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ﴾ (الانبیاء: ۹۶)۔ [1]

"یعنی وہ (یاجوج و ماجوج) اس زمانہ میں سد کے متعلق ہر قسم کے ردوبدل سے بے بس ہو گئے ہیں اس لیے کہ استطاعوا کا صیغہ زمانہ ماضی کی اطلاع کے لیے وضع کیا گیا ہے پس اس آیت میں اس بات کی ہرگز نفی نہیں نکلتی کہ زمانہ مستقبل میں اللہ تعالیٰ ان کو اس پر قدرت دے دے کہ وہ آہستہ آہستہ اور تدریجی طور پر اس سد کو توڑ پھوڑ ڈالیں تا کہ وہ وقت موعود آ پہنچے جس کی خبر سورۂ انبیاء میں دی گئی ہے اور امر مقدور پورا ہو جائے اور تب وہ یک لخت یلغار کر کے اس طرح نکل پڑیں گے جس طرح سورۂ انبیاء کی اس آیت میں خبر دی گئی ہے ﴿وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ﴾۔"

غرض اس عبارت کا مفہوم بھی وہی ہے جو حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے منقول ہو چکا ہے اور بغیر کسی تاویل کے آیت ﴿مَا اسْتَطَاعُوْا .... الآیة﴾ کا صاف طور پر یہی مطلب متعین ہو جاتا ہے کہ یہ ذوالقرنین کے زمانہ کی کیفیت خود ان ہی کی زبانی ہو رہی ہے، یہ مطلب کسی طرح بھی نہیں ہے کہ ذوالقرنین کی سد یاجوج و ماجوج کے خروج موعود سے پہلے ٹوٹ ہی نہیں سکتی۔

اور یہ مطلب ہو بھی کیسے سکتا ہے جب کہ یاجوج و ماجوج صرف ایک اس درہ سے ہی نکل کر غارت گری نہیں کرتے تھے بلکہ دنیا کے اس کونہ سے چین کے علاقہ منچوریا تک ان کے خروج کے بہت سے مقامات تھے پس اگر ان کے لیے سد ذوالقرنین نے درہ کی راہ ہمیشہ کے لیے مسدود کر دی تھی تو دوسرے مقامات سے ان کا خروج کیوں نہیں ہو سکتا تھا؟

---

[1] البدایہ والنھایہ ج ۲ ص ۱۱۲

Marfat.com

اسی لیے حضرت شاہ صاحب نے آیت ﴿ وَ تَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَىٕذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ ﴾ (الکھف: ۹۹) کی تفسیر یہ کی ہے کہ ذوالقرنین کے اس واقعہ میں چونکہ یاجوج و ماجوج پر اس جانب سے روک قائم ہوجانے کا تذکرہ ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کے مقولہ کے بعد اپنی جانب سے اس آیت میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اے مخاطبین! تم جن یاجوج و ماجوج قبائل کے متعلق یہ باتیں سن رہے ہو یہ بھی سن لو کہ ہم نے ان قبائل کے لیے یہ مقدر کردیا ہے کہ وہ آپس میں الجھتے رہیں گے اور موج در موج باہم دست بگریباں ہوتے رہیں گے حتیٰ کہ وہ وقت آجائے جب کہ قیامت بپا ہونے میں "نفخ صور" کے علاوہ اور کوئی مرحلہ باقی نہ رہے اور سورۂ انبیاء میں یہ ارشاد فرمایا کہ "نفخ صور" سے پہلے قیامت کی اشراط و علامات میں سے ایک شرط یا علامت یہ پیش آئے گی کہ یاجوج و ماجوج کے تمام قبائل اپنے نکلنے کے ہر مقام سے ایک ساتھ امنڈ آئیں گے اور دنیا کی عام غارت گری کے لیے اپنی مقامی بلندیوں سے تیزی کے ساتھ اترتے ہوئے کائنات کے گوشہ گوشہ میں پھیل جائیں گے، ﴿ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴾ "الحدب" لغت میں اوپر سے نیچے جھکنے کو کہتے ہیں، اس لیے "حدب" کے معنی اونچے مقام سے نیچے اترنے کے ہوتے ہیں اور "نسلان" عربی لغت میں پھسلنے کو کہتے ہیں، اس لیے "ینسلون" کے معنی یہ ہوئے کہ وہ اس سرعت کے ساتھ امنڈ آئیں گے کہ یہ معلوم ہوگا گویا وہ کسی ٹیلے سے پھسل رہے ہیں، چنانچہ مفردات امام راغب اور نہایہ ابن اثیر میں "حدب" اور "نسل و نسلان" کی بحث میں یہی لغوی تفصیل مذکور ہے۔

لہٰذا اس تفسیر سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ قرآن عزیز نے یاجوج و ماجوج کے خروج موعود کی جو کیفیت بیان فرمائی ہے وہ ان ہی قبائل پر منطبق ہوتی ہے جو بحر کاسپین سے لے کر منچوریا تک پھیلے ہوئے ہیں اور جو دنیا کی بہت بڑی آبادی کے محور ہیں اور جائے وقوع کے اعتبار سے عام سطح آبادی سے اس قدر بلند حصہ زمین پر مقیم ہیں کہ جب بھی نکل کر متمدن اقوام پر حملہ آور ہوتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا اُوپر سے نیچے کو پھسل رہے ہیں پس آئندہ بھی جب اشراط ساعت کی شکل میں ان کا آخری خروج ہوگا تو ان کے تمام قبائل کا سیلاب ایک ہی دفعہ اُمنڈ آئے گا اور ایسا معلوم ہوگا کہ انسانوں کے سمندر کا بند ٹوٹ گیا ہے اور وہ اپنے مقامات کی ہر بلندی سے نیچے کی جانب بہہ پڑا ہے۔

قرآن عزیز کی آیات زیر بحث کی یہ تفسیر الفاظ اور جملوں کو ان کے لغوی معنی سے ادھر ادھر ہٹائے اور ان میں تاویل کیے بغیر اس قدر لطیف ہے کہ جس سے وہ بہت سے شکوک و شبہات یک قلم دفع ہوجاتے ہیں جو اس سلسلہ میں مفسرین کو پیش آئے ہیں اور ان کو حل کرنے کے لیے غیر جانب تاویلات کرنی پڑی ہیں۔ نیز مدعیان نبوت کو ان تاویلات سے فائدہ اٹھا کر الحاد و زندقہ پھیلانے کا موقعہ میسر آگیا ہے۔

سورۂ کہف اور سورۂ انبیاء کی آیات کی اس تفسیر کے بعد اب حدیث بخاری کا مرحلہ باقی رہ جاتا ہے کہ اس کی کیا مراد ہے؟ تو حدیث ((ویل للعرب من شر قد اقترب)) اس بات پر تو صاف دلالت کرتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو رویا میں، جو نبی کے لیے وحی کی طرح صحیح اور حجت ہوتا ہے، یہ دکھایا گیا کہ سد یاجوج و ماجوج میں رخنہ پڑ جانے سے ایسا سخت حادثہ پیش آنے والا ہے جو عرب کے لیے ہولناک ثابت ہوگا لیکن یہ بات پوری طرح وضاحت کے ساتھ سامنے نہ آسکی کہ ((فتح من ردم یاجوج و ماجوج)) میں لفظ فتح سے حقیقی معنی مراد ہیں کہ واقعی یاجوج و ماجوج کی سد میں سے انگوٹھے اور انگلی کے بنائے ہوئے حلقہ کی مقدار میں شگاف ہوگیا ہے یا پیشین گوئیوں کی طرح اس پیشین گوئی میں بھی "فتح" اور حلق تسعین کا استعارہ کی شکل میں بیان کیا گیا ہے۔ نیز یہ کہ

Marfat.com

جملہ کا پہلے جملہ ((ویل للعرب)) سے کوئی ربط ہے یا یہ الگ الگ دو مستقل باتیں ہیں؟

ان دونوں سئلوں کے متعلق اہل تحقیق کی رائے مختلف ہے اور چونکہ اس رویا صادقہ کی تعبیر خود ذات اقدس ﷺ سے یا صحابہ رضی اللہ عنہم کے آثار سے بسند صحیح منقول نہیں ہے اس لیے محدثین اور ارباب سیر نے یہ کوشش فرمائی ہے کہ وہ اس حدیث کے مصداق کو تقریبی طور پر متعین فرمائیں۔

شیخ بدرالدین عینی فرماتے ہیں کہ ((ویل للعرب)) کے جملہ میں ان شرور وفتن کی جانب اشارہ کیا گیا ہے جو آپ کی وفات کے بعد ہی امت میں رونما ہونے شروع ہو گئے اور جن کا نتیجہ یہ نکلا کہ امت میں سب سے پہلے عرب (قریشی حکومت) کی طاقت کا خاتمہ ہو گیا اور جن کی ہلاکتوں کا پہلا شکار اہل عرب ہی ہوئے اور بعد میں ان کا اثر تمام امت مرحومہ پر پڑا۔

اور روم (سد) میں انگلی اور انگوٹھے کے بنائے ہوئے حلقہ کی مقدار رخنہ پیدا ہو جانے کا ذکر تقریبی ہے یعنی یہ مقصد نہیں ہے کہ واقعی اتنا چھوٹا سا رخنہ پڑ گیا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ سد ذوالقرنین کے استحکامات کی مدت ختم ہو گئی اور اب اس میں رخنہ پڑنے کی ابتداء ہو چلی ہے گویا اب وہ آہستہ آہستہ شکست وریخت ہو جائے۔ [1]

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ بھی قریب قریب یہی فرماتے ہیں، لکھتے ہیں کہ اس واقعہ کی جانب اشارہ ہے جو رویا صادقہ کے بعد قتل عثمان رضی اللہ عنہ کی شکل میں ظاہر ہوا اور پھر متواتر فتن اور شرور کا سلسلہ جاری ہو گیا جن کا نتیجہ یہ نکلا کہ عرب (قریشی حکومت) تمام اقوام کے لیے ایسے ہو گئے جیسا کہ کھانے کے پیالہ پر کھانے والے جمع ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں اس تشبیہ کا ذکر بھی موجود ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"وہ زمانہ قریب ہے کہ تم پر قومیں اس طرح ایک دوسرے کو دعوت دیں گی جس طرح کھانے کے بڑے پیالہ پر کھانے والے ایک دوسرے کو دعوت دیتے ہیں"۔ [2]

قرطبی کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے اس ارشاد کے مخاطب عرب ہی ہیں اور رخنہ سد کے متعلق دونوں محدثین کا رجحان اسی جانب معلوم ہوتا ہے کہ اس سے حقیقی رخنہ مراد نہیں ہے بلکہ یہ ایک تشبیہ ہے۔

ان ہر دو محدثین کی تفصیلات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ((ویل للعرب)) والا جملہ جو شرور وفتن سے متعلق ہے اور "فتح روم" کے جملہ میں ایک ہی بات بیان کی گئی ہے۔ اور یہ دونوں جملے اس طرح آپس میں مربوط ہیں کہ دونوں کو ایک ہی حادثہ سے متعلق سمجھا جائے۔

اور حافظ عمادالدین بن کثیر اس بارے میں کوئی فیصلہ کن رائے نہیں رکھتے اور متردد ہیں کہ زیر بحث حدیث ((فتح من ردم یاجوج وماجوج)) میں فتح سے حقیقی فتح (کھل جانا) مراد ہے یا استعارہ ہے کسی آئندہ ایسے حادثہ سے جو یاجوج و ماجوج کے ہاتھوں پیش آنے والا ہے اور جس کا اثر براہ راست عرب (حکومت قریش) پر پڑے گا لیکن کرمانی شارح بخاری بعض علماء سے نقل کرتے ہیں کہ وہ اس پوری حدیث کو ایک ہی معاملہ سے متعلق سمجھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اس میں یاجوج و ماجوج کے ایسے حادثہ کا ذکر کیا گیا ہے جس کا ظہور قیامت کی علامت سے جدا درمیانی وقفہ میں پیش آنے والا ہے اور جو باعث ہوگا عرب کے زوال کا اور

---

[1] عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۲۳۵ [2] فتح الباری ج ۱۳ ص ۹۱

"فتح ردم" استعارہ ہے اس بات سے کہ جو حادثہ آئندہ رونما ہونے والا ہے اس کی ابتداء ہوگئی ہے اور یہ وہ حادثہ تھا جو مستعصم باللہ خلیفہ عباسی کے زمانہ میں "فتنہ تاتار کے نام سے برپا ہوا اور جس نے عرب طاقت کا خاتمہ کر کے رکھ دیا"۔ [1]

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یاجوج و ماجوج قبائل کی اس تاخت و تاراج کے بعد جس کا ذکر ذوالقرنین کے واقعہ کے ضمن میں آیا ہے تاریخ میں ان قبائل کا پھر کوئی یادگار حملہ مذکور نہیں ہے۔

البتہ ساتویں صدی عیسوی میں ان کے لیے ذوالقرنین کی یہ روک بیکار ہوگئی اور انہوں نے بحر خزر اور بحر اسود کے اس درہ کے علاوہ جوان پر بند کر دیا گیا تھا بحیرہ یورال اور بحر خزر کا درمیانی راستہ پا لیا، نیز ادھر سد ذوالقرنین کے استحکامات میں بھی فرق آنا شروع ہوگیا تھا اور اس طرح ذوالقرنین کے بعد اب یاجوج و ماجوج کے ایک نئے فتنہ کا آغاز ہو چلا تھا اور صدیوں سے ان خاموش قبائل فتنہ جو میں پھر حرکت شروع ہوگئی تھی۔

لہٰذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رویاء صادقہ میں یہ دکھا دیا گیا کہ اگرچہ ابھی وہ وقت دور ہے جبکہ قیامت کے قریب تمام قبائل یاجوج و ماجوج عالم انسانیت پر چھا جائیں گے لیکن وہ وقت قریب ہے جب کہ ذوالقرنین کے بعد ان کا ایک اہم خروج پھر ہوگا اور وہ عرب کی طاقت اور فرماں روائی کی بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوگا اور اسی خروج کو اس طرح حسی طور پر دکھایا گیا کہ گویا (سد) دیوار میں ایک چھوٹا سا سوراخ ہوگیا ہے، اور آہستہ آہستہ وہ دیوار گر کر منہدم ہو جانے والی ہے۔

چنانچہ زمانہ نبوی میں یہ وہ وقت تھا کہ ان قبائل میں سے چند منگولین قبائل نے اپنے مرکز سے نکل کر قرب و جوار میں پھیلنا اور چھوٹے چھوٹے حملے کرنا شروع کر دیا تھا، اور آخر کار چھٹی صدی ہجری میں چنگیز خان ان کا قائد بن گیا اور اس نے منتشر قبائل کو ایک جگہ جمع کرنا شروع کیا اور پھر اس کے بیٹے اوکتائی خان نے ایک بے پناہ طاقت کے ساتھ اٹھ کر مغرب و جنوب پر حملہ کر دیا اور ۶۸۲ء میں آخر ہلاکو خان کے ہاتھوں بغداد کی عرب خلافت کا خاتمہ ہوگیا اور اس نے "خلافت عربیہ" کو تہ و بالا کر ڈالا۔

تو یوں سمجھیے کہ جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس خود علامات قیامت میں سے سب سے بڑی علامت ہے یعنی آپ خاتم النبیین ہیں اور پھر بھی قیامت کے وقت میں اور ذات اقدس میں کافی غیر متعین فاصلہ ہے اسی طرح یہ فتنہ تاتار بھی علامت قیامت "خروج یاجوج و ماجوج" کا ایک ابتدائی نشان ہے اور جس طرح خروج دجال و قتل دجال اور نزول عیسیٰ علیہ السلام قیامت کی قریبی علامات ہیں اسی طرح سورۂ انبیاء میں ذکر کردہ خروج یاجوج و ماجوج بھی علامات قیامت میں سے قریبی اور آخری علامت یا آخری شرط ہے پس "فتح ردم" میں ان کی ابتدائی حرکت کی جانب اشارہ ہے جو رویائے صادقہ کے وقت شروع ہو چکی تھی اور ((ویل للعرب)) سے اس نتیجہ کا اظہار ہے جو عرب حکومت کے خاتمہ پر منتج ہوا ہے۔

لیکن شیخ بدر الدین عینی نے بخاری کی شرح عمدۃ القاری میں کرمانی کے بیان کردہ اس قول کی تردید کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ تاتاری فتنہ کا بانی چنگیز خان اور اس کا بیٹا ہلاکو خان تھا اور ان کو یاجوج و ماجوج میں سے سمجھنا صحیح نہیں ہے، لہٰذا اس حدیث کا مصداق اس فتنہ کو قرار دینا بھی غلط ہے بہرحال حدیث ((ویل للعرب)) کی ان مختلف توجیہات سے جب کہ یہ بات ظاہر ہوگئی کہ اس روایت کے مصداق کا تعین خود حدیث سے نہیں ہوتا بلکہ محدثین نے قرائن اور الفاظ حدیث کی نشست کو پیش نظر رکھ کر اپنی جانب سے

---

[1] عمدۃ القاری ج ۱۱

Marfat.com

مصداق متعین کرنے کی سعی فرمائی ہے اور پھر اس میں بھی اختلاف رائے رہا ہے تو اب ان ہی کے بتائے ہوئے اصول کو سامنے رکھ کر ہم بھی کچھ کہنے اور حدیث زیر بحث کے مقصد کو متعین کرنے کا حق رکھتے ہیں، اگرچہ دوسرے اقوال کی طرح وہ بھی غیر منصوص اور قابل ردّ وقبول ہوگا۔

حدیث زیر بحث میں مستقبل میں پیش آنے والے جس فتنہ اور شر کی خبر دی گئی ہے اس کے دو جملے بہت اہم ہیں ایک ((ویل للعرب من شر قد اقترب)) "عرب کے لیے ہلاکت ہے اس شر سے جو بلاشبہ قریب آ لگا ہے"۔ اور دوسرا ((فتح الیوم من ردم یاجوج و ماجوج وحلق تسعین)) "آج کے دن یاجوج و ماجوج کی سد سے انگوٹھے اور انگلی کے گول دائرہ کی مقدار میں کھول دیا گیا ہے"۔ اور ان ہر دو جملوں کے درمیانٔ واوٴ عطف بھی نہیں ہے۔

لہٰذا الفاظ حدیث پر کافی غور وخوض کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں مسطورہ بالا ہر دو اقوال کی گنجائش ہے یعنی حدیث کا پہلا جملہ یہ پتہ دیتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ ایک ایسے اہم شر کی اطلاع دے رہے ہیں جس کا اثر یہ ہوگا کہ عرب کے لیے سخت ہلاکت کا سامنا ہوگا اور "خلافت قریش" زوال پذیر ہو جائے گی۔

اور دوسرا جملہ یا پہلے جملہ کی تائید میں پیش کیا گیا ہے اور یہ بتایا جا رہا ہے کہ اس امت میں جو اہم فتنے بپا ہونے والے ہیں اور جن کا ابتدائی اثر عرب کی ہلاکت کی شکل میں ظاہر ہوگا ان فتنوں کے رونما ہونے کے لیے حسی علامت اس طرح سامنے آ گئی ہے کہ یاجوج و ماجوج پر بنائی ہوئی مستحکم سد ذوالقرنین میں رخنہ پڑنا شروع ہو گیا اور اس کی شکست و ریخت ہونے لگی۔ گویا یہ رخنہ آئندہ اسلامی طاقت یا عرب طاقت میں جلد رخنہ پڑ جانے کے لیے ایک علامت ہے۔ چنانچہ یہ فتنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے شروع ہو کر مختلف فتنوں کے بعد چند صدیوں میں قریشی حکومت کی ہلاکت وتباہی پر جا کر ٹھہرا اور اس طرح حدیث کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔

پس اس شکل میں "فتح ردم" آئندہ فتنوں اور شروں کے پیش آنے کی ایک علامت ہے جو امت اسلامیہ میں بپا ہو کر قرب قیامت میں موعود خروج یاجوج و ماجوج پر جا کر ختم ہو جائیں گے اور اس کے بعد دنیا کے درہم و برہم ہو جانے سے قیامت ہو جائے گی۔

یا یوں کہیے کہ دوسرا جملہ پہلے جملہ کی صرف تائید ہی نہیں ہے بلکہ اس کی تفسیر ہے اور پہلا جملہ درحقیقت نتیجہ اور ثمرہ ہے دوسرے جملہ کا اور مطلب یہ ہے کہ عرب (قریشی حکومت) کی ہلاکت کا وقت آ پہنچا۔ گویا یاجوج و ماجوج کا وہ بند جو ذوالقرنین نے بہت مستحکم باندھا تھا اس میں اب رخنہ پڑ گیا اور معنی اس میں شکست و ریخت شروع ہو گئی اور یہ تمہید ہے اس فتنہ کی جو اسی جانب سے اٹھے گا اور قریشی حکومت کا خاتمہ کر دے گا۔

پس اس تعبیر کے لحاظ سے تاتاری فتنہ کی وہ تاریخ سامنے لائی جائے گی جو گزشتہ صفحات میں پیش کی گئی ہے اور جس میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح حدیث کی بیان کردہ پیشین گوئی کے مطابق اس فتنہ کی ابتدا دور رسالت سے شروع ہو گئی تھی اور پھر کس طرح وہ خلیفہ عباسی مستعصم باللہ کے دور حکومت میں قریشی حکومت کے استیصال کا باعث ہوئی۔

پس اگر ان دونوں جملوں کے درمیان جو ربط اور تعلق ہے اس میں اس قدر وسعت تسلیم کر لی جائے کہ وہ محدثین کی بتائی ہوئی توجیہ یعنی اہم شرور وفتن کا شیوع اور کرمانی کا بیان کردہ ایک قول کے مطابق توجیہ یعنی فتنہ تاتار کا وجود، ان دونوں توجیہات کو حاوی ہو سکے تو ایسا تسلیم کر لینے میں نہ شرعی قباحت لازم آتی ہے اور نہ تاریخی اور زیر بحث حدیث کا مصداق بہت زیادہ فہم کے قریب

آ جاتا ہے۔

رہا شیخ بدرالدین نور اللہ مرقدہٗ کا یہ ارشاد کہ چنگیز خانی تاتاری یاجوج و ماجوج نہیں کہلائے جا سکتے تو یہ شیخ کا تسامح ہے اس لیے کہ یاجوج و ماجوج کے تعین کی بحث میں محققین محدثین اور مؤرخین نے جن قبائل اور ان کے مواطن کو محقق قرار دیا ہے اور خود شیخ موصوف نے بھی جن کو بڑی حد تک تسلیم فرمایا ہے ان ہی قبائل میں سے ایک شاخ ان تاتاریوں کی بھی ہے جو چنگیز خانی کہلائے اور یہ اپنے دور بربریت و وحشت میں ان ہی جگہوں میں آباد رہے ہیں اور وہیں سے ان کا خروج ہوا ہے جن پر سد ذوالقرنین قائم کی گئی تھی۔

بہرحال سورۂ کہف اور سورۂ انبیاء کی زیر بحث آیات کی اس تفسیر کے درمیان جو ہم نے حضرت علامہ انور شاہ نور اللہ مرقدہٗ اور حافظ حدیث عماد الدین بن کثیر کے حوالہ جات سے بیان کی ہے اور اس حدیث کی پیشین گوئی کے مصداق متعین کرنے والی مسطورہ بالا توجیہات کے درمیان کسی قسم کا بھی تعارض پیدا نہیں ہوتا اور زیر بحث آیات و روایات کے مصداق اپنی اپنی جگہ صاف اور واضح ہو جاتے ہیں اور ایسا کرنے میں نہ رکیک تاویلات کا سہارا لینے کی ضرورت پیش آتی ہے اور نہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس کو تفسیر بالرائے یا قابل اعتراض جدت کہا جا سکتا ہے بلکہ یہ جو کچھ بھی ہے سلف صالحین اور محدثین وارباب سیر کے مختلف اقوال میں ترجیح راجح کے اصول کو کارفرما بنا کر ایک ایسی معتدل راہ ہے جو نصوص قرآنی اور صحیح روایات حدیثی کے درمیان تطبیق کی راہ کہلائی جاتی اور سلفاً عن خلف مقبول و محمود رہی ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ حدیث مسطورہ بالا میں حلقہ کی مقدار رخنہ پڑ جانے کا جو تذکرہ ہے اس کے متعلق محدثین کی یہ رائے ہے کہ استعارہ و تشبیہ مراد ہو یا حسی رخنہ بہردوصورت حلقہ کی مقدار رخنہ کا ذکر تقریبی ہے نہ کہ تحدیدی یعنی یہ مطلب ہے کہ سد میں رخنہ پڑنا شروع ہو گیا یہ مراد نہیں ہے کہ واقعی ایک حلقہ کی مقدار ہی رخنہ پڑا ہے چنانچہ گزشتہ صفحات میں ہم ابن کثیر سے اس سلسلہ میں نقول پیش کر چکے ہیں۔

اس سلسلہ میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں اور بعض دوسرے علماء نے کتب سیرت میں اس امر کی کوشش کی ہے کہ سورۂ انبیا کی ان آیات کا مصداق جن میں یاجوج و ماجوج کے موعود خروج کا ذکر کیا گیا ہے ((حتی اذا فتحت یاجوج وماجوج وھم من کل حدب ینسلون)) فتنہ تاتار کو بنا کر یہیں قصہ کو ختم کر دیں اور اس کا امارت ساعت و علامت قیامت سے کوئی تعلق باقی نہ رہنے دیں۔

مگر ہمارے نزدیک قرآن عزیز کا سیاق و سباق ان کی اس تفسیر یا توجیہ کا قطعاً اباء و انکار کرتا ہے اور یہ اس لیے کہ سورۂ انبیاء میں اس واقعہ کو جس ترتیب سے بیان کیا ہے، وہ یہ ہے:

﴿وَ حَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَاۤ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝ حَتّٰۤى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَ مَاْجُوْجُ وَ هُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ۝ وَ اقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ۹۵-۹۷)

"اور مقرر ہو چکا ہے ہر ایک ایسی بستی پر کہ جس کو ہم نے ہلاک کر دیا ہے کہ اس کے بسنے والے واپس نہ ہوں گے یہاں تک کہ کھول دیئے جائیں یاجوج و ماجوج اور وہ ہر بلندی سے دوڑتے ہوئے امنڈ پڑیں اور قریب آ جائے سچا وعدہ پھر اس وقت حیرانی سے کھلی کی کھلی رہ جائیں آنکھیں منکروں کی اور کہیں ہائے ہماری بدبختی کہ ہم بے خبر رہے اس (قیامت) سے بلکہ ہم ظلم و شرارت میں سرشار رہے"۔

ان آیات میں آیت زیر بحث ﴿حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ﴾ الآیہ سے پہلی آیت میں یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ مرنے والوں کی موت کے بعد اب ان کے لیے اس دنیا میں دوبارہ زندگی نہیں ہے اور آیت زیر بحث میں یہ کہا گیا ہے کہ موت کے بعد دوبارہ زندگی کا وقت جن علامت و آیات کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے یا جن پر معلق کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ یاجوج و ماجوج کے تمام قبائل اپنی پوری طاقت کے ساتھ بیک وقت اپنے مراکز سے نکل کر تیزی سے تمام دنیا پر چھا جائیں اور اس سے متصل آیت میں مزید یہ کہا گیا کہ پھر اس کے بعد قیامت بپا ہو جائے گی اور تمام شخص اپنی زندگی کے نیک و بد انجام دینے کے لیے میدان حشر میں جمع ہو جائیں گے اور ناکام اپنی ناکامی پر حسرت و یاس کرتے رہ جائیں گے۔

پس آیت زیر بحث کے سیاق و سباق نے یہ بات بخوبی واضح کر دی کہ اس مقام پر یاجوج و ماجوج کے ایک ایسے خروج کی اطلاع دی گئی ہے جس کے بعد شر و رفتن کا کوئی سلسلہ بلکہ دنیا کی ہستی کا کوئی سلسلہ باقی نہیں رہ جائے گا اور صرف قیامت بپا ہو جانے یعنی نفخ صور کی دیر باقی رہ جائے گی جو اس واقعہ کی تکمیل کے بعد عمل میں آ جائے گی۔

لہٰذا آیت کے سیاق و سباق سے قطع نظر کرتے ہوئے اور حدیث ((ویل للعرب من شر قد اقترب)) کا مصداق "فتنہ تاتار" کو متعین کرتے ہوئے سورۂ انبیاء کی اس آیت کو آخری علامت ساعت سے نکال کر فتنہ تاتار پر محمول کر لینا ہرگز ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا، نیز جمہور سلف صالحین کی مسلمہ توجیہ کے قطعاً خلاف ہے۔

ممکن ہے کہ اس میں توجیہ کے ناقلین و قائلین ہمارے اس اعتراض کو ہم پر ہی پلٹ دیں اور یہ فرمائیں کہ اسی طرح سورۂ کہف میں بھی آیت ﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ﴾ میں "وعد" سے کیوں قیامت مراد لی جائے جب کہ اس کے بعد ہی آیت ﴿وَّ نُفِخَ فِی الصُّوْرِ﴾ موجود ہے جو بلاشبہ قیامت کی آخری علامت ہے اور کیوں نہ کہا جائے کہ اس آیت سے یہ مراد ہے کہ یاجوج و ماجوج نفخ صور تک سد کے اندر محصور اور بند رہیں گے اور نفخ صور کے قریب یک بیک سد گر جائے گی اور وہ نکل پڑیں گے۔

تو اس کے متعلق ہماری یہ گزارش ہے کہ یہ اعتراض اپنی اس تقریر کے ساتھ ہرگز ہم پر وارد نہیں ہوتا اس لیے کہ سورۂ کہف کی ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے ہم پہلے ہی یہ واضح کر چکے ہیں کہ ان آیات میں سب سے پہلے ﴿وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِی الْقَرْنَیْنِ ؕ﴾ سے شروع کر کے ﴿وَ كَانَ وَعْدُ رَبِّیْ حَقًّا﴾ تک ذوالقرنین کا واقعہ بیان کیا گیا ہے یعنی آیت ﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ﴾ میں ذوالقرنین کا مقولہ نقل کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کا اپنا ارشاد نہیں ہے اس لیے یہاں "وعد" سے وعدۂ قیامت مراد نہیں ہے بلکہ کسی تعمیر کی خرابی کا مقدور و معین وقت مراد ہے جس کی تعیین کو ذوالقرنین نے اپنی جانب سے تخمینی طور پر متعین کرنے کی بجائے مرد مؤمن اور مرد صالح کی طرح خدا کی مرضی کے حوالہ کر دیا ہے۔

اور چونکہ ذوالقرنین کے واقعہ میں ضمنی طور سے یاجوج و ماجوج کا بھی ذکر آ گیا تھا اس لیے اس کے خاتمہ پر اگلی آیت میں

Marfat.com

اللہ تعالیٰ نے بھی یاجوج و ماجوج کا مختصر ذکر فرما دیا اور آیت ﴿وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوجُ فِي بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ﴾ میں یہ بیان کیا کہ جن یاجوج و ماجوج کا ذکر تم نے ابھی ذوالقرنین کے واقعہ میں سنا ان کو ہم نے شر اور فتنہ کی اس زندگی میں اس طرح کر چھوڑا ہے کہ وہ برابر فساد اور چپقلش باہمی میں مصروف رہیں گے اور یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہے گا کہ صور پھونک دیا جائے گا اس دن وہ سب جمع کیے جائیں گے اور اس دن جہنم کافروں پر پیش کی جائے گی۔

گویا سورۂ انبیاء میں تو یاجوج و ماجوج کا ذکر مستقل حیثیت رکھتا ہے اور وہاں بتانا ہی یہ منظور ہے کہ ان کا اجتماعی خروج قیامت کی آخری علامات میں سے ایک نمایاں علامت ہے اور سورۂ کہف میں ان کا تذکرہ صرف ضمنی ہے اور ان کے فساد اور شر انگیزی کے خصوصی واقعہ کی مناسبت سے انکی باہمی فساد انگیزیوں اور مختلف اوقات میں موج در موج چپقلشوں کی وارداتوں کا ذکر اس انداز میں کر دیا گیا کہ ان کے موعود خروج کی جانب بھی اشارہ ہو جائے۔

غرض سورۂ کہف کی زیر بحث آیات کا سیاق و سباق یعنی ان سے پہلی اور بعد کی آیات کا ہرگز یہ تقاضا نہیں ہے کہ ذوالقرنین کے مقولہ ﴿فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهٗ دَكَّآءَ﴾ میں "وعد" سے مراد وعدۂ قیامت لیا جائے اور وہ معنی بیان کیے جائیں جو معترض نے ہماری بیان کردہ سورۂ انبیاء کی تفسیر کے مقابلہ میں پیش کی ہیں۔

الحاصل جن معاصر مفسرین نے سورۂ انبیاء کی زیر بحث آیات کا مصداق فتنہ تاتار کو بتایا ہے اور اس کی تائید میں بخاری کی مشہور حدیث ((ویل للعرب من شر قد اقترب.... الخ)) کو پیش کیا ہے ان کی یہ تفسیر غلط ہے اور حدیث سے اس کی تائید قطعاً بے محل ہے بلکہ بخاری و مسلم کی دوسری صحیح احادیث جو کتاب الفتن میں مذکور ہیں اس تفسیر کے خلاف صاف صاف یہ بیان کرتی ہیں کہ علامات قیامت میں جب آخری علامات رونما ہوں گی تو پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے نزول ہوگا اور دجال کا سخت فتنہ برپا ہوگا اور آخر کار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں وہ مارا جائے گا اور پھر کچھ عرصہ کے بعد یاجوج و ماجوج کا موعود خروج ہوگا جو تمام دنیا پر شر و فساد کی صورت میں چھا جائے گا اور پھر کچھ وقفہ کے بعد نفخ صور ہوگا اور یہ کارخانۂ دنیا درہم برہم ہو جائے گا۔ *

یہ بھی واضح رہے کہ یہ اور اسی قسم کی دوسری صحیح اور اصح روایات سے ان متنبیوں (جھوٹے مدعیان نبوت) کے دعووں کا بھی ابطال ہو جاتا ہے اور ان کے کذب صریح کی رسوائی آشکارا ہو جاتی ہے جو اپنی نبوت کی صداقت کی تعمیر یہ کہہ کر تیار کرتے ہیں کہ انگریز اور روس یاجوج و ماجوج ہیں اور جب کہ ان کا خروج ہو چکا اور وہ عالم کے اکثر حصوں پر قابض ہو چکے تو اب "یسوع مسیح" کی آمد ضروری ہوگئی لہٰذا وہ موعود مسیح (عیسیٰ) ہم ہیں کیونکہ جب شرط موجود ہے تو مشروط کیوں موجود نہ ہو۔

کسی جھوٹے مدعی نبوت کی یہ دلیل اگرچہ خود تار عنکبوت سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی اور اس لیے درخور اعتناء بھی نہیں ہے تاہم عوام کو غلط فہمی سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس مدعی کے بیان کردہ یہ دونوں دعوے جو دلیل کے دو مقدموں کے طور پر بیان کیے گئے ہیں غلط اور ناقابل قبول ہیں اور اس لیے ان سے پیدا شدہ نتیجہ بھی بلاشبہ باطل اور مردود ہے۔

پہلا دعویٰ یا مقدمہ تو اس لیے غلط ہے کہ ہم نے یاجوج و ماجوج کی بحث میں تفصیل کے ساتھ حدیث و تاریخ سے یہ ثابت

---

* بخاری کتاب الفتن ج ۲

Marfat.com

کر دیا ہے کہ یاجوج و ماجوج کا اطلاق صرف ان ہی قبائل پر ہوتا رہا ہے جو اپنے اصل مرکز میں بہمہ طریق وحشت و بربریت مقیم ہیں اور ان میں سے جو افراد یا قبائل مرکز چھوڑ کر دنیا کے مختلف حصوں میں بس گئے اور آہستہ آہستہ متمدن بن گئے ہیں وہ تاریخ کی نظر میں یاجوج و ماجوج نہیں کہلاتے بلکہ اپنے بعض امتیازات خصوصی کے پیش نظر نئے نئے ناموں سے موسوم ہو گئے اور اپنے اصلی نسلی مرکز سے اس قدر اجنبی ہو گئے ہیں کہ وہ اور یہ دو مستقل جدا جدا قومیں بن گئیں اور ایک دوسرے کے دشمن ہوئے اسی طرح قرآن و حدیث کے مطالعہ سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ ان ہی قبائل کو یاجوج و ماجوج کہتا ہے جو اپنی بربریت اور وحشت کے ساتھ عام سے الگ اپنے مرکز میں گوشہ گیر ہیں۔

اور اسی اصول پر دوسرا دعویٰ یا مقدمہ بھی باطل ہے کہ انگریز اور روس بلکہ یورپین حکومتوں کا تسلط اور قبضہ یاجوج و ماجوج کا خروج ہے اور یہ اس لیے کہ ایک تو ابھی ذکر ہو چکا کہ متمدن اقوام کو یاجوج و ماجوج کہنا ہی غلط ہے دوسرے اس لیے کہ یاجوج و ماجوج کے اس فتنہ و فساد کے پیش نظر جس کا ذکر ذوالقرنین کے واقعہ میں سورۂ کہف میں مذکور ہے اور صحیح احادیث کی تصریحات کے مطابق ان کا وہ خروج بھی جس کا ذکر سورۂ انبیاء میں کیا گیا ہے اور جس کی علامت قیامت میں سے ٹھہرایا ہے ایسے ہی فساد و شر کے ساتھ ہوگا جس کا تعلق تمدن و حضارت سے دور کا بھی نہ ہو اور جو خالص وحشیانہ طرز و طریق پر برپا کیا جائے کہاں سائنس کے ایجادات و آلات کا طریقہ جنگ اور کہاں غیر متمدن وحشیانہ جنگ و پیکار؟ شتان بینهما۔

اور یہ بات اس لیے بھی واضح ہے کہ متمدن اقوام کی جنگ و پیکار کتنی ہی وحشیانہ طرز و طریق اختیار کیے ہوئے کیوں نہ ہوں بہرحال سائنس اور حرب و ضرب کے اصول کے مطابق ہوتی ہیں اور یہ سلسلہ اقوام و امم میں ہمیشہ سے جاری ہے اس لیے اگر اس قسم کے جابرانہ و قاہرانہ تسلط اور قبضہ کے متعلق قرآن عزیز کو پیشین گوئی کرنی تھی تو اس کی تعبیر کے لیے ہرگز یہ طریقہ اختیار نہ کیا جاتا جو یاجوج و ماجوج کے خروج موعود کے سلسلہ میں سورۂ کہف اور سورۂ انبیاء میں اختیار کیا گیا ہے بلکہ ان کی ترقی نما بربریت کی جانب ضروری اشارات یا تصریحات کا ہونا لازم تھا۔ [1]

الحاصل احادیث صحیح اور آیات قرآنی کی مطابقت کے ساتھ ساتھ جب مسئلہ زیر بحث پر غور و فکر کیا جاتا ہے تو بصراحت یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس علامت سے قبل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول از آسمان ضروری ہے نہ یہ کہ پہلے یاجوج و ماجوج کا خروج ہوگا اور مسیح علیہ السلام کی آمد کا انتظار کیا جائے، چنانچہ صحیح مسلم کی ایک طویل حدیث میں مذکور ہے:

فبینما هو كذلك اذا بعث الله المسيح بن مريم فينزل عند المنارة البيضاء شرقى دمشق بين مهرودتين واضعًا كفيه على اجنحة ملكين اذا طاطا رأسه قطر و اذا رفعه تحدر منه جمان كاللؤلؤ فلا يحل لكافر يجد ريح نفسه الامات و نفسه ينهتى حيث ينتهى طرفه فيطلبه حتى يدركه بباب لد فيقتله ثم ياتى عيسى ابن مريم قوم قد عصمهم الله منه فيمسح عن وجوههم و يحدثهم بدرجاتهم فى الجنة فبينما هو كذلك اذا اوحى الله الى عيسى انى قد اخرجت عبادًا لى لا يدان لاحد بقتالهم فحرز عبادى الى الطور و يبعث الله ياجوج و

[1] یہ امر کہ آج جبکہ کاکیشیا کا تمام علاقہ متمدن ہو چکا اور یہاں کی بیشتر آبادی مسلمان ہے تو قریب بہ قیامت یاجوج و ماجوج کا خروج اس علاقہ سے کس طرح ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ گزشتہ صفحات میں یہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے کہ کاکیشیا کے اس حصہ سے چین و تبت تک کے تمام ساحلی اور پہاڑی علاقوں کا سلسلہ ان ہی وحشی قبائل کا مسکن رہا ہے اور آج بھی ہے، پس ان ہی علاقوں کے مختلف حصوں سے بے تعداد وحشی انسان وقت موعود پر نکل کر دنیا انسان کو تاراج کرنے کے لیے پھیل جائیں گے۔

ماجوج ﴿وَهُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُونَ﴾. [1]

"واقعات یہاں تک پہنچیں گے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مسیح بن مریم علیہ السلام کو بھیجے گا اور وہ (جامع) دمشق کے سپید شرقی منارہ کے نزدیک اس طرح اتریں گے کہ زعفرانی رنگ کی دو چادروں میں ملبوس اور فرشتوں کے بازوؤں پر ہاتھ کا سہارا دیئے ہوئے ہوں گے جب سر کو جھکائیں گے تو پانی ٹپکنے لگے گا اور جب سر اٹھائیں گے تو اس سے پانی کے قطرات اس طرح گرنے لگیں گے گویا ہار سے موتی ٹوٹ کر گر رہے ہیں یعنی آسمان پر غسل کر کے فوراً ہی نزول ہوگا جہاں تک ان کا سانس جائے گا کافر کی موت کا باعث ہوگا اور ان کا سانس ان کی حد نظر تک پہنچے گا، پھر اتر کر وہ دجال کا پیچھا کریں گے اور وہ اس کو بیت المقدس کے قریب بستی لد کے دروازہ پر پائیں گے اور قتل کر دیں گے۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان لوگوں کے پاس تشریف لائیں گے جن کو اللہ تعالیٰ دجال کے فتنہ سے محفوظ رکھے گا اور ان کے غبار آلودہ چہروں کو مس کرتے ہوئے ان کو جنت میں جو درجات ملیں گے اس کے متعلق باتیں کریں گے، حالات یہاں تک پہنچیں گے کہ اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام پر وحی کرے گا کہ اب میں اپنے بندوں میں سے ایک ایسی قوم کو نکالتا ہوں جن سے جنگ کرنے کی دنیا میں کسی کے اندر طاقت نہیں ہے، لہٰذا تم میرے تمام بندوں کو طور پر لے جاؤ۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ یاجوج و ماجوج کو نکالے گا جو تیزی کے ساتھ دوڑتے ہوئے آئیں گے اور ہر بلند جگہ سے نکل پڑیں گے"۔

پس یاجوج و ماجوج کا خروج کسی حال میں بھی ان اقوام پر صادق نہیں آسکتا جو تمدن اور حضارت کی راہوں سے قاہرانہ اور جابرانہ جنگ و پیکار کے ذریعہ سے دنیا پر غالب و قابض ہوتی رہی ہیں اور کسی شخص کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ یاجوج و ماجوج قبائل کی تاریخی بحث سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اور جدید نبی بن کر اسلام کے اساسی اور بنیادی مسئلہ ختم نبوت کے خلاف تشکیل نبوت کی جدید طرح ڈالے اور اس طرح اسلام میں رخنہ انداز ہو کر دوست نما دشمن بنے۔

کیا ذوالقرنین نبی تھے؟:

ذوالقرنین کے تعین کے بعد یہ مسئلہ بھی اہمیت رکھتا ہے کہ یہ واضح ہو جائے کہ ذوالقرنین نبی ہیں یا ایک نیک نہاد بادشاہ؟ سلف صالحین اور متاخرین کی اکثریت اسی جانب ہے کہ ذوالقرنین صالحین میں سے ہیں اور نیک نفس بادشاہ اور وہ نبی یا رسول نہیں۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس روایت میں کہ جس میں ذوالقرنین کی وجہ تسمیہ بیان کی گئی ہے ان کا یہ قول مصرح موجود ہے:

لم یکن نبیًا ولا ملکًا. (الحدیث) [2]

"ذوالقرنین نہ نبی تھے اور نہ فرشتہ"۔

کان رجلًا احب اللہ فاحبہ.... الخ.

"وہ ایک انسان تھے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو محبوب رکھا، پس اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو محبوب رکھا"۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس روایت کو نقل کر کے اس کی توثیق کی ہے اور کہا ہے کہ میں نے اس روایت کو حافظ حدیث ضیاء الدین مقدسی کی کتاب مختارہ کی احادیث سے بسند صحیح سنا ہے اور پھر فرماتے ہیں کہ اس روایت میں ذوالقرنین کے متعلق یہ الفاظ بھی مذکور ہیں:

بعثہ اللہ الیٰ قومہ. [3] "اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کی قوم کی طرف بھیجا"۔

---

[1] مسلم کتاب الفتن [2] فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۵ [3] فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۸

Marfat.com

اس سے یہ اشکال ہوتا ہے کہ لفظ "بعث" تو نبوت و رسالت کے لیے بولا جاتا ہے پھر نبوت کے انکار کے کیا معنی؟ اس کے بعد خود ہی یہ جواب دیا ہے کہ "بعث" یہاں اپنے عام معنی میں ہے جو نبی اور غیر نبی دونوں کے لیے بولا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

وقيل كان من الملوك وعليه الاكثر. (فتح)

"اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھا اور اکثر کی یہی رائے ہے"۔

حضرت علیؓ کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی یہی مسلک ہے کہ ذوالقرنین نبی نہ تھے بلکہ ایک نیک اور صالح بادشاہ تھے:

عن ابن عباس قال كان ذوالقرنين ملكًا صالحًا رضى الله عمله و اثنٰى عليه فى كتابه و كان منصورًا.[1]

"حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ذوالقرنین نیک اور صالح بادشاہ تھا اللہ تعالیٰ نے اس کے اعمال کو پسند فرمایا اور اپنی کتاب (قرآن) میں اس کی تعریف فرمائی اور وہ فاتح و کامیاب بادشاہ تھا"۔

اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بھی ذوالقرنین کو صالحین میں سے مانتے تھے۔[2]

البتہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی جانب یہ نسبت کی جاتی ہے کہ وہ ذوالقرنین کو نبی مانتے تھے:

عن مجاهد عن عبدالله بن عمرو قال كان ذوالقرنين نبيًا.[3]

"عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ذوالقرنین نبی تھے"۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس روایت کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ قرآن کا ظاہر یہی بتایا ہے،[4] مگر ان تمام اقوال کو نقل کرنے کے بعد فیصلہ کچھ نہیں دیتے لیکن حافظ عماد الدین ابن کثیر ان اقوال کو نقل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا فیصلہ یہ دیتے ہیں:

والصحيح انه كان ملكا من ملوك العادلين.[5]

"اور صحیح یہ ہے کہ ذوالقرنین عادل بادشاہوں میں سے تھا"۔

حضرت استاد علامہ محمد انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی تحقیق بھی یہی ہے، چنانچہ عقیدۃ الاسلام میں تحریر فرماتے ہیں:

بل ملك اخر من الصالحين ينتهى نسبه الى العرب الساميين الاولين.

"کہ وہ ایک اور نیک بادشاہوں میں سے تھا اور اس کا نسب قدیم سامیوں پر پہنچتا ہے"۔

ان نقول کے پیش نظر مولانا آزاد کا یہ فرمانا:

"تو صحابہ و سلف سے جو تفسیر منقول ہے وہ یہی ہے کہ ذوالقرنین نبی تھے"۔[6]

اپنے عموم کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے کیونکہ بیشتر سلف صالحین ذوالقرنین کی نسبت کے قائل نہیں ہیں بلکہ ان کو ایک بادشاہ حیثیت میں تسلیم کرتے ہیں، البتہ بعض سلف کی رائے میں وہ نبی تھے۔

اسی طرح متاخرین میں ابن کثیر کے متعلق یہ کہنا بھی غلط فہمی پر مبنی ہے کہ وہ ذوالقرنین کے نبی ہونے کی تائید میں ہیں اس لئے کہ سطور بالا میں ابن کثیر رحمہ اللہ سے جو کچھ منقول ہے وہ قطعاً اس کے خلاف ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں

---

[1] البدایہ والنھایہ ج ۲ ص ۱۳۲ [2] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۰۳ [3] فتح الباری ج ۶ ص ۲۶۵
[4] فتح الباری ج ۶ ص ۱۹۷ [5] فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۵ [6] ترجمان القرآن ج ۲ ص ۴۲۰

Marfat.com

اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ذوالقرنین اور خضر کا جو ایک جگہ ساتھ ساتھ ذکر کیا ہے اور اس میں خضر کی نبوت کی توثیق فرمائی ہے تو اس جگہ شاید ضمائر کے مرجع میں مولانا موصوف کو مغالطہ ہو گیا ہے چنانچہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

فان الاول کان عبدًا مؤمنًا صالحًا و ملکا عادلًا و کان وزیرہ الخضر، وقد کان نبیا علی ما قررناہ قبل ھٰذا۔ [1]

"اس لیے کہ اوّل (یعنی ذوالقرنین) ایک عبد مومن اور صالح تھا اور عادل بادشاہ اور اس کے وزیر خضر علیہ السلام تھے اور وہ (خضر) اس تحقیق کے مطابق جو ہم سابق میں بیان کر چکے ہیں بے شک نبی تھے"۔

بہر حال حضرت علی، ابن عباس، ابوہریرہ رضی اللہ عنہم، امام رازی، ابن کثیر اور ان کے علاوہ سلف صالحین اور متاخرین کی اکثریت اسی کی قائل ہے کہ ذوالقرنین نبی نہیں تھے بلکہ عادل بادشاہ تھے پس جب کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین بلکہ متاخرین میں سے بھی اکثر اسی جانب ہیں کہ ذوالقرنین نبی نہ تھے تو جمہور کا یہ رجحان بلاشبہ اس امر کی دلیل ہے کہ آیت ﴿قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ﴾ میں خدائے تعالیٰ کی مخاطبت ذوالقرنین کے ساتھ اسی قسم کی ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے قصہ میں ﴿اَوْحَيْنَآ﴾ کے اندر ہے۔

﴿وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ﴾ (القصص:٧)

"اور ہم نے موسیٰ کی والدہ پر وحی کی کہ تو اس (موسیٰ علیہ السلام) کو دودھ پلانا منظور کر لے"۔

اور یقیناً ان حضرات کا منطوق پر مفہوم کو ترجیح دینا بے وجہ نہیں ہے، خصوصاً جب کہ اس مخاطبت کو نہ ﴿اَوْحَيْنَآ﴾ سے تعبیر کیا گیا اور نہ ﴿اَنْزَلْنَا﴾ سے اور نہ ﴿قُلْنَا﴾ کے علاوہ ذوالقرنین سے متعلق آیات میں کوئی ایسا مؤید موجود ہے جو ﴿قُلْنَا﴾ کی خطابت کو خطابت وحی قرار دیتا ہے۔

لہٰذا راجح مذہب یہی ہے کہ ذوالقرنین نبی نہیں تھے بلکہ عادل اور صالح بادشاہ تھے۔

بصائر:

① مطالب قرآن کی بصیرت کے لیے جس طرح لغت عرب معانی بلاغت و بیان صرف و نحو احادیث اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم جیسے علوم کی معرفت ضروری ہے اسی طرح صحیح علم تاریخ کی معرفت ضروری ہے، چنانچہ گزشتہ اقوام و امم کے حالات و واقعات کا علم حاصل کر کے ان سے عبرت و بصیرت حاصل کرنے کی ترغیب خود قرآن عزیز نے پر زور اسلوب بیان کے ساتھ دی ہے، ارشاد ہے:

﴿قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ⑪﴾ (الانعام:١١)

"کہہ دیجئے زمین کی سیاحت کرو پھر دیکھو جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوگا"۔

﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ⑬⑦﴾ (ال عمران:١٣٧)

"بے شبہ تم سے پہلے (خدا کی مقرر کردہ) راہیں گزر چکی ہیں پس زمین کی سیر کرو پھر دیکھو جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا"۔

---

[1] تاریخ ابن کثیر ج ٢ ص ١٠٢

Marfat.com

④ جہاں تک اسلام کے بنیادی مسائل کا تعلق ہے اس میں سلف صالحین کا مسلک ہی بغیر چون و چرا دلیل راہ ہے اور اس سے تجاوز زیغ اور گمراہی ہے لیکن جہاں تک قرآن کے لطائف و نکات، معارف و علوم، اسرار و غوامض اور علمی و تاریخی مطالب کا تعلق ہے اس کے لیے کسی زمانہ میں بھی در تحقیق بند نہیں ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے:

((فلا تنقضی عجائبه)).

"قرآن کے لطائف و حکم کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں"۔

خصوصاً جب کہ تاریخی مطالب کے حصول کے لیے آج کے ذرائع معلومات قدیم علوم تاریخ کے ذرائع سے زیادہ وسیع ہو چکے ہیں تو سلف صالحین کے مسلک قدیم پر قائم رہتے ہوئے قرآنی حقائق اور اس کے تاریخی مباحث کی تفصیلات و جزئیات میں اقوال سلف کا پابند نہ رہتے ہوئے قرآن کی تائید کے لیے قدیم تحقیق اٹھانا سلف صالحین کی اقتداء ہے نہ کہ ان کے مسلک سے انحراف کیا کوئی اہل علم اور صاحب نظر اس حقیقت کا انکار کر سکتا ہے کہ ان مطالب تفسیری کے علاوہ جن کے متعلق دلائل سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ ارشادات نبوی ﷺ ہیں صحابہ رضی اللہ عنہم کے ذاتی اقوال کے خلاف یا ان سے جدا تابعین اور تبع تابعین کے اقوال بہ کثرت کتب تفسیر میں مذکور ہیں اور متاخرین علماء تفسیر متقدمین کے اقوال پر نقد و جرح کرتے اور اختلاف رائے رکھتے نظر آتے ہیں اور ان میں سے ہر شخص کی تحقیق قرآن عزیز کے مطالب کی خدمت ہی سمجھی جاتی ہے، البتہ اہلیت شرط ہے اور جو شخص بھی اس خدمت کے لیے اقدام کرے اس کا فرض ہے کہ فیما بینی و بین اللہ یہ غور و فکر کرے کہ وہ جس مسئلہ میں کوئی راہ اختیار کرتا ہے حقیقت میں اس کے تمام مالہ اور ماعلیہ سے واقف ہے یا نہیں اور یہ کہ اس کی اس تحقیق سے قرآن کی مزید تائید ہی ہوتی ہے اور سلف صالحین کے بنیادی مسلک قدیم سے قطعاً تجاوز لازم نہیں آتا۔

⑤ عدل و ظلم کی حکومت کے درمیان ہمیشہ سے یہ امتیازی فرق چلا آتا ہے کہ عادل حکومت کا نصب العین رعایا اور عوام (پبلک) کی خدمت ہوتا ہے اور اس لیے عادل بادشاہ کا شاہی خزانہ رفاہ عام اور پبلک خدمات اور ان کی خوشحالی کے لیے ہوتا ہے اور وہ اپنی ذات پر ضروری حاجات سے زیادہ اس میں سے صرف نہیں کرتا اور نہ عوام کو ٹیکسوں کی کثرت سے پریشان حال بناتا ہے اس کے برعکس جبر و ظلم کی حکومت کا منشاء بادشاہ اور حکومت کا اقتدار، ذاتی تعیش اور اس کا استحکام ہوتا ہے اس لیے وہ نہ رعایا کے دکھ درد کی پرواہ کرتا ہے اور نہ ان کی راحت و آرام کا خیال رکھتا ہے اور اس سلسلہ میں اگر کچھ ہو بھی جاتا ہے تو وہ حکومت کے مفاد و مصالح کے پیش نظر ضمنی ہوتا ہے نیز اس حکومت میں رعایا ہمیشہ ٹیکسوں کے بوجھ سے دبی رہتی اور اس ملک کی اکثریت افلاس و غربت ہی کا شکار رہتی ہے۔

ذوالقرنین چونکہ ایک صالح اور عادل بادشاہ تھا اس لیے اس نے شمالی سیاحت میں اس قوم سے ٹیکس لینے سے انکار کر دیا جو یاجوج و ماجوج پر سد بنانے کے سلسلہ میں دینا چاہتے تھے اور اس نے صاف کہا کہ خدا نے مجھ کو حکومت و ثروت اس لیے نہیں دی کہ میں اس کو ذاتی تعیش پر صرف کروں بلکہ صرف اس لیے عطا فرمائی ہے کہ اس کے ذریعہ سے مخلوق خدا کی خدمت انجام دوں۔ نیز اس نے جو ملک بھی فتح کیا اس کی رعایا پر عفو و کرم ہی کی بارش کی اور کبھی ان کو نہیں ستایا۔

Marfat.com

اصحاب الکہف والرقیم

(۱۰۰ء تخمیناً)

○ قرآن عزیز اور اصحاب الکہف والرقیم ○ کہف ورقیم؟ ○ واقعہ کی حیثیت ○ تفسیری حقائق ○ نتائج وعبر

قرآن عزیز اور اصحاب الکہف والرقیم:

ابن اسحاق بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ قریش مکہ میں یہ مشورہ ہوا کہ محمد ﷺ کا معاملہ بہت سنگین ہوتا جا رہا ہے اس لیے ایسا کوئی یقینی فیصلہ ہونا چاہئے کہ یہ صادق ہیں یا کاذب تا کہ ہم ان کے متعلق اپنی آخری رائے پر عمل کر سکیں۔ بہتر یہ ہے کہ اس مسئلہ کو یہود مدینہ سے حل کیا جائے کیونکہ وہ خود کو اہل کتاب کہتے اور اس قسم کے معاملات میں صاحب بصیرت ہیں۔ قریش نے اس غرض سے نضر بن حارث اور عقبہ بن معیط پر مشتمل ایک وفد علماء یہود کے پاس بھیجا۔ علماء یہود نے ان سے کہا کہ تم ان سے تین باتیں دریافت کرو، اگر وہ صحیح صحیح جواب دیں تو بلاشبہ وہ خدا کے سچے رسول ہیں، تم کو ہرگز ان کی مخالفت نہیں کرنی چاہئے، اور اگر وہ صحیح جواب نہ بتا سکیں تو تم کو اختیار ہے جو چاہو ان کے ساتھ کرو۔ وہ تین سوال یہ ہیں:

① ذوالقرنین کا واقعہ کیا ہے؟ ② اصحاب کہف کون تھے اور ان پر کیا گزرا؟ ③ روح کی حقیقت بیان کیجئے؟

وفد نے مکہ جا کر صنادید قریش سے صورتحال کہہ سنائی اور قریش نے اس بات کو بہت پسند کیا اور خدمت اقدس ﷺ میں حاضر ہو کر آپ ﷺ سے یہ تینوں سوالات کیے۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اس کا جواب وحی آنے پر دوں گا۔ چنانچہ جب وحی کے ذریعہ آپ ﷺ کو ان واقعات کی حقیقت سے آگاہ کر دیا گیا تب آپ ﷺ نے ان کے سامنے سورۂ کہف تلاوت کر کے واقعات کی حقیقت ان پر واضح کر دی:

﴿اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِیْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰیٰتِنَا عَجَبًا ۝ اِذْ اَوَى الْفِتْیَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَاۤ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّ هَیِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝ فَضَرَبْنَا عَلٰۤى اٰذَانِهِمْ فِی الْكَهْفِ سِنِیْنَ عَدَدًا ۝ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْۤا اَمَدًا ۝ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّهُمْ فِتْیَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنٰهُمْ هُدًى ۝ وَّ رَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا ۝ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ لَوْ لَا یَاْتُوْنَ عَلَیْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَیِّنٍ ؕ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى

Marfat.com

عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ﴿١٥﴾ وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ
رَّحْمَتِهٖ وَ يُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ﴿١٦﴾ وَ تَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ
الْيَمِيْنِ وَ اِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَ هُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنْ يَّهْدِ
اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿١٧﴾ وَ تَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّ هُمْ رُقُوْدٌ ۖۗ وَّ
نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ ذَاتَ الشِّمَالِ ۖۗ وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ؕ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ
لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّ لَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ﴿١٨﴾ وَ كَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ؕ قَالَ قَآئِلٌ
مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ؕ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ؕ فَابْعَثُوْۤا اَحَدَكُمْ
بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَاۤ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَ لْيَتَلَطَّفْ وَ لَا
يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ﴿١٩﴾ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَ لَنْ تُفْلِحُوْۤا
اِذًا اَبَدًا ﴿٢٠﴾ وَ كَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْۤا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚۤ اِذْ
يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ؕ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰۤى
اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ﴿٢١﴾ سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ
كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ؕ قُلْ رَّبِّيْۤ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ
اِلَّا قَلِيْلٌ ۬ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۪ وَّ لَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿٢٢﴾ وَ لَا تَقُوْلَنَّ
لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿٢٣﴾ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۫ وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَ قُلْ عَسٰۤى اَنْ يَّهْدِيَنِ
رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿٢٤﴾ وَ لَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَ ازْدَادُوْا تِسْعًا ﴿٢٥﴾ قُلِ اللّٰهُ
اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اَبْصِرْ بِهٖ وَ اَسْمِعْ ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ ۫ وَّ لَا
يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا ﴿٢٦﴾ وَ اتْلُ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ۫ وَ لَنْ تَجِدَ مِنْ
دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿٢٧﴾ وَ اصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَ لَا
تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَ اتَّبَعَ
هَوٰىهُ وَ كَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿٢٨﴾ وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۫ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ اِنَّاۤ
اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ؕ وَ اِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ؕ
بِئْسَ الشَّرَابُ ؕ وَ سَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿٢٩﴾ (الكهف: ٩-٢٩)

Marfat.com

”کیا تم نے یہ گمان کرلیا ہے کہ اصحاب کہف ورقیم کا معاملہ ہماری نشانیوں میں سے کوئی عجیب (معاملہ) ہے جب کہ چند نوجوان پہاڑ کے غار میں پناہ گیر ہوگئے تھے اور یہ دعا مانگ رہے تھے اے ہمارے پروردگار! تو اپنے پاس سے ہم کو رحمت عطا کر اور ہمارے لیے رشد وہدایت مہیا کر پھر ہم نے غار میں چند سال تک کے لیے ان کو تھپک کر سلا دیا، پھر ان کو اٹھایا (بیدار کیا) تا کہ ہم جان لیں کہ دونوں (بستی والوں اور غار والوں) میں سے کس نے ان کی مدت کا صحیح اندازہ لگایا، ہم تجھ کو ان کا صحیح اور سچا واقعہ بتائے دیتے ہیں، بیشک وہ چند نوجوان تھے جو اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے تھے اور ہم نے ان کو ہدایت کی روشنی اور زیادہ عطاء کردی تھی اور جب وہ (حاکم وقت کے سامنے) یہ اعلان کرنے پر کمربستہ ہوگئے کہ ہمارا پروردگار وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے اور ہم ہرگز اس کے علاوہ کسی کو خدا نہیں پکار سکتے اور اگر ایسا کریں تو خدا پر بہتان باندھیں گے، اس وقت ہم نے ان کے دل خوب مضبوط کردیے تھے وہ کہتے تھے کہ یہ ہماری قوم ہے جنہوں نے اللہ کے ماسوا بہت سے معبود بنا لیے ہیں۔ یہ کیوں کھلی دلیل اپنے معبودانِ باطل (کی صداقت) کے لیے نہیں لاتے پس اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹی تہمت لگائے اور اے رفیقو! جب تم ان سے اور ان کی عبادت سے جو اللہ کے سوا وہ باطل معبودوں کی کرتے ہیں علیحدگی اختیار کرتے ہو تو پہاڑ کے غار میں چلے چلو تمہارا پروردگار اپنی رحمت نچھاور کرے گا اور تمہارے معاملہ میں سہولت کار پیدا کرے گا اور اے پیغمبر! تم سورج کو دیکھو گے کہ وہ نکلتے وقت ان کے غار سے داہنی جانب بچ کر نکل جائے گا اور ڈوبتے وقت غار سے کترا کر بائیں جانب کو ہوجاتا ہے اور وہ کشادہ غار میں ہیں یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے جس کو وہ ہدایت دے وہی راہ یاب ہے اور جس شخص کو اس کی مسلسل سرکشی کی بنا پر گمراہ کرے تو اس کے لیے کسی راہ دکھانے والے مددگار کو نہ پائے گا اور تو ان کو بیدار گمان کرے گا حالانکہ وہ سو رہے ہوں گے اور ہم ان کی کروٹیں بدلتے رہتے ہیں داہنے بھی اور بائیں بھی اور ان کا کتا اپنے اگلے ہاتھ پھیلائے غار کے منہ پر بیٹھا ہوا ہے اگر تو ان کو جھانک کر دیکھے تو ان کی اس شان اور حالت کو دیکھ کر مرعوب ہوجائے اور بھاگ پڑے اور اسی طرح ہم نے ان کو اٹھا دیا جگا دیا تا کہ آپس میں پوچھ گچھ کریں۔ ایک نے ان میں سے کہا تم غار میں کب سے ہو؟ دوسروں نے جواب دیا ایک دن یا دن کے کچھ حصہ سے۔ پھر انہوں نے کہا تمہارا پروردگار ہی خوب جانتا ہے کہ تم یہاں کتنی مدت سے ہو تو (اب یہ کرو کہ) اپنے میں سے کسی ایک کو شہر میں یہ سکہ دے کر بھیجو کہ وہ تمہارے لیے دیکھ بھال کر عمدہ قسم کا کھانا لائے اور اس کو چاہیے کہ بہت ہی رازدارانہ طریقہ پر جائے اور ہرگز کسی کو اطلاع نہ ہونے دے کہ ہم یہاں مقیم ہیں اس لیے کہ اگر ان پر تمہارا معاملہ منکشف ہوگیا تو وہ تم کو سنگسار کردیں گے یا تم کو زبردستی اپنے دین کی جانب لوٹانے پر مجبور کریں گے اور اس وقت تم ہرگز کامیاب نہ رہو گے (نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں) اور اسی طرح ہم نے شہر والوں پر ان کا معاملہ ظاہر کردیا تا کہ وہ یہ یقین کرلیں کہ خدا کا وعدہ سچا ہے اور قیامت کی گھڑی ضرور آنے والی ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے ہم نے ان کو اس وقت اس معاملہ کی اطلاع دی جب کہ وہ قیامت کے وجود وعدم پر آپس میں اختلاف کررہے تھے پھر وہ کہنے لگے کہ ان اصحاب کہف پر قبہ تعمیر کردو ان کا پروردگار ان کے حال کا خوب واقف کار ہے، یعنی ان سے کوئی تعرض نہ کرو، ان لوگوں نے جو برسر حکومت تھے کہا ہم تو ان کے غار پر ایک مسجد (ہیکل) تعمیر کریں گے اے پیغمبر کچھ لوگ

کہیں گے وہ تین آدمی ہیں چوتھا ان کا کتا ہے کچھ لوگ ایسا بھی کہتے ہیں نہیں پانچ ہیں چھٹا ان کا کتا ہے یہ سب اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں بعض کہتے ہیں سات ہیں آٹھواں ان کا کتا ہے۔ (اے پیغمبر ﷺ!) کہہ دے ان کی اصل گنتی تو میرا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کیونکہ ان کا حال بہت کم لوگوں کے علم میں آیا ہے اور تو لوگوں سے اس بارہ میں نزاع نہ کر مگر صرف اس حد تک کہ صاف صاف بات میں ہو (یعنی باریکیوں میں نہیں پڑنا چاہیے کہ کتنے آدمی تھے کتنے دنوں تک رہے تھے) اور نہ ان لوگوں میں سے کسی سے اس بارے میں کچھ دریافت کر اور ہرگز کسی چیز کے متعلق یہ نہ کہنا کہ میں کل کو یہ ضرور کرنے والا ہوں مگر (یہ کہہ کر) کہ ہوگا وہی جو اللہ چاہے گا اور جب کبھی بھول جاؤ تو اپنے پروردگار کی یاد تازہ کر تو کہہ دو "امید ہے میرا پروردگار اس سے بھی زیادہ کامیابی کی راہ مجھ پر کھول دے گا"۔ اور کہتے ہیں وہ غار میں تین سو برس تک رہے اور لوگوں نے نو برس اور بڑھا دیئے ہیں۔ (اے پیغمبر!) تو کہہ دے اللہ ہی بہتر جانتا ہے وہ کتنی مدت تک رہے وہ آسمان و زمین کی ساری پوشیدہ باتیں جاننے والا ہے بڑا ہی دیکھنے والا بڑا سننے والا ہے کہ اس کے سواء لوگوں کا کوئی کارساز نہیں اور نہ وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک کرتا ہے"۔

کہف ورقیم:

لغت میں کہف پہاڑ کے اندر وسیع غار کو کہتے ہیں مگر رقیم کے معنی میں مفسرین کو سخت تردد ہے اور ضحاک اور سدی جو ہر ایک تفسیری روایت کو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی جانب ضرور منسوب کر دیا کرتے ہیں۔ اس مقام پر بھی حضرت عبداللہ بن عباس سے متعدد اقوال نقل کرتے ہیں:

یہ رقم سے مشتق ہے اور رقیم بمعنی مرقوم (مکتوب) ہے چونکہ بادشاہ وقت نے ان کی تلاش کے بعد ان کے نام پتھر کی ایک تختی پر کندہ کر دیئے تھے اس لیے ان کو اصحاب رقیم بھی کہا جاتا ہے، سعید ابن جبیر اس کی تائید میں ہیں اور مفسرین کے یہاں یہی قول مشہور ہے۔

یہ وادی کا نام ہے جہاں پہاڑ میں وہ غار تھا جس میں اصحاب کہف روپوش ہوئے تھے۔ قتادہ، عطیہ، عوفی اور مجاہد بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔

یہ اس پہاڑ کا نام ہے جس میں غار تھا۔

عکرمہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو یہ کہتے سنا ((ما ادری ما الرقیم کتاب ام بنیان)) میں نہیں کہہ سکتا کہ رقیم سے کندہ تختی مراد ہے یا شہر مراد ہے۔

بروایت کعب احبار، وہب بن منبہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ یہ ایلہ (عقبہ) کے قریب ایک شہر کا نام ہے، یہ بلاد روم میں واقع ہے۔

تاریخ اور اثری تحقیقات کے پیش نظر یہ آخری قول ہی صحیح اور قرآن عزیز کے بیان کے مطابق ہے اور باقی اقوال محض قیاسی ہیں۔

Marfat.com

اس اجمال کی تفصیل کے لیے تاریخ اور علم الآثار کے چند اوراق کا مطالعہ ضروری ہے، اصل یہ ہے کہ یہ واقعہ بعثت مسیح علیہ السلام سے کچھ زمانہ بعد کا ہے اور انباط کے قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے یہ انباط کون ہیں؟ اور ان کا مسکن و موطن کہاں ہے؟ یہی وہ گتھی ہے جس کے سلجھ جانے پر حقیقت روشن ہو سکتی ہے۔

مؤرخین عرب انباط کے متعلق عموماً یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ عجمی النسل ہیں اور اسی لیے وہ نبطی کو عربی کا مقابل قرار دیتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں ہے اور عرب مؤرخین کے مختلف تاریخی مقولے اور توراۃ اور رومی و یونانی تاریخیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ نبطی خالص عربی اور اسماعیلی النسل ہیں مگر بدویانہ زندگی ترک کر دینے اور حجاز سے نکل کر دوسرے علاقوں میں بس جانے کی وجہ سے یہ عربوں کے لیے اجنبی ہو گئے حتیٰ کہ خود بھی یہ بھول گئے کہ عرب سے ان کو کیا نسبت ہے؟ اسی بناء پر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا مشہور مقولہ ہے:

تعلموا النسب ولا تکونوا کنبط السواد اذا سئل احدھم عن اصلہ قال من قریۃ کذا۔

"اپنے نسب کو سیکھو عراق کے نبط کی طرح نہ بن جاؤ کہ جب ان میں سے کسی سے دریافت کیا جائے کہ تم کس خاندان سے ہو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم فلاں شہر کے ہیں"۔

لیکن "انباط" کی بحث کو چھوڑ کر جب مؤرخین عرب سے دریافت کیا جائے کہ نبط یا نابت کون ہے تو وہ بغیر کسی اختلاف کے فوراً یہ جواب دیں گے "ابن اسمٰعیل علیہ السلام" کیونکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارہ لڑکوں میں سے بڑے کا نام نابت یا نبط ہے، چنانچہ ابن کثیر اپنی تاریخ میں نابت کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

ثم جمیع عرب الحجاز علی اختلاف قبائلھم یرجعون فی انسابھم الی ولدیہ نابت و قیدار و کان الرئیس بعدہ والقائم بالامور الحاکم فی مکۃ والنظار فی امر البیت و زمزم نابت بن اسمٰعیل وھو ابن اخت الجرھمیین ثم تغلب جرھم علی البیت طمعًا فی بنی اختھم فحکموا بمکۃ وما والاھا عوضا عن بنی اسمٰعیل مدۃ طویلۃ فکان اوّل من صار الیہ امر البیت بعد نابت مضاض بن عمرو بن سعد بن الرقیب بن عبید بن نابت۔ ❶

"تمام حجازی عرب کے مختلف قبائل کا نسب حضرت اسمٰعیل کے دو صاحبزادوں نابت اور قیدار پر ختم ہوتا ہے اور اسمٰعیل علیہ السلام کے بعد ان کا جانشین نابت ہوا وہی تمام امور کا والی مکہ کا حاکم، زمزم اور کعبہ کا متولی قرار پایا اور یہ بنی جرہم کا بھانجا تھا پس بنی جرہم اس تعلق کی وجہ سے اس کے بعد عرصہ تک مکہ پر حاکم و قابض رہے اور اطراف مکہ پر بھی انہی کی حکومت رہی مدت دراز کے بعد نابت کی پانچویں پشت میں سے ایک شخص مضاض نے دوبارہ مکہ کی حکومت اور بیت اللہ کی تولیت کو بنی جرہم کے قبضہ سے نکال کر اپنے ہاتھ میں لی"۔

---

❶ البدایہ والنہایہ ج ۲

Marfat.com

مگر اس کے آگے عرب مؤرخین عام طور پر اس بارے میں خاموش ہیں کہ جب نابت بن اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل کثرت سے بڑھی تو کیا وہ صرف حجاز ہی کے اندر محدود رہی یا اطراف و جوانب میں پھیلی اور اگر ادھر ادھر گئی تو اس کا سلسلہ کہاں تک پھیلا۔ البتہ ابن خلدون نے اس سے متعلق معلومات میں کچھ اضافہ کیا ہے، وہ کہتا ہے:

"نابت بن اسمٰعیل بیت اللہ کا متولی ہوا اور مکہ میں اپنے بھائیوں کے ساتھ مقیم رہا تا آنکہ اس کی نسل نے اس درجہ ترقی کی کہ وہ مکہ میں نہ سما سکے اور حجاز کے اطراف و جوانب تک میں پھیل گئے"۔ [1]

لیکن توراۃ نے اس سلسلہ میں مختلف مقامات پر جو کچھ کہا ہے وہ اصل گتھی کو سلجھانے میں بہت زیادہ مدد و معاون ثابت ہوتا ہے اس نے شروع میں تو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کی فہرست دی ہے اور اس کے بعد اس نے یہ بتایا ہے کہ خاندان نابت سائیر (کوہ سراط) یعنی حجاز سے شام کے علاقوں تک پھیلا ہوا ہے اور ایلہ (عقبہ) تک ان کا قبضہ ہے توراۃ میں نابت کا تلفظ بھی مختلف طریقوں سے مذکور ہے کہیں بنیت ہے تو کہیں نبیط اور کہیں نبایوط۔

توراۃ کے حوالہ جات یہ ہیں:

"یہ اسماعیل کے بیٹوں کے نام ہیں مطابق ان کے ناموں اور نسبتوں کی فہرست کے اسمٰعیل کا پہلو ٹھا نبیت اور قیدار اور ادبئیل اور بیسام اور مسماع اور دومہ اور مشا اور حدر اور تیمہ اور اطور اور نفیس اور قدماہ"۔ [2]

یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی میں یروشلم کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے:

"اور قوموں کی دولت تیرے (یروشلم) کے پاس فراہم ہوگی اونٹوں کی قطاریں اور مدیان اور عنیفہ کی سانڈنیاں تیرے گرد آ کے جمع ہوں گی وہ سب جو سبا کے ہیں آئیں گے۔ قیدار کی ساری بھیڑیں تیرے پاس جمع ہوں گی۔ نبیت کے مینڈھے تیری خدمت میں حاضر ہوں گے"۔ [3]

اور حزقیل نے نبی کے صحیفہ میں ہے:

"بنایوط (نابت) کی بھیڑیں نذر لی جائیں گی"۔ [4]

اور سفر تکوین میں خاندان نابت کا علاقہ سکونت یہ بتاتے ہیں:

"اور وہ حویلہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اس راہ میں ہے جس سے آشور کو جاتے ہیں بستے تھے ان کا قطعہ زمین ان کے سب بھائیوں کے سامنے پڑا تھا"۔ [5]

ان حوالجات کی تفصیل و تشریح کے لیے اب اگر ان رومی مؤرخین کی شہادات بھی شامل کر لی جائیں جو نبطیوں (انباط) کے معاصر ہیں تو یہ بات بالکل ہی صاف ہو جاتی ہے کہ انباط اور بنو نابت بن اسمٰعیل علیہ السلام ایک ہی ہیں اور یہ کہ انہوں نے غیر متمدن زندگی کو چھوڑ کر متمدن زندگی اختیار کر لی تھی۔

یوسیفوس جو پہلی صدی عیسوی میں ہو گزرا ہے اور انباط کا معاصر بھی ہے لکھتا ہے:

---

[1] جلد ثانی [2] تکوین باب ۲۵ آیات ۱۳-۱۴ [3] باب ۲۱ آیت ۱۴
[4] باب ۲۵ آیت ۱۸ [5] باب ۲۵ آیت ۱۸

Marfat.com

"ملک بحر احمر سے نہر فرات تک اسمٰعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کے قبضہ میں ہے جن کے سبب سے ان کا نام بنو طینہ (Nabatena) پڑ گیا ہے اس کی سرحد (مغرب میں) مصر اور عرب سنگستان (Petana) مل گئی ہے، اور بہت سے بیابانوں اور بلند و فراز زمینوں کو شامل ہے جو مشرق کی طرف خلیج فارس تک منتہی ہوتی ہے عموماً اس ملک کے باشندوں کا نام بنایوط عرب (Nelayotn) ہے"۔ ❶

اور ڈائڈ روس ۸۰ ق م بیان کرتا ہے:

"انباط خلیج ایلہ (عقبہ) پر رہتے ہیں"۔ ❷

اور دوسری جگہ لکھتا ہے:

"اوپر گزرتے ہوئے تم خلیج عقبہ (ایلہ) میں داخل ہو گے جس کے حدود پر ان عربوں کی بہت سی آبادیاں ہیں جن کو لوگ نبط کہتے ہیں"۔ ❸

اور آثار اور کتبات میں نبط کا نام سب سے پہلے ۷۰۰ ق م میں نظر آتا ہے جب کہ آشور بنی پال شاہ اسیریا کے کتبہ میں وہ اپنے مفتوحین کی فہرست میں ناتان شاہ نبط کا تذکرہ کرتا ہے۔ ❹

ان تفاصیل کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت بالکل آشکارا ہو جاتی ہے کہ ایلہ (عقبہ) کی خلیج سے شام تک اور سواحل مصر سے خلیج فارس تک جو قوم مسطورہ بالا حوالجات میں برسر اقتدار نظر آتی ہے وہ نابت بن اسمٰعیل ہی کی نسل ہے جو نبط، انباط، بنایوط اور نبیت کے ناموں سے پکاری جاتی رہی ہے۔

البتہ ایک بات طبیعت میں ضرور کھٹکتی ہے اور وہ یہ کہ نابت بن اسمٰعیل علیہ السلام کی جس نسل سے توراۃ اور رومی مؤرخین اس تفصیل کے ساتھ واقف ہوں وہ عرصہ دراز کے بعد اپنے بھائیوں (اہل عرب) کی نگاہ میں کیوں اجنبی ہو گئی بلکہ خود نبطی یہ کیوں بھول گئے کہ وہ خالص عربی النسل اور اسمٰعیل (علیہ السلام) کی اولاد ہیں سو اس کے متعلق یاقوت حموی کے ایک جملہ سے بآسانی جواب دیا جا سکتا ہے۔ یاقوت (عربہ) کے عنوان میں بحث کرتے ہوئے یہ بیان کرتا ہے:

اما النبط فکل من لم یکن راعیًا او جندیا عند العرب من ساکن الارضین.

"اہل عرب دنیا کے ہر اس انسان کو نبطی کہہ دیتے ہیں جو چرواہا یا سپاہی نہ ہو"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حجاز سے نکل کر مدت مدید کے بعد چونکہ نبطیوں نے بدویانہ، سپاہیانہ زندگی چھوڑ کر متمدن شہریوں کی زندگی اختیار کر لی تھی اس لیے آہستہ آہستہ اہل عرب کی نگاہ میں بنی نابت اجنبی ہو گئے اور وہ ان کو بھی عجمی حکمرانوں کی طرح سمجھنے لگے لہٰذا ان کے طریق بود و ماند معاشرتی تمدن اور اختلاف احوال نے ان حجازیوں سے الگ کر کے ان ہی کے بھائیوں کی نگاہ پر ان کے حجابی پردے ڈال دیئے۔

---

❶ ماخوذ از گولڈ کائس آف رین ص ۲۲۵ انٹی ۱۲ (ارض القرآن ج ۲)

❷ ارض القرآن ج ۲ ص ۶۱، ماخوذ از گولڈ کائس آف مدن ص ۲۲۵ اینٹی (۱۲)

❸ ایضاً ج ۲ ص ۶۰ ❹ ایضاً ج ۲ ص ۶۰

مؤرخین کے نزدیک انباط کا رقبہ حکومت تین مختلف العہد قوموں کے دائرۂ حکومت پر حاوی تھا یعنی ① ثمود کا ملک "وادی قریٰ" اس کا دارالحکومت مشہور شہر حجر تھا۔ ② ملک مدین اس کا دارالحکومت خود شہر مدین ہی تھا۔ ③ ملک ادوم اس کا دارالحکومت رقیم تھا۔ [1]

انباط کا زمانہ حکومت ۷۰۰ ق م سے شروع ہو کر ۱۰۶ تک ختم ہو جاتا ہے، اوائل صدی عیسوی میں رومیوں نے ان پر لشکر کشی کر کے اور شکست دے کر رقیم اور اس کے پورے علاقہ پر قبضہ کر لیا تھا اور انباط کے پاس صرف حجر کا علاقہ باقی رہ گیا تھا جو ۱۰۶ء میں جب ان کے ہاتھ سے نکل گیا تو انباط کی حکومت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا، رومیوں نے رقیم پر قبضہ کرنے کے بعد جب اس کو اپنی تمدنی، سیاسی اور معاشرتی ترقیوں کا مرکز بنایا تو اس کا پرانا نام بدل کر پیٹرا رکھا۔

یہی وہ رقیم ہے جس کا ذکر اصحاب کہف کے واقعہ میں قرآن عزیز نے کیا ہے: ﴿ اَمۡ حَسِبۡتَ اَنَّ اَصۡحٰبَ الۡكَهۡفِ وَالرَّقِيۡمِ ۙ كَانُوۡا مِنۡ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝ ﴾ اور یہی وہ شہر ہے جس کے کچھ سعادت مند انسان بت پرستی سے نفور ہو کر اور بت پرست حکمرانوں کے ظلم وجور سے محفوظ رہنے کی خاطر اس شہر کے پہاڑ کے ایک غار میں چھپ رہے تھے۔ پس حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ ارشاد کہ رقیم "ایلہ" کے قریب شہر تھا اور یہ کہ وہ روم کے علاقہ میں تھا بالکل صحیح اور قرآن اور تاریخ دونوں کے عین مطابق ہے۔ بلاشبہ وہ ایلہ (خلیج عقبہ) کے قریب واقع تھا اور چونکہ رومیوں نے اس پر قبضہ کر لیا تھا اس لیے اس کو روم کے علاقہ میں شمار کرنا قطعاً درست ہے۔

مگر حیرت ہے اس تاریخی انقلاب پر کہ جب رومیوں نے انباط کے اس مرکزی شہر کا نام پیٹرا رکھ دیا تو اس نام نے تھوڑے ہی دنوں میں اس درجہ شہرت حاصل کر لی کہ عرب اور عجم نے اس کے سیناؤں اور فنون لطیفہ کی نیرنگیوں سے متاثر ہو کر اس کا اصل نام بالکل فراموش کر دیا اور ان کے لیے چند صدیوں ہی میں رقیم ایک اجنبی اور غیر معلوم نام ہو گیا حتیٰ کہ اہل عرب نے بھی اس کو بطرا ہی کے نام سے یاد رکھا اور نتیجہ یہ نکلا کہ جب قرآن نے اس کا اصل نام بیان کیا تو دوسروں کی طرح اہل عرب بھی حیران تھے کہ رقیم غار کا نام ہے یا لوہے کی تختی کا یا پہاڑ کا یا شہر کا لیکن جس نام کو انباط کے بھائیوں (حجازیوں) نے بھلا دیا تھا اس کو توراۃ نے اپنی سند میں محفوظ رکھا تا کہ جب نبی امی "وحی کے ذریعہ" اصل حقیقت کا اعلان کرے تو وہ اس کی تائید کے لیے خود کو پیش کر سکے۔ [2]

گزشتہ جنگ عظیم کے بعد آثار قدیمہ کی تحقیقات نے جہاں اور بعض جدید انکشافات کیے ہیں ان میں سب سے نمایاں اسی شہر رقیم (پیٹرا یا بطرا) کی دریافت ہے اور اس کے متعلق جس قدر اثری تحقیق کی جا رہی ہے اس سے قرآن عزیز کی حرف بہ حرف تصدیق ہوتی جاتی ہے۔

خلیج عقبہ (ایلہ) سے شمال کی جانب بڑھتے ہوئے پہاڑوں کے دو متوازی سلسلے ملتے ہیں ان ہی میں سے ایک پہاڑ کی بلندی پر انباط کا دارالحکومت رقیم آباد تھا۔

اس شہر کی موجودہ زمانہ میں جو اثری پیمائش کی جا رہی ہے اس میں نئے نئے انکشافات کے ساتھ اس کے پہاڑوں کے عجیب وغریب "غار" بھی قابل ذکر ہیں، یہ غار بہت وسیع اور دور دور تک چلے گئے ہیں اور اس طرح واقع ہیں کہ دن کی دھوپ اور تپش ان تک نہیں پہنچتی۔ ایک غار ایسا بھی دریافت ہوا ہے کہ جس کے دہانہ پر قدیم عمارتوں کے آثار پائے جاتے ہیں اور بہت سے

---

[1] ادوم کا علاقہ اوّل عیسو بن اسحاق (علیہ السلام) کے قبضہ میں تھا جیسا کہ ادملہ کے ذکر میں قصص القرآن جلد دوم میں ذکر ہو چکا ہے۔

[2] توراۃ سفر عدد اور صحیفہ یسعیاہ میں اس شہر کا نام راقیم بیان کیا گیا ہے۔ دائرۃ المعارف (عرب)

ستونوں کے کھنڈر باقی رہ گئے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ کسی ہیکل کی عمارت ہے۔

اس صاف اور بے لاگ اثری اور تاریخی شہادتوں کے بعد یہ کہنا بہت آسان ہو جاتا ہے کہ قرآن عزیز نے جب اصحاب کہف کا واقعہ بیان کیا ہے وہ اسی شہر رقیم سے تعلق رکھتا ہے۔

واقعہ:

اسماعیلی عربوں کے مذہب سے متعلق تاریخ کے صفحات یہ شہادت دیتے ہیں کہ ان میں گو کچھ عرصہ باپ دادا کا دین حق "ملت ابراہیم" باقی رہا مگر آہستہ آہستہ مصر، شام اور عراق کے صنم پرستوں کے تعلقات نے عمرو بن لحی کے ذریعہ ان میں بت پرستی اور ستارہ پرستی کی داغ بیل ڈال دی اور کچھ عرصہ بعد ان عربوں کو شرک پرستی میں ایسا ید طولیٰ حاصل ہو گیا کہ وہ دوسروں کے لیے پیش رو بن گئے چنانچہ نابت کی اولاد بھی شرک کی گمراہی میں مبتلا تھی اور ان کے مشہور بت ذوالشریٰ لات، منات، ہبل، کسعہ، عمیانس اور حریش تھے۔ ✿ صدیوں تک نبطی بت پرستی کی اس گمراہی میں مبتلا رہے کہ مسیحی دور کے اوائل میں دارالحکومت رقیم کے اندر ایک عجیب معاملہ پیش آیا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

مسیحی مذہب کا ابتدائی دور ہے نبطی حکومت کے اطراف یعنی شام وغیرہ میں عیسائیت کا زور ہے کہ رقیم کی چند نوجوان سعید روحیں شرک سے بیزار اور نفور ہو کر توحید کی جانب مائل ہو جاتی اور اور دین عیسوی کو قبول کر لیتی ہیں شدہ شدہ یہ بات بادشاہ وقت تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ بادشاہ نوجوان کو دربار میں بلاتا اور انکشاف حال چاہتا ہے، نوجوان کلمہ حق بلند کرنے میں بے باک اور جری ثابت ہوتے ہیں یہ بات بادشاہ کو ناگوار گزرتی ہے مگر وہ دوبارہ معاملہ پر غور کرنے کے لیے ان کو چند روز کی مہلت دیتا ہے یہ دربار سے واپس آ کر آپس میں مشورہ کرتے ہیں اور طے پاتا ہے کہ خاموشی کے ساتھ کسی پہاڑ کے غار میں پوشیدہ ہو جانا چاہیے تاکہ مشرکوں کے شر سے محفوظ رہ کر عبادت الٰہی میں مشغول رہ سکیں۔ یہ سوچ کر وہ ایک غار میں پوشیدہ ہو جاتے ہیں۔ جب وہ غار میں داخل ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان پر نیند طاری کر دیتا ہے اور وہ خواب ہی کی حالت میں کروٹیں بدلتے رہتے ہیں۔ غار کی عجیب کیفیت ہے، اندر سے بہت وسیع ہے مگر قدرت نے اس کو ایسا موقع نصیب کیا ہے کہ زندگی کی بقاء کے قدرتی سامان وہاں سب موجود ہیں، ایک طرف دھانہ ہے تو دوسری جانب ہوا گزرنے کے منفذ اور سوراخ ہیں جن کی وجہ سے ہر وقت تازہ ہوا اندر آتی جاتی رہتی ہے۔ غار شمال وجنوب رویہ ہے اس لیے طلوع وغروب کے وقت آفتاب کی تپش اندر نہیں پہنچ پاتی مگر ہلکی ہلکی روشنی برابر پہنچتی رہتی ہے اور ایسی کیفیت پیدا ہو گئی ہے کہ نہ تاریکی ہی ہے کہ کچھ نظر نہ آئے اور نہ اتنی روشنی ہے کہ کھلے میدان کی طرح جگہ روشن ہو جائے۔ اس حالت میں چند انسان اس غار میں خواب آلود ہیں اور ان کا رفیق کتا اپنے اگلے ہاتھ پھیلائے غار کے دھانہ پر باہر کی جانب منہ کیے بیٹھا ہے۔

اس مجموعی صورت حال نے ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے کہ پہاڑوں کے درمیان غار کے اندر جھانکنے والے انسان پر خوف و ہراس کی حالت طاری ہو جاتی ہے اور وہ بھاگ کھڑے ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

برسوں تک یہ نوجوان اسی حالت میں آرام کے ساتھ محفوظ رہتے ہیں کہ شہر میں انقلاب ہو جاتا ہے رومی عیسائی نبطی حکومت

✿ کتاب الاصنام لابن الکلبی

Marfat.com

پرحملہ آور ہوتے ہیں اور دشمن کو شکست دے کر اس پر قابض ہو جاتے ہیں اور اس طرح رقیم (پیٹرا) عیسائیت کے آغوش میں آ جاتا ہے۔ اب خدا کی مشیت فیصلہ کرتی ہے کہ یہ نوجوان بیدار ہوں، وہ بیدار ہو جاتے ہیں اور آپس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے ایک دوسرے سے دریافت کرتے ہیں کہ ہم کتنی مدت سوتے رہے؟ ایک نے جواب دیا کہ ایک دن اور دوسرے نے کہا یا دن کا بھی کچھ حصہ۔ پھر کہنے لگے کہ ہم میں سے کوئی شہر جا کر کھانا لے آئے اور یہ سکہ لے جائے مگر جو بھی جائے اس طرح لین دین کرے کہ شہر والوں کو پتہ نہ لگ سکے کہ ہم کون ہیں اور کہاں ہیں؟ ورنہ مصیبت آ جائے گی۔ بادشاہ ظالم بھی ہے اور مشرک بھی، وہ یا تو شرک پر آمادہ اور بے دینی پر مجبور کرے گا اور یا ہم سب کو قتل کر ڈالے گا اور یہ باتیں ہمارے دین و دنیا کو برباد کر دینے والی ثابت ہوں گی۔

اب نوجوانوں میں سے ایک شخص سکہ لے کر شہر گیا، وہاں دیکھا تو حالات بالکل بدل چکے ہیں اور نئے آدمی اور نیا طور و طریقہ نظر آ رہا ہے، مگر پھر بھی وہ ڈرتے ڈرتے ایک باورچی کی دوکان پر پہنچا اور کھانے پینے کی چیزیں خریدیں، جب قیمت ادا کرنے لگا تو باورچی نے دیکھا کہ سکہ قدیم ہے اس طرح آخر بات کھل گئی لوگوں کو جب اصل حقیقت معلوم ہوئی تو انہوں نے اس شخص کا خیر مقدم کیا اور اس عجیب و غریب معاملہ سے بہت زیادہ دلچسپی لی کیونکہ عرصہ ہوا کہ یہاں مشرک بادشاہوں کا دور ختم ہو چکا تھا اور یہاں کے باشندوں نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔

اس شخص نے جب یہ حال دیکھا تو اگرچہ عیسائیت پھیل جانے سے اس کو بے حد خوشی ہوئی مگر اپنے اور اپنے رفیقوں کے لیے یہی پسند کیا کہ دنیا کے ہنگاموں سے علیحدہ رہ کر یاد خدا میں گزار دیں اس لیے کسی طرح مجمع سے جان بچا کر پہاڑ کی راہ لی اور اپنے رفقاء میں پہنچ کر سب حال کہہ سنایا۔ ادھر شہریوں میں ان کی جستجو کا شوق پیدا ہوا اور انہوں نے آخر ان کو ایک غار میں پا لیا۔ لوگوں نے اصرار کیا کہ وہ شہر چلیں اور اپنی پاک زندگی سے اہل شہر کو فائدہ پہنچائیں مگر وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہوئے اور انہوں نے اپنی عمر کا باقی حصہ راہبانہ زندگی کے ساتھ اسی غار میں گزار دیا۔

جب ان مردانِ خدا راہبوں کا انتقال ہو گیا تو اب لوگوں میں چرچا ہوا کہ ان کی یادگار قائم ہونی چاہیے۔ چنانچہ ان میں جو حضرات ذی اثر اور با اقتدار تھے انہوں نے کہا کہ ہم تو ان کے غار پر ہیکل (مسجد) تعمیر کریں گے اور غار کے دہانہ پر ایک عظیم الشان ہیکل تعمیر کرا دیا۔ ①

اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ جب اس جوان کے پیچھے بادشاہ وقت اور پبلک دونوں آئے تو غار کے قریب پہنچ کر وہ یہ نہ معلوم کر سکے کہ جوان کس جانب چلا گیا اور جب بہت جستجو کے بعد بھی اصحاب کہف کا پتہ نہ پا سکے تب مجبور ہو کر واپس گئے اور ان کی یاد میں پہاڑ پر ایک ہیکل (مسجد) تعمیر کر دیا۔

واقعہ کی تاریخی حیثیت:

ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور دیگر بزرگوں کی نقول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے کچھ زمانہ بعد کا ہے یعنی ابتداء دور مسیحی کا واقعہ ہے مگر مجھ کو اس قول میں یہ تردد ہے کہ محمد بن اسحٰق کی اس روایت

① فتح الباری ج اول حدیث غار و تفسیر ابن کثیر ج ۲ سورۂ کہف البدایہ والنھایہ ج ۲

Marfat.com

سے جو اس واقعہ کے شانِ نزول سے متعلق ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصحابِ کہف کے بارے میں قریش مکہ کو یہود نے تعلیم کیا تھا کہ وہ دوسرے سوالوں کے ساتھ ایک سوال یہ بھی کریں اور یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ اس واقعہ کے ساتھ یہود کو خاص دلچسپی تھی پس اگر یہ واقعہ عیسائیت کی ترقی سے متعلق تھا تو یہود کو اس کے ساتھ دلچسپی کے کیا معنی کیونکہ یہودیت اور عیسائیت تو نبرد آزما اور حریف جماعتیں ہیں اس سے راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت مسیح علیہ السلام سے بہت پہلے یہودی دور سے متعلق ہے۔ ❶

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ سوال اگرچہ اہمیت رکھتا ہے لیکن تاریخی سندات اس کی تائید نہیں کرتیں بلکہ خلاف فیصلہ کرتی ہیں اس لیے کہ یہ مسلم ہے کہ واقعہ زیر بحث شہر رقیم میں پیش آیا ہے اور یہ بھی طے شدہ حقیقت ہے کہ رقیم اپنی آبادی کے وقت سے کبھی یہودیت سے متاثر نہیں ہوا بلکہ نبطی دور میں بت پرستی کا گہوارہ رہا اور اس کے بعد رومیوں نے جب اس پر قبضہ کر لیا تو وہ عیسائیت کی آغوش میں آ گیا۔ چنانچہ رقیم کی تاریخ ان ہی دو عہدوں سے مبنی ہے تو پھر ایک خاص نکتہ کے پیش نظ محض ظن وتخمین سے کس طرح اس واقعہ کو یہودیت سے متعلق کہا جا سکتا ہے۔ اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ مسیحی مذہب کے ابتدائی دور میں اس قسم کے چند واقعات اور بھی پیش آئے ہیں جن میں مشرک اور بت پرست بادشاہوں کے خوف سے عیسائیوں نے غاروں اور پہاڑوں میں جا کر راہبانہ زندگی اختیار کی ہے چنانچہ ایک واقعہ شہر افسس میں پیش آیا، ایک انطاکیہ میں اور ایک خود روم میں پیش آ چکا ہے۔ لہٰذا قرآن عزیز نے ایک ایسے ہی واقعہ کی خبر دی ہے جو شہر رقیم یا راقیم میں پیش آیا تھا۔

اس بنا پر ابن اسحٰق کی روایت کے متعلق دو باتوں میں سے ایک بات تسلیم کرنی چاہیے، اوّل یہ کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اس روایت میں تین سوالات کا جو ذکر کیا ہے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو سوالات تو صرف یہودی علماء کے بنائے ہوئے تھے اور ان سے مشرکین مکہ قطعاً ناآشنا تھے مگر تیسرے سوال واصحاب کہف کا سوال، سے متعلق خود قریش مکہ کو بھی ایک حد تک علم تھا اس لیے کہ یہ واقعہ ان کے بہت قریب ہی پیش آیا تھا اور اگرچہ وہ رقیم کو بھول گئے تھے لیکن پیٹرا (بطرا) سے وہ بخوبی واقف تھے اور شام کی تجارت کی وجہ سے نبطیوں کے ساتھ ان کا ہر وقت کا واسطہ تھا اور واقعہ بھی کچھ زیادہ طویل عرصہ کا نہ تھا پس ہوسکتا ہے کہ وہ اس واقعہ کی کچھ معمولی باتیں جانتے ہوں اور چونکہ اس کا تعلق اہل کتاب سے تھا اس لیے قریشیوں نے آپ کی صداقت کے امتحان کے لیے بمشورۂ یہود اس کو بھی شامل کر لیا ہو اور چونکہ سوالات بہرحال مشرکین ہی کی جانب سے کیے گئے اس لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اختصار کے طور پر ان تینوں کو ایک ہی اسلوب سے نقل فرما دیا۔

یہ احتمال محض اندھیرے کا تیر نہیں ہے بلکہ قرآن عزیز کے اسلوب بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کیونکہ زیر بحث تینوں سوالات میں سے پہلے اور دوسرے سوالوں کے متعلق قرآن کا اسلوب بیان یہ ہے ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ﴾ ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ﴾ یعنی ان دونوں جگہ سوال کی حیثیت نمایاں کیا ہے مگر تیسرے مسئلہ میں پیرایہ بیان اس سے جدا یہ اختیار کیا گیا ہے ﴿اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا﴾ اس جگہ اگرچہ خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب ہے لیکن مقصود وہی لوگ ہیں جو سوال کر رہے ہیں اور اس واقعہ کی کچھ حقیقت جاننے کی وجہ سے اسے ایک عجیب وغریب واقعہ سمجھتے اور

---

❶ تفسیر ابن کثیر ج ۳ سورۂ کہف البدایہ والنہایہ ج ۲

Marfat.com

نبی اکرم ﷺ سے مزید تفصیلات کے طالب ہیں۔ نیز اسی واقعہ میں قرآن نے یہ بھی کہا ہے کہ جب آپ ﷺ اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ ان کو بتائیں گے تو آپ ان کی تعداد کے بارے میں مختلف چرچے سنیں گے ﴿سَيَقُولُونَ ثَلٰثَةٌ﴾ ﴿يَقُولُونَ خَمْسَةٌ﴾ یہ بھی ثبوت ہے اس امر کا کہ قریش مکہ ضرور اس واقعہ سے قدرے آگاہ تھے اور اسی لیے "الرقیم" کہہ کر قرآن نے اس جانب ان کو توجہ دلائی کہ تم آج جس کا "بطرا" کہہ کر ذکر کرتے ہو وہ دراصل تمہارے ہی بھائیوں کی حکومت کا مرکزی شہر "رقیم" ہے جو تم سے فراموش ہو چکا ہے۔

دوسری بات یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے رومیوں کی فتوحات رقیم وحجر تک نبطیوں کے ہاتھوں یہودیوں کو ہر قسم کی تکالیف پیش آ چکی اور ان کے ساتھ سیاسی و مذہبی حریفانہ نبرد آزمائیاں بھی ہو چکی تھیں۔[1] اس لیے اگرچہ اس واقعہ میں عیسائیت کی صداقت کا ایک پہلو ضرور نکلتا تھا تاہم نبطیوں کی مشرکانہ زندگی اور رومیوں کے ہاتھوں ان کی تذلیل وتحقیر کا پہلو بھی کچھ کم نمایاں نہیں ہوتا تھا جو بہر حال ان کی مسرت کا باعث تھا اور اس لیے غالباً یہود نے اس حیثیت کو نظر انداز کر دیا اور دو سوالوں کے ساتھ اس تیسرے سوال کو بھی خصوصیت کے ساتھ منتخب کیا۔

تفسیری حقائق:

① ﴿اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝﴾

"اے پیغمبر ﷺ! کیا تو خیال کرتا ہے کہ غار اور رقیم ہماری نشانیوں میں سے عجیب نشانی تھے؟"

یعنی جو لوگ اس واقعہ کو خدا کی نشانیوں میں سے بہت زیادہ نشانی سمجھ رہے ہیں تو ان پر یہ ظاہر کر دو کہ میرے خدا کے نشان یوں تو کائنات انسانی کے لیے بلاشبہ عجیب ہیں لیکن اس کی قدرت کاملہ کے پیش نظر اس کے دوسرے نشانات کے مقابلہ میں یہ کوئی عجیب وغریب نشان نہیں ہے اس لیے کہ زمین وآسمان کی صناعی سورج چاند اور ستاروں کی تخلیق اور ان کا حیرت انگیز نظام کشش نظام فلکی کی یہ بے نظیر ترتیب انسان پر وحی الٰہی کا نزول اور بظاہر اسباب حق کی کمزوری اور باطل کی قوت کے باوجود حق کی فتح اور باطل کی شکست ایسے امور ہیں جو اس واقعہ سے کہیں زیادہ تعجب خیز اور حیرت انگیز ہیں پس جن لوگوں کو یہ واقعہ بادیٔ النظر میں عجیب معلوم ہوتا ہے وہ اگر قدرت حق کی مسطورہ بالا کارفرمائیوں پر نگاہ حقیقت آگاہ سے غور کریں تو پھر ان کو بھی اقرار کرنا پڑے کہ بلاشبہ قدرت حق کے سامنے یہ واقعہ نہ عجیب ہے اور نہ حیرت انگیز البتہ عبرت زا اور بصیرت افزا ضرور ہے۔ ﴿لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ﴾

② امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں اصحاب کہف پر بھی ایک باب معنون کیا ہے مگر مسطورہ بالا واقعہ سے متعلق مشہور حدیث ان کی شرائط کے مطابق ثابت نہیں ہوئی اس لیے انہوں نے سورۂ کہف کی آیات زیر بحث کی تفسیر اس روایت کے ذریعہ نہیں کی البتہ انہوں نے بنی اسرائیل کے ایک دوسرے واقعہ کے پیش نظر جو کہ "حدیث الغار" کے عنوان سے معنون ہے یہ سمجھا ہے کہ "اصحاب کہف" اور اصحاب رقیم دو الگ الگ شخصیتیں ہیں اور اصحاب رقیم وہ حضرات ہیں جن کا ذکر "حدیث الغار" میں کیا گیا ہے اسی بناء پر انہوں نے حدیث الغار کو "اصحاب رقیم" کی تفسیر میں نقل فرمایا ہے۔ حدیث غار کا واقعہ یہ ہے:

[1] سفر عدد باب ۲۰ آیات ۱۴-۲۱ و یسعیاہ

Marfat.com

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں سے پہلے بنی اسرائیل میں سے تین شخص سفر کر رہے تھے اثناء راہ میں بارش آ گئی، وہ تینوں ایک پہاڑ کی کھو (غار) میں پناہ لینے کے لیے داخل ہو گئے اتفاقاً پہاڑ کی اونچائی سے ایک بھاری پتھر لڑھک کر غار کے منہ پر آ گرا اور اس کو ڈھانپ لیا۔ یہ دیکھ کر تینوں نے ایک دوسرے سے کہا بھائی اب اس ویرانہ میں اس حادثہ سے نجات کی بظاہر اسباب تو کوئی صورت نظر نہیں آتی البتہ اگر ہم میں سے ہر ایک شخص اپنی زندگی کے کسی ایسے کام کا ذکر کر کے جو اس نے ریاء و نمود سے خالی صرف رضاء الٰہی کی خاطر کیا ہو رب العالمین کی درگاہ میں دعا مانگے تو کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اس مصیبت سے نجات دے دے، تب ان میں سے ایک نے کہا خدایا تجھ کو خوب معلوم ہے کہ میں نے ایک مرتبہ ایک مزدور سے چند سیر چاولوں پر مزدوری کرائی تھی مگر کام کے بعد مزدور چلا گیا اور اس کی اجرت میرے ذمہ باقی رہ گئی۔ فصل پر جب میں نے چاول کی کاشت کی تو اس کا حصہ بھی شامل کر لیا اور پیداوار پر اس کے حصہ کے چاولوں سے ایک عمدہ بیل خرید لیا۔ اس عرصہ میں مزدور آیا اور اس نے اپنی مزدوری کا مطالبہ کیا میں نے بیل کی رسی اس کے ہاتھ میں دے کر کہا کہ یہ تیری مزدوری کا حاصل ہے اور اس کو واقعہ سنایا وہ بہت خوش ہوا اور بیل کو لے گیا۔ پس اے خدا اگر تیرے نزدیک میرا یہ عمل صرف تیری خوشنودی اور حقوق العباد کی حفاظت پر مبنی تھا تو اس کی برکت سے ہماری اس مصیبت کو دور کر دے چنانچہ اس کی دعا کا یہ اثر ہوا کہ بھاری چٹان نے حرکت کی اور غار کے منہ سے کچھ ہٹ گئی اور کشادگی پیدا ہو گئی۔ اب دوسرے نے کہا خدایا تو دانا و بینا ہے کہ میرے والدین بہت ضعیف اور ناتواں تھے اس لیے میرا یہ دستور تھا کہ اپنی بکریوں کا دودھ دوہ کر شام کو سب سے پہلے ان کو پلاتا اور بعد میں اپنے اہل وعیال کو شکم سیر کرتا ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ مجھ کو جنگل میں دیر ہو گئی دودھ لے کر گھر آیا تو والدین انتظار کر کے سو چکے تھے اہل وعیال بھوک سے مضطرب اور بے تاب تھے اور دودھ کے خواہش مند مگر میں نے کہا کہ جب تک والدین اٹھ کر نہ پی لیں گے کسی کو دودھ نہیں ملے گا اور والدین کی نیند خراب نہ ہو اس لیے بیدار کرنا بھی نہیں چاہتا تھا اور تمام شب اسی طرح ان کے سرہانے دودھ لیے بیٹھا رہا کہ شاید درمیان میں بیدار ہوں اور بھوک ستائے مگر وہ صبح کو ہی بیدار ہوئے تب میں نے پہلے ان کو دودھ پلایا اور جب وہ سیراب ہو گئے تو بعد میں اہل وعیال کو دیا" پس اے خدا اگر میرا یہ عمل صرف تیری رضاء اور اطاعت والدین کے اداء حق کے لیے تھا تو ہماری اس مصیبت کو ٹال دے پتھر میں دوبارہ جنبش ہوئی اور چٹان اس درجہ ہٹ گئی کہ سامنے آسمان نظر آنے لگا اب تیسرے شخص کی نوبت تھی اس نے کہا! الٰہی تو علیم وخبیر ہے کہ میں اپنی چچا زاد بہن پر عاشق تھا اور اس کے وصل کے لیے بے تاب مگر وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہوتی تھی بمشکل تمام میں نے اس کو سو درہم دے کر ورغلایا اور عمل بد پر آمادہ کر لیا جب میں اس کے قریب ہوا اور ہم دونوں کے درمیان کوئی حائل نہ رہا تو اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا بندۂ خدا، خدا کے خوف سے ڈر اور ناحق عصمت ریزی پر بے باک نہ بن" یہ سنتا تھا کہ مجھ پر تیرا خوف غالب آیا اور میں اس سے الگ ہو گیا اور سو درہم بھی اسی کو بخش دیے الٰہ العالمین اگر میرا یہ عمل خالص تیری رضا اور تیرے خوف کے پیش نظر تھا تو ہماری اس آفت کو دور کر اور ہم کو اس سے نجات دے اس کے بعد فوراً چٹان حرکت میں آئی اور غار کے دہانہ پر سے لڑھک کر نیچے جا رہی اور وہ تینوں اسرائیلی اس مصیبت سے نجات پا کر مسرت وشادمانی کے ساتھ اپنی منزل پر روانہ ہو گئے۔

اس روایت کی شرح کرتے ہوئے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بزار اور طبرانی نے سند حسن کے ساتھ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ

Marfat.com

سے بھی روایت نقل کی ہے اور اس میں یہ اضافہ ہے کہ نعمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو رقیم کا ذکر کرتے ہوئے سنا آپ غار میں بند رہ جانے والے تین آدمیوں کا واقعہ سنا رہے تھے غالباً اسی بنا پر امام بخاری نے رقیم کی تفسیر میں "یہ حدیث غار" روایت کی ہے۔ ❶

لیکن اس تحقیق کے بعد جو گزشتہ سطور میں زیر بحث آ چکی جب کہ قرآن بعض آثار صحابہ اور تاریخ سے یہ پایہ ثبوت کو پہنچ گیا کہ رقیم اس شہر کا نام ہے جس کے کسی پہاڑ کے غار میں اصحاب کہف جا چھپے تھے تو اب مسند بزار اور معجم طبرانی کی روایت کے مبہم الفاظ سے اصحاب رقیم کو اصحاب کہف سے جدا سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ خصوصاً جب کہ روایت نعمان رضی اللہ عنہ میں یہ احتمال موجود ہے کہ نبی اکرم ﷺ اصحاب رقیم کا ذکر فرما رہے ہوں اور اس کے ساتھ اس واقعہ کا بھی ذکر فرمایا ہو اور بعد کو راوی نے غلطی سے یہ سمجھ لیا ہو کہ نبی اکرم ﷺ نے حدیث غار کا واقعہ دراصل اصحاب رقیم کی تفسیر میں ارشاد فرمایا ہے نیز جب کہ عربی زبان میں رقیم کے معنی "غار" کے کبھی نہیں آتے نہ حقیقتاً نہ مجازاً تو پھر یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ ذات اقدس ﷺ نے "رقیم" بمعنی غار کہہ کر حدیث غار کو اس کی تفسیر بتایا ہو یہ راوی کا وہم ہے اور غالباً اسی لیے بزار اور طبرانی کے علاوہ کسی نے بھی اس اضافہ کو بیان نہیں کیا حالانکہ کتب حدیث میں یہ واقعہ بہ کثرت منقول ہے اور خود صحیح بخاری بھی اس اضافہ سے خالی ہے نیز اگر صحیح روایت سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ نبی اکرم ﷺ نے "الرقیم" کی تفسیر صاف اور واضح الفاظ میں خود ارشاد فرما دی ہے تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ جلیل القدر مفسرین اپنی اپنی تحقیق کے مطابق الرقیم کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل فرماتے؟ اور خود حافظ ابن حجر عسقلانی بھی یہ جرات نہ کرتے کہ اس روایت کے خلاف یہ فرمائیں کہ صحیح اور صواب یہ ہے کہ اصحاب کہف اور اصحاب رقیم دونوں ایک ہی ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

و قال قوم اخبر الله عن قصة اصحٰب الكهف و لم يخبر عن قصة اصحاب الرقيم (قلت) و ليس كذٰلك بل السياق يقتضى ان اصحاب الكهف هم اصحاب الرقيم۔ ❷

"اور ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کا واقعہ تو ہم کو سنایا ہے مگر اصحاب رقیم کا واقعہ نہیں بیان کیا (میں کہتا ہوں) یہ بات صحیح نہیں ہے بلکہ قرآن کا سیاق یہ چاہتا ہے کہ اصحاب کہف اور اصحاب رقیم ایک ہی ہیں۔"

❸ ﴿فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِی الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا﴾ مولانا آزاد نے ﴿فَضَرَبْنَا عَلَى الْاٰذَانِ﴾ کے معنی یہ بیان فرمائے ہیں "صاف معنی تو یہ ہیں کہ ان کے کان دنیا کی طرف سے بند ہو گئے تھے یعنی دنیا کی صدا ان تک نہیں پہنچتی تھی۔ ❹ آیت کی تفسیر میں یہ قول ضعیف اور شاذ ہے ❺ اس کے برعکس مفسرین کے نزدیک مشہور تفسیر یہ ہے کہ ان پر نیند طاری ہو گئی تھی چونکہ نیند کی حالت میں آدمی کوئی آواز نہیں سنتا اس لیے اس حالت کو ﴿ضَرَبَ عَلَى الْاٰذَانِ﴾ سے تعبیر کیا گیا مگر اس تفسیر کے متعلق مولانا آزاد یہ فرماتے ہیں اس تفسیر میں اشکال یہ ہے کہ عربی میں نیند کی حالت کے لیے ﴿ضَرَبَ عَلَى الْاٰذَانِ﴾ کی تعبیر نہیں ملتی لیکن وہ (مفسرین) کہتے ہیں یہ ایک طرح کا استعارہ ہے گہری نیند کی حالت کو ﴿ضَرَبَ عَلَى الْاٰذَانِ﴾ کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ❻

---

❶ فتح الباری ج ٦ حدیث الغار ❷ فتح الباری ج ٦ ص ٢٩٣ ❸ ترجمان القرآن ج ٢
❹ فتح الباری ج ٦ ❺ ترجمان القرآن ج ٢

Marfat.com

ہمارے نزدیک مفسرین کی تفسیر ہی راجح ہے اور یہ استعارہ ہر زبان کے محاورات میں پایا جاتا ہے مثلاً جب ماں گود کے بچے کو لوریاں دے کر سلاتی ہے تو اس کے کان اور بازو پر ہاتھ رکھ کر تھپکتی جاتی ہے اس لیے اردو زبان میں بھی "کانوں کو تھپک دینا" نیند طاری کر دینے کے لیے بولا جاتا ہے چنانچہ شیخ الہند (نور اللہ مرقدہ) نے اس جملہ کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔ [1]

"پھر تھپک دیے ہم نے ان کے کان اس کھوہ (غار) میں چند برس گنتی کے۔" (کہف)

علاوہ ازیں عربی زبان میں "ضرب علی اذنہ" کے معنی "منعہ ان یسمع" کے آتے ہیں یعنی اس کو سننے سے روک دیا" اب سننے سے روک دینے کی متعدد صورتیں ہیں ایک یہ کہ کوئی شخص بستی سے دور جنگل میں غار کی کھوہ میں جا بیٹھا اور اس لیے دنیا کی باتوں سے اس کے کان ناآشنا ہو گئے دوسری یہ کہ وہ بہرا ہو گیا اور سننے سے معذور کر دیا گیا۔ تیسری یہ کہ وہ سو گیا اور اس کے دیگر حواس ظاہرہ کی طرح کان بھی سننے سے معطل ہو گئے۔ لہٰذا "ضرب علی الاذان" کی تعبیر ان سب صورتوں کے لیے یکساں قابل استعمال ہے اور استعارہ وتشبیہ ہے تو تینوں معنی کے لیے ہے البتہ مولانا آزاد کی تفسیر میں یہ اشکال ضرور لازم آتا ہے کہ اگر "ضرب علی الاذان" کے معنی یہ ہیں کہ ان کے کان دنیا کی طرف سے بند ہو گئے تھے۔ یعنی وہ بحالت بیداری عام زندگی کے مطابق بستی سے دو پہاڑ کے غار میں راہبانہ زندگی بسر کر رہے تھے تو پھر اس آیت کے کیا معنی ہوں گے؟

﴿وَ كَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ؕ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ؕ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ﴾ (الکہف: ۱۹)

"اور ہم نے ان کو اٹھایا کہ وہ آپس میں سوال کریں ایک نے ان میں سے کہا تم یہاں کتنی مدت ٹھہرے رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔"

کیا یہ آیت اپنے صاف معنی میں یہ ظاہر نہیں کرتی کہ "ضرب علی الاذان" کی صاف تعبیر یہاں وہی ہے جو جمہور مفسرین کے نزدیک صحیح اور راجح ہے بلکہ ایسے موقع پر ﴿بَعَثْنٰهُمْ﴾ کی تعبیر کا تقاضا تو یہ ہے کہ مفسرین کی تفسیر کے علاوہ دوسرے معنی لینا قطعاً بے محل ہیں۔

اس جگہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قرآن نے اصحاب کہف کی اس گفتگو کے بعد جو وہاں سوئے رہنے کی مدت سے متعلق ہے ان کی یہ گفتگو بھی نقل کی ہے کہ ان میں سے کوئی شہر جائے اور پوشیدہ طور پر جائے کہ کسی کو خبر نہ ہونے پائے یہ بھی جمہور کی تفسیر کو قوت پہنچاتی ہے اس لیے کہ غار میں مدت قیام پر بات چیت اور پھر فوراً کھانے کی خواہش کا اظہار دونوں باتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑیے تو صاف معنی وہی بنتے ہیں جو مفسرین نے بیان کیے ہیں اور مولانا آزاد کی یہ تفسیر کہ عرصہ دراز کے بعد ان کو شہر کی حالت معلوم کرنے کا خیال پیدا ہوا اور اس سلسلہ میں ان کے درمیان یہ گفتگو ہوئی" تکلف بارد ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مولانا آزاد کو شروع سے آخر تک اس واقعہ کی تمام آیات میں تکلف بارد اختیار کرنا پڑا ہے مثلاً جب قرآن نے ان کی حالت بیان کرتے ہوئے یہ کہا ﴿وَ تَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّ هُمْ رُقُوْدٌ ﯼ﴾ تو ان کو گمان کرے گا کہ وہ بیدار ہیں حالانکہ وہ خواب

---

[1] ترجمہ حضرت مولانا محمود الحسن صاحب نور اللہ مرقدہ

Marfat.com

میں ہیں" تو مولانا موصوف کو اپنی تفسیر کو صحیح بنانے کے لیے "یقظ" کے معنی زندہ اور "رقد" کے معنی "مردہ" کے اختیار کرنے پڑے ہیں حالانکہ ان کے حقیقی معنی "بیداری" اور "نیند" کے ہیں اور یہ معنی بلاتکلف یہاں صادق آتے ہیں پس مولانا پر بھی وہی بات صادق آتی ہے جو انہوں نے مفسرین کی مسلمہ تفسیر پر لازم کی ہے یعنی "فی الکلام تجوز بطریق الاستعارۃ" کلام میں استعارہ کی راہ سے مجاز اختیار کیا گیا ہے۔

بلکہ اگر غائر نظر سے دیکھیے تو "حقیقت کے صادق ہوتے ہوئے مجاز اختیار کرنا" مولانا آزاد" کی تفسیر پر تو صادق آتا ہے لیکن جمہور مفسرین کی تفسیر پر صادق نہیں آتا۔

مولانا آزاد نے آیات زیر بحث کی تفسیر میں اگرچہ مفسرین کے مختار قول کے خلاف ضعیف قول کو اپنا مختار بنایا ہے تاہم مفسرین کے اقوال کو احتمال کے درجہ میں تسلیم کرتے ہوئے ان کی تائید میں جو جملے ارشاد فرمائے ہیں وہ بلاشبہ ایسے حضرات کے لیے خصوصاً قابل مطالعہ ہیں جو اس قسم کے واقعات کو محض تعجب خیز سمجھ کر خلاف عقل کہہ دینے کے عادی ہیں فرماتے ہیں:

"بہر حال اگر یہاں "ضرب علی الاذان" سے مقصود نیند کی حالت ہو تو پھر مطلب یہ قرار پائے گا کہ وہ غیر معمولی مدت تک نیند کی حالت میں پڑے رہے اور ﴿ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ﴾ کا مطلب یہ کرنا پڑے گا کہ اس کے بعد نیند سے بیدار ہو گئے۔"

یہ بات کہ ایک آدمی پر غیر معمولی مدت تک نیند کی حالت طاری رہے اور پھر بھی زندہ رہے طبی تجارب کے مسلمات میں سے ہے اور اس کی مثالیں ہمیشہ تجربہ میں آتی رہتی ہیں پس اگر اصحاب کہف پر قدرت الٰہی سے کوئی ایسی حالت طاری ہو گئی ہو جس نے غیر معمولی مدت تک انہیں سلائے رکھا تو یہ کوئی مستبعد بات نہیں۔" [1]

(۲) ﴿ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰی لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ﴿۱۲﴾﴾ (الکھف: ۱۲)

"پھر ہم نے ان کو خواب سے اٹھایا تاکہ معلوم کریں کہ دو جماعتوں میں سے کس نے اس مدت کو محفوظ رکھا جس میں وہ (غار کے اندر) رہے۔"

یہاں دو جماعتوں میں سے ایک اصحاب کہف کی اور دوسری اہل شہر کی جماعت مراد ہے مطلب یہ ہے کہ یہ اس لیے کیا کہ مدت ظاہر ہو جائے اور یہ معلوم کرنے کے بعد کہ خدائے تعالیٰ نے ان کو برسوں تک بحالت خواب زندہ رکھا جب کہ وہ زندگی کی کے وسائل سے یکسر محروم تھے لوگوں کو یہ یقین ہو جائے کہ بلاشبہ اسی طرح وہ مخلوق کو مرنے کے بعد بھی زندہ کرے گا اور بیشک قیامت اور بعث بعد الموت کا مسئلہ حق ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جب ان کو بیدار کیا اور ان میں سے ایک نوجوان شہر میں کھانا لینے گیا تو اس زمانہ میں بستی والوں کے درمیان "بعث بعد الموت" پر جھگڑا اور مناقشہ جاری تھا ایک جماعت کہتی تھی کہ فقط روح کا ہو گا اور دوسری جماعت قائل تھی کہ روح اور جسم دونوں کو زندہ ہونا ہے یہ تو نصاریٰ کی جماعتیں تھیں اور جو نبطی مشرک آباد تھے وہ سرے سے بعث بعد الموت ہی کے منکر تھے ایسے نازک وقت میں اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو غار سے بیدار کر کے بھیجا اور اس طرح اصحاب کہف کا واقعہ سب پر ظاہر ہو گیا تو اس نے علی رؤس الاشہاد یہ نظیر قائم کر دی کہ جس طرح برسوں تک اسباب حیات سے

---

[1] ترجمان القرآن ج ۲

Marfat.com

محروم رہنے کے باوجود روح کے ساتھ جسم بھی صحیح وسالم باقی رہا اسی طرح "بعث بعد الموت" روح اور جسم دونوں سے تعلق رکھتا ہے اور جس طرح سوتے رہنے کے بعد اصحاب کہف بیدار کر دیئے گئے اسی طرح قبر (عالم برزخ) میں سینکڑوں اور ہزاروں برس مردہ رہنے کے بعد قیامت میں زندہ کر دیئے جائیں گے۔

﴿وَ كَذٰلِكَ اَعۡثَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ لِيَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيۡبَ فِيۡهَا ۚ اِذۡ يَتَنَازَعُوۡنَ بَيۡنَهُمۡ اَمۡرَهُمۡ﴾ (الکہف:۲۱)

"اور پھر (دیکھو) اسی طرح یہ بات بھی ہوئی کہ ہم نے لوگوں کو ان کے حال سے واقف کر دیا (ان کی بات) پوشیدہ نہ رہ سکی اور اس لیے واقف کر دیا کہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں۔" [1]

آیت کی یہ تفسیر عکرمہ کی روایت سے ماخوذ ہے اور اسی کو عام طور پر اختیار کیا گیا ہے لیکن مولانا آزاد نے ﴿لَا رَيۡبَ فِيۡهَا﴾ کو ﴿اِذۡ يَتَنَازَعُوۡنَ بَيۡنَهُمۡ اَمۡرَهُمۡ﴾ سے جدا کرتے ہوئے آیت کے معنی یہ کیے ہیں اسی وقت کی بات ہے کہ لوگ آپس میں بحث کرنے لگے ان لوگوں کے معاملہ میں کیا کیا جائے لوگوں نے کہا اس غار پر ایک عمارت بنا دو۔ حضرت شاہ ولی اللہ (نور اللہ مرقدہ) نے بھی یہی ترجمہ کیا ہے۔

"درآں وقتیکہ نزاع می کردند مردماں درمیان خود در مقدمہ ایشاں پس گفتند عمارت کنید بر غار ایشاں"

یعنی یہ حضرات ﴿يَتَنَازَعُوۡنَ﴾ میں قیامت کے متعلق شہریوں کے باہم اختلاف کو مراد نہیں لیتے بلکہ اس گفتگو کو مراد لیتے ہیں جو اصحاب کہف کے مرقد پر ہیکل تعمیر کرنے کے بارے میں ہوئی۔

⑤ ﴿فَاۡوٗۤا اِلَى الۡكَهۡفِ﴾ ہم نے واقعہ کی جو تفصیلات بیان کی ہیں اور قرآن کی اندرونی اور تاریخ و روایات کی بیرونی شہادتوں سے جن امور کو ثابت کیا ہے ان سے جدا عام مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ یہود بنی اسرائیل کے قدیم زمانہ کا ہے جو شہر افسس میں ایک مشرک .... بادشاہ دقیانوس کے زمانہ حکومت میں پیش آیا۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ انہوں نے عیسائیت نہیں بلکہ یہودیت کو قبول کر لیا تھا اور بادشاہ وقت کے ظلم و جور سے بچ کر غار میں پناہ گزین ہو گئے تھے لیکن ہم ان پر گزشتہ سطور میں سیر حاصل بحث کر چکے اور ثابت کر چکے ہیں کہ اس واقعہ کا تعلق عیسائی دور سے ہے۔

⑥ ﴿سَيَقُوۡلُوۡنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمۡ كَلۡبُهُمۡ ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ خَمۡسَةٌ سَادِسُهُمۡ كَلۡبُهُمۡ رَجۡمًۢا بِالۡغَيۡبِ ۚ﴾ (الکہف:۲۲)

اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ سے متعلق ان حقائق کے اظہار کے بعد جو اس کے مقصد "تذکیر" کے لیے مفید تھے واقعہ کی ان جزئیات کے متعلق جو محض تاریخی حیثیت رکھتی ہیں اور ان کے جان لینے سے کوئی خاص فائدہ مرتب نہیں ہوتا۔ پیغمبر ﷺ کو یہ نصیحت فرمائی کہ وہ ان لاحاصل بحثوں سے پرہیز کریں اور ان پر سرسری طور سے گزر جائیں اور بیکار باتوں کے کھوج لگانے کی فکر نہ کریں۔ مثلاً یہ کہ ان نوجوانوں کی تعداد کیا تھی؟ ان کی عمروں کا تناسب کیا تھا وہ غار میں کتنی مدت مقیم رہے؟ مدت کی صحیح مقدار

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۳ عن عکرمہ۔

کیا ہے؟ وغیرہ۔

﴿قُلْ رَّبِّیْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا یَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِیْلٌ فَلَا تُمَارِ فِیْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا وَّلَا تَسْتَفْتِ فِیْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا﴾ (الکہف:۲۲)

"(اے پیغمبر ﷺ) کہہ دیجئے ان کی اصل گنتی تو میرا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کیونکہ ان کا حال بہت کم لوگوں کے علم میں آیا ہے اور جب صورت حال یہ ہے تو لوگوں سے اس بارہ میں بحث ونزاع نہ کر مگر صرف اس حد تک کہ صاف صاف بات میں ہو اور ورنہ ان لوگوں میں سے کسی سے اس بارے میں کچھ دریافت کر؟ (اس لیے کہ جو بات بھی ہوگی انکل سے ہوگی)"۔

تاہم حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ فرماتے ہوئے کہ ان قلیل میں سے جن کو ان کی تعداد کا علم ہے ایک میں بھی ہوں ارشاد فرمایا کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے تعداد کے متعلق پہلے دو مقولوں کا ذکر کرنے کے بعد یہ فرمایا کہ یہ باتیں انکل کے تیر ہیں مگر تیسرا قول ذکر کرنے کے بعد ایسی کوئی بات نہیں کہی اس لیے یہ ہی صحیح تعداد ہے۔ ❶

﴿وَلَبِثُوْا فِیْ کَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا﴾ (الکہف:۲۵)

اس آیت کا ترجمہ عام طور پر مفسرین نے اس طرح کیا ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ اپنی جانب سے یہ اطلاع دے رہا ہے کہ وہ تین سو نو سال غار میں رہے مگر حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم سے بعض روایات میں جو معنی مذکور ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگوں کا مقولہ ہے اللہ تعالیٰ کا اپنا قول نہیں ہے یعنی وہ آیت ﴿وَلَبِثُوْا.... الایة﴾ کو اس سے قبل کے جملہ ﴿یَقُوْلُوْنَ﴾ کے تحت میں داخل سمجھتے اور یہ معنی کرتے ہیں کہ جس طرح لوگ (عیسائی) اصحاب کہف کی تعداد کے متعلق مختلف باتیں کہتے ہیں اور کہیں گے اسی طرح وہ یہ بھی کہتے ہوئے پائے جاتے ہیں کہ اصحاب کہف تین سو نو سال تک غار میں رہے۔
چنانچہ قاضی شوکانی اپنی تفسیر فتح القدیر میں نقل فرماتے ہیں:

اخرج ابن ابی حاتم و ابن مردویه عن ابن عباس قال ان الرجل لیفسر الایة و یری انها کذلك فیهوی ابعد ما بین السماء والارض ثم تلا ﴿وَلَبِثُوْا فِیْ کَهْفِهِمْ﴾ ثم قال کم لبثت القوم قالوا ثلث مائة و تسع قالو کانوا لبثوا کذلك لم یقیل الله قل الله اَعْلَمُ بما لبثوا و لکنه حکی مقالة القوم فقال ﴿سَیَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ﴾ الیٰ قوله ﴿رَجْمًا بِالْغَیْبِ﴾ فاخبر انهم لا یعلمون ثم قال ﴿سَیَقُوْلُوْنَ وَ لَبِثُوْا فِیْ کَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَ ازْدَادُوْا تِسْعًا﴾۔ ❷

ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں انہوں نے فرمایا آدمی آیت کی تفسیر کرتا ہے اور یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس نے بالکل صحیح تفسیر کی ہے حالانکہ وہ اس میں فاش غلطی کرتا ہے گویا وہ اس آسمان وزمین سے بھی دور

---

❶ ابن کثیر ج ۳ ❷ فتح القدیر سورۂ کہف

جا گرا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ فرما کر بعد میں اس آیت کو تلاوت کیا ﴿وَ لَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ﴾ اور فرمانے لگے لوگوں نے یہ سوال پیدا کیا کہ اصحاب کہف کتنے عرصہ غار میں رہے اور خود ہی یہ کہنے لگے کہ وہ تین سو نو سال غار میں رہے۔ پھر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ارشاد فرمایا کہ اگر اصحاب کہف واقعی اتنے عرصہ ہی غار میں رہے ہوتے تو اللہ تعالیٰ یہ نہ فرماتا ﴿قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا﴾ آپ کہہ دیجئے اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ کتنے عرصہ مقیم رہے" دراصل یہ اللہ تعالیٰ کا مقولہ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے قول کو حکایت کیا ہے اور ان کی گفتگو کو یہاں سے شروع کیا ہے ﴿سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ ... اِلٰى قَوْلِهٖ ... رَجْمًا بِالْغَيْبِ﴾ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ وہ صحیح تعداد سے واقف نہیں ہیں اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے لوگوں کا دوسرا یہ مقولہ بیان کیا کہ وہ کہتے ہوئے پائے جائیں گے ﴿سَيَقُوْلُوْنَ وَ لَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَ ازْدَادُوْا تِسْعًا ۝﴾۔

اور ابن کثیر نے تفسیر میں بروایت قتادہ، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ نقل کیا ہے:

قال قتادة وفی قراءة عبد الله وقالوا ولبثوا یعنی انه قاله الناس وهكذا قال قتادة و مطرف. ❶

قتادہ کہتے ہیں اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرات میں یہ ہے (و قالوا و لبثوا) یعنی یہ مقولہ لوگوں کا ہے قتادہ اور مطرف کی رائے بھی یہی ہے۔"

ہمارے نزدیک بھی یہی معنی راجح ہیں کیونکہ قرآن کا سیاق اسی کو ظاہر کرتا ہے اس لیے کہ ان ہی آیات میں قرآن نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کی ہے کہ وہ اس قسم کی غیر مفید اور اٹکل کی باتوں کے پیچھے نہ پڑیں پس جب کہ ﴿وَ لَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ﴾ کے بعد یہ کہا گیا ﴿قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ تو اس سے یہ بات صاف ہوگئی کہ غار میں قیام کی مدت کا مسئلہ بھی اندھیرے کا تیر ہے اور اس لیے صحیح طریق کار اس بارے میں بھی یہی ہے کہ اس کو علم الٰہی کے سپرد کر دیا جائے لہٰذا اس صورت میں یہ مقولہ اللہ تعالیٰ کا نہیں بلکہ ان لوگوں کا ہے جو زمانہ نبوت میں اس واقعہ کی تفصیلات کے سلسلہ میں بے فائدہ اٹکل کے تیر چلاتے رہتے تھے۔

بایں ہمہ ابن کثیر رحمہ اللہ عام مفسرین کے معنی کو ہی راجح کہتے ہیں اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کو منقطع اور ان کی قراۃ کو شاذ ثابت کر کے اس کو ناقابل حجت قرار دیتے ہیں مگر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی صحیح روایت کا ان کے پاس کیا جواب ہے؟ ابن کثیر یہ بھی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اول تین سو سال فرمایا اور یہ شمسی حساب کے مطابق ہے اور پھر ﴿وَ ازْدَادُوْا تِسْعًا﴾ کہہ کر نو سال کا اور اضافہ اس لیے کیا تاکہ شمسی حساب قمری حساب کے ساتھ مطابق ہو جائے مگر اول نظر میں بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ آیت کی یہ تفسیر نہیں بلکہ تاویل ہے اس لیے کہ ایک طرف تو قرآن تذکیر و موعظت کے مقصد سے زائد تفصیلات کو دور از کار کہتا ہے اور دوسری جانب خود ہی ایسی باتوں کے درپے ہوتا ہے جس کا موعظت و بصیرت سے کوئی خاص تعلق نہیں بلکہ خالص علم ہیئت کا مسئلہ ہے۔ ❷ ابن کثیر کے نزدیک یہ مقولہ اس لیے بھی لوگوں کا نہیں ہو سکتا کہ نصاریٰ کے یہاں قیام کہف کی مدت تین سو سال مشہور ہے

---

❶ ج ۳۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرات سے یہ مراد ہے کہ وہ اس مقام پر بطور تفسیر کے یہ پڑھ دیا کرتے تھے۔ (مؤلف)

❷ نیز از روئے حساب بھی نو کا اضافہ تطابق حساب کے لئے کافی نہیں۔

اور نوکا ان کے یہاں کوئی ذکر نہیں پایا جاتا مگر یہ بات بھی صحیح نہیں ہے اس لیے کہ دوسرے مفسرین نے ان کے دونوں قول نقل کیے ہیں۔ شاید ابن کثیر کی نظر سے دوسرا مقولہ نہیں گزرا۔

⑧ ﴿وَ تَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ..... اِلٰى..... فِرَارًا وَّ لَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ﴾ (الکہف: ۱۷)

ان آیات میں قرآن عزیز نے اصحاب کہف کی اس حالت کا ذکر کیا ہے جب کہ وہ شروع میں غار کے اندر جا کر پوشیدہ ہوئے تھے اور یہ اس لیے کہ ان آیات کے متصل ہی جو آیات اس واقعہ پر روشنی ڈال رہی ہیں ان میں یہ باتیں مذکور ہیں وہ نیند سے بیدار ہوئے اور انہوں نے ایک رفیق کو کھانا لانے کے لیے شہر بھیجا اس کی وجہ سے شہر والوں پر حقیقت حال ظاہر ہوگئی جملہ معترضہ کے طور پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر اس حقیقت حال کے منکشف کر دینے کی مصلحت بیان کی وہ دوبارہ غار میں عزلت گزیں ہو گئے اور اہل شہر نے اس غار کے دہانہ پر ہیکل تعمیر کر دیا ان واقعات کے بیان کرنے کے بعد ان آیات میں اس کیفیت کو بیان کیا جا رہا ہے جو اصحاب کہف پر نیند طاری ہونے کی حالت میں گزری یعنی اس غار کی اندر سے کیا حالت تھی دھوپ اور تازہ ہوا پہنچنے نہ پہنچنے کی کیا کیفیت تھی ایک طویل مدت تک خواب کی حالت میں رہنے کی کیا شکل تھی کیا ایک ہی کروٹ پر سوئے رہے یا زندہ انسانوں کی طرح کروٹیں بدلتے رہتے تھے ان کا کتا کس طرح وفاداری کا حق ادا کر رہا تھا۔ اس مجموعی کیفیت کا اثر باہر سے جھانک کر دیکھنے والے انسان پر کیسا پڑتا تھا۔

جمہور مفسرین نے یہی تفسیر کی ہے اور آیات کے باہم نظام و ترتیب کے لحاظ سے یہ بہت صاف اور واضح تفسیر ہے مگر مولانا ...ان تمام آیات کو اصحاب کہف کے دوبارہ غار میں عزلت گزیں ہو جانے سے متعلق سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ قرآن یہ تفصیلات ...حالت کی بیان کر رہا ہے جب ان پر موت طاری ہو چکی تھی اور پھر انہوں نے "ایقاظ" میں یقظہ کے معنی زندگی اور رقود میں رقد ...یعنی موت کے اختیار کر کے کافی تکلف کیا ہے اور بعض مقدمات کے اضافہ کے ساتھ اپنی تفسیر کو دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے ...ئے یہ فرمایا ہے کہ چونکہ مفسرین نے ان آیات کو اصحاب کہف کے پہلی مرتبہ غار میں پوشیدہ ہو جانے سے متعلق کہا ہے اس لیے ان ...یات کی تفسیر میں حیرانی پیش آئی ہے مگر اس پوری تفصیل کے مطالعہ سے بآسانی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آیات زیر بحث کی تفسیر میں ...ین قدیم کو تو کوئی حیرانی پیش نہیں آئی البتہ خود مولانائے موصوف کو اپنی اختیار کردہ تفسیر کی وضاحت میں ضرور تکلفات بارده اختیار ...نے پڑے ہیں اور سچ پوچھئے تو اس مقام پر ان کی تفسیر تاویل ہو کر رہ گئی ہے۔

﴿ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ "یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے"۔

یعنی پہاڑ کے اندر غار کی یہ مجموعی کیفیت کہ غار کا دہانہ اگرچہ تنگ ہے مگر اس کے اندر بہت کافی وسعت ہے اس کا جاء وقوع شمالاً و جنوباً ہے کہ جس کی وجہ سے طلوع و غروب دونوں حالتوں میں آفتاب غار کے سامنے سے داہنے اور بائیں کترا کر نکل جاتا ہے اور غار اس کی تپش سے محفوظ رہتا ہے اور دوسری جانب منفذ ہونے کی وجہ سے ہوا اور روشنی بقدر ضرورت پہنچتی رہتی ہے گویا انسانی بقاء کے لیے جو چیز مضر ہے یعنی تپش اس سے حفاظت اور جو بقاء حیات کے لیے ضروری شے ہے یعنی روشنی اور ہوا اس

کی موجودگی یہ ایسے امور ہیں جو خدائے تعالیٰ کی کھلی نشانیاں کہی جاسکتی ہیں کہ ان کی بدولت برسوں تک خدا کے نیک بندے دنیا کے علائق سے جدا ہو کر غار میں بحالت خواب بسر کر سکے اور ایسی حالت میں بسر کر سکے جب کہ سامان خورد و نوش اور بقاء حیات کے دیگر وسائل دنیوی سے قطعاً محروم تھے۔

⑩ عام طور پر مشہور ہے کہ اصحاب کہف ابھی تک غار میں سو رہے ہیں اور زندہ ہیں مگر یہ صحیح نہیں ہے اس لیے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بصراحت یہ فرمایا ہے کہ ان کا انتقال ہو چکا۔

قال قتادۃ غزا ابن عباس مع حبیب بن مسلمہ فمروا بکھف فی بلاد الروم فراؤا فیہ عظاما فقال قائل ھذہ عظام اھل الکھف فقال ابن عباس لقد بلیت عظامھم من اکثر من ثلثمائۃ سنۃ. (رواہ ابن جریر) ❶

"قتادہ کہتے ہیں ابن عباس رضی اللہ عنہما ایک مرتبہ حبیب بن مسلمہ کے ساتھ ایک غزوہ میں تشریف لے گئے راہ میں بلاد روم میں اس مقام پر گزر ہوا جہاں پہاڑی غاروں کا سلسلہ ہے وہاں انہوں نے کسی غار کے اندر انسانوں کی ہڈیاں یا ڈھانچے دیکھے تو کسی کہنے والے نے کہا یہ اہل کہف کی ہڈیاں معلوم ہوتی ہیں اس پر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ان کی ہڈیاں تو تین سو سال سے بھی زیادہ عرصہ ہوا کہ بوسیدہ ہو چکیں۔"

⑪ قرآن عزیز اور صحیح روایات سے یہ قطعاً معلوم نہیں ہوتا کہ اصحاب کہف کے نام کیا تھے بلکہ قرآن عزیز نے تو مشرکین مکہ یا نبطی اور رومی عیسائیوں کے یہاں اس سلسلہ میں جو اٹکل کی باتیں مشہور تھیں ان پر اعتماد رکھنے اور ان کی تحقیقات میں پڑنے سے روکا ہے البتہ اسرائیلی روایات میں ان کے نام یہ بتائے گئے ہیں: مکسلمینا، تملیخا، مرطونس، کسطونس، بیرونس، ونیوس، نطونس اور ان کے کتے کا نام قطمیر یا حمران ہے۔ ❷

⑫ ﴿وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ﴾ کتے نے وفاداری اور جاں نثاری کا ثبوت دیا اور صلحاء کی صحبت پائی تو قرآن نے بھی اس کا ذکر خیر کر کے اس کو وہ عزت بخشی کہ انسانوں کے لیے قابل رشک بنا دیا شیخ سعدی رحمہ اللہ نے کیا خوب کہا ہے:

سگ اصحاب کہف روزے چند پئے نیکاں گرفت مردم شد
پسر نوح بابداں بہ نشست خاندان نبوتش گم شد

⑬ ﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَاْيْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ (الکہف: ۲۳)

"اور کسی چیز کے لیے یہ نہ کہو کہ کل میں اس کو ضرور کروں گا مگر (یہ کہہ لیا کرو) یہ کہ خدا چاہے تو۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ تعلیم دی ہے کہ جب مستقبل میں کسی کام کا ارادہ ہو تو دعویٰ کے ساتھ یہ نہیں کہنا چاہیے کہ میں اس کو ضرور کروں گا اس لیے کہ کون جانتا ہے کہ کل کیا ہوگا اور کہنے والا اس کائنات میں موجود بھی ہوگا یا نہیں لہٰذا اس معاملہ کو خدا کے سپرد کرتے ہوئے "انشاء اللہ" ضرور کہنا چاہیے۔

---

❶ یہ روایت بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ واقعہ عیسائیت کے ابتدائی دور میں پیش آیا ہے۔

❷ یہ روایت بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ واقعہ عیسائیت کے ابتدائی دور میں پیش آیا ہے۔

⑭ ﴿وَقُلْ عَسَىٰ أَن يَهْدِيَنِ رَبِّي لِأَقْرَبَ مِنْ هَٰذَا رَشَدًا﴾ (الکہف:۲۴)

"تم کہو اُمید ہے میرا پروردگار اس سے بھی زیادہ کامیابی کی راہ مجھ پر کھول دے گا۔"

اس آیت میں اس جانب اشارہ ہے کہ عنقریب ایسا ہی معاملہ تم کو بھی پیش آنے والا ہے بلکہ وہ اس سے بھی عجیب وغریب ہوگا یعنی اپنا آبائی وطن چھوڑنا پڑے گا۔ راہ میں غار ثور کے اندر کئی دن تک پوشیدہ رہو گے۔ دشمن غار ثور کے منہ پر پہنچ جانے کے باوجود تم کو نہ پاسکیں گے تم بخیر وخوبی مدینہ پہنچ جاؤ گے اور وہاں تم پر فتح وکامرانی کی ایسی راہیں کھول دی جائیں گی جو اس معاملہ سے کہیں زیادہ عظیم وجلیل ہوں گی یہ سورت مکی عہد کی آخری سورتوں میں سے ہے اس لیے اس کے نزول کے بہت تھوڑے زمانہ بعد ہجرت کا وہ عظیم الشان واقعہ پیش آیا جس نے مسلمانوں کے دور حیات میں حیرت زا انقلاب پیدا کر دیا اور باطل نے حق کے سامنے سپر ڈال دی۔

⑮ ﴿لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِم مَّسْجِدًا﴾ (الکہف:۲۱)

"ہم ضرور ان کے مرقد پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے۔"

معلوم نہیں کہ اس کہنے سے ان لوگوں کا مقصد کیا تھا؟ یہ کہ واقعی ان کے مرقد پر ہیکل بنا کر اس کو سجدہ گاہ عام وخاص بنائیں گے کیونکہ یہ خدا کے مقبول بندے تھے تب تو ان عیسائیوں کا یہ عمل اسلام کی نگاہ میں قابل مذمت ونفرت ہے اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

((لعن الله اليهود والنصاری اتخذوا قبور انبيائهم مساجدا)).[1]

"اللہ تعالیٰ یہود ونصاریٰ پر لعنت بھیجے کہ انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجد (سجدہ گاہ) بنالیا تھا۔"

یعنی قبروں کو سجدہ کرتے تھے اور پھر ارشاد فرمایا:

((لا تتخذوا قبری عيدا))

"لوگو! تم میری قبر کو عید کی طرح تہوار نہ بنالینا۔"

اور اگر ان کا مطلب یہ تھا کہ ان کی یادگار میں غار کے منہ پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے کہ جس میں صرف خدائے عزوجل ہی کی عبادت ہوا کرے گی تو ان کا یہ فیصلہ بے شبہ محمود اور قابل ستائش تھا۔

نتائج وعبر:

① اگر ہم کو کوئی بات اپنی عقل کے مطابق عجیب وغریب معلوم ہو تو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنی حقیقت کے لحاظ سے بھی واقعی کوئی عجیب بات ہے اور اگر وہ عجیب ہے بھی تو ہمارے لیے ہے نہ کہ خالق کائنات کے لیے جس نے کہ کائنات ہست وبود کو پیدا کیا اور پھر ایسے محکم نظام پر اس کو قائم کیا کہ عقل حیران ہے مگر آنکھ روزانہ اس کا مشاہدہ کرتی اور قلب ہر لمحہ اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ ﴿وَمَا ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ﴾ خدائے تعالیٰ پر یہ بات کچھ بھاری نہیں۔

---

[1] رواہ الشیخین

Marfat.com

④ جب شر و فساد اور ظلم و سرکشی اس درجہ بڑھ جائے کہ خدا کے نیک بندوں کے لیے کہیں پناہ نہ رہے تو اگرچہ عزیمت کا مرتبہ یہی ہے کہ کائنات کی رشد و ہدایت کی خاطر ہمہ قسم کی تکالیف برداشت کرے اور کلمہ حق پر کوہ استقامت بنا رہے اور مخلوق خدا سے منقطع ہو کر عزلت و کنج نشینی اختیار نہ کرے لیکن اگر حالات اس درجہ نزاکت اختیار کر لیں کہ مخلوق کے ساتھ تعلق رکھنے کی شکل میں یا جان دینی پڑے اور یا دین باطل قبول کرنے پر مجبور ہونا پڑے اور حالت یہ ہو جائے:

﴿ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَ لَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا۝ ﴾ (الکہف: ۲۰)

”تو اس وقت رخصت ہے کہ جان کی حفاظت اور دین کی صیانت کے لیے دنیا کے علائق سے کٹ کر عزلت نشینی اختیار کر لے۔“

گویا یہ اضطراری حالت کا ایک ہنگامی اور وقتی علاج ہے جو صرف تحفظ دین و ایمان کے لیے کیا جا سکتا ہے لیکن اسلام کی نگاہ میں بذاتہ کوئی محبوب عمل نہیں ہے اور اختیاری طور پر اس جوگیانہ زندگی کو اختیار کرنا رہبانیت ہے ((ولا رھبانیۃ فی الاسلام)) اور اسلام رہبانیت کو ناپسند کرتا ہے۔

عیسائیوں کی مذہبی تاریخ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی عہد میں بعض سچے عیسائیوں کو اصحاب کہف کی طرح کے چند واقعات پیش آئے جن میں سے ایک روم میں ایک انطاکیہ میں اور ایک شہر افس میں پیش آنا بتایا جاتا ہے چنانچہ انہوں نے حالات سے مجبور ہو کر اضطراری طور پر اس جوگیانہ زندگی کو اختیار کیا تھا مگر بعد میں دوسری بدعات کی طرح یہ عمل بھی عیسائیت کا اہم جز اور محبوب عمل شمار ہونے لگا اور جس طرح ہندوستان کے قدیم دھرم کے مطابق دنیا سے کٹ کر ہندو جوگی پہاڑوں کی کھوہ اور ویرانوں میں یوگ کرنا مقدس عمل سمجھتے ہیں اسی طرح عیسائیوں نے بھی اختیاری رہبانیت کو مذہب کے مقدس اعمال میں شامل کر لیا۔

لیکن قرآن حکیم نے ان کے اس عمل کے متعلق صفائی کے ساتھ ظاہر کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بذاتہ یہ عمل کوئی پسندیدہ عمل نہیں ہے بلکہ اہل کتاب کی مذہبی بدعات میں سے ایک بدعت ہے۔

﴿ وَ رَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ ﴾
(الحدید: ۲۷)

”اور راہبانہ زندگی کو کہ جس کو ان (عیسائیوں) نے دین میں ایجاد کر لیا ہم نے ان پر فرض نہیں کیا تھا مگر انہوں نے اختیار کیا تھا اللہ کی رضا جوئی کے لیے پر اس کے حق کی رعایت نہ رکھ سکے۔“

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے یہ طریق دین کے طریقوں میں سے نہیں مقرر کیا تھا بلکہ انہوں نے خود ہی اختیار کر لیا تھا اور اگرچہ ابتداء میں انہوں نے یہ خدائے تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے اختیار کیا تھا مگر بعد میں اس کو نباہ نہ سکے اور رہبانیت کے پردہ میں دنیاداروں سے زیادہ دنیا طلبی اور ہوس ناکیوں میں مبتلا ہو گئے۔

حق یہ ہے کہ صاف اور سیدھی راہ اعتدال کی راہ ہے نہ اس میں پیچ و خم ہے اور نہ نشیب و فراز یہ راہ افراط اور تفریط دونوں سے جدا کر کے منزل مقصود تک پہنچا دیتی ہے اور چونکہ اسلام دین فطرت ہے اس لیے اس نے ہر معاملہ میں اعتدال ہی کو پسندیدہ عمل قرار دیا ہے اس کی نگاہ میں جس قدر دنیا میں انہماک برا ہے اسی قدر مخلوق خدا سے کٹ کر جوگیانہ رہبانیت بھی مذموم ہے۔ نبی اکرم

Marfat.com

ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس امت کے لیے رہبانیت "جہاد فی سبیل اللہ" ہے کیونکہ میدان جہاد کے لیے انسان جب ہی قدم اٹھاتا ہے کہ وہ اپنے نفس، اپنے اہل وعیال اور ہر قسم کے دنیوی علائق سے بے نیاز ہو کر صرف خدائے تعالیٰ کی مرضی کو پورا کرنا اپنا مقصد اور نصب العین بنالے۔

③ حضرت عبداللہ بن عباس ؓ سے آیت

﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ (الکہف: ۲۳)

کے شان نزول کے متعلق یہ روایت کی جاتی ہے کہ جب مشرکین مکہ نے نبی اکرم ﷺ سے اصحاب کہف کے بارہ میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں کل وحی سے معلوم کر کے اس کا جواب دوں گا مگر آپ ﷺ کو "انشاء اللہ" کہنا یاد نہ رہا اس وجہ سے تقریباً پندرہ روز وحی کا نزول نہیں ہوا تب مشرکین نے چہ میگوئیاں شروع کر دیں اور آپ ﷺ اس وجہ سے دل فگار ہونے لگے پندرہ روز کے بعد وحی کا نزول ہوا اور اس نے واقعہ کی ضروری تفصیلات کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا کہ انسان جبکہ فردا سے ناواقف ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ جب کل کے لیے کسی بات کا وعدہ کرے تو خدا کی مشیت کا حوالہ ضرور دے دیا کرے تاکہ یہ بات کبھی فراموش نہ ہونے پائے کہ بندہ نہیں جانتا کہ کل کیا ہوگا میں زندہ بھی رہوں گا یا نہیں اور اگر زندہ بھی رہا تو وعدہ کے ایفا پر قادر ہو سکوں گا یا نہیں۔

④ دین اور ملت، خدائے تعالیٰ کی صاف اور سیدھی راہ کا نام ہے اس لیے وہ جبر واکراہ سے قلب میں نہیں اترتی بلکہ اپنی صادق روشنی سے اندھے دلوں کو روشن اور منور کرتی ہے ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ "دین کے بارہ میں کوئی زبردستی نہیں ہے" مگر اس کے برعکس باطل کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ خدا کی مخلوق پر زبردستی ظلم اور جبر سے اپنا اثر جمائے اور دلیل کی جگہ جبر سے کام لے لیکن خدا کی مشیت انجام کار صداقت (دین حق) کو غالب اور باطل کو مغلوب کر دیتی ہے اور انجام ونتیجہ حق ہی کے ہاتھ رہتا ہے مگر چونکہ خدا کی گرفت کا قانون اول کافی مہلت دیتا ہے اس لیے ظالم اقوام جہالت سے اس کو اپنی کامیابی سمجھ کر خدا کی بطش شدید سے غافل ہو جاتی ہیں اور اس لیے تاریخ بار بار اپنے سبق کو دہراتی رہتی ہے۔

⑤ تجربہ اس کا شاہد ہے کہ حق وصداقت کی تحریک اور نہ صرف یہ بلکہ ہر انقلابی تحریک جس درجہ قوم کے نوجوانوں پر اثر انداز ہوتی ہے عمر رسیدہ افراد قوم پر اس سرعت کے ساتھ اثر انداز نہیں ہوتی "علم النفس" (Psychology) کے ماہرین اس کی یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ معمر افراد کا دل ودماغ چونکہ عمر کے بڑے حصہ میں پرانی ریت ورسم کا عادی ہو جاتا ہے اور گزشتہ نظام سوسائٹی سے عرصہ تک مانوس رہ چکا ہوتا ہے اور اس کے رگ وریشہ میں قدیم اثرات راسخ ہو چکے ہوتے ہیں اس لیے ہر وہ تحریک جو قدیم نظام یا فرسودہ رسوم کے خلاف ظاہر ہوتی ہے ان کا دل ودماغ اس کے جدید اثرات سے اذیت وتکلیف محسوس کرتا ہے اور جدید وقدیم محرکات کا تصادم ان کے لیے بار بن جاتا ہے اس لیے وہ جدید انقلاب سے مانوس ہونے کی بجائے اور زیادہ متوحش ہو جاتے ہیں البتہ ان میں سے جو دل ودماغ جذبات کے مقابلہ میں عقل کو اور تاثرات کے مقابلہ میں دلائل کو راہ نما بنالیتے اور ہر معاملہ میں جدت وقدامت سے قطع نظر متانت وسنجیدگی کے ساتھ اس کی افادیت ومضرت پر غور کرنے کے

عادی ہوتے ہیں وہ اس عام اصول سے مستثنیٰ ہیں اور جب وہ انقلابی تحریک کے فوائد کو دلائل کی قوت سے محسوس کر لیتے ہیں تو اس تحریک کے لیے زبردست پشت پناہ ثابت ہوتے ہیں مگر جماعتوں اور قوموں میں عموماً ان کی تعداد کم ہوتی ہے۔

لیکن عمر رسیدہ افراد کے برعکس چونکہ نوجوانوں کے دل و دماغ بڑی حد تک غیر جانبدار ہوتے اور پرانے رسم و رواج کے لیے ابھی تک راسخ نہیں ہوتے اس لیے ان پر جدید نقوش بہت جلد منقش ہو جاتے ہیں اور وہ کسی تبدیلی اور کسی انقلاب کو محض اس لیے کہ وہ جدید محرکات کے داعی ہیں توحش کی نظروں سے نہیں دیکھتے بلکہ دلچسپی کے ساتھ اس کی طرف بڑھتے اور صاف دل و دماغ سے اس پر غور کرتے ہیں۔

اب یہ انقلابی تحریک کی ذمہ داری ہے کہ اگر اس میں صداقت اور حقانیت کارفرما ہے اور جماعتوں اور قوموں کو غلط روی سے نکال کر صراط مستقیم کی جانب داعی ہے تو اس کی جانب سرعت کے ساتھ جوق در جوق بڑھنے والوں اور پیروی کرنے والوں کی زندگی میں چار چاند لگ جاتے اور ان کا وجود کائنات ہست و بود کے لیے رحمت ثابت ہوتا ہے اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہے تو وہ ان تر و تازہ اور صاف دل و دماغ رکھنے والے نوجوانوں کو تباہی اور بربادی کی راہ پر لگا دیتی ہے اور ان کا وجود دنیائے انسانی کے لیے مصیبت اور عذاب بن جاتا ہے۔

قرآن عزیز نے اس واقعہ کے اظہار میں عبرت و موعظت کے جو پہلو نمایاں کیے ہیں ان میں سے ایک اہم پہلو اسی نفسیاتی مسئلہ کی جانب توجہ دلانا ہے۔

وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ قریش مکہ میں سے بوڑھوں اور سن رسیدہ لوگوں کی اکثریت کا اسلام کی مقدس تعلیم سے گریز اور انفرادی و اجتماعی حیات انسانی کے اس جدید انقلاب (اسلام) سے توحش اور ان کے نوجوانوں کی اکثریت کا اس کی جانب تیزی کے ساتھ متوجہ ہونا اور اس کی دعوت انقلاب کی کشش سے فوج در فوج اس کے لیے حلقہ بگوش ہو جانا دنیا کا انوکھا مظاہرہ نہیں ہے بلکہ جب کبھی بھی فرسودہ نظام اور باطل رسم و رواج کے خلاف خدا کے پیغمبروں نے حق و صداقت کا انقلاب برپا کیا ہے تو قبول حق کے لیے عمر رسیدہ انسانوں سے زیادہ نوجوانوں کے دل و دماغ پر ہی اس کا گہرا اثر پڑا ہے۔

سباء اور سیل عرم

(۲۰۰ ء تخمیناً)

○ تمہید ○ سباء ○ نام یا لقب ○ زمانہ حکومت ○ سباء اور طبقات حکومت ○ مکائب سباء اور ملوک سباء
○ وسعت حکومت ○ طرز حکومت ○ سباء کی عمارات ○ سباء کا تمدن ○ سد مارب ○ جنتان عن یمین وشمال
○ سیل عرم ○ چند تاریخی مباحث ○ تفسیری مطالب نتائج و بصائر

تمہید:

سباء اور سیل عرم کا واقعہ بھی تاریخی واقعات میں بہت اہمیت رکھتا اور قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ میں صد ہزار سامان عبرت و موعظت مہیا کرتا ہے۔

قوموں کے عروج و زوال کا پس منظر بخت و اتفاق کا رہین منت نہیں ہوتا بلکہ قانون قدرت کے مقررہ اصول کے مطابق پیش آتا ہے البتہ کبھی اسباب عروج و زوال ایسے واضح اور صاف ہوتے ہیں کہ عام طریقہ سے یا مشاہدہ میں آ جاتے ہیں اور یا عقل کی سرسری توجہ سے پہچان لیے جاتے ہیں اور کبھی ان کا وجود ایسے اسباب پر مبنی ہوتا ہے جن کا تعلق عام اسباب و وسائل سے جدا۔ خدائے تعالیٰ کی فرماں برداری اور نافرمانی سے وابستہ ہوتا ہے یعنی باسباب ظاہر اگرچہ ایک قوم میں مثلاً وہ تمام حالات و اسباب پائے جاتے ہوں جن سے کسی قوم کو عروج حاصل ہوتا ہے تاہم وہ قوم اچانک ہلاکت و بربادی کی نذر ہو جاتی اور عالم انسانی کے لیے اس کی ہلاکت حیرت انگیز واقعہ بن جاتی ہے لیکن جب خدا کی جانب سے ان کی سرکشی بغاوت اور احکام الٰہی کی پیہم خلاف ورزی کا پردہ چاک ہو جاتا ہے اور وحی الٰہی ان کے عمل اور پاداش عمل کی تفصیلات کو برسر عام لے آتی ہے تب اہل دانش یہ یقین کر لیتے ہیں کہ جس قوم کی اجتماعی زندگی کے خوب صورت خول میں ایسی مکروہ اور گھناؤنی شکل موجود تھی تو بلاشبہ اس کی ہلاکت و تباہی بخت و اتفاق کی وجہ سے نہیں بلکہ نوامیس الٰہی کے قانون پاداش عمل کے عین مطابق ہوئی ہے۔

سباء اور قوم سباء کا وہ عبرت ناک سانحہ اور ان کے عروج زوال کا وہ بصیرت افروز واقعہ جو سطور ذیل میں درج کیا جا رہا ہے قوموں کے عروج و زوال کے اس دوسرے قانون کے ہی زیر اثر عالم وجود میں آیا تھا اور تاریخ کے صفحات اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ جو قوم خوش عیشی اور رفاہیت کے اونچے درجہ پر بے خوف و خطر زندگی بسر کر رہی تھی وہ یک لخت ہلاکت و بربادی کے قعر مذلت میں کس اتفاق وقت سے نہیں گر گئی تھی بلکہ اپنے دور رس اعمال بد کی پاداش میں اس کو یہ روز بد دیکھنا پڑا تھا۔

پس مناسب یہ ہے کہ قرآن عزیز نے ان حقائق کو جس انداز میں بیان کر کے سامان موعظت و بصیرت عطاء کیا ہے تاریخ

Marfat.com

کی بے لوث شہادت سے ان کی تفاصیل کو نقل کر دیا جائے تا کہ صداقت قرآن کا یہ پہلو بھی منکرین قرآن کے حق میں حجت کاملہ بن سکے۔

سباء:

سباء قحطانی قبائل کی مشہور شاخ ہے مؤرخین عرب اس کا نسب اس طرح بیان کرتے ہیں:

سباء بن یشجب بن یعرب بن قحطان۔

مگر تورات میں یہ کہا گیا ہے کہ سباء قحطان کا بیٹا ہے۔

اور یقطان (قحطان) سے المودواد، سلف، حصار، مادت، ارخ، ہدورام، اوزال، وقلاه عوبل، ابی مائل، سباء، حضتار موت، اوفیر، حویلہ، یارج (یعرب) اور یوباب پیدا ہوئے یہ سب بنی یقطان تھے اور ان کے مکان میسا سے سفار کی راہ میں اور پورپ کے پہاڑ تک تھے۔ ❁

قحطان کو یقطان، یقطون، یقطین اور بقطین بھی کہا جاتا ہے۔ ❁

زبیر بن بکار کہتے ہیں کہ عربی میں قحطان اور عبرانی و سریانی میں یقطان اور یقطن کہتے ہیں مؤرخین جدید تورات کے بیان کو صحیح سمجھتے ہیں اس لیے کہ قحطان کی اولاد سے متعلق جو تفصیلات اس نے دی ہیں وہ تاریخی اقوال اور اثری و حضری کتبات سے مطابقت رکھتی ہیں، جدید مؤرخین کی اس تحقیق کے علاوہ یوں بھی ایسے معاملات میں تورات کا بیان دوسری روایات تاریخی کے مقابلہ میں زیادہ مستند سمجھا جاتا ہے۔

غرض سباء بروایت تورات، قحطان کا بیٹا تھا اور بروایت عرب قحطان کا بیٹا۔

اہل نسب و تاریخ کا اس پر اتفاق ہے کہ قحطان امم سامیہ کی شاخ ہے لیکن اس میں اختلاف رکھتے ہیں کہ وہ عرب عاربہ میں سے ہے یا عرب مستعربہ میں یعنی وہ بنی اسماعیل میں سے ہے اور عدنانی و قحطانی ایک ہی سلسلہ ہے یا عدنانی تو بنی اسمٰعیل ہیں اور قحطانی اس سلسلہ سے الگ قدیم سلسلہ ہے۔

بعض مؤرخین عرب کا رجحان یہ ہے کہ قحطانی بھی بنو اسماعیل ہی ہیں اور تمام اقطاع عرب بنی اسماعیل کے علاوہ اور کسی نسل سے نہیں ہیں چنانچہ علماء انساب میں سے زبیر بن بکار اور محمد بن اسحاق کی یہی رائے ہے۔ ❁ اور امام بخاری بھی اسی جانب مائل ہیں اس لیے کہ انہوں نے بخاری میں ایک باب تحریر کیا ہے: باب نسبة الیمن الی اسماعیل علیه السلام۔

اور اس باب کے تحت ایک حدیث نقل کی ہے جس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ بنی اسلم جو خزاعہ کی شاخ ہیں ان کو نبی اکرم ﷺ نے بنی اسمٰعیل فرمایا ہے اور خزاعہ بنی ازد کی شاخ ہیں اور بنی ازد باتفاق قحطانی ہیں لہٰذا قحطانی بھی بنی اسمٰعیل ہی میں سے ہوئے وہ حدیث یہ ہے:

❁ پیدائش باب ۱۱ آیات ۲۶-۳۰ ❁ الانباہ فی قبائل الرواہ لابن عبدالبر

❁ فتح الباری ج ۶ ص ۳۰۴ باب قول اللہ تعالیٰ ﴿وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا﴾

Marfat.com

خرج رسول الله ﷺ علی قوم من اسلم یتناضلون بالسوق فقال ارموا بنی اسمٰعیل فان ابا کم کان رامیًا. ❶

"ایک مرتبہ بنی اسلم کی ایک جماعت پر نبی اکرم ﷺ کا گزر ہوا دیکھا تو وہ بازار میں تیر اندازی کی مشق کر رہے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا ہاں اے اولادِ اسمٰعیل خوب تیر اندازی کرو اس لیے کہ تمہارے باپ اسمٰعیل بھی تیر انداز تھے۔"

اور کتاب احادیث الانبیاء میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں حضرت ہاجرہ علیہا السلام کا ذکر کرتے ہوئے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

تلك امکم یا بنی ماء السماء. "اے عرب یہ (ہاجرہ) تمہاری ماں ہیں۔"

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسی جملہ کی شرح میں یہ کہا ہے: کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے "بنی ماء السماء" کہہ کر اہل عرب کو اس لیے خطاب فرمایا کہ وہ اپنی اور اپنے مویشیوں کی خاطر ایسے مقامات پر خیمے لگاتے پھرتے تھے جہاں بارش کا پانی جمع ہوگیا ہو یا ماء سماء سے زمزم مراد ہے اور ان ہر دو معنی کے لحاظ سے یہ جملہ ان لوگوں کے لیے دلیل بن سکتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ تمام عرب بنی اسمٰعیل ہیں۔

اور بعض اس جملہ کی وجہ تسمیہ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ اہل عرب کی شرافت نسب اور نجابت حسب کے لیے بطور تشبیہ کے بولا گیا ہے کہ جس طرح آسمان سے نازل پانی صاف اور بے عیب ہوتا ہے اسی طرح اہل عرب بھی حسب و نسب میں بے عیب ہیں پس اگر یہ معنی مراد ہیں تو اس صورت میں یہ جملہ ان حضرات کے لیے دلیل نہیں بن سکتا۔ اور آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں:

"عنقریب اس مسئلہ کی مزید تفاصیل انشاء اللہ تعالیٰ اوائل مناقب میں آئیں گی۔" ❷

اور اس مقام پر پہنچ کر پہلے قول کو تسلیم نہیں کرتے اور آخر قول ہی کو صحیح مانتے ہیں جیسا کہ عنقریب معلوم ہو جائے گا۔

اور محققین کا یہ دعویٰ ہے کہ تمام عرب کے انساب کا منبع دو ہیں۔ عدنان اور قحطان عدنان، بنی اسمٰعیل اور عرب مستعربہ ہیں اور قحطان عرب عاربہ، گویا ان کے نزدیک قحطانی بنی اسمٰعیل نہیں ہیں چنانچہ ہمدانی ابن عبدالبر، ابن کثیر، ابن حجر عسقلانی، ابن کلبی اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اسی کے قائل ہیں۔

قال هشام و من زعم ان قحطان لیس من ولد اسمٰعیل فانه یقول قحطان هو یقطون بن عابر بن شالخ بن ارفخشذ بن سام بن نوح قال ابوعمر هکذا قال ابن الکلبی فی العرب العاربة و رأیت بخط ابی جعفر العقیلی قال نا محمد بن اسمٰعیل قال نا سلام بن مسکین قال نا عون بن ربیعه عن یزید الفارسی عن ابن عباس قال العرب العاربة قحطان بن الهمیسع والامداد والسالفاتِ و حضرموت و هذا حدیث حسن الاسناد و هو اعلیٰ ما روی فی هذا الباب و اولیٰ بالصواب. ❸

"ہشام کہتے ہیں اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قحطان بنی اسمٰعیل میں سے نہیں ہیں تو وہ اس کا نسب نامہ یہ بیان کرتے ہیں قحطان

---

❶ تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۵۶ ❷ فتح الباری ج ۶ ص ۳۰۴ باب قول اللہ تعالیٰ ﴿وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِیْمَ خَلِیْلًا﴾
❸ الانباہ علی قبائل الرواہ ص ۵۷۔۵۸

(یقطون) بن عابر بن شالخ بن ارفخشذ بن سام بن نوح۔ ابوعمر (ابن عبدالبر) کہتے ہیں کہ ابن کلبی نے بھی عرب عاربہ کی تفصیل کرتے ہوئے اسی طرح بیان کیا ہے اور میں نے ابوجعفر عقیلی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ روایت دیکھی ہے کہ انہوں نے محمد بن اسماعیل سے بسلسلہ سند یہ سنا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ قحطان بن الہمیسع اور امداد اور سالفات اور حضر موت یہ سب عرب عاربہ ہیں اور اس حدیث کی سند حسن ہے اور اس مسئلہ میں یہ قول بلحاظ روایت بھی اعلیٰ درجہ کا ہے اور قرین صواب بھی ہے۔"

بلکہ ابن کثیر تو یہ کہتے ہیں کہ جمہور کی یہی رائے ہے:

لکن الجمہور علی ان العرب القحطانیۃ من عرب الیمن و غیرھم لیسوا من سلالۃ اسمٰعیل و عندھم ان جمیع العرب ینقسمون الی قسمین قحطانیۃ و عدنانیۃ۔ ❶

"لیکن جمہور کی تحقیق یہ ہے کہ قحطانی عرب خواہ وہ یمنی ہوں یا غیر یمنی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے نہیں ہیں اور ان کے نزدیک تمام عرب دو اصل پر تقسیم ہیں قحطانی اور عدنانی۔"

اور جمہور کی جانب سے "بنی اسلم" سے متعلق حدیث کا حافظ ابن حجر نے یہ جواب دیا ہے کہ اس حدیث سے یہ استدلال صحیح نہیں ہے کہ جو قبائل بھی قحطان کی جانب منسوب ہیں وہ سب بنی اسماعیل ہیں اس لیے کہ بعض قحطانی قبائل وہ ہیں جن کے متعلق علماء انساب میں سخت اختلاف ہے کہ وہ قحطانی ہیں یا عدنانی مثلاً بنی خزاعہ کے بارہ میں یہی بحث ہے، تو یہ ممکن ہے کہ بنی اسلم کے متعلق بھی اسی قسم کا اختلاف موجود ہو (چنانچہ موجود ہے) اور ابن عبدالبر نے اسی حدیث کو بروایت صحیح نقل کیا ہے اور اس میں یہ اضافہ ہے کہ بنوخزاعہ اور بنواسلم دونوں تیراندازی کر رہے تھے تو یہ ہوسکتا ہے کہ خزاعہ کی اکثریت کی وجہ سے آپ نے تغلیباً ایسا فرمادیا ہو۔ ❷

لیکن ان جوابات کے علاوہ حافظ ابن حجر نے انساب عرب کے مشہور عالم ہمدانی سے یہ نقل کیا ہے کہ یمن کی حکومت کے زوال کے بعد جو قحطانی قبائل حجاز میں آ کر بس گئے تھے ان کے اور عدنانی قبائل کے درمیان ازدواجی رشتے بکثرت ہونے لگے تھے۔ اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سبیل توسع ایسا ارشاد فرمایا یعنی پدری سلسلہ کی بجائے مادری سلسلہ سے ان کو بنی اسماعیل فرمایا ہے۔

ہمدانی کا یہ جواب تاریخی نقطہ نظر سے بالکل صحیح ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یمن سے نکلنے کے بعد قحطانی اور عدنانی قبائل کے مابین ازدواجی رشتہ نے ہی یہ صورت پیدا کردی ہے کہ بعض اہل نسب مشہور قحطانی قبائل کو عدنانی اتحطانی کہتے نظر آتے ہیں مثلاً انصار (اوس خزرج) کے متعلق تمام محققین علم الانساب کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ قحطانی الاصل ہیں مگر اسی ازدواجی رشتہ سے کبھی بہ سبیل توسع ان کو عدنانی بھی کہہ دیا جاتا ہے اور اس نے بعض مورخین کو یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ وہ قحطانی نہیں بلکہ عدنانی ہیں۔ چنانچہ ابن عبدالبر کہتے ہیں:

فاول ذٰلک الازد وھی جرثومۃ من جراثیم قحطان و افترقت الازد و فیما ذکر ابن عبدہ و غیرہ من علماء الانساب علی نحو سبع و عشرین قبیلۃ فمنھم الانصار۔ ❸

---

❶ تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۵٦ ❷ فتح الباری ج ٦ ص ۴۲۰ ❸ الانباہ ص ۱۰٦

Marfat.com

قال ابن اسحاق امھما قیلہ ابنتہ کاھل بن عدرۃ من قضاعہ کانت تحت حارثہ بن ثعلبہ ۔ ❶

و روی عن عمر بن الخطاب و عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنھم) ان قضاعۃ بن معد (بن عدنان) ۔ ❷

"قبائل یمن میں سے پہلا قبیلہ ازد ہے اور قحطانی سلسلہ کی شاخ ہے اور ابن عبدہ وغیرہ علماء انساب کے اقوال کے مطابق ازد کی تقریباً ستائیس شاخیں ہیں پس ان ہی میں سے انصار (اوس و خزرج) بھی ہیں ابن اسحاق کہتے ہیں کہ اوس و خزرج کی والدہ قیلہ بنت کاہل بن عزرہ بنی قضاعہ میں سے تھی جو حارثہ بن ثعلبہ (قحطانی) کے نکاح میں آئی حضرت عمر بن الخطاب اور حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہم) سے منقول ہے کہ قضاعہ بن معد (بن عدنان) کی نسل سے ہیں۔

اسی طرح مصنف ارض القرآن کا وہ قول بھی درست ہے جو انہوں نے اس سلسلہ میں بیان کیا ہے کہ بعض علماء انساب و حدیث خود قحطان کو اسماعیلی کیوں کہتے ہیں وہ فرماتے ہیں۔

اس مبالغہ میں اصل حقیقت صرف یہ ہے کہ بعض قحطانی اسماعیلی ہیں اور یمن میں سکونت کے باعث یا کسی اور سبب سے ان کو قحطانی فرض کر لیا گیا ہے۔

ایک جانب بعض عدنانی قبائل کا یمن میں مقیم ہو جانا اور دوسری جانب سب کے انتشار سے بعض قحطانی قبائل کا حجاز، شام، عراق، نجد، بحرین میں جا کر وطن بنا لینا اور عدنانی قبائل کے ساتھ ازدواجی رشتے قائم کر لینا یہ وہ امور ہیں جن کی وجہ سے بعض قبائل کے متعلق قحطانی اور عدنانی ہونے میں اختلاف پیدا ہو گیا البتہ اہل عرب کو خود قحطان کے متعلق اسماعیلی ہونے کا خیال کیوں پیدا ہوا؟ اس کے جواب میں ہم مصنف ارض القرآن سے متفق نہیں ہیں کیونکہ جو اہل نسب اور علماء حدیث قحطان کو بنی اسماعیل میں سے سمجھتے ہیں وہ یہ بات اس الجھاؤ کی وجہ سے ہرگز نہیں کہتے کہ بعض عدنانی قبائل یمن میں بس جانے کی وجہ سے قحطانی کہلانے لگے جیسا کہ سید صاحب کا خیال ہے بلکہ یہ تو ایک مستقل نظریہ ہے جو بعض علماء نسب و حدیث کے درمیان اس لیے مقبول ہے کہ ان کے نزدیک تمام عرب صرف حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں اور ان کے نزدیک عرب مستعربہ کے علاوہ عرب بائدہ اور عرب عاربہ کی کوئی شاخ عرب میں باقی ہی نہیں رہی۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا حجاز کعبۃ اللہ اور حرم کے ساتھ جو تعلق ہے اس کی عظمت اور اکثر قبائل عرب کے ابوالقبائل ہونے کا علاقہ ہے اس کی اہمیت یہ دو اہم باتیں ہیں کہ جن کی وجہ سے غالباً بعض قحطانی قبائل نے بھی خود کو عدنانی کہنا شروع کر دیا خصوصاً مقیم حجاز قبائل نے اس کو زیادہ نمایاں کیا نتیجہ یہ نکلا کہ جو قبائل خود کو اس پردہ میں نہیں چھپا سکتے تھے انہوں نے اس سے بڑھ کر ایک اور قدم اٹھایا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ خود قحطانی بھی اسماعیلی ہے تاکہ عدنانی اور قحطانی کا یہ فرق باقی ہی نہ رہے جو ایک کے اسماعیلی اور دوسرے کے غیر اسماعیلی ہونے سے باہمی امتیاز و شرف کا سبب بنتا تھا اور اسی بنا پر علماء انساب کے درمیان یہ مسئلہ اختلافی بن گیا اور علماء حدیث میں سے بعض محدثین نے غالباً اس لیے اس نظریہ کی تائید کی کہ ان کے سامنے چند ایسی صحیح روایات تھیں جن سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ شاید کل عرب بنی اسماعیل ہی ہیں مثلاً حدیث کا یہ جملہ ((تلک امکم یا بنی ماء السماء)) میں ایک قسم کا عموم پایا جاتا ہے مثلاً بعض ایسے قبائل کے متعلق کہ جن کو قحطانی سمجھا جاتا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کے لیے "بنی اسمٰعیل" فرمانا مگر ان محدثین کا یہ خیال

---

❶ الانباہ ص ۶۳ ❷ ایضاً ج ۱ ص ۲۷۷

Marfat.com

صحیح نہیں ہے جیسا کہ ہم حافظ ابن حجر، ابن عبدالبر، ابن کثیر بلکہ حضرت عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کے مقالات سے ثابت کر چکے ہیں کہ وہ روایات کے ان الفاظ کا مطلب کیا سمجھتے ہیں بلکہ ابن عبدالبر نے اس مسئلہ کو صاف کرتے ہوئے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اس دعوے کے ثبوت میں بعض مرفوع احادیث بھی پیش کی جاتی ہیں جن میں جرہم سلف اور ثقیف کو مستثنیٰ کرتے ہوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

((العرب کلها من ولد اسماعیل)). [1]

معلوم رہے کہ یہ اور اس قسم کی تمام روایات نا قابل اعتماد اور نا قابل حجت ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب ان کی نسبت غلط ہے اور ابن عبدالبر کے اس قول سے بھی ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے۔

قال ابو عمر اکثر الاختلاف المذکور فی کتابنا هذا و فی غیره من اهل النسب تولد من اختلافهم فی النسبة جمیع العرب الی اسمٰعیل بن ابراهیم (علیهما السلام) علی ما قدمنا ذکره فی کتابنا هٰذا فی باب قحطان وغیره. [2]

"ابو عمر (ابن عبدالبر) کہتا ہے کہ ہماری اس کتاب میں اور اس کے علاوہ نسب کی دوسری کتابوں میں قبائل کے متعلق جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ اس نظریہ کی بدولت پیدا ہوا ہے کہ تمام عرب اسماعیل بن ابراہیم (علیہما السلام) کی اولاد ہیں جیسا کہ ہم اسی کتاب میں قحطان اور بعض دوسرے ناموں کے تحت ذکر کر آئے ہیں۔"

اور ابن کثیر کے اس قول سے بھی:

قیل ان جمیع العرب ینتسبون الی اسمٰعیل بن ابراهیم (علیهما السلام) والتحیة والاکرام والصحیح المشهور ان العرب العاربة قبل اسمٰعیل و قد قدمنا ان العرب العاربة منهم عاد و ثمود و طسم و جدلیس و امیم و جرهم و العمالیق و امم اخرون لا یعلمهم الا الله کانوا قبل الخلیل علیه الصلٰوة والسلام و فی زمانه ایضًا. [3]

"کہا جاتا ہے کہ تمام عرب حضرت اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام کی نسل سے ہیں اور صحیح اور مشہور قول یہ ہے کہ عرب عاربہ حضرت اسماعیل علیہ السلام سے پہلے عرب کے ساکن ہیں اور ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ عاد، ثمود، طسم، جدلیس، امیم، جرہم اور عمالیق اور ان کے علاوہ اور قبائل جن کا حال صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے سے تھے اور ان کے زمانہ میں عرب میں ان کی نسلیں پائی گئی ہیں۔"

پس حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کے متعلق جو انہوں نے اہل عرب کو مخاطب کرتے ہوئے حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے سلسلہ میں فرمایا یعنی "تلك امكم یا بنی ماء السماء" باآسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ یا تو انہوں نے عدنانی قبائل کی اکثریت کے پیش نظر جو حجاز میں آباد تھی تغلیباً یہ فرما دیا اور یا اس لیے فرمایا کہ عرب کے قحطانی قبائل ہوں یا عدنانی پدری یا مادری کسی نہ کسی سلسلہ سے بنی ہاجرہ ضرور ہیں۔

---

[1] الانباہ ص ۹۲ [2] وهی اثار کلها ضعیفه الاسناد ایضاً ص ۱۰۶ [3] ابن اثیر ج ۲ ص ۱۵۶

Marfat.com

اس کے برعکس اگر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے اس مقولہ کا مطلب یہ لیا جائے کہ تمام عرب پدری سلسلہ سے حقیقتاً بنی اسمٰعیل ہیں تو یہ واقعہ کے بھی خلاف ہو گا اور ان صحیح روایات کے بھی مخالف رہے گا جن سے یہ ثابت ہے کہ عرب کے قبائل کا سلسلہ نسب قحطانی اور عدنانی قبائل کے علاوہ بنی جرہم اور بعض دوسرے ان قبائل سے بھی تعلق رکھتا ہے جو عرب عاربہ کہلاتے تھے۔ اور توراۃ اور مؤرخین تو اس کے متعدد سلسلے بیان کرتے ہیں۔

نام یا لقب:

سباء نام ہے یا لقب؟ یہ بھی ایک سوال ہے جو اس جگہ زیر بحث آتا ہے توراۃ کہتی ہے کہ یہ نام ہے اور مؤرخین عرب کہتے ہیں کہ سباء لقب ہے اور نام عمرو یا عبد شمس [1] ہے، عصر حاضر کے اہل تاریخ اسی کو صحیح سمجھتے ہیں پھر عرب کے اہل تاریخ سباء کا وجہ لقب یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ لفظ "سبا" بمعنی "قید" سے ماخوذ ہے چونکہ اس نے عرب میں سب سے پہلے جنگی قیدیوں کا طریقہ رائج کیا اور ان کو غلام بنایا اس لیے سباء لقب پایا اور جدید مؤرخین کہتے ہیں کہ یہ "س، ب، الف، مع ہمزہ سے مرکب" ایسے لفظ سے ماخوذ ہے جس کے مفہوم میں تجارت کے معنی داخل ہیں اور سباء اور قوم سباء چونکہ تاجر پیشہ قوم تھی اس لیے سباء کے نام سے مشہور ہوئی چنانچہ آج بھی بعض عرب میں یہ لفظ شراب کی تجارت کے لیے بولا جاتا ہے "سبا الخمر شراها ليشربها و سبى سباء الخمر حملها من بلد الى بلد" [2] ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس کا لقب "الرائش" بھی تھا لغت میں ریش یا ریاش کے معنی مال کے آتے ہیں یہ چونکہ بہت بڑا فیاض اور سخی تھا اور لوگوں کو کثرت سے مال و متاع دیتا رہتا تھا اس لیے اس لقب سے مشہور ہوا۔

زمانہ حکومت:

عام مؤرخین یہ کہتے ہیں کہ سباء نے چار سو چوبیس برس حکومت کی [3] مگر جدید فلسفہ تاریخ کے لحاظ سے اس کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ یہ خاندان سباء کی مدت حکومت بیان کی گئی ہے لیکن یہ قاعدہ اس جگہ صحیح نظر نہیں آتا اس لیے کہ اگر قحطان کی تیسری پشت سے اس مدت کو شروع کیا جائے تو یہ تقریباً ۲۵۰۰ ق م ہو سکتی ہے۔ اس حساب سے سباء کی حکومت کو ۲۰۰۰ ق م ختم ہو جانا چاہیے حالانکہ ہم حضرت سلیمان علیہ السلام کے تذکرہ میں توراۃ سے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ۹۵۰ ق م میں ملکہ سباء "بلقیس" نے حاضر خدمت ہو کر سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہے اور بہت سے تحفے پیش کیے ہیں اور جیسا کہ سورۂ نمل میں ملکہ سباء کے واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے یہ زمانہ سباء کی حکومت کا زمانہ عروج ہے چنانچہ زبور میں حضرت داؤد علیہ السلام کی یہ دعا مذکور ہے:

> "اے خدا بادشاہ کو اپنی عدالتیں عطاء کر اور بادشاہ کے بیٹے کو اپنی صداقت دے وہ تیرے لوگوں میں صداقت سے حکم کرے گا ترسیس اور جزیروں کے سلاطین نذریں گزاریں گے اور وہ جیتا رہے گا اور سباء کا سونا اسے دیا جائے گا اس کے حق میں سدا دعا ہوگی۔" [4]

حضرت داؤد علیہ السلام کی یہ دعا مقبول ہوئی اور ۹۵۰ ق م میں ان کے صاحبزادے حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں ملکہ نے حاضر ہو کر بہت سا سونا اور بیش قیمت جواہرات پیش کیے۔

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۵۸ و تفسیر ابن کثیر ج ۳ [2] اقرب الموارد [3] البدایہ والنہایہ ج ۲ [4] زبور ۷۲

Marfat.com

لہٰذا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو سباء کی عمر کے متعلق مبالغہ سے کام لیا گیا ہے اور یا اس سے سباء کے پورے دور حکومت کی مدت نہیں بیان کی گئی بلکہ ان کی حکومت کے دوسرے دور یعنی ملوک سباء کی مدت حکومت مراد ہے جو کم وبیش چار سو چھتیس سال ہے۔ [1]

سباء اور طبقات حکومت:

مؤرخین کہتے ہیں کہ سباء کے دو بیٹے تھے ایک حمیر اور دوسرا کہلان اور تمام قحطانی قبائل ان ہی دو سلسلوں سے وابستہ ہیں اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ عدنانی (اسماعیلی) قبائل جو نابت اور قیدار کی اولاد ہیں ان کا اصلی وطن شمالی عرب ہے اور قحطانی قبائل کا مسکن جنوبی عرب (یمن) ہے۔

اور عام اہل نسب جب حکومت سباء کا ذکر کرتے ہیں تو وہ حمیر کو براہ راست سباء کا جانشین کہہ دیتے ہیں اور تمام سلسلہ حکومت کو حمیری حکومت ہی سے یاد کرتے ہیں اور سباء کی حکومت کو مستقل حیثیت نہیں دیتے حالانکہ تاریخی حیثیت سے یہ نظریہ بالکل غلط ہے اس لیے کہ سباء یمن کے دور حکومت سے متعلق جو کتبات اثری اور حضری ذرائع سے برآمد ہو رہے ہیں نیز یونانی اور رومی معاصر سباء مؤرخین کی جو تاریخی شہادتیں ہیں ان سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سباء کی حکومت دو طبقات میں منقسم رہی ہے اور پھر ہر دو طبقات کا زمانہ حکومت جدا جدا دو دوروں میں تقسیم ہے۔

طبقہ اولیٰ کا پہلا دور تقریباً ۱۱۰۰ ق م سے شروع ہو کر ۵۵۰ ق م پر ختم ہوتا ہے کیونکہ بلحاظ کتبات سب سے پہلے حکومت سباء کا ذکر زبور ۹۵۰ ق م میں ہوا ہے اور یہ ان کے عروج کا زمانہ قیاس کیا گیا ہے اس دور میں شاہان سباء کا لقب مکارب سباء نظر آتا ہے اور سلیمان علیہ السلام کے زمانہ کی ملکہ سباء (بلقیس) اسی دور سے تعلق رکھتی ہے اور طبقہ اولیٰ کا دوسرا دور ۵۵۰ ق م سے شروع ہو کر ۱۱۵ ق م پر ختم ہوتا ہے جیسا کہ علم الآثار سے ثابت ہو چکا ہے اور "سیل عرم" اور "سباء کا انتشار" اسی دور سے متعلق ہے اس دور کے بادشاہ "ملوک سبا" کہلاتے ہیں۔

اور طبقہ ثانیہ کا پہلا دور ۱۱۵ ق م سے شروع ہو کر اواخر ۳۰۰ء پر ختم ہو جاتا ہے یہ بادشاہ ملک سباء وریدان اور ملوک حمیر کہے جاتے ہیں اور ریدان ان کے مشہور قلعہ کا نام ہے اور سباء اور حمیر قومیت کو ظاہر کرتا ہے۔ حمیری سنہ اگرچہ غیر معروف رہا ہے لیکن ان کے ایک کتبہ میں حبشہ کے حملہ یمن اور ذونواس کی موت کا تذکرہ ہے چونکہ یہ واقعہ عرب اور رومی تاریخی روایات کے مطابق ۶۲۵ء میں پیش آیا اور کتبہ میں ۶۴۰ حمیری درج ہے لہٰذا اس کو پیش نظر رکھ کر سنہ حمیری کی ابتداء ۱۱۵ ق م سے مطابقت رکھتی ہے اس دور میں سباء کا یہ خاندان صرف یمن اور اطراف یمن کا حکمران رہا ہے۔

اور طبقہ ثانیہ کا دوسرا دور ۳۰۰ء کے اواخر سے شروع ہو کر ۵۲۵ء پر ختم ہوتا ہے اور یہ وہ زمانہ ہے کہ جب آخری مرتبہ اہل حبش یمن پر قابض ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ آفتاب اسلام کی ضیاء یمن تک پہنچتی ہے اور سارا یمن ایک ہی روز مشرف بہ اسلام ہو جاتا ہے اس دور میں حکومت کا تسلسل باقی نہیں رہا بلکہ ۳۴۰ء کے وسط میں پہلی مرتبہ اکسومی حبشی خاندان نے کچھ عرصہ کے لیے یمن پر فاتحانہ قبضہ کر لیا تھا مگر چند سال کے بعد حمیر پھر اس کو واپس لے لیتے ہیں اس دور میں شاہان سباء کا لقب مؤرخین عرب کے نزدیک تبع ہو جاتا ہے اور یہ "تبابعہ یمن" کہلاتے ہیں سامی زبان میں "تبع" کے معنی "سلطان اور قاہر بادشاہ" کے ہیں چونکہ اس دور میں شاہان حمیر

[1] ارض القرآن

یمن کے علاوہ حضر موت حبشہ، نجد اور تہامہ تک اپنی حدود مملکت کو وسیع کر لیا تھا اس لیے وہ اس لقب سے مشہور ہوئے چنانچہ ان کے دور کے کتبات میں "ملک سباء دریدان وحضر موت وغیرہ ملکوں کے نام اضافہ ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں اور یہی وہ "تبع ہیں جن کا ذکر قرآن کی سورۂ دخان اور سورۂ ق میں کیا گیا ہے دریدان کا قلعہ ان کا ابتدائی دارالحکومت رہا ہے اور یہ شہر ظفار کے قریب آباد تھا جو صنعا (موجودہ دارالحکومت یمن) کے متصل ہے اور جب سباء کے طبقہ اولیٰ کے انتشار سے اس کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا تو حمیر نے مارب تک اپنی حکومت کو وسیع کر لیا۔

سباء کے طبقات کی یہ تقسیم مشہور مؤرخ حمزہ اصفہانی کے بیان سے ہوتی ہے۔

و اول من ملك اولاد قحطان حمير بن سبا فبقى مليكا حتى مات هرمًا و توارث ولده الملك بعده فلم يعدهم الملك حتى مضت قرون وصار الملك الى الحارث و هو تبع الاول فمن ملك اليمن قبل الرائش ملكان ملك بسبا و ملك بحضر موت فكان لا يجمع اليمانيون كلهم عليهم الى ان ملك الرائش فاجتمعوا عليه و تبعوه فى تبعًا. ❶

"قحطان کی اولاد میں جو پہلا بادشاہ ہوا وہ حمیر بن سباء ہے یہ آخری وقت تک بادشاہ رہا یہاں تک کہ بوڑھا ہو کر مر گیا پھر حکومت اس کی اولاد میں وراثۃً جاری رہی اور چند صدیوں تک ان کے ہاتھ سے نہیں نکلی پھر حارث الرائش بادشاہ ہوا جو پہلا تبع ہے اس سے پہلے دو بادشاہ ہوتے تھے ایک سباء میں اور ایک حضر موت میں تمام یمنی ایک پر جمع نہیں ہوتے تھے لیکن جب الرائش بادشاہ ہوا تو اس کی بادشاہی پر سب مجتمع ہو گئے اور اس کی اطاعت قبول کر لی اس لیے اس کا لقب تبع ہوا۔"

اور مؤرخ محدث ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی اپنی تاریخ میں یہی بیان کیا ہے:

و كانت العرب تسمى كل من ملك اليمن مع الشحر و حضر موت تبعا كما يسمون من ملك الشام مع الجزيرة قيصر و من ملك الفرس كسرىٰ و من ملك مصر فرعون و من ملك الحبشة النجاشي و من ملك الهند بطليموس. ❷

"اور عرب اس بادشاہ کو یمن کے ساتھ شحر اور حضر موت کا بھی بادشاہ ہو تبع کہتے ہیں جیسا کہ اس بادشاہ کو جو شام اور جزیرہ دونوں کا حکمران ہو قیصر کہتے ہیں اور جو فارس کا بادشاہ ہو اس کو کسریٰ اور ملک مصر کے بادشاہ کو فرعون اور حبشہ کے بادشاہ کو نجاشی اور ہندوستان کے بادشاہ کو بطلیموس کہتے ہیں۔"

غرض یہ خیال کہ سباء کی حکومت اور حمیری حکومت ایک ہی بات ہے نہ صرف تاریخ ہی کے خلاف ہے بلکہ خود قرآن عزیز کی تصریحات کے بھی خلاف ہے اس لیے کہ قرآن عزیز نے حکومت سباء سے متعلق سورۂ نمل اور سورۂ سبا میں جو دو واقعے بیان کیے ہیں ان کا تعلق سباء کے اس طبقہ سے ہے جو ملوک حمیر اور تبابعہ سے قبل گزرا ہے اور اس لیے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حمیر ہرگز سباء کا بلاواسطہ بیٹا نہیں ہے بلکہ اس کے اور حمیر کے درمیان بہت زیادہ واسطے ہیں اور حمیر اگرچہ سباء کا بیٹا ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس

❶ ص ۱۰۸ مطبوعہ کلکتہ ❷ البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۵۹

Marfat.com

کا اپنا زمانہ اور اس کی نسل میں قیام حکومت کا زمانہ ایک ہے بلکہ قیاس یہ چاہتا ہے کہ سباء کے بعد اس کی اولاد میں حکومت کا وہ سلسلہ جو طبقہ اولیٰ سے تعلق رکھتا ہے بجائے حمیر کی نسل کے کہلان کی کسی قدیم شاخ میں قائم رہا ہے کیونکہ مارب اور سباء کی نو آبادیوں کی تباہی کا اثر ہم بنی کہلان میں زیادہ پاتے ہیں اور مارب تک حمیری حکومت کی ابتداء سباء کی بربادی سے شروع ہوتی ہے چنانچہ عام مؤرخین کے خلاف ابن عبدالبر نے یہ تصریح کی ہے کہ سباء کی حکومت صرف حمیر کی نسل ہی میں نہیں رہی بلکہ کہلان کے خاندان میں بھی یہ سلسلہ رہا ہے وہ فرماتے ہیں:

وولد سبا حمیر بن سبا و کہلان بن سبا فمن حمیر و کہلان کانت ملوک الیمن من التبابعة والاذواء.

"اور سباء کے دو بیٹے تھے حمیر اور کہلان اور حمیر و کہلان دونوں ہی کی نسل سے یمن کے بادشاہ تبع اور ذو ہوئے ہیں۔"

مکارب سباء وملوک سباء:

سباء (طبقہ اولیٰ) کے دور اول کے حکمران تاریخ میں "مکارب سبا" کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں یہ لفظ "مکا" بمعنی مذہبی اور "رب" بمعنی مالک سے مرکب ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سباء کا ابتدائی دور حکومت مذہبی پیشواؤں یعنی کاہن حکمرانوں سے شروع ہوتا ہے ان بادشاہوں کا دارالحکومت صرواح تھا اور یہ مارب اور صنعاء کے درمیان واقع تھا اور اس کے کھنڈرات بھی موجود ہیں اور ملوک سباء (شاہان سبا) کا دارالحکومت مارب تھا اور ان کا بادشاہ اس کے مشہور قلعہ "سلحین" میں رہتا تھا۔ ابن علقمہ جاہلی شاعر مسلمان مؤرخین سے قبل ان دونوں زمانہ ہائے حکومت کو الگ الگ ظاہر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

من یا من الحدثان بعد ملوک صرواح و مارب

صرواح اور مارب کے بادشاہوں کے بعد اب کون حوادث سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

اور یہی شاعر قلعہ سلحین کا بھی ذکر کرتا ہے۔

و قیصر سلحین قد عفاہ ریب الزمان الذی یریب

اور سلحین کا محل، جس کو زمانہ کے حوادث نے فنا کر دیا۔

وسعت حکومت:

حکومت سباء کی ابتداء جنوبی عرب "یمن" کے مشرقی حصہ سے ہوتی ہے اس کا دارالحکومت اول صرواح تھا اور پھر مارب ہوا آہستہ آہستہ اس حکومت نے ترقی کی اور ملکی فتوحات کے ساتھ ساتھ تجارتی ذرائع سے بھی بہت زیادہ کامیابی حاصل کی اس لیے اس کا رقبہ حکومت وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا اور شمالی عرب اور افریقہ تک اس کے حدود نظر آنے لگے چنانچہ حبشہ میں اذنیہ کا ضلع اسی کے مقبوضات میں تھا اور حکومت سباء کی جانب سے مغافر کے لقب سے ایک سبائی حکومت کرتا تھا یمن سے براہ حجاز شام تک جو قدیم تجارتی شاہراہ تھی اور جس کا ذکر قرآن عزیز نے سورۂ قریش میں "رحلة الشتاء والصیف" کہہ کر کیا ہے اور دوسری جگہ جس کو امام مبین فرمایا ہے وہ بھی ان ہی کے قبضہ میں آ گئی تھی اور شام فلسطین اور مدین کے نواح میں بھی ان کے مقبوضات موجود تھے اور ا

Marfat.com

طرح تقریباً آٹھویں صدی قبل مسیح میں اہل معین پر غلبہ پانے کے بعد سباء کی حکومت عرب کی عظیم الشان متمدن حکومت تھی۔ ❶

طرز حکومت:

سباء کے طرز حکومت کے متعلق اہل تاریخ یہ کہتے ہیں کہ اس زمانہ کے محدود سلسلہ رسل و رسائل کے پیش نظر یہ ضروری سمجھتا تھا کہ دارالحکومت سے فاصلہ پر آباد شہروں اور بستیوں پر آزاد گورنروں کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں ہوں اور جو مرکزی حکومت کے تابع اور اس کے نائب کی حیثیت سے حکومت کیا کریں۔ پس اس اصول پر یمن کی حکومت قائم تھی اور اس کی ترتیب و تنظیم اس طرح پر تھی کہ آس پاس کے گاؤں اور قصبوں کے درمیان عموماً ایک قلعہ ہوتا تھا جس پر قلعہ دار رہتا تھا اور وہی ان آبادیوں کا حاکم اور ذو کہلاتا تھا اور اس مجموعہ آبادی کو "محفد" کہتے تھے۔ یمنی زبان میں ذو کے معنی "آقا" کے ہیں جو عربی میں بمعنی صاحب و مالک بولا جاتا ہے اور اس کی جمع اذواء آتی ہے اور قلعہ کا جو نام رکھا جاتا تھا اسی کے انتساب سے قلعہ دار کا لقب قرار پاتا تھا مثلاً ذو غمدان ذو ثعلبان۔

پھر چند محفد مل کر ایک "مخلاف" بنتا تھا اور اس مخلاف کے حاکم کو قیل (صوبہ دار) کہتے تھے قیل کی جمع "اقیال" ہے اور یہ سب اقیال "ملک" (بادشاہ) کے تابع فرمان ہوتے تھے ان ہی بادشاہوں کو یمن کی تاریخ میں مکارب سباء کہا جاتا تھا اور بادشاہ کا بھی ایک زبردست اور محکم قلعہ ہوتا تھا چنانچہ قلعہ "ریدان" اور "سلحین" ان ہی بادشاہوں کے قلعے تھے اور یہ بادشاہ ان ہی قلعوں اور دارالحکومت کے شہروں کے انتساب سے لقب پاتے تھے مثلاً ایک سباء وذوریدان یا ملک سباء ذو سلحین" مارب کے آثار سے جو سکے حاصل کیے گئے ہیں ان پر یہ نقش کندہ ہے "ضرب بیت سلحین وحضر مارب" یعنی یہ قلعہ سلحین اور شہر مارب میں مسکوک کیا گیا۔

یمن کے اسلامی حکومت میں شامل ہونے کے بعد بھی "اذواء" اور "اقیال" کا یہ نظم حکومت باقی رکھا گیا اور یہی وہ اقیال یمن ہیں جن کو نبی اکرم ﷺ نے دعوت اسلام کے لیے نامہ ہائے مبارک تحریر فرمائے اور انہوں نے برضا و رغبت دعوت اسلام کو قبول کیا۔

سباء کی عمارات:

ہمدانی جو کہ قدیم مؤرخین کی طرح جدید یورپ کی نگاہ میں بھی بہت مستند اور سچا مؤرخ تسلیم کیا جاتا ہے اس نے اپنی مشہور کتاب اکلیل میں ایک باب سبا کی عظیم الشان اور عجیب وغریب عمارات کے لیے مرتب کیا ہے اور حکومت سبا کے سلسلہ میں جو کتبات پائے گئے ہیں ان میں بھی اکثر ان قلعوں اور بے نظیر عمارات ہی کے کتبے ہیں اور یورپین سیاح بھی ان کھنڈرات کے عجیب وغریب حالات سناتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ قصر غمدان ❷ بے مثل صناعی کا نمونہ تھا یہ قصر بیس منزل رکھتا تھا اور ہر ایک منزل کا ارتفاع بقدر دس گز معماری اور سب سے اوپر کی منزل نہایت بیش قیمت آبگینوں سے بنائی گئی تھی اور اس قصر میں سو وسیع و عریض کمرے تھے اسی طرح بے نظیر عمارات کا سلسلہ تھا جو اس زمانہ کے رفیع تمدن اور سبا کی حیرت انگیز ترقی کا آئینہ دار تھا۔

---

❶ دائرۃ المعارف للبستانی (سبا) معجم البلدان (یمن)

❷ قال ابن غمدان قصر بالیمن بناہ یعرب بن قحطان وملکہ بعدہ واختلہ واثلہ بن یعرین سبا ویقال کان ارتفاعہ عشرین طبقہ البدایہ والنہایہ ج۲ ص۱۷۹۔

سبا کا تمدن:

گزشتہ سطور میں کہا جا چکا ہے کہ اہل سبا ایک تاجر قوم تھی اور یہ وصف ان کا قومی مزاج بن گیا تھا اس لیے وہ حکومت کے وسائل ترقی کے لیے بھی اسی کو زیادہ اہم وسیلہ سمجھتے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کے حدود حکومت میں جو خزانے مدفون کر رکھے تھے وہ اور زیادہ ان کی اس فطرت کے لیے تائید غیبی بن گئے تھے کیونکہ عرب میں سونے اور جواہرات کی بہ کثرت کانیں موجود ہیں اور ان کا بیشتر حصہ ان ہی کے رقبہ حکومت میں موجود تھا۔ مدین میں سونے کے علاوہ دوسری قسم کی معدنیات بھی پائی جاتی ہیں حضرموت اور یمن کا علاقہ خوشبودار اشیاء کی پیداوار کے لیے مشہور تھا اور اب بھی ہے عمان اور بحرین میں موتیوں کے خزانے ہیں جن سے آج بھی تمام دنیا میں بیش قیمت موتی جاتا ہے۔ خود یمن کے ساحل ہندوستان اور حبش کی پیداوار کے لیے منڈی تھے اور شام، مصر اور یورپ اور ہندوستان حبش کے درمیان جو درآمد و برآمد ہوتی اور تجارتی کاروبار ہوتا تھا اس زمانہ میں سبا ہی اس کے واحد اجارہ دار اور براہ حجاز ان ملکوں تک سامان تجارت پہنچاتے تھے اسی بنا پر توراۃ میں سبا کی دولت و ثروت اور اس کی وجہ سے ان کے تمدن کی عظمت کے بہ کثرت تذکرے پائے جاتے ہیں چنانچہ یسعیاہ نبی کی کتاب میں ہے۔

"مصر کے مزدور اور حبش اور سبا کے تجارتی مال اور تنومند آدمی تیرے پاس آئیں گے اور وہ تیرے ہوں گے۔" ❁

اور اسی کتاب میں دوسری پیشین گوئی ہے:

"(اے یروشلم) اونٹوں کی قطاریں تجھ پر چھا جائیں گی مدین اور عیفا کی اونٹنیاں (بھی) یہ سب سبا سے آئیں گی اور سونا اور لوبان لے کر آئیں گی۔" ❁

اور یرمیاہ نبی کی کتاب میں ہے:

"(خداوند غصہ کرتے ہوئے فرماتا ہے) کس مقصد کے لیے میرے پاس سبا کا لوبان پیش کرتے ہو۔" ❁

اور حزقیل نبی کی کتاب میں ہے:

"اور عوام کے ساتھ سبا والے بیابان (عرب) سے لائے گئے جن کے ہاتھوں میں کنگن ہیں اور خوب صورت تاج ان کے سروں پر ہیں۔" ❁

اور دوسری جگہ ہے:

"اور سبا اور رعمہ کے سوداگر تیرے ساتھ سوداگری کرتے تھے وہ تیرے بازاروں میں ہر قسم کے نفیس اور خوشبودار مصالحے اور ہر طرح کے جواہرات اور سونا اور یمن کے شہروں حران قانہ اور عدن اور سوداگران سبا اور اشور اور کلما د تیرے سوداگر ہیں یہ ہی تیرے تاجر تھے ہر قسم کی چیزوں کے جو کمخاب اور چونے اور ارغوانی اور منقش پوشاکیں اور سب طرح کے بوٹے دار نفیس کپڑے گٹھوں سے کسے ہوئے اور مضبوط بندھے ہوئے تیری تجارت گاہ میں بیچنے کے لیے لاتے تھے۔" ❁

❁ (۱۴_۴۵) ❁ (۶_۱۰) ❁ (۶_۲۰) ❁ (۲۳_۴۲) ❁ (۲۷_۲۴_۲۲)

Marfat.com

سد مارب:

عرب میں مستقل دریا ناپید ہیں، اکثر بارش کے پانی پر گزر ہے اور کہیں کہیں پہاڑی چشمے بھی ہیں، بارش کا پانی ہو یا پہاڑی چشموں کا تمام پانی بہہ کر وادی کے ریگستان میں جذب ہو کر ضائع ہو جاتا ہے، قوم سبا نے اس پانی کو کام میں لانے اور باغات و زراعت کو سرسبز و شاداب بنانے کے لیے یمن کے اقطاع و امصار میں ایک سو سے زائد بند باندھے تھے اور ان کی وجہ سے تمام ملک سرسبز و بہارستان بنا ہوا تھا ان ہی بندوں میں سے سب سے بڑا اور عظیم الشان بند "سد مارب" تھا جو دارالحکومت مارب میں بنایا گیا تھا۔

اس "سد" کے متعلق قدیم جدید مؤرخوں اور سیاحوں نے جو حالات لکھے ہیں وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ سبا کو فن انجینئری اور ہندسہ میں بہت بڑا کمال حاصل تھا۔

مارب کے جنوب میں داہنے بائیں دو پہاڑ ہیں جو کہ ابلق کے نام سے مشہور ہیں اور ان کے درمیان بہت طویل و عریض وادی ہے جس کو وادی اذنیہ کہتے ہیں جب پانی برستا یا پہاڑی چشموں سے بہہ نکلتا تو وادی دریا بن جاتی۔ سبا نے یہ دیکھ کر ۸۰۰ ق م میں ان دونوں پہاڑوں کے درمیان بند باندھنا شروع کیا اور عرصہ تک اس کی تعمیر کا سلسلہ جاری رہا۔

بعض مؤرخین عرب کہتے ہیں کہ یہ بن دو میل مربع تھا[1] اور صاحب ارض القرآن ایک یورپین سیاح ازماؤ کے مضمون کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ یہ ایک سو پچاس فٹ لمبی اور پچاس فٹ چوڑی دیوار ہے جس کا بہت بڑا حصہ منہدم ہو چکا ہے اور ایک تہائی اب بھی باقی ہے اور وہ یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ اس سیاح نے اس کا بہت عمدہ نقشہ تیار کر کے اپنے مضمون کے ساتھ شائع کیا ہے جو فرنچ ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں چھپا ہے اور جس کو انہوں نے ارض القرآن میں بھی نقل کیا ہے۔

مؤرخین عرب یہ بھی کہتے ہیں کہ سبا نے اس کو اس طرح تعمیر کیا تھا کہ پانی کو روکنے کے بعد موسموں کے اختلاف کے پیش نظر آبیاری کے لیے پانی کے اوپر نیچے تین درجے قائم کر دیئے تھے اور ہر درجہ میں تیس تیس کھڑکیاں رکھی تھیں جن کے ذریعہ پانی کو کھولا اور بند کیا جاتا تھا اور پھر ان کے نیچے ایک بہت بڑا حوض بنایا تھا اس کے دائیں اور بائیں دو بڑے بڑے آہنی پھاٹک تھے جن کے ذریعہ حوض کا پانی تقسیم ہو کر مارب کے دونوں جانب نہروں، گولوں اور رجبھوں کے ذریعہ حسب ضرورت کام میں آتا تھا۔ اس عظیم الشان بند کی وجہ سے تقریباً تین سو مربع میل تک داہنے اور بائیں چھواروں کے نخلستان، میووں اور پھلوں کے حسین و جمیل باغ، خوشبوؤں کے کھیت اور مرغزار دار چینی، عود اور مختلف قسم کے خوشبودار درختوں کے گنجان باغات اس کثرت سے ہو گئے تھے کہ تمام علاقہ چمنستان اور فردوس بنا ہوا تھا۔[2]

ابن کثیر رحمہ اللہ وغیرہ بروایت ابن منبہ یہاں تک مبالغہ کرتے ہیں کہ اگر ایک عورت کسی موسم میں بھی سر پر ٹوکری رکھ کر ان باغات کے اندر سے گزرتی تو ہاتھ لگائے بغیر ہی اس کی ٹوکری پختہ پھلوں کے ٹپکنے سے بھر جاتی۔[3]

یمن کی طبعی خصوصیت کے لحاظ سے خوشبوؤں، پھلوں اور پھولوں کے درختوں کی کثرت مارب کے بند کی وجہ سے اس میں

---

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۳ ص ۱۵۹ [2] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۵۸ [3] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۵۹

Marfat.com

عظیم الشان اضافہ اور ترقی تجارتی کاروبار اور معدنیات کی کثرت کی وجہ سے سونا، چاندی اور جواہرات کی بہتات نے قوم سبا میں اس درجہ خوش عیشی، رفاہیت، فارغ البالی اور اطمینان پیدا کر دیا تھا کہ وہ ہر وقت مسرت وشادمانی کے ساتھ خدا کی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہوتے اور شب و روز طمانیت و مرفعہ الحالی میں زندگی بسر کرتے تھے۔

اور ملک کے بہارستانوں اور چمنستانوں کی وجہ سے آب و ہوا میں اس درجہ اعتدال تھا کہ اہل سبا مچھروں، مکھیوں اور پسوؤں جیسے ایذا رساں کیڑوں سے پاک ومحفوظ تھے چنانچہ سبا کے معاصر مؤرخ اہل سبا کی اس رشک پیدا کرنے والی زندگی کے حالات اس طرح بیان کرتے ہیں (راٹوتھینس Eratoothens) ۱۹۴ق م لکھتا ہے۔

"عرب کے انتہائی حد پر سمندر (بحر ہند وعرب) کے پہلو میں سبا کے لوگ ہیں جن کا دارالحکومت مارب (Mariaba) ہے یہ قطعہ ملک مصر کے زیریں پڑا ہے، گرمیوں میں بارش ہوتی ہے اور دریا جاری ہوتے ہیں جو میدانوں اور تالابوں میں جا کر خشک ہو جاتے ہیں اسی سبب سے زمین اس قدر سرسبز وشاداب ہے کہ تخم ریزی وہاں سال میں دوبار ہوتی ہے حضر موت سے سبا کے ملک تک چالیس روز کا راستہ ہے اور معین سے سوداگر ستر دن میں ایلہ (عقبہ) پہنچتے ہیں، حضر موت، معین اور سبا کے ملک خوش وخرم ہیں اور ہیکلوں اور شاہی عمارتوں سے آراستہ ہیں۔

اور یونانی مؤرخ اگاتھرشیڈس (Agathershidos) ۱۴۵ق م لکھتا ہے سبا عرب آبادان (Arafiafler) میں رہتے ہیں جہاں بہت اچھے اچھے بے شمار میوے ہوتے ہیں۔ زمین جو سمندر کے متصل ہے اس میں بلسان اور نہایت خوب صورت درخت ہوتے ہیں جو دیکھنے میں بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں اندرون ملک بخورات، دارچینی اور چھوہارے کے نہایت بلند درختوں کے گنجان جنگل ہیں اور ان درختوں سے نہایت شیریں بو پھیلا کرتی ہے درختوں کے اقسام کی کثرت وتنوع کے سبب سے ہر قسم کا نام و وصف مشکل ہے جو خوشبو اس میں سے اڑتی ہے وہ جنت کی خوشبو سے کم نہیں اور جس کی تعریف لفظوں میں ادا نہیں ہوسکتی جو اشخاص زمین سے دور ساحل سے گزرتے ہیں وہ بھی جب ساحل کی طرف سے ہوا چلتی ہے تو اس خوشبو سے محظوظ ہوتے ہیں وہ گویا آب حیات کا لطف اٹھاتے ہیں اور یہ تشبیہ بھی اس کی قوت ولطافت کے مقابل میں ناقص ہے۔

اور یہی مؤرخ دوسری جگہ لکھتا ہے:

سبا میں تمام دنیا میں سب سے زیادہ دولت مند لوگ ہیں۔ چاندی اور سونا بکثرت ہر طرف سے لایا جاتا ہے بعد کے سبب سے کسی نے ان کو فتح نہیں کیا ہے اسی لیے خصوصاً ان کے دارالحکومت میں سونے چاندی کے برتن ہیں تخت اور پیش گاہیں ہیں جن کے ستون زرنگار اور نقرئی وطلائی نقش ونگار سے آراستہ ہیں ایوان اور دروازے زر وجواہر سے منقش ہیں اس قسم کے زیب وزینت پر وہ نہایت ہنرمندی اور محنت صرف کرتے ہیں۔

اور مشہور مؤرخ آرٹی میڈ دروس (ARtimidors) ۱۰۰ق م باشندہ شہر افسس لکھتا ہے:

سبا کا بادشاہ اور اس کا ایوان مارب میں ہے جو ایک پر اشجار پہاڑ پر زنانہ خوش حالی (عیش وعشرت) میں واقع ہے میووں کی کثرت کے سبب سے لوگ سست اور ناکارہ ہوگئے ہیں خوشبودار درختوں کی جڑوں میں لیٹے پڑے رہتے ہیں۔ جلانے کی لکڑی کے بدلے دارچینی اور خوشبودار لکڑی جلاتے ہیں کچھ لوگوں کا پیشہ زراعت ہے اور کچھ ملکی وغیر ملکی مسالوں کی تجارت کرتے ہیں یہ مسالے

Marfat.com

مقابل کے حبشی ساحل سے لائے جاتے ہیں جہاں سبا کے لوگ چمڑے کی کشتیوں میں بیٹھ کر دریا کے پار چلے جاتے ہیں قرب و جوار کے قبائل سبا سے تجارتی اسباب خریدتے ہیں اور وہ اپنے ہمسایوں کو دیتے ہیں اور اسی طرح دست بدست وہ شام اور جزیرہ تک پہنچتے ہیں۔ ¹

جنتان عن یمین وشمال:

غرض یمن کی طبعی خصوصیات کے علاوہ جو اس ملک کی شادابی اور معتدل آب و ہوا کے لیے قدرتی وسائل کی شکل میں موجود تھیں ملک کے اندر اس "بند آب" نے ہمہ قسم کی راحت عیش و عشرت کی زندگی کے لیے سامان فراہم کر دیئے تھے اور ان سب چیزوں پر یہ متضاد تھا کہ یمن سے شام تک جس مشہور شاہراہ امام مبین پر اہل سبا کے تجارتی قافلوں کی آمد و رفت تھی اس کے بھی دونوں جانب حسین وخوبصورت بلساں اور دارچینی کے خوشبودار درختوں کا سایہ تھا اور قریب قریب فاصلہ سے حکومت سبا نے ان کے سفر کو آرام دہ بنانے کے لیے کاروان سرائے بنا رکھی تھیں جو شام کے علاقہ تک ان کو اس آرام کے ساتھ پہنچاتی تھیں کہ خنک پانی اور میووں اور پھلوں کی افراط یہ بھی محسوس نہیں ہونے دیتی تھی کہ وہ اپنے وطن میں ہیں یا دشوار گزار سفر میں حتیٰ کہ جب خوشگوار سایہ اور فرحت بخش ہوا میں ان کا کارواں ان کارواں سراؤں میں ٹھہرتا میوے اور تازہ پھل کھاتا اور سرد وشیریں پانی پیتا ہوا حجاز اور شام تک آمد و رفت رکھتا تو ہمسایہ قومیں رشک وحسد سے ان پر نگاہیں اٹھاتی اور حیرت وتعجب کے ساتھ ان کے اس عیش وعشرت پر انگشت بدنداں ہو جاتی تھیں جیسا کہ آپ ابھی ان کے معاصر مؤرخین کی زبان سے سن چکے ہیں کہ وہ کن الفاظ کے ساتھ ان کی اس خوش حالی کا تذکرہ کر رہے ہیں اور جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے بے حد ارزاں کر دیا تھا۔

ان تاریخی تصریحات کے بعد اب ہم کو قرآن عزیز کی ان آیات کا مطالعہ کرنا چاہیے جو سبا کی اس خوش حالی کا ذکر کرتے ہوئے اس کو اہل سبا پر خدائے تعالیٰ کا عظیم الشان انعام واکرام اور احسان عظیم ظاہر کرتا ہے۔

﴿لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِیْ مَسْكَنِهِمْ اٰیَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ یَّمِیْنٍ وَّ شِمَالٍ ۬ؕ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَ اشْكُرُوْا لَهٗ ؕ بَلْدَةٌ طَیِّبَةٌ وَّ رَبٌّ غَفُوْرٌ ۝۱۵﴾ (سبا: ۱۵)

"بلاشبہ اہل سبا کے لیے ان کے وطن میں قدرت الٰہی کی عجیب وغریب نشانی تھی دو باغوں کا (سلسلہ) داہنے بائیں اور (خدا نے ان کو یہ فرما دیا تھا) اے سبا والو اپنے پروردگار کی جانب سے بخشی ہوئی روزی کھاؤ اور اس کا شکر کرو شہر ہے پاکیزہ اور پروردگار ہے بخشنے والا۔"

ایک مرتبہ گزشتہ تاریخی تفاصیل کو اور مطالعہ کیجئے اور صرف مسلمان مؤرخین کی روایات کی روشنی میں نہیں بلکہ ان غیر مسلم مؤرخین کی معاصرانہ شہادتوں کی روشنی میں پڑھیے جو اسلام دشمنی میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور پھر قرآن کی مسطورہ بالا آیات کا مطالعہ فرمایئے قرآن کہتا ہے کہ سبا کے اپنے گھر ہی میں خدائے تعالیٰ کی بے نظیر اور عجیب وغریب نشانی موجود تھی وہ یہ کہ سینکڑوں میل تک ان کے شہر کے داہنے بائیں میووں پھلوں اور خوشبودار چیزوں کے درختوں کا گنجان سلسلہ باغات کی شکل میں موجود تھا، یہ خدائے

---

¹ ارض القرآن ج ۲ ص ۲۵۲ _ ۲۵۴

Marfat.com

تعالیٰ کا عطا کردہ رزق تھا جو آس پاس کی قوموں کے مقابلہ میں دو طرح سے ان کو بخشا گیا تھا۔ ایک ملک کے طبعی خواص کے ذریعہ جو اللہ کی "فطرۃ" کے ہاتھوں سے معتدل ہوا، سرد و خشک پانی، عمدہ پھلوں اور پھولوں کی خودرو پیداوار اور خوشبودار چیزوں کے درختوں کی طبعی نشوونما کی شکل میں ظاہر ہوا اور دوسرا آب رسانی کے بہتر طریقوں کی صورت میں جو درحقیقت خالق کائنات ہی کی عطا کردہ عقل و خرد اور فہم و ذکا کا نتیجہ تھا۔ پس اہل سبا کا فرض ہے کہ وہ اس خوش عیشی اور عافیت کوشی پر جو ان کو ان کے وطن ہی میں بے محنت حاصل ہے" اس کے شکرگزار بندے بنیں اگر وہ ان نعمتوں کا شکر ادا کریں گے اور خدا کے رشتہ کو مضبوط کرنے کے لیے اس کی مرضیات پر گامزن رہیں گے تو بلاشبہ انہیں یہ سمجھنا چاہیے کہ ایک جانب ان کی دنیا کی زندگی کے لیے ان کو ایسا عمدہ اور ہر طرح سے پاک صاف وطن حاصل ہے اور دوسری جانب ان کی حیات ابدی اور نجات اخروی کے لیے ان کا پروردگار بہت بخشنے والا ہے۔

اہل سبا اور خدا کی نافرمانی:

اہل سبا ایک عرصہ تک تو اس جنت ارضی کو خدا کی عظیم الشان آیت و نعمت ہی سمجھتے اور حلقہ بگوش اسلام رہتے ہوئے احکام الٰہی کی تعمیل اپنا فرض یقین کرتے رہے لیکن تمول، خوش عیشی اور ہر قسم کے تنعم نے آہستہ آہستہ ان میں بھی وہی اخلاق ردیہ پیدا کر دیئے جو ان کی پیشرو گزشتہ متکبر اور مغرور قوموں میں موجود تھے اور یہ یہاں تک ترقی کرتے رہے کہ انہوں نے دین حق کو بھی خیر باد کہہ دیا اور کفر و شرک کی سابق زندگی کو دوبارہ اپنا لیا۔ تاہم "رب غفور" نے فوراً گرفت نہیں کی بلکہ اس کی وسعت رحمت نے قانون امہال (مہلت دینے کا قانون) سے کام لیا اور انبیاء (علیہم السلام) نے ان کو راہ حق کی تلقین فرمائی اور بتایا کہ ان نعمتوں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم دولت، ثروت اور جاہ و حشمت کے نشہ میں چور ہو کر مست ہو جاؤ اور نہ یہ کہ اخلاق کریمانہ کو چھوڑ بیٹھو اور کفر و شرک اختیار کر کے خدا کے ساتھ بغاوت کا اعلان کر دو، سوچو اور غور کرو کہ یہ راہ بری ہے اور اس کا انجام برا انجام ہے۔

محمد ابن اسحاق بروایت ابن منبہ کہتے ہیں کہ اس درمیان میں ان کے پاس خدائے تعالیٰ کے تیرہ نبی حق رسالت ادا کرنے آئے مگر انہوں نے مطلق توجہ نہ کی اور اپنی موجودہ خوش عیشی کو دائمی وراثت سمجھ کر شرک و کفر کی بدمستیوں میں مبتلاء رہے۔ [1]

آخر تاریخ نے خود کو دہرایا اور ان کا انجام بھی وہی ہوا جو گزشتہ زمانہ میں خدائے برحق کی نافرمان قوموں کا ہو چکا ہے۔

سیل عرم:

چنانچہ خدائے تعالیٰ نے ان پر دو قسم کا عذاب مسلط کر دیا جس کی بدولت ان کے جنت مثال باغات برباد ہو گئے اور ان کی جگہ جنگلی بیریاں، خاردار درخت اور پیلو کے درخت اُگ کر یہ شہادت دینے اور عبرت کی کہانی سنانے لگے کہ خدا کی پیہم نافرمانی اور سرکشی کرنے والی اقوام کا یہ حشر ہوتا ہے۔

پہلی سزا:

ہوا یہ کہ وہ "بند" جس کی تعمیر پر ان کو بے حد ناز تھا اور جس کی بدولت ان کے دارالحکومت کے دونوں جانب تین سو مربع میل تک خوبصورت اور حسین باغات اور سرسبز و شاداب کھیتوں اور فصلوں سے یمن گلزار بنا ہوا تھا وہ خدا کے حکم سے ٹوٹ گیا اور اچانک

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۲

Marfat.com

اس کا پانی زبردست سیلاب بنا ہوا وادی میں پھیل گیا اور مارب اور اس تمام حصہ زمین پر جن میں یہ فرحت بخش باغات تھے چھا گیا اور ان سب کو غرق آب کر کے برباد کر ڈالا اور جب پانی آہستہ آہستہ خشک ہو گیا تو اس پورے علاقہ میں باغوں کی جنت کی جگہ پہاڑوں کے دونوں کناروں سے وادی کے دونوں جانب جھاؤ کے درختوں کے جھنڈ جنگلی بیروں کے جھاندوں اور ان پیلو کے درختوں نے لے لی جن کا پھل بدذائقہ اور بکساپن لیے ہوتا ہے۔

اور خدا کے اس عذاب کو اہل مارب اور قوم سبا کی کوئی قوت وسطوت نہ روک سکی اور بند باندھنے میں انجینئری اور علم ہندسہ کی مہارت فن کا جو ثبوت انہوں نے دیا تھا وہ اس کی شکستگی کے وقت سب ناکارہ ہو کر رہ گیا اور اہل سبا کے لیے اس کے سواء کوئی چارہ کار باقی نہ رہا کہ اپنے وطن مالوف اور بلدہ طیبہ مارب اور نواح مارب کو چھوڑ کر منتشر ہو جائیں۔

قرآن عزیز نے اسی عبرتناک واقعہ کو بیان کر کے عبرت نگاہ اور بیدار قلب انسان کو نصیحت کا یہ سبق سنایا ہے:

﴿فَاَعۡرَضُوۡا فَاَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ سَيۡلَ الۡعَرِمِ وَ بَدَّلۡنٰهُمۡ بِجَنَّتَيۡهِمۡ جَنَّتَيۡنِ ذَوَاتَىۡ اُكُلٍ خَمۡطٍ وَّ اَثۡلٍ وَّ شَىۡءٍ مِّنۡ سِدۡرٍ قَلِيۡلٍ ﴿۱۶﴾ ذٰلِكَ جَزَيۡنٰهُمۡ بِمَا كَفَرُوۡا ؕ وَ هَلۡ نُجٰزِىۡۤ اِلَّا الۡـكَفُوۡرَ ﴿۱۷﴾﴾ (سبا: ۱۶-۱۷)

"پھر انہوں نے (قوم سبا نے) ان پیغمبروں کی نصیحتوں سے منہ پھیر لیا پس ہم نے ان پر بند توڑنے کا سیلاب بھیج دیا اور ان کے دو (عمدہ) باغوں کے بدلے دو ایسے باغ اُگا دیئے جو بدمزہ پھلوں، جھاؤ اور کچھ بیری کے درختوں کے جھنڈ تھے یہ ہم نے ان کی ناشکر گزاری کی سزا دی اور ہم ناشکر قوم ہی کو سزا دیا کرتے ہیں۔"

غور کیجئے کہ یہ سیلاب بہ اسباب ظاہر کس طرح آیا۔ کیا اس لیے کہ "مارب کا بند" کہنہ اور شکستہ ہو گیا تھا؟ نہیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو جس قسم کے مہندسین اور انجینئری کے ماہرین نے اس کو بنایا تھا۔ سبا میں ان کی اس وقت بھی کمی نہ تھی اور وہ اس کے علاوہ ملک کے مختلف حصوں میں سینکڑوں بند تعمیر کراتے رہے تھے پھر کیا وہ اس کی کہنگی اور شکستگی کا اتنا انتظام بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اگر اس کو اپنی طبعی عمر پر ٹوٹنا ہی ہے تو پانی کے زور کو اس طرح کم کر دیا جائے یا اس کے لیے تعمیر میں ایسے اضافے کر دیئے جائیں کہ جس سے یہ اچانک شکست ہو کر اس مصیبت عظمیٰ کا باعث نہ بن سکتا پھر یہ سیلاب کیوں آیا کیا اس لیے کہ اس حقیقت کے جان لینے کے باوجود کہ یہ بند عنقریب شکستہ ہو کر اس واہیہ کبریٰ کا باعث بننے والا ہے انہوں نے کاہلی اور سستی سے اس کی پرواہ نہیں کی تو تاریخ کی روشنی میں یہ بھی غلط ہے اس لیے کہ حکومت سبا کے متعلق جو معاصرانہ تاریخی شہادتیں مہیا ہیں وہ یہ ظاہر کرتی ہیں کہ وہ اس بند کی مضبوطی استحکام اور ہر قسم کے حفاظتی امور کے بارے میں بہت مطمئن تھے اور برابر اس سے آبپاشی کا کام لے رہے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ قدیم وجدید تاریخیں اس ہولناک تاریخی واقعہ کے اسباب وعلل کے بارے میں قطعاً خاموش ہیں اور اس لیے خاموش ہیں کہ سبا پر یہ عذاب بلاشبہ غیر متوقع اور اچانک آیا جس سے وہ خود بھی حیران وسراسیمہ ہو کر رہ گئے اور وہ اس کے سواء اور کچھ سمجھ سکے کہ یہ جو کچھ ہوا اچانک غیبی ہاتھ سے ہوا کیونکہ "بند" کے استحکامات اور انتظامات میں بظاہر کوئی خرابی نہیں تھی پھر یک لخت اس کا ٹوٹ جانا اور پانی کا سیلاب عظیم کی شکل میں پھیل کر تمام جنت نشان علاقہ کو تباہ وبرباد کر دینا بجز عذاب الٰہی کے اور کیا ہو سکتا ہے انہوں نے جب جائز اور پاک خوش عیشی کو عیاشی اور بداطواری میں بدل دیا۔ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی بجائے غرور و

Marfat.com

تکبر کے ساتھ کفرانِ نعمت کیا، نبیوں اور پیغمبروں کے بار بار رشد و ہدایت پہنچانے کے باوجود شرک و کفر پر اصرار کیا تو اچانک عذاب الٰہی آ کر ان کو تباہ و برباد نہ کرتا تو اور کیا ہوتا؟

﴿فَاَعۡرَضُوۡا فَاَرۡسَلۡنَا عَلَیۡہِمۡ سَیۡلَ الۡعَرِمِ ..... ذٰلِکَ جَزَیۡنٰہُمۡ بِمَا کَفَرُوۡا ؕ وَ ہَلۡ نُجٰزِیۡۤ اِلَّا الۡکَفُوۡرَ ۝﴾ (سبا: ۱۶۔۱۷)

ابن جریر ابن کثیر اور دوسرے اصحاب سیر نے اس موقعہ پر ایک اسرائیلی حکایت بیان کی ہے جس کو محمد بن اسحاق نے وہب بن منبہ سے نقل کیا ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جب "سد مارب" کو برباد کرنے کا ارادہ کر لیا تو "بند" کی بنیادوں میں بڑے بڑے گھونس پیدا کر دیئے اور انہوں نے آہستہ آہستہ اس کی جڑوں کو کھوکھلا کرنا شروع کر دیا قوم سبا نے جب یہ دیکھا تو بند کی بنیادوں کے ہر ایک پایہ اور ستون سے بلیاں بندھوا دیں کہ اس خوف سے گھونس جڑوں کو کھوکھلا نہ کر سکیں گے۔

وہب بن منبہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کی کتابوں میں یہ پیشین گوئی درج تھی کہ اس سد کی بربادی گھونسوں کے ذریعہ ہوگی اس لیے جب انہوں نے سد میں گھونسوں کو دیکھا تو بلیاں باندھ دیں مگر جب خدائے تعالیٰ کی مشیت کے پورا ہونے کا وقت آیا تو گھونس اتنے منہ زور ہو گئے کہ وہ بلیوں سے گھبرانے کی بجائے ان پر حملہ آور ہونے لگے اور انہوں نے چند ہی روز میں بن آب کی جڑیں ہلا دیں اور نتیجہ یہ نکلا کہ بند پانی کا زور برداشت نہ کر سکا اور سیلاب کی صورت میں بہہ نکلا اس روایت کو بعض راویوں نے بغیر سند کے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کی جانب بھی منسوب کیا ہے۔

یہ روایت، اسرائیلی حکایت اور اسرائیلی داستان سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتی اور اصول روایت و درایت کے اعتبار سے ناقابل اعتماد ہے، روایت کے لحاظ سے اس لیے قابل اعتماد نہیں کہ اس کے بعض طریقے بے سند ہیں اور بعض منقطع اور درایت کے اعتبار سے اس لیے اعتماد کے قابل نہیں کہ اس روایت میں سیلاب سے متعلق جو واقعہ درج ہے یعنی گھونس اور بلیوں کا معاملہ وہ صرف وہب بن منبہ کی روایت میں مذکور ہے اور وہب اسرائیلی روایات کے مدار ہیں نیز اگر "سد مارب" کی تباہی میں گھونسوں اور بلیوں کا یہ معرکہ بھی کچھ تعلق رکھتا تو قرآن واقعہ کی اس اہم کڑی کو کبھی نظر انداز نہ کرتا یا کم از کم کسی صحیح حدیث میں اس تفصیل کا تذکرہ ہوتا۔

علاوہ ازیں جس ملک میں ایسے ماہر انجینئر موجود ہوں جنہوں نے مارب اور اس کے علاوہ یمن کے بہت سے حصوں میں بہترین "بند آب" اپنی فنی مہارت کی مدد سے بنائے ہوں ان کے متعلق عقل یہ کیسے باور کر سکتی ہے کہ جب ان کے علم میں یہ بات آئی ہو کہ اس "بند آب" کی بنیادیں گھونس کھوکھلا کر رہے ہیں تو بند کے استحکامات کی تمام ان حفاظتی تدابیر کو چھوڑ کر جو فن انجینئری اور استحکامات تعمیرات کے اصول پر ضروری تھیں صرف اس طفلانہ حرکت پر اکتفا کر لیا کہ بند کے ستونوں اور پایوں کے ساتھ بلیاں باندھ دیں پھر گھونس آزاد اور بلیاں مقید یہ عجیب حفاظتی تدبیر کسی طرح قابل قبول نہیں ہے۔

اس روایت کے برعکس قرآن عزیز کی صنیع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سبا پر "سیل عرم" کا یہ عذاب اچانک آیا اور اس نے اس طرح مارب اور اطراف مارب کو تباہ کیا کہ اہل مارب کو سنبھلنے اور پیش آمدہ حالات کا صحیح اندازہ لگانے کا بھی موقع نہیں ملا۔ لہٰذا اگر چوہوں یا گھونسوں سے متعلق حکایت کو کسی درجہ میں تسلیم بھی کیا جائے تو واقعہ کی حقیقت صرف اسی قدر ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے

Marfat.com

موسم میں جب کہ یمن میں بارش بہ کثرت برستی ہے "بند آب" میں بڑے بڑے گھونسوں کی اتنی کثیر تعداد پیدا کر دی ہو جنہوں نے غیر معمولی طور پر چند ہی دنوں میں اس کو کھوکھلا کر ڈالا اور پانی کے زور نے یک لخت بند کو شکست کر کے سیلاب عظیم بپا کر دیا۔ اور قوم سبا اس حال سے ناواقف رہی اور اچانک حادثہ نے ان کو خانماں برباد کر کے اِدھر اُدھر منتشر کر دیا اگر چہ اس تفصیل کا ثبوت بھی کسی صحیح روایت سے نہیں ملتا۔

قرآن عزیز کا سیاق اور اس کا اسلوب بیان ان تمام روایات یا حکایات کا بھی انکار کرتا ہے جو محمد بن اسحاق وغیرہ اصحاب سیر نے اس سلسلہ میں نقل کی ہیں کہ انصار اور بعض دوسرے قبائل یمن کے بعض بزرگوں کو پرانی کتابوں یا کاہنوں کے ذریعہ سے "سیل عرم" کے متعلق تفصیلی حالات معلوم ہو گئے تھے اور اس لیے وہ اس حادثہ کبریٰ کے واقع ہونے سے قبل ہی مختلف حیلوں اور بہانوں سے یمن (مارب) چھوڑ کر یثرب، شام، عراق جیسے مقامات میں جا کر آباد ہو گئے تھے، ابن اسحاق وغیرہ کی روایات کا خلاصہ یہ ہے:

عمرو بن عامر لخمی اور بعض دوسرے ابو القبائل کو پرانی کتابوں اور کاہنوں کے ذریعہ سے یہ معلوم ہو گیا کہ شہر مارب پر سد کی شکست کی بدولت سخت بربادی آنے والی ہے اور اس سد کی شکست کا جب وقت آئے گا تو اول اس کی بنیادوں میں گھونس پیدا ہوں گے جو بنیادوں کو کھوکھلا کریں گے اور جب بند آب کمزور پڑ جائے گا تب برسات کے موسم میں ٹوٹ کر سینکڑوں میل تک سیلاب آ جائے گا اور مارب اور اس کے دونوں جانب میلوں تک حصہ ملک تباہ و برباد ہو جائے گا چنانچہ سب سے اول عمرو بن عامر نے یہ دیکھا کہ چوہے یا گھونس "بند آب" کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں تب اس نے سمجھا کہ اب مارب کی بربادی کا وقت آ پہنچا اس لیے اس نے طے کر لیا کہ اپنی قوم کو اصل حقیقت سے مطلع کیے بغیر کسی حیلہ سے ترک وطن کر کے کسی دوسری جگہ آباد ہو جانا چاہیے تاکہ آنے والی مصیبت سے محفوظ رہ سکیں اور بعض روایات میں ہے کہ عمرو کی بیوی بھی کاہنہ تھی اور اس واقعہ کی اطلاع اس نے پہلے سے ہی اپنے شوہر کو دے دی تھی۔ لہٰذا اس نے یہ طے کر لیا کہ یہاں سے ترک وطن کر دینا چاہیے مگر یہ ایسے طریقہ سے ہو کہ قوم کو کسی طرح علم نہ ہو ورنہ تو معاملہ بگڑ جائے گا۔ چنانچہ اس نے اپنے چھوٹے بیٹے کو تنہائی میں بلا کر یہ سمجھایا کہ میں ایک خاص ضرورت کے پیش نظر یہ چاہتا ہوں کہ کل جب میں مجلس میں تجھ سے کسی کام کے متعلق حکم کروں تو انکار کر دینا اس پر میں مصنوعی غصہ سے تیرے منہ پر طمانچہ ماروں گا تجھ کو بھی چاہیے کہ ادب واحترام کو بالائے طاق رکھ کر میرے منہ پر انتقامی طمانچہ لگائے اس کے بعد میں جو کچھ کرنا چاہتا ہوں کروں گا۔

لڑکے نے باپ کا یہ انوکھا مشورہ سنا تو بے حد پریشان ہوا اور اس نے ایسی گستاخی کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن باپ کے اصرار کے بعد اس کو منظور کرنا پڑا چنانچہ دوسرے روز برسر مجلس وہی صورت پیش آئی جو باپ بیٹے کے درمیان مشورہ سے طے پائی تھی عمرو نے جب بیٹے کے ہاتھ سے طمانچہ کھایا تو بے حد مشتعل ہوا اور یہ ظاہر کیا کہ وہ اس کو قتل کیے بغیر نہ چھوڑے گا اہل مجلس نے اس کے غصہ کو فرو کرنے کی بہت کوشش کی مگر اس نے نہ مانا آخر لڑکے کے ماموں دخل انداز ہوئے اور انہوں نے عمرو کو دھمکی دی کہ اگر اپنے بیٹے کو قتل کرے گا تو ہم تجھ کو قتل کر ڈالیں گے۔ عمرو نے یہ سن کر انتہائی غم وغصہ کے ساتھ اہل مجلس کو اپنا یہ فیصلہ سنایا کہ جس ملک میں ایک باپ کو اپنے بیٹے کی سخت گستاخی کی سزا دینا ناممکن ہو ایسے ملک میں رہنا عبث ہے۔ لہٰذا میں اپنی تمام جائیداد اور عمدہ

Marfat.com

باغات کو ارزاں فروخت کر دینا چاہتا ہوں تا کہ میں ایسی جگہ سے کہیں دور جا بسوں، یہ دیکھ کر لوگوں نے عمرو کی جائیداد کو سستے داموں خرید لیا اور وہ معہ اپنے اہل و عیال کے ترک وطن کر کے چلا گیا اور اسی طرح بعض دوسرے لوگ بھی حادثہ سے قبل ہی حادثہ کے خوف سے ترک وطن کر گئے۔

ان روایات کا اسلوب بیان خود بتا رہا ہے کہ یہ ایک فرضی داستان ہے جو داستان گوئی کے طرز پر بنائی گئی ہے نیز مستند تاریخی روایات سے بھی ان واقعات کی تائید نہیں ہوتی اور ان واقعات کے غیر مستند ہونے کے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ قرآن حکیم کا سیاق ان کے خلاف صاف طور پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ سبا کے قبائل اور خاندانوں کا تفرق و انتشار "سیل عرم" کے حادثہ کے بعد وقوع میں آیا ہے نہ کہ واقعہ سے قبل۔

پس تعجب ہے مولانا حبیب الرحمان صاحب (مرحوم و مغفور) جیسے دوررس عالم پر کہ انہوں نے "اشاعت اسلام" میں سبا اور سیل عرم پر مفصل و مدلل بحث کرتے ہوئے کس طرح ان داستانوں کو اہم روایات کی طرح بغیر کسی نقد و تبصرہ کے بیان فرما دیا۔

غرض یہ روایات صحیح ہوں یا غلط یہ بات واضح ہے کہ سبا اپنے غرور و تکبر عیاشانہ کاہلی و غفلت اور کفر و شرک پر اصرار و سرکشی کے سبب "سیل عرم" کے ذریعہ اس طرح تباہ و برباد ہوئے کہ فن تعمیر اور استحکامات عمارات کی تمام مہارت اکارت اور رائیگاں گئی اور وہ خود کو اس عذاب الٰہی سے نہ بچا سکے اور خدا کی مشیت پوری ہو کر رہی۔

دوسری سزا:

مارب کے "بند آب" ٹوٹ جانے پر جب شہر مارب اور اس کے دونوں جانب کے علاقے سرسبز کھیتوں، خوشبودار درختوں اور عمدہ میووں اور پھلوں کے شاداب باغوں سے محروم ہو گئے تو ان بستیوں کے اکثر باشندے منتشر ہو کر کچھ شام، عراق اور حجاز کی جانب چلے گئے اور کچھ یمن کے دوسرے علاقوں میں جا بسے مگر عذاب الٰہی کی تکمیل ہنوز باقی تھی اس لیے کہ سبا نے صرف غرور سرکشی اور کفر و شرک ہی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو نہیں ٹھکرایا تھا بلکہ ان کو یمن سے شام تک راحت رساں آبادیوں اور کارواں سراؤں کی وجہ سے وہ سفر بھی ناپسند تھا جس میں ان کو یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ سفر کی صعوبتیں کیا ہوتی ہیں اور پانی کی تکلیف اور خورد و نوش کی ایذاء کس شے کا نام ہے اور قدم قدم پر میلوں تک دو رویہ خوشبوؤں اور پھلوں کے باغات کی وجہ سے گرمی اور تپش کی زحمت سے بھی ناآشنا تھے۔

انہوں نے ان نعمتوں پر خدا کا شکر ادا کرنے کی بجائے بنی اسرائیل کی طرح ناک بھوؤں چڑھا کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ انسان سفر کے ارادہ سے گھر سے نکلے تو یہ بھی نہ معلوم ہو کہ حالت سفر میں ہے یا اپنے گھر میں وہ بھی کیا خوش نصیب انسان ہیں جو ہمت مردانہ کے ساتھ سفر کی ہمہ قسم کی تکالیف اٹھاتے پانی اور خورد و نوش کے لیے آزار سہتے اور اسباب راحت آرام کے مہیا نہ ہونے کی وجہ سے لذت سفر کا ذائقہ چکھتے ہیں۔ اے کاش ہمارا سفر بھی ایسا ہو جائے کہ ہم یہ محسوس کرنے لگیں کہ وطن سے کسی دور دراز جگہ کا سفر کرنے نکلے ہیں اور ہم دوری منزل کی تکالیف سہتے ہوئے حضر اور سفر میں امتیاز کر سکیں۔

بدبخت اور ناسپاس گزار انسانوں کی یہ ناشکری تھی جس کی تمناؤں اور آرزوؤں میں مضطرب ہو کر خدا کے عذاب کو دعوت دے رہے تھے اور اس کے انجام بد سے غافل ہو چکے تھے۔

Marfat.com

سباء نے جب اس طرح کفرانِ نعمت کی تکمیل کر دی تو اب خدائے تعالیٰ نے بھی ان کو دوسری سزا یہ دی کہ یمن سے شام تک ان کی تمام ان آبادیوں کو ویران کر دیا جو نزدیک نزدیک مسلسل چھوٹے چھوٹے قصبوں، گاؤں، کارواں سراؤں اور تجارتی منڈیوں کی صورت میں آباد اور ان کے راحت و آرام کی کفیل تھیں اور سفر کی ہر قسم کی صعوبتوں سے ان کو محفوظ رکھتی تھیں" اور اس طرح اس پورے علاقہ میں خاک اُڑنے لگی اور یمن سے شام تک نو آبادیوں کا یہ سلسلہ ویرانہ میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ قرآن عزیز کی یہ آیات اسی حقیقت کا اعلان کرتی ہیں:

﴿وَ جَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّ قَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ ۭ سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَ اَيَّامًا اٰمِنِيْنَ ۝۱۸ فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا وَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَ مَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝۱۹﴾ (سبا: ۱۸۔۱۹)

"ہم نے ان کے (ملک) اور برکت والی آبادیوں (شام) کے درمیان بہت سی کھلی آبادیاں قائم کر دی تھیں اور ان میں سفر کی منزلیں (کارواں سرائیں) مقرر کی تھیں (اور کہہ دیا تھا) چلو ان آبادیوں کے درمیان دن رات بے خوف و خطر مگر انہوں نے کہا اے ہمارے پروردگار ہمارے سفروں (منزلوں) کے درمیان دوری کر دے اور یہ (کہہ کر) انہوں نے خود اپنی جانوں پر ظلم کیا بس ہم نے ان کو کہانی بنا دیا اور ان کو پارہ پارہ کر دیا بلاشبہ اس (واقعہ) میں عبرت کی نشانیاں ہیں صابر اور شکر گزار بندوں کے لیے۔"

مؤرخین کہتے ہیں کہ سبا کے مقابلہ میں عرصہ دراز سے رومیوں کی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح وہ بھی ہندوستان اور افریقہ کے ساتھ عربوں کی طرح براہ راست تجارت کر کے بیش بہا فائدہ حاصل کریں مگر عرب کسی طرح ان کو اس کا موقع نہیں دیتے تھے اور ان تجارتی سواحل پر قابض تھے لیکن پہلی صدی قبل مسیح میں رومیوں نے یکے بعد دیگرے مصر اور شام پر قبضہ کر لیا اور اب ان کو موقعہ ملا کہ اپنے منصوبہ کو پورا کریں لیکن تجارتی مراکز کے لیے جو شاہراہ امام مبین عربوں نے بنا رکھی تھی وہ خشکی کی راہ تھی اور گزرنے والوں کے لیے عربوں سے واسطہ پڑنا لازمی تھا اور رومی ان پہاڑی راہوں کو عبور کرنے میں ویسے بھی دقت محسوس کرتے تھے اس لیے انہوں نے عربوں کے خوف سے محفوظ رہنے کے لیے یہ کیا کہ ہندوستان اور افریقہ کی تجارت کے بری راستہ کو بحری راستہ میں تبدیل کر دیا اور بحر احمر میں کشتیوں کے ذریعہ تمام مال مصر اور شام کی بندرگاہ پر اُتارنے لگے نتیجہ یہ نکلا کہ اس جدید طریق تجارت نے یمن سے شام تک سبا کی تمام آبادیوں کو برباد کر دیا اور وہاں چند دنوں میں ہی خاک اڑنے لگی اور سبا کا یہ خاندان تتر بتر ہو گیا، کسی نے شام کی راہ لی کسی نے عمان کی اور کسی نے عراق کا رخ کیا تو کسی نے حجاز کا اور کوئی مجد پہنچا تو کسی نے بحرین کی راہ اختیار کی اور اہل سبا کی حکومت کا شیرازہ اس طرح بکھر گیا کہ وہ حقیقتاً ایک کہانی بن کر رہ گئے اور ﴿فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ﴾ اور ﴿مَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ﴾ کا صحیح نقشہ آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

اگر آپ تاریخ کا بغور مطالعہ کریں گے تو یہ بات حقیقت بن کر آپ کے سامنے آ جائے گی کہ سیل عرم کا واقعہ اور طریق سفر کی تبدیلی کی یہ صورت کہ جس کی وجہ سے یمن سے شام تک سبا کی نو آبادیاں برباد ہو کر رہ گئیں زمانہ کے اعتبار سے ایک دوسرے

سے زیادہ دور نہیں ہیں اور دونوں قسم کے عذاب کا رشتہ ایک دوسرے کے ساتھ قائم ہے۔

قرآن عزیز نے جب اہل عرب کو سبا اور "سیل عرم" کا یہ واقعہ سنایا تو اس وقت یمن کا ہر متنفس اس حقیقت کا بہ چشم خود مشاہدہ کر رہا تھا اور وہ تمام خاندان بھی جو حجاز، شام، عمان، بحرین، نجد میں اس حادثہ کی بدولت پناہ گزین ہو گئے تھے اپنے آباؤ اجداد کے اس مرکز کی حالت زار کو دیکھ اور سن رہے تھے حتیٰ کہ ہمدانی جو کہ چوتھی صدی ہجری کا سیاح مورخ ہے اپنی کتاب اکلیل میں یمن کے اس حصہ کے متعلق اپنی عینی شہادت پیش کرتا ہے کہ قرآن نے ﴿جَنَّتٰنِ عَنْ یَّمِیْنٍ وَّ شِمَالٍ﴾ کہہ کر جن باغوں کا ذکر کیا ہے بلاشبہ آج ان کی جگہ اس قدر کثرت سے پیلو کے درخت موجود ہیں کہ اتنی کثرت کے ساتھ اور کہیں نہیں پائے جاتے اور ان ہی درختوں کے ساتھ جھاؤ اور کہیں کہیں جنگلی بیر کے درخت بھی نظر آتے ہیں اور دیدہ بینا اور گوش حق نیوش کو یہ کہہ کر سبا کی عبرت زا داستان سناتے رہتے ہیں۔

دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو ۔۔۔ میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہو

مولانا سید سلیمان نے ارض القرآن میں ابرہہ کے زمانہ کے کتبہ عرم کا ذکر کرتے ہوئے کیا خوب فرمایا ہے:

"اس عصر تاریخی میں جب ہر غیر معاصرانہ روایت قابل شک واشتباہ ہے خدائے قرآن نے اپنے کلام معجز کی صداقت کا نیا سامان پیدا کر دیا یعنی اس بند کے ٹوٹے ہوئے کھنڈر میں واقعہ، سیلاب کے مشرح حالات کا کتبہ جو ایک عیسائی فاتح یمن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے مل گیا ہے یہ عیسائی فاتح وہی ہے جو اپنے ہاتھیوں کے بل پر کعبہ کو ڈھانے نکلا تھا لیکن آج اس دشمن کعبہ کا سنگی ہاتھ کعبہ مکرمہ کی کتاب مقدس کی تصدیق کے لیے بلند ہے۔" [1]

اس کتبہ میں ان حالات کا بھی تفصیل کے ساتھ ذکر ہے جو سبا کے دور میں سیل عرم کی وجہ سے "بند آب" کی شکستگی سے تعلق رکھتے ہیں۔

الحاصل سبا کا یہ خاندان جو وسعت حکومت میں یمن (جنوبی عرب) اطراف شام وحجاز کی نو آبادیوں (شمالی عرب) اور حبشہ (افریقہ) پر حکمران تھا ۱۱۵ ق م کے پس و پیش حکومت سے بھی محروم ہو گیا اور اس کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا اور حبشہ پر اکسومی (سبا) خاندان نے اور شمالی عرب میں اسماعیلی عربوں نے اور خود یمن میں حمیری (سبا) خاندان نے اپنی اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔ [2]

اس جگہ یہ بات قابل وضاحت ہے کہ "سیل عرم" کا سانحہ اور حادثہ سارے یمن پر پیش نہیں آیا تھا بلکہ یمن کے دارالحکومت مارب اور اس کے اطراف میں دونوں جانب سینکڑوں میل تک اس کا تباہی خیز اثر پڑا اور اس وقت صرف وہی قبائل ترک وطن پر مجبور ہوئے جو ان مقامات میں آباد تھے باقی ملک اور اس کے آباد باشندے یمن ہی میں مقیم رہے البتہ جب دوسرے عذاب نے رونما ہو کر پورے یمن کو اثر انداز کر لیا تب سبا کے باقی قبائل بھی منتشر ہونے پر مجبور ہوئے اور اس طرح ان کے اس مشہور خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

یہ بات کہ "سیل عرم" کے حادثہ کا تمام قبائل یمن پر اثر نہیں پڑا تھا عرب اور غیر عرب مورخین دونوں کے یہاں مسلم ہے چنانچہ ابن کثیر رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

---

[1] ارض القرآن ج ۱ ص ۲۵۷ ۔ ۲۵۸ [2] تاریخ ابن کثیر ج ۲ وانسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (سبا)

"جب سیل عرم آیا تو تمام قبائل سبا یمن سے منتشر نہیں ہو گئے تھے بلکہ وہی قبائل منتشر ہوئے تھے جو مارب (دارالحکومت) میں مقیم تھے اور جن کے شہر میں مشہور "مارب کا بند" تھا اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے جو حدیث سابق میں ذکر ہو چکی ہے اس کا منشاء بھی یہی ہے کہ ان میں سے چار قبائل شام کے علاقوں میں جا بسے اور چھ قبائل یمن ہی میں مقیم رہے اور یمن میں مقیم قبائل، مذحج، کندہ، انمار، اشعر تھے اور انمار کی تین شاخیں تھیں خثعم، بجیلہ اور حمیر یہی وہ سبائی قبائل ہیں جن میں سے سبا کے نشست و انتشار کے بعد یمن کے حکمراں لوگ اور تبابعہ پیدا ہوئے تا آنکہ ان سے حبشہ کے بادشاہ نے یمن چھین لیا اور اس پر قابض ہو گیا اور پھر حمیری بادشاہ سیف بن ذی یزن نے دوبارہ شاہ حبشہ سے یمن کو واپس لیا اور یہ واقعہ ولادت باسعادت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے تھوڑے زمانہ قبل ہی پیش آیا جس کا تفصیلی ذکر ہم اپنے موقعہ پر کریں گے۔" [1]

اور سبا کے جو قبائل خاندان یمن سے نکل کر اِدھر اُدھر جا بسے تھے ان کی تفصیل دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"سبا کے قبائل میں سے غسانی قبائل کی ایک شاخ بصری (شام) چلی گئی اور ایک شاخ خزاعہ نے یثرب جاتے ہوئے بطن مر (تہامہ) کو شاداب دیکھ کر وہیں قیام کر دیا اور اوس و خزرج (انصار) یثرب (مدینہ) میں مقیم ہو گئے اور بنی ازد کا ایک حصہ عمان میں اور ایک وادی سراۃ میں جا بسا اور اسی طرح سبا کے یہ قبائل اقطاع و امصار عرب میں منتشر اور شذر و مذر پراگندہ ہو گئے۔" [2]

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"شعبی کہتے ہیں کہ غسان، شام و عراق میں منتشر ہو گئے اور انصار (اوس و خزرج) یثرب (مدینہ) میں جا بسے اور خزاعہ تہامہ (مکہ) میں اور ازد عمان میں جا بسے اور آس پاس منتشر ہو کر رہنے سہنے لگے۔" [3]

ابن کثیر رحمہ اللہ یہ بھی کہتے ہیں:

"عرب میں سبا کا یہ تفرق (انتشار) اس درجہ مشہور اور عبرت ناک سمجھا جاتا ہے کہ جب اہل عرب کسی قوم یا خاندان کے تفرق و انتشار کا ذکر کرتے ہیں تو یہ کہتے ہیں "تفرقوا ایدی سبا و تفرقوا شذر و مذر" ان کا حال سبا کا سا ہو گیا وہ پارہ پارہ ہو کر رہ گئے۔" [4]

تاریخی مباحث:

کتب سیر میں مذکور ہے کہ "مارب کا بند" سبا بن یعرب نے بنایا تھا مگر وہ اس کو پورا نہ کر سکا اور اس کے بعد اس کے بیٹے حمیر نے اس کو مکمل کیا [5] اور بعض کہتے ہیں کہ اس کو ملکہ سبا بلقیس نے تعمیر کرایا تھا لیکن یہ دونوں باتیں حقیقت سے بہت دور محض ظن و تخمین کی پیداوار تھیں" اس لیے کہ ماہرین علم الآثار نے "سد" کے کھنڈرات سے یہ پتہ چلایا ہے کہ اس بند آب کے بنانے والوں کے نام سنگی کتبوں پر کندہ اسی بند کی شکستہ دیواروں پر موجود ہیں اور ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس بند کو سب سے پہلے ۸۰۰ ق م میں سمع امر ینین بن سمعہلی نیوف (مکارب سبا) نے بنانا شروع کیا تھا مگر اس کے زمانہ میں تعمیر مکمل نہ ہو سکی اور اس

---

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۹۱ [2] تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۵۳۸ [3] تفسیر ابن کثیر ص ۵۳۹
[4] تفسیر ابن کثیر ص ۵۳۴ [5] تاریخ ابن کثیر ج ۳ ص ۱۵۹

Marfat.com

کے بعد کے بادشاہوں نے اس کو پورا کیا شبع امر کے علاوہ جو نام ان کتبوں سے پڑھے گئے وہ یہ ہیں "سمہلی نیوف بن ذمر علی (مکارب سبا) کرب اہل بین بن شبع امر (مکارب سبا) ذمر علی ذرح (ملک سبا) یدع ایل وتار۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ سد" مکارب سبا" کے زمانہ سے شروع ہو کر"ملوک سبا" کے ابتدائی دور تک طویل عرصہ میں تعمیر ہو سکی ہے۔ [1]

(۲) ترمذی میں بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہ ایک حدیث ہے جس میں مذکور ہے کہ ایک سائل نے نبی اکرم ﷺ سے دریافت کیا کہ سبا کسی ملک کا نام ہے یا کسی عورت کا یا کسی مرد کا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک مرد کا نام ہے جس کی نسل سے دس قبائل ہیں ان میں سے چار شام میں سکونت رکھتے ہیں اور چھ یمن میں۔ یمنی قبائل مذحج، کنہ، ازد، اشعر، انمار اور حمیر ہیں اور شامی قبائل میں لخم، جذام، عاملہ، غسان ہیں ترمذی نے اس حدیث کو حسن غریب کہا ہے [2] اور ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے مختلف طرق روایت کو بیان کر کے بعض طریق روایت کو حسن قوی کہا ہے [3] اور ابن عبدالبر نے انساب عرب پر بحث کرتے ہوئے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد یہ فیصلہ دیا ہے۔

هذا ادنٰى ما قيل به في ذٰلك والله اعلم. [4]

"یہ روایت ان سب اقوال سے بہتر ہے جو اس سلسلہ میں کہتے جاتے ہیں۔"

اس روایت سے قبائل مسطورہ بالا کا قحطانی ہونا ثابت ہوتا ہے مگر یہ واضح رہے کہ ان میں سے متعدد قبائل کے متعلق علماء انساب میں سخت اختلاف ہے کہ یہ عدنانی ہیں یا قحطانی تاہم انصار (اوس خزرج) کے متعلق جو بلاشبہ بنی ازد ہیں تمام علماء انساب کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ قحطانی الاصل ہیں اور بخاری کی وہ حدیث کہ جس سے مصنف ارض القرآن نے ان کو عدنانی ثابت کرنا چاہا ہے بقول علامہ ابن حجر عسقلانی ہرگز اس کے لیے دلیل نہیں بن سکتی جیسا کہ ہم گزشتہ صفحات میں بیان کر آئے ہیں اور نہ ہم کو کسی عالم نسب انصاری کا یہ قول نظر آیا کہ اس نے خود کو قحطانی الاصل تسلیم نہ کیا ہو، البتہ یہ ممکن ہے کہ چونکہ نبی اکرم ﷺ عدنانی اسماعیلی ہیں اس لیے بعض انصار نے حصول شرف ومجد کے جذبہ میں مادری سلسلہ سے خود کو عدنانی (اسماعیلی) کہہ دیا ہو۔

یہ بیشک صحیح ہے کہ بعض عدنانی قبائل نے چونکہ یمن میں سکونت اختیار کر لی تھی اس لیے بعض قحطانی اور عدنانی قبائل کے درمیان علماء انساب میں اختلاف نظر آتا ہے اور قضاعہ کے عدنانی سے قحطانی بن جانے کا عجیب قصہ تو ابن عبدالبر اور خود شعراء عرب نے بیان کیا ہے کہ کس طرح انہوں نے اپنے بھانجہ خالد بن یزید بن معاویہ کے اس مناقشہ میں جو اس کے اور بنو امیہ کے درمیان پیش آ گیا تھا۔ خالد کے کہنے سے اول خود کو یمنی قبائل کا حلیف بنایا اور پھر یمنی الاصل (قحطانی الاصل) ہونے کے مدعی بن گئے۔ [5]

(۳) قرآن حکیم نے سورہ سبا میں سبا کی مذہبی حالت پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سبا کے طبقہ اولیٰ کی ہر دو شاخوں کا مذہب یا آفتاب پرستی (ستارہ پرستی) رہا ہے اور یا سچی یہودیت (دین موسوی) اور طبقہ ثانیہ کی ہر دو شاخوں میں یا صنم پرستی قومی مذہب رہا ہے اور یا عیسائی (یہودیت) بھی کبھی کبھی ان میں نظر آ جاتی ہے۔ قرآن نے اصحاب اخدود کا جو واقعہ بیان کیا ہے اس سے بھی اس پر روشنی پڑتی ہے اس لیے کہ ذونواس حمیری (یہودی) یمن ہی کا بادشاہ تھا۔

---

[1] ارض القرآن ماخوذ مضمون از ازماؤ فرنچ ایشیاٹک سوسائٹی جرنل ۱۸۷۴ء [2] تفسیر ج ۳

[3] الانباہ ص ۱۰۴ [4] ایضاً ص ۱۰۶ [5] الانباہ ص ۵۹-۶۰

④ اہل عرب اس کے قائل ہیں کہ تمام قبائل عرب بلا استثنا صرف دو شخصوں کی نسل سے ہیں عدنان اور قحطان مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ توراۃ اور تاریخ ان دو سلسلوں کے علاوہ بعض دوسرے سلسلے بھی بیان کرتی ہے بلکہ بعض صحیح روایات میں بنی جرہم کا بھی ذکر موجود ہے جو ان دونوں (قحطانی) اور عدنانی سلسلوں سے الگ تیسرا سلسلہ ہے پھر علماء انساب کے پاس کون سی دلیل ہے کہ وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عرب میں ان دو سلسلوں کے سواء سب معدوم ہو گئے اور تمام قبائل عرب ان دو ہی سلسلوں میں منحصر ہو گئے ہیں؟

نبی اکرم ﷺ سے ایک ضعیف روایت سے اور حضرت عبداللہ بن مسعود، عبداللہ ابن عباس، عمرو بن میمون اور محمد بن کعب قرظی رضی اللہ عنہم سے بروایت قوی منقول ہے کہ جب وہ اس آیت کو تلاوت فرماتے:

﴿وَالَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ ۛ لَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا اللَّهُ ۚ﴾ (ابراهیم: ۹)

"اور وہ لوگ جو ان (قوموں) کے بعد ہیں ان کو اللہ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا"

تو ارشاد فرمایا کرتے تھے:

"کذب النسابون" "نسب بیان کرنے والے جھوٹے ہیں"۔

یعنی انہوں نے بیچ میں بہت کچھ جھوٹ ملا دیا ہے۔

ابن عبدالبر معرفت علم انساب کو مفید علم ثابت کرتے ہوئے اس روایت کے متعلق فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے ان حضرات کا یہ جملہ قریش کے نسب کے لیے مخصوص ہو اور ان کا مطلب یہ ہو کہ اس سلسلہ میں عدنان سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے درمیان جو کڑیاں ہیں وہ تحقیقی نہیں ہیں اور اس میں نسابین کا جھوٹ شامل ہے مگر ہمارے نزدیک اس جملہ کا ٹھیک مطلب یہ ہے کہ اہل نسب کا یہ دعویٰ کہ وہ بنی آدم کے سلسلہ انساب کے ماہر اور محقق ہیں اور کوئی سلسلہ ہماری نگاہ تحقیق سے نہیں چھوٹا صحیح نہیں ہے اور وہ اپنے اس دعوے میں جھوٹے ہیں ﴿لَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا اللَّهُ ۚ﴾ اللہ کے سواء کون اس کا دعویٰ کرسکتا ہے۔ (انتہی) ❶

ہم ابن عبدالبر کی اس توجیہ کی حرف بہ حرف تائید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عرب قبائل میں ایسے سلسلے موجود ہیں جو عدنانی اور قحطانی سے الگ ہیں اور اکثر علماء انساب ان میں تمیز کرنے سے قاصر رہے ہیں جیسا کہ ہم ابن کثیر کے حوالہ سے ثابت کر چکے ہیں۔

چند تفسیری مباحث:

① مفسرین کو "عرم" کے معنی میں بحث ہے اور وہ چند معنی بیان کرتے ہیں:

"گہرا پانی"، "وادی"، "سیلاب عظیم"، "بند آب" شاہ عبدالقادر نور اللہ مرقدہ، نے "سیلاب عظیم" مراد لیا ہے فرماتے ہیں "پس بھیجی ہم نے ان پر روزور کی" اور مصنف ارض القرآن فرماتے ہیں کہ "جس کو عرب حجاز "سد" کہتے ہیں اسی کو عرب یمن "عرم" کہتے ہیں ہمارے نزدیک زیادہ صحیح اور موقع کے مناسب یہی معنی ہیں اور جب کہ لغت عرب میں "عرمۃ" کے معنی "بند آب" کے آتے ہیں تو دوسرے معانی کی جانب توجہ غیر ضروری ہے "العرمتہ"، "سد یعترض بہ الوادی" ❷ اس معنی کے دلچسپ اور مناسب

❶ القصد والامم لابن عبدالبر ص ۱۹ ❷ الانباہ ص ۴۹

Marfat.com

حال ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح قرآن عزیز میں "بند آب" کا ذکر ثابت ہو جاتا ہے اور دوسرے معانی اگر مراد لیے جائیں تو ان سے صرف یہ لازم آتا ہے کہ کوئی بند آب ہوگا جس کو سیلاب بہا کر لے گیا بند آب کا ذکر صراحتاً ثابت نہیں ہوتا۔

(۲) کسی خطہ زمین میں باغوں کا ہونا گو خوش عیشی کی دلیل ہے لیکن گزشتہ تفاصیل سے یمن کے طبعی خواص اور پھر بند آب کے عجیب و غریب طرز تعمیر نے سینکڑوں میل تک مارب کے داہنے بائیں مسلسل پھلوں، پھولوں اور میووں کے بے شمار باغات نے جو صورت حال پیدا کر دی تھی اس کے متعلق غیر مسلم مورخوں کی شہادتیں بھی یہ بتا رہی ہیں کہ مارب اور یمن کا یہ علاقہ دنیا میں فردوس نظیر بن گیا تھا اور ان کے ملک کی یہ صورت حال خدائے تعالیٰ کے خصوصی کرم کی رہین منت تھی اسی لیے قرآن عزیز نے اس کو خدا کی نشانی کہا ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّ شِمَالٍ ۬﴾ (سبا:۱۵)

(۳) ان آیات میں ہے ﴿ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّ رَبٌّ غَفُوْرٌ ۝﴾ "شہر ہے پاک اور پروردگار ہے بخشنے والا" اور اس کے بعد ہے ﴿ فَاَعْرَضُوْا ﴾ "پس انہوں نے خدا سے روگردانی کی" ان دونوں جملوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سبا پہلے مسلمان تھے اور احکام الٰہی کے مطیع و فرماں بردار مگر آہستہ آہستہ انہوں نے نافرمانی اور کفر اختیار کر لیا جیسا کہ اس آیت سے بھی ظاہر ہوتا ہے ﴿ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ؕ﴾ تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام اور کفر کے یہ دو زمانے ان پر کب طاری ہوئے تا کہ ان آیات کی تفسیر واقعات تاریخی کی روشنی میں کی جا سکے۔

اس سوال کا حل یہ ہے کہ سورۂ سبا سے قبل سورۂ نمل میں قرآن عزیز نے ملکہ سبا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعات میں یہ بیان کیا ہے کہ ملکہ سبا اور اس کی قوم پہلے آفتاب پرست اور مشرک تھی مگر حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعوت و ارشاد پر اس نے اسلام قبول کر لیا اور تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ وہ اس کے بعد بھی اپنی زندگی میں سریر آرائے سلطنت رہی اور تمام قوم اس کی مطیع و فرماں بردار تھی پس جو اصحاب بصیرت اس زمانہ کی قوموں کے مذاہب کی تاریخ سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ اسلام لانے کے بعد ملکہ کا سلطنت پر قائم رہنا اس کی واضح اور روشن دلیل ہے کہ ملکہ کے ساتھ اس کی قوم بھی ایمان لے آئی تھی۔

آپ نبی اکرم ﷺ کے ان نامہائے مبارک کے ان جملوں کو پڑھیے جو آپ ﷺ نے شاہان عالم کے نام دعوت اسلام کے سلسلہ میں بھیجے ہیں:

((فان تولیت فعلیك اثم الیریسیین)) ، ((فان تولیت فعلیك اثم القبط)) ، ((فان تولیت فعلیك اثم المجوس)).

"اے شاہان روم و ایران و مصر اگر تم نے خدا کی دعوت حق کا انکار کر دیا تو تمہاری رعایا کی گمراہی کا وبال بھی تمہاری گردن پر رہے گا۔"

یہ آپ ﷺ نے کیوں ارشاد فرمایا صرف اس لیے کہ قدیم شخصی حکومتوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ان کی قومی حکومتوں میں جو مذہب بادشاہ کا ہوتا تھا وہی پوری قوم کا مذہب بن جاتا تھا اور بعض اقوام میں تو بادشاہ "خدا کا مظہر" سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا کسی بات کو اس کا قبو

Marfat.com

کر لینا گویا رعایا کے لیے خدا کے حکم کے برابر تھا۔

بہر حال ۹۵۰ ق م میں سبا نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا اور صدیوں تک انہوں نے اس امانت الٰہی کو سینہ سے لگائے رکھا لیکن گزشتہ قوموں کی طرح جب انہوں نے اس سے روگردانی شروع کی اور دوبارہ شرک اختیار کیا تب خدا کے پیغمبروں نے اپنے اپنے زمانہ میں آ کر ان کو رشد و ہدایت کی جانب متوجہ کیا۔ غالباً یہ انبیاء بنی اسرائیل ہیں جو بذات خود یا اپنے نائبوں کے ذریعہ ان کو ہدایت کی جانب بلاتے رہے ہیں مگر انہوں نے عیش و عشرت، دولت و ثروت اور حکومت و شوکت کے نشہ میں کوئی پرواہ نہیں کی بلکہ بنی اسرائیل کی طرح خدا کی نعمتوں کو ٹھکرانے لگے تب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ایک صدی پہلے خدا کی جانب سے سیل عرم اور آبادیوں کی تباہی کا عذاب آیا اور اس نے سبا کے خاندان کو پارہ پارہ کر دیا۔

ایک یونانی مؤرخ تھیوفرتیسن جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً تین سو بارہ برس پہلے اور سبا کا معاصر تھا لکھتا ہے:

"یہ ملک سبا سے متعلق ہے جو بخورات کی بڑی حفاظت کرتے ہیں ان بخورات کا ڈھیر آفتاب کے ہیکل میں لایا جاتا ہے جو اس ملک میں نہایت مقدس سمجھا جاتا ہے۔" ❶

اور علمائے اسلام میں سے ماہرین علم الآثار نے دوسری یا تیسری صدی ہجری میں یمن کے ایک کتبہ میں پڑھا تھا۔

هذا ما بنى شمر يرعش سيدة الشمس. ❷

"یہ شمر یرعش نے سورج دیبی کے لیے بنایا ہے۔"

④ سورۂ سبا کی ان ہی آیات میں ہے: ﴿ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا ﴾ مفسرین نے ان برکت والی بستیوں کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل کیے ہیں ان میں سے صحیح قول یہ ہے کہ اس سے شام کی بستیاں مراد ہیں اس لیے کہ قرآن نے اس سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے وہ ان ہی بستیوں پر صادق آتا ہے جن کا تعلق یمن سے شام تک تجارتی شاہراہ سے تھا، مجاہد حسن قتادہ، سعید بن جبیر بن زید (رحمہم اللہ) وغیرہ یہی تفسیر کرتے ہیں:

يعنى قرى الشام يعنى انهم كانوا يسيرون من اليمن الى الشام فى قرى ظاهرة متواصلة. ❸

"یعنی برکت والی بستیوں سے شام کی بستیاں مراد ہیں یعنی وہ یمن سے شام تک امن و اطمینان کے ساتھ ان بستیوں میں ہو کر گزرتے ہیں جو اسی غرض سے قریب قریب بنائی گئی ہیں کہ ان کا سفر آسان اور خوش گوار رہے۔"

ابن کثیر رحمہ اللہ ﴿ قُرًى ظَاهِرَةً ﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اى بينة واضحة يعرفها المسافرون و يقيلون فى واحدة و يبيتون فى اخرى. ❹

"یعنی ایسی بستیاں جو مسافروں تاجروں اور سیاحوں کے لیے ہی قریب قریب بنائی گئی تھیں اور جن کو وہ اچھی طرح پہچانتے تھے کہ ایک بستی میں دوپہر آرام سے گزاری تو شب باشی کے لیے دوسری بستی میں پہنچ گئے۔"

مفسرین (رحمہم اللہ) جب سبا کی ان آیات کی تفسیر کرتے ہیں تو "سیل عرم" اور "قری ظاہرة" یعنی یمن سے شام تک پھیلی ہوئی سبا

---

❶ ارض القرآن ج ۲ ص ۱۶۳ ماخوذ از ہیرن کی ہسٹاریکل ریسرچیز ج ۱ ص ۳۵

❷ تاریخ حمزہ اصفہانی ۱۱۰ کلکتہ ❸ تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۵۳۳ ❹ ارض القرآن ج ۱ ص ۲۷۴

Marfat.com

کی نوآبادیات کی بربادی دونوں ہی کا تذکرہ کرتے ہیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ تاریخ کے اس پہلو پر نہیں ہے جو رومیوں کے تجارتی راہ بدل دینے سے سبا کو پیش آیا اور خود سبا کی اس مانگ پر ﴿ رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا ﴾ خدا نے ان کو اس حالت میں بدل دیا کہ وہ تلاش معاش کے لیے دیگر قبائل عرب کی طرح سفر کے مصائب جھیلتے پھریں اور ان کو عبرت کی کہانی بنا دیا اور پارہ پارہ کر دیا مگر ہم گزشتہ سطور میں یہ ثابت کر چکے ہیں کہ چونکہ بری تجارتی شاہراہ سے بحری راہ کی وہ تبدیلی کہ جس کے نتیجہ میں سبا کی نوآبادیاں بہت جلد برباد ہو گئیں اور سبا کا یہ خاندان حکومت پارہ پارہ ہو گیا تقریباً اس ہی زمانہ میں پیش آیا جو زمانہ "سیل عرم" کا تھا خواہ تبدیلی راہ کی داغ بیل اس سے بہت پہلے یونانیوں کے ہاتھوں پڑی ہو۔ پس مفسرین اگرچہ "قریٰ ظاہرۃ" کی بربادی میں تجارتی راہ کی تبدیلی کا تذکرہ نہیں کرتے مگر وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ "سیل عرم" اور یمن سے شام تک کی سبائی آبادیوں کی بربادی دو جدا جدا معاملے ہیں، یہ نہیں ہے کہ بند آب کے ٹوٹ جانے سے یہ تمام نوآبادیاں بھی برباد ہو گئی تھیں جیسا کہ ہم ابن کثیر رحمہ اللہ سے سابق میں نقل کر چکے ہیں کہ سیل عرم کے بعد بھی مارب کے علاوہ یمن کے دوسرے حصوں میں قبائل یمن آباد تھے۔ لہٰذا قرآن کا فیصلہ مفسرین کے علی الرغم نہیں ہے جیسا کہ منصف ارض القرآن نے سمجھا ہے۔

نتائج وعبر:

① اللہ تعالیٰ نے قرآن عزیز میں موعظت ونصیحت کے چار طریقے بیان فرمائے ہیں۔

(الف) "تذکیر بالاء اللہ" یعنی خدائے تعالیٰ نے اپنے بندوں پر جن نعمتوں کی ارزانی فرمائی ہے ان کو یاد کر کے خدا کے احکام کی پیروی کی جانب متوجہ کرنا سورۂ اعراف میں ارشاد ہے:

﴿ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾ (الاعراف: ٦٩)

"پس اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔"

﴿ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝ ﴾ (الاعراف: ٧٤)

"پس اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد کرتے مت پھرو۔"

(ب) "تذکیر بایام اللہ" یعنی ان گزشتہ قوموں کے حالات بیان کر کے نصیحت وعبرت دلانا جنہوں نے یا تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت وانقیاد کی وجہ سے کامرانی اور فلاح دارین حاصل کی اور یا سرکشی وطغیان کی انتہا پر پہنچ کر ہلاکت وتباہی مول لی اور عذاب الٰہی کے مستوجب قرار پائیں یا بالفاظ دیگر قوموں کی عروج وزوال کو پیش کر کے سامان عبرت مہیا کرنا سورۂ ابرہیم میں ہے۔

﴿ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ﴾ (ابراھیم: ٥)

"اور اے پیغمبر ان کو نصیحت کیجئے قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ یاد دلا کر۔"

(ج) "تذکیر بآیات اللہ" یعنی مظاہر قدرت کی جانب توجہ دلا کر خالق کائنات کی ہستی اور اس کی وحدت کا اعتراف کرانا اور تصدیق حق کے لیے اپنی نشانیوں (معجزات آیات قرآنی) کے ذریعہ چشم بصیرت وا کرنا۔ سورۂ یوسف میں ارشاد ہے:

Marfat.com

﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۝﴾(یوسف: ۱۰۵)

"اور زمین اور آسمان میں خدا کے بہت سے نشانات ہیں کہ جن پر وہ بے توجہی کے ساتھ گزر جاتے ہیں اور پرواہ بھی نہیں کرتے۔"

(د) "تذکیر بما بعد الموت" یعنی برزخ اور قیامت کے حالات سنا کر عبرت دلانا سورۂ قٓ میں ہے۔

﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ۝﴾(ق: ٤٥)

"پس قرآن کے ذریعہ نصیحت کرو اس شخص کو جو خدا کی وعید یعنی بعد الموت کے عذاب سے ڈرتا ہے۔"

پس قوم سبا کا یہ واقعہ "تذکیر بایام اللہ" سے تعلق رکھتا ہے اور ہم کو یہ عبرت دلاتا ہے کہ جب کوئی قوم عیش و راحت اور ثروت و طاقت کے گھمنڈ میں آ کر نافرمانی اور سرکشی پر آمادہ ہو جاتی ہے تو اول خدائے تعالیٰ اس کو مہلت دیتا اور اس کو راہ راست پر لانے کے لیے اپنی حجت کو آخری حد تک پورا کرتا ہے پس اگر وہ اس پر بھی قبول حق کی دشمن رہتی اور بغاوت و سرکشی کے اس اعلیٰ معیار پر پہنچ جاتی ہے کہ اس کو خدا کی نعمتیں اور عطا کردہ راحتیں بھی ناگوار گزرنے لگتی ہیں اور وہ ان کو ٹھکرانے لگتی ہے تو پھر قانون گرفت اپنا فولادی پنجہ آگے بڑھاتا اور ایسی بدبخت قوم کو پارہ پارہ کر دیتا اور ہلاکت و بربادی کے چرخ پر اتار دیتا ہے اور ان کا سارا کروفر دنیا کے سامنے صرف ایک کہانی بن کر رہ جاتا ہے۔

﴿قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝﴾(النمل: ٦٩)

(اعاذنا اللہ من ذٰلك)

Marfat.com

اصحاب الاخدود (یا) قوم تُبع

(۵۲۵ء)

○ اخدود ○ اصحاب اخدود اور قرآن حکیم ○ واقعہ کی تفصیلات ○ تنقید و تبصرہ ○ تبع عرب کی دو حکایتیں
○ چند تفسیری نکات ○ بصائر و عبر

اخــدود؟

"خد یا اخدود" کے معنی گڑھے، کھائی اور خندق کے ہیں یہ مفرد ہے اور اس کی جمع "اخادید" آتی ہے، چونکہ زیر بحث واقعہ میں کافر بادشاہ اور اس کے امراء و داعیان سلطنت نے خندقیں اور گڑھے کھدوا کر اور ان کے اندر آگ دہکا کر عیسائی مومنوں کو ان میں ڈال کر زندہ جلا دیا تھا اس نسبت سے ان کافروں کو "اصحاب اخدود" کہا جاتا ہے۔

اصحاب اخدود اور قرآن حکیم:

اصحاب اخدود کا تذکرہ قرآن حکیم میں سورہ بروج میں کیا گیا ہے اور اجمال و اختصار کے ساتھ صرف اسی قدر پر اکتفاء کیا گیا ہے جو رشد و ہدایت کے لیے باعث موعظت و بصیرت ہے۔

وہ کہتا ہے کہ محمد ﷺ کی بعثت سے قبل ایک مقام پر حق و باطل کا معرکہ پیش آیا۔ ایک جانب خدا کے مومن بندے تھے جن کے پاس اگرچہ مادی قوت و طاقت نہیں تھی اور وہ اس لحاظ سے ضعیف و کمزور تھے مگر ایمان اور حق و صداقت کی قوت اور خدا کے نام پر ایثار و فداکاری کی طاقت کے مالک تھے دوسری جانب میں ایمان باللہ اور قبول حق سے محرومی تھی مگر مادی شوکت و صولت اور قاہرانہ طاقت کی فراوانی تھی ان حالات میں کافر و مشرک طاقت نے مومنوں کی ایمانی قوت اور قبول حق کی طاقت کو دعوت مبارزت دی کہ یا وہ ایمان باللہ کو ترک کر کے شرک و کفر پر واپس آ جائیں ورنہ دنیا سے فنا ہو جانے کے لیے تیار ہو جائیں۔ مومنین صادقین نے اس دعوت مبارزت (چیلنج) کو ایمانی جرأت کے ساتھ قبول کیا اور ایمان باللہ کی روشنی سے نکل کر شرک و کفر کی تاریکی میں داخل ہونے سے انکار کر دیا۔

یہ دیکھ کر کافر جماعت کی جانب سے حاکمانہ طاقت اور قاہرانہ جبروت کے ساتھ شہر کے مختلف حصوں میں خندقیں کھودی جا رہی ہیں خندقوں کے اندر آگ دہک رہی ہے، شعلے بھڑک رہے ہیں اور زمین کا اکثر حصہ کرہ نار بنا ہوا ہے اب مومن جماعت کے غیور اور فداکار انسان کشاں کشاں لائے جا رہے ہیں، وہ جگہ جگہ خندقوں کے دہانوں پر کھڑے کر دیئے گئے ہیں اور کفر و شرک اپنی

Marfat.com

مادی قوت کے بل پر کہہ رہا ہے کہ یا مجھ کو قبول کرو ورنہ بھڑکتی ہوئی آگ اور دہکتے ہوئے گڑھوں کی نذر کر دیئے جاؤ گے یہ سن کر مومن جماعت کہتی ہے جہنم کی آگ کے مقابلہ میں تمہارا آگ کا یہ عذاب ایک کھیل ہے اس لیے ایمان باللہ جہنم کی آگ کے مقابلہ میں بخوشی اس کو قبول کرتا ہے مگر شرک و کفر کو ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتا، کفر و شرک کی طاقت یہ سن کر لاجواب ہو جاتی مگر غیظ وغضب میں آ کر فدا کارانِ توحید کو زندہ نذر آتش کر دیتی ہے اور اس طرح حق کو فتح و کامرانی اور باطل کو شکست و ناکامی ہو جاتی ہے کیونکہ جو دنیا والوں کی نظر میں خندقوں کے اندر دہکتی آگ میں جلا دیئے گئے وہ جلے اور مرے نہیں بلکہ زندۂ جاوید بن کر ابدی جنت اور سرمدی بہشت سے نوازے گئے اور جو اپنی دنیوی طاقت کے گھمنڈ پر نیکو کار انسانوں پر بجھ جانے اور فنا ہو جانے والی آگ دہکا رہے تھے وہ ابدی اور دائمی آگ "جہنم" کے مستحق قرار پائے، انہوں نے دنیا میں آگ کی بھٹی روشن کی اور مومنین صادقین کو اس کا ایندھن بنایا خدائے تعالیٰ نے عالم آخرت میں ایک ہولناک بھٹی (جہنم) روشن کر رکھی ہے جس کا ایندھن کافر و مشرک ہوں گے، جابر و ظالم ہوں گے ان کی بھٹی کو بہ عجلت یا بہ دیر بجھ جانا ہے، فنا ہو جانا ہے۔ لیکن خدا کی دہکائی ہوئی بھٹی کو خلود اور ہمیشگی حاصل ہے وہ نہ بجھے گی اور نہ فنا ہو گی۔ کفر و شرک نے دنیا کی طاقت پر گھمنڈ کیا مگر اس کا نتیجہ "عذاب الحریق" اور "عذاب جہنم" ہے اور ایمان باللہ نے خدا کی طاقت پر بھروسہ کیا تو اس کا نتیجہ ﴿ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ﴾ اور ﴿جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ کی صورت میں ظاہر ہوا۔

غرض سورۂ بروج میں یہ واقعہ معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ اس طرح مذکور ہے:

﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۝۱ وَ الْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۝۲ وَ شَاهِدٍ وَّ مَشْهُوْدٍ ۝۳ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝۴ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝۵ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۝۶ وَّ هُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ۝۷ وَ مَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّاۤ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝۸ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝۹ اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَ لَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ۝۱۰ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ۬ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ۝۱۱﴾ (البروج: ۱۔۱۱)

"شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے○ قسم ہے آسمان کی جس میں برج ہیں اور اس دن کی جس کا وعدہ ہے اور اس دن کی جو حاضر ہوتا ہے اور اس دن کی جس کے پاس حاضر ہوتے ہیں، مارے گئے کھائیاں کھودنے والے آگ ہے بہت ایندھن والی جب وہ اس پر بیٹھے اور جو کچھ وہ کرتے تھے مسلمانوں کے ساتھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور ان سے بدلہ نہیں لیتے تھے مگر صرف اس بات کا کہ وہ یقین لائے اللہ پر جو زبردست ہے تعریفوں کا مستحق ہے جس کا راج ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور اللہ کے سامنے ہے ہر چیز بیشک جو ایمان سے بچلائے ایمان والے مردوں کو اور عورتوں کو پھر توبہ نہ کرے تو ان کے لیے عذاب ہے دوزخ کا اور ان کے لیے عذاب ہے آگ میں جلنے کا بیشک جو لوگ یقین لائے (اللہ پر) اور انہوں نے بھلائیاں کیں ان کے لیے جنتیں ہیں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں یہ ہے بہت بڑی کامرانی۔"

Marfat.com

واقعہ کی تفصیلات:

مفسرین نے ان آیات کی تفسیر میں متعدد واقعات نقل کیے ہیں مگر ان میں سے دو زیادہ مشہور ہیں ایک کا ذکر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے مسند میں امام مسلم نے صحیح میں اور نسائی و ترمذی نے سنن میں کیا ہے وہ یہ کہ حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا گزشتہ زمانہ میں ایک بادشاہ تھا اس کے دربار میں ایک جادوگر تھا جب وہ بہت بوڑھا ہو گیا تو ایک روز اس نے بادشاہ سے کہا میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں اور موت کا وقت قریب ہے اس لیے میری خواہش ہے کہ آپ ایک فہیم و زیرک لڑکا میرے حوالہ کر دیں تا کہ میں اس کو اپنا یہ فن (سحر) سکھا کر اپنی زندگی ہی میں کامل کر دوں۔ چنانچہ بادشاہ نے ایک لڑکے کو اس کے سپرد کر دیا اور اس نے ساحر سے سحر کی تعلیم شروع کر دی۔ بادشاہ کے محل اور ساحر کے مکان کے درمیان ایک راہب [1] کی کٹیا تھی ایک مرتبہ لڑکا اس راہب کے پاس چلا گیا اور اس کی باتوں اور اس کے طریقوں کو دیکھ کر بہت مسرور ہوا اور اس کے پاس آنے جانے لگا۔ یہاں دیر ہونے لگی تو ساحر اور بادشاہ مقررہ آمد و رفت میں تاخیر کرنے پر برافروختہ ہوئے لڑکے نے راہب سے اس کی شکایت کی۔ راہب نے کہا کہ اس معاملہ کے مخفی رکھنے کی صرف یہ صورت ہے کہ جب بادشاہ باز پرس کرے تو یہ عذر کر دینا کہ ساحر کے یہاں تاخیر ہو گئی اور جب ساحر ناراض ہو تو یہ کہہ دینا کہ بادشاہ کے پاس تاخیر ہو گئی۔

غرض یہ سلسلہ عرصہ تک یوں ہی جاری رہا کہ ایک مرتبہ لڑکے نے دیکھا کہ راہ میں بہت ہیبت ناک اور عظیم الجثہ درندہ لوگوں کی راہ روکے ہوئے ہے اور کسی کو یہ جرات نہیں ہوتی کہ وہ اس کے سامنے سے گزر جائے لڑکے نے سوچا کہ یہ بہترین وقت ہے اس بات کا کہ میں جانچ کروں آیا ساحر کا مذہب سچا ہے یا راہب کا (دین) یہ سوچ کر اس نے ایک پتھر اٹھایا اور کہنے لگا "خدایا اگر تیرے نزدیک ساحر کے مقابلہ میں راہب کا دین سچا ہے تو میرے اس پتھر سے تو اس جانور کو ہلاک کر دے" یہ کہہ کر اس نے جانور کو پتھر مارا پتھر کا لگنا تھا کہ وہ وہیں ہلاک ہو گیا لڑکا چل دیا اور راہب سے جا کر سارا ماجرا کہہ سنایا۔ راہب نے کہا صاحب زادے تم مجھ پر فضیلت لے گئے مجھے ڈر ہے کہ تم آزمائش میں ڈالے جاؤ گے دیکھو وہ وقت آئے تو میرا ذکر نہ کرنا۔ لوگوں نے لڑکے کی اس جرأت کو دیکھ کر چرچا کیا اور کہنے لگے کہ اس کو عجیب غریب علم آتا ہے، یہ سن کر اس کے پاس اندھے اور جذامی آنے لگے اور انہوں نے کہا کہ اپنے علم کے زور سے ہم کو اچھا کر اور وہ خدا کے فضل سے اچھا کر دیتا تھا۔ بادشاہ کا ایک درباری مصاحب نابینا ہو گیا تھا اس نے لڑکے کا چرچا سنا تو تحفے تحائف کا بہت بڑا سامان لے کر اس کے پاس آیا اور تحفے پیش کرتے ہوئے بینا کر دینے کی درخواست کی۔ لڑکے نے جواب دیا میں کچھ نہیں ہوں اور نہ مجھ میں یہ طاقت ہے بلکہ شافی مطلق تو خدائے واحد ہے پس اگر تو ایمان لے آئے اور اس واحد و یکتا کے سوا کسی کی پرستش نہ کرے تو میں ضرور تیری سفارش کے لیے دعا کروں گا۔ درباری یہ سن کر خدائے واحد پر ایمان لے آیا اور مسلمان ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو شفاء عطاء فرمائی اور وہ بینا ہو گیا۔ اگلے دن جب وہ بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے نابینا کو بینا پایا، تب بادشاہ نے سوال کیا کہ اپنے بینا ہونے کی حقیقت بیان کر اس نے جواب دیا "میرے رب نے مجھ کو شفا بخش دی" بادشاہ نے کہا تیرا رب تو میں ہوں میں نے تجھ کو اچھا کر دیا؟ درباری نے جواب میں کہا نہیں تیرے اور میرے اور کل

---

[1] حق پرست عیسائی عابد

Marfat.com

جہان کے پروردگار نے اچھا کر دیا، بادشاہ نے (غصہ میں آ کر) کہا "کیا میرے سواء بھی کوئی تیرا رب ہے" درباری نے کہا جی ہاں۔ "اللہ تیرا اور میرا دونوں کا رب ہے" تب بادشاہ نے اس کو طرح طرح کے عذاب میں مبتلاء کیا آخر اس نے لڑکے کا ماجرا کہہ سنایا۔ بادشاہ نے لڑکے کو بلایا اور اس سے کہا بیٹا مجھے معلوم ہوا ہے کہ "تو سحر کے ذریعہ سے اندھوں کو بینا اور مبروص اور جذامی کو شفاء دیتا ہے" لڑکے نے کہا "مجھ میں یہ طاقت کہاں؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کے شفاء دینے سے شفایاب ہوتے ہیں" بادشاہ نے کہا "کیا میرے علاوہ بھی تیرا اور کوئی رب ہے؟" لڑکے نے کہا "وہ خدا جو واحد و یکتا ہے تیرا اور میرا دونوں کا رب ہے" تب بادشاہ نے اس کو عذاب میں مبتلاء کرنا شروع کر دیا آخر اس نے راہب سے متعلق تمام واقعہ کہہ سنایا تب بادشاہ نے راہب کو بلایا اور اس کو مجبور کیا کہ وہ دین حق سے پھر جائے مگر راہب نے کسی طرح اس کو قبول نہیں کیا۔ تب بادشاہ نے اس کے سر پر آرا چلوا دیا اور اس طرح اس کو شہید کر ڈالا۔ اب لڑکے سے کہا کہ تو راہب کے دین سے پھر جا لڑکے نے بھی صاف انکار کر دیا تو بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر وہاں سے گرا دو کہ پاش پاش ہو جائے جب سرکاری آدمی لڑکے کو پہاڑ پر لے کر چڑھے تو لڑکے نے دعا کی "الٰہی تو ان لوگوں کے مقابلہ میں میرے لیے کافی ہو جا" چنانچہ اسی وقت پہاڑ زلزلہ میں آ گیا اور سرکاری آدمی گر کر ہلاک ہو گئے اور لڑکا صحیح و سالم بچ کر بادشاہ کے سامنے حاضر ہو گیا۔ بادشاہ نے یہ دیکھا تو کہا کہ تیرے ساتھ والے کہاں گئے لڑکے نے کہا خدا نے ان کے مقابلہ میں میری مدد کی تب بادشاہ نے غضب ناک ہو کر حکم دیا کہ اس کو لے جاؤ اور دریا میں لے جا کر غرق کر دو، سرکاری آدمی جب اس کو دریا کے بیچ میں لے کر پہنچے تو لڑکے نے پھر وہی دعا کی "خدایا ان سے مجھ کو نجات دے" فوراً ہی دریا میں جوش آیا اور وہ سب غرق ہو گئے اور لڑکا پھر بچ گیا اور صحیح و تندرست بادشاہ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ بادشاہ نے پھر وہی سوال کیا اور لڑکے نے وہی پھر جواب دیا اور اس مرتبہ وہ کہنے لگا۔ "بادشاہ اس طرح تو ہرگز مجھ پر کامیابی حاصل نہیں کر سکتا البتہ جو ترکیب میں بتاؤں اگر اس کو اختیار کرے تو بیشک تو مجھ کو قتل کر سکتا ہے" بادشاہ نے لڑکے سے وہ ترکیب دریافت کی لڑکے نے کہا: "تو شہر کی تمام مخلوق کو بلند جگہ پر جمع کر جب سب جمع ہو جائیں تو اس وقت مجھ کو درخت پر سولی دینا اور میرے ترکش سے تیر لے کر اور یہ پڑھ کر میرے سینہ پر مارنا "بسم اللہ رب الغلام" "اللہ کے نام پر جو اس لڑکے کا پروردگار ہے" تب میں مر سکتا ہوں" بادشاہ نے لڑکے کے قول پر عمل کیا اور جب تمام شہر جمع ہو گیا تو لڑکے کو سولی پر لٹکا کر اور لڑکے کی بتائی ہوئی عبارت پڑھ کر اس کے تیر مارا اور لڑکا تیر کھا کر جان بحق ہو گیا۔ مخلوق نے یہ دیکھا تو سب نے ایک دم باآواز بلند نعرہ لگایا "امنا برب الغلام، امنا برب الغلام" "ہم لڑکے کے پروردگار پر ایمان لائے" اور سب مسلمان ہو گئے درباری کہنے لگے "بادشاہ جس بات کا تجھ کو خوف تھا آخر وہی ہو کر رہی اور یہ تمام رعایا مسلمان ہو گئی بادشاہ یہ دیکھ کر جامہ سے باہر ہو گیا اور اس نے حکم دیا کہ شہر کے ہر ایک محلہ اور گلی کوچہ میں خندقیں کھودو اور ان میں خوب آگ دہکاؤ اور پھر ہر محلہ کے لوگوں کو جمع کرو اور ان سے کہو کہ وہ اس دین سے باز آ جائیں جو باز آ جائے اس کو چھوڑ دو اور جو انکار کرتا جائے اس کو دہکتی آگ میں ڈالتے جاؤ لوگ جوق در جوق جمع ہوتے تھے اور دین حق سے باز نہ رہنے کا اقرار کرتے اور دہکتی آگ میں بخوشی ڈالے جاتے تھے اور اس جاں گسل اور ہولناک نظارہ کو بادشاہ اور اس کے مصاحبین مسرت کے ساتھ دیکھ رہے تھے کہ ایک عورت لائی گئی جس کی گود میں شیر خوار بچہ تھا عورت بچہ کی محبت میں جھجکی فوراً بچہ نے کہا: "ماں صبر سے کام لے اور بے خوف خندق میں کود جا اس لیے کہ بلاشبہ تو حق پر ہے اور یہ ظالم باطل پر ہیں۔"[1]

[1] مسلم، نسائی، ترمذی، مسند احمد

Marfat.com

اور دوسرا واقعہ صاحب سیرۃ محمد بن اسحاق نے بہ سلسلہ سند محمد بن کعب رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ شام اور حجاز کے درمیان جو بستی نجران کے نام سے مشہور ہے اس کے باشندے بت پرست اور مشرک تھے اور ان کے قریب کی آبادی میں ایک ساحر رہتا اور وہ نجران کے لڑکوں کو سحر کی تعلیم دیا کرتا تھا کچھ عرصہ بعد نجران اور ساحر کی بستی کے درمیان ایک راہب آ کر خیمہ زن ہوا وہب بن منبہ کہتے ہیں کہ اس کا نام فیمون تھا نجران کے جو لڑکے ساحر سے سحر کی تعلیم حاصل کرتے تھے ان میں ایک لڑکا عبداللہ بن تامر بھی تھا ایک روز عبداللہ راہب کے خیمہ میں چلا گیا۔ راہب نماز میں مشغول تھا عبداللہ کو راہب کی نماز اور طریق عبادت بہت پسند آیا اور اس کے پاس آنے جانے لگا اور اس سے اس کے دین کو سیکھنا شروع کر دیا اور ایمان لے آیا اور راہب سے سچی مسیحیت کی تعلیم حاصل کر کے آہستہ آہستہ عالم دین بن گیا۔ اب اس نے راہب سے یہ اصرار کیا کہ مجھ کو اسم اعظم کے متعلق کچھ بتایئے مگر راہب یہ کہہ کر ٹالتا رہا کہ برادر زادہ مجھے یہ خوف ہے کہ تو اس کو برداشت نہ کر سکے گا کیونکہ میں تجھ کو کمزور پاتا ہوں لڑکا خاموش ہو گیا یہاں تو یہ سلسلہ جاری تھا اور ادھر عبداللہ کا باپ تامر یہ سمجھتا رہا کہ میرا لڑکا ساحر سے سحر سیکھ رہا ہے کچھ دن خاموش رہ کر لڑکے نے صبر نہ ہو سکا اور اس نے یقین کر لیا کہ راہب بخل کر رہا ہے اور بتانا نہیں چاہتا یہ سوچ کر اس نے تیروں کا مٹھا لیا اور ہر ایک تیر پر خدا کا ایک ایک نام لکھا اور پھر آگ روشن کی اور ایک ایک تیر کو اس میں ڈالنا شروع کیا تیر آہستہ آہستہ آگ کی نذر ہوتے رہے اور جلتے رہے مگر ایک تیر جب آگ میں پہنچا تو فوراً اچھل کر دور جا گرا لڑکا سمجھ گیا کہ اس تیر پر اسم ذات کندہ یہی اسم اعظم ہے اور اس کے بعد راہب کو سارا قصہ کہہ سنایا۔ راہب نے سنا تو عبداللہ کو نصیحت کی کہ اس کو حفاظت کے ساتھ اپنے پاس رکھنا۔

عبداللہ نے اس کو دین حق کی تبلیغ کا ذریعہ بنا لیا وہ جس کسی کو مریض پاتا تو اس سے یہ کہتا کہ اگر تو خدائے واحد پر ایمان لے آئے اور مومن بن جائے تو میں تیرے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کروں کہ وہ تجھ کو تندرست کر دے اور جب وہ شخص سچے دل سے ایمان لے آتا تو یہ دعا کرتا اور مریض چنگا ہو جاتا، شدہ شدہ یہ بات نجران کے بادشاہ تک پہنچی اس نے لڑکے کو بلایا اور کہا کہ تو نے میری مملکت میں فساد مچایا اور میرے اور میرے باپ دادا کے دین کی مخالفت شروع کر دی اس لیے اب تیری سزا یہ ہے کہ تجھ کو قتل کر دیا جائے۔

لڑکا کہنے لگا: "بادشاہ! میرا قتل تیری قدرت سے باہر ہے" بادشاہ نے غضب ناک ہو کر حکم دیا کہ اس کو پہاڑ کی چوٹی سے گرا دو، سرکاری آدمیوں نے اس کو پہاڑ کی چوٹی سے گرا دیا مگر قدرت الٰہی نے اس کو صحیح سالم رکھا اور وہ بادشاہ کے پاس واپس آ گیا اب بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو دریا میں لے جا کر غرق کر دو۔ لیکن وہ دریا میں پھینک دیئے جانے کے باوجود غرق نہ ہوا اور اس کو مطلق کوئی گزند نہیں پہنچا تب لڑکے نے بادشاہ سے کہا کہ اگر تو واقعی مجھ کو قتل کر دینا چاہتا ہے تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ تو خدائے واحد کا نام لے کر مجھ پر حملہ کر تو میں مارا جا سکتا ہوں، بادشاہ نے خدائے واحد کا نام لے کر لڑکے پر حملہ کیا تو لڑکا جاں بحق ہو گیا مگر ساتھ ہی عذاب الٰہی نے بادشاہ کو بھی اسی جگہ ہلاک کر دیا۔

اہل شہر نے جب لڑکے اور بادشاہ کے درمیان جنگ کا یہ نظارہ دیکھا تو وہ سب صدق دل سے خدائے واحد پر ایمان لے آئے اور مشرف بہ اسلام ہو گئے اور انہوں نے سچائی کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کے احکام کی پیروی کو اپنا دین بنا لیا۔ چنانچہ نجران میں نصرانیت کے حقیقی اور سچے دین کی بنیاد اسی واقعہ سے پڑی۔

نجران میں عیسائیت کی ترویج اور لڑکے اور راہب کے واقعہ کا تذکرہ یہودی المذہب شاہ یمن ذونواس تک بھی پہنچا اس نے سنا تو سخت اشتعال میں آ گیا اور لشکر جرار لے کر نجران پہنچا اور تمام شہر میں منادی کرادی کہ کوئی شخص عیسائیت پر قائم نہیں رہ سکتا یا تو وہ یہودیت قبول کر لے ورنہ مرنے کے لیے تیار ہو جائے اہل نجران کے قلب میں عیسائیت اس درجہ گھر کر چکی تھی کہ ...ب نے مرجانا قبول کیا مگر عیسائیت سے منہ نہ موڑا۔ ذونواس نے یہ دیکھا تو غیظ وغضب میں آ گیا اور حکم دیا کہ شہر کی گلیوں اور شاہراہوں میں خندقیں اور کھائیاں کھودی جائیں اور ان میں آگ دہکائی جائے جب لشکریوں نے تعمیل کر دی تو اس نے شہریوں کو جمع کر کے حکم دیا کہ جو شخص یہودیت قبول کرنے سے انکار کرتا جائے مرد ہو یا عورت یا بچہ اس کو زندہ آگ میں ڈال دو۔ چنانچہ اس حکم کے مطابق بیس ہزار کے قریب مظلوم انسانوں کو جام شہادت پینا پڑا۔

یہی وہ واقعہ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورہ بروج میں کیا ہے: ﴿قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۙ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۙ﴾

اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد ابن اسحاق کہتا ہے کہ ذونواس یمن کا مشہور بادشاہ ہے اس کا اصل نام زرعہ تھا مگر سریر آرائے سلطنت ہونے کے بعد یوسف ذونواس کے نام سے شہرت پائی اس کے باپ کا نام تبان اسعد تھا اور ابو کرب کنیت رکھتا تھا۔ یمن کے ان بادشاہوں کا لقب "تبع" تھا اس لیے کتب تاریخ میں یہ خاندان تبابعہ یمن کہلاتا ہے۔ ابو کریب وہ پہلا "تبع" ہے جس نے بت پرستی چھوڑ کر یہودیت کو قبول کر لیا تھا، اس نے مدینہ پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا تھا مگر بنی قریظہ کے دو یہودی علماء کی تلقین پر سچے دین موسوی کو قبول کر کے مدینہ سے واپس چلا آیا اور پھر مکہ معظمہ پہنچ کر کعبہ پر غلاف چڑھایا اور دونوں یہودی علماء کو یمن ساتھ لے آیا انہوں نے یمن میں یہودیت کی تبلیغ کی اور آہستہ آہستہ اہل یمن نے یہودیت قبول کر لی۔

الحاصل ذونواس نے ایک دن میں نجران کے بیس ہزار حق پرست انسانوں کو شہید کر دیا مگر ان میں سے ایک شخص دوس ذوالغلبان کسی طرح جان بچا کر نکل بھاگا اور شام میں مقیم قیصر روم کے دربار میں پہنچ کر نجران کے حادثہ کی ہوشربا داستان کہہ سنائی اور احتجاج کیا۔ قیصر نے فوراً حبشہ کے بادشاہ "نجاشی" کو لکھا کہ وہ یمن پر حملہ کر کے ذونواس سے اس ظلم کا انتقام لے۔ نجاشی نے اس پر چڑھائی کر دی اور تھوڑے ہی عرصہ بعد اس کو شکست دے کر تمام یمن پر قبضہ کر لیا ذونواس نے دریا کے راستہ فرار ہونے کی کوشش کی مگر غرق ہو گیا اور اس طرح تقریباً ستر سال تک یمن نصاریٰ کے زیر حکومت رہا اس کے بعد حمیری خاندان کے ایک رئیس سیف بن ذی یزن نے کوشش کی کہ اپنے خاندان کے زیرنگین ملک پر دوبارہ قبضہ کرے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اس نے کسریٰ فارس سے مدد طلب کی کسریٰ نے حکم دیا کہ مملکت میں جس قدر بھی قیدی ہیں ان کو رہا کر کے اور ان کی فوج بنا کر سیف بن ذی یزن کی مدد کی جائے اور سیف نے سات سو ایرانی اور باقی اپنی فوج کی مدد سے یمن پر حملہ کیا اور نصاریٰ کے ہاتھ سے یمن کو آزاد کرا لیا۔ [1]

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نجران کا بادشاہ بت پرست تھا پس اگر عیسائی راہب کے ذریعہ نجران میں عیسائیت پھیل گئی تو ذونواس کو جو کہ یہودی المذہب تھا اس درجہ طیش کیوں آیا؟ اس کا جواب یورپین مؤرخین یہ دیتے ہیں کہ جس زمانہ کا یہ واقعہ ہے اس وقت سیاسی اور تجارتی صورت حال ایسی بن گئی تھی کہ رومی (عیسائی) اور حبشی ایک فریق تھا اور حمیری (یہودی) اور ایرانی دوسرا فریق تھا اور دونوں میں زبردست رقابت قائم تھی اس لیے ذونواس نجران میں عیسائیت کو برداشت نہ کر سکا۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۴۹۴۔۴۹۵، البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۳۰۔۱۳۱

Marfat.com

ہم اس میں اس قدر اور اضافہ کرتے ہیں کہ تاریخ اس بات کو بھی ثابت کرتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ صلیب کے اس نظریہ کی بناء پر جو یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کے یہاں مسلمہ ہے اس درجہ آپس میں عداوت اور بغض بڑھ گیا تھا کہ دونوں فریق بت پرستوں کی ترقی کو برداشت کر سکتے تھے لیکن ایک دوسرے کی مذہبی ترقی ان کے لیے ناقابل برداشت تھی اور اس کا مظاہرہ اس درجہ نمایاں تھا کہ جب کبھی یہود کو موقعہ ملا ہے تو انہوں نے عیسائیوں پر محض مذہب کے نام پر سخت سے سخت مظالم روا رکھے ہیں اور حکومت کے دباؤ سے زبردستی ان کو یہودی بنانے کی کوشش کی ہے اور جب کبھی عیسائیوں کو موقعہ ہاتھ آیا ہے تو انہوں نے یہودیوں پر اسی طرح کے مظالم سے گریز نہیں کیا پس نجران کا واقعہ ایسے زمانہ میں پیش آیا جب کہ مسطورہ بالا سیاسی اور تجارتی رقابت کی موجودگی میں رومی تاجر سواحل یمن تک پہنچتے اور مال تجارت کے ساتھ ساتھ عیسائیت کی تبلیغ کو بھی جاری رکھتے تھے آہستہ آہستہ نتیجہ یہ نکلا کہ نجران جو ساحل یمن پر واقع تھا رومی تاجروں کا تجارتی اور تبلیغی مرکز بن گیا۔ حمیری بادشاہ یہ دیکھتے تھے اور سخت برہم ہوتے تھے مگر صاف طور سے ظلم کرنے کا بہانہ ہاتھ نہیں آتا تھا کہ حسب اتفاق راہب اور لڑکے کا یہ واقعہ پیش آ گیا اور ذونواس نے جب یہ دیکھا کہ بات ریاست و تجارت سے گزر کر مذہب تک پہنچ گئی تو یہودیت کے روایتی تعصب نے قابو سے باہر کر دیا اور پھر جو کچھ پیش آیا گزشتہ سطور میں آپ اس کا مطالعہ چکے ہیں۔

ان دو واقعات کے علاوہ مشہور محدث ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے صاحبزادہ ربیع فرماتے ہیں کہ اصحاب اخدود کے متعلق ہم نے سنا ہے کہ "فترۃ" کے زمانہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان زمانہ میں خدائے تعالیٰ کے نیک بندوں کی ایک جماعت نے جب یہ دیکھا کہ زمانہ بہت ہی خراب ہو چلا ہے اور فتنوں اور شرارتوں کا زور بڑھتا جا رہا ہے اور دین حق گروہ بندیوں کی نذر ہو کر ہر شخص کی ذاتی رائے کے تابع بن گیا ہے تو انہوں نے باہم مشورہ کر کے عام آبادیوں سے بہت دور ایک چھوٹی سی بستی آباد کر لی اور اس میں سچی عیسائیت کے مطابق عبادت و صداقت کی زندگی بسر کرنے لگے مگر ان کا یہ معاملہ پوشیدہ نہ رہ سکا۔ اور شدہ شدہ اس زمانہ کے بت پرست بادشاہ تک پہنچ گیا اس نے آ کر بستی کا محاصرہ کر لیا اور ان کو توحید الٰہی کے خلاف بت پرستی پر مجبور کرنے لگا لیکن ان حق پرستوں پر اس کی سختیوں کا مطلق اثر نہ ہوا اور انہوں نے شرک و بت پرستی سے صاف انکار کر دیا۔ تب بادشاہ نے غضبناک ہو کر خندقیں کھدوانے اور ان میں آگ دہکانے کا حکم دیا اور پھر جو شخص بت پرستی سے انکار کرتا جاتا تھا اس کو آگ میں جھونک دیا جاتا تھا۔ حق پرست گروہ کے بزرگ پروانہ وار آگ میں کود جاتے تھے اور اپنے بچوں اور نوجوانوں کو تسلی دیتے جاتے تھے کہ آج کا دن خوف کھانے کا دن نہیں ہے یہ آگ ہمارے لیے جہنم کی آگ سے محفوظ رہنے کا پیش خیمہ ہے۔ چنانچہ تمام حق پرستوں نے حق پر نثار ہو جانا قبول کیا مگر شرک و بت پرستی پر آمادگی ظاہر نہ کی، اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بھی ان پر اپنا یہ فضل فرمایا کہ جب وہ آگ میں ڈالے جاتے تو آگ تک پہنچنے اور اس کی تکلیف سہنے سے قبل ہی ان کی روح قبض کر لی جاتی تھی، مگر خندق اور کھائیوں کی آگ اس درجہ بھڑک رہی تھی کہ ان نیکوکار انسانوں کو کھا لینے کے بعد بھی نہ بجھی اور بے قابو ہو کر کچھ اس طرح پھیلتی گئی کہ بت پرست ظالم بادشاہ اور اس کے تمام لشکری سب کے سب اس کے اندر گر گئے اور جل کر وہیں خاک سیاہ ہو گئے۔ قرآن عزیز کی یہ آیات ﴿قُتِلَ أَصْحَٰبُ ٱلْأُخْدُودِ ۝ ٱلنَّارِ ذَاتِ ٱلْوَقُودِ ۝﴾ اسی واقعہ کا تذکرہ کر رہی ہیں۔ ❶

❶ تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۴۹۳

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ یہ واقعہ فارس میں پیش آیا، جب فارس کے بادشاہ نے دین حق چھوڑ کر باطل پرستی اختیار کرلی اور اپنے محارم (ماں، بہن، بیٹی وغیرہ) سے نکاح کرنا جائز قرار دے لیا تو ان کے بعض علماء نے جو ابھی تک دین حق پر قائم تھے بادشاہ کو اس بات سے منع کیا بادشاہ نے حق کے سامنے سرتسلیم خم کرنے کی بجائے غضب ناک ہو کر یہ حکم کیا کہ کھائیاں کھدوائی جائیں اور جو شخص نکاح محارم کو باطل کہے اس کو کھائی میں جھونک کر زندہ جلا دیا جائے۔ چنانچہ اہل حق کی جماعت نذر آتش کر دی گئی اور پارسیوں میں آج تک نکاح محارم کو جائز سمجھا جا رہا ہے۔ [1]

انتقاد:

ان روایات کے مفہوم اور مقصد پر اگر نظر کی جائے اور تفصیلات و جزئیات کو نظر انداز کر دیا جائے تو سب کا حاصل ایک ہی نکلتا ہے اور وہ یہ کہ گزشتہ زمانہ میں مشرک یا یہودی بادشاہ نے ایک حق پرست اور توحید الٰہی سے سرشار جماعت کو بت پرستی یا باطل پرستی پر مجبور کیا اور جب انہوں نے اس کے مطالبہ کو ٹھکرا دیا اور ایمان باللہ اور حق پرستی کو ترک کر دینے سے انکار کر دیا تو ظالم و جابر بادشاہ نے ان کو آگ میں جھونک کر زندہ جلا دیا مگر نتیجہ کے اعتبار سے حق پرست جماعت کے حصہ میں ابدی کامرانی اور سرمدی فوز و فلاح آئی اور ظالم و باطل کوش جماعت دنیا میں بھی خائب و خاسر ہوئی اور آخرت میں ابدی جہنم پائی۔

نیز اگر اس حقیقت پر غور کیا جائے کہ نزول آیات و سور میں اصل شے مفہوم و مراد ہے اور شان نزول کو ثانوی اور تاریخی حیثیت حاصل ہے جیسا کہ حکیم الامت شاہ ولی اللہ (نور اللہ مرقدہٗ) نے الفوز الکبیر میں تصریح فرمائی ہے تو پھر بآسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ باختلاف زمانہ اس چرخ نیلی فام کے نیچے ایسے واقعات متعدد پیش آچکے ہیں جن کا ذکر مسطورہ بالا روایات میں کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ بھی ایک مستقل واقعہ ہے جس کو مسلم نے صحیح میں اور امام احمد نے مسند میں نقل کیا ہے اور وہ بھی جس کو محمد بن اسحاق نے سیرۃ میں بیان کیا اور وہ بھی جس کو ابن کثیر نے بروایت حضرت علی رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے بلکہ ابن کثیر نے بحیثیت ایک مؤرخ کے یہ ثابت کیا ہے کہ بلاشبہ اس نوعیت کے واقعات متعدد پیش آچکے ہیں وہ تحریر فرماتے ہیں:

وقد یحتمل ان ذٰلک قد وقع فی العالم کثیرًا کما قال ابن ابی حاتم کانت الاخدود فی الیمن زمان تبع و فی القسطنطنیۃ زمان قسطنطین و فی العراق فی ارض بابل بخت نصر الذی صنع الصنم و امر الناس ان یسجدوا لہ۔ [2]

"اور یہ ممکن ہے کہ ایسے واقعات عالم میں بہت ہو گزرے ہوں مثلاً ابن ابی حاتم کا بیان ہے کہ اخدود کا معاملہ ایک تو یمن میں تبع کے زمانہ میں پیش آیا اور دوسرا قسطنطین کے زمانہ میں قسطنطنیہ میں اور تیسرا عراق (بابل) میں بخت نصر کے زمانہ میں پیش آیا جس نے ایک بت بنا رکھا تھا اور وہ لوگوں کو مجبور کرتا تھا کہ اس کو سجدہ کریں اور جو سجدہ نہ کرتا اس کو آگ میں جھونک دیا جاتا تھا۔"

وعن مقاتل قال کانت الاخدود ثلاثۃ واحدۃ بنجران بالیمن والاخرٰی بالشام والاخرٰی بفارس احرقوا

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۴۹۳ [2] تفسیر ابن کثیر ج ۴ سورۂ بروج

بالنار اما التی بالشام فھو انطنانوس الرومی و اما الذی بفارس فھو بخت نصر و اما التی بارض العرب (نجران) فھو یوسف ذونواس فاما التی بفارس والشام فلم ینزل اللہ تعالیٰ فیھم قرانًا و انزل فی التی کانت بنجران. ❶

"اور مقاتل فرماتے ہیں کہ "اخدود" تین واقعے ہیں ایک یمن (عرب) کے شہر نجران میں پیش آیا۔ دوسرا شام میں اور تیسرا فارس میں ان واقعات میں مظلوموں کو دہکتی آگ میں ڈالا گیا تھا اور شام کا واقعہ انطنانوس رومی کے ہاتھوں پیش آیا اور فارس کا بخت نصر (بنوکدنذر) کے ہاتھوں اور نجران کا واقعہ یوسف ذونواس کے ہاتھوں پیش آیا لیکن فارس اور شام کے واقعات کا ذکر قرآن میں نہیں ہے البتہ نجران میں جو واقعہ پیش آیا اس کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے۔" ❷

بہر حال اگرچہ مسطورہ بالا روایات بلکہ ان کے علاوہ اسی قسم کے اور واقعات اپنے مفہوم و مراد اور مقصد کے لحاظ سے سب ہی سورۂ بروج کی آیات زیر بحث کا مصداق بن سکتے ہیں لیکن تاریخی اعتبار سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ قرآن عزیز نے خصوصیت کے ساتھ کس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے تو مشہور تابعی مقاتل کی عبارت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قرآن میں جس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ نجران اور ذونواس سے تعلق رکھتا ہے اور یہی قول صحیح ہے اور یہ اس لیے کہ مسلم اور مسند کی روایت کے تو کسی ایک جملہ سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ نبی اکرم ﷺ نے اس واقعہ کو سورۂ بروج کی آیات کی تفسیر کے سلسلہ میں بیان فرمایا ہے، یہی وجہ ہے کہ امام مسلم نے اس روایت کو کتاب التفسیر میں نقل نہیں فرمایا، البتہ ترمذی نے ایک "حسن غریب روایت" میں ضرور اس واقعہ کو دوسرے واقعہ سے مربوط اس طرح بیان کیا ہے کہ گویا یہ سورۂ بروج کی زیر بحث آیات کی تفسیر ہے لیکن ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ترمذی کی حدیث سے تو یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ نبی اکرم ﷺ نے اس واقعہ کو بیان فرمایا ہے بلکہ یہ قوی احتمال ہے کہ یہ واقعہ راوی حدیث حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ کا اپنی جانب سے بیان کردہ ہو کیونکہ وہ اہل کتاب کے قصص و واقعات کے بہت بڑے عالم تھے ترمذی کی حدیث کا ترجمہ یہ ہے۔

ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ عصر کی نماز سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے لب مبارک کو اس طرح حرکت دی گویا کچھ بات فرمانا چاہتے ہیں مگر بیان نہ فرمائی تب کسی نے عرض کیا کہ آپ ﷺ کچھ ارشاد فرمانا چاہتے تھے مگر فرمایا نہیں، لبوں کو حرکت دے کر رہ گئے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ انبیاء سابقین میں سے ایک نبی اپنی امت کا حال دیکھ کر از راہِ فخر کہنے لگے کہ ایسی امت کس

---

❶ تفسیر ابن کثیر ج ۴ سورۂ بروج

❷ شام و فارس کے واقعات میں شام کے واقعہ سے تو غالباً قسطنطین کا واقعہ مراد ہے وہ یہ کہ جب قسطنطین بانی قسطنطنیہ نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین حق کی بجائے مروجہ مسیحیت کو اپنا دین بنایا اور توحید کی جگہ تثلیث کو عقیدہ کی بنیاد قرار دیا اور صخرہ بیت المقدس سے منحرف کر کے مشرق کو قبلہ بنایا اور تمام قلمرو میں منادی کر دی کہ یا آباء و اجداد کا دین چھوڑ کر دین مسیحی اختیار کرو اور جو انکار کرے اس کو دہکتی آگ میں جھونک دو۔ اوائل چھٹی صدی عیسوی میں ہزاروں انسان دہکتی آگ میں جھونک دیئے گئے اور فارس کے واقعہ سے متعلق ابن کثیر رحمہ اللہ نے ایک اسرائیلی روایت جو کہ دانیال نبی کے صحیفے میں بھی مذکور ہے یہ بیان کی ہے کہ عراق (بابل) میں بخت نصر نے سونے کا ایک بت بنوایا تھا اور تمام رعایا سے اس کو سجدہ کراتا تھا سب نے سجدہ کیا لیکن دانیال علیہ السلام اور ان کے رفقاء نے سجدہ سے انکار کر دیا تب بخت نصر نے خندق میں آگ دہکا کر اس میں ان سب کو دھکیل دیا مگر وہ ان پر برد و سلام ہو گئی اور کوئی آنچ نہ آئی اور جن نو آدمیوں نے آگ کی بھٹی میں ان کو ڈالا تھا وہ جل کر خاک ہو گئے۔

Marfat.com

نبی کی ہوگی؟ کون اس کے مقابلہ میں اپنی امت پیش کر سکے گا اللہ تعالیٰ کو ان کا یہ انداز پسند نہ آیا اور ان پر وحی نازل ہوئی کہ دو باتوں میں سے ایک بات قبول کر دیا امت پر مصیبت کا نزول ہو یا ان پر دشمن کا تسلط ہو، خدا کے نبی نے دشمن کے تسلط پر مصیبت کے نزول کو ترجیح دی۔ چنانچہ ستر ہزار کے قریب موت کی آغوش میں سلا دیئے گئے (اس کے بعد روایت کے الفاظ یہ ہیں):

وكان اذا حدث بهذا الحديث حدث بهذا الحديث الاخر.

اور جب وہ اس واقعہ کو بیان کیا کرتے تھے تو اس کے ساتھ ایک اور واقعہ سنایا کرتے تھے (یہ دوسرا واقعہ وہی ہے جو مسلم میں مذکور ہے) اس روایت کو نقل کرنے کے بعد ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وهذا السياق ليس فيه صراحة ان سياق هذه القصة من كلام النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال شيخنا الحافظ ابوالحجاج المزی فيحتمل ان يكون من كلام صهيب الرومی فانه كان عنده من اخبار النصارى. ❶

"اور روایت کا یہ طریق بیان ہرگز اس کی صراحت نہیں کرتا کہ اس دوسرے واقعہ کا تذکرہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے کیا گیا ہمارے استاد ابوالحجاج مزی فرماتے ہیں اس بیان میں یہ احتمال ہے کہ یہ واقعہ صہیب رومی رضی اللہ عنہ کی جانب سے ہو اس لیے کہ وہ نصاریٰ کے قصص و واقعات کے عالم تھے۔"

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے "اصحاب اخدود" کے متعلق کتب تفسیر و سیر میں تین روایات مذکور ہیں ایک روایت اوپر بیان ہو چکی دوسری روایت میں ہے کہ یہ واقعہ یمن میں پیش آیا ہے اور تیسری روایت میں ہے کہ یہ حبشہ کا واقعہ ہے مگر ان تینوں روایات میں سے کسی ایک روایت کے متعلق بھی ان سے یہ بصراحت مذکور نہیں کہ وہ ان میں سے کسی واقعہ کو تاریخی حیثیت سے ان آیات کی تفسیر سمجھتے ہیں۔

پس جب کہ مسلم کی روایت اس مسئلہ میں خاموش ہے اور ترمذی کی روایت سے بھی اس کے متعلق کوئی بات صاف ثابت نہیں ہوتی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایات بطور توسع اور مفہوم و مقصد کے پیش نظر تو آیات کا مصداق بنتی ہیں لیکن تاریخی حیثیت سے شان نزول پر دلالت نہیں کرتیں تو اس صورت حالات میں مقاتل کی صراحت اپنے اندر قوت رجحان رکھتی ہے۔ چنانچہ اہل تحقیق کا رجحان اسی جانب ہے کہ قرآن میں مذکور واقعہ ذونواس سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وما ذكره ابن اسحاق يقتضی ان قصتهم كانت فی زمان الفترة التی بين عيسیٰ و محمد عليهما من الله السلام وهو اشبه. ❷

"اور ابن اسحاق نے جو واقعہ نقل کیا ہے اس کا اقتضا یہ ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان زمانہ (فترۃ) کا ہے اور یہی قرین قیاس ہے۔"

وقد تقدم فی قصة اصحاب الاخدود ان ذونواس وكان اخر ملوك حمير وكان مشركا وهو الذی قتل اصحاب الاخدود وكانوا نصارى وكانوا قريبا من عشرين الفا. ❸

---

❶ تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۴۹۴ ❷ تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۴۹۵ ❸ ایضا سورۃ الفیل

Marfat.com

اور اصحاب اخدود کے واقعہ میں گزر چکا ہے کہ ذونواس ہی وہ بادشاہ تھا جس نے تقریباً بیس ہزار سچے عیسائیوں کو خندقوں میں ڈال کر مار ڈالا تھا یہ بادشاہ مشرک تھا اور شاہان حمیر میں سے آخری بادشاہ تھا۔"

اور شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہٗ) کا رجحان بھی اسی جانب ہے لیکن یہ دونوں بزرگ ذونواس کو مشرک کہتے ہیں مگر تاریخی سند سے ثابت ہو چکا ہے کہ ذونواس اپنے باپ کے دین یہودیت ہی پر قائم تھا۔

علاوہ ازیں قیاس بھی یہ چاہتا ہے کہ قرآن میں مذکور واقعہ نجران اور ذونواس سے ہی تعلق رکھتا ہے اس لیے کہ اس سلسلہ میں بیان کردہ واقعات میں سے یہ واقعہ زمانہ کے لحاظ سے بھی زیادہ قریب ہے اور ملکی اعتبار سے بھی خود عرب کے اندر کا واقعہ ہے اس لیے نزول قرآن کے وقت اہل عرب اس واقعہ سے ضرور آگاہ ہوں گے۔ لہٰذا حق و باطل کے مختلف معرکوں میں سے موعظت و عبرت کے لیے قرآن نے اس واقعہ کو بیان کر دیا اور اس کے علاوہ دوسرے واقعات یا تو بہت ہی قدیم زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں اور یا عرب کے باہر دوسرے ملکوں سے علاقہ رکھتے ہیں اس لیے وہ اس کے مقابلہ میں قابل ترجیح نہیں ہو سکتے۔ [1]

تبع:

"سیل عرم" کی بحث میں اگرچہ سبا کے ضمن میں "تبع اور تبابعہ" کا تفصیلی ذکر آ چکا ہے تاہم مختصر طور پر یہاں بھی یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ یمن کے حمیری بادشاہوں میں سے ان کا لقب رہا ہے جنھوں نے تقریباً ڈھائی سو سال تک یمن کے مغربی حصہ کو دارالسلطنت قرار دے کر عرب شام، عراق اور افریقہ کے بعض حصوں پر بڑی شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی، جدید تحقیق کے اصول پر حمیر حمرۃ (سرخی) سے ماخوذ ہے اور اس کے مقابلہ میں سودانی۔ سواد (سیاہی) سے بنایا گیا ہے، چونکہ اہل عرب یعنی حمیری، حبشیہ کو سیاہ فام ہونے کی وجہ سے "سودانی" کہتے تھے اس لیے جواب میں حبشی ان کو احمر (سرخ) کہتے تھے۔ یہی لفظ آگے چل کر "حمیر" بن گیا اور لفظ "تبع" اصلاً حبشی لفظ ہے یا سامی الاصل ہے؟ اس کے متعلق عرب مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ یہ عربی (سامی) لفظ ہے اور تبع سے بمعنی متبوع (سردار) بنا لیا گیا ہے اور جدید اہل تحقیق یہ کہتے ہیں کہ یہ لفظ حبشی الاصل ہے اور بمعنی قاہر و غالب آتا ہے

---

[1] محقق عصر حضرت استاذ علامہ انور شاہ (نور اللہ مرقدہ) ارشاد فرماتے تھے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک آیت کا شان نزول تاریخی حیثیت سے متعین ہوتا ہے پھر بھی آیت کے مفہوم و مراد کے لحاظ سے اس میں اتنی وسعت ہوتی ہے کہ اس قسم کی دوسری جزئیات کو خود صاحب شریعت ﷺ آیت کا شان نزول فرما دیا کرتے ہیں۔ چنانچہ اس کی بہترین مثال سورۂ توبہ کی یہ آیت ﴿لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ﴾ (توبہ:۱۰۸) باتفاق جمہور "مسجد قبا" کے بارے میں نازل ہوئی لیکن ایک مرتبہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ذات اقدس ﷺ سے اس آیت کے شان نزول کے متعلق دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا "مسجدی ہذا" اس آیت کا مصداق میری یہ مسجد (مسجد نبوی) ہے چنانچہ تمام محدثین کے نزدیک آپ ﷺ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں جن اوصاف کا تذکرہ کیا گیا ہے چونکہ اس کا مصداق مسجد قبا سے بھی زیادہ مسجد نبوی بنتی ہے اس لیے یہ زیادہ مستحق ہے کہ اس کو شان نزول بنایا جائے۔

لیکن آپ ﷺ کے ارشاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تاریخی حیثیت سے آیت کا شان نزول مسجد قبا سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ مسجد نبوی سے رکھتا ہے پس اگر مسئلہ زیر بحث میں یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ترمذی کی روایات میں مذکورہ واقعہ کو نبی اکرم ﷺ ہی نے سورۂ بروج کی آیات کا شان نزول فرمایا ہے تو نقل و عقل سے پیدا شدہ قرائن و دلائل اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کا یہ ارشاد مبارک مصداق کے توسع کے پیش نظر ہے نہ کہ اس حیثیت سے کہ تاریخی بنا پر ترمذی میں مذکور واقعہ ہی آیات کا شان نزول ہے۔

Marfat.com

یعنی عربی میں "سلطان اور حبشی زبان میں تبع مترادف ہے۔"

قرآن عزیز نے بھی تبع کا ذکر دو مقامات سورۂ قٓ اور سورۂ دخان میں کیا ہے، سورۂ دخان میں مختصر طور پر ان کی مادی قوت و طاقت کا ذکر کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ جب خدا کی نافرمانی کر کے وہ ہلاکت سے نہ بچے تو قریش جو ان کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں وہ سرکشی کر کے کیسے بچ سکتے ہیں اور سورۂ قٓ میں صرف مجرم قوموں کی فہرست میں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔

﴿اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ۙ وَّالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ اَهْلَكْنٰهُمْ ۡ اِنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ۝﴾ (الدخان: ۳۷)

"یہ (قریش) بہتر (قوی و طاقتور) ہیں یا تبع کی قوم اور جو ان سے پہلے گزر گئیں ہم نے ان کو اس لیے ہلاک کر دیا کہ وہ مجرم تھیں۔"

﴿كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ اَصْحٰبُ الرَّسِّ وَ ثَمُوْدُ ۝ وَ عَادٌ وَّ فِرْعَوْنُ وَ اِخْوَانُ لُوْطٍ ۝ وَّ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَ قَوْمُ تُبَّعٍ ۭ﴾ (ق: ۱۲۔۱۴)

"ان (مشرکین مکہ) سے پہلے نوح (علیہ السلام) کی قوم نے اصحاب الرس نے ثمود، عاد، فرعون، اخوان لوط اور اصحاب الایکہ اور قوم تبع نے (خدا کے پیغمبروں کو) جھٹلایا ہے۔"

عرب کی دو حکایتیں:

ابن کثیر رحمہ اللہ نے مشہور محدث ابوبکر بن ابی الدنیا رحمہ اللہ کے واسطہ سے بروایت محمد بن جعفر بن ابی طالب یہ حکایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بعض اہل علم سے سنا ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے جب اصفہان فتح کر لیا اور شہر میں فاتحانہ داخل ہو گئے تو شہر پناہ کا ملاحظہ کیا دیکھا تو ایک جانب میں دیوار شکستہ ہے انہوں نے حکم دیا کہ دیوار کا یہ حصہ درست کر دیا جائے لیکن جب دیوار کو درست کر دیا گیا تو وہ ٹھہر نہ سکی اور یک لخت پھر گر گئی۔ چنانچہ دوبارہ مرمت کی گئی مگر وہ پھر منہدم ہو گئی تب بعض لوگوں کا یہ خیال ہوا کہ اس مقام پر کسی مرد صالح کی قبر معلوم ہوتی ہے یہ سوچ کر جب بنیاد کو کھدوایا گیا تو دیکھا کہ ایک شخص کھڑا مدفون ہے اور اس کے ہاتھ میں تلوار ہے اور تلوار پر عبارت کندہ ہے جس کا حاصل یہ ہے "میں حارث بن مضاض ہوں جس نے اصحاب اخدود سے انتقام لیا" حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے اس کو وہاں سے نکال کر قبرستان میں دفن کرا دیا اور دیوار کی تعمیر کرا دی جو صحیح سالم رہی۔"[1]

حارث بن مضاض عرب کے خاندان جرہم کا ایک بادشاہ تھا جس نے نابت بن اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے مکہ کی حکومت لے کر حکمرانی کی تھی اور یہ تقریباً حضرت اسماعیل علیہ السلام سے پانچ سو سال بعد کا زمانہ ہے، اس اعتبار سے اصحاب اخدود کا واقعہ بہت قدیم زمانہ سے متعلق ہو جاتا ہے مگر یہ روایت سیر کی روایات میں سے ہے اور اس کی سند منقطع ہے اس لیے اس کی حیثیت حکایت اور کہانی سے زیادہ نہیں ہے، علاوہ ازیں اگر یہ واقعہ صحیح تسلیم کر لیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ یہ ان مختلف واقعات میں سے ایک واقعہ ہو جن کا ذکر قرآن میں نہیں ہے مگر وہ آیات بروج کے مصداق میں داخل ہیں۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۴

Marfat.com

اسی طرز کی ایک حکایت مشہور محدث محمد بن ابوبکر بن حزم نے بغیر سند کے بیان کی ہے، کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں نجران کا ایک شخص زمین کھود رہا تھا دیکھا تو اس جگہ ایک قبر ہے اندر جھانک کر دیکھا تو ایک نعش کو اس طرح بیٹھے ہوئے پایا کہ وہ اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے ہے جب لوگوں نے اس کے ہاتھ کو سر سے ہٹایا تو اس سے خون بہنے لگا اور جب ہاتھ کو اسی طرح رکھ دیا تو خون بند ہو گیا۔ اس شخص کے ہاتھ میں ایک انگشتری تھی اور اس کے نگینہ پر یہ عبارت کندہ تھی "رَبِّیَ اللّٰہُ" اس واقعہ کی خبر فوراً حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو دی گئی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ اس شخص کو اس کی حالت پر رہنے دیا جائے اور اسی جگہ دفن کر دیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اس زمانہ میں لوگوں میں یہ مشہور تھا کہ یہ نعش عبداللہ بن تامر کی ہے۔

نجران میں چونکہ راہب اور عبداللہ بن تامر کا واقعہ پیش آ چکا تھا اس لیے کوئی محل تعجب نہیں کہ اس قسم کی حکایات وہاں مشہور رہی ہوں اور عیسائیوں نے اپنی برتری کے لیے ان کو خوب آب و رنگ دیا ہو۔

چند تفسیری نکات:

① ﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۝ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۝ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ۝﴾ (البروج: ۱-۳)

قرآن عزیز کی ان آیات میں "واؤ" بمعنی قسم ہے اور ان آیات کے علاوہ قرآن کی متعدد سورتوں میں مختلف اشیاء کی قسم کا تذکرہ موجود ہے عام طور پر ان مقامات کی تفسیر میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ جس طرح ہم آپس میں قسمیں کھاتے ہیں یا ایسی چیز کی قسم کھاتے ہیں جو ہمارے لیے بہت زیادہ عزت و عظمت کے لائق ہے مثلاً باپ، استاد، پیر، پیغمبر اور خدا کی قسم اور یا ایسی شے کی قسم کھائی جاتی ہے جو ہماری نگاہ میں بہت زیادہ محبوب ہو۔ مثلاً اولاد کی یا محبوب کی قسم اسی طرح خدائے تعالیٰ نے بھی قرآن میں قسمیں کھائی ہیں اور یہ سمجھ کر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کو قسم کھانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کیونکہ قسم تو صرف اس لیے کھائی جاتی ہے کہ مخاطب کو اگر ہماری بات پر کوئی شبہ ہو تو ہم جس چیز کی عزت کرتے یا اسے بہت زیادہ محبوب سمجھتے ہیں اس کی عزت و محبت کو واسطہ بنا کر اپنی صداقت کا یقین دلائیں پس جب کہ خدائے برتر کی ذات سے نہ کوئی برتر ہے اور نہ وہ اپنی صداقت کی تائید کے لیے کسی محبوب سے محبوب تر شے کا محتاج تو پھر ان اقسام القرآن کا کیا مطلب ہے؟۔

نیز جو شخص خدائے تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے وہ تو خود اس کا قائل ہے کہ اس ذات واحد سے زیادہ کوئی سچا نہیں ہے ﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا﴾ اور العیاذ باللہ جو شخص خدا کو نہیں مانتا اس کے لیے یہ سب قسمیں بیکار ہیں۔ لہٰذا قرآن عزیز میں مذکور اقسام کے کیا معنی؟

حقیقت یہ ہے کہ قرآن عزیز کے ان مقامات میں "واؤ" قسم یا لفظ قسم سے متعارف قسم سمجھنا اور جن اشیاء کو واؤ قسم یا لفظ قسم کے بعد بیان کیا گیا ہے ان سے یہ مراد لینا کہ "جس طرح عام طور پر ہم باپ یا بیٹے کی یا اپنے سے معظم و محترم یا پیاری شے کی قسم کھاتے ہیں اسی طرح خدا نے بھی قسمیں کھائی ہیں" قطعاً غلط اور عربی زبان کے محاورات سے ناواقفیت کی دلیل ہے اور یہ اس لیے کہ عرب محاورات میں ان مواقع پر بھی واؤ قسم کو استعمال کیا جاتا ہے جہاں کسی شے کو بطور تاکید کلام کے یا بطور شہادت و استشہاد کے پیش کیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی کلام میں ایسی بات کہی گئی ہے جس کے متعلق یہ خطرہ ہے کہ وہ بات جس کے لیے گفتگو شروع کی گئی ہے دل نشین

Marfat.com

ہو جائے اس صورت میں "الواو للقسم بمعنی الواو للتاکید" ہو جاتی ہے اسی طرح اگر متکلم کی جانب سے کوئی ایسی بات کہی گئی ہے جس کا سمجھنا مخاطب کے لیے اس وقت تک مشکل ہے جب تک اس بات سے متعلق ایسے شواہد نہ پیش کیے جائیں جو اس بات کو دلنشین بنا سکیں تو ایسے موقعہ پر واو قسم کے ساتھ ایسے امور کو بیان کیا جاتا ہے جو اس مضمون کو تہ قلب میں اتارنے کے لیے مدد دے سکیں جس کے لیے متکلم مخاطب سے کلام کر رہا ہے اور ایسے موقعہ استعمال میں "الواو للقسم" کے معنی "الواو للشهادة" کے ہو جاتے ہیں چنانچہ جن مقامات پر واو قسم کو "تاکید" یا "شہادت" کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور ان مقامات میں جن چیزوں کو واو یا لفظ قسم کے بعد بیان کیا گیا ہے ان کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ متکلم کے لیے بزرگ ومحترم یا محبوب ہی ہوں بلکہ دنیا و مافیہا کی ہو شے بھی متکلم کے مقصد "تاکید مضمون" یا "شہادت و استشہاد" کے لیے مفید اور موقعہ کے مناسب حال ہو اس کا بیان کیا جانا ضروری ہے۔

پس قرآن عزیز میں جن جن مقامات پر "واو قسم یا "لفظ قسم" سے کلام کی ابتداء کی گئی ہے ان تمام مقامات میں قسم سے متعارف معنی (حلف) مراد لینا قطعاً غلط اور باطل ہیں بلکہ عربی محاورۂ زبان کے مطابق ان میں سے اکثر مقامات میں واو بمعنی شہادت ہے اور بعض مقامات میں بمعنی تاکید ہے۔

مثلاً سورۂ والتین میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات ہست و بود میں انسان کو سب سے بہتر مخلوق بنایا ہے مگر ان انسانوں کے علاوہ جو ایمان باللہ اور عمل صالح کے ذریعہ اپنی انسانیت کے امتیاز کو باقی رکھتے ہیں جن انسانوں نے عقل وشعور کے موصی امتیازات کے باوجود اپنے خالق اور پروردگار سے سرکشی کی وہ ذلت ورسوائی کے اسفل سافلین میں پھینک دیئے گئے۔

لیکن یہ دونوں باتیں سطحی نظر میں دل لگتی نہیں تھیں اس لیے کہ کائنات عالم میں انسان سے زیادہ قوی و طاقت ور اور وسیع و بعض مخلوق موجود ہیں جیسے شمس وقمر، کواکب وسیارات اور ارض وسماوات نیز انسان عالم کی ہر شے کا کسی نہ کسی درجہ میں محتاج ہے اور ان کی کوئی شے اس کی محتاج نظر نہیں آتی لہٰذا یہ کس طرح باور کیا جائے کہ ایک ضعیف البنیان اور ہر شے کی محتاج مخلوق اپنی خلقت کے اعتبار سے کل کائنات سے بہتر ہو اور اگر یہ مان بھی لیا جائے تو پھر احسن تقویم کے اعزاز سے معزز ہونے کے بعد اسفل سافلین میں گرا دیئے جانے کے کیا معنی؟ اس ادق مضمون کو سمجھانے اور فہم وادراک کے قریب لانے کے لیے قرآن نے اول تین واقعات کو شہادت کے پیش کیا اور پھر اصل مضمون کو واضح کیا اس نے کہا:

﴿وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝﴾ (التین: ۱ تا ۳)

شے کے "احسن تقویم" پر ہونے کا معیار اس کی جسمانی طاقت یا عرض وطول کی فراوانی اور احتیاج سے استغنا نہیں ہے بلکہ عقل و ادراکات وجذبات کا وجود اس کے لیے صحیح معیار ہیں تاکہ وہ ان کے ذریعہ اپنے اندر ودیعت شدہ متضاد قوتوں کا توازن صحیح رکھ تمام کائنات سے ممتاز ومعزز نظر آئے اور یہ وصف صرف انسان ہی کے اندر تخلیق کیا گیا ہے اور دوسری اشیاء عالم اس سے یکسر محروم اور ان ہی اوصاف کی بدولت وہ بدی اور گمراہی سے محفوظ رہتا اور نیکی اور ہدایت کی راہ پر گامزن ہو کر اپنے خالق کی معرفت کرتا اور ابدی وسرمدی نجات وفلاح پاتا ہے بلکہ عالم کی راہ نمائی اور کائنات الٰہی میں خدا کے پیغامات حق کی پیغمبری کا عظیم اعزاز بھی اسی کے لیے مخصوص ہے۔

Marfat.com

تم اگر تاریخ ماضی کے اوراق کا مطالعہ کرو گے تو تم پر بآسانی اس کی صداقت ظاہر ہو جائے گی مثلاً شام (بیت المقدس) کا وہ مقام جہاں بکثرت انجیر و زیتون کے درخت اور باغات پائے جاتے ہیں اس بات کے لیے شہادت دے رہا ہے کہ اس جگہ خدا کا وہ سچا ہادی پیدا ہوا جس کا نام عیسیٰ بن مریم ہے اور جس نے پاک بازی کے ساتھ دنیا کو ہدایت اور راستی کا سبق سکھایا اور اس سے قدیم تاریخ کا مطالعہ کرو تو طور سینا اس کا گواہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس پر خدا کے کلام کو کتنی بار سنا اور خدا کی پیغمبری کا شرف حاصل کر کے بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلائی اور مساوات انسانی کا سبق سنایا اور دور کیوں جاتے ہو اس بلد امین (مکہ) سے پوچھو وہ شہادت دے گا کہ اس کی آغوش میں محمد ﷺ جیسی مقدس ہستی اور خدا کے بزرگ ترین پیغمبر نے جنم لیا اور عرب کے بے برگ و گیاہ ریگستان میں کھڑے ہو کر ساری کائنات کو حق و صداقت اور اخوت و مساوات کا سبق سنایا اور توحید الٰہی کی جانب صحیح راہ نمائی کی۔ کیا یہ تینوں مقدس ہستیاں انسان کے سوا کچھ اور تھیں اور عالم کی راہ نمائی کا جو کام انہوں نے انجام دیا کیا وہ شمس و قمر، آسمان و زمین بلکہ جن و ملک انجام دے سکتے تھے؟ نہیں ہرگز نہیں پس اگر تاریخ ماضی کی یہ سب شہادتیں صحیح اور حق ہیں تو اب اس اقرار میں پس و پیش کیوں ہو کہ بلاشبہ انسان کو خدا نے بہترین قوام سے مخلوق کیا ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝﴾ اور جب ایسا ہے تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ جو انسان ان مقدس ہستیوں کے طریق کار پر کاربند نہیں ہے اور ان کی راہ ہدایت سے منحرف ہو کر بدی اور گمراہی کو اپنی زندگی بنائے ہوئے ہے وہ یقیناً انسانیت کے معیار سے گر گیا اور وہ اسی قابل ہے کہ انجام کار انتہائی قعر مذلت "اسفل سافلین" میں پھینک دیا جائے ﴿ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۝﴾ (سورۃ التین: ۳ تا ۵)

ہاں جس نے ایمان باللہ اور عمل صالح کو اختیار کر کے یعنی "اسلام" کو راہ عمل بنا کر اپنی انسانیت کے شرف و امتیاز کو محفوظ رکھا اس کے لیے خدا کے پاس بے منت اجر و ثواب اور نتائج و ثمرات کی کامرانی ہے:

﴿اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۝﴾ (التین: ٦)

یہ ہے مطلب قرآن کی قسموں کا جو اس ایک مثال سے ظاہر ہے۔ لہٰذا باقی اقسام القرآن بھی اسی طرح اپنی اپنی سورت میں بیان کردہ مضمون کو دل نشیں بنانے کے لیے مناسب حال شواہد و نظائر کا کام دیتی اور بعض مقامات پر تاکید مضمون کا حق ادا کرتی ہیں۔

اس تفصیل کے بعد سورۂ بروج کی اقسام کی تفسیر بہت سہولت کے ساتھ ذہن و فکر میں آ سکتی ہے، اس سورہ میں چند چیزوں کو واو قسم کے ساتھ بیان کیا گیا ہے: ① ﴿وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۝﴾ برجوں والا آسمان، ② ﴿وَ الْیَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۝﴾ قیامت کا دن، ③ ﴿شَاهِدٍ﴾ جمعہ کا دن یا ہر وہ شخص جو حاضر و موجود ہو، ④ ﴿مَشْهُوْدٍ﴾ عرفہ کا دن یا ہر وہ شخص جو اس واقعہ سے متعلق ہے اور ان کے بعد یہ کہا گیا: ﴿قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝ اِذْ هُمْ عَلَیْهَا قُعُوْدٌ ۝﴾ ..... الآیۃ یعنی جن باطل پرستوں نے خندقیں کھدوا کر اور ان میں آگ دہکا کر مومنوں کو خدا پرستی کی بنا پر ایسی حالت میں آگ کے اندر دھکیل کر زندہ جلا دیا کہ خود کنارہ پر بیٹھے اپنی اس انسانیت سوز حرکت کا تماشہ دیکھ رہے تھے وہ اپنی اس کمینہ حرکت پر زیادہ دن نازاں نہ رہ سکے اور انجام کے لحاظ سے ہلاکت و بربادی ظالموں کے ہی حصہ میں آئی اور دائمی سرور و کامرانی مظلوموں نے پائی۔

اس واقعہ میں دو باتیں واضح کی گئی ہیں ایک یہ کہ دنیا کے کسی گوشہ میں ایسا الم ناک واقعہ پیش آیا۔ دوسری بات یہ کہ نتیجہ و ثمرہ کے پیش نظر ظالم خسارہ میں رہا اور مظلوموں کو فوز و فلاح نصیب ہوئی اور جب کہ پہلی بات گزشتہ تاریخ سے تعلق رکھتی تھی

Marfat.com

دوسری بات بھی یا تو تاریخ ماضی سے ہی متعلق تھی یا مستقبل سے اس کا تعلق تھا تو ضروری ہوا کہ مخاطب کو یہ دل نشین کرایا جائے کہ ایسا ضرور ہوا اور جب بھی ایسا ہوا ہے تو اس کا انجام ظالم کے حق میں خسران ہی رہا ہے۔ چنانچہ اظہار مقصد سے قبل "واو قسم" کے ذریعہ اس طرح کلام کی ابتدا کی گئی کہ برجوں والا آسمان اس بات کا شاہد ہے کہ اسی چرخ نیلی فام کے نیچے ایک المناک واقعہ پیش آیا اور یوم قیامت بھی گواہ ہے جس میں ہر حق و باطل کا فیصلہ ٹھیک ٹھیک ہو جانے والا ہے کہ اس المیہ کا انجام ظالم کے حق میں برا رہا اور ہر وہ شخص اس کا گواہ ہے جو واقعہ کے وقت موجود تھا اور خود وہ ظالم اور مظلوم گواہ ہیں جن کا اس معاملہ سے تعلق رہا ہے کہ بلاشبہ خندق کھود کر آگ میں انسانوں کو جلانے والے ہی انجام کار ہلاک و برباد ہوئے یا یوں کہہ لیجئے کہ وہ برجوں والا آسمان جو اپنی حیرت انگیز صنعت اور کواکب و نجوم کے ساتھ زینت پر خدائے واحد کی وحدانیت کا اقرار کر رہا ہے اور وہ قیامت کا دن جس دن میں خدائے واحد کے سواء کسی کی قوت و طاقت باقی نہ رہے گی اور جہاں ﴿ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ○ ﴾ کا اعلان ہوگا اور وہ جمعہ کا دن جس میں ہر ہفتہ کروڑوں انسان خدا کے سامنے سربسجود ہو کر اس کی وحدانیت کا اعلان کرتے ہیں اور وہ عرفہ کا دن جس میں سال بھر میں تمام خدا پرست دنیا خدائے واحد کی پرستش کا مظاہرہ کرتی ہے یہ سب اس بات کے لیے شاہد اور گواہ ہیں کہ "اصحاب اخدود" اپنے ظلم کے نتیجہ میں ناکام رہے اور ہلاک و برباد ہوئے اور نہ صرف وہ بلکہ ہر ظالم کا انجام "جہنم" اور ابدی ذلت و رسوائی ہے اور مظلوم کے لیے دنیا و دین دونوں میں فوز و فلاح اور کامرانی ہے اور پھر اس بات کو ثابت کرنے کے لیے چند تاریخی واقعات کو بھی دہرایا گیا اور بتایا گیا کہ تم ثمود اور فرعون کے واقعات پر غور کرو اور تاریخ ماضی میں محفوظ ان کی عبرت ناک داستانوں کا مطالعہ کرو تاکہ تم کو یقین ہو جائے کہ جن حقائق کی جانب سورۂ بروج میں توجہ دلائی گئی ہے ان کا ایک ایک حرف صحیح اور صادق ہے کیا "اصحاب الاخدود" میں طاقت و قوت ثمود اور فرعون سے زیادہ تھی اور کیا جب انہوں نے خدا کے مقابلہ میں سرکشی کر کے مظلوم ایمان داروں پر ہولناک مظالم کیے اور اس کی سزا میں خدائے تعالیٰ کی سخت گرفت نے ان کو بے یار و مددگار بنا کر ہلاک و برباد کر دیا تو دنیا کی کوئی طاقت و قوت یا خود ان کی قوت و سطوت ان کے کچھ بھی کام آئی اور ان کو تباہی سے بچا سکی؟

﴿ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ۙ۝۱۷ فِرْعَوْنَ وَ ثَمُوْدَ ؕ۝۱۸ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ۙ۝۱۹ وَّ اللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ ۚ۝۲۰ ﴾ (البروج: ۱۷-۲۰)

④ ﴿ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ﴾ میں مفسرین نے برج کی تفسیر کرتے ہوئے تین معنی مراد لیے ہیں:

(الف) بڑے بڑے نجوم و کواکب مراد ہیں۔

(ب) بروج ہیئت مراد ہیں جن کی تعداد بارہ ہے اور بحساب ہیئت قدیم ہر ایک برج میں سورج پورے ایک ماہ میں دورہ کرتا اور چاند دو دن اور تہائی دن میں دورہ کرتا اور دو راتیں مستور رہتا ہے اور اس طرح یہ دونوں مہینے اور سال بناتے ہیں۔

(ج) بروج سے وہ قلعے مراد ہیں جو آسمان پر محافظ فرشتوں کے لیے بنے ہوئے ہیں۔

ہمارے نزدیک قرآن عزیز میں دوسرے معنی قطعاً مراد نہیں ہیں اس لیے کہ ہیئت کا یہ حساب ضروری نہیں کہ صحیح ہو بلکہ آج کی ترقی یافتہ ہیئت نے تو تجربہ اور مشاہدہ کی حد تک یونان کی ہیئت قدیم کو تقویم پارینہ بنا دیا ہے اور بطلیموس کا نظام فلکی فرسودہ داستان

Marfat.com

بن کر رہ گیا ہے اور پہلے اور تیسرے معانی میں پہلے معنی راجح معلوم ہوتے ہیں اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ بڑے کواکب و نجوم ہی محافظ ملائکۃ اللہ کا مستقر ہیں تو پہلے اور تیسرے معنی میں مطابقت ہو جائے گی۔

③ ﴿وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ﴾ کی تفسیر میں جلیل القدر صحابہ اور تابعین سے مختلف اقوال منقول ہیں:

(الف) شاہد سے مراد جمعہ محمد ﷺ انسان یا اللہ تعالیٰ مراد ہے۔

(ب) مشہود سے عرفہ قیامت یا جمعہ مراد ہے مگر اکثر کا رجحان یہ ہے کہ شاہد سے جمعہ اور مشہود سے عرفہ مراد ہے اس لیے کہ جمعہ کا دن ہر ہفتہ آتا ہے اور دنیا کے ہر گوشہ سے لوگ عرفات میں حاضر ہوتے ہیں۔

ابن جریر طبری نے نبی اکرم ﷺ سے بھی ایک روایت اسی طرح کی بیان کی ہے:

قال رسول اللہ ﷺ الیوم الموعود یوم القیامة و ان الشاهد یوم الجمعة و ان المشهود یوم عرفة. (الحدیث)

④ اصحاب الاخدود کو قیامت کے دن جو عذاب ہوگا اس کے متعلق قرآن عزیز نے عذاب جہنم کے ساتھ عذاب الحریق آگ لگنے کا عذاب کا بھی ذکر کیا ہے اس سے یا تو عذاب جہنم ہی مراد ہے اور "جزاء از جنس عمل" کے اصول پر اس کو عذاب حریق بھی کہہ دیا گیا ہے یا جہنم میں ہی جلنے کا کوئی خاص قسم کا عذاب مراد ہے حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی یہی رائے ہے اور شاہ عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہ نے یہ معنی مراد لیے ہیں کہ آخرت میں جہنم کا عذاب اور دنیا میں آگ کے اندر جلنے کا عذاب اور اس سے ان کا مقصد غالباً اس واقعہ کی جانب اشارہ کرنا ہے جس کو ہم ابن ابی حاتم کی روایت سے نقل کر آئے ہیں۔

بصائر و عبر:

① جب انسان انفرادی اور اجتماعی زندگی میں خدا کے خوف سے بے پرواہ ہو جاتا ہے اور اس کو دولت و حکومت کا نشہ کبر و غرور کی اس بلندی پر پہنچا دیتا ہے جس پر چڑھ کر اس کی نگاہ میں تمام مخلوق ہیچ اور حقیر نظر آنے لگتی ہے تو اخلاق حسنہ اور جذبات عالیہ اس سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں اور وہ اپنی ذات اور ذاتی اغراض کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھتا۔ تب یکایک غیرت حق کو حرکت ہوتی ہے اور وہ اس کو اس طرح بلندی سے پٹخ دیتی ہے کہ پستی و ذلت کے تاریک غار کے علاوہ اس کے لیے اور کوئی جگہ باقی نہیں رہتی اور ﴿اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى﴾ کہنے والا رب حقیقی کی ایسی سخت گرفت میں آ جاتا ہے کہ پھر کائنات کی بھرپور طاقت اس کے کام آتی ہے نہ عالم ہست و بود کی دولت وحشمت اور اس کو سرنگوں ہو کر یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ﴿اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ۝﴾ ہے۔

② انسان "انسانیت کے امتیازات و خصائص" سے بنتا ہے ورنہ حیوان سے بھی بدتر ہے اور انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ جب انسان کو ہمہ قسم کی دولت وحشمت اور سامان میسر ہوں اور سطوت و طاقت بھی بے اندازہ نصیب ہو تو اس وقت بھی خدا اور خوف خدا سے ہرگز بیگانہ نہ ہو۔ ظفر مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا وہ ہو کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

Marfat.com

﴿ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ زَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ..... فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴾ (الاعراف: ۶۹، ۷۴)

"اور اے قوم عاد وہ وقت یاد کرو جب تم کو قوم نوح کے بعد ان کا جانشین بنایا اور تم کو مخلوق میں ہر طرح کی فراخی عطاء کی ..... پس اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد کرتے نہ پھرو۔"

﴿ وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴾ (الاعراف: ۱۰)

"اور ہم نے بے شبہ تم کو زمین میں قدرت وسطوت عطاء کی اور تمہارے لیے ان میں زندگی کے سامان بخشے پھر تم میں بہت کم شکر گزار ہیں۔"

③ انسان جب خدائے تعالیٰ پر یقین محکم کر لیتا اور حلاوت ایمانی سے فیض یاب ہو جاتا ہے تو پھر کائنات کی بڑی سے بڑی طاقت اور عالم کا ہولناک سے ہولناک ظلم بھی اس کو حق وصداقت سے متزلزل نہیں کر سکتا اور وہ کوہ استقامت بن کر ایثار وقربانی کا پیکر ثابت ہوتا ہے چنانچہ "اصحاب اخدود" کا واقعہ اس کی زندہ شہادت ہے۔

④ "جزاء از جنس عمل" خدائے تعالیٰ کا قانون ناطق ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ظالم ومتکبر کو ظلم وکبر کے عالم وجود میں آتے ہی فوراً سزا مل جائے اس لیے کہ بہ تقاضائے صفت رحمت یہاں ساتھ ساتھ قانون امہال (مہلت دینے کا قانون) بھی کام کر رہا ہے۔ البتہ جب اچانک گرفت کر لی جاتی ہے تو پھر چھٹکارا ناممکن ہے۔

Marfat.com

اصحاب الفیل

۵۷۱ء وسنہ ولادت باسعادت ﷺ عام الفیل

○ حبش ○ حکومت ○ نجاشی ○ مذہب وتمدن ○ یمن وحبش کی کشمکش ابرہہ الاشرم ○ القلیس
○ اصحاب الفیل ○ قرآن حکیم اور اصحاب الفیل ○ تفسیری مباحث ○ بصائر وغیرہ

حبش:

سبا کی بحث میں یہ ذکر آ چکا ہے کہ حکومت سبا کی حدود مملکت جنوبی عرب سے شروع ہو کر شمال عرب اور افریقہ تک وسیع ہو گئی تھیں۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ یمن اور افریقہ کے درمیان بحر احمر اور بحر عرب کے جو گوشے حائل ہیں ان کو بحر حبش کہا جاتا ہے اس لیے یمن کے مقابل بحر حبش عبور کر کے افریقہ کے سواحل پر جو آبادیاں ہیں اور جو دراصل سبا کی تجارتی نو آبادیاں تھیں اس قطعہ کو عرب جغرافیہ دان حبش کہتے ہیں اور یہ یورپین اقوام میں ابی سینیاء یونان میں ایتھوپیا اور خود اہل حبش میں جیز کہلاتا ہے۔ لغت عرب میں "حبش" کے معنی اختلاط و امتزاج کے آتے ہیں۔ (۱) چونکہ عرب مؤرخین کے نزدیک حمیر (سبا) اور حبشہ کے اصل باشندوں کے اختلاط سے یہ قوم عالم وجود میں آئی اس لیے انہوں نے ان کا یہ نام تجویز کیا ہے۔ (۲)

اور علماء انساب کہتے ہیں کہ جب اہل حبش (اکسوم) نے یمن پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا تو سبا کے خاندانوں میں یہ کہہ کر سلسلہ ازدواج قائم کیا کہ اصلاً وہ طے بن ادد (بنی کہلان) کی اولاد ہیں۔ اور سبا ہی کی ایک شاخ ہیں۔ (۳)

اور یورپین مستشرقین کی رائے یہ ہے کہ اہل حبش (اکسوم) غیر مخلوط سامی الاصل نہیں ہیں بلکہ اصل باشندوں کے ساتھ مختلف اقطاع عرب کے مختلف قبائل مل گئے ہیں۔ (۴)

بہرحال ان اقوال کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ افریقی قبائل (بنی حام) سبائی عرب قبائل (بنی سام) کے اختلاط سے قوم (حبش) وجود میں آئی ہے۔

حکومت:

اس مخلوط سبائی قوم کا دارالحکومت شہر اکسوم تھا جو ملک حبش کے صوبہ "تجریے" میں بجانب مشرق واقع تھا۔ اس شہر کے آثار

---

(۱) حبش الشئی۔ جمعه ولاتخابیش۔ جماعه من الناس لیسوا من قبیلته واحدة۔
(۲) دائرۃ المعارف للبستانی ووجدی ودائرۃ المعارف الاسلامیہ (حبش وسبا)
(۳) القصر ردالامم ص ۲۶ لابن عبدالبر (۴) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (سبا)

اب تک باقی ہیں اور اہل حبش اس کو مقدس شہر سمجھتے ہیں۔ [1]

کہتے ہیں کہ جس زمانہ میں حمیر نے ریدان کے قلعہ میں اپنی حکومت کا پرچم بلند کیا اسی زمانہ میں حبش نے اکسوم میں حکومت کی بنیاد ڈالی جو تقریباً ۱۱۵ ق م سے چھٹی صدی ہجری تک قائم رہی۔

نجاشی:

عرب، حبشہ کے بادشاہ کو نجاشی کا لقب دیتے ہیں دراصل یہ حبشی لفظ نجوس کا معرب ہے حبش کی زبان میں نجوس کے معنی "بادشاہ" کے ہیں اصحمہ بن ابجر مشہور نجاشی حبش ان خوش قسمت بادشاہوں میں سے ہیں جنہوں نے نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا زمانہ پایا اور اسلام کی دولت سے مشرف ہوئے ان ہی کے زمانہ میں مسلمانوں نے پہلی ہجرت حبشہ کی جانب کی نجاشی نے ان کو باعزت پناہ دی اور قریش کے اس مطالبہ کو ٹھکرا دیا کہ مسلمانوں کو ان کے حوالہ کر دیا جائے اور حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی اس تقریر سے متاثر ہو کر جو نجاشی کے دربار میں انہوں نے صداقت اسلام اور حقیقت اسلام پر کی تھی اس نے اسلام قبول کر لیا۔ یہی وہ نجاشی ہیں جن کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کا سلسلہ مراسلت رہا ہے اور یہی وہ نجاشی ہیں جن کے انتقال پر نبی اکرم ﷺ نے غائبانہ ان کی نماز جنازہ پڑھی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو بذریعہ وحی ان کے انتقال کی خبر دی۔

مذہب وتمدن:

حبش کا مذہب اور ان کا تمدن شروع سے ہی مصر (عرب) کے مذہب وتمدن سے متاثر رہا ہے اس لیے ان کا تمدن قریب قریب عرب ہی کا تمدن ہے اور مذہبی اعتبار سے یہ خاندان شروع میں مصری اور یمنی قبائل کی طرح بت پرست تھا لیکن جب رومی بادشاہوں کے اثر سے مصر نے عیسائیت کو قبول کر لیا تو اس کا اثر حبش پر بھی پڑا اور ۳۳۰ء میں سب سے پہلے اذنیہ نجاشی نے عیسائیت کو قبول کر لیا۔

حبش ویمن کی کشمکش:

گزشتہ صفحات میں یہ ذکر ہو چکا ہے کہ روم وایران کی رقیبانہ وحریفانہ کشمکش نے یمن اور حبش کو بھی متاثر کیے بغیر نہ چھوڑا اور سیاسی اور تجارتی رقابت نے ان دونوں کے درمیان بھی کشمکش قائم کر دی جس کے نتیجہ میں من اور ایران ایک جانب نظر آتے ہیں اور حبش وروم دوسری جانب پھر عجیب اتفاق یہ ہوا کہ جس زمانہ میں حبش میں عیسائیت کا ظہور ہوا اسی کے قریب یمن میں یہودیت نے قدم جمائے، اگرچہ اس زمانہ میں عیسائیت کو کافی فروغ حاصل تھا مگر نہیں معلوم کن وجوہ کی بنا پر اہل عرب عیسائیت کے ساتھ مانوس نہیں تھے اس لیے یمن نے جب تبدیل مذہب کیا تو یہودیت کو قبول کیا اور عیسائیت کی جانب رجحان نہ کیا مگر چوتھی صدی عیسوی میں جب اذنیہ نجاشی حبشہ نے عیسائیت کو قبول کر لیا تو یمن اور حبش کے درمیان مذہبی منافرت کے جذبات نے سابق رقابت کو اور زیادہ مشتعل کر دیا اور اسی اشتعال کے نتائج میں "اصحاب اخدود" کا سانحہ پیش آیا اور ذونواس شاہ یمن کے اس ظلم کی دادرسی کے لیے نجران کے ایک سردار دوس بن تغلبان نے نجاشی کے توسط سے قیصر روم تک فریاد پہنچائی اور قیصر روم نے نجاشی حبش کو حکم دیا کہ وہ یمن پر حملہ کر کے

---

[1] ایضاً ایڈیشن ۹ ج ۱ ص ۶۶-۶۷

حمیریوں سے انتقام لے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ہے۔
"اوائل چھٹی صدی میں حمیر (ذونواس) نے عیسائیوں کو سخت تکلیف پہنچائی جسٹینین اول نے شاہ حبش کالب الاصبح کو لکھا کہ ان کی امداد کرے چنانچہ اس نے حمیر کے ہاتھ سے یمن چھین لیا۔" ❶

اور ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ دوش نے قیصر روم کے پاس براہ راست فریاد کی اور قیصر نے ایک حکم نامہ دے کر اس کو نجاشی کے پاس بھیج دیا۔ دوش جب قیصر کا شاہی فرمان نجاشی کے پاس لے کر پہنچا تو وہ ستر ہزار فوج کے ساتھ یمن پر حملہ آور ہوا۔ ذونواس بھی فوج گراں لے کر مقابلہ پر آیا مگر شکست کھا گیا اور گھوڑے پر سوار دریا میں کود گیا کہ پار اتر کر فرار ہو جائے مگر پار نہ ہو سکا اور دریا میں غرق ہو گیا۔ ❷

عرب مؤرخین کہتے ہیں کہ یمن کے فاتح کا نام ارباط تھا اور ابرہۃ الاشرم اس کے ہمرکاب تھا مگر یونانی کہتے ہیں کہ اس کا نام اسمیفوس ھا اور اس زمانہ کے نجاشی کا نام الیباس (الاصبح) تھا۔

غرض مؤرخین عرب کی روایت کے مطابق ارباط یمن کا پہلا گورنر بنایا گیا حتیٰ کہ چند سال کے بعد ابرہہ نے اس پر بغاوت کر دی اور اس کو مار ڈالا اور بلاشرکت غیرے یمن پر قابض ہو گیا جب نجاشی الاصبح کو یہ خبر پہنچی تو وہ سخت غضبناک ہوا اور اس نے قسم کھائی کہ ابرہہ کو قتل کر کے اس کے دارالحکومت کو پیروں تلے روند ڈالے گا۔

ابرہہ نے یہ سنا تو بہت گھبرایا اور اپنے جسم سے کچھ خون نکال کر ایک شیشی میں بند کیا اور ایک تھیلہ میں یمن کی خاک بھری اور دونوں چیزوں کو قاصد کے ہاتھ نجاشی کے پاس بھیجا اور اس کو لکھا کہ جس طرح ارباط آپ کا تابع فرمان تھا اسی طرح یہ غلام بھی ہمیشہ تابع اور مطیع رہے گا جب سے میں نے یہ سنا ہے کہ حضور والا مجھ سے خفا ہیں اس وقت سے سخت پریشان ہوں اور میں آپ کی قسم کو پورا کرنے کے لیے اپنا خون اور یمن کی خاک بھیج رہا ہوں کہ آپ اس خون کو یمن کی خاک پر ڈال کر پیروں سے روند دیجئے اور اپنی قسم پوری کر لیجئے نجاشی نے ابرہہ کی معافی کو وقت کی مصلحت کے مناسب خیال کرتے ہوئے قبول کر لیا اور یمن پر ابرہہ کی گورنری کو منظور کر لیا اور اس طرح وہ یمن پر مطمئن حکومت کرنے لگا۔ ❸

ابرہۃ الاشرم:

ابرہہ کے متعلق مؤرخین کا یہ بیان ہے کہ یہ شاہی خاندان سے تھا اور چونکہ نکٹا تھا اس لیے اہل عرب اس کو ابرہۃ الاشرم کہتے ہیں۔ عربی میں "اشرم" نکٹے کو کہتے ہیں اس کی حکومت کا آغاز بعض کے نزدیک ۵۲۵ء اور بعض کے نزدیک ۵۴۳ء سے ہوتا ہے صاحب ارض القرآن دوسرے قول کو ترجیح دیتے ہیں۔

ابرہہ، ابراہیم کا حبشی تلفظ ہے یہ عیسائیت میں بہت پر جوش تھا۔ اس نے تمام قلمرو میں عیسائی مبلغ مقرر کیے اور شہروں میں بڑے بڑے گرجا (کنیسا) تعمیر کرائے۔ ان تمام کلیساؤں میں سب سے بڑا اور مشہور کلیسا دارالحکومت صنعاء میں تیار کرایا جس کو اہل عرب "القلیس" کہتے ہیں جو یونانی لفظ "کلیسا" کا معرب ہے۔

---

❶ مضمون اسی سینا ❷ تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۶۹ ❸ تاریخ ابن کثیر ج ۱

Marfat.com

القلیس:

ابن جریر اور ابن کثیر بروایت محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ یہ "کلیسا" بلحاظ فن تعمیر عدیم النظیر تھا اور جب یہ تعمیر ہو گیا تو ابرہہ نے نجاشی کو لکھا کہ میں نے آپ کے لیے صنعاء میں ایسا بے نظیر گرجا تعمیر کرایا کہ اس سے قبل تاریخ نے ایسا گرجا کبھی نہ دیکھا ہو گا اب میری تمنا یہ ہے کہ اقطاع و امصار کے عرب جو مکہ میں کعبہ کا حج کرنے کے لیے جمع ہوتے ہیں ان سب کا رخ اس "کلیسا" کی جانب پھیر دوں اور کل عرب کے لیے یہی مقام حج بن جائے اہل عرب نے یہ سنا تو ان میں سخت برہمی پیدا ہو گئی۔ ❶

(سہیلی کہتے ہیں کہ ابرہہ نے اس کی تعمیر میں یمن پر بہت سخت مظالم کیے، اہل یمن کو جبراً مزدور بنایا اور یمن کی بے اندازہ دولت اور بیش بہا زر و جواہر کو بے دریغ اس پر صرف کیا) یہ بیش قیمت پتھروں کی بہت خوب صورت اور بہت طویل و عریض عمارت تھی اور عجیب و غریب زرکار نقوش سے منقش اور جواہر ریزوں سے مزین تھی اور ہاتھی دانت اور آبنوس کے نہایت حسین و جمیل منقش منبروں اور سونے چاندی کی صلیبوں سے اس کو سجایا گیا تھا۔ ❷

اصحاب الفیل:

تاریخ عرب اس کی شاہد ہے کہ تمام اہل عرب خواہ وہ کسی بھی فرقہ اور کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں کعبہ کی بہت زیادہ عظمت کرنے اور اپنے اپنے عقیدہ کے مطابق اس کا حج کرنا مقدس فرض سمجھتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ خاص کعبہ کے اندر عرب کے مختلف فرقوں کے بت تین سو ساٹھ کی تعداد میں نصب تھے۔ ❸

حتیٰ کہ حضرت ابراہیم، حضرت اسمٰعیل، حضرت عیسیٰ، حضرت مریم (علیہم السلام) کی تصاویر بھی موجود تھیں اور جب فتح مکہ میں نبی اکرم ﷺ فاتحانہ داخل ہوئے تو آپ ﷺ کے ارشاد پر جس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے صحابہ نے ان بتوں کو کعبہ سے خارج کیا ہے تو اس وقت بھی یہ تصاویر کعبہ کے اندر موجود تھیں اور ایک روایت میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے سامنے جب یہ ذکر آیا کہ مشرکین عرب نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی تصویر اس طرح بنائی ہے کہ ان کے ہاتھ میں "پانسے" ہیں تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا مشرکین جھوٹے ہیں اور اسمٰعیل علیہ السلام کا دامن اس بیہودہ عمل سے پاک ہے۔ ❹

بہرحال جب صنعاء میں مقیم کسی حجازی نے یہ سنا کہ ابرہہ نے "القلیس" کو اس نیت سے بنایا ہے تو اس کو غصہ آیا اور اس نے ایک شب میں موقعہ پا کر اس کلیسا کو نجس کر دیا۔ ابرہہ کو جب صبح کو یہ معلوم ہوا اور تحقیق کے بعد پتہ چلا کہ یہ کام کسی حجازی کا ہے تو غصہ سے بے قابو ہو گیا اور گرجا کی بے حرمتی دیکھ کر غیظ و غضب میں پیچ و تاب کھانے لگا اور قسم کھائی کہ اب کعبہ ابراہیمی کو برباد کیے بغیر چین سے نہ بیٹھوں گا یہ ارادہ کر کے ابرہہ لشکر جرار اور ہاتھیوں کی ایک تعداد ساتھ لے کر مکہ کی جانب روانہ ہوا۔ یہ خبر تمام قبائل عرب میں ہوا پر سوار ہو کر پہنچ گئی اور تمام عرب میں اس سے ایک ہیجان پیدا ہو گیا سب سے پہلے یمن ہی کے ایک امیر ذونفر نے

---

❶ تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۷

❷ اس کے آثار عباسی خلیفہ اول سفاح کے زمانہ تک موجود تھے روض الانف ج ۱ و تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۷۰

❸ بخاری و مسلم ❹ بخاری باب فتح

Marfat.com

یمن سے نکل کر عرب کے مختلف قبائل کے پاس قاصد بھیجے کہ میں ابرہہ کا مقابلہ کرنا چاہتا ہوں آپ کو چاہیے کہ اس نیک مقصد میں میرا ساتھ دیں۔ چنانچہ وہ آگے بڑھ کر ابرہہ کے مقابل آیا اور اس سے جنگ کی مگر شکست کھا گیا اور ذونضر گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے بعد قبیلہ بنی خثعم کے سردار نفیل بن حبیب سے مقابلہ ہوا اور اس کو بھی شکست اٹھانی پڑی اور وہ بھی گرفتار ہو گیا جب ابرہہ طائف پہنچا تو بنی ثقیف کے سردار مسعود بن معتب نے آگے بڑھ کر ابرہہ کو یقین دلایا کہ مجھ کو اور میرے قبیلہ کو آپ سے کوئی پرخاش نہیں ہے اس لیے کہ ہم کو یہ یقین ہے کہ آپ "بیت اللات" کے انہدام کا ارادہ نہیں رکھتے جس میں ہمارا سب سے معظم اور محترم معبود لات نصب ہے۔ ابرہہ نے ان کو اطمینان دلایا اور خاموشی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ مسعود ثقفی نے راستہ بتانے کے لیے ایک شخص ابورغال کو راہنما بنا دیا مگر ابورغال وادی مغمس پہنچ کر مر گیا کہتے ہیں کہ عرب زمانہ جاہلیت میں اس کی قبر کو سنگسار کیا کرتے تھے کہ یہ کعبہ کے انہدام کے لیے راہنما بنا تھا۔

مغمس پہنچ کر ابرہہ نے ایک حبشی فوجی افسر کو جس کا نام اسود بن مقصود تھا حکم دیا کہ وہ مکہ جا کر چھاپہ مارے۔ اسود مکہ کے قریب پہنچا تو "قریش اور دوسرے قبائل کے اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کو جو کثیر تعداد میں چر رہے تھے" پکڑ کر اپنے لشکر میں لے گیا۔ ان میں عبدالمطلب کے بھی دو سو اونٹ شامل تھے۔

اس زمانہ میں عبدالمطلب قریش کے سردار تھے۔ یہ حال دیکھ کر قریش، کنانہ، ہزیل اور دیگر قبائل نے آپس میں مشورہ کیا کہ ابرہہ کا مقابلہ کس طرح کیا جائے؟ مشورہ کے بعد یہ طے پایا کہ ہم میں طاقت مدافعت نہیں ہے اس لیے ہم کو مکہ چھوڑ کر قریب کی پہاڑی پر چلے جانا چاہیے ابھی یہ لوگ مکہ ہی میں تھے کہ ابرہہ کی جانب سے جناطہ الحمیری پہنچا اور دریافت کیا کہ مکہ کا سردار کون ہے؟ لوگوں نے عبدالمطلب بن ہاشم کی جانب اشارہ کیا۔ جناطہ نے کہا "میں ابرہہ کی جانب سے آیا ہوں ہمارے بادشاہ کا یہ حکم ہے کہ آپ تک یہ پیغام پہنچا دوں کہ ہمارا ارادہ آپ لوگوں کو نقصان پہنچانے کا نہیں ہے اور نہ ہم آپ سے جنگ کرنے کے لیے آئے ہیں ہم تو صرف اس گھر (بیت اللہ) کو ڈھانے کے لیے آئے ہیں پس اگر تمہارا ارادہ مقابلہ اور مدافعت کا ہو تو تم جانو اور اگر تم ہمارے اس ارادہ میں حائل نہ ہو تو ہمارا بادشاہ آپ سے ملاقات کا خواہش مند ہے۔" عبدالمطلب نے جواب دیا ہمارا قطعاً ارادہ نہیں کہ ہم تمہارے بادشاہ سے جنگ کریں اور نہ ہم میں یہ طاقت ہے یہ اللہ کا گھر ہے اور اس کے برگزیدہ نبی ابراہیم علیہ السلام کی یادگار، پس اگر اللہ اس کی حفاظت کرنا چاہے گا تو وہ کر سکتا ہے اور اگر اس کو اس کی حفاظت مقصود نہیں ہے تو ہم قوت مدافعت کے قابل قطعاً نہیں ہیں۔

(غرض اس گفتگو کے بعد عبدالمطلب ابرہہ کے لشکر میں پہنچے) اور ایک درباری کی جانب سے سفارش و تعارف پر اس کے سامنے پیش ہوئے۔ عبدالمطلب بہت شاندار اور وجیہ و شکیل انسان تھے، ابرہہ نے دیکھا تو ان کے ساتھ عزت سے پیش آیا اور اپنے برابر ان کو جگہ دی۔

گفتگو شروع ہوئی تو ان کی طلاقت لسانی اور خطابت سے ابرہہ بہت زیادہ متاثر ہوا، دوران گفتگو میں جب معاملہ پر بات چیت شروع ہوئی تو عبدالمطلب نے شکایت کی کہ آپ کے ایک سردار نے میرے اونٹ گرفتار کر لیے ہیں لہٰذا آپ سے درخواست ہے کہ ان کو میرے حوالہ کر دیجئے ابرہہ نے یہ سنا تو کہا: "عبدالمطلب میں تو تم کو بہت فہیم و عقیل سمجھتا تھا لیکن اس سوال پر سخت متعجب ہوں، تم کو معلوم ہے کہ میں کعبہ کو ڈھانے کے لیے آیا ہوں جو تمہاری نگاہ میں سب سے زیادہ باعظمت اور مقدس ہے لیکن تم نے اس

کے متعلق ایک جملہ بھی نہیں کہا اور ایسی چھوٹی اور حقیر بات کا ذکر کر رہے ہو؟" عبدالمطلب نے جواب دیا "بادشاہ یہ اونٹ چونکہ میری ملکیت ہیں اس لیے میں نے ان کے متعلق درخواست پیش کی اور کعبہ میرا گھر نہیں خدا کا مقدس گھر ہے وہ آپ اس کا محافظ ہے میں کون ہوں جو اس کے لیے سفارش کروں؟" ابرہہ کہنے لگا اب اس کو میرے ہاتھ سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ عبدالمطلب نے جواب دیا: "آپ جانیں اور رب البیت جانیں" یہاں پہنچ کر سلسلہ گفتگو ختم ہو گیا اور ابرہہ نے اپنے لشکریوں کو حکم دیا کہ عبدالمطلب کے اونٹ واپس کر دیے جائیں۔"

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ عبدالمطلب کے ہمراہ بنی بکر کا سردار یعمر بن نفاثہ اور بنی ہزیل کا سردار خویلد بن واثلہ بھی تھے، روانگی سے قبل انہوں نے ابرہہ کے سامنے یہ پیش کش کی کہ اگر کعبہ کے انہدام سے باز آ جائیں تو ہم تہامہ کا ایک تہائی مال آپ کی خدمت میں حاضر کر دیں گے مگر ابرہہ نے اپنی طاقت کے نشہ میں اس پیشکش کو ٹھکرا دیا اور اپنے ارادہ پر اڑا رہا تب یہ لوگ ناکام واپس آ گئے۔

عبدالمطلب نے واپس آ کر قریش اور دوسرے قبائل عرب کو جمع کیا اور ان کو تمام گفتگو سنا کر یہ مشورہ دیا کہ اب ہم سب کو قریب کی کسی پہاڑ پر پناہ گزیں ہو جانا چاہیے تاکہ اس منظر کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھ سکیں جب اہل مکہ پہاڑی پر جانے لگے تو عبدالمطلب کی قیادت میں کعبۃ اللہ میں حاضر ہوئے اور اس کی زنجیر پکڑ کر درگاہ الٰہی میں یہ دعا کی:

"خدایا ہم اس بارے میں غمگین نہیں ہیں کہ جب ہم اپنی متاع کی حفاظت کر سکتے ہیں تو اپنی متاع (کعبہ) کی تجھ کو بھی ضرور حفاظت کرنی ہے اور تیری تدبیر پر نہ صلیب کی طاقت غالب آ سکتی ہے اور نہ اہل صلیب کی کوئی تدبیر، ہاں اگر تو ہی یہ چاہتا ہے کہ ان کو اپنے مقدس گھر کو خراب کرنے دے تو پھر ہم کون؟ جو تیرا جی چاہے سو کر۔"

مؤرخین نے عبدالمطلب کے ان اشعار کو بھی نقل کیا ہے جو انہوں نے اپنے خاص انداز خطابت کے ساتھ فی البدیہ درگاہ الٰہی میں پیش کیے اور جن کا ترجمہ ہم ابھی نقل کر چکے ہیں:

لا هم ان العبد يمنع رحاله فامنع رحالك
لا يغلبن صليبهم و محالهم غدوا محالك
ان كنت تاركهم و قبلتنا فامر ما بدالك [1]

اس کے بعد عبدالمطلب اور تمام قریش مکہ کو خالی کر کے قریب کے پہاڑوں پر چلے گئے اور گھاٹیوں میں پناہ گزیں ہو کر حالات کا انتظار کرنے لگے۔

اگلے دن صبح کو ابرہہ نے اپنا لشکر مکہ کی جانب بڑھایا اگلی قطاروں میں ہاتھی تھے اور ان کے پیچھے لشکر جرار، ابھی یہ لشکر مکہ تک نہیں پہنچا تھا کہ راہ میں ہی اچانک پرندوں کے غول کے غول نمودار ہوئے اور لشکر کے سر پر فضا میں چھا گئے ان کی چونچ اور ان کے پنجوں میں سنگریزے تھے پرندوں نے ان سنگریزوں کو لشکر پر پھینکنا شروع کیا جس شخص کے سنگریزے لگتے تھے بدن پھوڑ کر باہر نکل آتے تھے اور فوراً ہی اعضاء گلنے سڑنے لگتے تھے نتیجہ یہ نکلا کہ تھوڑی دیر میں سارا لشکر زیروزبر ہو کر رہ گیا۔

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۲

Marfat.com

محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ کچھ لوگ اسی حال میں لشکر سے فرار ہو کر یمن اور حبشہ پہنچے اور انہوں نے ابرہہ اور اس کے لشکر کی تباہی کا حال سنایا۔

اور مشہور محدث ابن ابی حاتم بروایت عبید بن عمیر نقل کرتے ہیں کہ جب ابرہہ کا لشکر مکہ کی جانب بڑھا تو تیز ہوا چلی اور سمندر کی جانب سے پرندوں کے غول اڑتے ہوئے لشکر پر چھا گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فضا میں پرندوں کا زبردست لشکر پرے کے پرے باندھے ہوئے ہے ان کے منہ اور ان کے دونوں پنجوں میں سنگریزے تھے انہوں نے اول تو آواز کی اور پھر لشکر پر سنگریزے مارنے لگے۔ ساتھ ہی تند و تیز ہوا چلنے لگی جس نے اس سنگ باری کو لشکر کے لیے مصیبت عظمیٰ بنا دیا۔ چنانچہ جس شخص پر یہ سنگریزے گرے بدن پھوڑ کر باہر نکل آئے اور بدن گلنے اور سڑنے لگا اور اس طرح ان سنگ ریزوں نے سارے لشکر کو چھلنی کر ڈالا۔ [1]

محمد بن اسحاق نے بروایت عکرمہ رحمہ اللہ نقل کیا ہے کہ اسی سال عرب میں مرض چیچک کا ظہور ہوا۔

قرآن اور اصحاب فیل:

قرآن عزیز نے اس واقعہ کا سورہ الفیل میں اپنے معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ اس طرح ذکر کیا ہے گویا ذات اقدس ﷺ پر خدائے تعالیٰ کا بہت بڑا احسان اور اس کے اعزاز و اکرام کا عظیم الشان "نشان" ہے۔

﴿ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝ وَّ اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝ ﴾ (الفیل: ۱-۵)

"(اے محمد ﷺ) کیا تو نے نہیں دیکھا تجھ کو معلوم نہیں کہ تیرے پروردگار نے ہاتھیوں والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ کیا ان کے فریب کو ناکارہ نہیں بنا دیا اور بھیج دیے ان پر پرندوں کے جھنڈ وہ پھینک رہے تھے ان پر سنگریزے پس کر دیا ان کو کھائے بھوسہ کی طرح۔"

اصحاب الفیل کا یہ عجیب و غریب واقعہ ماہ محرم میں ولادت باسعادت محمد ﷺ سے چالیس یا پچاس روز قبل پیش آیا اہل عرب

---

[1] کہتے ہیں کہ ابرہہ نے فوج کو حکم دیا کہ وہ مکہ کی جانب بڑھے جب وہ مکہ کے قریب پہنچی ہے تو ہاتھیوں کی قطار میں سے سب سے پہلے اس ہاتھی نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا جس پر ابرہہ سوار تھا۔ فیلبان اگرچہ اس کے آنکس پر آنکس لگا رہا اور زبانی ڈپٹ رہا تھا مگر وہ کسی طرح آگے بڑھنے کا نام نہیں لیتا تھا لیکن جب اس کو یمن کی جانب چلاتے تھے تو وہ تیزی کے ساتھ چلنے لگتا تھا اس حالت میں اچانک پرندوں کے غول نے آ گھیرا۔

گویا قدرت کی جانب سے ابرہہ کے لیے یہ آخری تنبیہ تھی کہ وہ اب بھی سمجھ جائے کہ اس کا یہ ارادہ باطل اور ناپاک ہے اور یہ جرأت دراصل خدا کی طاقت کو چیلنج ہے اس لیے اس کو اس سے باز آ جانا چاہیے لیکن اس بدبخت نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی اور اپنے کردار کی پاداش کو پہنچ کر رہا۔

بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ جب پرندوں کی سنگساری سے ابرہہ کا لشکر برباد ہو گیا تو اس میں سے بعض آدمی جو بدحالی کے ساتھ فرار ہو کر یمن پہنچے تھے ان میں سے خود ابرہہ بھی اس حالت میں پہنچا کہ اس کے تمام اعضاء گل سڑ کر گر چکے تھے اور وہ صرف ایک مضغہ گوشت نظر آتا تھا۔

یعنی قدرت نے جس طرح فرعون کو غرق کر دینے کے بعد اس کی نعش کو اس لیے کنارہ پر پھینک دیا تھا کہ وہ مصر کے قبطیوں اور بنی اسرائیل دونوں کے لیے سامان عبرت و بصیرت بنے اسی طرح یمن اور حبش کے باشندوں کی عبرت کے لیے ابرہہ کو اس حالت میں یمن پہنچایا کہ وہ یہ غور کریں کہ جس شخص نے اپنی مادی قوت کے گھمنڈ پر خدا کی طاقت کو چیلنج کیا تھا آج قدرت کے زبردست ہاتھ نے اس کا یہ حال کر دیا۔ ﴿فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ﴾

Marfat.com

میں یہ واقعہ اس درجہ اہمیت وشہرت رکھتا تھا کہ انہوں نے اس سال کا نام "عام الفیل" (ہاتھیوں والا سال) رکھ دیا اور اس کے بعد تاریخی واقعات کو اسی سنہ کے حساب سے شمار کرنے لگے جو عیسوی سنہ کے حساب سے ۵۷۱ء اور رومی سنہ کے حساب سے ۸۸۶ سکندری کے مطابق ہوتا ہے۔

روایات عرب اور عرب مؤرخین میں یہ واقعہ اس درجہ مشہور ومعروف تھا کہ جب نبی اکرم ﷺ مکہ کی زندگی مبارک میں سورۃ الفیل کا نزول ہوا تو مشرکین، یہود اور نصاریٰ کی اس عداوت کے باوجود جو آپ ﷺ کی ذات مبارک سے ان کو تھی کسی سمت سے بھی اس سورۃ میں بیان کردہ واقعہ کے خلاف کوئی صدا بلند نہیں ہوئی کہ یہ واقعہ غلط ہے یا اس کی اصل حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ دوسری ہے۔

یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ چونکہ یہ واقعہ صرف ذات اقدس ﷺ ہی سے نہیں بلکہ تمام عرب خصوصاً قریش کی عظمت وعزت بڑھاتا تھا اس لیے کسی نے اس کے خلاف آواز بلند نہیں کی یہ بات اس لیے غلط ہے کہ جس وقت یہ سورۃ نازل ہوئی ہے اس وقت عرب میں مذہبی فرقہ بندی کے اعتبار سے عرب کے مختلف حصوں میں عموماً اور نجران کے مشہور شہر میں خصوصاً عیسائیت مشرکین مکہ اور محمد ﷺ دونوں کی حریف ورقیب تھی اس لیے وہ عربی نژاد ہونے کو قطع نظر کر سکتے تھے مگر عیسائیت کی اس توہین کو جو ان کے زعم میں یا قریش مکہ کی عزت کو بڑھاتی تھی اور یا محمد ﷺ کی عظمت کو ایک لحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے بلکہ وہ اور یہود دونوں ایسے واقعہ کو سننا بھی گوارا نہ کرتے جو ان کے قبلہ صخرہ (بیت المقدس) کے علاوہ ایسے مقام "کعبہ" کی صد ہزار عظمت کا اظہار کرتا ہے جس کے قبلہ بننے کو وہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے اور علی الاعلان اس کو جھٹلاتے تھے۔

بہر حال تاریخ کی صاف اور بے لوث شہادت یہ ثابت کر رہی ہے کہ ایک عیسائی معاصر نے بھی اس واقعہ کے خلاف لب کشائی کی جرات نہیں کی اور ہجرت کے بعد جب آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں نجران کا وفد (ڈیپوٹیشن) آیا ہے تو وہ اپنے خیال میں اسلام کے خلاف جس قسم کی نکتہ چینیاں کر سکتا تھا اور محمد ﷺ اور قرآن کی تکذیب میں جو دلائل دے سکتا تھا وہ سب اس نے پیش کیے لیکن اس واقعہ کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نہیں نکالا اور اگر ایسا ہوا ہوتا تو جس تاریخ نے ساڑھے تیرہ سو برس سے ان تمام اعتراضات کو اپنی آغوش میں محفوظ رکھا ہے جو معاندین کی جانب سے نبی اکرم ﷺ، قرآن اور اسلام پر کیے گئے ہیں وہ کیسے اس اعتراض کو فراموش کر سکتی تھی۔

لہٰذا تعصب سے پاک حقیقت میں نگاہ کو یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ یہ واقعہ اپنی تفصیلات کے ساتھ جس طرح عرب روایات اور مؤرخین عرب کے یہاں محفوظ اور مشہور ہے وہ قطعاً صحیح ہے اور صحیح نہ ہونے کی آخر کون سی وجہ ہے جب کہ سورۃ الفیل کے نزول کے وقت اس واقعہ کو گزرے صرف بیالیس تینتالیس سال ہی ہوئے اور اس لیے اس واقعہ کو آنکھوں سے دیکھنے والے ہزاروں اور اپنے یقین اور وطنی روایات سے سننے والے لاکھوں کی تعداد میں تمام اقطاع عرب میں موجود تھے۔

لیکن صدیوں کے بعد آج یورپین مؤرخین یہ کہتے ہیں "واقعہ صرف اتنا ہے کہ ابرہہ رومیوں کی مدد کو فوج لے کر نکلا راہ میں اس کی فوج چیچک کی وبا سے برباد ہوگئی" اور لطف یہ ہے کہ ان کے پاس اس دعویٰ کے لیے نہ کوئی تاریخی دلیل ہے اور نہ معاصرانہ شہادت بلکہ صرف عرب مؤرخین (محمد بن اسحاق وغیرہ) کے اس بیان سے کہ "اسی سال عرب میں چیچک کا ظہور ہوا" یہ فیصلہ کر لیتے ہیں۔

Marfat.com

معلوم نہیں کہ تاریخ اور فلسفہ تاریخ کا یہ کون سا نظریہ ہے کہ ایک روایت کے تمام واقعات کا تو اپنے مخالف سمجھ کر "بلا دلیل انکار کر دیا جائے اور اس واقعہ کے ایک ضمنی جملہ کے مفہوم کو بدل کر اور بغیر کسی سند کے اپنی جانب سے اس میں اضافہ کر کے ایک نیا مطلب پیدا کر لیا جائے۔"

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ بقول ابن اسحاق اسی سال عرب میں چیچک کا ظہور ہوا اور غیر اسلامی روایت کے مطابق ہم یہ بھی قبول کیے لیتے ہیں کہ اسی سال یمن اور حبش میں بھی اس مرض نے سر نکالا تاہم اس سے یہ کیسے لازم آ جاتا ہے کہ:

① ابرہہ "کعبہ" کے ڈھانے کے لیے لشکر لے کر نہیں نکلا تھا جیسا کہ مستند تواریخ سے ثابت ہوتا ہے بلکہ رومیوں کی مدد کو نکلا تھا جیسا کہ یورپین مؤرخین بے دلیل محض انکل سے کہہ رہے ہیں۔

② اور یہ کہ ابرہہ کا لشکر رب کعبہ کے حکم سے چڑیوں کی سنگ باری سے تباہ نہیں ہوا جیسا کہ معاصر شہادتوں اور تواتر کے درجہ کی روایات ملکی تاریخی سے ثابت ہے بلکہ چیچک کی وبا سے برباد ہو گیا جس کے لیے تاریخ میں کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔

یہ بات تو ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ ابرہہ "القلیس" کے انتقام میں کعبہ کو ڈھانے نکلا تھا پس اگر سمندر کی جانب سے آنے والی چڑیوں نے سنگریزوں کے ذریعہ سے بحکم رب کعبہ چیچک کے ایسے سخت جراثیم پیدا کر دیئے کہ انہوں نے حملہ آوروں کو سانس لینے کی بھی مہلت نہیں دی اور سنگریزوں کے لگنے کے فوراً بعد ہی بدن گلنے اور سڑنے لگا اور سارا لشکر زیر و زبر ہو کر رہ گیا تو اس کو کیا کہنا چاہیے؟ اور یہ اگر قادر مطلق کی جانب سے ابرہہ اور اس کے لشکر پر عذاب نہیں تھا تو اور کیا تھا: ﴿فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ﴾

حقیقت حال یہ ہے کہ یہ فطرت پرست "یورپین مؤرخین" یا تو اس واقعہ کو اس وجہ سے مسخ کرنا چاہتے ہیں کہ اس سے کعبۃ اللہ کی عظمت اور وقت کی خود ساختہ عیسائیت کی اہانت کا پہلو بہت صاف اور نمایاں طور پر سامنے آتا ہے اور قدرت کے ہاتھوں حق و باطل کے معرکہ میں حق کے غلبہ اور باطل کی مغلوبیت کا اعلان ہو جاتا ہے یا محض فطرت پرستی اور مادہ پرستی کے جذبہ میں انہوں نے خدائے تعالیٰ کی غیر محدود طاقت کے مشاہدہ سے آنکھ بند کر لی ہے اور وہ ایسے واقعات کو ناممکن خیال کر لیتے ہیں حالانکہ اسی آسمان کے نیچے تاریخ اقوام و امم نے بارہا ایسے مشاہدے کیے ہیں اور تاریخ نے ان کو اپنی آغوش میں محفوظ رکھا ہے کہ جب بھی کوئی قوم ظلم و تکبر، طغیان و عصیان اور فساد و سرکشی میں حد سے گزر گئی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اجرام ارضی و سماوی میں سے کبھی ہوا کو، کبھی برق کو کبھی باد و باراں کو کبھی ہولناک چیخ کو اور کبھی حیوانات کی یورش کو اس طرح ان پر مسلط کر دیا ہے کہ آنکھوں دیکھتے وہ اور ان کا زبردست تمدن سب کا سب خاک میں مل گیا، عاد و ثمود، نمرود، فرعون، اصحاب ایکہ، اصحاب اخدود جیسی قومیں اپنے اپنے زمانہ میں زبردست تمدن و حکومت کی مالک تھیں مگر جب انہوں نے خدا کی زمین میں فساد مچا دیا۔ زیردستوں پر ظالمانہ قابض ہو کر ان کو کچل ڈالا۔ شرک و کفر میں بے باک ہو کر خدا کے پیغمبروں کے ساتھ بے رحمانہ سلوک کیا اور انانیت میں آ کر بعض نے خدائی کا دعویٰ تک کر دیا تو ان ہی عناصر اور مخلوق ارضی و سماوی کے ذریعہ جن کا ذکر سطور بالا میں ہو چکا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس طرح ہلاک و برباد کر دیا کہ تاریخ کے اوراق کے سوا دنیا میں ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔

مگر انسان کی اس غفلت کو کیا کیجئے کہ وہ کوتاہی عقل سے گزشتہ واقعات کا انکار کرنے پر بہت جلد آمادہ ہو جاتا اور نئے کرشمہ غیبی کا طالب ہوتا ہے بلکہ بنی اسرائیل کی طرح بیجا جسارت کے ساتھ یہ کہہ اٹھتا ہے ﴿لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً﴾

Marfat.com

اور جب وہ بھی اگلوں کی طرح عذاب الٰہی میں گرفتار ہو جاتا ہے تو حسرت و افسوس کرتا ہوا دوسروں کے لیے سامان عبرت و بصیرت بن جاتا ہے اور اس وقت کا اعتراف و اقرار اور اس وقت کی حسرت و ندامت اس کے کسی کام نہیں آتی۔

﴿فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَ كَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ۝ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَ خَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ۝﴾

(المؤمن: ۸۴-۸۵)

"پس جب دیکھا انہوں نے عذاب ہمارا تو انہوں نے کہا ہم ایمان لائے ایک خدا پر اور جس چیز کو خدا کا شریک ٹھہراتے تھے اس سے منکر ہوئے پس ان کے اس ایمان نے ان کو کوئی نفع نہیں دیا جب انہوں نے ہمارا عذاب آنکھوں سے دیکھ لیا اللہ تعالیٰ کی یہی سنت ہے جو ہمیشہ سے اس کے بندوں کے ساتھ جاری ہے اور کافروں نے اس موقعہ پر خسارہ ہی اٹھایا۔"

یہی حال آج یورپین مادہ پرستوں اور ان کے کور باطن مقلدوں کا ہے کاش کہ وہ حقیقت حال کو سمجھنے کی کوشش کریں اور حقائق سے انکار اور ان کا استہزاء نہ کریں۔ انہیں تاریخ کے دہرائے ہوئے اس سبق کو کبھی بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ لارڈ کچز نے اسی زمانہ میں مصر پر جارحانہ مظالم کرتے ہوئے بڑے تکبر کے ساتھ سر بلند کرتے ہوئے یہ کہا تھا "آج میں مصر کا فرعون ہوں" پھر تم نے دیکھا کہ خدائے برتر کے قانون "پاداش عمل" نے اس کو وہی جواب دیا جو فرعون کو ملا تھا ﴿فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ﴾ اور اس کی غرقِ دریا نعش کو یورپ کی سائنس جدید کا کوئی کرشمہ بھی قعر دریا سے اوپر نہ لا سکا۔

یہ واقعہ صدیوں کا نہیں ہے، ہماری اور تمہاری زندگی کا واقعہ ہے پھر کیا منکرین خدا اور منکرین قدرت خدا نے اس واقعہ سے کوئی سبق حاصل کیا؟ نہیں بلکہ انہوں نے یہ کہہ کر ضمیر کی آواز کو دبا لیا کہ یہ تو بخت و اتفاق کے واقعات میں سے ایک واقعہ ہے جو ہو گزرا، آخر انہوں نے ایسا کیوں سمجھ لیا قرآن کہتا ہے صرف اس لیے کہ:

﴿لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَ لٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ۝﴾ (سورۃ الحج: ۴۶)

یعنی یہ بات نہیں ہے کہ وہ کور چشم ہیں وہ خوب دیکھتے ہیں لیکن ان کے سینوں کے اندر ان کے دل اندھے ہو گئے ہیں" اس لیے کچھ دیکھتے ہیں اس سے عبرت حاصل نہیں کرتے۔ لہٰذا ایسی جماعت کے لیے اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے: ﴿فَانْتَظِرُوْۤا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝﴾

[سو]رہ فیل اور بعض دیگر تفسیریں:

سطور بالا میں سورۂ فیل کی تفسیر سلف صالحین رحمہم اللہ اور جمہور کے مسلک کے مطابق کی گئی ہے اس تفسیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ [اللہ] تعالیٰ نے حرم کعبہ کی صیانت و حفاظت کے لیے ابرہۃ الاشرم اور اس کے عظیم الشان لشکر کو اپنے قانون "تعذیب امم" کے پیش نظر [کے] لیے معجزانہ طور پر چھوٹی چھوٹی چڑیوں کے ذریعہ کنکریوں کی مار سے ہلاک و برباد کر دیا کہ قریش بہ اسباب ظاہر اس لشکر جرار کے [مقابلہ] کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور رب کعبہ کو بہر حال کعبہ کی حفاظت مقصود تھی۔

Marfat.com

یہ تفسیر لغت عرب کی مطابقت، سلف صالحین سے منقول، روایات اور تاریخی تواتر کے پیش نظر بغیر کسی رد وانکار کے تیرہ سو سال سے قابل قبول رہی ہے۔

لیکن اس تفسیر کے مطابق چونکہ اس واقعہ کا تعلق اللہ تعالیٰ کے اعجاز قدرت اور معجزانہ فعل کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے اس لیے گزشتہ پچاس ساٹھ سال کے اندر یورپ کے الحاد سے مرعوب ہو کر بعض حضرات نے سلف کے خلاف یہ سعی فرمائی ہے کہ خواہ حقیقت حال نظر انداز ہو جائے مگر کسی طرح اس واقعہ کا عجوبہ پن دور کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے تفسیر بالرائے سے کام لیا ہے۔ تفسیر بالرائے کے یہی معنی ہیں کہ اس پر نظر کیے بغیر کہ اس بارہ میں قرآن خود کیا کہتا ہے اور ایک خالی الذہن انسان اس سے کیا مطلب اخذ کرتا ہے اپنی جانب سے پہلے ایک خاص خیال قائم کر لیا جائے اور اس کے بعد آیات قرآنی کی تفسیر اپنے اس اختراعی خیال پر کر دی جائے۔

تفسیر بالرائے کے اصول پر سورۃ الفیل کی پہلی تفسیر سرسید کی جانب سے تہذیب الاخلاق میں کی گئی۔ سید صاحب چونکہ بذات خود عربیت (علوم لغت عرب) اور ان علوم سے جو قرآن عزیز کے حقائق سمجھنے کے لیے ازبس ضروری ہیں بیگانہ تھے اس لیے ان کی یہ تفسیر سرتا سر اغلاط اور لغو تاویلات پر مبنی ہے اور تفسیر احمدی کے ان دوسرے مقامات کی طرح جس میں انہوں نے خود قرآن عزیز کی دوسری آیات اور نبی معصوم ﷺ سے منقول صحیح روایت کے خلاف تفسیر بالرائے بلکہ تحریف معنوی پر غلط اقدام کیا ہے، اس مقام پر بھی قرآن کی زبان سے وہ کہلانا چاہتے ہیں جس کو قرآن کہنے کے لیے تیار نہیں، اس کے منہ میں وہ بات رکھ دینی چاہتے ہیں جسے خود اس کی زبان قبول نہیں کرتی۔

سرسید کی تفسیر سورۃ الفیل کی بنیاد اس امر پر قائم ہے کہ آیت ﴿وَ اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝﴾ میں "طیر" سے "پرند" نہیں بلکہ "بدفالی" مراد ہے اور کنایۃً یہ لفظ "بلا ومصیبت" کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

مگر سید صاحب اس بات سے قطعاً ناآشنا ہیں کہ عربی لغت میں "طیر" کے معنی "بدفالی" کے ہرگز نہیں آتے اور وہ لفظ "طائر" ہے جس کے معنی بدفالی کے آتے ہیں اور جس سے کنایۃً مصیبت و بلاء کا مفہوم مراد ہو سکتا ہے۔ نیز وہ عربیت کے اس قاعدہ سے بھی قطعاً ناواقف معلوم ہوتے ہیں کہ اگر بفرض محال "طیر" کے معنی "بدفالی" کے تسلیم بھی کر لیے جائیں تب بھی اس مقام پر یہ معنی اس لیے نہیں بن سکتے کہ لغت عرب میں اس معنی کے ہوتے ہوئے اس کی جانب "ارسال" کی نسبت قطعاً غلط اور باطل ہے بلکہ اس کے لیے ﴿اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ﴾ کی جگہ "انزل علیھم" اور "القی علیھم" بولا جاتا ہے۔

حقائق قرآن سے بے بہرہ مگر یورپ کے الحاد و زندقہ سے مرعوب یہ حضرات قرآن کی تفسیر پر جرأت بے جا تو کرتے ہیں مگر اس بات کو یکسر فراموش فرما دیتے ہیں کہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا ہے: ﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا﴾ اور تمام زبانوں کی طرح عربی الفاظ وتراکیب کے لیے بھی کچھ قواعد اور شروط ہیں۔ پس اگر کوئی شخص ان کے خلاف اس کے الفاظ اور اس کے جملوں کے معنی اور مفہوم بیان کرتا ہے تو درحقیقت تحریف معنوی کا مجرم بنتا ہے۔ بہرحال سید صاحب کی تفسیر اس قسم کی اغلاط کا مجموعہ ہے اس لیے علمی مباحث میں جگہ پانے کے لائق نہیں ہے۔

سلف صالحین کے خلاف سورۃ الفیل کی دوسری تفسیر مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ مصنف نظام القرآن کی ہے، یہ تفسیر سلف

اور جمہور کی تفسیر سے قطع نظر کر کے صرف عربیت اور اشعار عرب کے پیش نظر کی گئی ہے اور یہ اگرچہ مولانائے مرحوم کی علمی دیانت، تقویٰ وطہارت اور درک علوم قرآنی کے پیش نظر ان حضرات کی تفاسیر کی فہرست میں شامل نہیں ہے جنھوں نے محض معجزات کے انکار کی بنا پر تفسیر بالرائے کی مجرمانہ جسارت کی ہے تاہم واقعہ کے عجوبہ پن کو دور کرنے کے لیے مولانائے مرحوم کی یہ سعی معنوی استقام کی حال ہے اور اس لیے ہم مولانائے مرحوم کی خدمت قرآن کا احترام کرتے ہوئے ان کے بعض دوسرے تفسیری مقامات کی طرح اس مقام سے بھی اختلاف کرنے پر مجبور ہیں۔

مولانائے مرحوم کی تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ "ترمی" کا فاعل "طیر" نہیں ہے بلکہ "انت" ہے جو "الم تر" کا بھی فاعل ہے اور آیت ﴿وَ اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ﴾ اس حقیقت کا اظہار کرتی ہے جو عام طور پر عربوں کا خیال تھا کہ جب کوئی جرار فوج کسی جانب کا رخ کرتی ہے تو مردار خوار جانوروں کا غول پرے باندھے ساتھ ہوا میں اُڑتا چلتا ہے۔ مثلاً ابونواس کہتا ہے "ہمارے ممدوح کی فوج کے ہمراہ پرندے ہیں کیونکہ ان کو اس کے فاتح ہونے کا یقین ہے" یا بصرہ میں جنگ جمل سے جو صورت حال پیش آئی اس کا حال اسی روز اہل حجاز کو اس لیے معلوم ہو گیا تھا کہ مردار خوار جانور انسانوں کے کٹے ہوئے اعضا پنجوں میں لیے اُڑتے پھرتے تھے۔
اس تفسیر کے پیش نظر سورۃ الفیل کی آیات کے معنی یہ ہوں گے:

"تو نے دیکھا کہ تیرے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ اس نے ان کی تدبیر کو بیکار نہیں کر دیا؟ اس نے ان پر پرندوں کے پرے کے پرے بھیجے تو ان ہاتھی والوں کو پتھروں سے مارتا تھا پھر خدا نے ان کو کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا۔"

اس تفسیر پر حسب ذیل اعتراضات وارد ہوتے ہیں:

① اگر "ترمی" کا فاعل "انت" ہے "طیر" نہیں ہے تو ﴿بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ﴾ میں ﴿سِجِّيْلٍ﴾ کا اضافہ بے ضرورت بلکہ بے معنی ہو جاتا ہے۔

② اس صورت میں ﴿وَ اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ﴾ کی غرض وغایت یا اس کے فائدہ اور مقصد سے خود قرآن خاموش ہے اور اس طرح سورۃ کی آیات کا باہم ربط باقی نہیں رہتا بلکہ نظم وانسجام میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔

③ شعراء عرب کے کلام میں فوج کے ساتھ پرندوں کے غول کا چلنا صرف ایک شاعرانہ تخیل ہے اس لیے قرآن کے بیان کردہ حقائق کی تفسیر کو اس خیال سے وابستہ کرنا صحیح نہیں ہے۔

④ واقعہ کے معاصر یا کچھ عرصہ بعد کے عرب شعراء جب کہ خود اپنے اشعار میں اقرار کرتے ہیں کہ "ترمی" کا فاعل "طیر" ہے نہ کہ "الم تر کی ضمیر انت" (قریش) تو اس سے عدول کیوں اور کس لیے۔

⑤ ﴿فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ﴾ میں "فا" ثمرہ اور نتیجہ ہے "ترمی" کا اور "جعل" کا فاعل "رب" ہے تو معلوم ہوا کہ قریش کی سنگ باری سے ہاتھیوں والی فوج جرار کا کھائے ہوئے بھس کی طرح ہو جانا تب ہی صحیح ہو سکتا ہے کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اعجاز قدرت کا عمل بھی ہو ورنہ بلحاظ اسباب عادیہ یہ صورت قطعاً غیر معقول ہے اور اگر اس میں اعجاز کا دخل ہے تو جس عجیب بات سے بچنے کے لیے سلف کے خلاف تفسیر کو اختیار کیا گیا تھا اسی کو تسلیم کرنا لازم آجاتا ہے۔

Marfat.com

(٦) عرب کی جنگوں میں محض بدویانہ سنگ اندازی کے طریقہ جنگ کے لیے تاریخی سند مطلوب ہے ورنہ خاص اس موقعہ کے لیے طریقہ جنگ کی یہ تفسیر بے سند رہ جاتی ہے اور نا قابل قبول ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بلاغت کا تقاضا ہے کہ جب کسی لفظ کے ساتھ متعلقات کا اضافہ ہو تو ضروری ہے کہ اس کا کوئی فائدہ ہونا چاہیے یعنی اس اضافہ کو کسی مقصد کے لیے لایا گیا ہو ورنہ وہ کلام بلاغت سے گر جائے گا اور اس کا اعجاز بلاغت تک پہنچنا تو معلوم؟ کیونکہ ایسی صورت میں یہ اضافہ بے معنی اور مہمل ہو جاتا ہے حتیٰ کہ اشعار کے تنگ میدان میں بھی بے ضرورت اس کو جائز نہیں سمجھا جاتا۔

دوسرا مقدمہ یہ قابل توجہ ہے کہ "سجیل" لغت عرب میں کنکری کو کہتے ہیں یعنی اگر مٹی کو آگ میں پکایا جائے تو پکنے کے بعد اس میں پتھر کی سی سختی پیدا ہو جاتی ہے اسی مٹی کی چھوٹی چھوٹی ٹھیکریوں کا نام عربی میں سجیل اور فارسی میں "سنگ گل" ہے بلکہ بعض علماء لغت نے تو یہ تصریح کی ہے کہ سجیل فارسی مرکب لفظ "سنگ گل" کی ہی تعریب ہے یعنی "مٹی سے بنا ہوا پتھر" اور یہ ظاہر بات ہے کہ مکہ کے پہاڑوں پر چھوٹے بڑے پتھر تو بہرحال کافی ملیں گے لیکن وہاں سجیل (کنکریوں) کی افراط کے کوئی معنی نہیں۔

پس اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ آیت ﴿تَرۡمِیۡهِمۡ بِحِجَارَةٍ مِّنۡ سِجِّیۡلٍ﴾ میں قریش کی بدویانہ سنگ باری مراد ہے تو اس صورت میں ﴿بِحِجَارَةٍ﴾ کہنا کافی تھا بلکہ "حجارہ" کو سجیل کے ساتھ مخصوص کرنا حقیقت واقعہ کے خلاف ہو جاتا اور ایک غلط بات کا اظہار لازم آ جاتا ہے۔

ممکن ہے کہ جواب میں یہ کہا جائے کہ اس مقام پر سجیل سے پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے یعنی "سنگ ریزے" مراد ہیں تو یہ اس لیے صحیح نہ ہوگا کہ لغت عرب میں پتھر کے چھوٹے ٹکڑے کو "الحصی" کہتے ہیں اور اس کی جمع "حصاۃ" آتی ہے۔ چنانچہ متداول کتب لغت میں بھی بصراحت یہ فرق مذکور ہے "الحصی صغار الحجارۃ الواحدۃ حصاۃ"۔ سجیل الحجارۃ من الطین الیابس" حتیٰ کہ علماء لغت اس فرق کو یہاں تک نمایاں کرتے ہیں کہ جو ٹھیکریاں مٹی کے برتن سے ٹوٹ کر وجود میں آتی ہیں اگرچہ و سجیل کہلائی جا سکتی ہیں تاہم دقیق امتیاز کے وقت لغت عرب میں ایسی ٹھیکری کے لیے لفظ "خذف" [1] مخصوص ہے اور ہم کو یہ حقیقت بھی کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ محققین علماء لغت کا یہ دعویٰ ہے کہ لغت عرب میں ایک لفظ بھی دوسرے لفظ کا مترادف نہیں ہے او جو لفظ بھی فصحاء و بلغاء عرب کے کلام میں استعمال ہوتا ہے وہ اپنی مستقل حیثیت رکھتا ہے اور جن کو ہم مرادف الفاظ سمجھتے ہیں ان باہم جو نازک اور دقیق فرق ہے ان کی خصوصیات ضرور ملحوظ رہتی ہیں۔

غرض مصنف نظام القرآن کی تفسیر سورۃ الفیل کے مطابق اس مقام پر "سجیل" کا ذکر نہ صرف بے ضرورت بلکہ خلاف وا اور بے محل ہو جاتا ہے اور دوسرے اعتراض کا حاصل یہ ہے کہ اگر "ترمی" کا فاعل "طیر" مان لیا جائے جیسا کہ جمہور نے اختیار کیا بغیر کسی خارجی مدد کے آیات سورۃ اپنا مطلب صاف صاف ادا کر دیتی ہیں اور سیاق و سباق کی مطابقت اور کلام کا انسجام اور اس ترتیب بحالہ باقی رہتی ہے۔

---

[1] مشہور اور متداول کتب لغت کا مطالعہ کیجیے۔

Marfat.com

لیکن تفسیر زیر بحث کے مطابق اگر "ترمی" کا فاعل "طیر" نہیں ہے بلکہ "انت" ہے تو اس صورت میں "ارسال طیر" کی غرض و غایت سے قرآن (سورۃ الفیل) قطعاً خاموش نظر آتا بلکہ ربط کلام میں خلل واقعہ ہو جاتا ہے اس لیے کہ آیت ﴿ اَلَمْ یَجْعَلْ کَیْدَھُمْ ﴾ اور ﴿ تَرْمِیْھِمْ ﴾ کے درمیان ﴿ وَ اَرْسَلَ عَلَیْھِمْ ﴾ اپنے مقصد کے لیے قطعاً واضح نہیں ہے اور نہ سیاق و سباق میں اس کی جانب کوئی اشارہ موجود ہے بلکہ یہ کلام اجنبی ہے جو اپنی تصریح کے لیے آپ ہی ذمہ دار ہے اور بغیر تصریح کے باعث خلل کلام ہے اور اگر کلام کی اس اجنبیت کو باہر کی مدد سے حل اور آیت سے پیدا شدہ قدرتی سوال پر اس کی خاموشی کو خارجی تمہید سے دور کیا جاتا ہے تو بلحاظ بلاغت کلام ایسے ابہام و اجمال سے کہ جو خصوصی واقعہ کے سلسلہ میں اس طرح کلام میں موجود ہو کہ سیاق و سباق نہ اس کی وضاحت کرتے ہوں اور نہ اس پر دلالت کرتے ہوں" کلام میں نقص لازم آتا اور بے محل ابہام کا الزام وارد ہوتا ہے۔

تعجب ہے کہ "ارسال طیر" کی غرض و غایت یا حکمت کا اپنی جانب سے اختراع تو درست سمجھا جائے اور بغیر کسی سند کے یہ کہہ دیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پرندوں کو صحن حرم میں افتادہ مردہ نعشوں سے پاک کرنے کے لیے بھیجا تھا اور بقاء ترتیب مضمون آیات اور حفاظت نقص کلام کی خوبیوں کے باوجود خود سورۃ میں ہی جو غایت اور حکمت بیان کی گئی ہے اور جو خارج سے مدد کی قطعاً محتاج نہیں ہے یعنی ﴿ تَرْمِیْھِمْ ﴾ تو اس کو رد کر کے غیر معقول قرار دیا جائے اور خصوصاً ایسی حالت میں کہ مردہ نعشوں سے صحن حرم کی پاکی کے متعلق صحیح تاریخی روایت میں یہ موجود ہے:

و ذکر النقاش فی تفسیرہ ان السیل احتمل جثتھم فالقاہ فی البحر۔ ❶

"اور نقاش نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ سیلاب آیا اور اس نے مردہ نعشوں کو بہا کر سمندر میں جا ڈالا۔"

اور تیسرے اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ بالفرض اگر آیت ﴿ وَ اَرْسَلَ عَلَیْھِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ ۝ ﴾ کی تفسیر صاحب نظام القرآن کے اس استشہاد (کو صحیح تسلیم کر لیا جائے جو بطور تمہید انہوں نے اشعار عرب سے کیا ہے اور آیت کی خاموشی کو ختم کرنے کے لیے اصول بلاغت کو نظر انداز کر دیا جائے تب بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ ابونواس یا نابغہ جیسے شعراء عرب کے کلام میں اگر یہ تخیل پایا بھی جاتا ہے کہ "جب کوئی فوج جنگ کے لیے سفر کرتی تھی تو مردار خوار جانور جھنڈ کے جھنڈ اس کے ساتھ چلتے تھے تو اس تخیل سے یہ کیسے لازم آیا کہ شعراء کا یہ خیال مبنی بر حقیقت ہے اور محض شاعرانہ تخیل نہیں ہے کہ قرآن کی تفسیر کے لیے استشہاد کا کام دے سکے؟ بلکہ جب ہم عرب کی لڑائیوں کے ان تفصیلی حالات کا مطالعہ کرتے ہیں جو اس واقعہ کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان ہوئیں اور جن کے جزئی جزئی حالات اور معمولی معمولی واقعات تک کی تفصیلات کتب سیر و تاریخ میں محفوظ ہیں تو ان میں سے کسی ایک جنگ میں بھی اس حقیقت کا ذکر موجود نہیں ہے کہ مردار خوار پرندوں کے یہ جھنڈ کے جھنڈ مسلم یا مشرک لشکر کی ابتداء مسافت ہی سے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ چنانچہ غزوۂ بدر، اُحد، حنین، احزاب کے حالات اس قسم کے واقعہ سے قطعاً خاموش ہیں بلکہ اس کے خلاف غزوۂ بدر میں اس کا ثبوت تو موجود ہے کہ زعماء قریش کی نعشیں اٹھا کر ایک گڑھے میں ڈال دی گئیں اور یہ ذکر نہیں پایا جاتا کہ مسلمانوں کے یا مشرکین مکہ کے لشکر کے ساتھ مردار خوار پرند شروع ہی سے ہم سفر تھے اور انہوں نے ان مردہ نعشوں کو فوراً ہی ٹھکانے لگا دیا اسی طرح عرب کے علاوہ دنیا کی اور جنگوں میں بھی کہیں اس واقعہ کا ثبوت نہیں ملتا پس اس سے صاف معلوم

❶ البدایہ والنہایہ

Marfat.com

ہوتا ہے کہ شعراء عرب کا یہ کلام شاعرانہ مبالغہ آمیز تخیل سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا دراصل وہ اپنے ممدوح کو بہادری پر مبالغہ آمیزیاں کرتے ہوئے یہ مبالغہ بھی کرتے ہیں کہ انسان تو انسان مردار خوار جانور تک اس کی بہادری کا یقین رکھتے اور اس لیے اس کے لشکر کے ہمراہ چلتے ہیں حالانکہ حقیقت حال صرف اتنی ہوتی تھی کہ جب اس ممدوح نے دشمن کو شکست دے دی تو شکست خوردہ لشکر کی نعشوں پر گدھ چیل وغیرہ مردار خوار جانور نوچنے کھانے کو ٹوٹ گئے، اس عام بات کو شعراء نے شاعرانہ دقیقہ سنجی کے ساتھ ادا کر دیا ہے، کیا ابو نواس کا یہی شعر جو مفسر صاحب نے بطور استشہاد پیش کیا ہے خود ہی یہ ظاہر نہیں کرتا کہ یہ محض شاعرانہ نکتہ سنجی ہے اس لیے کہ وہ کہتا ہے کہ میرے ممدوح کے لشکر کے ہمراہ پرند ہیں کیونکہ ان کو اس کے فاتح ہونے کا یقین ہے تو کیا یہ بھی تسلیم کر لینا چاہیے کہ ان مردار خوار پرندوں کی فراست وکیاست انسانی فراست سے بھی بڑھی ہوئی ہوتی تھی کہ یہ معرکہ جنگ پیش آنے سے پہلے ہی یہ بھی سمجھ جاتے تھے کہ فلاں کو فتح اور فلاں کو شکست ہوگی اور اس لیے فاتح کی فوج کے ہمراہ چلتے تھے نہ کہ مفتوح کی فوج کے ساتھ۔

اور اگر اپنی خیالی تفسیر کی خاطر یہ سب عجیب باتیں تسلیم کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے تو نہ معلوم سلف اور جمہور کی تفسیر ہی کو مان لینے میں کیوں اس قدر جھجک ہے۔

رہا بصرہ میں جنگ جمل کا ہونا اور حجاز میں پرندوں کے ذریعہ اس طرح اصل کیفیت کا حال معلوم ہو جانا کہ وہ انسانوں کے اعضاء کو پنجوں میں لیے اڑتے تھے تو اس سے یہ کیسے لازم آ گیا کہ یہ مردار خوار پرندے طرفین کے لشکر یا جو فاتح بننے والا تھا اس کے لشکر کے ساتھ ساتھ چل کر میدان معرکہ تک پہنچ کر درختوں اور جھاڑیوں میں خیمہ زن ہو گئے تھے کیا بصرہ میں نسر (گدھ) اور زاغ و زغن نہیں تھے اور کیا جو کچھ آج بھی ہوتا ہے وہی وہاں بھی نہیں ہوا ہوگا کہ جنگ کے نتیجہ میں جب میدان میں نعشیں پڑ گئیں تو فوراً ہی چہار جانب کی بعید مسافت سے مردار خوار پرند آ پہنچے اور کٹے ہوئے اعضاء کو پنجوں میں لے اڑے اور فضاء میں ان کے ذریعہ اہل حجاز کو بھی واقعہ کی اصل کیفیت کا پتہ چل گیا۔ چنانچہ گدھ کے لیے تو ماہرین علم الحیوانات کا بیان یہ ہے کہ قدرت نے اس کی قوت شامہ کو اس قدر حساس بنایا ہے کہ وہ مردہ نعشوں کی پھیلی ہوئی بو یا فضاء میں پھیلی ہوئی گوشت کی بو کو بیسیوں میل کی مسافت سے محسوس کر لیتا اور سرعت رفتار کے ساتھ وہاں پہنچ جاتا ہے۔

الحاصل تفسیر زیر بحث میں آیت ﴿وَ اَرْسَلَ عَلَیْهِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ﴾ کی تفسیر کے لیے خارج سے ان اشعار کی مدد لینا جو صرف شاعرانہ تخیل کی پیداوار ہیں اور صحیح تاریخی حقائق سے اعراض کرنا بلکہ خود قرآن کے سیاق وسباق سے ہی بغیر خارجی مدد کے واقعہ کی جو مکمل تصویر بنتی ہے اس سے گریز کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

اس تفسیر پر چوتھے اعتراض کی تفصیل یہ ہے کہ اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ "ترمی" کا فاعل "قریش" ہیں تو آیت ﴿فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ﴾ میں الفاء للجزاء داخل ہو کر یہ ثابت کر رہی ہے کہ اس کا مدخول (یعنی جس جملہ پر وہ داخل ہے) آیت ﴿تَرْمِیْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ﴾ کا ثمرہ اور نتیجہ ہے جس کا مطلب زیر بحث تفسیر کے مطابق یہ ہوا کہ جب قریش نے سنگ باری کے ذریعہ ان پر حملہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمن کو کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا یعنی سب وہیں کھیت رہے اور ہاتھیوں اور انسانوں سب کا کچومر نکل گیا۔

تو سوال یہ ہے کہ قریش کی بدویانہ سنگ باری سے کسی فوج گراں کا کہ جس میں دیو پیکر ہاتھیوں کی قطاریں بھی ہوں اس

Marfat.com

طرح بھرکس نکل جاتا کہ وہ اگر فرار ہو کر جان بچانا بھی چاہیں تو نہ بچ سکیں۔ اسباب عادیہ کے اعتبار سے کیا معقول سمجھا جاسکتا ہے اور کیا عقل یہ نہیں کہتی کہ جب ابرہہ نے یہ دیکھ لیا تھا کہ وہ اور اس کی فوج گراں قریش کی سنگ باری کی تاب نہیں لا سکتے تو اس نے کیوں وہاں رہ کر ساری فوج کا بھرکس نکلوالیا اور کیوں وہ ان ہی وادیوں میں سے ہو کر فرار نہیں ہو گیا جن وادیوں سے ہو کر آیا تھا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قریش کے پاس سنگ باری کے لیے مشینیں نہیں تھی کہ وہ ابرہہ کے لشکر پر ہزاروں من کی مہیب چٹانیں اس عجلت کے ساتھ لڑھکا دیتے کہ تمام لشکری اور ہاتھی گھوڑے اور اونٹ سب کے سب وہیں دب کر رہ جاتے اور کھائے ہوئے بھس کی طرح سب کا کچومر نکل جاتا۔

اور قریش پر خدائے تعالیٰ کا احسان تو اس صورت میں بھی پورا ہو جاتا تھا کہ اس نے ایسے عظیم الشان لشکر کو بدویانہ سنگ باری سے ہزیمت خوردہ بنا کر فرار پر آمادہ کر دیا۔

البتہ یہ بات اس وقت صحیح ہوسکتی اور باور کی جاسکتی ہے کہ اس کو اسباب عادیہ کے عام قانون سے مستثنیٰ قرار دے کر قدرت الٰہی کے معجزانہ عمل کے ساتھ وابستہ سمجھا جائے اور یہ کہا جائے کہ عام طریق جنگ کے خلاف یہ ایک معجزہ تھا مگر اس صورت میں تفسیر زیر بحث کا مقصد فوت ہوا جاتا ہے۔

حقیقت حال یہ ہے کہ قرآن عزیز کی اس سورۃ کا اسلوب بیان از اول تا آخر یہ کہہ رہا ہے کہ یہاں جو صورت حال پیش آئی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے خاص نوامیس قدرت کے زیر اثر ہوئی ہے اور اسی لیے جن لوگوں نے اس واقعہ کو آنکھوں سے دیکھا یا مشاہدہ کرنے والوں کی زبانی سنا ہے وہ اس سے آگاہ ہیں کہ یہ معاملہ کس درجہ عجیب اور کرشمہ قدرت کے زیر اثر کس درجہ حیرت انگیز ہو گزرا ہے اور یہ سبق ہے اور عبرت و بصیرت ہے قریش کے لیے جو اپنی طاقت کے گھمنڈ میں محمد ﷺ اور مسلمانوں کو پیس ڈالنا چاہتے ہیں وہ سمجھیں کہ جس نے کعبہ کی حفاظت کا یہ غیبی انتظام کر دیا وہی آج قبلہ ابراہیمی "کعبہ" کی صحیح عظمت کے داعی کی حفاظت وصیانت کا ضامن ہے۔

غرض غیر مسلح انسانوں کے ذریعہ چھوٹے چھوٹے پتھروں کی سنگ باری سے دیو پیکر ہاتھیوں اور آہن پوش لشکریوں کو فرار کا موقع نہ دے کر موقعہ ہی پر کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دینا اسی طرح عجیب ہے جیسا کہ پرندوں کی ماری ہوئی کنکریوں کا بندوق کی گولی کی طرح لگنا یا ایسے مہلک جراثیم کا حامل ہونا جن سے ایک فوج گراں کھائے ہوئے بھس کی طرح ہو کر رہ جائے مگر یہ کہ تسلیم کیا جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک "معجزانہ نشان" تھا۔

اور اگر اس سے انکار نہیں ہے تو پھر کوئی وجہ وجیہ نظر نہیں آتی کہ سلف اور جمہور بلکہ بلا واسطہ خود آیات قرآنی سے حاصل شدہ تفسیر سے عدول کر کے ایسی تفسیر کیوں اختیار کی جائے جو لغت اور روایات دونوں لحاظ سے اسقام و نقائص کی حامل ہو۔

پانچویں اعتراض کا مقصد یہ ہے کہ زیر بحث تفسیر میں اگر شعراء عرب کے اشعار سے استشہاد کرنا حل مطلب کے لیے ضروری سمجھا گیا تو اس کی کیا وجہ ہے کہ اس کے لیے واقعہ سے متعلق مخصوص اشعار کو جن میں اس واقعہ کے معاصر عبدالمطلب کے اشعار بھی شامل ہیں نظر انداز کر دیا گیا بلکہ ان سے اعراض روا رکھا گیا اور شعراء عرب کے ایک ایسے تخیل کو بطور استشہاد تسلیم کیا گیا جس کا مبنی برحقیقت ہونا خود محل نظر ہے اور جس کے لیے خود آیات قرآنی میں بھی کوئی قرینہ موجود نہیں ہے بلکہ ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ

Marfat.com

اس مقام پر موجودگی طیر کا معاملہ تمام حالات کی بنا پر نہیں تھا بلکہ کرشمہ قدرت نے خاص صورت حال کے ساتھ ان کو بھیجا تھا تب ہی تو ﴿تَرْمِيهِمْ﴾ سے قبل کی آیت میں " ﴿أَرْسَلَ﴾ فرما کر اللہ تعالیٰ نے ان کی آمد کو خاص طور سے اپنی جانب منسوب کیا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ کارخانہ عالم میں جو کچھ بھی حرکت وسکون ہے سب اسی کی قدرت کے ہاتھوں سے ہے۔

نیز ﴿تَرْمِي﴾ کے بعد ﴿فَجَعَلَهُمْ﴾ کہہ کر یہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ "رمی" کا یہ نتیجہ کہ وہ ﴿عَصْفٍ مَّأْكُولٍ﴾ کی طرح ہو گئے ہمارا اپنا فعل تھا جس میں دوسرے کو کوئی دخل نہیں تھا ورنہ اگر پرندوں کا وجود عام حالات کی بناء پر ہوتا اور ﴿عَصْفٍ مَّأْكُولٍ﴾ نتیجہ ہوتا قریش کے عمل سنگ باری کا تو اسلوب بیان یہ نہ ہوتا بلکہ یوں کہا جاتا "ان کے سروں پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ منڈلانے لگے جب کہ تو ان پر سنگ باری کر رہا تھا اور ہو گئے وہ اس سنگ باری سے کھائے ہوئے بھس کی طرح"

الحاصل جب کہ عرب قبل از اسلام اور بعد از اسلام دونوں زمانوں میں شعراء عرب کے وہ اشعار موجود ہیں جن میں صاف صاف اس کا اقرار ہے کہ واقعہ کی نوعیت وہی ہے جس کو روایات سلف ظاہر کرتی ہیں تو ان سے اعراض اور شعراء کے ایک عام تخیل سے استشہاد ہرگز درست نہیں ہوسکتا۔

چنانچہ عبدالمطلب کے وہ اشعار جو اس سے قبل ذکر میں آچکے ہیں اس حقیقت کا صاف صاف اعلان کرتے ہیں کہ قریش نے ابرہہ کے لشکر کے مقابلہ میں طاقت مقاومت نہ دیکھتے ہوئے جنگ سے اعراض کیا اور وہ کعبہ کو رب کعبہ کے حوالہ کر کے پہاڑیوں پر پناہ گزیں ہو گئے اور حالات کا انتظار کرنے لگے عبدالمطلب کہتے ہیں:

لا هم ان العبد يمنع رحاله فامنع رحالك

"ہم اگرچہ عاجز ہونے کی وجہ سے شہر سے جا رہے ہیں لیکن یہ کوئی غم کی بات نہیں ہے ہر شخص اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے خدایا تو بھی اپنے گھر کی حفاظت کر۔"

اور آخر میں دشمن کے مقابلہ سے اپنے عجز اور درماندگی اور بظاہر اسباب کعبہ کی حفاظت سے مایوسی کے اثرات کا ان الفاظ میں اظہار کرتے ہیں:

ان كنت تاركهم و كعبتنا فامر ما بدالك

"اور اگر تیرا یہی منشاء ہے کہ وہ ہمارے کعبہ کے متعلق اپنا منشاء پورا کرلیں تو پھر جو تیرا جی چاہے وہ حکم فرما۔"

عبدالمطلب، واقعہ اصحاب فیل کے معاصر ہیں، سردار قریش ہیں اور ان کی جانب سے جنگ صلح کے ضامن ہیں وہ اقرار کر رہے ہیں کہ قریش دشمن کے مقابلہ سے عاجز ہو کر کعبہ اور ابرہہ کے معاملہ کو سپرد بخدا کر کے نتیجہ کے منتظر ہیں مگر اس کے برخلاف زیر بحث تفسیر اصرار کرتی ہے کہ قریش نے ضرور ابرہہ کے لشکر سے جنگ کی اور ان کو تباہ و ہلاک کر دیا۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

واقعہ سے متعلق یہ اشعار تمام کتب سیر میں بسند صحیح مذکور ہیں نیز عام روایات کی طرح اس واقعہ سے متعلق دورائے تک موجود نہیں ہیں بلکہ صرف ایک ہی قول تاریخی تواتر سے منقول چلا آتا ہے مگر افسوس کہ پھر بھی وہ قابل توجہ نہیں سمجھا جاتا۔

علاوہ ازیں اگر فرض کر لیجئے کہ یہ اشعار عبدالمطلب کی جانب غلط منسوب ہیں تب بھی ان اشعار سے یہ تو بہرحال ثابت ہوتا

Marfat.com

ہے کہ جن اہل عرب اور اہل حجاز کے سامنے قرآن، واقعہ فیل کو بیان کر رہا ہے ان کے یہاں قبل از اسلام اس واقعہ سے متعلق یہی روایت مسلم تھی جو ان اشعار کے ذریعہ ظاہر کی گئی ہے اور اسی کو انہوں نے اپنے بزرگوں کی زبانی سنا یا واقعہ کا خود مشاہدہ کیا تھا اور اسی لیے عرب بعد الاسلام کے تمام شعراء بھی اپنے اشعار میں بلا خلاف اسی حقیقت کا اظہار کرتے چلے آئے ہیں۔

عبداللہ بن ربعری سہمی اس واقعہ کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

سائل امیر الحبش عنها مارانی
فلسوف بینی الجاهلین علیهما
ستون الفا لم ینوبوا ارضهم
بل لم یعش بعد الایاب سقیمها

"حبشہ کے سردار سے معلوم کرو کہ اس نے کیا کچھ دیکھا، عنقریب ناواقفوں کو اس واقعہ سے خبردار لوگ واقف کر دیں گے۔ ساٹھ ہزار لشکریوں میں سے کسی کو وطن لوٹنا نصیب نہیں ہوا اور اگر کوئی اِکا دُکا زخم خوردہ بھاگ نکلا تو وہ بھی خدائی مار کے زخموں سے نہ بچ سکا۔"

اور عبداللہ بن قیس کہتے ہیں:

کاده الاشرم الذی جاء بالفیل فولی وجیشه مهزوم
و أستهلت علیهم الطیر بالجندل حی کانه مرجوم

"ابرہۃ الاشرم نے یہ تدبیر چلی کہ کعبہ کے گرانے کو ہاتھیوں کو لے کر آیا پس وہ بھاگا اور اس کا لشکر بھی شکست خوردہ ہو گیا جب کہ پرندوں کے لشکر ان پر کنکریوں کی بارش کرتے ہوئے پرے کے پرے آپہنچے اور سارا لشکر سنگسار ہو کر رہ گیا۔"

اور ابو قیس بن اسلت انصاری ابرہہ کے لشکر کی تباہی کے لیے خدائی مدد کا اس طرح ذکر کرتے ہیں:

فلما أتاکم نصر ذی العرش ردهم
جنود الملیک بین ساف وحاصب
فولوا سرأعا هاربین و لم ینوب
الی أهله بحبش غیر عصانب

"پھر جب عرش والے کے پاس سے تمہارے لیے مدد آ پہنچی تو ابرہہ اور اس کے لشکر کا خدائی لشکر (پرندوں کے غول) نے منہ پھیر دیا جب کہ وہ ٹھیکریاں اور کنکریاں برسا رہا تھا پس سارا لشکر جلد ہی شکست کھا کر بھاگا اور ان میں سے چند معمولی ٹولیوں کے سواء کوئی بھی حبشہ تک نہ پہنچ سکا اور سب یہیں ہلاک و تباہ ہو کر رہ گئے۔"

چھٹے اعتراض کی تفصیل یہ ہے کہ قبل از اسلام اور بعد از اسلام عرب کی مشہور حروب کی تاریخی تفصیلات اشعار عرب، کتب سیرت اور مسلم و غیر مسلم تواریخ میں موجود ہیں جن میں مذہبی ملکی اور قومی ہر قسم کی جنگوں کے تذکرے پائے جاتے ہیں مگر ایک جنگ کے متعلق بھی یہ ثابت نہیں ہے کہ اہل عرب یا قریش نے محض بدویانہ سنگ باری کی جنگ کی ہو بلکہ اس زمانہ کے متداول اسلحہ تلوار، تیر

Marfat.com

اور تبر وغیرہ سے ہی وہ جنگ کیا کرتے تھے جس میں منجنیق (گوپھن) کا بھی استعمال ہو جایا کرتا تھا اور اگر یہ تسلیم نہیں ہے تو اشعار عرب اور تاریخ عرب سے کوئی سند دکھائی جائے کہ محض سنگ باری کی جنگ کا کون سا مشہور یا غیر مشہور واقعہ تاریخ میں مذکور ہے کیونکہ تاریخ تو آج تک یہی کہتی چلی آتی ہے کہ اہل عرب تلوار کے دھنی اور بات بات پر ان کے درمیان تلوار کا نیام سے نکل آنا روزمرہ کا مشغلہ تھا۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ بدویانہ سنگ باری کا یہ طریقہ اس خاص واقعہ میں پیش آیا اور اس کے ثبوت کے لیے یہی اول اور آخر مثال ہے تو پھر خود اس مخصوص واقعہ کے لیے تاریخی ثبوت چاہیے تا کہ یہ متعین ہو سکے کہ سلف اور جمہور سے منقول تفسیر غلط اور یہ جدید تفسیر ہی صحیح تفسیر ہے حالانکہ اس کے لیے کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں۔

پس اگر نہ خود عرب کے واقعات جنگ میں اس کی مثالیں موجود ہیں اور نہ خاص اس واقعہ کے لیے کوئی تاریخی شہادت پائی جاتی ہے بلکہ اس کے برعکس حجاز کی قوی روایات، تاریخی وقائع اور سلف صالحین کی نقول و روایات سے باتفاق یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابرہہ کے لشکر جرار کے مقابلہ میں قریش نے کوئی جنگ نہیں کی اور وہ تاب مقاومت سے عاجز ہونے کی وجہ سے کعبہ کو رب کعبہ کے بھروسہ پر چھوڑ کر پہاڑی پر پناہ گزیں ہو گئے تھے تو محض عربیت کے پیش نظر دو احتمالات میں سے ایسے احتمال کو اختیار کرنا جو بقاعدۂ عربیت بھی اسقام کا حامل ہے اور تاریخی شہادات اور سلف کی روایات کے بھی خلاف ہے نا قابل قبول ہے۔

اس مقام پر یہ حقیقت بھی آشکارا ہو جانی چاہیے کہ کتب تفسیر و سیر میں چونکہ بکثرت ایسی روایات پائی جاتی ہیں جن کی نسبت سلف صالحین کی جانب بسند صحیح ثابت ہو جانے کے بعد بھی محققین علماء تفسیر یہ کہہ کر اس کے قبول و تسلیم کی قیمت گھٹا دیتے ہیں کہ یہ روایت اسرائیلیات میں سے ہے یعنی گو اس کی نسبت حضرت عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن مسعود، ابوہریرہ رضی اللہ عنہم کی جانب بلحاظ سند روایت صحیح ہے لیکن وہ ان روایات میں سے نہیں ہے کہ جو نبی معصوم ﷺ کے قول و عمل یا تقریر و تثبیت سے تعلق رکھتی اور اس بناء پر سلف کا مسلک قرار دی جا سکتی ہو بلکہ حضرت عبداللہ بن سلام، وہب بن منبہ اور کعب احبار جیسے بزرگوں کی ان حکایات و اقوال سے ماخوذ ہے جو یہ حضرات تبحر علماء یہود میں سے ہونے کی بنا پر اسلام لانے کے بعد مسلمانوں کی مجالس میں بیان کیا کرتے تھے اور نبی اکرم ﷺ کی اس اجازت کے پیش نظر کہ مسلمانوں کو توراۃ اور اسرائیلی روایات کی نقل اس حد تک جائز ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات کے خلاف نہ ہو" مسلمان روایات کو بطور حکایت نقل کر دینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے اس لیے سورہ الفیل کی تفسیر میں بھی کیا یہ امکان ہے کہ "ترمی" کا فاعل "طیر" کو مان کر سلف سے جو روایات منقول ہیں وہ بھی اسی قسم کی اسرائیلی حکایات ہوں کہ جن کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ آیات کی یہ تفسیر سلف اور جمہور کا متفقہ مسلک نہیں ہے تو اس کا جواب نفی میں ہوگا اور یہ اس لیے کہ جس زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا اور جس وقت سورہ الفیل کا نزول ہوا دونوں زمانوں میں اس واقعہ سے کعبہ کی عظمت کے مقابلہ میں عیسائیت کی سخت توہین لازم آتی ہے اور اسی بنا پر جدید یورپین مؤرخین بھی اس توہین سے تلملا کر جو قدرت کے ہاتھوں عیسائیت کو کعبۃ اللہ کی عظمت کے مقابلہ میں پیش آئی تھی اس واقعہ کی بے سند اور دور از کار تاویلات کرتے نظر آتے ہیں اور جب کہ یہود اور علماء یہود بھی اپنی روایتی حاسدانہ خو کی وجہ سے اس مرکز توحید کی عظمت کو برداشت نہیں کر سکتے تھے جو بوڑھے پیغمبر ابراہیم علیہ السلام کی اسماعیلی شاخ کی اسرائیلی شاخ پر برتری کا باعث بنا ہے تو بے شبہ یہ کہنا مبنی برحقیقت ہوگا کہ جس واقعہ کی اشاعت

Marfat.com

یہود و نصاریٰ کو ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں ہو سکتی اس سے متعلق روایات کو اسرائیلیات اور اسرائیلی روایات کی طرح نہیں کہا جا سکتا بلکہ ان روایات کی صداقت کی سب سے بڑی دلیل ہی یہ ہے کہ جس وقت سورۃ الفیل کا نزول ہوا ہے واقعہ کو گزرے ابھی پچاس سال سے زیادہ نہیں ہوئے تھے مگر پھر بھی کسی مخالف جماعت یا فرد کو اس کی تکذیب کی جرات نہ ہو سکی اور کسی ایک شخص نے یہ تک نہ کہا کہ آیات الفیل کا دعویٰ صحیح ہو یا نہ ہو لیکن قریش میں اس کے متعلق جس قسم کی باتیں مشہور ہیں وہ سرتا سر غلط ہیں اور اگر تکذیب کی گئی ہوتی تو تاریخ اس کو اپنے سینہ میں اسی طرح محفوظ رکھتی جس طرح اسلام کے مخالفوں کی ہر قسم کی ہرزہ سرائیوں اور معاندانہ واقعات و احوال کو آج محفوظ رکھا ہے۔

پس ایک منصف مزاج اور طالب حق انسان کا فرض ہے کہ وہ اس حقیقت کا اعتراف کرے کہ سورۃ الفیل سے متعلق واقعہ کی تفصیلات جس طرح عرب روایات اور شعراء عرب کے اشعار اور سلف سے منقول تفاسیر میں منقول ہیں وہی صحیح تفسیر ہے۔

سلف سے منقول سورۃ الفیل کی تفسیر اس لیے بھی قابل قبول ہے کہ اس کے مطابق وہ اسقام نہیں پیدا ہوتے جو جدید تفسیر کی صورت میں پیدا ہوتے ہیں اور یہ اس لیے کہ اگر ہم خارج کی شرح و تفصیل سے قطع نظر صرف قرآن کی آیات کے معانی ہی میں محدود رہ کر تفسیر کریں تو ربط آیات اور ترتیب مضمون اور انسجام سورہ یہ سب امور بغیر کسی وقت و تاویل کے قائم رہتے اور آیات کے معنی ہوتے ہیں۔

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے ہاتھیوں والوں کے ساتھ کیا کیا۔ کیا ان کی شر آمیز تدبیر کو بیکار نہیں کر دیا اور اس نے ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیئے جو ان پر کنکریاں پھینک رہے تھے پس کر دیا پروردگار نے ان کو کھائے ہوئے بھس کی طرح۔

آیات کے اس صاف اور صحیح ترجمہ پر غور فرمایئے کہ کس طرح ایک آیت دوسری آیت کے ساتھ مربوط اور بغیر کسی اضافہ مضمون کے خود ہی پوری حقیقت کا اظہار کر رہی ہے البتہ قرآن میں مذکور معجزات کے سلسلہ الذہب میں ایک کڑی کا ضرور اضافہ کرتی ہے۔ اور قرآن سے باہر عرب روایات نثر و نظم اس صاف اور واضح حقیقت کے لیے بغیر کسی اضافہ کے صرف تفصیل واقعہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

جمہور سلف کے خلاف سورۃ الفیل کی تفسیر ایک جدید مدعی تفسیر علوم قرآن نے بھی کی ہے جدید مفسر صاحب چونکہ نبی معصوم ﷺ سے منقول احادیث صحیحہ کو بھی ادلہ شرعیہ سے خارج سمجھتے اور انکار حدیث کو اپنا مسلک بنائے ہوئے ہیں اور خدمت مذہب کے نام سے اپنے مضامین میں اس الحاد کو خاص رنگ میں پیش کر کے انکار حدیث کی تبلیغ فرماتے رہتے ہیں اس لیے ظاہر ہے کہ ان کی نگاہ میں سلف صالحین کے مسلک کی کیا پرواہ ہو سکتی تھی۔

سورہ الفیل کی یہ تفسیر اگرچہ مصنف نظام القرآن ہی کی تفسیر سے ماخوذ ہے مگر چونکہ جدید مفسر صاحب حقیقتاً علوم عربیت اور علوم قرآن دونوں سے ناواقف ہیں اور بایں ہمہ مختلف زبانوں میں قرآن کی تفاسیر بکثرت وجود میں آنے کے باعث ارزاں شہرت حاصل کرنے کے لیے مفسر بننا چاہتے ہیں اس لیے انہوں نے نظام القرآن میں مسطور تفسیر کے علمی پہلوؤں سے گریز کرتے ہوئے خطابیات کے طریقہ پر آیات کے مفہوم و معانی سے جدا اپنی جانب سے چند ایسے اضافوں کے ساتھ اس کو پیش کیا ہے جن کو دیکھ

Marfat.com

کر صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ایسے کلام کی تفسیر کر رہے ہیں جو ان کے خیال میں خود اپنے اداء مقصد میں کوتاہ اور اپنے اسلوب بیان میں ناقص ہے اور محتاج ہے ایسے چند اضافوں کا جن کے ذریعہ اس کی تکمیل ہو سکے اور جو اس کے سقم اور نقص کو دور کر سکیں چنانچہ فرماتے ہیں:

جزئی تفاصیل میں جانے کے بغیر یوں سمجھو کہ اہل مکہ کی ایک مخالف قوت (ابرہہ) نے چاہا کہ قریش پر حملہ کیا جائے لیکن اس انداز سے کہ حملہ اچانک ہو اور قریش کو بے خبر جا پکڑا جائے۔ چنانچہ اس کے لیے اس نے ایسا راستہ اختیار کیا کہ وہ وادیوں میں چھپتا چھپاتا مکہ تک آ پہنچے اور فوج کے مہیب ہاتھی انہیں کچل ڈالیں یہ تھی اس کی خفیہ تدبیر (کید) اس تدبیر کے مخفی رکھنے کے لیے اس نے پورا پورا اہتمام کر لیا لیکن مشیت کا منشاء اہل مکہ کا بچانا تھا اس لیے اس مہم میں ایک ایسی کڑی ساتھ جا لگی جس سے یہ تمام اسکیم ناکام ہو کر رہ گئی جس زمانہ میں بارود اور بم زمین کے ساتھ آسمان کو بھی آتش زار نہیں بنایا کرتے تھے بڑے لاش خور پرندے مثل گدھ چیل فوجوں کے ہمراہ ہو جاتے جوں ہی کوئی فوج نقل و حرکت کرتی یہ اپنی خدا داد فراست سے اندازہ کر لیتے کہ اب رزق کا سامان پیدا ہونے لگا ہے ہاتھیوں والی فوج نے اپنی نقل و حرکت کو اہل مکہ سے چھپائے رکھا لیکن ان پرندوں کے جھنڈ طیراً ابابیل کے معنی جھنڈ کے جھنڈ ہیں نہ کہ وہ ابابیلیں جو سر شام ہمارے ہاں اُڑتی پھرا کرتی ہیں اس فوج پر منڈلاتے ہوئے ساتھ ہوئے اور یوں زمین کی مخفی تدبیر کا راز آسمان کے پرندوں نے کھول دیا اہل مکہ جانتے تھے کہ اس قسم کے پرندوں کی پرواز کا کیا مطلب ہوتا ہے اور اس دھوئیں سے نیچے کی آگ کا پتہ پا گئے اور پہاڑوں پر چڑھ کر ایسا پتھراؤ کیا کہ فوج کا ہاتھیوں سمیت بھرکس نکل گیا۔ قرآن کریم نے اہل مکہ کو اس واقعہ کی یاد دلائی ہے۔ ❁

اس تفسیر پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں ان کا تفصیلی ذکر تو مصنف نظام القرآن کی تفسیر سورۃ الفیل کے سلسلہ میں آ چکا اس لیے یہ بر خود غلط مقلدانہ تفسیر قابل اعتناء نہیں ہے البتہ اس میں اپنی جانب سے نئے اضافات کر کے قرآن کو جو لقمے دیئے گئے ہیں ان کی خرافت کا اظہار از بس ضروری ہے مفسر جدید نے ان اختراعی اضافات کو اس لیے بیان کیا ہے کہ ان کی گڑھی ہوئی تفسیر کے مطابق آیات کے مفہوم و معنی میں جو سقم پیدا ہو جاتا ہے اس کو دور اور ربط آیات میں جو خلا واقع ہو جاتا ہے اس کو پر کر دیا جائے۔

ایک جانب مصنف نظام القرآن کے تفسیری مطالب کا اپنی جانب انتساب اور دوسری جانب تقلیدی مضمون میں مجتہدانہ غیر علمی اضافات کی اپج ان دونوں باتوں نے مل کر جدید مفسر صاحب کی تفسیر سورۃ الفیل کو طرفہ معجون بنا دیا ہے۔

آپ ایک مرتبہ پھر نشان زدہ عبارت کا مطالعہ فرمائیں اور ساتھ ہی سورۃ الفیل کی آیات کے سادہ معانی پر بھی توجہ دیتے جائیں تو آپ خود ہی حیرت و تعجب میں پڑ جائیں گے کہ اصحاب الفیل کے واقعہ سے متعلق یہ تمام کڑیاں جو جدید مفسر صاحب نے بیان فرمائی ہیں کہاں سے حاصل ہوئیں۔

سورۃ الفیل کی آیات میں تو ان باتوں کا پتہ تک نہیں ہے پھر نہیں معلوم کہ جدید مفسر صاحب نے ان کو کہاں سے اخذ کیا جب کہ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ واقعہ سے متعلق روایات کو غلط اور تل کے اوٹ پہاڑ کی طرح سمجھتے ہیں اور جو کچھ کہہ رہے ہیں خود قرآن کے اندر سے کہہ رہے ہیں کیونکہ واقعہ سے متعلق روایات تو مفسر صاحب کے اضافوں کے برعکس یہ بیان کرتی ہیں:

❁ طلوع اسلام نمبر ۱۴۱ ص ۵۸

Marfat.com

① ابرہہ اپنی فوج گراں لے کر کہ جس میں بہت سے ہاتھی بھی شامل تھے علی الاعلان یمن سے مکہ کے لیے نکلا تھا اور اسی لیے راہ میں بعض قبائل عرب نے مزاحمت کی اور ناکام رہے۔
② ابرہہ کے اس خروج کی تمام اقطاع عرب میں شہرت ہو گئی تھی۔
③ اس لیے ابرہہ کی تدبیر جنگ خفیہ نہیں بلکہ علانیہ تھی۔
④ ابرہہ نے حجاز پہنچ کر عبدالمطلب سے صاف کہہ دیا تھا کہ مجھے قریش سے کوئی سروکار نہیں میں تو کعبہ کے انہدام کے لیے آیا ہوں۔
⑤ عبدالمطلب اور قریش نے تاب مقاومت نہ رکھتے ہوئے مقابلہ نہیں کیا بلکہ پہاڑی پر چلے گئے۔
⑥ مشیت کا منشاء کعبہ کی حفاظت تھی نہ کہ قریش کا بچانا کیونکہ ابرہہ کعبہ ہی کو گرانے آیا تھا۔

اب جب کہ نہ قرآن ہی میں ان اضافوں کا ذکر ہے جن کو جدید مفسر صاحب نے بڑے شدومد سے بیان کیا ہے اور نہ ان کی بیان کردہ تفصیلات کے لیے کوئی تاریخی یا حدیثی سند موجود ہے تو ایسی تفصیلات پر مبنی تفسیر بلاشبہ تفسیر بالرائے اور قطعاً غلط اور مہمل ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ مفسر صاحب کے ان تمام اضافوں کی بنیاد صرف لفظ "کید" ہے جو سورۃ الفیل کی آیت ﴿ اَلَمْ یَجْعَلْ کَیْدَهُمْ ﴾ میں مذکور ہے اور جس کے معنی انہوں نے "خفیہ تدبیر" کے کیے ہیں۔

لیکن یہ بات بھی لغو ہے اس لیے کہ اول تو فقط لفظ "کید" سے یہ داستان طویل کس طرح وجود میں آ سکتی ہے تاوقتیکہ اس کے لیے قرآن کے اندر یا باہر سے کوئی سند موجود نہ ہو دوسرے لغت عرب میں "کید" کے معنی "خفیہ تدبیر" کے لیے ہرگز مخصوص نہیں ہیں بلکہ کبھی وہ "شرآمیز تدبیر" کے مفہوم کو ادا کرتا ہے خواہ علانیہ ہو یا خفیہ اور کبھی "مطلق جنگ" کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔

الکید، الحیلہ، المکر، الخبث، الحرب اور ان سب معانی میں "شرآمیز تدبیر" کا مفہوم مشترک ہے بلکہ خود قرآن نے لفظ کید کو مختلف مقامات پر "مطلق تدبیر" اور طریق کار کے معنی میں یا علانیہ تدبیر کے معنی میں استعمال کیا ہے سورۂ حج میں ہے:

﴿مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ۝﴾ (الحج: ۱۵)

"جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو دنیا اور آخرت میں کوئی مددگار نہیں دے گا (یعنی خدا سے ناامید ہے) تو اس کو چاہیے کہ آسمان کی بلندی تک رسی کھینچ لے جائے اور جب اس کو پکڑے ہوئے معلق ہو تو چاہیے کہ اس کو کاٹ ڈالے پھر دیکھے کہ اس کی تدبیر اور اس کا یہ طریق کار کیا اس چیز کو کھو دے گا جو اس کو غصہ میں لاتی ہے (یعنی خدا سے ناامید ہونا ایسا ہے جیسا کہ کوئی شخص کسی بلندی پر رسی باندھ کر چڑھے اور پھر بیچ میں پہنچ کر اس کو کاٹ ڈالے)۔"

اس مقام پر "کید" کے معنی فقط طریق کار" اور مطلق تدبیر کے ہیں اور خفیہ اور علانیہ دونوں شرطوں سے آزاد۔

اور سورۂ انبیاء میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں ہے:

﴿قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَ انْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۝ قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۝ وَ اَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ۶۸-۷۰)

Marfat.com

"کافروں نے کہا تم اس (ابراہیم علیہ السلام) کو آگ میں جلا ڈالو اور اپنے معبودوں (بتوں) کی مدد کرو اگر تم کرنا چاہتے ہو ہم نے کہا (اللہ تعالیٰ نے کہا) اے آگ تو ابراہیم پر ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی کی چیز بن جا اور انہوں نے (کافروں نے) ابراہیم کے ساتھ بری تدبیر کا ارادہ کیا پس ہم نے ان کو ہی خسارہ اٹھانے والوں میں کر دیا۔"

اور سورۂ الصافات میں ہے:

﴿قَالُوا ابْنُوا لَهٗ بُنْيَانًا فَأَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ ۝ فَأَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ۝﴾ (الصافات: ۹۷-۹۸)

"انہوں نے (مشرکوں نے) کہا بناؤ اس کے (ابراہیم علیہ السلام کے) لیے ایک عمارت (یعنی آگ کی بھٹی) پھر ڈال دو اس کو آگ کی بھٹی میں پس انہوں نے اس کے ساتھ بری تدبیر کا ارادہ کیا سو کر دیا ہم نے ان کو ذلیل و خوار۔"

ان ہر دو مقامات کا سیاق کلام یہ ہے کہ جب مشرکین ابراہیم علیہ السلام کے واضح اور روشن دلائل توحید کے مقابلہ میں لاجواب اور عاجز ہو گئے تو قبول حق کی بجائے غیظ و غضب میں آ کر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ شخص چونکہ ہمارے معبودوں (بتوں) کے حق میں گستاخ ہے اس لیے اس کو آگ کی بھٹی میں ڈال کر زندہ جلا دو، ابراہیم علیہ السلام اس فیصلہ کو سن رہے تھے مگر انہوں نے مطلق کوئی پرواہ نہیں کی اور اپنے اعلان حق پر قائم رہے۔

قرآن نے مشرکین کے اس فیصلہ کو "کید" سے ہی تعبیر کیا ہے حالانکہ وہ خفیہ نہیں تھا بلکہ اعلانیہ تھا۔

غرض جب کہ "کید" خفیہ تدبیر کے لیے مخصوص نہیں ہے تو جب تک وضاحت کلام یا واضح قرینہ اس کا متقاضی نہ ہو کہ فلاں مقام پر "کید" کے معنی "خفیہ تدبیر" کے ہونے چاہئیں اس لفظ کو اس معنی کے ساتھ مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔

اور ظاہر ہے کہ سورۃ الفیل میں اس تخصیص کے لیے نہ کوئی وضاحت موجود ہے اور نہ کوئی واضح قرینہ حتیٰ کہ خود جدید مفسر صاحب کے بیان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے پاس اپنی بیان کردہ خفیہ تدبیر کی داستان کے لیے لفظ "کید" کے سوا نہ قرآن کے اندر سے کوئی ثبوت موجود ہے اور نہ باہر ہے اس لیے انہوں نے ابرہہ کی لشکر کشی سے متعلق داستان بیان کرتے ہوئے بے سند یہ کہنے پر اکتفا کیا ہے یہ بھی اس کی خفیہ تدبیر "کید" اور یہ بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ "کید" کی یہ تفصیل انہوں نے کہاں سے حاصل کی ہے؟

یہ سوال اس لیے اور بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس مقام پر "کید" کے معنی "خفیہ تدبیر" ہی کے ہیں تب بھی تو یہ ضروری نہیں ہے کہ خفیہ تدبیر کی تفصیلات وہی ہوں جو جدید تفسیر میں بیان کی گئی ہیں کیونکہ "خفیہ تدبیر" کو کسی خاص تفصیل کے اندر محدود کرنے کے لیے دلیل اور سند درکار ہے۔

نیز جب کہ سورۃ الفیل میں "اصحاب الفیل" کا ذکر ایک واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے تو اس سلسلہ میں محض احتمالات عقلی بے معنی ہیں بلکہ از بس ضروری ہے کہ واقعہ کے بنیادی اجزاء و تفاصیل خود قرآن میں موجود ہوں اور مفسرین کے ذہنی اختراع و ایجاد کے محتاج نہ ہوں اور پھر فروعی تفاصیل بھی اگر بیان کی جائیں تو ان کے لیے بھی داخلی یا خارجی سند صحیح کا ہونا ضروری ہے ورنہ تو واقعہ واقعہ نہیں رہے گا بلکہ ہر شخص کی دماغی اپج کا کھلونا بن کر رہ جائے گا۔

جدید تفسیر میں خفیہ تدبیر کی بیان کردہ تفصیلات کے متعلق ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ آیت ﴿وَّ اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝﴾ میں "ارسال طیر" اور "کید" دونوں مل کر اس تفصیل کو ظاہر کرتے ہیں تو یہ کہنا لغو اور بے سود ہے اس لیے کہ اس آیت میں تو

Marfat.com

صرف یہ کہا گیا ہے کہ "بھیج دیئے ہم نے ان پر پرند جھنڈ کے جھنڈ اور جدید مفسر صاحب یہ فرما چکے ہیں کہ آسمانی فضا میں بارود اور بموں کے استعمال سے قبل مردار خوار جانور لشکروں کے ساتھ ساتھ اس لیے منڈلاتے ہوئے چلتے تھے کہ ان کی فراست راہنمائی کرتی تھی کہ اب ان کی غذا کا سامان مہیا ہونے والا ہے اور شعراء عرب کے اشعار سے مصنف نظام القرآن بھی یہ استشہاد کر چکے ہیں کہ جب دو فریق میدان جنگ میں نبرد آزما ہونے کے لیے اپنی جگہ سے روانہ ہوتے تھے تو ان کے سروں پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ اُڑتے ہوئے چلا کرتے تھے تاکہ مردہ نعشوں سے غذا حاصل کریں۔

تو تفسیر جدید کے مطابق ان دونوں باتوں کا حاصل زیادہ سے زیادہ یہ نکل سکتا ہے کہ آیت ﴿وَ اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝﴾ یہ ظاہر کرتی ہے کہ عام حالات جنگ کی طرح اس جگہ بھی اللہ تعالیٰ نے ابرہہ کے لشکر پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیے کہ وہ اس کی مردہ نعشوں سے غذا حاصل کریں لیکن "خفیہ تدبیر" کی یہ تفصیلات کہ:

① قریش پر اس انداز سے حملہ کیا جائے کہ حملہ اچانک ہو اور قریش کو بے خبر جا پکڑا جائے۔

② چنانچہ اس نے ایسا راستہ اختیار کیا کہ وادیوں میں چھپتا چھپاتا مکہ تک آ پہنچے۔

③ لیکن مشیت کا منشا چونکہ اہل مکہ کا بچانا تھا اس لیے اس میں ایک ایسی کڑی ساتھ جا لگی جس سے یہ تمام اسکیم ناکام ہو کر رہ گئی (وہ یہ کہ) پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ اس فوج پر منڈلاتے ہوئے ساتھ ہو گئے اور یوں زمین کی مخفی تدبیر کا راز آسمان کے پرندوں نے کھول دیا۔

④ اہل مکہ جانتے تھے کہ اس قسم کے پرندوں کی پرواز کا کیا مطلب ہوتا ہے وہ اس دھوئیں سے نیچے کی آگ کا پتہ پا گئے نہ آیت ﴿وَ اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝﴾ سے ظاہر ہوتی ہیں اور نہ "کید" سے اور نہ دونوں کو باہم ملا کر مطلب حاصل کرنے سے ان تفصیلات کا ثبوت بہم پہنچتا ہے بلکہ یہ تک ظاہر نہیں ہوتا کہ اصحاب الفیل نے جو کید کیا تھا وہ "خفیہ تدبیر" کی ہی صورت میں تھا۔

یہی وجہ ہے کہ جدید تفسیر میں بایں ادعاء تردید مسلک سلف صالحین رحمہم اللہ خفیہ تدبیر کی ان تفصیلات کے لیے کوئی ثبوت بہم نہ پہنچایا جا سکا اور جو کچھ کہا گیا صرف دماغی اختراع سے کہا گیا ہے اور اگر جدید مفسر صاحب کے پاس ان کے لیے کوئی سند داخلی یا خارجی موجود ہے تو اس کے لیے صرف یہی کہا جا سکتا ہے: ﴿ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ ﴾

تفسیر زیر بحث میں واقعہ سے متعلق تفصیلات کو اپنی جانب سے گھڑ کر جو شکل و صورت دی گئی ہے اس میں جدید مفسر صاحب نے جگہ جگہ اس پر زور دیا ہے کہ اصحاب فیل کا مقصد قریش پر حملہ کرنا اور ان کو تباہ و برباد کرنا تھا اور مشیت کا منشا ان کو بچانا تھا اسی لیے سب کچھ ہوا جو سورۃ الفیل میں مذکور ہے لیکن ان تاریخی تفصیلات سے اگر قطع نظر بھی کر لی جائے جو واقعہ سے متعلق کتب سیر و تاریخ میں مذکور ہیں اور جو بے تکلف سورۃ الفیل کی آیات کی تفسیر یا تفصیل کرتی ہیں تب بھی بخاری و مسلم (صحیحین) کی احادیث، تفسیر جدید کے اس بنیادی مقدمہ کے قطعاً خلاف فیصلہ دیتی ہیں اور یہ ثابت کرتی ہیں کہ "اصحاب فیل" کی یہ جنگ قریش کی تباہی کے لیے نہیں تھی "کعبۃ اللہ" کی بربادی کے لیے تھی اور اسی لیے مشیت کا منشا کعبہ کی حفاظت تھا نہ کہ قریش کو بچانا۔

چنانچہ بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ سے حدیبیہ کے واقعہ سے متعلق جو طویل روایت نقل کی ہے اس میں ہے: مسلمان اگرچہ جنگ کی نیت سے نہیں بلکہ زیارت بیت اللہ کے مقصد سے مکہ جا رہے تھے مگر مشرکین نے یہ سمجھا کہ جنگ کا ارادہ

Marfat.com

ہے اس لیے خالد بن ولید (جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) مقدمۃ الجیش بن کر راہ روکنے کے لیے ایک چھوٹے دستہ کے ساتھ آگے بڑھے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھا تو کہا بخدا ہمارا ارادہ کعبہ کی زیارت کے سوا اور کچھ نہیں ہے لیکن اگر مشرکین مکہ ہمارے اس نیک مقصد میں حائل ہوئے تو ہم بے شبہ مقابلہ کریں گے تب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ راہ بدل کر چلو تا کہ خالد کو پتہ نہ چلے کہ ہم کس طرف سے ہو کر آ رہے ہیں اور ایک لخت ان کے سر پر پہنچ جائیں۔ چنانچہ جب مسلمان ثنیہ المرار (پہاڑی ٹیلہ) پر پہنچے جہاں سے اچانک خالد کے دستہ پر حملہ کیا جا سکتا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی (قصواء) بیٹھ گئی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ہر چند اس کو اٹھانا چاہا مگر وہ نہ اٹھی تب سب کہنے لگے قصواء بھڑک گئی اور بے قابو ہوگئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا قصواء نہ بھڑکی ہے اور نہ بے قابو ہوئی اور نہ اس کی یہ عادت ہے بلکہ اس کو اسی خدا نے روک رکھا ہے جس نے ہاتھیوں والوں کو روک دیا تھا:

((فقال صلی اللہ علیہ وسلم ما خلائت و ما ذاك لها بخلق و لكن حبسها حابس الفيل))

اور پھر فرمایا اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ میں میری جان ہے مشرکین مکہ شعائر اللہ کی عظمت کے سلسلہ میں جس بات کے بھی طالب ہوں گے میں اس کو پورا کروں گا اس ارشاد کے بعد اونٹنی کو ڈپٹا اور اونٹنی کھڑی ہوگئی اور حدیبیہ کے آخری کنارہ پر جا پہنچی۔ (1)

اس روایت میں ((حبسها حابس الفيل)) فرما کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ ارشاد فرمایا کہ مشرکین مکہ اگر شعائر اللہ کی حرمت کے سلسلہ میں کسی بات کے بھی طالب ہوں گے تو میں اس کو پورا کروں گا تو یہ ارشاد مبارک صاف صاف یہ ظاہر کر رہا ہے کہ "حابس الفیل" نے جس طرح پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے یہ عہد لینے کے لیے قصواء کو چلتے چلتے روک دیا کہ اگر قریش سے جنگ پیش آئی تو وہ حرم اور کعبہ کی عظمت و حرمت کو مطلق کوئی آنچ نہ آنے دیں گے اسی طرح ماضی میں خدائے تعالیٰ نے اصحاب فیل کو اس لیے برباد کر دیا اور مکہ تک نہ پہنچنے دیا کہ وہ حرم اور کعبہ کو برباد کرنے اور اس کی توہین کرنے آئے تھے۔ چنانچہ خالد کے آمادۂ جنگ ہونے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ارادۂ مقاومت نے جب صورت حال کو جنگ کے قریب کر دیا تو حرم کے قریب پہنچ کر بحکم رب العالمین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناقہ بیٹھ گئی تا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے صحابہ رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں یہ اعلان کرایا جائے کہ مشرکین مکہ سے ارادۂ جنگ ہے لیکن سرزمین مکہ شعائر اللہ کا مرکز و محور ہے یہاں کعبۃ اللہ ہے۔ مقام ابراہیم ہے سعی ہے مسجد حرام ہے اور تمام سرزمین مکہ حرم ہے اس لیے ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ مشرکین مکہ (قریش) سے جنگ کے سلسلہ میں شعائر اللہ کی حرمت و عظمت میں کوئی فرق آنے پائے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اس حقیقت حال کو فراست وحی سے سمجھ رہے تھے اس لیے اول آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناقہ (قصواء) کے بیٹھ جانے کی وجہ بیان فرمائی اور اس کے بعد یہ مسطورہ بالا اعلان فرمایا اور اب جبکہ کعبۃ اللہ اور شعائر اللہ کی عظمت و حرمت کا وعدہ منجانب اللہ لے لیا گیا تو اس کے فوراً بعد ہی خدا کے حکم سے قصواء خود بخود کھڑی ہوگئی اور منزل مقصود کی جانب گامزن ہوئی۔

اور بخاری و مسلم (صحیحین) کی ایک روایت میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے روز جو خطبہ دیا اس میں ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے مکہ کو ہاتھیوں کی یورش سے بچا لیا تھا مگر اس نے اپنے رسول اور مسلمانوں کو اس پر قبضہ دے دیا تو یاد رہے کہ خدا کے اس حرم کی عظمت اب بھی اسی طرح ہے جس طرح اس سے پہلے تھی جو موجود ہیں ان کو چاہیے کہ غائب تک اس خبر کو پہنچائیں۔

(1) غزوۃ الحدیبیہ

Marfat.com

اس روایت میں بھی سرور عالم ﷺ نے صاف الفاظ میں یہ ظاہر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ کو ہاتھیوں کی یورش سے قریش کی خاطر نہیں بلکہ کعبۃ اللہ اور حرم کی عظمت وحرمت کی خاطر بچایا تھا اور پھر مسلمانوں کو اس غلط فہمی سے بچانے کے لیے کہ کہیں وہ فتح مکہ کے زعم میں یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ مکہ میں جنگ کی اجازت نے حرم کی عظمت آج کچھ کم کر دی ہے یہ خطبہ ارشاد فرما کر حقیقت حال کو واضح فرمایا اور تاکید فرمائی کہ جو لوگ اس وقت موجود نہیں موجود حضرات اس بات کو ان تک پہنچا دیں بلکہ اُمت مسلمہ کو ہمیشہ پہنچاتے ہیں۔

قریش کی بقا اور ان کی حفاظت اور حرم وکعبہ کی بقاء اور ان کی حفاظت یہ دو جدا جدا حقائق ہیں اور خدائے تعالیٰ نے دوسری حقیقت کی حفاظت کو اپنے ذمہ لیا ہے نہ کہ پہلی کو اس کے متعلق فتح مکہ کے وقت بعض صحابہ کو یہ غلط فہمی ہوگئی تھی کہ اس خاص وقت میں اللہ تعالیٰ نے شاید نبی معصوم ﷺ کی کامیابی کی خاطر حرم کی عظمت وحرمت کو بھی نظر انداز کر دینے کی اجازت دے دی ہے۔ یہی غلط فہمی حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو پیش آئی اور جب نبی اکرم ﷺ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے بہت سختی کے ساتھ ان کے اس خیال کی تردید فرمائی اور صرف یہی نہیں کیا بلکہ ان کو ان کے لشکر کی سرداری سے بھی معزول کر دیا۔ چنانچہ بخاری نے فتح مکہ سے متعلق حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کی طویل روایت میں اس طرح اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔

جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ پرچم لہراتے ابوسفیان کے پاس سے گزرے تو کہنے لگے ابوسفیان "الیوم یوم الملحمة الیوم تستحل الکعبة" (آج کا دن لڑائی کا دن ہے آج کعبہ کی حرمت کو بھی گزند پہنچ جائے گا) یہ سن ابوسفیان نے نبی اکرم ﷺ سے شکایت کی کہ سعد یہ کہہ رہے ہیں آپ ﷺ نے سن کر فوراً فرمایا:((کذب سعد ولکن ھذا الیوم یعظم اللہ فیه الکعبة ویوم تکسی فیه الکعبة)) "سعد نے جو کہا جھوٹ کہا آج کا دن وہ ہے جس میں کعبہ کی عظمت کو اللہ تعالیٰ زیادہ بلند کرے گا آج کا دن وہ ہے کہ کعبہ کی حرمت کے لیے اس پر غلاف چڑھایا جائے گا اور بعض روایات میں اس کے ہم معنی یہ الفاظ ہیں ((الیوم یوم المرحمة الیوم تکسی الکعبة)).

اس روایت میں اگرچہ "اصحاب فیل" کا کوئی حوالہ نہیں ہے مگر فتح مکہ کے دوران میں اس واقعہ کے پیش نظر آ جانے سے یہ حقیقت بہرحال اور زیادہ روشن ہوگئی کہ جنگ وصلح ہر دو حالات میں اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ قریش کی حفاظت نہیں بلکہ کعبہ اور حرم کی حفاظت مقصود رہی ہے۔

فتح مکہ میں آخر قریش مکہ پر ہی ان کی بدعہدی کی وجہ سے چڑھائی ہوئی اور اگرچہ قریش کے فرار سے جنگ کی صورت پیدا نہیں ہوئی تاہم جن قریشیوں نے تھوڑی بہت مزاحمت کی وہ قتل بھی ہوئے مگر حابس الفیل نے ان کی کوئی مدد نہیں کی بلکہ مسلمانوں کو ہی کامیاب کر دیا کیوں؟ صرف اس لیے کہ مسلمانوں کا اعلان جنگ قریش کے لیے تھا اور وہ اس طرح کعبہ اور حرم کی حقیقی عظمت و حرمت کو واپس لانا چاہتے تھے اور اصحاب الفیل کو تباہی اور بربادی سے اس لیے واسطہ پڑا کہ اہل کتاب ہونے کے باوجود وہ مشرکین مکہ (قریش) کے خلاف نبرد آزما نہیں ہوئے تھے بلکہ مرکز توحید کعبۃ اللہ کو برباد کرنے کے ارادہ سے آئے تھے۔

ہم نے جدید مفسر صاحب کی مفروضہ داستان کے خلاف نبی معصوم ﷺ کی صحیح احادیث سے اگرچہ مسکت اور فیصلہ کن مواد پیش کر دیے ہیں مگر ہم یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ ان کی نگاہ میں اپنی من گھڑت داستان کے سامنے احادیث کی یہ شہادات اسی طرح قابل مضحکہ اور لائق سخریہ ہیں جس طرح وہ اپنے مزعومہ اسلامی رسالہ میں بخاری اور مسلم کی بعض دوسری احادیث کا مذاق اڑا

چکے اور ان کو نا قابل اعتماد قرار دے چکے ہیں۔ و الی اللہ المشتکی

الحاصل جس طرح موثق دلائل و شواہد کی روشنی میں تفسیر جدید کا یہ بنیادی مقدمہ یا اختراعی تفاصیل کا یہ اہم حصہ بے بنیاد اور باطل ہے اسی طرح باقی حصص کو بھی بمصداق "قیاس کن زگلستان من بہار مرا" سمجھ لیجئے کہ ان کی حقیقت کیا ہے کہ ان کے لیے نہ قرآن کے اندر کوئی سند موجود ہے اور نہ باہر تاریخ و احادیث سے کوئی ان کو تائید حاصل ہے۔

مگر تفسیر بالرائے پر جدید مفسر صاحب کی یہ جسارت کس درجہ حیرت زا ہے کہ وہ اپنی خود ساختہ تفسیر کے مقابلہ میں سلف سے منقول تفسیر پر جو کہ احادیث صحیحہ عرب روایات اور تاریخی تواتر سے موید ہے تل کے اوٹ پہاڑ کی پھبتی کسنے سے بھی نہیں چوکتے۔ (انا للہ و انا الیہ راجعون)

اگر مفسر صاحب نے باقی تفسیر قرآن میں بھی یہی گل کاریاں کی ہیں اور اسلامی خدمت کے لیے اسی پیمانہ کو معیار بنایا ہے تو ہم اس خدمت دین کے لیے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔

گر ہمیں مکتب است وہم ملا　　　کار طفلاں تمام خواہد شد

چند تشریحی مطالب:

① آیت ﴿وَ اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ﴾ میں ابابیل پرندوں کی جماعت کو کہتے ہیں اور اس کے مفہوم میں جماعت اور تتابع دونوں ایک ساتھ داخل ہیں یعنی وہ پرند مراد ہیں جو پرے کے پرے بن کر اڑتے اور اڑتے ہوئے ایک دوسرے میں گھسنے کی کوشش کرتے ہوں۔ چنانچہ لغت میں ہے "الابابیل" الفرق طیرا ابابیل متتابعہ مجتمعۃ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں "ابابیل ای تتبع بعضھا بعضا" اور یہی مجاہد سے منقول ہے اور پرے کے پرے بن کر اس طرح اڑنا کہ ایک دوسرے کے پیچھے لگا ہوا ہے طبعا اور فطرۃً بعض چھوٹے پرندوں کا خاصہ ہے بعض علماء لغت کہتے ہیں کہ یہ "ابالۃ" کی جمع ہے اور اکثر کا قول یہ ہے کہ یہ ایسی جمع ہے جس کے لیے کوئی واحد نہیں ہے "ابابیل" "جمع لا واحد لہ"۔

② ﴿بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ﴾ میں حجارہ کو سجیل کے ساتھ مقید کیا ہے، یہ اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ اس سے وہ شے مراد ہے جس کو فارسی میں "سنگ گل" اور اُردو میں "کھنگر" کہتے ہیں اور یہ کہ سنگ اور سنگریزوں کو "سجیل" نہیں کہا جاتا بلکہ ان کے لیے حجر پتھر اور حصی (سنگریزہ یا پارہ ہائے سنگ) بولا جاتا ہے۔

اہل لغت پتھر اور پتھر سے مشابہ اشیاء کے درمیان جو فرق بیان کرتے ہیں اس کا حاصل بھی یہی ہے یعنی الحجر پتھر، الحصی سنگریزہ یا پارۂ سنگ، سجیل کنکر یا سنگ گل الخذف مٹی کے برتنوں کے شکستہ ٹکڑے یا ٹھیکری۔ لہٰذا جس شخص نے ﴿حِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ﴾ کے معنی سنگ یا پارۂ سنگ سمجھ کر ﴿تَرْمِيْهِمْ﴾ کا ترجمہ سنگ باری کر رہے تھے۔ کیا ہے غلط کیا ہے کیونکہ یہ لغت اور محاورات عرب دونوں کے خلاف ہے اور اس لیے اس معنی پر مبنی تفسیر بھی صحیح نہیں ہوسکتی اور اگر یہ کہا جائے کہ قرآن نے حصی کو مجازاً سجیل کہا ہے تو ثابت کرنا چاہیے کہ قرآن نے حقیقت کو چھوڑ کر کس لیے اس مقام پر مجازاً استعمال کیا ہے؟

اور اگر "سجیل" کے معنی حقیقی معنی مراد ہیں تو یہ بتانا چاہیے کہ مکہ کی اس پہاڑی پر "جہاں چڑھ کر قریش نے کنکر مارے" یہ کنکر کہاں سے آ گئے تھے جب کہ پہاڑیوں پر سنگریزے یا پارہ ہائے سنگ تو ہوتے ہیں مگر کنکر نہیں ہوتیں؟

Marfat.com

③ آیت ﴿فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ﴾ اس بات کے لیے نص ہے کہ ایسی فوج گراں کا جس میں ہزار ہا مسلح لشکریوں کے علاوہ دیو پیکر ہاتھی بھی تھے کنکروں کی مار سے کھائے ہوئے بھس کی طرح ہو جانا اور فرار ہو کر جان بچا لینے کی مہلت تک نہ ملنا قدرت کے اعجاز ہی کے ذریعہ وقوع پذیر ہوا اور اسباب عقلی وعادی کے ماتحت عمل میں نہیں آیا۔

بصائر وعبر:

مذاہب کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون "تعذیب اقوام وامم" بہ تقاضائے حکمت دو میں منقسم رہا ہے۔

① جب تک پیروان دین حق اور متبعین پیغمبران خدا کی تعداد معاندین اور مخالفین کے مقابلہ میں اس قدر قلیل رہی ہے کہ عام حالات میں وہ دشمن کے مقابلہ سے معذور رہے ہیں تو اس پورے دور میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے زمین وآسمان یعنی اجرام ارضی وفلکی کے ذریعہ ان کی نصرت وحمایت کا سامان ہوتا رہا ہے اور تعلیم حق وصداقت سے سرکش اور متمرد قوموں پر قدرت بلاواسطہ مختلف قسم کے زمینی اور آسمانی عذاب نازل کرتی رہی ہے۔ چنانچہ قوم نوح (علیہ السلام) عاد، اصحاب ایکہ فرعون وقوم فرعون وغیرہ اقوام وامم سب اسی قسم کے عذاب سے ہلاک وبرباد کی گئیں یہ دور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ختم ہو جاتا ہے۔

② جب جان نثاران حق وصداقت کی تعداد اس درجہ پر پہنچ گئی کہ وہ اگرچہ معاندین کے مقابلہ میں تھوڑے بھی رہے ہوں تب بھی اپنی تعداد کی اکثریت کے لحاظ سے دشمن کے مقابلہ میں سینہ سپر ہونے کے قابل ہیں تو پھر "سنت اللہ" یہ رہی ہے کہ خود فدا کاران حق اور مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ میدان کارزار میں نکل کر دشمنان خدا کا مقابلہ کریں اور اپنی جان کی بازی لگا کر ملت بیضاء اور دین حق کی حمایت کے لیے سینہ سپر بنیں اور ساتھ ہی سچے رسولوں کے ذریعہ یہ وعدہ بھی دیا جاتا رہا کہ ثمرہ اور نتیجہ میں فتح و نصرت تمہارا ہی حصہ ہے ﴿وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○﴾ اور یہ نصرت وفتح کبھی ملائکۃ اللہ کی معیت جہاد سے پوری کی جاتی ہے اور کبھی اس کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔

غرض جن قوموں نے بھی حق وصداقت کے ظاہر ہو جانے اور خدائے برتر کے سچے پیغمبروں کی صداقت کو جان لینے کے بعد از راہ عداوت وغرور تعلیم حق سے نہ صرف منہ موڑا بلکہ اس کو مٹانے کی سعی ناکام کی تو اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ان کو پاداش عمل کے چرخ پر کھینچ کر اور مختلف قسم کے عذاب چکھا کر صفحہ ہستی سے مٹا دیا اور اگرچہ ان کی تعذیب کا قانون عام طور سے ان ہی دو دوروں کے اندر منحصر رہا تاہم اللہ تعالیٰ کی حکمت کسی خاص طریق کار کے دائرہ میں محدود نہیں ہے اس لیے ہو سکتا ہے کہ ہماری اس تقسیم میں بعض مستثنیات بھی موجود ہوں البتہ تتبع اور استقراء کے پیش نظر تقسیم ضرور صحیح ہے۔

③ کعبۃ اللہ کے خلاف اصحاب فیل کی لشکر کشی اگرچہ قانون تعذیب امم کے دوسرے دور میں پیش آئی لیکن ایسے حالات اور ایسے زمانہ میں پیش آئی جو دور اول کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں یعنی "فترۃ وحی" (انقطاع وحی) کا زمانہ جس میں نہ کوئی رسول ہے اور نہ کوئی نبی اور نہ وقت کے سچے دین کے حامل ہی نظر آتے ہیں اور اگر ہیں بھی تو منتشر افراد ہیں نہ کہ با اثر جماعت کہ وہ کعبۃ اللہ کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہو۔ بلکہ ایک مدعی دین مسیحی ہی کعبہ ابراہیمی اور مرکز توحید کو برباد کرنے کے درپے نظر آتا ہے۔

اور مشرکین مکہ شرک وکفر کے باوجود اگرچہ "بیت اللہ" کی عظمت کے قائل ہیں مگر ایسی فوج گراں کے مقابلہ میں تاب و مقاومت نہیں رکھتے کہ جس کے ساتھ دیو پیکر ہاتھی بھی ہیں اور کعبہ کو رب کعبہ کے بھروسہ پر چھوڑ کر پہاڑ کی گھاٹیوں میں پناہ گزیں ہو

Marfat.com

جاتے ہیں تو ایسی حالت میں دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں ایک یہ کہ ابرہہ اور اس کا لشکر (اصحاب فیل) کامیاب ہو اور بیت اللہ برباد کر دیا جائے اور دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ کا ایسا نشان (معجزہ) ظاہر کرے جو اسباب و وسائل سے بالاتر ہو کر اس مرکز دین اور قبلہ عالم "کعبہ" کی عظمت و حرمت کی حفاظت کا ضامن ہو اور ابرہہ اور اس کے لشکر (اصحاب فیل) کو قانون تعذیب امم کے پہلے دور کے مطابق ہلاک و برباد کر دے تاکہ یہ واقعہ کائنات انسانی کے لیے باعث عبرت و بصیرت ہو۔ چنانچہ حضرت حق کی جانب سے یہی دوسری صورت رونما ہوئی اور اس کے اعجاز قدرت نے "اصحاب فیل" پر جو عذاب سماوی نازل کیا تھا سورۃ الفیل میں اسی کو بیان کیا گیا ہے۔ "ذلك هو الحق" ...... "وما ذلك على الله بعزيز"

④ یہ واقعہ ولادت باسعادت محمد (ﷺ) سے چند [1] روز قبل پیش آیا یہ وہ وقت تھا جب کہ کائنات کا گوشہ گوشہ خدا پرستی اور توحید الٰہی کے نغموں سے محروم ہو چکا تھا، اور خدا کی بھیجی ہوئی سچی تعلیم کے مدعی ہر جگہ موجود تھے مگر سچی تعلیم معدوم ہو چکی تھی اور ادیان و ملل کے اصل خدوخال اور ان کی حقیقی شکل و صورت کو تحریف و تبدیل کے مرض نے مسخ کر دیا تھا۔ ہر جگہ شرک و کفر کا دور دورہ تھا، کہیں اصنام پرستی ہو رہی تھی تو کسی جگہ کواکب پرستی کا شور تھا کہیں آتش پرستی مقصد عبادت تھی تو کسی مقام پر عناصر پرستی دین کا نصب العین بن چکی تھی، کہیں تثلیث نے جگہ پا کر حضرت یسوع کو "مسیح بن اللہ" بنایا تھا تو کسی گروہ نے "عزیر بن اللہ" کہہ کر مذہب کے نام کا سہارا لیا تھا غرض ساری کائنات میں یا خدا کا انکار کار فرما تھا اور یا پھر اصنام پرستی، عناصر پرستی، کواکب پرستی حیوانات پرستی نے فلسفیانہ تخیل کی آڑ لے کر شرک و کفر کو نمایاں کیا تھا۔ اس لیے یہاں خدا پرستی کے علاوہ اور سب کچھ موجود تھا اگر مفقود تھی تو وہ فقط خدائے واحد کی پرستش ہی تھی۔

ان حالات کے پیش نظر غیرت حق کا فیصلہ ہوا کہ اب وہ نور ہدایت روشن اور وہ آفتاب رسالت جلوہ گر ہو جو کسی ایک خاص خطہ دنیا کو ہی نہیں بلکہ تمام عالم اور ساری کائنات کو "راہ مستقیم" دکھائے اور کائنات پرستی سے ہٹا کر خدا پرستی سکھائے۔ وہ گم کردہ راہ انسانوں کو راہ بتائے اور بھٹکے ہوئے غلاموں کو حقیقی مالک و آقا سے ملائے، ٹوٹے ہوؤں کا رشتہ جوڑے اور جاہلیت کی زنجیروں کو توڑے وہ دعائے خلیل علیہ السلام اور نوید مسیح کا حاصل ہو اور اس مرکز توحید "کعبہ" کی حقیقی عظمت و حرمت کا داعی جو خدا پرستی کے لیے سب سے پرانا اور مقدس گھر ہے اور جس کی تعمیر کا شرف ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام جیسے پیغمبروں کو بخشا گیا۔ آج اسرائیل کے خاندان سے "دعوت حق کی امانت واپس لے لی گئی کیونکہ انہوں نے خیانت کی اور اپنے بزرگوں کی وصیت کو فراموش کر دیا ﴿ نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ﴾ آج اسماعیل کا خاندان نوازا گیا اور خدا کی پاک امانت "سلالۃ اسماعیلی" کو عطا کر دی گئی۔ وقت آ رہا ہے کہ رسالت و نبوت کا یہ چاند عنقریب غار حرا سے کھیت کرے اور آفتاب حقیقت بن کر دنیا پر چمکے اس کی ملت، ملت ابراہیمی کہلائے اور دنیا میں خدا کا سب سے پہلا گھر (کعبہ) پھر قبلہ عالم اور مرکز کائنات ہے۔ *

ادھر حضرت حق کا یہ فیصلہ ہو چکا ہے مگر دوسری جانب دنیا کی ایک حقیر ہستی یمن اور حبشہ کی فانی حکومت کے زعم میں یہ چاہتی ہے کہ مرکز توحید اور کعبہ ملت حق "بیت اللہ" کو برباد کر کے اور صفحہ ہستی سے مٹا کر مرکز تثلیث صنعاء کے القلیس کو کائنات انسانی کا قبلہ مقصود اور کعبہ محمود بنائے اور اس طرح توحید خالص کی جگہ تثلیث کی شرک پرستی کو فروغ دے وہ سمجھتا ہے کہ میری فوج گراں

[1] کتب سیر میں راجح قول یہ ہے کہ یہ واقعہ ولادت باسعادت سے پچاس روز قبل پیش آیا۔

Marfat.com

شوکت و ہیبت کے مقابلہ سے سارا عرب عاجز و درماندہ ہے اور وہ یقین رکھتا ہے کہ مہیب ہاتھیوں کا یہ لشکر جب "کعبۃ اللہ" کو منہدم کرنے کے لیے آگے بڑھے گا تو خدا کے اس گھر کو کوئی نہ بچا سکے گا اس لیے وہ کروفر اور ہیبت وعظمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے یمن سے چلتا ہے اور راہ میں جو قبائل مزاحمت کرتے ہیں ان کو پامال کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے سردار قریش عبدالمطلب جب اس کے سامنے پیش ہوتے ہیں تو وہ اپنے غرور ونخوت کے ساتھ یہ ظاہر کر دیتا ہے کہ ہمارا مقصد قریش سے نبرد آزما ہونا نہیں ہے بلکہ کعبہ کا انہدام وفنا مقصود ہے۔ عبدالمطلب اچھوتے اور عبرت آموز انداز میں اپنی بے چارگی اور تاب مقاومت سے معذوری کا اظہار کر کے کعبہ کو رب کعبہ کے سپرد کر کے قریش سمیت ابرہہ کی راہِ مزاحمت سے ہٹ جاتے ہیں۔

اب مقابلہ انسانوں کا انسانوں سے نہیں ہے بلکہ فرعون صفت اور ہامان نمط انسانی طاقت خدا کی طاقت سے ٹکرانا چاہتی ہے یہاں انسانی مقاصد دوسرے انسانوں کے مقاصد سے متصادم نہیں ہیں بلکہ حضرت حق کے مقصد پاک سے ایک ناپاک ہستی کا ارادۂ ناپاک تصادم چاہتا ہے پھر نتیجہ کیا نکلا وہی جو ہونا چاہیے تھا کہ خدا کی معجزانہ قدرت کے سامنے انسانی قوت پاش پاش ہو کر رہ گئی اور اصحاب الفیل کا مقصد شر حضرت حق کے مقصد خیر کے مقابلہ میں ﴿خَسِرَ الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ۝﴾ کا مصداق بن کر رہ گیا۔

آج نہ اصحاب الفیل کا نام ونشان باقی ہے اور نہ اقلیس صنعاء کا اور نہ وہ قریش مکہ ہی باقی ہیں جن کی آنکھوں نے وہ منظر دیکھا تھا لیکن قبلہ توحید اور مرکز صداقت "کعبۃ اللہ" اسی طرح اپنی عظمت وجلالت کے ساتھ قائم ودائم ہے اور آج بھی قرآن عزیز اس کی رفعت شان کا ببانگ دہل یہ اعلان کر رہا ہے

﴿اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝﴾ (آل عمران :۹۶)

"بیشک سب سے قدیم وہ گھر جو انسان کی "خدا پرستی" کے لیے بنایا گیا۔ یقیناً وہ ہے جو مکہ میں ہے جو سراسر مبارک اور جہانوں کے لیے (مرکز) ہدایت ہے۔"

⑤ سورۂ الفیل کے مطالعہ سے دو باتیں صاف طور پر سمجھ آجاتی ہیں۔

ایک یہ کہ اس سورۃ میں ایک متمرد اور سرکش جماعت کی ہلاکت کا عبرت آموز واقعہ مذکور ہے۔

دوسری یہ کہ اس واقعہ سے منجانب اللہ، کعبۃ اللہ کی حرمت وعظمت کی حفاظت کا بصیرت افروز نتیجہ نکلتا ہے۔

اب رہا یہ امر کہ اس واقعہ کے بیان کرنے سے جو غرض وغایت ہے وہ اپنے اندر کیا اسرار وحکم محفوظ رکھتی ہے تو اگرچہ خدا کی حکمتوں کا احاطہ انسانِ فانی کے حیلہ امکان سے باہر ہے تاہم بنظر استحسان دو حکمتیں نمایاں نظر آتی ہیں۔

(الف) یہ واقعہ ولادت باسعادت (ﷺ) کے لیے ایک زبردست "نشان" کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے کہ نظام قدرت کے ابھرے ہوئے نقوش ہم کو یہ خبر دیتے ہیں کہ اس کارگہ عالم میں جب بھی کوئی عظیم انقلاب بپا ہوتا ہے تو اس کے وجود سے قبل ضرور ایسے آثار اور ایسی علامات ظاہر ہوتی ہیں کہ جن کو دیکھ کر عبرت نگاہ اور حقیقت آگاہ انسان آنے والے انقلاب کا اندازہ کر لیتا ہے اور انسان ہی نہیں بلکہ حضرت حق نے حیوانات تک میں احساس جزئیات کا ایسا ملکہ ودیعت کیا ہے کہ طوفانِ باد وباراں اور بھونچال جیسے حوادث کا پتہ صرف علامات وآثار سے پالیتے اور وقت سے قبل ہی اپنے اضطراب وکرب کے ذریعہ دور رس

Marfat.com

انسانوں کو ان حقائق کا علم کرا دیتے ہیں۔

دور نہ جایئے روزانہ ہونے والے انقلاب ہی کو دیکھئے اور اس سے اس حقیقت کی صداقت کو وزن کیجئے شب دیجور کی حیات چند ساعت کا جب پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور طلوع آفتاب عالمتاب کی وجہ سے اس کو پیام مرگ مل جاتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ رات کے آخری کنارہ پر پہنچ کر وہ کائنات کو اپنے رخ روشن کا جلوہ دکھا دیتا ہو بلکہ ہوتا یہ ہے کہ اول اُفق مشرق میں سفیدۂ صبح نمودار ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ تاریکی کو روشنی سے بدلتا جاتا ہے اس وقت ہر ذی ہوش یہ سمجھ جاتا ہے کہ خورشید خاور کی تنویر کا وقت آ پہنچا گو نیند کے ماتے شب تاریک کی مرگ ناگہانی اور سفیدۂ صبح کی منادی طلوع آفتاب سے غافل ہوئے پڑے رہتے ہیں لیکن مرد باہوش اس علامت کو دیکھ کر روز روشن کی آمد کا پتہ لگا لیتے ہیں اور خواب غفلت سے بیدار ہو جاتے ہیں تاکہ آفتاب عالمتاب کی ضوء فشانی سے قبل ہی خود کو اس کے خیر مقدم کے لائق بنا سکیں۔

عالم مادی کے اس انقلاب کی طرح عالم روحانیات میں بھی "سنت اللہ" اسی طرح جاری و ساری ہے کیونکہ تمام عالمین کا "رب" ایک ہی وحدہ لاشریک لہ ہستی ہے اس لیے ہر عالم کے لیے اس کے نوامیس وقوانین میں بھی وحدت اور یکسانیت جلوہ گر ہے۔

کائنات روحانی میں عالم مادی کے وجود ہی سے یہ انقلاب تو ہوتا ہی رہا جونہی توحید الٰہی کی روشنی پر کفر و شرک کی تاریکی نے غلبہ پایا ناموس الٰہی نے کسی روشن ستارہ یا قمر یا لیلۃ البدر کے ذریعہ اس ظلمت کو کافور کر دیا لیکن ابھی عالم ایسی روشنی کا طلبگار تھا کہ اس کے طلوع کے بعد روشنی اور تاریکی کا فرق اس طرح نمایاں ہو جائے کہ پھر کبھی ظلمت کفر نور توحید پر اس طرح نہ چھا سکے کہ سراب اور آب حیات کے درمیان امتیاز مشکل ہو جائے ہاں اگر روز روشن کی موجودگی میں بھی کسی شپر کو آفتاب کی روشنی نظر نہ آئے تو یہ ایک جدا بات ہے کہ قصور کس کا ہے، آفتاب کا یا شپرہ چشم کا؟

غرض جب وہ وقت قریب آ پہنچا کہ نبوت و رسالت کا آفتاب عالمتاب (محمد ﷺ) طلوع ہوا اور شرک و کفر کے پردہ ہائے ظلمت ﴿ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾ چاک کر دیئے جائیں تو آسمان و زمین میں سفیدۂ صبح سعادت کے ایسے آثار و علائم نمودار ہونے لگے کہ چشم حق میں اور دلِ حق آگاہ نے یہ محسوس کر لیا کہ عنقریب عالم روحانیت میں عظیم الشان انقلاب بپا ہونے والا اور وہ وقت آنے والا ہے کہ داستان شب سرد پڑ جائے گی اور حقیقت کا آفتاب چمک اٹھے گا اور دل و زبان یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم　　چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

عالم روحانیات کا یہ سراج منیر✿ ظاہر ہے کہ سرزمین مکہ سے طلوع ہونے والا تھا اور اس کی دعوت عام کا محور و مرکز بھی مقدس مقام بننے والا تھا جہاں عبادت الٰہی کا سب سے پرانا گھر "کعبۃ اللہ" قبلہ عالم و عالمیان تھا پس ایسے عظیم الشان انقلاب کے وقت کفر و شرک کی ظلمت شب نے ایک آخری سہارا لیا اور نورِ آفتاب پر غالب آنے کی کوشش کی، یہی وہ منظر تھا جو ابرہہ اور اس کے لشکر اصحاب فیل کی بدولت دنیا کے اس پردۂ متحرک پر نظر آیا کہ کسی طرح مرکز توحید "کعبۃ اللہ" کو برباد کر کے تثلیث "القلیس" کو مرجع خلائق اور مرجع عبادت بنا دیا جائے تاکہ ظلمت شرک ایسا فروغ پائے کہ طلوع آفتاب کی نوبت ہی نہ آنے پائے۔

مگر قدرت کے منشاء کو کوئی طاقت نہیں روک سکتی اور خدا کے ارادہ پر کوئی ہستی غالب نہیں آ سکتی لہٰذا دنیا نے دیکھا کہ یہ منظر

✿ قرآن کے مادی آفتاب کو بھی سراج ہی کہا ہے ﴿وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا﴾ اس لئے روحانی آفتاب کو بھی سراج منیر کہا ہے۔

Marfat.com

بہت جلد ہی آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو گیا اور موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور تھوڑے سے عرصہ کے بعد ہی رسالت و نبوت کے آفتاب عالمتاب نے روشن ہو کر ساری کائنات الٰہی کو منور کر دیا۔

تو اب کہنا چاہیے کہ نبی اکرم ﷺ کی ولادت باسعادت سے قبل جو "نشان" ظہور میں آئے اور صبح سعادت کے لیے آثار و علامات کہلائے ان ہی میں سے "اصحاب فیل" کا واقعہ بھی ایک زبردست "نشان اور عظیم المرتبت" علامت ہے۔

(ب) اس واقعہ کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے قریش کو اپنا بہت بڑا احسان یاد دلایا ہے کہ وہ یہ نہ بھول جائیں کہ جس وقت وہ "کعبہ" کی عظمت کے قائل ہونے کے باوجود ابرہہ (اصحاب فیل) کے اس مقابلہ سے عاجز رہے تھے جس میں اس نے "کعبہ" کی بربادی کا بیڑا اٹھایا تھا اس وقت ہم نے اپنی قدرت کاملہ کے "نشان اعجاز" سے وہ کر دکھایا کہ دشمن کی شر آمیز تدبیر اور اس کا ارادۂ بد دونوں خاک میں مل کر رہ گئے۔

کیا تم نے اس عبرت زا واقعہ سے یہ سبق حاصل نہیں کیا کہ یہ سب کچھ تمہاری خوشنودی کے لیے نہیں تھا جب کہ تم شرک کی تاریکیوں میں غرق اور کفر کی آلودگیوں میں ملوث تھے بلکہ "کعبہ" کی اس عظمت کی بقاء کے لیے تھا جس کی تعمیر بوڑھے پیغمبر ابراہیم علیہ السلام اور جواں پیغمبر اسماعیل علیہ السلام کے مقدس ہاتھوں سے ہوئی اور جس کے متعلق انہوں نے یہ فرمایا:

﴿رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ﴾ (ابراهیم: ۳۷)

"اے میرے پروردگار میں نے بسایا ہے اپنی بعض اولاد کو بن کھیتی کی سرزمین میں تیرے باعزت و حرمت والے گھر کے پاس۔"

اور اس حرم مقدس کی خاطر جس کے لیے ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا کی:

﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝۳۵﴾ (ابراهیم: ۳۵)

"(وہ وقت یاد کرو جب جب ابراہیم علیہ السلام نے) کہا اے میرے پروردگار تو اس شہر مکہ کو امن والا کر دے اور مجھ کو اور میری اولاد کو اس بات سے بچا کہ ہم بت پرستی میں مبتلا ہوں۔"

آج پھر وہ وقت ہے کہ خدا کا پیغمبر محمد ﷺ کعبہ کی حقیقی عظمت قائم کرتا اور اس کو بتوں اور بت پرستی کی تلویث سے پاک کرنا چاہتا ہے مگر تم ان کو اور مسلمانوں کو ضعیف اور کمزور سمجھ کر اور اپنی قوت کے غرور اور گھمنڈ میں اکڑ کر آڑے آ رہے ہو تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جس ذات نے "اصحاب فیل" کے کبر و غرور کو خاک میں ملا دیا تھا وہ تمہارے غرور کا بھی یہی حشر نہیں کر سکتا؟ سمجھو اور معاملہ کی حقیقت پر غور کرو اور پیغمبر خدا ﷺ کی مخالفت سے باز آ جاؤ۔

اس بات کی تائید سورۃ الفیل سے متصل سورۃ القریش سے بھی ہوتی ہے اس لیے کہ اس سورۃ میں قریش کو یہ توجہ دلائی گئی ہے یا ان پر اپنے اس احسان کو ظاہر کیا گیا ہے کہ عرب قبائل کے باہم بات بات پر جنگ و جدل اور معمولی معمولی معاملہ پر حرب و ضرب کے باوجود وہ حرم مکہ میں کس طرح مامون و محفوظ ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ اس کی خدمت کے انتساب کی وجہ سے حرم سے باہر بھی سردی اور گرمی دو موسموں میں اپنے محبوب تجارتی سفروں میں شام اور یمن تک بے خوف و خطر آتے جاتے ہیں اور کوئی آنکھ اٹھا کر بھی ان کی جانب دیکھنے نہیں پاتا۔

تو کیا وہ اس احسان کے شکر گزار نہیں ہوتے اور حرم اور کعبہ کی حقیقی عظمت کو سربلند کرنے کے لیے خدا کا آخری پیغمبر ﷺ تم کو جس صداقت کی جانب بلاتا ہے اس پر لبیک کہنے کو تیار نہیں ہوتے ان کے لیے یہ بات ہرگز زیبا نہیں دیتی۔

Marfat.com

﴿فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۝ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝﴾ (القریش: ۳-۴)

"پس ان کو چاہیے کہ وہ اس گھر کے پروردگار کی سچی پرستش کریں کہ جس نے ان کی بھوک کے لیے سامان رزق بہم پہنچایا اور ان کو خوف وخطر سے مامون ومحفوظ کر دیا۔"

(۶) ابرہہ مذہباً عیسائی تھا اور اس لیے وہ بیت اللہ "کعبہ" کی عظمت کو کسی طرح برداشت نہیں کرتا تھا اور اس کا وجود گویا ایک خار تھا جو کانٹے کی طرح اس کے دل میں کھٹک رہا تھا اس نے سوچا کہ "کعبہ" معمولی پتھروں کی ایک سادہ عمارت ہے اگر اس کے مقابلہ میں ایک ایسی خوبصورت اور بے نظیر عمارت بشکل کلیسا (گرجا) تیار کی جائے جو بیش قیمت پتھروں اور جواہرات سے مزین ہو تو اس طرح میں سارے عرب کی توجہ "کعبہ" سے ہٹا سکوں گا اور اس جدید "معبد" کو مرجع خلائق بنا سکوں گا یہ سوچ کر ایک طرف اس نے یمن کے دار الحکومت صنعاء میں ایک بے نظیر گرجا "القلیس" بنوایا اور دوسری جانب ایک معمولی واقعہ کو حیلہ بنا کر کعبہ کی بربادی کا تہیہ کیا نتیجہ جو کچھ ہوا مفصل مذکور ہو چکا لیکن اس واقعہ میں اس جانب اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی تمام قوموں میں سب سے زیادہ عیسائیوں کو ہی اس بیت اللہ "کعبہ" کے ساتھ عداوت رہے گی اور وہ اپنے غیر متمدن اور متمدن ہر زمانہ میں اس کے خلاف اپنی عداوت کا اظہار کرتے رہیں گے اور ہمیشہ اس مرکز توحید کے درپے رہیں گے، چنانچہ تاریخ ماضی اس کی شاہد ہے کہ جب کبھی نصاریٰ کو اس کا موقع میسر آیا انہوں نے عملاً اپنی عداوت کا اظہار کیے بغیر نہ چھوڑا اور اگرچہ خدائے تعالیٰ نے اس سلسلہ میں ہمیشہ ان کے ارادوں کو ناکام رکھا مگر وہ بہر حال اپنے قلبی بغض وحسد کا ثبوت دیے بغیر نہیں رہے۔

(۶) "کعبہ" بیت اللہ یعنی "خدا کا گھر" کہلاتا ہے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ "العیاذ باللہ" اللہ تعالیٰ کسی گھر میں ساکن ہے یا وہ گھر کا محتاج ہے بلکہ حقیقت حال یہ ہے کہ اس نے اپنی خالص عبادت کی غرض سے اقطاع وامصار کے مسلمانوں اور سچے عبادت گزاروں کے لیے کعبہ کو مرکز ومحور بنایا ہے اور یہ اس لیے کہ جب کہ خدائے تعالیٰ جہات سے وراء الوراء اور پاک ہے اور انسان اپنے ہر کام میں جہات میں سے کسی جہت کا محتاج تو از بس ضروری تھا کہ تمام کائنات کے پیروان توحید اور عبادت گزاران رب العالمین کی عبادت اور ان کی حیات ملی ودینی کے لیے ایک مرکز ہوتا کہ وہ انتشار اور تفرق وتشتت سے محفوظ رہیں اور وحدت اجتماعی کا سبق سیکھیں۔

لہٰذا اس کے لیے وہ مقدس عمارت "شعائر اللہ" قرار دی گئی جس کو مجدد انبیاء ورسل ابراہیم علیہ السلام اور ان کے مقدس بیٹے اسماعیل علیہ السلام نے دنیا میں سب سے پہلے صرف خدائے واحد کی پرستش کے لیے تعمیر کیا تھا اور جو توحید کے اعلان کی سب سے پرانی یادگار تھی

﴿وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ۝﴾

"جو لوگ اللہ کی نشانیوں کی عظمت کریں گے تو یہ ان کے دل کی پرہیز گاری کی دلیل ہے۔"

پس کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کعبہ کی اس لیے عظمت کرے کہ وہ "صنم" ہے یا خود قابل پرستش ہے اس لیے کہ جو ایسا سمجھے گا وہ مسلمان نہیں بلکہ مشرک کہلائے گا۔ بلکہ اس کی حرمت صرف اس لیے ہے کہ وہ "شعائر اللہ" ہے اور مرکز توحید، چنانچہ اسی حقیقت کو ایک عارف باللہ نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔ ؎ قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

﴿فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ۝﴾

Marfat.com

قصص القرآن

جلد چہارم

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے واقعات وحالات کا مُبصرانہ اور محققانہ بیان

تالیف

مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی رفیقِ اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی

تخریج وتصحیح

مولانا محمد عرفان فاضل جامعہ مدنیہ، لاہور

مکتبہ رحمانیہ
MAKTABA-E-REHMANIA
اقرأ سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

فہرست مضامین (جلد چہارم)

پیش لفظ ۶

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

قرآن عزیز اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ۷
عمران وحنہ ۹
مریم علیہا السلام کی ولادت ۱۰
حنہ اور ایشاع ۱۲
مریم علیہا السلام کا زہد وتقویٰ ۱۳
کیا عورت نبی ہو سکتی ہے؟ ۱۴
نبوۃ النساء اور ابن حزم ۱۵
کیا حضرت مریم علیہا السلام نبی ہیں؟ ۲۰
آیت ﴿وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کا مطلب ۲۰
حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بشارات کتب سابقہ ۲۲
ولادت مبارک ۲۴
بشارات ولادت ۲۹
حلیہ مبارک ۲۹
ثت ورسالت ۳۰
یات بینات ۳۲
ق توجیہات اور حقیقت معجزات ۳۵
رت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی تعلیمات کا خلاصہ ۴۷
اری عیسیٰ علیہ السلام ۴۸
ری عیسیٰ علیہ السلام اور قرآن وانجیل کا موازنہ ۴۹
نزول مائدہ ۵۱
"رفع الی السماء" یعنی زندہ آسمان پر اٹھالیا جانا ۵۵
قادیانی تلبیس اور اس کا جواب ۶۶
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع سماوی اور چند جذباتی باتیں ۷۵
وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ کی تفسیر ۷۶
حیات عیسیٰ علیہ السلام ۷۸
لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۷۸
حیاۃ ونزول عیسیٰ علیہ السلام اور احادیث صحیحہ ۸۲
حیات ونزول مسیح علیہ السلام کی حکمت ۸۸
واقعات نزول صحیح احادیث کی روشنی میں ۹۵
وفات مسیح علیہ السلام ۹۷
وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۹۷
فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۱۰۳
حضرت مسیح کی دعوت اصلاح اور بنی اسرائیل کے فرقے ۱۰۶
اناجیل اربعہ ۱۰۷
قرآن اور انجیل ۱۱۱
انجیل اور حواری عیسیٰ علیہ السلام ۱۱۴
حضرت مسیح علیہ السلام اور موجودہ مسیحیت ۱۱۶
تثلیث؟ ۱۱۶
ازمنہ مظلمہ اور اصلاح کنیسہ کی آواز ۱۲۰
قرآن اور عقیدۂ تثلیث ۱۲۲
حضرت مسیح علیہ السلام خدا کے مقرب اور برگزیدہ رسول ہیں ۱۲۲

Marfat.com

حضرت مسیح علیہ السلام نہ خدا ہیں نہ خدا کے بیٹے ۱۲۳
لائق توجہ بات ۱۲۷
کفارہ ۱۲۷

حضرت محمد ﷺ

محمد ﷺ اور قرآن ۱۲۹
بشارات النبی ﷺ ۱۳۴
تورات اور بشارات ۱۳۹
صبح سعادت ۱۵۴
تاریخ ولادت کی تحقیق ۱۵۶
نسب مبارک ۱۵۸
یتیمی ۱۶۱
بت پرستی سے نفرت، خلوت پسندی اور عبادت الٰہی کا ذوق ۱۶۴
حقیقت وحی ۱۶۵
صاحب وحی کی معرفت کی وجدانی دلیل ۱۷۵
بعثت ۱۷۷
حدیث بخاری اور بعض مستشرقین کی کوتاہ اندیشی ۱۷۹
بشریت اور نبوت کا باہمی تعلق ۱۸۱
نبی اور مصلح ۱۸۶
کیفیت وحی ۱۹۱
کیفیت وحی اور بعض مستشرقین کی گمراہی ۱۹۳
نزول وحی کا پہلا دور ۱۹۴
نزول وحی کا دوسرا دور ۱۹۵
اعلانِ دعوت وارشاد کی پہلی منزل ۱۹۶
دعوت وارشاد کی دوسری منزل ۱۹۷
بعثت عامہ ۱۹۸
دعوت اسلام کا مجمل خاکہ اور حضرت جعفرؓ کی تقریر ۱۹۹
قرآن اور تجدید دعوت ۲۰۰
توحید ۲۰۲
رسالت ۲۰۴
یوم آخرت ۲۰۵
اسراء (معراج) ۲۱۰
واقعہ کی وحدت ۲۱۰
تحقیق تاریخ وسنہ ۲۱۱
قرآن عزیز اور واقعہ معراج ۲۱۱
احادیث اور واقعہ معراج کا ثبوت ۲۱۲
واقعہ کی نوعیت ۲۱۲
واقعہ معراج واسراء اور قرآن عزیز ۲۱۲
سورۂ بنی اسرائیل اور واقعہ معراج ۲۱۳
والنجم اور واقعہ معراج ۲۱۹
واقعہ کی تفصیلات ۲۲۲
معراج میں رؤیت باری ۲۲۴
ہجرت ۲۲۵
ہجرت حبش ۲۲۵
ہجرت مدینہ کے اسباب ۲۲۶
ہجرت نبوی ﷺ ۲۲۷
دار الندوہ ۲۲۷
قرآن عزیز اور ہجرت مدینہ ۲۲۸
ہجرت؟ ۲۲۹
ختم نبوت ۲۳۱
غزوۂ بدر ۲۴۵
غزوہ ۲۴۵
بدر ۲۴۵
واقعہ ۲۴۵
دعائے نصرت ۲۵۱
غیبی نصرت وامداد ۲۵۱

نتیجہ جنگ ۲۵۲
جنگ بدر نے تاریخ عالم کا رخ بدل دیا ۲۵۳
قرآن عزیز کی روشنی میں غزوۂ بدر پر دوبارہ نظر ۲۵۳
غزوۂ اُحد ۲۶۹
اُحد ۲۶۹
غزوۂ اُحد ۲۶۹
حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت ۲۷۱
قرآن عزیز اور غزوۂ اُحد ۲۷۱
غزوۂ احزاب (غزوۂ خندق) ۲۷۳
قرآن عزیز اور غزوۂ احزاب ۲۷۵
واقعہ حدیبیہ ۲۷۶
بیعت رضوان ۲۷۷
معاہدۂ صلح ۲۷۸
الفتح الاعظم ۲۸۰
حاطب بن بلتعہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ ۲۸۱
بت شکنی ۲۸۴
رحمۃ اللعالمین کی شان ۲۸۴
خطبہ ۲۸۵
فتح مکہ اور قرآن عزیز ۲۸۶
غزوۂ حنین ۲۸۸
غزوۂ حنین اور قرآن حکیم ۲۸۹
غزوہ تبوک اور قبول توبہ کا عجیب واقعہ ۲۹۰
مالی استعانت ۲۹۰
عذر خواہی ۲۹۱
معاشرتی مقاطعہ ۲۹۱
ضبط و نظم کی عدیم النظیر مثال ۲۹۲
عشق رسول اور صداقت اسلام کا حیرت انگیز معیار ۲۹۲
قبول توبہ اور سورۂ توبہ ۲۹۴
قرآن عزیز اور غزوۂ تبوک ۲۹۴
اہم غزوات اور نتائج و بصائر ۲۹۵
بدر الکبریٰ ۲۹۵
غزوۂ اُحد ۲۹۵
غزوۂ احزاب ۲۹۷
صلح حدیبیہ ۲۹۸
فتح مکہ ۲۹۹
غزوۂ حنین ۲۹۹
غزوۂ تبوک ۳۰۰
تبنی ۳۰۱
حضرت زید رضی اللہ عنہ ۳۰۱
انسداد تبنی ۳۰۳
خرافی داستان ۳۰۴
حاصل کلام ۳۰۶
بصائر ۳۰۷
بنونضیر ۳۰۸
قرآن عزیز اور بنونضیر ۳۰۹
بصائر ۳۰۹
واقعہ افک ۳۱۰
موعظت ۳۱۲
نباء فاسق ۳۱۳
موعظت ۳۱۴
مسجد ضرار ۳۱۵
موعظت ۳۱۶
وفات یا وصل بالرفیق الاعلیٰ ۳۱۷
عبرت و موعظت ۳۱۹

Marfat.com

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا۔

وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مُحَمَّدِنِ الْمَبْعُوْثِ کَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا۔

امابعد! خدائے تعالیٰ کا احسان عظیم ہے کہ آج قصص القرآن کی تالیف اپنی آخری منزل پر پہنچ کر کامیابی کے ساتھ مکمل ہو گئی، میں کیا اور میری لیاقت اور میرا قلم کیا؟ یہ جو کچھ بھی خدا کے فضل اور قرآن حکیم کی برکت کی بدولت ہوا۔ فالحمد للہ علی ذالك۔

یہ جلد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت و دعوت اور حیات طیبہ اور دیگر مباحث متعلقہ پر مشتمل، اور پہلی تین جلدوں کی خصوصیات و امتیازات کی حامل ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقدس حالات میں خصوصیت کے ساتھ وہ مباحث لائق مراجعت ہیں جو قرآن حکیم کے حکیمانہ دلائل و براہین کی روشنی میں "حیات عیسیٰ علیہ السلام" سے متعلق ہیں یا عہد قدیم و عہد جدید (توراۃ وانجیل) کے مضامین الٰہیات سے تعلق رکھتے ہیں۔

خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "حیات طیبہ" تو وہ مخدوم شے ہے کہ از سلف تا خلف مسلسل ہر زندہ زبان اس خدمت پاک کو اپنا فرض یقین کرتی اور ادائے فرض سے سبکدوشی کا شرف حاصل کرتی رہی ہے۔ خصوصاً عربی زبان کے بعد اُردو زبان میں اس خدمت نے بہترین ذخیرہ پیش کر دیا ہے۔ اور مختصر، متوسط مطول ہر نوع کی تالیفات اس سلسلہ میں موجود ہیں اس لیے اس تالیف میں کوشش کی گئی ہے کہ صرف ان ہی واقعات کو سپرد قلم کیا جائے جن کا قرآن حکیم سے براہِ راست تعلق ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر شعبہ حیات قرآن حکیم کی جیتی جاگتی تصویر، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر اسوۂ حسنہ آیات قرآن کی تفسیر ہے۔

قصص القرآن کی تالیف اپنی افادیت اور مقصد تالیف کے لحاظ سے کیا درجہ رکھتی ہے۔ اس کا فیصلہ ارباب ذوق کی نگاہ بصیرت کے سپرد ہے..... خدائے تعالیٰ سے دست بدعاء ہوں کہ وہ اس خدمت کو قبول فرمائے۔

وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰهِ وَهُوَ حَسْبِیْ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ ○

خادم ملت

محمد حفظ الرحمٰن صدیقی کان اللہ لہ

۹ صفر المظفر ۱۳۶۵ء مطابق ۱۳ جنوری ۱۹۴۶ء

Marfat.com

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

○ قرآن اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ○ عمران وحنہ ○ مریم علیہا السلام کی ولادت ○ حنہ اور ایشاع الیشبع ○ مریم علیہا السلام کا زہد وتقویٰ ○ مقبولیت خداوندی ○ کیا عورت نبی ہوسکتی ہے؟ ○ نبوت النساء اور ابن حزم ○ آیت ﴿وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ○ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بشارات کتب سابقہ ○ ولادت مبارک ○ بشارات ولادت ○ حلیہ مبارک ○ بعثت ورسالت ○ آیات بینات لائق توجہ بات اور حقیقت معجزات ○ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کا خلاصہ ○ حواری (عیسیٰ) علیہ السلام ○ حواری عیسیٰ علیہ السلام اور قرآن وانجیل کا موازنہ ○ نزول مائدہ ○ رفع الی السماء یعنی زندہ آسمان پر اٹھالیا جانا ○ قادیانی تلبیس اور اس کا جواب ○ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع سماوی اور چند جذباتی باتیں ○ قادیانی کی ایک کذب بیانی ○ حیات عیسیٰ علیہ السلام ○ ﴿لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ﴾ تفسیر بالرائے کی نمایاں مثال ○ ﴿وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ .... مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ..... وَرَافِعُكَ اِلَيَّ﴾ ○ حیات عیسیٰ علیہ السلام اور احادیث صحیحہ ○ احادیث حیات ونزول ○ حیات مسیح علیہ السلام اور اجماع امت ○ حیات ونزول مسیح علیہ السلام کی حکمت ○ واقعات نزول صحیح احادیث کی روشنی میں ○ وفات مسیح علیہ السلام ﴿وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ﴾ نبی صادق ومتنبی کاذب ○ حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت اصلاح ○ بنی اسرائیل کے فرقے ○ اناجیل اربعہ ○ قرآن اور انجیل ○ انجیل اور حواری عیسیٰ علیہ السلام ○ حضرت مسیح علیہ السلام اور موجودہ مسیحیت ○ تثلیث؟ باپ، بیٹا، روح القدس ازمنہ مظلمہ اور اصلاح کلیسہ کی آواز ○ حضرت مسیح علیہ السلام خدا کے مقرب رسول ہیں ○ حضرت مسیح نہ خدا ہیں نہ خدا کے بیٹے ○ لائق توجہ بات ○ کفارہ؟

قرآن عزیز اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جلیل القدر اور اولوالعزم پیغمبروں میں سے ہیں، اور جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ورسل ہیں اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام خاتم الانبیاء بنی اسرائیل ہیں، اور جمہور کا اس پر اجماع ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا، اور درمیان کا یہ زمانہ جس کی مدت تقریباً پانچ سو ستر سال ہے۔ فترۃ (انقطاع وحی) کا زمانہ رہا ہے۔

Marfat.com

عیسیٰ علیہ السلام کی جلالت قدر اور عظمت شان کا ایک امتیازی نشان یہ بھی ہے کہ اگر انبیاء بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت و رسالت کا مقام امامت حاصل ہے تو عیسیٰ علیہ السلام مجدد انبیاء بنی اسرائیل ہیں، اس لیے کہ قانون ربانی (تورات) کے بعد بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کے لیے انجیل (بائبل) سے زیادہ عظیم المرتبہ دوسری کوئی کتاب نازل نہیں ہوئی اور یہ ایک حقیقت ہے کہ انجیل کا نزول قانون تورات کی تکمیل ہی کی شکل میں ہوا ہے یعنی نزول تورات کے بعد یہود نے جو قسم قسم کی گمراہیاں دین حق میں پیدا کر لی تھیں انجیل نے توراۃ کی شارح بن کر بنی اسرائیل کو ان گمراہیوں سے بچنے کی دعوت دی اور اس طرح تکمیل تورات کا فرض انجام دیا اور بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فراموش شدہ پیغام ہدایت عیسیٰ علیہ السلام ہی نے دوبارہ یاد دلایا اور تازہ باران رحمت کے ذریعہ اس خشک کھیتی کو دوبارہ زندگی بخشی۔ مزید برآں یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام سرور کائنات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑا مناد اور مبشر ہیں اور ہر دو مقدس پیغمبروں کے درمیان ماضی اور مستقبل دونوں زمانوں میں خاص رابطہ اور علاقہ پایا جاتا ہے۔ ❶

قرآن عزیز نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مماثلت کے سلسلہ میں جن پاک ہستیوں کے واقعات سے بہت زیادہ بحث کی ہے ان میں حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ (علیہم السلام) کی مقدس ہستیاں زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت قرآن کے "تذکیر بایام اللہ" میں اس لیے زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ جس دین قویم اور ملت بیضاء کا عروج و کمال محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تقدیس کے ساتھ وابستہ تھا اور جس ملت کی دعوت و تبلیغ کا محور و مرکز ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بننے والی تھی وہ ملت ابراہیم علیہ السلام کے نام سے موسوم ہے ﴿مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ﴾ کیونکہ یہی وہ بوڑھے پیغمبر ہیں جنھوں نے شرک کے مقابلہ میں سب سے پہلے توحید الٰہی کو حنیفیت کا لقب دیا اور آئندہ ہمیشہ کے لیے خدا کی راہ مستقیم کے لیے "ملة حنیفیه" کا امتیاز قائم کر دیا، یعنی جو خدا کی پرستش کے لیے مظاہر کائنات کی پرستش کو وسیلہ بناتا ہے "وہ مشرک" ہے اور جو خالق کائنات کی یکتائی کا قائل ہو کر براہِ راست اسی کی پرستش کرتا ہے وہ "حنیف" ہے۔ پس اس مقدس پیغمبر نے خدا پرستی کے اس حقیقی تصور کو عملی حیثیت میں اس درجہ نمایاں کیا کہ مستقبل میں ادیان حق کے لیے اس کی پیروی حق و صداقت کا معیار بن گئی اور خدائے برتر کی جانب سے قبولیت کا یہ شرف عطاء ہوا کہ یہ مقدس پیغمبر کائنات رشد و ہدایت کا امام اکبر اور مجدد اعظم قرار دیا گیا:

﴿ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ﴾ (آل عمران: ۹۵)

"پس پیروی کرو ابراہیم کی ملت کی، جو سب سے کٹ کر صرف خدا کی جانب جھکنے والا ہے۔"

﴿ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ڏ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا ﴾ (الحج: ۷۸)

"یہ ملت ہے تمہارے باپ ابراہیم کی، اس نے تمہارا نام "مسلم" رکھا نزول قرآن سے قبل اور اس قرآن میں بھی تمہارا نام "مسلم ہے"۔"

اور موسیٰ علیہ السلام کی مقدس زندگی کا تذکرہ اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ ان کی دعوت و تبلیغ کے واقعات یعنی قوم کی جہالت و نافرمانی، دشمنانِ خدا سے نبرد آزمائی پیہم مصائب و آلام پر صبر و استقلال کا دوام و ثبات، اور اسی قسم کے دوسرے کوائف و حالات میں ان کے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان بہت زیادہ مشابہت و مناسبت پائی جاتی ہے اور اس لیے وہ واقعات و حالات، قبول و انکار حق

---

❶ تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔

Marfat.com

اور ان سے پیدا شدہ نتائج کے سلسلہ میں بصیرت وعبرت کا سامان مہیا کرتے اور نظائر وشواہد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کی حیات طیبہ کا مقدس ذکر مسطورہ بالا خصوصیات وامتیازات کی بناء پر خاص اہمیت رکھتا ہے۔

غرض قرآن عزیز نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات وواقعات کو بسط وتفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور ان کی حیات طیبہ کے دیباچہ کے طور پر ان کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام کے واقعات زندگی کو بھی روشن کیا ہے تاکہ قرآن کا مقصد "تذکیر بایام اللہ" پورا ہو۔

یہ ذکر پاک قرآن عزیز کی تیرہ سورتوں میں ہوا ہے، ان میں سے کسی جگہ نام مبارک عیسیٰ (یسوع) سے یاد کیا گیا ہے اور کسی جگہ "مسیح علیہ السلام" اور عبداللہ کے لقب سے اور کسی مقام پر کنیت "ابن مریم" کے اظہار کے ساتھ۔

نقشہ ذیل اس حقیقت کا کاشف اور ارباب مطالعہ کی بصیرت کے لیے مدد ومعاون ہے:

شمار	سورہ	آیات	عیسیٰ	مسیح	عبداللہ	ابن مریم	تعداد آیات
۱	البقرہ	۸۷، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۲۵۳	۳	۰	۰	۲	۵
۲	آل عمران	۴۲، ۶۴، ۹۴	۵	۱	۰	۱	۲۴
۳	النساء	۱۵۶، ۱۵۹، ۱۷۱، ۱۷۲	۳	۳	۰	۲	۶
۴	المائدہ	۱۷، ۴۶، ۷۲، ۷۵، ۷۸، ۱۱۰، ۱۲۰	۶	۵	۰	۱۰	۱۸
۵	الانعام	۸۵	۱	۰	۰	۰	۱
۶	التوبہ	۲۰، ۳۱	۰	۱	۰	۱	۲
۷	مریم	۱۶، ۳۵	۱	۱	۱	۱	ار
۸	المومنون	۵۰	۱	۰	۰	۱	۱
۹	الاحزاب	۷، ۸	۱	۰	۰	۱	۲
۱۰	الشوریٰ	۱۳	۱	۰	۰	۰	۱
۱۱	الزخرف	۵۷، ۶۳	۱	۰	۰	۱	۲
۱۲	الحدید	۲۷	۱	۰	۰	۱	۱
۱۳	الصف	۶، ۱۵	۲	۰	۰	۲	۲

عمران وحنہ:

حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کے حالات میں گزر چکا ہے کہ بنی اسرائیل میں عمران ایک عابد وزاہد شخص تھے اور اسی زہد وعبادت کی وجہ سے نماز کی امامت بھی ان ہی کے سپرد تھی اور ان کی بیوی حنہ بھی بہت پارساء اور عابدہ تھیں اور اپنی نیکی کی وجہ سے دونوں بنی اسرائیل میں بہت زیادہ محبوب ومقبول تھے۔ ①

---

① تفسیر ابن کثیر ج ۱ (آل عمران)

محمد بن اسحٰق "صاحب مغازی" نے عمران کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے:

عمران بن یاشم بن میشا بن جزقیا بن ابراہیم بن عزریا بن ناوش بن اجر بن یہودا بن نازم بن مقاسط بن ایشا بن ایاز بن رخیعم (رحبعام) بن سلیمان بن داؤد (علیہ السلام) اور حافظ ابن عساکر نے ان ناموں کے علاوہ دوسرے نام بیان کیے ہیں اور ان دونوں بیانات میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے تاہم اس پر تمام علماء انساب کا اتفاق ہے کہ عمران حضرت سلیمان علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں اور حنہ بنت فاقوذ بن قبیل بھی داؤد علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ [1]

عمران صاحب اولاد نہیں تھے اور ان کی بیوی حنہ بہت زیادہ متمنی تھیں کہ ان کے اولاد ہو، وہ اس کے لیے درگاہ الٰہی میں دست بدعاء اور قبولیت دعاء کے لیے ہر وقت منتظر رہتی تھیں۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حنہ صحن مکان میں چہل قدمی کر رہی تھیں، دیکھا کہ ایک پرندا اپنے بچہ کو بھرا رہا ہے، حنہ کے دل پر یہ دیکھ کر سخت چوٹ لگی اور اولاد کی تمنا نے بہت جوش مارا اور حالت اضطراب میں بارگاہِ الٰہی میں دعاء کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے اور عرض کیا "پروردگار اسی طرح مجھ کو بھی اولاد عطاء کر کہ وہ ہماری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنے۔" دل سے نکلی ہوئی دعاء نے قبولیت کا جامہ پہنا اور حنہ نے چند روز بعد محسوس کیا کہ وہ حاملہ ہیں۔ حنہ کو اس احساس سے اس درجہ مسرت ہوئی کہ انہوں نے نذر مان لی کہ جو بچہ پیدا ہوگا اس کو ہیکل (مسجد اقصیٰ) کی خدمت کے لیے وقف کردوں گی۔ [2]

بہر حال اللہ تعالیٰ نے عمران کی بیوی حنہ کی دعاء کو شرف قبولیت بخشا اور وہ مسرت و شادمانی کے ساتھ امید بر آنے کی گھڑی کا انتظار کرنے لگیں۔

بشر بن اسحاق کہتے ہیں کہ حنہ ابھی حاملہ تھیں کہ ان کے شوہر عمران کا انتقال ہوگیا۔ [3]

مریم علیہا السلام کی ولادت:

جب مدت حمل پوری ہوگئی اور ولادت کا وقت آ پہنچا تو حنہ کو معلوم ہوا کہ ان کے بطن سے لڑکی پیدا ہوئی ہے، جہاں تک اولاد کا تعلق ہے حنہ کے لیے یہ لڑکی بھی لڑکے سے کم نہ تھی مگر ان کو یہ افسوس ضرور ہوا کہ میں نے جو نذر مانی تھی وہ پوری نہیں ہو سکے گی، اس لیے کہ لڑکی کس طرح مقدس ہیکل کی خدمت کر سکے گی؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے افسوس کو یہ کہہ کر بدل دیا کہ ہم نے تیری لڑکی کو ہی قبول کیا اور اس کی وجہ سے تمہارا خاندان بھی معزز اور مبارک قرار پایا، حنہ نے لڑکی کا نام مریم علیہا السلام رکھا، سریانی میں اس کے معنی [4] "خادم" کے ہیں، چونکہ یہ ہیکل کی خدمت کے لیے وقف کردی گئیں اس لیے یہ نام موزوں سمجھا گیا۔

قرآن عزیز نے اس واقعہ کو معجزانہ اختصار کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۵۶

[2] بنی اسرائیل کی مذہبی رسوم میں سے یہ رسم بہت مقدس سمجھی جاتی تھی کہ وہ اپنی اولاد کو ہیکل کی خدمت کے لئے وقف کریں۔ البدایہ والنہایہ ج ۲۔

[3] فتح الباری ج ۲ ص ۳۶۴۔ [4] فتح الباری ج ۶ ص ۳۶۵۔

وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۳۴﴾ إِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّىْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِىْ بَطْنِىْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّىْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّىْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ وَاِنِّىْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَاِنِّىْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۳۶﴾ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ؕ

(آل عمران: ۳۳۔۳۷)

"بیشک اللہ نے آدم اور نوح اور آل ابراہیم اور آل عمران ❶ کو (اپنے اپنے زمانہ میں جہاں) والوں پر بزرگی عطاء فرمائی (ان میں سے) بعض، بعض کی ذریت ہیں) اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے (وہ وقت یاد کرو جب عمران کی بیوی نے کہا: "خدایا! میں نے نذر مان لی ہے کہ میرے پیٹ میں جو (بچہ) ہے وہ تیری راہ میں آزاد ہے" پس تو اس کو میری جانب سے قبول فرما۔ بیشک تو سننے والا، جاننے والا ہے۔" پھر جب اس نے جنا تو کہنے لگی۔ "پروردگار! میرے لڑکی پیدا ہوئی ہے اور اللہ خوب جانتا ہے جو اس نے جنا ہے اور لڑکا اور لڑکی یکساں نہیں ہیں (یعنی ہیکل کی خدمت لڑکی نہیں کر سکتی لڑکا کر سکتا ہے) اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے۔ اور میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان الرجیم کے فتنہ سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ پس مریم کو اس کے پروردگار نے بہت اچھی طرح قبول فرمایا اور اس کی نشوونماء اچھے طریق پر کی اور زکریا کو اس کا نگران کار بنا دیا۔"

حضرت مریم علیہا السلام جب سن شعور کو پہنچیں اور یہ سوال پیدا ہوا کہ مقدس ہیکل کی یہ امانت کس کے سپرد کی جائے تو کاہنوں ❷ میں سے ہر ایک نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اس مقدس امانت کا کفیل مجھ کو بنایا جائے مگر اس امانت کی نگرانی کا اہل حضرت زکریا علیہ السلام سے زیادہ کوئی نہ تھا، اس لیے کہ وہ مریم علیہا السلام کی خالہ ایشاع (الیشبع) کے شوہر بھی تھے اور مقدس ہیکل کے معزز کاہن اور خدائے برتر کے نبی بھی تھے، اس لیے سب سے پہلے انہوں نے ہی اپنا نام پیش کیا مگر جب سب کاہنوں نے یہی خواہش ظاہر کی اور باہمی کشمکش کا اندیشہ ہونے لگا تو آپس میں طے پایا کہ قرعہ اندازی کے ذریعہ اس کا فیصلہ کر لیا جائے۔ اور بقول روایات بنی اسرائیل تین مرتبہ قرعہ اندازی کی گئی وہ دریا میں اپنے قلم (پورے) ڈالتے مگر قرعہ کی شرط کے مطابق ہر مرتبہ زکریا علیہ السلام ہی کا نام نکلتا، کاہنوں نے جب یہ دیکھا کہ اس معاملہ میں زکریا علیہ السلام کے ساتھ تائید غیبی ہے تو انہوں نے بخوشی اسی فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور اس طرح یہ "سعید امانت" حضرت زکریا علیہ السلام کے سپرد کر دی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ مریم علیہا السلام کی کفالت کا یہ معاملہ اس لیے پیش آیا کہ وہ یتیم تھیں اور مردوں میں سے کوئی ان کا کفیل نہیں تھا بعض کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں قحط کا بہت زور تھا اس لیے کفالت کا سوال پیدا ❸ ہوا۔ لیکن یہ دونوں باتیں اگر نہ بھی ہوتیں تب بھی

---

❶ عمران حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد کا نام بھی ہے اور حضرت مریم علیہا السلام کے والد کا بھی یہاں والد مریم علیہا السلام مراد ہیں۔
❷ کاہن سے وہ مقدس ہستیاں مراد ہیں جو ہیکل میں مذہبی رسوم ادا کرتی اور خدمت ہیکل پر مامور تھیں۔
❸ تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳۶۰۔

کفالت کا سوال اپنی جگہ پھر بھی باقی رہتا اس لیے کہ مریم علیہا السلام اپنی والدہ کی نذر کے مطابق "نذر ہیکل" ہو چکی تھیں اور چونکہ لڑکی تھیں اس لیے از بس ضروری تھا کہ وہ کسی مرد نیک کی کفالت میں اس خدمت کو انجام دیتیں۔

غرض زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم علیہا السلام کے صنفی احترامات کا لحاظ رکھتے ہوئے ہیکل کے قریب ایک حجرہ ان کے لیے مخصوص کر دیا تاکہ وہ دن میں وہاں رہ کر عبادت الٰہی سے بہرہ ور ہوں اور جب رات آتی تو ان کو اپنے مکان پر ان کی خالہ ایشاع کے پاس لے جاتے اور وہ وہیں شب بسر کرتیں۔ ①

حنہ اور ایشاع:

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جمہور کا قول یہ ہے کہ ایشاع (الیشبع مریم علیہا السلام کی ہمشیر تھیں اور حدیث معراج میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسیٰ اور یحییٰ علیہما السلام کے متعلق یہ فرما کر ((وھما ابنا خالۃ)) جو رشتہ ظاہر فرمایا ہے اس سے بھی جمہور کے قول کی تائید ہوتی ہے۔

لیکن جمہور کا یہ قول قرآن عزیز اور "تاریخ" دونوں کے خلاف ہے اس لیے کہ قرآن نے مریم علیہا السلام کی ولادت کے واقعہ کو جس اسلوب کے ساتھ بیان کیا ہے وہ صاف بتا رہا ہے کہ عمران اور حنہ، مریم علیہا السلام کی ولادت سے قبل اولاد سے قطعاً محروم تھیں یہی وجہ ہے کہ حنہ نے مریم علیہا السلام کی ولادت پر یہ نہیں کہا "خدایا! میرے تو پہلے بھی ایک لڑکی موجود تھی، اب تو نے دوبارہ بھی لڑکی ہی عطاء فرمائی" بلکہ درگاہِ الٰہی میں یہ عرض کیا کہ جس شکل میں میری دعا کو تو نے قبول فرمائی ہے اس کو حسب وعدہ تیری نذر کیسے کروں؟ نیز تورات اور بنی اسرائیل کی تاریخ سے بھی کہیں یہ ثابت نہیں کہ عمران اور حنہ کے مریم علیہا السلام کے ماسواء کوئی اور اولاد بھی تھی بلکہ اس کے برعکس تاریخ یہود اور اسرائیلیات کا مشہور قول یہ ہے کہ ایشاع، مریم علیہا السلام کی خالہ تھیں۔

دراصل جمہور کی جانب یہ منسوب قول صرف حدیث معراج کے مسطورہ بالا جملہ کے پیش نظر ظہور میں آیا ہے حالانکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ((وھما ابنا خالۃ)) وہ دونوں خالہ زاد بھائی ہیں، مجاز متعارف کی شکل میں ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ طریق توسع والدہ کی خالہ کو عیسیٰ علیہ السلام کی خالہ فرمایا ہے اور اس قسم کا توسع عام بول چال میں شائع ذائع ہے۔

علاوہ ازیں ابن کثیر رحمہ اللہ کا اس کو قول جمہور کہنا بھی محل نظر ہے اس لیے کہ محمد بن اسحاق، اسحاق بن بشر، ابن عساکر، ابن جریر اور ابن حجر رحمہم اللہ جیسے جلیل القدر اصحاب حدیث و سیر کا رجحان اس جانب ہے کہ ایشاع، حنہ کی ہمشیر اور مریم علیہا السلام کی خالہ ہیں، حنہ کی بیٹی نہیں ہیں۔

---

① روح المعانی سورۂ آل عمران.... مولانا آزاد ترجمان القرآن میں لکھتے ہیں۔ قرآن میں حضرت مسیح علیہ السلام کے ظہور کا ذکر زیادہ تفصیل کے ساتھ دو جگہ کیا گیا ہے، یہاں اور سورۂ آل عمران کی آیات (۳۵۔۶۳) میں یہاں یہ ذکر حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش کے بیان سے شروع ہوا ہے اور اناجیل اربعہ میں سے سینٹ لوقا کی انجیل ٹھیک اسی طرح یہ تذکرہ شروع کرتی ہے لیکن سورۂ آل عمران میں یہ تذکرہ اس سے پیشتر کے ایک واقعہ سے شروع ہوتا ہے یعنی حضرت مریم علیہا السلام کی پیدائش اور ہیکل میں پرورش پانے کے واقعہ سے اور اس بارہ میں چاروں انجیل خاموش ہیں لیکن انیسویں صدی میں متروک اناجیل کا جو نسخہ ویٹیکان کے کتب خانہ سے برآمد ہوا اس نے حضرت مریم علیہا السلام کی پیدائش کا یہ مفقود ٹکڑا کر دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم چوتھی صدی عیسوی کے اوائل تک سرگزشت کا یہ ٹکڑا بھی اسی طرح الہامی یقین کیا جاتا تھا جس طرح بقیہ ٹکڑے یقین کیے جاتے ہیں۔ ج ۲ ص ۴۴۳۔

Marfat.com

مریم علیہا السلام کا زہد وتقویٰ:

زکریا علیہ السلام مریم علیہا السلام کی ضروری نگہداشت کے سلسلہ میں کبھی کبھی ان کے حجرہ میں تشریف لے جایا کرتے تھے لیکن ان کو یہ بات عجیب نظر آتی کہ جب وہ خلوت کدہ میں داخل ہوتے تو مریم علیہا السلام کے پاس اکثر بے موسم کے تازہ پھل موجود پاتے۔ [1] آخر زکریا علیہ السلام سے نہ رہا گیا اور انہوں نے دریافت کیا: مریم تیرے پاس یہ بے موسم پھل کہاں سے آتے ہیں؟ مریم علیہا السلام نے فرمایا: "یہ میرے پروردگار کا فضل وکرم ہے، وہ جس کو چاہتا ہے بے گمان رزق پہنچاتا ہے۔" حضرت زکریا علیہ السلام نے یہ سنا تو سمجھ گئے کہ خدائے برتر کے یہاں مریم علیہا السلام کا خاص مقام اور مرتبہ ہے اور ساتھ ہی بے موسم تازہ پھلوں کے واقعہ نے دل میں یہ تمنا پیدا کر دی کہ جس خدا نے اپنی قدرت کاملہ سے یہ پھل بے موسم پیدا کر دیے، کیا وہ میرے بڑھاپے اور بیوی کے بانجھ ہونے کے باوجود مجھ کو بے موسم پھل (بیٹا) عطاء نہ کرے گا؟ یہ سوچ کر انہوں نے خشوع وخضوع کے ساتھ بارگاہِ ربانی میں دعاء کی اور وہاں سے شرف قبولیت کا مژدہ عطاء ہوا۔

﴿وَ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝﴾ (آل عمران: ۳۷)

"اور اس (مریم) کی کفالت زکریا نے کی، جب اس (مریم) کے پاس زکریا داخل ہوتے تو اس کے پاس کھانے کی چیزیں رکھی پاتے۔ زکریا نے کہا: "اے مریم! یہ تیرے پاس کہاں سے آئیں؟" مریم (علیہا السلام) نے کہا "یہ اللہ کے پاس سے آئی ہیں بلاشبہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بے گمان رزق دیتا ہے۔"

مریم علیہا السلام اسی طرح ایک عرصہ تک اپنے مقدس مشاغل کے ساتھ پاک زندگی بسر کرتی رہیں اور مقدس ہیکل کا سب سے مقدس مجاور حضرت زکریا علیہ السلام بھی ان کے زہد وتقویٰ سے بے حد متاثر تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی عظمت اور جلالت قدر کو اور زیادہ بلند کیا اور فرشتوں کے ذریعہ ان کو برگزیدہ بارگاہ الٰہی ہونے کی یہ بشارت سنائی۔

﴿وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَ طَهَّرَكِ وَ اصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝﴾ (آل عمران: ۴۲-۴۳)

"(اے پیغمبر وہ وقت یاد کیجئے) جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو بزرگی دی اور پاک کیا اور دنیا کی عورتوں پر تجھ کو برگزیدہ کیا، اے مریم! اپنے پروردگار کے سامنے جھک جا اور سجدہ ریز ہو جا اور نماز پڑھنے والوں کے ساتھ نماز ادا کر۔"

﴿وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۠ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ

[1] یہ تفصیل اگرچہ تفسیری روایات سے ماخوذ ہے اور آیت میں صرف لفظ رزق آیا ہے لیکن آیت سے بصراحت ثابت ہوتا ہے کہ مریم علیہا السلام کا یہ رزق انسانی داد ودہش کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ بطور کرامت منجانب اللہ تھا۔ (مؤلف)

Marfat.com

﴿يَخْتَصِمُونَ﴾ (آل عمران: ٤٤)

"اور تم اس وقت ان کاہنوں کے پاس موجود نہ تھے جب وہ اپنے قلموں پوروں) کو قرعہ اندازی کے لیے) ڈال رہے تھے کہ مریم کی کفالت کون کرے اور تم اس وقت (بھی) موجود نہ تھے جب وہ اس کفالت کے بارے میں آپس میں جھگڑ رہے تھے۔"

حضرت مریم علیہا السلام جبکہ نہایت مرتاض، عابد و زاہد اور تقویٰ و طہارت میں ضرب المثل تھیں اور جبکہ عنقریب ان کو جلیل القدر پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ ہونے کا شرف بھی حاصل ہونے والا تھا تو من جانب اللہ ان کی تقدیس و تطہیر کا یہ اعلان بلاشبہ حق بہ حقدار رسید کا مصداق ہے، تاہم علمی اور تاریخی اعتبار سے بلکہ خود قرآن و احادیث کے مفہوم کے لحاظ سے یہ مسئلہ قابل توجہ ہے کہ آیت ﴿وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کی مراد کیا ہے، اور کیا درحقیقت حضرت مریم علیہا السلام کو بغیر کسی استثناء کے کائنات کی تمام عورتوں پر برتری اور فضیلت حاصل ہے؟ اور یہی نہیں بلکہ اس آیت فضیلت نے مریم علیہا السلام کی ذات سے متعلق علماء سلف میں چند اہم مسائل کو زیر بحث بنا دیا ہے مثلاً: ① کیا عورت نبی ہوسکتی ہے؟ ② کیا حضرت مریم علیہا السلام نبی تھیں؟ ③ اگر نبی نہیں تھیں تو آیت کے جملہ ﴿وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کا مطلب کیا ہے؟

کیا عورت نبی ہوسکتی ہے؟:

محمد بن اسحاق، شیخ ابو الحسن اشعری، قرطبی، ابن حزم (نور اللہ مرقدہم) اس جانب مائل ہیں کہ عورت نبی ہوسکتی ہے بلکہ ابن حزم تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت حوا، سارہ، ہاجرہ، اُمِ موسیٰ، آسیہ اور مریم علیہم السلام یہ سب نبی تھیں اور محمد بن اسحاق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اکثر فقہاء اس کے قائل ہیں کہ عورت نبی ہوسکتی ہے اور قرطبی فرماتے ہیں کہ مریم علیہا السلام نبی تھیں۔

ان حضرات کے اقوال کے برعکس خواجہ حسن بصری، امام الحرمین شیخ عبد العزیز اور قاضی عیاض (نور اللہ مرقدہم) کا رجحان اس جانب ہے کہ عورت نبی نہیں ہوسکتی اور اس لیے مریم علیہا السلام بھی نبی نہیں تھیں۔ قاضی اور ابن کثیر یہ بھی کہتے ہیں کہ جمہور کا مسلک یہی ہے اور امام الحرمین تو اجماع تک دعویٰ کرتے ہیں۔ جو علماء یہ فرماتے ہیں کہ عورت نبی نہیں ہوسکتی وہ اپنی دلیل میں اس آیت کو پیش کرتے ہیں:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ﴾ (النحل: ٤٣)

"اور تم سے پہلے ہم نے نہیں بھیجے مگر مرد کہ وحی بھیجتے تھے ہم ان کی طرف۔"

اور خصوصیت کے ساتھ حضرت مریم علیہا السلام کی نبوت کے انکار پر یہ دلیل دیتے ہیں کہ قرآن عزیز نے ان کو "صدیقہ" کہا ہے، سورۂ مائدہ میں ہے:

﴿مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۭ﴾ (المائدہ: ٧٥)

"پس ابن مریم تو ایک پیغمبر ہیں جن سے پہلے اور بھی پیغمبر گزر چکے اور ان کی والدہ صدیقہ تھیں۔"

Marfat.com

اور سورۂ نساء میں قرآن عزیز نے منعم علیہم کی جو فہرست دی ہے وہ اس کے لیے نص قطعی ہے کہ "صدیقیت" کا درجہ "نبوت" سے کم اور نازل ہے۔ ❶

اور جو حضرات عورت کے نبی ہونے کے قائل ہیں وہ فرماتے ہیں کہ قرآن عزیز نے حضرت سارہ، ام موسیٰ اور حضرت مریم (علیہن السلام) کے متعلق جن واقعات کا اظہار کیا ہے ان میں بصراحت موجود ہے کہ ان پر خدا کے فرشتے وحی لے کر نازل ہوئے اور ان کو منجانب اللہ بشارات سے سرفراز فرمایا اور ان تک اپنی معرفت، عبادت کا حکم پہنچایا، چنانچہ حضرت سارہ کے لیے سورۂ ہود اور سورہ الذریات اور ام موسیٰ کے لیے سورۂ قصص میں اور مریم علیہا السلام کے لیے آل عمران اور سورۂ مریم میں بواسطہ ملائکہ اور بلا واسطہ خطاب الٰہی موجود ہے اور ظاہر ہے کہ ان مقامات پر وحی کے لغوی معنی (وجدانی ہدایت یا مخفی اشارہ) کے نہیں ہیں جیسا کہ آیت ﴿وَ اَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ﴾ میں شہد کی مکھی کے لیے وحی کا اطلاق کیا گیا ہے۔

اور خصوصیت کے ساتھ حضرت مریم علیہا السلام کے نبی ہونے کی یہ واضح دلیل ہے کہ سورہ مریم میں ان کا ذکر اسی اسلوب کے ساتھ کیا گیا ہے جس طریقہ پر دیگر انبیاء ورسل کا تذکرہ ہے مثلاً:

﴿وَاذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ مُوْسٰۤی.... وَاذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ اِدْرِیْسَ.... وَاذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ اِسْمٰعِیْلَ.... وَاذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ اِبْرٰهِیْمَ.... وَاذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ مَرْیَمَ﴾ یا مثلاً: ﴿وَاَرْسَلْنَاۤ اِلَیْهَا رُوْحَنَا﴾

ہم نے مریم علیہا السلام کی جانب اپنے فرشتہ جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا۔ یا مثلاً ﴿قَالَ اِنَّمَاۤ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ﴾ میں بلاشبہ تیرے پروردگار کی جانب سے پیغامبر ہوں" نیز آل عمران میں مریم علیہا السلام کو ملائکۃ اللہ نے جس طرح خدا کی جانب سے پیغامبر بن کر خطاب کیا ہے وہ بھی اس دعویٰ کی روشن دلیل ہے۔

اور مریم علیہا السلام کے صدیقہ ہونے سے متعلق جو سوال ہے اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر قرآن نے حضرت مریم علیہا السلام کو "صدیقہ" کہا ہے تو یہ لقب ان کی شان نبوت کے اسی طرح منافی نہیں ہے جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے مسلم نبی ہونے کے باوجود آیت ﴿یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ﴾ ❺ میں ان کا صدیق ہونا ان کے نبی ہونے کو مانع نہیں ہے بلکہ ذکر پاک مقامی خصوصیت کی بناء پر مذکور ہوا ہے۔ کیونکہ جو "نبی" ہے وہ بہرحال "صدیق" ضرور ہے البتہ اس کا عکس ضروری نہیں ہے۔

ان علماء اسلام کی ترجمانی جس تفصیل کے ساتھ کتاب الفصل میں مشہور محدث ابن حزم رحمہ اللہ نے کی ہے اس تفصیل وقوت کے ساتھ دوسری جگہ نظر سے نہیں گزری اس لیے سطور ذیل میں اس پورے مضمون کا ترجمہ لائق مطالعہ ہے۔

نبوۃ النساء اور ابن حزم:

یہ فصل ایسے مسئلہ کے متعلق ہے جس پر ہمارے زمانہ میں قرطبہ (اندلس) میں شدید اختلاف بپا ہوا، علماء کی ایک جماعت

---

❶ اُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِیْنَ ۚ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِیْقًا ﴿۶۹﴾

❷ سورۂ ہود آیت ۷۳-۷۱، والذریات آیت ۳-۲۹ ❸ قصص آیت ۷

❹ آل عمران ۴۲-۴۳-۴۵-۴۷ و سورۂ مریم ۱۶-۲۶ ❺ سورۂ یوسف

Marfat.com

کہتی ہے کہ عورت نبی نہیں ہوسکتی اور جو ایسا کہتا ہے کہ عورت نبی ہوسکتی ہے وہ ایک نئی بدعت ایجاد کرتا ہے اور دوسری جماعت قائل ہے کہ عورت نبی ہوسکتی ہے اور نبی ہوئی ہیں، اور ان دونوں سے الگ تیسری جماعت کا مسلک توقف ہے اور وہ اثبات ونفی دونوں باتوں میں سکوت کو پسند کرتے ہیں مگر جو حضرات عورت سے متعلق منصب نبوت کا انکار کرتے ہیں ان کے پاس اس انکار کی کوئی دلیل نظر نہیں آتی البتہ بعض حضرات نے اپنے اختلاف کی بنیاد اس آیت کو بنایا ہے ﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡهِمۡ﴾۔

میں کہتا ہوں کہ اس بارہ میں کس کو اختلاف ہے اور کس نے دعویٰ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ عورت کو ہدایت خلق کے لیے رسول بنا کر بھیجتا ہے یا اس نے کسی عورت کو "رسول" بنایا ہے، بحث رسالت کے مسئلہ میں نہیں ہے بلکہ نبوت میں ہے، پس طلب حق کے لیے ضروری ہے کہ اول یہ غور کیا جائے کہ لغت عرب میں لفظ "نبوت" کے کیا معنی ہیں؟ تو ہم اس لفظ کو "انباء" سے ماخوذ پاتے ہیں جس کے معنی "اطلاع دینا" ہیں، پس نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ کسی معاملہ کے ہونے سے قبل بذریعہ وحی اطلاع دے یا کسی بھی بات کے لیے اس کی جانب وحی نازل فرمائے وہ شخص مذہبی اصطلاح میں بلاشبہ "نبی" ہے۔

آپ اس مقام پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وحی کے معنی اس الہام کے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کی سرشت میں ودیعت کر دیا ہے جیسا کہ شہد کی مکھی کے متعلق خدائے برحق کا ارشاد ہے ﴿وَ اَوۡحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحۡلِ﴾ اور نہ وحی کے معنی ظن اور وہم کے لے سکتے ہیں اس لیے کہ ان دونوں کو علم یقین سمجھنا (جو وحی کا قدرتی نتیجہ ہے) مجنوں کے سوا اور کسی کا کام نہیں ہے اور نہ یہاں وہ معنی مراد ہو سکتے ہیں جو باب کہانتہ سے تعلق رکھتے ہیں (یعنی یہ کہ شیاطین، آسمانی باتوں کو سننے اور چرانے کی کوشش کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان پر شہاب ثاقب کے ذریعہ رجم کیا جاتا ہے اور جس کے متعلق قرآن یہ کہتا ہے:

﴿شَیٰطِیۡنَ الۡاِنۡسِ وَالۡجِنِّ یُوۡحِیۡ بَعۡضُهُمۡ اِلٰی بَعۡضٍ زُخۡرُفَ الۡقَوۡلِ غُرُوۡرًا﴾ (الانعام: ۱۱۲)

کیونکہ یہ "باب کہانتہ" رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت کے وقت سے مسدود ہوگیا اور نہ اس جگہ وحی کے معنی نجوم کے تجربات علمیہ سے تعلق رکھتے ہیں جو خود انسانوں کے باہم سیکھنے اور سکھانے سے حاصل ہو جایا کرتے ہیں اور نہ اس کے معنی اس کے رویا (خواب) کے ہو سکتے ہیں جن کے سچ یا جھوٹ ہونے کا کوئی علم نہیں ہے بلکہ ان تمام معانی سے جدا "وحی بمعنی نبوۃ" یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے قصد اور ارادہ سے ایک شخص کو ایسے امور کی اطلاع دے جن کو وہ پہلے سے نہیں جانتا اور مسطورۂ بالا ذرائع علم سے الگ یہ امور حقیقت ثابتہ بن کر اس شخص پر اس طرح منکشف ہو جائیں گویا آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ اس علم خاص کے ذریعہ اس شخص کو بغیر کسی محنت وکسب کے بداہۃً ایسا صحیح یقین عطاء کر دے کہ وہ ان امور کو اس طرح معلوم کر لے جس طرح وہ حواس اور بداہت عقل کے ذریعہ حاصل کر لیا کرتا ہے اور اس کو کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور خدا کی یہ وحی یا تو اس طرح ہوتی ہے کہ فرشتہ آ کر اس شخص کو خدا کا پیغام سناتا ہے اور یا اس طرح کہ اللہ تعالیٰ براہ راست اس سے خطاب کرتا ہے۔

پس اگر ان حضرات کے نزدیک جو عورت کے نبی ہونے کا انکار کرتے ہیں نبوۃ کے معنی یہ نہیں ہیں تو وہ ہم کو سمجھائیں کہ آخر نبوت کے معنی ہیں کیا؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس کے ماسواء اور کوئی معنی بیان ہی نہیں کر سکتے۔

اور جبکہ نبوت کے معنی وہی ہیں جو ہم نے بیان کیے تو اب قرآن کے ان مقامات کا بغور مطالعہ کیجیے جہاں یہ مذکور ہے کہ اللہ

عزوجل نے عورتوں کے پاس فرشتوں کو بھیجا اور فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان عورتوں کو "وحی حق" سے مطلع کیا۔ چنانچہ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ام اسحاق (سارہ علیہا السلام) کو اسحاق علیہ السلام کی ولادت کی بشارت سنائی، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَ امْرَاَتُهٗ قَآىِٕمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَ مِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ۞ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰۤى ءَاَلِدُ وَ اَنَا عَجُوْزٌ وَّ هٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ۞ قَالُوْۤا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ؕ﴾ (سورۃ ھود: ۷۱۔۷۳)

ان آیات میں فرشتوں نے ام اسحاق کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اسحاق اور ان کے بعد یعقوب علیہما السلام کی بشارت سنائی ہے اور سارہ علیہا السلام کے تعجب پر یہ کہہ کر دوبارہ خطاب کیا ہے ﴿اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ﴾ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ والدۂ اسحاق (سارہ علیہا السلام) نبی تو نہ ہوں اور اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعہ اس طرح ان سے خطاب کرے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جبرئیل علیہ السلام فرشتہ کو مریم (ام عیسیٰ علیہا السلام) کے پاس بھیجتا ہے اور ان کو مخاطب کر کے یہ کہتا ہے:

﴿قَالَ اِنَّمَاۤ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ۞﴾ (سورۃ مریم: ۱۹)

تو یہ "وحی حقیقی" کے ذریعہ نبوت نہیں تو اور کیا ہے اور کیا اس آیت میں صاف طور پر نہیں کہا گیا ہے کہ مریم علیہا السلام کے پاس جبرئیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی جانب سے پیغامبر بن کر آئے؟ نیز زکریا علیہ السلام جب مریم علیہا السلام کے حجرہ میں آتے تو ان کے پاس اللہ کا غیب سے دیا ہوا رزق پاتے تھے اور انہوں نے اسی رزق کو دیکھ کر بارگاہِ الٰہی میں صاحب فضیلت لڑکا پیدا ہونے کی دعا کی تھی، اسی طرح ہم موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے معاملہ میں دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی نازل فرمائی کہ تم اپنے اس بچہ کو دریا میں ڈال دو اور ساتھ ہی ان کو اطلاع دی کہ میں اس کو تمہاری جانب واپس کروں گا اور اس کو "نبی مرسل" بناؤں گا، پس کون شک کر سکتا ہے کہ یہ "نبوت" کا معاملہ نہیں ہے، معمولی عقل وشعور رکھنے والا آدمی بھی بآسانی یہ سمجھ سکتا ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کے عطاء کردہ شرف نبوت سے وابستہ نہ ہوتا اور محض خواب کی بناء پر یا دل میں پیدا شدہ وسوسہ کی وجہ سے وہ ایسا کرتیں تو ان کا یہ عمل نہایت ہی مجنونانہ اور متہورانہ ہوتا اور اگر آج ہم میں سے کوئی ایسا کر بیٹھے تو ہمارا یہ عمل یا گناہ قرار پائے گا اور یا ہم کو مجنوں اور پاگل کہا جائے گا اور علاج کے لیے پاگل خانہ بھیج دیا جائے گا یہ ایک ایسی صاف اور واضح بات ہے جس میں شک وشبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تب یہ کہنا قطعاً درست ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں ڈال دینا اسی طرح وحی الٰہی کی بناء پر تھا جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رویا[1] (خواب) میں اپنے بیٹے (اسماعیل علیہ السلام) کا ذبح کرنا بذریعہ وحی معلوم کر لیا تھا اس لیے کہ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نبی نہ ہوتے اور ان کے ساتھ وحی الٰہی کا سلسلہ وابستہ نہ ہوتا اور پھر وہ یہ عمل محض ایک خواب یا نفس میں پیدا شدہ ظن کی وجہ سے کر گزرتے تو ہر شخص ان کے اس عمل کو یا گناہ سمجھتا یا انتہائی جنون یقین کرتا تو اب بغیر کسی تردد کے یہ کہا جا سکتا ہے

---

[1] نبیا کا خواب وحی ہوتا ہے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک حدیث میں ایسا ہی فرمایا ہے۔

Marfat.com

کہ ام موسیٰ علیہا السلام نبی تھیں۔

علاوہ ازیں حضرت مریم علیہا السلام کی نبوت پر ایک یہ دلیل بھی پیش کی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ کٓھٰیٰعٓصٓ میں ان کا ذکر انبیاء علیہم السلام کے زمرہ میں کیا ہے اور اس کے بعد ارشاد فرمایا ہے: ۔

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ۗ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ﴾ (سورۃ مریم: ۵۸)

"یہی ہیں وہ انبیاء آدم کی نسل سے اور ان میں سے جن کو ہم نے نوح (علیہ السلام) کے ساتھ کشتی میں سوار کیا (جن پر اللہ کا انعام واکرام ہوا)"۔

تو آیت کے اس عموم میں مریم علیہا السلام کی تخصیص کر کے ان کو انبیاء کی فہرست میں سے الگ کر لینا کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔

رہی یہ بات کہ قرآن نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مریم علیہا السلام کے لیے یہ کہا ہے ﴿وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ﴾ تو یہ لقب ان کی نبوت کے لیے اسی طرح مانع نہیں جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے نبی اور رسول ہونے کے لیے یہ آیت مانع نہیں ﴿يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ ﴾ اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ (وباللہ التوفیق)

اب حضرت سارہ، حضرت مریم، حضرت ام موسیٰ (علیہن السلام) کے مسئلہ نبوت کے ساتھ فرعون کی بیوی (آسیہ) کو بھی شامل کر لیجئے۔ اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: [1]

((کمل من الرجال کثیر ولم یکمل من النساء الا مریم بنت عمران و آسیة بنت مزاحم امرأة فرعون (او کما قال علیه السلام).

"یعنی مردوں میں سے تو بہت سے آدمی کامل ہوئے ہیں مگر عورتوں میں سے صرف یہی دو کامل ہوئیں مریم بنت عمران اور آسیہ بنت مزاحم زوجہ فرعون۔"

اور واضح رہے کہ مردوں میں یہ درجہ کمال بعض رسولوں (علیہم السلام) کو حاصل ہوا ہے اور اگرچہ ان کے علاوہ انبیاء و رسل بھی درجہ نبوت و رسالت پر مامور ہیں لیکن ان مرسلین کاملین کے درجہ سے نازل ہیں، اس لیے حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن عورتوں کو منصب نبوت سے سرفراز فرمایا ہے ان میں صرف ان دو عورتوں کو ہی درجہ کمال تک پہنچنے کی فضیلت حاصل ہے کیونکہ حدیث میں جس درجہ کمال کا ذکر ہو رہا ہے جو ہستی بھی اس درجہ سے نازل ہے وہ کامل نہیں ہے۔

بہر حال اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ اگرچہ بعض عورتیں بہ نص قرآن نبی ہیں لیکن ان میں سے ان دو عورتوں کو بھی درجہ کمال حاصل ہوا۔ درجات کے اس فرق کو خود قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے: ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ﴾ حقیقت یہ ہے کہ کامل اس کو کہا جاتا ہے جس کی نوع میں سے کوئی دوسرا اس کا ہمسر نہ ہو پس مردوں میں سے ایسے کامل خدا کے چند ہی رسول ہوئے ہیں جن کی ہمسری دوسرے انبیاء و رسل کو عطا نہیں ہوئی اور بلاشبہ ان ہی کاملین میں سے ہمارے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور

[1] بخاری میں الفاظ حدیث یہ ہیں: ((قال رسول اللہ ﷺ کمل من الرجال کثیر ولم یکمل من النساء الا آسیة امراة فرعون و مریم بنت عمران وان فضل عائشة علی النساء کفضل الثرید علی سائر الطعام))

Marfat.com

ابراہیم علیہ السلام ہیں جن کے متعلق نصوص (قرآن وحدیث) نے ان فضائل کمال کا اظہار کیا ہے جو دوسرے انبیاء ورسل کو حاصل نہیں ہیں، اسی طرح عورتوں میں سے وہی درجہ کمال کو پہنچی ہیں جن کا ذکر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں کیا ہے۔ [1]

ابن حزم رحمہ اللہ کے اس طویل مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر وحی کے ان معانی کو نظر انداز کر کے "جن کا اطلاق بلحاظ عموم لغت جبلت یا نفس میں ظن ووہم کے درجہ کا القاء والہام پر ہوتا ہے" وہ اصطلاحی معنی لیے ہیں جن کو قرآن نے انبیاء ورسل کے لیے مخصوص کیا ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں ایک وہ (وحی) جس کا منشاء مخلوق خدا کی رشد وہدایت اور تعلیم اوامر ونواہی سے ہوتا اور دوسری یہ کہ خدائے تعالیٰ کسی شخص سے براہِ راست یا فرشتہ کے واسطہ سے اس قسم کا خطاب کرے کہ جس سے بشارات دینا، یا کسی ہونے والے واقعہ کی ہونے سے قبل اطلاع دینا یا خاص اس کی ذات کے لیے کوئی امر ونہی فرمانا مقصود ہو، اب اگر پہلی صورت ہے تو یہ "نبوۃ مع الرسالۃ" [2] ہے اور بالاتفاق سب کے نزدیک یہ درجہ صرف مردوں کے ساتھ ہی مخصوص ہے جیسا کہ سورہ النحل کی آیت سے واضح ہے اور اس مسئلہ میں قطعاً دورائے نہیں ہیں۔

اور اگر وحی الٰہی کی دوسری شکل ہے تو ابن حزم رحمہ اللہ اور ان کے مؤیدین علماء کی رائے میں یہ بھی نبوت ہی کی ایک قسم ہے کیونکہ قرآن عزیز نے سورۂ شوریٰ میں انبیاء علیہم السلام پر نزول وحی کے جو طریقے بیان کیے ہیں وہ اس وحی پر بھی صادق آتے ہیں۔ سورۂ شوریٰ میں ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝۵۱﴾ (الشوریٰ: ۵۱)

"اور کسی انسان کے لیے یہ صورت ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے (بالمشافہ) گفتگو کرے مگر یا وحی کے ذریعہ یا پس پردہ کلام کے ذریعہ اور یا اس صورت سے کہ اللہ کسی فرشتہ کو پیغامبر بنا کر بھیجے اور وہ اس کی اجازت سے جس کو کہ وہ چاہے اس بشر کو وحی لا کر سنا دے بلاشبہ وہ بلند وبالا حکمت والا ہے۔"

اور جبکہ قرآن نے وحی کی اس دوسری قسم کا اطلاق بہ نص صریح حضرت مریم، حضرت سارہ، حضرت ام موسیٰ اور حضرت [آ]سیہ علیہن السلام پر کیا ہے جیسا کہ سورۂ ہود، قصص اور مریم سے ظاہر ہوتا ہے تو ان مقدس عورتوں پر "نبی کا اطلاق" قطعاً صحیح ہے اور [ا]س کو بدعت کہنا سرتاسر غلط ہے۔

ابن حزم رحمہ اللہ کے مؤید علماء نے اس سلسلہ میں پیدا ہونے والے اس شبہ کا جواب بھی دیا ہے "کہ قرآن نے جس طرح [صا]ف الفاظ میں مرد انبیاء کو نبی اور رسول کہا ہے اس طرح ان عورتوں میں سے کسی کو نہیں کہا" جواب کا حاصل یہ ہے کہ جبکہ "نبوۃ مع [الر]سالۃ" جو کہ مردوں کے لیے ہی مخصوص ہے کائنات انسانی کی رشد وہدایت اور تعلیم وتبلیغ نوع انسانی سے متعلق ہوتی ہے تو اس کا

---

[1] الفصل فی الملل والاہواء والنحل مطبوعہ مصر ۱۳۴۸ھ ج ۵ ص ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴ یہ بحث فتح الباری ج ۶ ص ۳۴۷۔ ۳۴۸۔ ۳۶۸ مطبوعہ مصر میں بھی قابل [م]راجعت ہے۔

[2] [ی]ہاں نبی اور رسول کے اس فرق کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جو علم کلام کی خاص اصطلاح ہے کیونکہ قرآن کثرت کے ساتھ نبی اور رسول کو مترادف معنی میں [اس]تعمال کرتا ہے۔

Marfat.com

تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس شخص کو اس شرف سے ممتاز فرمایا ہے اس کے متعلق وہ صاف صاف اعلان کرے کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا نبی اور رسول ہے، تاکہ امت پر اس کی دعوت و تبلیغ کا قبول کرنا لازم ہو جائے اور خدا کی حجت پوری ہو اور چونکہ نبوت کی وہ قسم جس کا اطلاق عورتوں پر بھی ہوتا ہے خاص اسی ہستی سے وابستہ ہوتی ہے جس کو یہ شرف ملا ہے تو اس کے متعلق صرف یہی اظہار کر دینا کافی ہے کہ جو "وحی من اللہ" انبیاء و رسل کے لیے ہی مخصوص ہے اس سے ان چند عورتوں کو بھی مشرف کیا گیا ہے۔

عورتوں کی نبوت کے اثبات و انکار کے علاوہ تیسری رائے ان علماء کی ہے جو اس مسئلہ میں "سکوت اور توقف" کو ترجیح دیتے ہیں ان میں شیخ تقی الدین سبکی رحمہ اللہ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، فتح الباری میں ان کا یہ قول مذکور ہے:

قال السبکی اختلف فی ھٰذہ المسئلة و لم یصح عندی فی ذٰلك شیء..... الخ [1]

سبکی فرماتے ہیں: "اس مسئلہ میں علماء کی آراء مختلف ہیں اور میرے نزدیک اس بارہ میں اثباتاً یا نفیاً کوئی بات ثابت نہیں ہے۔"

کیا حضرت مریم علیہا السلام نبی ہیں؟:

اس تفصیل سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کی نبوت کے انکار پر امام الحرمین کا دعوائے اجماع صحیح نہیں ہے۔ نیز یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ فہرست انبیاء میں مسطورۂ بالا دوسری مقدس عورتوں کے مقابلہ میں حضرت مریم علیہا السلام کی نبوت کے متعلق قرآنی نصوص زیادہ واضح ہیں، یہی وجہ ہے کہ امام شعرانی، ابن حزم اور قرطبی رحمہم اللہ کے درمیان حضرت مریم علیہا السلام کے علاوہ نبیات کی فہرست کے بارہ میں خاصہ اختلاف نظر آتا ہے [2] اور حضرت مریم علیہا السلام کی نبوت کے متعلق تمام مثبتین نبوت کا اتفاق ہے۔

ہم کو ابن کثیر رحمہ اللہ کے اس دعویٰ سے بھی اختلاف ہے کہ جمہور، انکار کی جانب ہیں، البتہ اکثریت غالباً سکوت اور توقف کو پسند کرتی ہے۔

آیت ﴿وَ اصْطَفٰكِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ﴾ کا مطلب:

جو علماء عورتوں میں نبوت کے قائل ہیں اور حضرت مریم علیہا السلام کو نبی تسلیم کرتے ہیں، ان کے مسلک کے مطابق تو آیت ﴿وَ اصْطَفٰكِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ﴾ کا مطلب صاف اور واضح ہے وہ یہ کہ حضرت مریم علیہا السلام کو کائنات کی تمام عورتوں پر فضیلت حاصل ہے، جو عورتیں نبی نہیں ہیں ان پر اس لیے کہ مریم علیہا السلام نبی ہیں اور جو عورتیں نبی ہیں ان پر اس لیے کہ وہ ان قرآنی نصوص کے پیش نظر جو ان کے فضائل و کمالات سے تعلق رکھتی ہیں باقی نبیات پر برتری رکھتی ہیں۔

لیکن جو علماء عورتوں کی نبوت کا انکار فرماتے ہیں اور حضرت مریم علیہا السلام کو "نبیہ" نہیں تسلیم کرتے وہ اس آیت کی مراد میں دو جدا جدا خیال رکھتے ہیں، بعض کہتے ہیں کہ آیت کا جملہ ﴿نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ﴾ عام ہے اور ماضی، حال اور مستقبل کی تمام عورتوں کو شامل ہے۔ اس لیے بلاشبہ حضرت مریم علیہا السلام کو بغیر کسی استثناء کے کائنات انسانی کی تمام عورتوں پر فضیلت و برتری حاصل ہے اور اکثر کا قول یہ ہے کہ آیت کے لفظ ﴿الْعٰلَمِیْنَ﴾ سے کائنات کی وہ تمام عورتیں مراد ہیں جو حضرت مریم علیہا السلام کی معاصر تھیں۔ یعنی قرآن عزیز حضرت مریم علیہا السلام کے زمانہ کا واقعہ نقل کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ بشارت دی کہ وہ اپنے زمانہ کی تمام عورتوں

---

[1] فتح الباری ج ۶ کتاب الانبیاء [2] فتح الباری ج ۶ ص ۳۶۸

Marfat.com

میں برگزیدہ اور صاحب کمال ہیں اور ہم نے ان سب میں سے ان کو چن لیا ہے اور ﴿الْعٰلَمِیْنَ﴾ کا یہ اطلاق وہی حیثیت رکھتا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت (بنی اسرائیل) کے لیے اس آیت میں اختیار کی گئی ہے۔

﴿وَ لَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ۝﴾ (الدخان: ۳۲)

"اور بلاشبہ ہم نے اپنے علم سے ان (بنی اسرائیل) کو جہان والوں کے مقابلہ میں پسند کر لیا ہے۔"

اور جبکہ باتفاق آراء بنی اسرائیل کی فضیلت کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ ﴿الْعٰلَمِیْنَ﴾ سے ان کی معاصر امم و اقوام مراد ہیں کہ ان میں سے امت موسیٰ علیہ السلام کو فضیلت حاصل ہے تو حضرت مریم علیہا السلام کی فضیلت کے باب میں بھی یہی معنی مراد لینے چاہئیں۔

حضرت مریم علیہا السلام کا تقدس اور تقویٰ و طہارت، حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کی والدہ ہونے کا شرف، مرد کے ہاتھ لگائے بغیر معجزہ کے طور پر ان کے مشکوئے معلیٰ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت باسعادت بلاشبہ ایسے امور ہیں جن کی بدولت ان کو معاصر عورتوں پر فضیلت و برتری حاصل تھی۔

پھر یہ حقیقت بھی فراموش نہیں ہونی چاہیے کہ باب فضیلت ایک وسیع باب ہے اور جس طرح کسی شے کی حقیقت بیان کرنے میں بلیغ اور عمدہ طریق بیان یہ ہے کہ وہ جامع و مانع ہو یعنی اس کی حقیقت پر اس طرح حاوی ہو کہ تمام دوسری چیزوں سے ممتاز ہو جائے، نہ ایسی کوئی کمی رہ جائے کہ اصل حقیقت پوری طرح بیان نہ ہو سکے اور نہ ایسا اضافہ ہو کہ بعض دوسری حقائق بھی ان کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ اسی طرح اس کے برعکس بیان فضیلت کے لیے فصاحت و بلاغت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو بیان حقیقت کی طرح حدود و قیود میں نہ جکڑ دیا جائے کیونکہ اس مقام پر حقیقت شے نہیں بلکہ فضیلت شے کا اظہار ہو رہا ہے جو اگر اسی طرح کے دوسرے افراد پر بھی صادق آ جائے تو بیان حقیقت کی طرح اس میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا بلکہ اس موقع پر وسعت بیان ہی ازبس ضروری ہوتا ہے تاکہ مخاطب کے دل میں اظہار فضیلت سے جو نفسیاتی اثر پیدا کرنا ہے وہ دل نشین اور مؤثر ہو سکے۔

تو ایسی صورت میں ﴿عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ﴾ کے معنی یہ نہیں ہوں گے کہ حضرت مریم علیہا السلام کے علاوہ دوسری کوئی مقدس عورت اس شرف کو نہیں پہنچ سکتی یا نہیں پہنچی بلکہ مطلب یہ ہوگا کہ حضرت مریم علیہا السلام کو فضائل و کمالات میں بلند سے بلند مرتبہ حاصل ہے، باب فضائل کی یہی وہ حقیقت ہے جس کے فراموش کر دینے پر فضائل صحابہ وغیرہ میں اکثر ہم کو لغزش ہو جاتی اور چند مقدس اشخاص سے متعلق فضائل کے مابین تضاد و تناقض نظر آنے لگتا ہے، البتہ ان فضائل کی حدود سے گزر کر جب ہم صاحب فضائل افراد کے انفرادی و اجتماعی اعمال کا جائزہ لے کر فرق مراتب بیان کرتے ہیں تو وہ ضرور ایک دوسرے کے لیے حد فاصل ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً حضرات صحابہ و صحابیات کے فضائل کے پیش نظر فرق مراتب کا صحیح فیصلہ جب ہی ممکن ہو سکتا ہے کہ ان کے ان فضائل کے ساتھ ساتھ جو زبان وحی ترجمان سے نکلے ہیں ان سے متعلق خصوصی ارشادات قرآنی و حدیثی، ان کی اسلامی خدمات، اسلام سے متعلق ان کی سرفروشیاں و جاں سپاریاں، نصرت حق میں، مالی فداکاریاں، اسلام کے نازک ترین لمحات میں ان کے علم و تدبر کی عقدہ کشائیاں اور ان کی عملی جدوجہد کی رفیع سرگرمیاں ان سب کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جائے۔

Marfat.com

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بشارات کتب سابقہ:

ادیان و ملل کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین حق اور ملت بیضاء کی تبلیغ و دعوت کا سلسلہ اگرچہ آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک برابر جاری رہا ہے لیکن اس سلسلہ کو مزید قوت پہنچانے اور سربلند کرنے کے لیے سنت اللہ یہ رہی ہے کہ صدیوں بعد ایک ایسے اولوالعزم اور جلیل القدر پیغمبر کو بھیجے جو امتداد زمانہ کی وجہ سے پیدا شدہ عام روحانی اضمحلال کو دور کر کے قبول حق کے افسردہ رجحانات میں تازگی بخشے اور ضعیف روحانی عواطف کو قوی سے قوی تر بنا دے، گویا مذہب کی خوابیدہ دنیا میں حق و صداقت کا صور پھونک کر ایک انقلاب عظیم بپا کر دے اور مردہ دلوں میں نئی روح ڈال دے اور اکثر ایسا ہوتا رہا ہے کہ جن اقوام و امم میں اس عظیم المرتبہ پیغمبر کی بعثت ہونے والی ہوتی ہے صدیوں پہلے ان کے ہادیان ملت اور داعیان حق (انبیاء علیہم السلام) اس مقدس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی بشارات وحی الٰہی کے ذریعہ سناتے رہتے ہیں تاکہ اس کی دعوت حق کے لیے زمین ہموار رہے اور جب اس نور حق کے روشن ہونے کا وقت آ جائے تو ان اقوام و امم کے لیے اس کی آمد غیر متوقع حادثہ نہ بن جائے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ان چند اولوالعزم، جلیل القدر اور مقدس رسولوں میں سے ایک ہیں اور اسی بناء پر انبیاء بنی اسرائیل میں سے متعدد انبیاء علیہم السلام ان کی آمد سے قبل ان کے حق میں منادی کرتے اور آمد کی بشارت سناتے نظر آتے ہیں اور ان ہی بشارات کی وجہ سے بنی اسرائیل مدت مدید سے منتظر تھے کہ مسیح موعود کا ظہور ہو تو ایک مرتبہ وہ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کی طرح اقوام عالم میں معزز و ممتاز ہوں گے اور رشد و ہدایت کی خشک کھیتی میں روح تازہ پیدا ہو گی اور خدا کے جاہ و جلال سے ان کے قلوب ایک مرتبہ پھر چمک اٹھیں گے۔ بائبل (توراۃ و انجیل) اپنی لفظی و معنوی تحریفات کے باوجود آج بھی ان چند بشارات کو اپنے سینہ میں محفوظ رکھتی ہیں جو حضرت مسیح (علیہ السلام) کی آمد سے تعلق رکھتی ہیں۔ توراۃ استثناء میں ہے:

"اور اس موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور شعیر (سائیر) سے ان پر طلوع ہوا، اور فاران کے پہاڑوں سے جلوہ گر ہوا۔" (ب ۳۳۔ آیت ۲۰)

اس بشارت میں "سینا سے خدا کی آمد" حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی جانب اشارہ ہے اور "سائیر سے طلوع ہونا" نبوت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہے، کیونکہ ان کی ولادت باسعادت اسی پہاڑ کے ایک مقام "بیت اللحم" میں ہوئی ہے اور یہی وہ مبارک جگہ ہے جہاں سے نور حق طلوع ہوا اور "فاران پر جلوہ گر ہونا" آفتاب رسالت کی بعثت کا اعلان ہے کیونکہ فاران، حجاز کے مشہور پہاڑی سلسلہ کا نام ہے۔ ❶

اور حضرت یسعیاہ نبی علیہ السلام کے صحیفہ میں ہے:

"دیکھ میں اپنا پیغمبر تیرے آگے بھیجتا ہوں جو تیری راہ تیار کرے گا، بیابان میں پکارنے والے کی آواز آتی ہے کہ خداوند کی راہ تیار کرو، اس کے راستے سیدھے بناؤ۔" ❷

اسی بشارت میں "پیغمبر" سے عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں اور بیابان میں پکارنے والے حضرت یحییٰ علیہ السلام ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مناد تھے اور ان کی بعثت سے قبل بنی اسرائیل میں ان کی بعثت رسالت کا مژدۂ جانفزا سناتے تھے۔

---

❶ تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔ ❷ باب ۴۰ آیات ۳۔۴

اور متی کی انجیل میں ہے:

"جب یسوع، ہیرودیس بادشاہ کے زمانہ میں یہودیہ کے بیت لحم میں پیدا ہوا تو دیکھو کئی مجوس پورب سے یروشلم میں یہ کہتے ہوئے آئے کہ یہودیوں کا بادشاہ جو پیدا ہوا ہے وہ کہاں ہے؟.... یہ سن کر ہیرودیس بادشاہ اور اس کے ساتھ یروشلم کے سب لوگ گھبرائے اور اس نے قوم کے سب سردار کاہنوں اور فقیہوں کو جمع کر کے ان سے پوچھا کہ مسیح کی پیدائش کہاں ہونی چاہیے؟ انہوں نے اس سے کہا کہ یہودیہ کے بیت لحم میں کیونکہ نبی (یسعیاہ علیہ السلام) کی معرفت یوں لکھا گیا ہے، اے بیت لحم یہوداہ کے علاقہ: تو یہوداہ کے حاکموں میں ہرگز سب سے چھوٹا نہیں کیونکہ تجھ میں سے ایک سردار نکلے گا جو میری امت اسرائیل کی گلہ بانی کرے گا۔" ❶

اور دوسری جگہ ہے:

"اور جب وہ یروشلم کے نزدیک پہنچے اور زیتون کے پہاڑ پر بیت فگے کے پاس آئے تو یسوع نے دو شاگردوں کو یہ کہہ کر بھیجا کہ اپنے سامنے کے گاؤں میں جاؤ وہاں پہنچتے ہی ایک گدھی بندھی ہوئی اور اس کے ساتھ بچہ تمہیں ملے گا، انہیں کھول کر میرے پاس لے آؤ اور اگر کوئی تم سے کچھ کہے تو کہنا کہ یہ خداوند کو درکار ہیں وہ فی الفور انہیں بھیج دے گا یہ اس لیے ہوا کہ جو نبی کی معرفت کہا گیا تھا وہ پورا ہو کہ "صیہون کی بیٹی سے کہو کہ دیکھ تیرا بادشاہ تیرے پاس آتا ہے وہ حلیم ہے اور گدھے پر سوار ہے بلکہ لادو بچہ پر۔" ❷

اور یوحنا کی انجیل میں ہے:

"اور یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کے لیے اس (یحییٰ علیہ السلام) کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں، انہوں نے اس سے پوچھا پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں، کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا نہیں، پس انہوں نے اس سے کہا پھر تو ہے کون؟ تاکہ ہم اپنے بھیجنے والوں کو جواب دیں کہ تو اپنے حق میں کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا میں جیسا کہ یسعیاہ نبی نے کہا ہے بیابان میں پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ سیدھی کرو۔" ❸

اور مرقس اور لوقا کی انجیلوں میں ہے:

"وہ لوگ منتظر تھے اور سب اپنے اپنے دل میں یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) کی بابت سوچتے تھے کہ آیا وہ مسیح تھے یا نہیں تو یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) نے ان سب کے جواب میں کہا: میں تو تمہیں بپتسمہ دیتا ہوں مگر جو مجھ سے زور آور ہے وہ آنے والا ہے میں اس کی جوتی کا تسمہ کھولنے کے لائق نہیں، وہ تمہیں روح القدس سے بپتسمہ دے گا۔" ❹

ان ہر دو بشارات سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہود اپنی مذہبی روایات کی بناء پر جن اولوالعزم پیغمبروں کی بعثت کے منتظر تھے ان میں مسیح علیہ السلام بھی تھے اور حضرت یحییٰ علیہ السلام ❺ نے ان کو بتایا کہ وہ نہ ایلیا ہیں نہ وہ نبی اور نہ مسیح علیہ السلام بلکہ مسیح علیہ السلام کی بعثت

❶ باب ۲ آیات ۱۔۶ ❷ باب ۲ آیات ۱۔۶ ❸ باب ۱ آیات ۱۹۔۲۳ ❹ لوقا باب ۱ آیات ۱۵۔۱۶
❺ عہد نامہ جدید (انجیل) میں یوحنا دو جدا جدا شخصیتیں ہیں ایک یحییٰ علیہ السلام اور دوسری عیسیٰ علیہ السلام کے حواری اور شاگرد۔

Marfat.com

کے مناد اور مبشر ہیں۔

قرآن عزیز نے بھی حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کے واقعہ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کی تمہید قرار دیا ہے اور یحییٰ علیہ السلام کا مبشر اور منادی بتایا ہے۔ آل عمران میں ہے:

﴿فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا ۢ بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (آل عمران:۳۹)

"پس فرشتوں نے اس (زکریا) کو اس وقت پکارا جبکہ وہ حجرہ میں کھڑا ہوا نماز پڑھ رہا تھا، بیشک اللہ تعالیٰ تجھ کو یحییٰ (فرزند) کی بشارت دیتا ہے، جو اللہ کے کلمہ (عیسیٰ علیہ السلام) کی تصدیق کرے گا۔"

ولادت مبارک:

عابد وزاہد اور عفت ماب مریم علیہا السلام اپنے خلوت کدہ میں مشغول عبادت رہتی اور ضروری حاجات کے علاوہ کبھی اس سے باہر نہیں نکلتی تھیں، ایک مرتبہ مسجد اقصیٰ (ہیکل) کے مشرقی جانب لوگوں کی نگاہوں سے دور کسی ضرورت سے ایک گوشہ میں تنہا بیٹھی تھیں کہ اچانک خدا کا فرشتہ (جبرئیل علیہ السلام) انسانی شکل میں ظاہر ہوا۔ حضرت مریم علیہا السلام نے ایک اجنبی شخص کو اس طرح بے حجاب سامنے دیکھا تو گھبرا گئیں اور فرمانے لگیں "اگر تجھ کو کچھ بھی خدا کا خوف ہے تو میں خدائے رحمان کا واسطہ دے کر تجھ سے پناہ چاہتی ہوں" فرشتے نے کہا: "مریم! خوف نہ کھا، میں انسان نہیں بلکہ خدا کا فرستادہ فرشتہ ہوں اور تجھ کو بیٹے کی بشارت دینے آیا ہوں" حضرت مریم علیہا السلام نے یہ سنا تو از راہ تعجب فرمانے لگیں: میرے لڑکا کیسے ہوسکتا ہے جبکہ مجھ کو آج تک کسی بھی شخص نے ہاتھ نہیں لگایا اس لیے کہ نہ تو میں نے نکاح کیا ہے اور نہ میں زانیہ ہوں" فرشتہ نے جواب دیا: میں تو تیرے پروردگار کا قاصد ہوں، اس نے مجھ سے اسی طرح کہا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ میں اس لیے کروں گا کہ تجھ کو اور تیرے لڑکے کو کائنات کے لیے اپنی قدرت کاملہ کے اعجاز کا "نشان" بنا دوں اور لڑکا میری جانب سے "رحمت" ثابت ہوگا اور میرا یہ فیصلہ اٹل ہے۔ مریم! اللہ تعالیٰ تجھ کو ایک ایسے لڑکے کی بشارت دیتا ہے جو اس کا "کلمہ" ❁ ہوگا، اس کا لقب "مسیح" ❁ اور اس کا نام عیسیٰ (علیہ السلام) (یسوع) ہوگا اور وہ دنیا اور آخرت دونوں میں باوجاہت اور صاحب عظمت رہے گا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی مقربین میں سے ہوگا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے نشان کے طور پر بحالت شیر خوارگی لوگوں سے باتیں کرے گا اور سن کہولت (بڑھاپے کا ابتدائی دور) بھی پائے گا تاکہ کائنات کی رشد وہدایت کی خدمت کی تکمیل کرے اور یہ سب کچھ اس لیے ضرور ہو کر رہے گا کہ اللہ تعالیٰ کا قانون قدرت یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کو وجود میں لانا چاہتا ہے تو اس کا محض یہ ارادہ اور حکم کہ "ہو جا" اس شے کو نیست سے ہست کر دیتا ہے۔ لہٰذا یہ یوں ہی ہو کر رہے گا اور اللہ تعالیٰ اس کو اپنی کتاب عطاء کرے گا، اس کو حکمت سکھائے گا اور اس کو بنی اسرائیل کی رشد وہدایت کے لیے رسول اور اولو العزم پیغمبر بنائے گا۔

قرآن عزیز نے ان واقعات کا معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ سورۂ آل عمران اور سورۂ مریم میں اس طرح ذکر کیا ہے:

❁ یعنی توالد وتناسل کے عام قانون سے جدا قانون اعجاز کے مطابق محض حکم الٰہی اور ارادۂ باری سے ہی رحم مریم میں وجود پذیر ہو جائے گا۔

❁ مسیح بمعنی مبارک یا سیاح جس کا کوئی گھر نہ ہو۔

Marfat.com

﴿اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ
وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝٤٥ وَ يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلًا وَّ مِنَ
الصّٰلِحِيْنَ ۝٤٦ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّ لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ۖ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۖ
اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝٤٧ وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ۝٤٨
وَ رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ﴾ (آل عمران: ۴۵۔۴۹)

"(وہ وقت قابل ذکر ہے) جب فرشتوں نے مریم (علیہا السلام) سے کہا: اے مریم! اللہ تعالیٰ تجھ کو اپنے کلمہ کی بشارت دیتا ہے اس کا نام مسیح، عیسیٰ ابن مریم ہوگا، وہ دنیا و آخرت میں صاحب وجاہت اور ہمارے مقربین میں سے ہوگا اور وہ (ماں کی) گود میں اور کہولت کے زمانہ میں لوگوں سے کلام کرے گا اور وہ نیکوکاروں میں سے ہوگا، مریم علیہا السلام نے کہا: "میرے لڑکا کیسے ہوسکتا ہے جبکہ مجھ کو کسی مرد نے ہاتھ تک نہیں لگایا" فرشتہ نے کہا: "اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے اسی طرح پیدا کر دیتا ہے، وہ جب کسی شے کے لیے حکم کرتا ہے تو کہہ دیتا ہے "ہو جا" اور وہ ہو جاتی ہے، اور اللہ اس کو کتاب و حکمت اور توراۃ و انجیل کا علم عطا کرے گا اور وہ بنی اسرائیل کی جانب اللہ کا رسول ہوگا۔"

﴿وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۝١٦ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ
حِجَابًا ۫ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝١٧ قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ
تَقِيًّا ۝١٨ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ۝١٩ قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ لَمْ
يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّ لَمْ اَكُ بَغِيًّا ۝٢٠ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَ لِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَ
رَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَ كَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ۝٢١﴾ (مریم: ۱۶۔۲۱)

"اور اے پیغمبر! کتاب میں مریم علیہا السلام کا واقعہ ذکر کرو اس وقت کا ذکر جب وہ ایک جگہ پورب کی طرف تھی اپنے گھر کے آدمیوں سے الگ ہوئی پھر اس نے ان لوگوں کی طرف سے پردہ کرلیا، پس ہم نے اس کی طرف اپنا فرشتہ بھیجا اور وہ ایک بھلے چنگے آدمی کے روپ میں نمایاں ہوگیا مریم اسے دیکھ کر گھبرا گئی، وہ بولی اگر تو نیک آدمی ہے تو میں خدائے رحمان کے نام پر تجھ سے پناہ مانگتی ہوں" فرشتہ نے کہا: "میں تیرے پروردگار کا فرستادہ ہوں اور اس لیے نمودار ہوا ہوں کہ تجھے ایک پاک فرزند دے دوں" مریم بولی "یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میرے لڑکا ہو، حالانکہ کسی مرد نے مجھے چھوا نہیں اور نہ میں بدچلن ہوں؟" فرشتہ نے کہا: "ہوگا ایسا ہی، تیرے پروردگار نے فرمایا کہ یہ میرے لیے کچھ مشکل نہیں وہ کہتا ہے یہ اس لیے ہوگا کہ اس (مسیح) کو لوگوں کے لیے ایک نشان بنا دوں اور میری رحمت کا اس میں ظہور ہو اور یہ ایسی بات ہے جس کا ہونا طے ہو چکا ہے۔"

جبرئیل امین علیہ السلام نے مریم علیہا السلام کو یہ بشارات سنا کر ان کے گریبان میں پھونک دیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کا کلمہ ان تک پہنچ گیا۔ مریم علیہا السلام نے کچھ عرصہ کے بعد خود کو حاملہ محسوس کیا تو بہ تقاضائے بشری ان پر ایک اضطرابی کیفیت طاری ہو گئی اور اس کیفیت نے اس وقت شدید صورت اختیار کر لی، جب انہوں نے دیکھا کہ مدت حمل ختم ہو کر ولادت کا وقت قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے، انہوں نے سوچا کہ اگر یہ واقعہ قوم کے اندر رہ کر پیش آیا تو چونکہ وہ حقیقت حال سے واقف نہیں ہے اس لیے نہیں معلوم وہ کس کس طرح بدنام اور بہتان طرازیوں کے ذریعہ کس درجہ پریشان کرے اس لیے مناسب یہ ہے کہ لوگوں سے دور کسی جگہ چلے جانا چاہیے، یہ سوچ کر وہ یروشلم (بیت المقدس) سے تقریباً نو میل کوہ سراۃ (ساعیر) کے ایک ٹیلہ پر چلی گئیں جواب "بیت اللحم" کے نام سے مشہور ہے، یہاں پہنچ کر چند روز بعد دردزہ شروع ہوا تو تکلیف و اضطراب کی حالت میں کھجور کے ایک درخت کے نیچے تنے کے سہارے بیٹھ گئیں اور پیش آنے والے نازک حالات کا اندازہ کر کے انتہائی قلق اور پریشانی کی حالت میں کہنے لگیں "کاش کہ میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی اور میری ہستی کو لوگ ایک قلم فراموش کر چکے ہوتے" تب نخلستان کے نشیب سے خدا کے فرشتہ نے پھر پکارا "مریم علیہا السلام! غمگین نہ ہو، تیرے پروردگار نے تیرے تلے نہر ❶ جاری کر دی ہے اور کھجور کا تنا پکڑ کر اپنی جانب ہلا تو پکے اور تازہ خوشے تجھ پر گرنے لگیں گے پس تو کھا پی اور اپنے بچہ کے نظارہ سے آنکھیں ٹھنڈی کر اور رنج و غم کو بھول جا۔"

حضرت مریم علیہا السلام پر تنہائی، تکلیف اور نزاکت حال سے جو خوف طاری اور اضطراب پیدا ہو گیا تھا فرشتہ کی تسلی آمیز پکار اور عیسیٰ علیہ السلام جیسے برگزیدہ بچہ کے نظارہ سے کافور ہو گیا اور وہ عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھ دیکھ کر شاد کام ہونے لگیں۔ تاہم یہ خیال پہلو میں ہر وقت کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا تھا کہ اگرچہ خاندان اور قوم میری عصمت و پاک دامنی سے ناآشنا نہیں ہے پھر بھی ان کی اس حیرت کو کس طرح مٹایا جا سکے گا کہ بن باپ کے کس طرح ماں کے پیٹ سے بچہ پیدا ہو سکتا ہے؟

مگر جس خدائے برتر نے ان کو یہ بزرگی اور برتری بخشی وہ کب ان کو اس کرب و بے چینی میں مبتلاء رہنے دیتا، اس لیے اس نے فرشتہ کے ذریعہ مریم علیہا السلام کے پاس پھر یہ پیغام بھیجا کہ جب تو اپنی قوم میں پہنچے اور وہ تجھ سے اس معاملہ کے متعلق سوالات کرے تو خود جواب نہ دینا بلکہ اشارہ سے ان کو بتانا کہ میں روزہ دار ہوں اور اس لیے آج کسی سے بات نہیں کر سکتی تم کو جو کچھ دریافت کرنا ہے اس بچہ سے دریافت کر لو، تب تیرا پروردگار اپنی قدرت کاملہ کا نشان ظاہر کر کے ان کی حیرت کو دور اور ان کے قلوب کو مطمئن کر دے گا۔ حضرت مریم علیہا السلام وحی الٰہی کے ان پیغامات پر مطمئن ہو کر بچہ کو گود میں لے کر بیت المقدس کو روانہ ہوئیں، جب شہر میں پہنچیں اور لوگوں نے اس حالت میں دیکھا تو چہار جانب سے ان کو گھیر لیا اور کہنے لگے "مریم علیہا السلام! یہ کیا؟" تو نے تو بہت ہی عجیب بات کر دکھائی اور بھاری تہمت کا کام کر لیا، اے ہارون علیہ السلام کی بہن! نہ تو تیرا باپ برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی بدچلن تھی پھر تو یہ کیا کر بیٹھی؟

مریم علیہا السلام نے خدا کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے لڑکے کی جانب اشارہ کر دیا کہ جو کچھ دریافت کرنا ہے اس سے معلوم کرلو میں تو آج روزہ ❷ سے ہوں۔ لوگوں نے یہ دیکھ کر انتہائی تعجب کے ساتھ کہا: "ہم کس طرح ایسے شیر خوار بچہ سے باتیں کر سکتے ہیں جو

---

❶ سری لغت عرب میں نہر کو بھی کہتے ہیں اور بلند ہستی کو بھی، جمہور نے اس جگہ پہلے معنی مراد لئے ہیں۔۔۔۔ اور حسن بصری، ربیع بن انس اور ابن اسلم رحمہم اللہ سے دوسرے معنی منقول ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تیرے تلے ایک بلند ہستی پیدا کر دی ہے۔ (البدایہ والنہایہ ج ۲)

❷ بنی اسرائیل کے یہاں روزہ میں خاموشی بھی داخل عبادت تھی۔

Marfat.com

ابھی ماں کی گود میں بیٹھنے والا بچہ ہے" مگر بچہ فوراً بول اٹھا "میں اللہ کا بندہ ہوں، اللہ نے (اپنے فیصلہ تقدیر میں) مجھ کو کتاب (انجیل) دی ہے اور نبی بنایا ہے اور اس نے مجھ کو مبارک بنایا خواہ میں کسی حال اور کسی جگہ بھی ہوں، اور اس نے مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے کہ جب تک میں زندہ رہوں یہی میرا شعار ہو اور اس نے مجھ کو اپنی ماں کا خدمت گزار بنایا اور خود سر اور نافرمان نہیں بنایا اور اس کی جانب سے مجھ کو سلامتی کا پیغام ہے جس دن کہ میں پیدا ہوا اور جس دن کہ میں مروں گا اور جس دن کہ پھر زندہ اٹھایا جاؤں گا"۔ اللہ تعالیٰ نے ان تفصیلات کو سورۂ انبیاء، تحریم اور سورۂ مریم میں ذکر فرمایا ہے:

﴿وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ۹۱)

"اور اس عورت (مریم علیہا السلام) کا معاملہ جس نے اپنی پاکدامنی کو قائم رکھا، پھر ہم نے اس میں اپنی "روح" کو پھونک دیا اور اس کو اور اس کے لڑکے کو جہان والوں کے لیے "نشان" ٹھہرایا ہے۔"

﴿وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا﴾ (التحریم: ۱۲)

"اور عمران کی بیٹی مریم علیہا السلام کہ جس نے اپنی عصمت کو برقرار رکھا پس ہم نے اس میں اپنی روح کو پھونک دیا۔"

﴿فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ۝ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ
قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ۝ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ۝ وَ
هُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ۝ فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ
الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ۚ ۝ فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ۭ
قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا ۝ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ۝
فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ۭ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝ قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۣ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ
وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ۝ وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۠ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝ وَّبَرًّۢا
بِوَالِدَتِيْ ۡ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ۝ وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ
حَيًّا ۝﴾ (مریم: ۲۲-۳۳)

"پھر اس ہونے والے فرزند کا حمل ٹھہر گیا وہ (اپنی حالت چھپانے کے لیے) لوگوں سے الگ ہو کر دور چلی گئی پھر اسے درد زہ (کا اضطراب) کھجور کے ایک درخت کے نیچے لے گیا (وہ اس کے تنا کے سہارے بیٹھ گئی) اس نے کہا کاش میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی، میری ہستی کو لوگ ایک قلم بھول گئے ہوتے، اس وقت (ایک پکارنے والے فرشتے نے) اسے نیچے سے پکارا "غمگین نہ ہو تیرے پروردگار نے تیرے تلے نہر جاری کر دی ہے، اور کھجور کے درخت کا تنا پکڑ کر اپنی طرف ہلا، تازہ اور پکے ہوئے پھلوں کے خوشے تجھ پر گرنے لگیں گے، کھا پی (اور اپنے بچہ کے نظارے سے) آنکھیں ٹھنڈی کر،

Marfat.com

پھر اگر کوئی آدمی نظر آئے (اور پوچھ گچھ کرنے لگے) تو (اشارہ سے) کہہ دے میں نے خدائے رحمان کے حضور روزہ کی منت مان رکھی ہے میں آج کسی آدمی سے بات چیت نہیں کر سکتی" پھر ایسا ہوا کہ وہ لڑکے کو ساتھ لے کر اپنی قوم کے پاس آئی، لڑکا اس کی گود میں تھا، لوگ (دیکھتے ہی) بول اٹھے "مریم! تو نے عجیب ہی بات کر دکھائی" اور بڑی تہمت کا کام کر گزری، اے ہارون ❶ کی بہن! نہ تو تیرا باپ برا آدمی تھا نہ تیری ماں بد چلن تھی" (تو یہ کیا کر بیٹھی) اس پر مریم علیہا السلام نے لڑکے کی طرف اشارہ کیا (کہ یہ تمہیں بتلا دے گا کہ حقیقت کیا ہے" لوگوں نے کہا: بھلا اس سے ہم کیا بات کریں جو ابھی گود میں بیٹھنے والا شیر خوار بچہ ہے" مگر لڑکا بول اٹھا "میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا، اس نے مجھے بابرکت کیا خواہ میں کسی جگہ ہوں، اس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا کہ جب تک زندہ رہوں یہی میرا شعار ہو۔ اس نے مجھے اپنی ماں کا خدمت گزار بنایا، ایسا نہیں کیا کہ خود سر اور نافرمان ہوتا، مجھ پر اس کی طرف سے سلامتی کا پیغام ہے جس دن پیدا ہوا، جس دن مروں گا اور جس دن پھر زندہ اٹھایا جاؤں گا"۔

قوم نے ایک شیر خوار بچہ کی زبان سے جب یہ حکیمانہ کلام سنا تو حیرت میں رہ گئی اور اس کو یقین ہو گیا کہ مریم علیہا السلام کا دامن بلاشبہ ہر قسم کی برائی اور تلویث سے پاک ہے اور اس بچہ کی پیدائش کا معاملہ یقیناً منجانب اللہ ایک "نشان" ہے۔

یہ خبر ایسی نہیں تھی کہ پوشیدہ رہ جاتی، قریب اور بعید سب جگہ اس حیرت زا واقعہ اور عیسیٰ علیہ السلام کی معجزانہ ولادت کے چرچے ہونے لگے اور طبائع انسانی نے اس مقدس ہستی کے متعلق شروع ہی سے مختلف کروٹیں بدلنی شروع کر دیں، اصحاب خیر نے اس کے وجود کو اگر یمن و سعادت کا ماہتاب سمجھا تو اصحاب شر نے اس کی ہستی کو اپنے لیے فال بد جانا اور بغض و حسد کے شعلوں نے اندر ہی اندر ان کی فطری استعداد کو کھانا شروع کر دیا۔

غرض اسی متضاد فضاء کے اندر اللہ تعالیٰ اپنی نگرانی میں اس مقدس بچہ کی تربیت اور حفاظت کرتا رہا تا کہ اس کے ہاتھوں بنی اسرائیل کے مردہ قلوب کو حیات تازہ بخشے اور ان کی روحانیت کے شجر خشک کو ایک مرتبہ پھر بار آور اور مثمر بنائے۔

﴿وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً وَآوَيْنَاهُمَا إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ﴾ (المؤمنون: ۵۰) ❷

---

❶ کہتے ہیں کہ ہارون مریم علیہا السلام کے خاندان میں ایک عابد و زاہد انسان اور بہت نیک نفس مشہور تھا۔ (تفسیر ابن کثیر)

❷ عن ابن عباس فی قوله ﴿وَآوَيْنَاهُمَا إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ﴾ قال المعين الماء الجاری و هو النهر الذی قال الله تعالیٰ ﴿قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا﴾ و كذا قال الضحاک و قتادة الی ﴿إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ﴾ هو بيت المقدس و هذا والله اعلم هو الاظهر لانه المذكور فی الاية الاخرىٰ والقران يفسر بعضه بعضا و هذا اولى ما يفسر به ثم الاحاديث الاصحيحه ثم الاثار. (تفسير ابن کثیر ج ۳ ص ۲۴۶)

یعنی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے آیت ﴿وَآوَيْنَاهُمَا إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ﴾ کی تفسیر میں منقول ہے کہ "معین" سے نہر جاری مراد ہے اور یہ اسی نہر کا ذکر ہے جس کو آیت ﴿قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا﴾ میں بیان کیا گیا ہے اور ضحاک اور قتادہ رحمہما اللہ کا بھی یہی قول ہے کہ ﴿إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ﴾ سے بیت المقدس کی سرزمین مراد ہے اور یہی قول زیادہ ظاہر ہے اس لیے کہ دوسری آیت میں بیت المقدس (کی نہر) کا ہی ذکر ہے اور قرآن کا بعض حصہ خود ہی دوسرے حصہ کی تفسیر کر دیا کرتا ہے اور تفسیر آیات میں پہلی جگہ اسی طریق تفسیر کو حاصل ہے اس کے بعد صحیح احادیث کے ذریعہ تفسیر کا اور اس کے بعد آثار کے ذریعہ تفسیر کا درجہ ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

Marfat.com

"اور ہم نے عیسیٰ بن مریم اور اس کی ماں (مریم) کو (اپنی قدرت کا) نشان بنا دیا اور ان دونوں کا ایک بلند مقام (بیت اللحم) پر ٹھکانا بنایا جو سکونت کے قابل اور چشمہ والا ہے۔"

بشارات ولادت:

قرآن عزیز نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بچپن کے حالات میں سے صرف اسی اہم واقعہ کا ذکر کیا ہے باقی بچپن کے دوسرے حالات کو جن کا ذکر قرآن کے مقصد تذکیر و موعظت سے خاص تعلق نہیں رکھتا تھا نظر انداز کر دیا ہے لیکن اسرائیلیات کے مشہور ناقل حضرت وہب بن منبہ سے جو واقعات منقول ہیں اور متی کی انجیل میں بھی جن کا ذکر موجود ہے ان میں سے یہ واقعہ بھی ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی تو اسی شب میں فارس کے بادشاہ نے آسمان پر ایک نیا ستارہ روشن دیکھا، بادشاہ نے درباری نجومیوں سے اس کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ اس ستارہ کا طلوع کسی عظیم الشان ہستی کی پیدائش کی خبر دیتا ہے جو ملک شام میں پیدا ہوئی ہے۔ تب بادشاہ نے خوشبوؤں کے عمدہ تحفے دے کر ایک وفد کو ملک شام روانہ کیا کہ وہ اس بچہ کی ولادت سے متعلق حالات و واقعات معلوم کریں، وفد جب شام پہنچا تو اس نے تفتیش حال شروع کی اور یہودیوں سے کہا کہ ہم کو اس بچہ کی ولادت کا حال سناؤ جو مستقبل قریب میں روحانیت کا بادشاہ ثابت ہوگا۔ یہود نے اہل فارس کی زبان سے یہ کلمات سنے تو اپنے بادشاہ ہیرودیس کو خبر کی، بادشاہ نے وفد کو دربار میں بلا کر استصواب حال کیا اور ان کی زبانی واقعہ کو سن کر بہت گھبرایا اور پھر وفد کو اجازت دی کہ وہ اس بچہ کے متعلق مزید معلومات حاصل کریں۔ پارسیوں کا یہ وفد بیت المقدس پہنچا اور جب حضرت یسوع علیہ السلام کو دیکھا تو اپنے رسم و رواج کے مطابق اول ان کو سجدۂ تعظیم کیا اور پھر مختلف قسم کی خوشبوئیں ان پر نثار کیں اور چند روز وہیں قیام کیا، دوران قیام میں وفد کے بعض آدمیوں نے خواب میں دیکھا کہ ہیرودیس اس بچہ کا دشمن ثابت ہوگا اس لیے تم اب اس کے پاس نہ جاؤ اور بیت اللحم سے سیدھے فارس کو چلے جاؤ۔ صبح کو وفد نے فارس کا ارادہ کرتے وقت حضرت مریم علیہا السلام کو اپنا خواب سناتے ہوئے کہا کہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کی نیت خراب ہے اور وہ اس مقدس بچہ کا دشمن ہے اس لیے بہتر یہ ہے کہ تم اس کو ایسی جگہ لے جا کر رکھو جو اس کی دسترس سے باہر ہو، اس مشورہ کے بعد حضرت مریم علیہا السلام یسوع مسیح علیہ السلام کو اپنے بعض عزیزوں کے پاس مصر لے گئیں اور وہاں سے ناصرہ چلی گئیں اور جب عیسیٰ علیہ السلام کی عمر مبارک تیرہ سال کی ہوئی تو ان کو ساتھ لے کر دوبارہ بیت المقدس واپس آئیں۔ یہی روایات یہ بھی ظاہر کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بچپن کے حالات زندگی بھی غیر معمولی تھے اور ان سے طرح طرح کے کرامات کا صدور ہوتا رہتا تھا۔[1] (واللہ اعلم بحقیقۃ الحال)

حلیہ مبارک:

بخاری حدیث معراج میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، میری ملاقات حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ہوئی تو میں نے ان کو میانہ قد سرخ سپید پایا۔ بدن ایسا صاف شفاف تھا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی حمام سے نہا کر آئے ہیں، اور بعض روایات میں ہے کہ آپ کے کاکل کاندھوں تک لٹکے ہوئے تھے اور بعض احادیث میں ہے کہ رنگ کھلتا ہوا گندم گوں تھا۔ بخاری کی روایت اور اس

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۷۷ و انجیل متی باب ۲

Marfat.com

روایت میں اداء و تعبیر کا فرق ہے حسن میں اگر صباحت کے ساتھ ملاحت کی آمیزش بھی ہوتی ہے تو اس رنگ میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، کسی وقت اگر سرخی جھلک آئی تو صباحت نمایاں ہو جاتی ہے اور اگر کسی وقت ملاحت غالب آ گئی تو چہرہ پر حسن و لطافت کے ساتھ کھلتا ہوا گندم گوں رنگ چمکنے لگتا ہے۔

بعثت و رسالت:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل بنی اسرائیل ہر قسم کی برائیوں میں مبتلاء تھے اور انفرادی و اجتماعی عیوب و نقائص کا کوئی پہلو ایسا نہیں تھا جو ان سے بچ رہا ہو، وہ اعتقاد و اعمال دونوں ہی قسم کی گمراہیوں کا مرکز و محور بن گئے تھے حتیٰ کہ اپنی ہی قوم کے ہادیوں اور پیغمبروں کے قتل تک پر جری اور دلیر ہو گئے تھے، یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے متعلق معلوم کر چکے ہو کہ اس نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو اپنی محبوبہ کے اشارہ پر کیسے عبرتناک طریقہ پر قتل کرا دیا تھا اور اس نے یہ سفاکانہ اقدام صرف اس لیے کیا کہ وہ حضرت علیہ السلام کی بڑھتی ہوئی روحانی مقبولیت کو برداشت نہ کر سکا اور اپنی محبوبہ سے ناجائز رشتہ پر ان کی نہی عن المنکر (برائی سے بچانے کی ترغیب) کی تاب نہ لا سکا اور یہ عبرتناک سانحہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی مبارک ہی میں ان کی بعثت سے قبل پیش آ چکا تھا۔

دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا للبستانی) میں یہود سے متعلق جو مقالہ ہے اس کے تاریخی مواد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت سے پہلے یہود کے عقائد و اعمال کا یہ حال تھا کہ وہ مشرکانہ رسوم و عقائد کو جزء مذہب بنا چکے تھے اور جھوٹ، فریب، بغض و حسد جیسی بداخلاقیوں کو تو عملاً اخلاق کریمانہ کی حیثیت دے رکھی تھی اور اسی بناء پر بجائے شرمسار ہونے کے وہ ان پر فخر کا اظہار کرتے تھے اور ان علماء و احبار نے تو دنیا کے لالچ اور حرص میں کتاب اللہ (توراۃ) تک کو تحریف کیے بغیر نہ چھوڑا اور درہم و دینار پر خدا کی آیات کو فروخت کر ڈالا یعنی عوام سے نذر اور بھینٹ حاصل کرنے کی خاطر حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانے سے بھی دریغ نہیں کیا اور اس طرح قانون الٰہی کو مسخ کر ڈالا۔

یہود کی اعتقادی اور عملی زندگی کا مختصر اور مکمل نقشہ ہم کو شعیا علیہ السلام کی زبانی خود توراۃ نے اس طرح دکھایا ہے:

"خداوند فرماتا ہے: یہ امت (بنی اسرائیل) زبان سے تو میری عزت کرتی ہے مگر ان کا دل مجھ سے دور ہے اور یہ بے فائدہ میری پرستش کرتے ہیں کیونکہ میرے حکموں کو پیچھے ڈال کر آدمیوں کے حکموں کی تعلیم دیتے ہیں۔"

بہرحال ان ہی تاریک حالات میں جب حضرت یحییٰ علیہ السلام کے قتل کا واقعہ بھی ہو گزرا اور بنی اسرائیل نے خدا کے حکموں کے خلاف بغاوت و سرکشی کی حد کر دی تب وہ وقت سعید آ پہنچا کہ جس مبارک بچہ نے حضرت مریم علیہا السلام کی آغوش میں پیغام حق سنا کر بنی اسرائیل کو حیرت میں ڈال دیا تھا سن رشد کو پہنچ کر اس نے یہ اعلان کر کے "کہ وہ خدا کا رسول اور پیغمبر ہے اور رشد و ہدایت خلق اس کا فرض منصبی" قوم میں ہلچل پیدا کر دی، وہ شرف رسالت سے مشرف ہو کر اور حق کی آواز بن کر آیا اور اپنی صداقت و حقانیت کے نور سے تمام اسرائیلی دنیا پر چھا گیا، اس مقدس ہستی نے قوم کو للکارا اور احبار کی علمی مجلسوں، راہبوں کے خلوت کدوں بادشاہ اور امراء کے درباروں اور عوام و خواص کی محفلوں میں حتیٰ کہ کوچہ و برزن اور بازاروں میں شب و روز یہ پیغام حق سنایا۔

لوگو! اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اپنا رسول اور پیغمبر بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے اور تمہاری اصلاح کی خدمت میرے سپرد فرمائی

ہے، میں اس کی جانب سے پیغام ہدایت لے کر آیا ہوں اور تمہارے ہاتھ میں خدا کا جو قانون (توراۃ) ہے اور جس کو تم نے اپنی جہالت اور کج روی سے پس پشت ڈال دیا ہے میں اس کی تصدیق کرتا ہوں اور اس کی مزید تکمیل کے لیے خدا کی کتاب (انجیل) لے کر آیا ہوں، یہ کتاب حق و باطل کا فیصلہ کرے گی اور آج جھوٹ اور سچ کے درمیان فیصلہ ہو کر رہے گا۔ سنو اور سمجھو اور اطاعت کے لیے خدا کے حضور جھک جاؤ کہ یہی دین و دنیا کی فلاح کی راہ ہے۔

اب ان حقائق اور ان کے عواقب و نتائج کو قرآن کی زبانی سنئے اور "احقاق حق و ابطال باطل" کے لطف سے بہرہ مند ہو کر عبرت و موعظت حاصل کیجئے، کیونکہ "تذکیر بایام اللہ" سے قرآن کا مقصد عظیم یہی بصیرت عبرت ہے:

﴿ وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ قَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ٘ وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ١ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ٘ وَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ۝۸۷ وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ۝۸۸ ﴾

(البقرہ: ۸۷-۸۸)

"اور بیشک ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب (توراۃ) عطاء کی اور اس کے بعد ہم (تم میں) پیغمبر بھیجتے رہے اور ہم نے عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) کو واضح معجزے دے کر بھیجا اور ہم نے اس کو روح پاک (جبرئیل) کے ذریعہ قوت و تائید عطاء کی، کیا جب تمہارے پاس (خدا کا) پیغمبر ایسے احکام لے کر آیا جن پر عمل کرنے کو تمہارا دل نہیں چاہتا تو تم نے غرور کو شیوہ (نہیں) بنالیا؟ پس (پیغمبروں کی) ایک جماعت کو جھٹلاتے ہو تو ایک جماعت کو قتل کر دیتے ہو، اور کہتے ہو کہ ہمارے دل (قبول حق کے لیے) غلاف میں ہیں (یہ نہیں) بلکہ ان کے کفر کرنے پر خدا نے ان کو ملعون کر دیا ہے پس بہت تھوڑے سے ہیں جو ایمان لے آئے ہیں۔"

﴿ وَ اِذْ كَفَفْتُ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ۝۱۱۰ ﴾ (المائدہ: ۱۱۰)

"اور (اے عیسیٰ) جب ہم نے بنی اسرائیل (کی گرفت و ارادۂ قتل) کو تجھ سے باز رکھا اس وقت جبکہ تو ان کے پاس کھلے معجزات لے کر آیا تو کہا بنی اسرائیل میں سے منکروں نے، یہ کچھ نہیں ہے مگر کھلا جادو ہے۔"

﴿ وَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ لِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ١۫ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ۝۵۰ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ۝۵۱ فَلَمَّاۤ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ١ۚ ﴾

(آل عمران: ۵۰-۵۲)

"اور میں تصدیق کرنے والا ہوں توراۃ کی جو میرے سامنے ہے اور (اس لیے آیا ہوں) تاکہ تمہارے لیے بعض وہ

چیزیں حلال کردوں جو (تمہاری کج روی کی وجہ سے) تم پر حرام کردی گئی تھیں اور میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی نشانی لے کر آیا ہوں پس اللہ کا خوف کرو اور میری پیروی کرو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ میرا اور تمہارا پروردگار ہے، پس اسی کی عبادت کرو یہی سیدھی راہ ہے۔ پس جبکہ عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے کفر محسوس کیا تو فرمایا اللہ کے لیے کون میرا مددگار ہے تو شاگردوں نے جواب دیا ہم ہیں اللہ کے (دین کے) مددگار۔"

﴿ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ﴾ (الحدید: ۲۷)

"پھر ان کے بعد (نوح وابراہیم علیہما السلام کے بعد) ہم نے اپنے رسول بھیجے اور ان کے بعد عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) کو رسول بنا کر بھیجا اور اس کو کتاب (انجیل) عطاء کی۔"

﴿اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۣ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ﴾

(سورہ المائدہ: ۱۱۰)

"(وہ وقت یاد کے لائق ہے) جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کہے گا "اے عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام! میری اس نعمت کو یاد کر جو میری جانب سے تجھ پر اور تیری والدہ پر نازل ہوئی جبکہ میں نے روح القدس (جبرئیل) کے ذریعہ تیری تائید کی کہ تو کلام کرتا تھا آغوش مادر میں اور بڑھاپے میں اور جبکہ میں نے تجھ کو سکھائی کتاب، حکمت، توراۃ اور انجیل۔"

﴿وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ۭ﴾ (الصف: ٦)

"اور (وہ وقت یاد کرو) جب عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام) نے کہا: اے بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمہاری جانب اللہ کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں توراۃ کی جو میرے سامنے ہے اور بشارت سنانے والا ہوں ایک پیغمبر کی جو میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہے۔" (صلی اللہ علیہ وسلم)

آیات بینات:

قصص القرآن جلد اول معجزات کی بحث میں گزر چکا ہے کہ حق وصداقت کے تسلیم وانقیاد میں انسانی فطرت ہمیشہ سے دو طریقوں سے مانوس رہی ہے ایک یہ کہ مدعیٔ حق کی حقانیت وصداقت، دلائل کی قوت اور براہین کی روشنی کے ذریعہ ثابت اور واضح ہو جائے اور دوسرا طریقہ یہ کہ دلائل و براہین کے ساتھ ساتھ منجانب اللہ اس کی صداقت کی تائید میں عام قانون قدرت سے جدا بغیر اسباب ووسائل اور تحصیل علم وفن کے اس کے ہاتھ پر امور عجیبہ کا مظاہرہ اس طرح ہو کہ عوام وخواص اس کے مقابلہ سے عاجز ودرماندہ ہو جائیں اور ان کے لیے اسباب ووسائل کے بغیر ان امور کی ایجاد ناممکن ہو، پہلے طریق کے ساتھ یہ دوسرا طریق انسان کے عقل وفکر اور اس کی نفسیاتی کیفیات میں ایسا انقلاب پیدا کر دیتا ہے کہ ان کا وجدان یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ داعیٔ حق (نبی وپیغمبر) کا

یہ عمل دراصل خود اس کا اپنا فعل نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ خدا کی قوت کام کر رہی ہے اور بلاشبہ یہ اس کے صادق ہونے کی مزید دلیل ہے۔ چنانچہ قرآن عزیز میں آیت ﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ﴾ [1] میں اسی حقیقت کا اظہار مقصود ہے مگر ان ہر دو طریقوں میں سے ان اصحاب علم و دانش پر جو قوت فہم و ادراک میں بلند مقام رکھتے ہیں پہلا طریقہ زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے اور وہ دوسرے طریقہ کو پہلے طریقہ کی تائید و تقویت کی حیثیت سے قبول کرتے اور داعیٔ حق (نبی و پیغمبر) کے دعوائے نبوت و رسالت کی صداقت کا مزید عملی ثبوت یقین کر کے اس پر ایمان لے آتے ہیں اور ان حضرات ارباب عقل و فکر کے برعکس ارباب قوت و اقتدار اور ان کی ذہنیت سے متاثر عام انسانی قلوب دوسرے طریقہ تصدیق سے زیادہ متاثر ہوتے اور نبی و پیغمبر کے معجزانہ افعال کو کائنات کی طاقت و قوت کے دائرہ سے بالاتر ہستی کا ارادہ و قوت فعل یقین کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور ان امور کو "خدائی نشان" باور کر کے دعوت حق و صداقت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔

قرآن عزیز نے اکثر و بیشتر مقامات پر پہلے طریق دلیل کو "حجۃ اللہ" "برہان" اور "حکمۃ" سے تعبیر کیا ہے۔ سورہ انعام میں خدا کی ہستی اس کی وحدانیت، معاد و آخرت اور دین کے بنیادی عقائد کو دلائل، نظائر اور شواہد کے ذریعہ سمجھانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

﴿قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ﴾ (الانعام: ۱۴۹)

"(اے محمد ﷺ) کہہ دیجئے، اللہ کے لیے ہی ہے حجت کامل (یعنی مکمل اور روشن دلیل)"

اور اس سورۃ میں دوسری جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرہ میں ہے:

﴿وَتِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ عَلَىٰ قَوْمِهِ﴾ (الانعام: ۸۳)

"اور یہ ہماری "دلیل" ہے جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلہ میں عطاء کی۔"

اور سورۂ نساء میں ہے:

﴿رُسُلًا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ (النساء: ۱۶۵)

"(ہم نے بھیجے) پیغمبر خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے تاکہ لوگوں کی جانب سے خدا پر پیغمبر بھیجنے کے بعد کوئی حجت (دلیل) باقی نہ رہے (کہ ہمارے پاس دلائل کے ذریعہ راہ مستقیم بتانے کوئی نہ آیا تھا اس لیے ہم دین حق کی معرفت سے محروم رہے)۔"

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِنْ رَبِّكُمْ﴾ (النساء: ۱۷۴)

"اے لوگو! بیشک تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے برہان (قرآن) آ گیا۔"

---

[1] اور اے پیغمبر (بدر کے غزوہ میں) جب تو نے (دشمنوں پر) مٹھی بھر خاک پھینکی تھی تو تو نے وہ مشت خاک نہیں پھینکی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھی مفصل بحث جلد اول میں گزر چکی ہے۔

Marfat.com

اور سورۂ یوسف میں ہے:

﴿ لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْھَانَ رَبِّهٖ ﴾ (یوسف: ۲٤)

"اگر نہ ہوتی یہ بات کہ دیکھ لی تھی اس (یوسف علیہ السلام) نے اپنے پروردگار کی دلیل۔"

اور سورۂ نحل میں ہے:

﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ (النحل: ۱۲۵)

"اپنے پروردگار کے راستہ کی جانب دعوت وحکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور تبادلہ خیالات کرو ان (مخالفین) کے ساتھ اچھے طریق گفتگو سے۔"

اور سورۂ نساء ہے:

﴿ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ (النساء: ۱۱۳)

"اور اللہ تعالیٰ نے اتارا تجھ پر کتاب کو اور حکمت کو۔"

اسی طرح "حکمت" کا یہ ذکر سورہ بقرہ آل عمران، مائدہ، لقمان، صٓ، زخرف، احزاب اور قمر میں بہ کثرت موجود ہے اور دوسرے طریق دلیل کو اکثر "آیۃ اللہ" اور آیات اللہ" اور بعض مقامات پر "آیات بینات" اور "بینات" کہا گیا ہے۔

ناقہ صالح علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے:

﴿ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً ﴾ (الاعراف: ۷۳)

"یہ اونٹنی تمہارے لیے (خدا کی جانب سے) ایک "نشان" ہے۔"

اور حضرت مسیح اور ان کی والدہ مریم علیہا السلام کے متعلق ارشاد ہے:

﴿ وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ (الانبیاء: ۹۱)

"اور ہم نے کر دیا مریم اور اس کے لڑکے عیسیٰ علیہ السلام کو جہان والوں کے لیے "نشان" (معجزہ)"

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں ارشاد باری ہے:

﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ﴾ (بنی اسرائیل: ۱۰۱)

"اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو نو نشان (معجزات) عطا کیے۔"

اور حضرت مسیح علیہ السلام کو جو معجزات دیے گئے تھے ان کے متعلق ارشاد ہے:

"اور دیے ہم نے عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کو معجزات۔ اس وقت جبکہ تو ان کے پاس کھلے معجزات لے کر آیا تو کہا بنی اسرائیل میں سے منکروں نے یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔"

Marfat.com

ہم نے اس مقام پر اکثر و بیشتر کا لفظ قصداً اختیار کیا ہے کیونکہ قرآن عزیز کے اسلوب بیان سے واقف اس سے بے خبر نہیں ہے کہ اس نے ان الفاظ کے استعمال میں وسعت تعبیر سے کام لیا ہے یعنی جبکہ "معجزہ" بھی ایک خاص قسم کا "برہان" ہے اور قرآن اور آیات قرآن جس طرح سرتا سر "علم و برہان ہیں اسی طرح "معجزہ" بھی ہیں، اس لیے معجزہ پر برہان کا اطلاق اور کتاب اللہ کے جملوں پر آیت اور آیات اللہ کا اطلاق مجاز نہیں بلکہ حقیقت ہے مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دو معجزوں عصاء اور ید بیضاء کے متعلق سورۂ قصص میں ہے:

﴿فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ﴾ (القصص:۳۲)

"پس تیرے رب کی جانب سے یہ دو دلیلیں ہیں۔"

اور کتاب اللہ اور اس کے جملوں پر آیت اور آیات کے اطلاقات سے تو قرآن کی کوئی طویل سورہ ہی خالی ہوگی، تمام قرآن میں جگہ جگہ اس کثرت سے اس کا استعمال ہوا ہے کہ اس کی فہرست مستقل موضوع بن سکتا ہے۔

اسی طرح "آیات بینات" کا اگرچہ بکثرت اطلاق کتاب اللہ (قرآن، توراۃ، زبور، انجیل) اور ان کی آیات پر ہوا ہے مگر مسطورہ بالا مقامات کی طرح بعض بعض جگہ اس کو "معجزات" کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔

لائق توجہ بات اور حقیقت معجزات:

نبی اور رسول کی بعثت کا مقصد کائنات کی رشد و ہدایت اور دین و دنیا کی فلاح و خیر کی رہنمائی ہے اور وہ منجانب اللہ وحی کی روشنی میں اس فرض منصبی کو انجام دیتا اور علم و برہان اور حجۃ حق کے ذریعہ راہ صداقت دکھاتا ہے، وہ یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ فطرت اور ماوراء فطرت امور میں تصرف و تغیر بھی اس کا کار منصبی ہے بلکہ وہ بار بار یہ اعلان کرتا ہے کہ میں خدا کی جانب سے بشیر و نذیر اور داعی الی اللہ بن کر آیا ہوں، میں انسان ہوں اور خدا کا ایلچی، اس سے زائد اور کچھ نہیں ہوں تو پھر اس کے دعوائے صداقت کے امتحان اور پرکھ کے لیے، اس کی تعلیم، اس کی تربیت اور اس کی شخصیت کا زیر بحث آنا یقیناً معقول لیکن اس سے ماوراء فطرت اور خارق عادت عجائبات و غرائب کا مطالبہ خلاف عقل اور بے جوڑ بات معلوم ہوتی ہے اور یوں نظر آتا ہے کہ کسی طبیب حاذق کے دعوئے حذاقت طب پر اس سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ طلسمی کھٹکے کی ایک عمدہ الماری یا لکڑی کا ایک عجیب قسم کا کھلونا بنا کر دکھائے، طبیب نے یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ وہ ماہر لوہار یا بڑھئی ہے بلکہ اس کا دعویٰ تو امراض جسمانی کے علاج کا ہے، اسی طرح پیغمبر خدا کا یہ دعویٰ نہیں ہوتا کہ وہ خدا کی طرح کائنات پر ہمہ قسم کے تصرف و تغیر کا مالک و قادر ہے بلکہ اس کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ تمام امراض روحانی کے لیے طبیب کامل اور حاذق و ماہر ہے۔

پس دعویٰ نبوت اور معجزات (خارق عادات امور) کے درمیان کیا تعلق ہے؟ اور کیا اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ "معجزہ" لوازم نبوت میں سے نہیں ہے؟

بلاشبہ یہ سوال بہت زیادہ قابل توجہ ہے اور اس لیے علم کلام میں اس مسئلہ کو کافی اہمیت دی گئی ہے لیکن ہم نے "آیات بینات" عنوان کے ماتحت ابتداء کلام میں دعوائے نبوت کی صداقت سے متعلق دلائل کی جو تقسیم انسانی طبائع اور ان کے فطری رجحانات

Marfat.com

کے پیش نظر کی ہے وہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے اور جوہر عقل کے تفاوت درجات نے بلاشبہ انسانوں کی قوت فکریہ کو جدا جدا طریقوں کی جانب مائل کر دیا ہے، ان حالات میں جب ایک نبی اور رسول یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ خدا کی جانب سے ایک ایسے منصب پر مامور ہے جو ریاضات ومجاہدات اور نیک عملی کی قوت سے نہیں بلکہ محض خدا کی موہبت اور عطاء سے حاصل ہوتا ہے اور یہ "منصب نبوت ورسالت" ہے اور اس کا مقصد کائنات کی رشد وہدایت اور تعلیم حق وصداقت ہے تو بعض انسانی دماغ اور ان کا جوہر عقل اس جانب متوجہ ہو جاتا ہے کہ اگر اس ہستی کا یہ دعویٰ صحت پر مبنی ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس کو خدائے برتر کے ساتھ اس درجہ قربت حاصل ہے جو دوسرے انسانوں کے لیے ناممکن ہے پس جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس کی صدائے اصلاح اور اس کی تعلیم ہمارے قدیم رسم ورواج یا مذہب ودھرم کے ان عقائد واعمال کے خلاف ہے جس کو ہم حق سمجھتے آئے ہیں تو ان متضاد اور متخالف تعلیمات کی صداقت وبطالت کے امتحان کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ یہ ہستی کوئی اور ماوراء فطرت یا خارق عادت امر کر دکھائے تو ہمارے لیے یہ سمجھنا بہت آسان ہو جائے گا کہ بغیر اسباب ووسائل کے اس ہستی کے ہاتھ ایسے امر کا صدور یقیناً اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس کو خدائے برتر کے ساتھ خاص قرب حاصل ہے، تب ہی تو خدائے برحق نے یہ "نشان" دکھا کر اس کی صداقت پر مہر لگا دی، نیز وہ صاحب قوت واقتدار انسان جن کے غور وفکر کی قوت ایسے سانچہ میں ڈھل گئی ہے کہ ان پر کوئی امر حق اس وقت تک مؤثر ہی نہیں ہوتا جب تک کہ ان کی متکبرانہ طاقت کو غیبی ٹھوکر سے بیدار نہ کیا جائے، وہ بھی اس کے منتظر رہتے ہیں کہ مدعی نبوت ورسالت اپنی صداقت کو دلیل وبرہان کے ساتھ ساتھ ایک ایسے "کرشمہ" کے ذریعہ ناقابل انکار بنا دے کہ جس کا صدور دوسرے انسانوں سے یا تو ممکن ہی نہ ہو اور یا بغیر اسباب ووسائل کے استعمال کیے وجود پذیر نہ ہو سکتا ہو تا کہ یہ باور کیا جا سکے کہ بلاشبہ اس ہستی کی تعلیم وتبلیغ کو خدائے برتر کی تائید حاصل ہے۔ اسی لیے علماء کلام نے دعوائے نبوت اور معجزہ کے درمیان تعلق پر بحث کرتے ہوئے یہ مثال بیان کی ہے کہ ایک شخص جب یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کو بادشاہ وقت نے اپنا نائب مقرر کر کے بھیجا ہے تو اس ملک یا صوبے کے باشندے خواستگار ہوتے ہیں کہ مدعی نیابت اپنے دعویٰ کی صداقت کے لیے کوئی سند اور علامت پیش کرے۔ چنانچہ مدعی نیابت ایک جانب اگر سند دکھاتا ہے تو دوسری جانب ایسی "نشانی" بھی پیش کرتا ہے جس کے متعلق یہ یقین کیا جا سکے کہ بادشاہ کی عطاء کردہ یہ نشانی اس کے عطیہ اور اس منصب کی تصدیق کے علاوہ اور کسی طرح بھی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً بادشاہ کی انگشتری (مہر حکومت) یا ایسا خاص عطیہ جو صرف اس منصب پر فائز ہستی کو عطاء کیا جاتا ہو۔

تو اگرچہ بظاہر دعویٰ نیابت اور انگشتری یا عطیہ خاص کے درمیان کوئی مطابقت نہیں ہے تاہم اس تعلق خاص نے جو شاہی تصدیق سے وابستہ ہے ان دونوں کے درمیان اہم ربط پیدا کر دیا ہے۔

لیکن جبکہ طریق تصدیق، معیار صداقت وحقانیت میں دوسرے درجہ کی حیثیت رکھتا ہے اور حقیقتاً معیاری حیثیت صرف طریق اول (حجۃ وبرہان حق" کو ہی حاصل ہے، اس لیے معجزہ کے وقوع وصدور کا معاملہ پہلے طریق کے وجود وصدور سے قطعاً جدا اور وہ یہ کہ ہر ایک مدعی نبوت ورسالت کے لیے از بس ضروری ہے کہ وہ اپنے دعویٰ حق وصداقت کو حجۃ وبرہان کی روشنی اور علم ویقین کی قوت کے ذریعہ ثابت کرے اور اپنی تعلیم وتربیت، اور شخصی حیات کے ہر پہلو میں دعویٰ اور دلیل وبرہان کی مطابقت کو واضح کرے اور انسانی جوہر عقل کے فکر وتدبر کی رہنمائی کا فرض اس طرح انجام دے کہ ہر قسم کے ظن ووہم اور فاسد وکاسد خیالات کے مقابلہ میں

Marfat.com

"یقین محکم" روز روشن کی طرح نمودار ہو جائے اور اس ادائے فرض کے لیے کسی کی جانب سے نہ مطالبہ شرط ہے اور نہ جستجو لازم بلکہ یہ نبی اور رسول کا براہ راست وہ فرض ہے جس کے لیے خدائے تعالیٰ نے اس کو منتخب اور مامور کیا ہے اور اگر ایک لمحہ کے لیے بھی وہ اس میں کوتاہی کرتا ہے تو گویا اپنے فرض کی پوری عمارت کو اپنے ہاتھ سے برباد کر دیتا ہے۔

﴿يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۖ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ﴾ (المائدہ: ۶۷)

"اے پیغمبر! جو تم پر نازل کیا گیا ہے تم اس کو پورا پورا پہنچا دو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو منصب رسالت کو ادا نہ کیا۔"

اس کے برعکس معجزہ کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ نبی اور رسول اس کو ضرور ہی دکھائے یا مخالفین کے ہر مطالبہ پر اس کی تعمیل کرے بلکہ "معجزہ" حجت و برہان کی وہ قسم ہے جو اکثر معاندین کے مطالبہ پر وقوع پذیر ہوتا ہے اور اس سے اس کا صدور صرف عالم الغیب کی اپنی "حکمت و مصلحت" پر ہی موقوف رہتا ہے اور وہی خوب جانتا ہے کہ معجزہ کے بارہ میں کسی کا سوال جویائے حق کی حیثیت میں ہے اور کس کا تعنت اور انکار مزید کے لیے کن سعید روحوں پر اس کا یہ اثر پڑے گا کہ وہ کہہ اٹھیں گی ﴿اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى﴾ اور کن بدبختوں پر اس طرح اثر انداز ہوگا کہ یوں گویا ہوں گے: ﴿إِنْ هٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ○﴾

پس قرآن عزیز نے اگر ایک جانب بہ نصوص قطعیہ یہ ظاہر کیا ہے کہ اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کو حجۃ و برہان کے ساتھ مزید تائید و تقویت کے لیے معجزات عطا کیے ہیں تو دوسری جانب یہ بھی صاف صاف نبی کی زبانی کہلا دیا ہے کہ میں خدا کی جانب سے فقط "نذیر مبین" "بشیر و نذیر" اور "رسول و نبی" ہوں۔ میں نے یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا کہ میں کائنات خداوندی کے تصرفات و تغیرات اور ماوراء فطرت امور پر قادر ہوں، ہاں خدائے برتر اگر چاہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے اور اس نے ایسا کیا بھی ہے مگر وہ جب ہی کرتا ہے کہ اس کی حکمت و مصلحت اس کی متقاضی ہو۔

چنانچہ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کو منطق الطیر اور تسخیر ہوا، طیور و جن کے نشان دیے گئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو "تسع آیات بینات" "نو کھلے نشان" عطاء کیے گئے جن میں سے دو نشان اعضاء اور ید بیضاء کو قرآن نے "بڑے نشان" کہا ہے اور بحر قلزم میں غرق فرعون اور نجات قوم موسیٰ علیہ السلام کا عجیب و غریب واقعہ مستقل ایک "نشان عظیم" ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر دہکتی آگ کے شعلوں کو "بردو سلام" بنا دیا۔ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کے لیے "ناقہ صالح" کو نشان بنایا کہ جوں ہی اس کو کسی نے ستایا اسی وقت خدا کا عذاب قوم کو تباہ و برباد کر جائے گا۔ چنانچہ ٹھیک اسی طرح پیش آیا۔ حضرت ہود اور حضرت نوح علیہما السلام سے ان کی قوموں نے عذاب طلب کیا اور کافی سمجھانے کے بعد بھی جب ان کا اصرار قائم رہا تو ان پیغمبروں نے عذاب الٰہی کی جو وعیدیں سنائی تھیں وہ ٹھیک اپنے اپنے وقت پر پوری ہوئیں حالانکہ ان سب مواقع میں بظاہر اسباب نزول عذاب اور وقوع حوادث ہلاکت کے کوئی سامان نہیں تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو مختلف نشان (معجزات) دیئے گئے ان کو بھی قرآن نے صاف صاف بیان کر دیا ہے جو ابھی زیر بحث آئیں گے اور آخر میں خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو علمی معجزہ قرآن عطا کیا جس کی تحدی (مقابلہ کے چیلنج) کا کوئی جواب نہ دے سکا، نیز بدر کے معرکہ میں فرشتوں کا نزول اور ان کے ذریعہ مسلمانوں کی نصرت و یاوری اور ﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ﴾ کے اعلان سے اس مشہور معجزہ کا اظہار فرمایا جس نے بدر کے میدان میں مٹھی بھر خاک کو ایک ہزار دشمنوں کی آنکھوں کا آزار بنا دیا اور

"شق القمر" کا معجزہ عطا فرمایا۔ معاملہ زیر بحث کا یہ ایک پہلو یا ایک رخ ہے اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب خاتم الانبیاء محمد کریم ﷺ کی دعوت ارشاد و تبلیغ حق کے روشن دلائل و براہین کا کوئی جواب مخالفین سے نہ بن پڑا تو از راہ تعنت و سرکشی عجائبات اور خارق عادات امور کا مطالبہ کرنے لگے تب اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی پیغمبر ﷺ کو اطلاع دی کہ ان کا مقصد طلب حق اور جستجوئے صداقت نہیں ہے بلکہ یہ جو کہہ رہے ہیں سرکشی، ضد اور تعصب کی راہ سے کہتے ہیں اس لیے ان کا جواب یہ نہیں ہے کہ خدا کے نشانات کو بھان متی کا تماشا یا مداری کا کھیل بنا دیا جائے بلکہ اصل جواب یہ ہے کہ ان سے کہہ دو میں ان تصرفات کا مدعی نہیں ہوں میں تو نیک و بد امور میں تمیز پیدا کرنے، خدا کے بندوں کا خدا کے ساتھ رشتہ ملانے اور نیک و بد کاموں کے انجام کو واضح کرنے کے لیے "نذیر مبین" اور "نبی رسول" ہوں:

﴿وَ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۙ﴿۹۰﴾ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۙ﴿۹۱﴾ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۙ﴿۹۲﴾ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَ لَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۳﴾﴾ (بنی اسرائیل: ۹۰-۹۳)

"اور انہوں نے (مشرکوں نے) کہا: ہم اس وقت تک ہرگز تیری بات نہیں مانیں گے کہ تو ہمارے لیے زمین سے چشمہ ابال دے یا تیرے واسطے کھجوروں کا اور انگوروں کا باغ ہو اور تو اس کے درمیان زمین پھاڑ کر نہریں بہا دے یا تو جیسا گمان کرتا ہے ہمارے اوپر آسمان گرا دے یا تو اللہ اور اس کے فرشتوں کو (ہمارے) مقابل لائے یا تیرے واسطے ایک سونے کا (طلائی) مکان ہو اور یا تو چڑھ جائے آسمان پر اور ہم تیرے چڑھ جانے کو بھی ہرگز اس وقت تک نہیں تسلیم کریں گے تاوقتیکہ تو ہمارے پاس (آسمان سے) کتاب لے کر نہ آئے کہ اس کو ہم پڑھیں (اے محمد ﷺ) کہہ دیجئے پاکی ہے میرے پروردگار کے لیے میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان ہوں، خدا کا پیغامبر ہوں۔"

﴿وَ لَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ۙ﴿۱۴﴾ لَقَالُوْۤا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ﴿۱۵﴾﴾ (الحجر: ۱۴-۱۵)

"اور اگر کھول دیں ہم ان پر آسمان کا ایک دروازہ اور یہ اس پر چڑھنے لگیں تب بھی ضرور یہی کہیں گے کہ اس کے سواء کچھ نہیں ہے کہ مست کر دی گئی ہیں ہماری آنکھیں بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔"

﴿وَ اِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ؕ﴾ (الانعام: ۲۵)

"اور اگر یہ ہر قسم کے نشان بھی دیکھ لیں تب بھی (ضد اور تعصب کی بناء پر) ایمان لانے والے نہیں ہیں۔"

اب ان تفصیلات سے یہ بھی بخوبی روشن ہو گیا کہ علم کلام میں جن علماء کی رائے یہ ظاہر کی گئی ہے کہ "معجزہ دلیل نبوت نہیں

Marfat.com

ہے" ان کی مراد کیا ہے؟ وہ دراصل دعوائے نبوت کی صداقت سے متعلق مسطورہ بالا ہر دو دلائل کے فرق کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جو ہستی نبوت و رسالت کا دعویٰ کرتی ہے اس پر لازم اور ضروری ہے کہ اپنے دعویٰ کی تصدیق کے لیے "حجۃ و برہان" پیش کرے اور دلائل کی روشنی میں اپنی حقانیت کو ثابت کرے اور وحی الٰہی کی جو تعلیم وہ کائنات کی ہدایت کے لیے پیش کرتی ہے برہان و حجت کے ذریعہ اس کی حقیقت کو واضح کرے تو گویا اس طرح نبوت و رسالت اور حجت و برہان صداقت میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے اس کے برعکس نبوت کے ساتھ معجزات اور آیات اللہ (نشانات خداوندی) کا تعلق اس طرح کا نہیں ہے بلکہ اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر مخالفین کے مطالبہ پر یا بہ تقاضائے حکمت الٰہی نبی اور رسول از خود اپنی صداقت کی تائید میں کوئی نشان (معجزہ) دکھائے تو بلاشبہ وہ اس ہستی کے نبی و رسول ہونے کی ناقابل انکار "دلیل" ہے اور اس کا انکار درحقیقت اس رسول کی صداقت کا انکار ہے کیونکہ اس صورت میں یہ انکار حقیقت اور واقعہ کا انکار ہے اور حقیقت کا انکار "حق" نہیں بلکہ "باطل" ہوتا ہے جو نبوت و رسالت کے مقصد کے ساتھ کسی طرح بھی جمع نہیں ہوسکتا۔ البتہ اگر حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہو کہ تعلیم حق کی روشنی، وحی الٰہی پر دلائل و براہین کا یقین، اور اصول دین پر حجت و برہان کا قیام ہوتے ہوئے اب مخالفین کے بار بار طلب معجزات و عجائبات کی پرواہ نہ کی جائے اور نبی و رسول، وحی الٰہی کی روشنی میں حجت و برہان کے ذریعہ تعلیم حق جاری رکھے اور مخالفین کے جواب میں صاف صاف کہہ دے کہ میں نے ماوراء فطرت پر قدرت کا کبھی دعویٰ نہیں کیا تو اس صورت میں بندوں پر خدا کی حجت تمام ہو جاتی ہے اور کسی امت اور قوم کو یہ حق نہیں رہتا کہ وہ تعلیم حق کے دلائل و براہین اور روشن حجت و بینہ سے اس لیے منہ پھیرے اور اس لیے اس کا انکار کر دے کہ اس کی طلب پر اچنبھوں اور عجائبات کا مظاہرہ کیوں نہیں کیا گیا۔

پس قرآن عزیز نے جن انبیاء و رسل کے واقعات و حالات "تذکیر بایام اللہ" کے سلسلہ میں بیان کرتے ہوئے نصوص قطعیہ کے ذریعہ صراحت و وضاحت سے یہ ثابت کیا ہے کہ ہم نے ان کی صداقت کے نشان کے طور پر نشانات (معجزات) ان کو عطا اور مخالفین کے سامنے ان کا مظاہرہ کیا تو ہمارا فرض ہے کہ ہم بے چون و چرا ان کو قبول اور ان کی تصدیق کریں اور عجائب پرستی کے الزام سے خائف ہو کر عالم غیب کی اس تصدیق سے گریز نہ کریں اور نہ رکیک و باطل تاویلات کے پردہ میں ان کے انکار پر آمادہ ہو جائیں کیونکہ ایسا کرنا اس آیت کا مصداق بن جانا ہے۔

﴿ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ﴾ (النساء: ۱۵۰)

"اور وہ کہتے ہیں کہ ہم کتاب الٰہی کے بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ایمان و کفر کے درمیان میں ایک راہ بنالیں۔"

اور ظاہر ہے کہ یہ مومن و مسلم کی نہیں بلکہ کافر و منکر کی راہ ہے، مومن و مسلم کی راہ تو سیدھی راہ یہ ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ﴾ (البقرہ: ۲۰۸)

"اے پیروان دعوت ایمانی! اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ (اور اعتقاد و عمل کی ساری باتوں میں مسلم بن جاؤ۔ مسلم

Marfat.com

ہونے کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ زبان سے اسلام کا اقرار کرلو) اور دیکھو شیطانی وسوسوں کی پیروی نہ کرو، وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے۔"

بہر حال "سنت اللہ" یہ جاری رہی ہے کہ جب کسی قوم کی ہدایت یا تمام کائنات انسانی کی فوز وفلاح کے لیے نبی اور پیغمبر مبعوث ہوتا ہے تو اس کو منجانب اللہ محکم دلائل و براہین اور آیات اللہ (معجزات) دونوں سے نوازا جاتا ہے، وہ ایک جانب وحی الٰہی کے ذریعہ کائنات کے معاش معاد سے متعلق اوامر ونواہی اور بہترین دستور ونظام پیش کرتا ہے تو دوسری جانب حسب مصلحت خداوندی "خدائی نشانات" کا مظاہرہ کر کے اپنی صداقت اور منجانب اللہ ہونے کا ثبوت دیتا ہے نیز ہر ایک پیغمبر کو اسی قسم کے معجزات ونشانات عطا کیے جاتے ہیں جو اس زمانہ کی علمی ترقیوں یا قومی وملکی خصوصیتوں کے مناسب حال ہونے کے باوجود معارضہ کرنے والوں کو عاجز ودرماندہ کردیں اور کوئی ان کے مقابلہ میں تاب مقاومت نہ لا سکے اور اگر تعصب اور ضد درمیان میں حائل نہ ہوں تو اپنی اکتسابی ترقیوں اور خصوصیتوں کے حقائق سے آگاہ ہونے کی وجہ سے اس اعتراف پر مجبور ہو جائیں کہ یہ جو کچھ سامنے ہے انسانوں کی قدرت سے بالاتر، ان کی دسترس سے باہر، اور صرف خدائے واحد ہی کی جانب سے ہے۔

مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں علم نجوم (Astronomy) اور علم کیمیا (Chemistry) کا بہت زور تھا اور ساتھ ہی ان کی قوم کواکب ونجوم کے اثرات کو ان کے ذاتی اثرات سمجھتی اور ان کو مؤثر حقیقی یقین کر کے خدائے واحد کی جگہ ان کی پرستش کرتی تھی اور ان کا سب سے بڑا دیوتا شمس (سورج) تھا کیونکہ وہ روشنی اور حرارت دونوں کا حامل تھا اور یہی دونوں چیزیں ان کی نگاہ میں کائنات کی بقاء وفلاح کے لیے اصل الاصول تھیں اور اسی بناء پر کرۂ ارضی میں "آگ" کو اس کا مظہر مان کر اس کی بھی پرستش کی جاتی تھی، علاوہ ازیں ان کو اشیاء کے خواص واثرات اور ان کے ردعمل پر بھی کافی عبور تھا گویا آج کی علمی تحقیقات کے لحاظ سے وہ کیمیاوی طریق ہائے عمل سے بھی بڑی حد تک واقف تھے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو ان کی قوم کی ہدایت اور خدا پرستی کی تعلیم وتلقین کے لیے ایک جانب ایسے روشن حجۃ وبرہان عطا فرمائے جن کے ذریعہ وہ قوم کے غلط عقائد کے ابطال اور احقاق حق کی خدمت انجام دیں اور مظاہر پرستی کی وجہ سے حقیقت کے چہرہ پر تاریکی کا جو پردہ پڑ گیا تھا اس کو چاک کر کے رخ روشن کو نمایاں کرسکیں۔

﴿ وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝﴾

(الانعام: ۸۳)

اور دوسری جانب جب کواکب پرست اور بت پرست بادشاہ سے لے کر عام افراد قوم نے ان کے دلائل وبرہان سے لاجواب ہو کر اپنی مادی طاقت کے گھمنڈ پر دہکتی آگ میں جھونک دیا تو اسی خالق اکبر نے جس کی دعوت وارشاد کی خدمت حضرت ابراہیم علیہ السلام انجام دے رہے تھے ﴿ يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا ﴾ کہہ کر اپنی قدرت کا وہ عظیم الشان نشان (معجزہ) عطا کیا جس نے باطل کے پر ہیبت ایوان میں زلزلہ پیدا کر دیا اور تمام قوم اس خدائی مظاہرہ سے عاجز، حیران وپریشان اور ذلیل وخاسر ہو کر رہ گئی:

﴿ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ۝ۚ﴾ (الانبیاء: ۷۰)

Marfat.com

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں سحر (Magic) مصری علوم وفنون میں بہت زیادہ نمایاں اور امتیازی شان رکھتا تھا اور مصریوں کو فن سحر میں کمال حاصل تھا اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قانون ہدایت (توراۃ) کے ساتھ ساتھ "ید بیضاء" اور "عصاء" جیسے معجزات دیے گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ساحرین مصر کے مقابلہ میں جب ان کا مظاہرہ کیا تو سحر کے تمام ارباب کمال اس کو دیکھ کر یک زبان ہو کر پکار اٹھے کہ بلاشبہ یہ سحر نہیں یہ تو اس سے جدا اور انسانی طاقت سے بالاتر مظاہرہ ہے جو خدائے برحق نے اپنے سچے پیغمبروں کی تائید کے لیے ان کے ہاتھ پر کرایا ہے کیونکہ ہم سحر کی حقیقت سے بخوبی واقف ہیں اور یہ کہہ کر انہوں نے فرعون اور قوم فرعون کے سامنے بے خوفی کے ساتھ اعلان کر دیا کہ وہ آج سے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے خدائے واحد ہی کے پرستار ہیں:

﴿وَ اُلْقِیَ السَّحَرَةُ سٰجِدِیْنَ ۝ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ رَبِّ مُوْسٰی وَ هٰرُوْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۲۰۔۲۲)

مگر فرعون اور امراء دربار اپنی بدبختی سے یہی کہتے رہے:

﴿قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِیْمٌ ۝﴾ (الشعراء: ۳۴) ... ﴿فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰی بِاٰیٰتِنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًی وَّ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِیْۤ اٰبَآىِٕنَا الْاَوَّلِیْنَ ۝﴾ (قصص: ۳۶)

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں علم طب (Medical Science) اور علم الطبیعات (Physics) کا بہت چرچا تھا اور یونان کے اطباء وحکماء (فلاسفر) کی طب وحکمت گردوپیش کے ممالک وامصار کے ارباب کمال پر بہت زیادہ اثر انداز تھی اور ملکوں میں صدیوں سے بڑے بڑے طبیب اور فلسفی اپنی حکمت و دانش اور کمالات طب کا مظاہرہ کر رہے تھے مگر خدائے واحد کی توحید اور دین حق کی تعلیم سے خواص وعوام یکسر محروم تھے اور خود بنی اسرائیل بھی جو کہ نبیوں کی نسل میں ہونے پر ہمیشہ فخر کرتے رہتے تھے جن گمراہیوں میں مبتلاء تھے سطور گزشتہ میں ان پر روشنی پڑ چکی ہے۔

پس ان حالات میں "سنت اللہ" نے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رشد وہدایت کے لیے منتخب کیا تو ایک جانب ان کو حجت و برہان (انجیل) اور حکمت سے نوازا تو دوسری جانب زمانہ کے مخصوص حالات کے مناسب چند ایسے نشان (معجزات) بھی عطاء فرمائے جو اس زمانہ کے ارباب کمال اور ان کے پیرووں پر اس طرح اثر انداز ہوں کہ جویائے حق کو اس اعتراف میں کوئی جھجک باقی نہ رہے کہ بلاشبہ یہ اعمال اکتسابی علوم سے جدا محض خدائے تعالیٰ کی جانب سے رسول برحق کی تائید میں رونما ہوئے ہیں اور متعصب اور متمرد کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ رہے کہ ان کو "صریح جادو" کہہ کر اپنے بغض وحسد کی آگ کو اور مشتعل کرے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ان معجزات میں سے جن کا مظاہرہ انہوں نے قوم کے سامنے کیا قرآن عزیز نے "چار معجزات کا بصراحت ذکر کیا ہے:

① وہ خدا کے حکم سے مردہ کو زندہ۔ ② اور پیدائشی نابینا کو بینا اور جذامی کو چنگا کر دیا کرتے تھے۔

③ وہ مٹی سے پرند بنا کر اس میں پھونک دیتے تھے اور خدا کے حکم سے اس میں روح پڑ جاتی تھی۔

④ وہ یہ بھی بتا دیا کرتے تھے کہ کس نے کیا کھایا اور خرچ کیا اور کیا گھر میں ذخیرہ محفوظ رکھا ہے؟

قوموں میں ایسے مسیحا موجود تھے جن کے علاج ومعالجے اور اکتسابی تدابیر سے مایوس مریض شفاء پاتے تھے، ان میں ماہر طبیعات ایسے فلسفی بھی کم نہ تھے جو روح و مادہ کے حقائق اور ارضی وسماوی اشیاء کی ماہیات پر بے نظیر نظریات وتجربیات کے مالک

سمجھے جاتے تھے اور حقائق اشیاء میں ان کی باریک بینی اور مہارت ارباب کمال کے لیے باعث صد نازش تھی لیکن جب ان کے سامنے عیسیٰ علیہ السلام نے اسباب و وسائل اختیار کیے بغیر ان امور کا مظاہرہ کیا تو ان پر بھی ہدایت وضلالت کی قدرتی تقسیم کے مطابق یہی اثر پڑا کہ جس شخص کے قلب میں حق کی طلب موجزن تھی اس نے اقرار کیا کہ بلاشبہ اس قسم کا مظاہرہ انسانی دسترس سے باہر اور نبی برحق کی تائید و تصدیق کے لیے منجانب اللہ ہے اور جن دلوں میں رعونت، حسد اور بغض و عناد تھا ان کے تعصب نے وہی کہنے پر مجبور کیا جو ان کے پیشرو انبیاء ورسل سے کہتے آئے تھے۔ ﴿اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ﴾

چوتھے معجزے کے بارے میں بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس کے مظاہرہ کی وجہ یہ پیش آئی کہ مخالفین جب ان کی دعوت رشد و ہدایت سے نفور ہو کر ان کو جھٹلاتے اور ان کے پیش کردہ آیات بینات (معجزات) کو سحر اور جادو کہتے تو ساتھ ہی از راہ تمسخر یہ بھی کہہ دیا کرتے تھے کہ اگر تم خدائے تعالیٰ کے ایسے مقبول بندے ہو تو بتاؤ آج ہم نے کیا کھایا ہے اور کیا بچا رکھا ہے تب عیسیٰ علیہ السلام ان کے تمسخر کو سنجیدگی سے بدل دیتے اور وحی الٰہی کی نصرت سے ان کے سوال کا جواب دے دیا کرتے تھے۔ ❶

مگر قرآن عزیز نے اس معجزہ کو جس انداز میں بیان کیا ہے اس کو غور کے ساتھ مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس "نشان" کے مظاہرہ کی وجہ مفسرین کی بیان کردہ توجیہ سے زیادہ دقیق اور وسیع معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام پیغام ہدایت و تبلیغ حق کی خدمت انجام دیتے ہوئے اکثر و بیشتر لوگوں کو دنیا میں انہماک، دولت و ثروت کے لالچ، اور عیش پسند زندگی کی رغبت سے باز رکھنے پر مختلف اسالیب بیان کے ذریعہ توجہ دلایا کرتے تھے تو جس طرح بعض سعید روحیں اس کلمہ حق کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتی تھیں اس کے برعکس شریر النفس انسان ان کے مواعظ حسنہ سے قلبی نفرت و اعراض کے باوجود امتثال امر کرنے والی ہستیوں سے زیادہ ان کو یہ باور کراتیں کہ ہم تو ہمہ وقت آپ کے اس ارشاد کی تعمیل میں سرگرم رہتے ہیں۔ لہٰذا قدرت حق نے یہ فیصلہ کیا کہ ان منافقین کی منافقت کی مضرت کو زائل کرنے کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایسا "نشان" عطا کیا جائے کہ اس ذریعہ سے حق و باطل منکشف ہو جائے اور حقوق اللہ اور حقوق انسانی کے اتلاف پر جو ذخیرہ اندوزی کا سامان کیا جا رہا ہے اس کا پردہ چاک کر دیا جائے۔

ان چہارگانہ خدائی نشان (معجزات) کے علاوہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بغیر باپ کے پیدائش بھی ایک عظیم الشان "خدائی نشان" تھا جس کے متعلق ابھی تفصیلات سن چکے ہو۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے ہاتھ پر جن معجزات کا ظہور ہوا یا ان کی ولادت جس معجزانہ طریق پر ہوئی یہود نے از راہ حسد ان کا انکار کیا تو کیا لیکن بعض فطرت پرست مدعی اسلام حضرات نے بھی ان کے انکار کے لیے راہ پیدا کرنے کی ناکام سعی فرمائی ہے ان میں سے بعض حضرات وہ ہیں جنہوں نے اس انکار کو ذاتی مفاد کے لیے نہیں بلکہ فطرت پرست اور منکرین خدا یورپین علماء جدید سے مرعوبیت کی بناء پر یہ روش اختیار کی ہے تاکہ ان کی مذہبیت پر عجائب پرستی کا الزام عائد نہ ہو سکے، ان میں سرسید اور مولوی چراغ علی صاحب خصوصیت سے قابل ذکر ہیں اور بعض وہ یہود صفت اشخاص ہیں جو اپنی ذاتی غرض اور ناپاک مقصد کی خاطر از راہِ حسد و بغض حضرت مسیح علیہ السلام کے ان معجزات کا نہ صرف انکار کرتے ہیں بلکہ تاویلات باطل کے پردہ میں ان کا مضحکہ اڑاتے ہیں ان میں سے متنبی کاذب مرزا قادیانی اور مسٹر محمد علی لاہوری خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

---

❶ البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۸۲

قادیانی اور لاہوری نے تو یہ ظلم کیا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے معجزہ ﴿اَنِّیْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَكُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ کے متعلق یہ کہہ دیا کہ مسیح کا یہ عمل ایک تالاب کی مٹی کا رہین منت تھا، معجزہ کچھ نہیں تھا اس تالاب کی مٹی کی یہ خاصیت تھی کہ جس کسی پرند کی شکل بنائی جاتی اور منہ سے دم تک سوراخ رکھ دیا جاتا تو ہوا بھر جانے سے اس میں آواز بھی پیدا ہو جاتی تھی اور حرکت بھی، گویا العیاذ باللہ! ان بدبختوں کے نزدیک حضرت مسیح علیہ السلام کی جانب سے منکروں کے مقابلہ میں یہ معجزانہ صداقت نہیں تھی بلکہ مداری یا شعبدہ باز کا تماشہ تھا۔

اسی طرح احیاء موتیٰ (مردہ کو زندہ کر دینا) کے معجزہ کا بھی انکار کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآن عزیز نے یہ فیصلہ سنا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ موت کے بعد کسی کو اس دنیا میں قبل از قیامت زندگی نہیں بخشے گا۔ لیکن لطف یہ ہے کہ اگر پورے قرآن کو از اول تا آخر پڑھ جایئے تو کسی ایک آیت میں بھی آپ کو یہ فیصلہ نہیں ملے گا بلکہ اس دعویٰ کے خلاف متعدد مقامات پر اس کا اثبات پائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں موت دینے کے بعد حیات تازہ بخشی ہے مثلاً سورہ بقرہ کی آیات ذبح بقرہ کے واقعہ میں ارشاد ہے:

﴿فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ یُحْیِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى﴾ (البقرہ: ۷۳)

یا سورۂ بقرہ ہی کی اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ﴾ (البقرہ: ۲۵۹)

یا اسی سورۃ میں تیسری جگہ مذکور ہے:

﴿وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَ لَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَ لٰكِنْ لِّیَطْمَىِٕنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ﴾ (البقرہ: ۲۶۰)

چنانچہ ان تمام واقعات میں "احیاء موتیٰ" کے صاف اور صریح معانی ثابت ہیں اور جن حضرات نے ان مقامات میں احیاء موتی سے مجازی یا کنائی معنی لیے ہیں ان کو طرح طرح کی تاویلات کی پناہ لینی پڑی ہے مگر ان کی تاویلات سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ احیاء موتی کی یہ تاویل اس وجہ سے نہیں کر رہے ہیں کہ قرآن کے نزدیک اس کا دنیا میں وقوع ممنوع ہے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ آیات مسطورہ بالا کے سیاق وسباق کے پیش نظر یہی معنی مناسب حال ہیں۔

غرض یہ دعویٰ کہ قرآن ممنوع قرار دیتا ہے کہ دار دنیا میں "احیاء موتیٰ" وقوع پذیر ہو صرف مرزا قادیانی اور مسٹر لاہوری کے دماغ کی اپج ہے جو قطعاً باطل اور غیر ثابت ہے اور اس کی پشت پر کوئی دلیل نہیں ہے، رہا یہ امر کہ خدا کے عام قانون فطرت کے ماتحت

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں بحث گزر چکی ہے ملاحظہ ہو قصص القرآن ج ۲۔
ایضاً ✽ قصص القرآن جلد اول میں بحث گزر چکی ہے۔

Marfat.com

ایسا نہیں پیش آتا رہتا سو اگر ایسا ہوتا رہتا تو پھر یہ "معجزہ" ہرگز نہ کہلاتا اور خدائے برتر کا قانون خاص جو تصدیق انبیاء علیہم السلام کے مقصد سے کبھی کبھی مخالفین کے مقابلہ میں بطور تحدی (چیلنج) کے پیش آتا ہے کوئی خصوصیت نہ رکھتا۔

اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام کی بن باپ پیدائش کے مسئلہ کا بھی انکار کیا گیا ہے اور قادیانی اور لاہوری نے بھی اس کے خلاف بے دلیل ہرزہ سرائی کی ہے لیکن اس مسئلہ کی موافق ومخالف آراء سے قطع نظر ایک غیر جانبدار منصف جب حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے متعلق تمام آیات قرآنی کا مطالعہ کرے گا تو اس پر یہ حقیقت بخوبی آشکارا ہو جائے گی کہ قرآن حضرت مسیح علیہ السلام سے متعلق یہود کی تفریط اور نصاریٰ کی افراط دونوں کے خلاف اپنا وہ فرض منصبی ادا کرنا چاہتا ہے جس کے لیے قرآن کی دعوت حق کا ظہور ہوا ہے یہود اور نصاریٰ اس بارہ میں دو قطعاً مخالف اور متضاد سمتوں میں چلے گئے ہیں یہود کہتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام مفتری اور کاذب اور شعبدہ باز تھے اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ وہ خدا، خدا کے بیٹے یا ثالث ثلثہ تھے ان حالات میں قرآن نے ان اوہام وظنون کے خلاف علم ویقین کی راہ دکھاتے ہوئے دونوں کے خلاف یہ فیصلہ دیا کہ راہ حق افراط وتفریط کے درمیان ہے اور صراط مستقیم کی یہی سب سے بڑی شناخت ہے۔

وہ کہتا ہے واضح رہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام مفتری اور کاذب نہیں تھے بلکہ خدا کے سچے پیغمبر اور راہ حق کے داعی صادق تھے انہوں نے دعوت حق کی تصدیق کے لیے جو بعض عجیب باتیں کر دکھائیں وہ معجزات انبیاء کی فہرست میں شامل ہیں نہ کہ ساحروں اور شعبدہ بازوں کی اور یہ بھی صحیح ہے کہ ان کی پیدائش بغیر باپ کے ہوئی مگر اس سے یہ کیسے لازم آ سکتا ہے کہ وہ خدا یا خدا کے بیٹے ہو گئے کیا جو شخص پیدائش کا محتاج ہو اور پیدائش میں بھی ماں کے پیٹ کا محتاج اور جو شخص بشری لوازم کھانے پینے کا محتاج ہو وہ عبد اور بشر کے ماسواء خدا یا معبود ہو سکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔

یہاں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ نصاریٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق الوہیت کا جو عقیدہ قائم کیا تھا اس کا بہت بڑا سہارا یہی واقعہ تھا جیسا کہ وفد نجران اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی باہمی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے۔

تو جبکہ قرآن نے یہود و نصاریٰ کے ان تمام باطل عقائد کی واضح الفاظ میں تردید کر کے جو انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق قائم کر لیے تھے اپنا فریضہ اصلاح انجام دیا یہ کیسے ممکن تھا کہ اگر بن باپ کے پیدائش کا واقعہ باطل اور غیر واقعی تھا اور جو سہارا بن رہا تھا الوہیت مسیح علیہ السلام کا، اس کے متعلق واضح طور سے قرآن تردید نہ کرتا بلکہ اس کے برعکس وہ جگہ جگہ اس واقعہ کو ٹھیک اس طرح بیان کرتا جاتا جیسا کہ متی کی انجیل میں بیان کیا گیا ہے اس کا فرض تھا کہ سب سے پہلے اسی پر ضرب کاری لگاتا اور صرف اس قدر کہہ کر کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا باپ فلاں شخص تھا اس ساری عمارت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا جس پر الوہیت مسیح علیہ السلام کی بنیاد رکھی گئی ہے مگر اس نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا بلکہ یہ کہا کہ یہ بات کسی طرح بھی مسیح علیہ السلام کی الوہیت کی دلیل نہیں بن سکتی، کیوں؟ اس لیے کہ

﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ۝٥٩﴾ (آل عمران: ۵۹)

پس اگر بن باپ کی پیدائش مسیح علیہ السلام کو درجہ الوہیت دے سکتی ہے تو آدم علیہ السلام کو اس سے زیادہ الوہیت کا حق حاصل ہے کہ وہ بن ماں باپ کے پیدا ہوئے ہے۔

بہر حال جن تاویل پرستوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی بن باپ پیدائش سے متعلق آیات کے جملوں کو جدا جدا کر کے احتمالات پیدا کیے ہیں وہ اس لیے باطل ہیں کہ جب اس واقعہ سے متعلق آیات کو یکجا کر کے مطالعہ کیا جائے تو ایک لمحہ کے لیے

Marfat.com

آیات کے معانی میں بن باپ پیدائش کے معنی کے ماسوا دوسرے کسی بھی احتمال کی گنجائش باقی نہیں رہتی مگر یہ کہ عربی زبان کے الفاظ کے معین مدلولات و اطلاقات میں تحریف معنوی پر بیجا جسارت کی جائے۔

نیز بقول مولانا ابوالکلام جن اصحاب نے بغیر باپ کے پیدائش سے متعلق آیات میں تاویل باطل کی ہے ان کی دلیل کا مدار صرف اس بات پر ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کا نکاح اگرچہ یوسف سے ہو چکا تھا مگر رخصتی عمل میں نہیں آئی تھی ایسی صورت میں میاں بیوی کے درمیان مقاربت گو شریعت موسوی کے خلاف نہیں تھی تاہم وقت کے رسم و رواج کے قطعاً خلاف تھی اس لیے حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش لوگوں پر گراں گزری لیکن اول تو اس واقعہ کا ثبوت ہی موجود نہیں سب بے سند بات ہے دوسرے یہودیوں نے حضرت مریم علیہا السلام پر جو بہتان لگایا تھا "انسائیکلو پیڈیا آف بائیبل" میں تصریح ہے کہ اس بہتان کی نسبت ایک شخص پینتھر اٹالی کی جانب کی تھی نہ کہ یوسف نجار کی جانب اس لیے تاویل کی یہ بنیاد ہی از سرتا پا غلط اور بے اصل ہے۔ ❶

علاوہ ازیں جہاں تک اس مسئلہ کا عقلی پہلو ہے سو عقل بھی اس کے امکان کو ممنوع اور محال قرار نہیں دیتی بلکہ اس کو ممکن الوقوع تسلیم کرتی ہے کیا سائنس کی موجودہ دنیا سے آشنا حضرات اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ آج جبکہ سائنس کی جدید تحقیق نے نظریوں سے آگے قدم بڑھا کر مشاہدہ اور تجربہ سے یہ ثابت کر دیا کہ دوسرے حیوانات کی طرح انسان کی خلقت و پیدائش بھی بیضہ سے ہوتی ہے اور اس کو اصطلاح میں خلیہ ❷ تخم کہتے ہیں یہ خلیہ مرد اور عورت دونوں میں ہوتا ہے اور حمل قرار پا جانے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ مرد کے خلیات تخم عورت کے بیضہ میں داخل ہو جاتے ہیں یہی خلیہ زندگی اور حیات کا تخم ہے اور قدرت حق نے اس کو بہت باریک جثہ عطا فرمایا ❸ ہے تو اس تحقیق نے امریکہ اور انگلینڈ کے سائنسدانوں کو اس جانب متوجہ کر دیا ہے کہ کیوں وہ ایک ایسی کوشش نہ کریں کہ بغیر مرد کی مقاربت کے جنس رجال کے خلیات تخم کو آلات کے ذریعہ جنس اناث کے مبیض میں داخل کر کے "وجود انسانی" حاصل کرنے میں کامیاب ہوں۔ سائنس والوں کا یہ تخیل ابھی عملی حیثیت سے کتنا ہی دور ہو لیکن اس سے یہ نتیجہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ عقل یہ ممکن سمجھتی ہے کہ انسانی پیدائش آنکھوں دیکھے عام طریق ولادت کے علاوہ بعض دوسرے طریقوں سے بھی ہو سکتی ہے اور ان کو قانون قدرت کے خلاف اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ ہم نے قدرت کے تمام قوانین کا احاطہ نہیں کر لیا ہے بلکہ انسان جس قدر علم و دانش کی جانب بڑھتا جاتا ہے اس کے سامنے قدرت حق کے قانون کے نئے نئے گوشے کھلتے جاتے ہیں۔

پس اگر یہ صحیح ہے کہ جو بات کل ناممکن نظر آتی تھی آج وہ ممکن کہی جا رہی ہے اور جلد یا بدیر اس کے وقوع پر یقین کیا جا رہا ہے تو نہیں معلوم پھر اس قانون قدرت سے انکار کر دینے کے کیا معنی ہیں جس کا علم اگرچہ ابھی تک ہم کو حاصل نہیں ہے مگر انبیاء و رسل جیسی قدسی صفات ہستیوں پر اس علم کی حقیقت آشکارا ہے تو کیا علمی دلیل کا یہ بھی کوئی پہلو ہے کہ جس بات کا ہم کو علم نہ ہو اور عقل اس کو ناممکن اور محال نہ ثابت کرتی ہو اس کا انکار صرف "عدم علم" کی وجہ سے کر دیا جائے خصوصاً جب یہ انکار ایک مدعی مسیحیت و نبوت کی جانب سے ہو تو اس کے لیے تو یہی کہا جا سکتا ہے۔

اب ان "آیات بینات" کو قرآن حکیم سے سنئے اور موعظت و عبرت کے حصول کا سروسامان کیجئے کہ ماضی کے ان واقعات کی تذکیر سے قرآن کا یہی عظیم مقصد ہے۔

---

❶ ترجمان القرآن ج ۲ ❷ خلیہ کو انگریزی میں (Catl) کہتے ہیں۔ ❸ اس کا قطر انچ کا 1/500 ہوتا ہے۔

Marfat.com

﴿وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ۚ﴿۴۸﴾ وَ رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ وَ اُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَ مَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ﴿۴۹﴾ وَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ لِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۟ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۵۰﴾ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۵۱﴾﴾ (آل عمران: ۴۸-۵۱)

"اور خدا سکھاتا ہے اس (عیسیٰ) کو کتاب، حکمت، توراۃ اور انجیل، اور وہ رسول ہے بنی اسرائیل کی جانب (وہ کہتا ہے) کہ بیشک میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے "نشان" لے کر آیا ہوں، وہ یہ کہ میں تمہارے لیے مٹی سے پرند کی شکل بناتا پھر اس میں پھونک دیتا ہوں اور وہ خدا کے حکم سے زندہ پرند بن جاتا ہے اور پیدائشی اندھے کو سوانکھا کر دیتا اور سفید داغ کے جذام کو اچھا کر دیتا ہوں، اور خدا کے حکم سے مردہ کو زندہ کر دیتا ہوں اور تم کو بتا دیتا ہوں جو تم کھا کر آتے ہو اور جو تم گھر میں ذخیرہ رکھ آتے ہو سو اگر تم حقیقی ایمان رکھتے ہو تو بلاشبہ ان امور میں (میری صداقت اور منجانب اللہ ہونے کے لیے) "نشان" ہے اور میں تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں جو میرے سامنے ہے اور (اس لیے بھیجا گیا ہوں) تاکہ بعض ان چیزوں کو جو تم پر حرام ہو گئی ہیں تمہارے لیے حلال کر دوں تمہارے لیے پروردگار ہی کے پاس سے "نشان" لایا ہوں "پس تم اللہ سے ڈرو" اور (اس کے دیے ہوئے احکام میں) میری اطاعت کرو بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے سو اس کی عبادت کرو یہی سیدھی راہ ہے۔"

﴿وَ اِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِيْ وَ تُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ وَ اِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ﴾ (المائدہ: ۱۱۰)

"اور (اے عیسیٰ ابن مریم! تو میری اس نعمت کو یاد کر) جبکہ تو میرے حکم سے گارے سے پرند کی شکل بنا دیتا اور پھر اس میں پھونک دیتا تھا اور وہ میرے حکم سے زندہ پرند بن جاتا تھا اور جبکہ تو میرے حکم سے پیدائشی اندھے کو سوانکھا اور سفید داغ کے کوڑھ کو اچھا کر دیتا تھا اور جبکہ تو میرے حکم سے مردہ کو زندہ کر کے قبر سے نکالتا تھا۔"

﴿فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۶﴾﴾ (الصف: ۶)

"پھر جب وہ (عیسیٰ علیہ السلام) ان کے پاس کھلے نشان لے کر آیا تو انہوں نے (بنی اسرائیل نے) کہا "یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔"

انبیاء علیہم السلام نے جب کبھی بھی قوموں کے سامنے آیات اللہ کا مظاہرہ کیا ہے تو منکروں نے ہمیشہ ان کے متعلق ایک بات ضرور کہی ہے "یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔" پس کیا ایک جویائے حق اور غیر متعصب انسان کے لیے یہ جواب اس جانب رہنمائی نہیں کرتا کہ

Marfat.com

انبیاء علیہم السلام کے اس قسم کے مظاہرے ضرور عام قوانین قدرت سے جدا ایسے علم کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتے تھے جو صرف ان قدسی صفات ہستیوں کے لیے ہی مخصوص رہا ہے اور ان کے علاوہ انسانی دنیا اس کے فہم حقیقت سے بہرہ مند نہیں ہوئی تب ہی ان لوگوں کے پاس جو از راہ عناد و ضد انکار پر تلے ہوئے تھے، اس کے انکار کے لیے اس سے بہتر دوسری تعبیر نہیں تھی کہ وہ ان امور کو "سحر و جادو" کہہ دیں۔ لہٰذا ان امور کو سحر و جادو کہنا بھی ان کے "معجزہ" اور "نشانِ خداوندی" ہونے کی زبردست دلیل ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی تعلیمات کا خلاصہ:

بہر حال حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو حجت و برہان اور آیات اللہ کے ذریعہ دین حق کی تعلیم دیتے رہتے اور ان کے بھولے ہوئے سبق کو یاد دلا کر مردہ قلوب میں حیات تازہ بخشتے رہتے تھے۔

خدا اور خدا کی توحید پر ایمان، انبیاء و رسل علیہم السلام کی تصدیق، آخرت (معاد) پر ایمان، ملائکۃ اللہ پر ایمان، قضاء و قدر پر ایمان، خدا کے رسولوں اور کتابوں پر ایمان، اخلاق حسنہ کے اختیار اعمال سیئہ سے پرہیز و اجتناب، عبادت الٰہی سے رغبت، دنیا میں انہماک سے نفرت اور خدا کے کنبہ (مخلوق خدا) سے محبت و مودت یہی وہ تعلیم و تلقین تھی جو ان کی زندگی کا مشغلہ اور فرض منصبی بنا ہوا تھا وہ بنی اسرائیل کو توراۃ، انجیل، اور حکیمانہ پند و نصائح کے ذریعہ ان امور کی جانب دعوت دیتے مگر بد بخت یہود اپنی فطرت کج، صدیوں کی مسلسل سرکشی اور تعلیم الٰہی سے بغاوت کی بدولت اس درجہ متشدد ہو گئے تھے اور انبیاء و رسل کے قتل نے ان کے قلوب کو حق و صداقت کے قبول میں اس درجہ سخت بنا دیا تھا کہ ایک مختصر سی جماعت کے علاوہ ان کی جماعت کی بڑی اکثریت نے ان کی مخالفت اور ان کے ساتھ حسد و بغض کو اپنا شعار اور اپنی جماعتی زندگی کا معیار بنا لیا اور اس لیے انبیاء کی سنت راشدہ کے مطابق رشد و ہدایت کے حلقہ بگوشوں میں دنیوی جاہ و جلال کے لحاظ سے کمزور و ناتواں اور زیر دست پیشہ ور طبقہ کی اکثریت نظر آتی تھی، ضعفاء کا یہ طبقہ اگر اخلاص و دیانت کے ساتھ حق کی آواز پر لبیک کہتا تو بنی اسرائیل کا وہ سرکش و مغرور حلقہ ان پر اور خدا کے پیغمبر پر پھبتیاں کستا، توہین و تذلیل کا مظاہرہ کرتا اور اپنی عملی جدوجہد کا بڑا حصہ معاندت و مخالفت میں صرف کرتا رہتا تھا۔

﴿وَ لَمَّا جَآءَ عِیۡسٰی بِالۡبَیِّنٰتِ قَالَ قَدۡ جِئۡتُکُمۡ بِالۡحِکۡمَۃِ وَ لِاُبَیِّنَ لَکُمۡ بَعۡضَ الَّذِیۡ تَخۡتَلِفُوۡنَ فِیۡہِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ﴿۶۳﴾ اِنَّ اللّٰہَ ہُوَ رَبِّیۡ وَ رَبُّکُمۡ فَاعۡبُدُوۡہُ ؕ ہٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِیۡمٌ ﴿۶۴﴾ فَاخۡتَلَفَ الۡاَحۡزَابُ مِنۡۢ بَیۡنِہِمۡ ۚ فَوَیۡلٌ لِّلَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡ عَذَابِ یَوۡمٍ اَلِیۡمٍ ﴿۶۵﴾﴾ (الزخرف: ۶۳-۶۵)

"اور جب عیسیٰ علیہ السلام ظاہر دلائل لے کر آئے تو کہا: "بلاشبہ میں تمہارے پاس "حکمت" لے کر آیا ہوں اور اس لیے آیا ہوں تا کہ ان بعض باتوں کو واضح کر دوں جن کے متعلق تم آپس میں جھگڑ رہے ہو، پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، بیشک اللہ تعالیٰ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے سو اس کی پرستش کرو یہی سیدھی راہ ہے" پھر وہ آپس میں گروہ بندی کرنے لگے، سو ان لوگوں کے لیے دردناک عذاب کے ذریعہ ہلاکت اور خرابی ہے۔"

﴿وَ اِذۡ قَالَ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ اِلَیۡکُمۡ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیَّ مِنَ

Marfat.com

التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ ﴾ (الصف: ٦)

"اور (وہ وقت یاد کرو) جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا: اے بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمہاری جانب اللہ کا پیغمبر ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں توراۃ کی جو میرے سامنے ہے اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا نام اس کا احمد ہے، پس جب (عیسیٰ علیہ السلام) آیا ان کے پاس معجزات لے کر تو وہ (بنی اسرائیل) کہنے لگے، یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔"

﴿ فَلَمَّاۤ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَ اشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا بِمَاۤ اَنْزَلْتَ وَ اتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِیْنَ ۝ ﴾ (آل عمران: ۵۲-۵۳)

"پھر جب عیسیٰ (علیہ السلام) نے ان (بنی اسرائیل) سے کفر محسوس کیا تو کہا "اللہ کی جانب میرا کون مددگار ہے" حواریوں نے جواب دیا: "ہم ہیں اللہ کے (دین کے) مددگار۔ ہم اللہ پر ایمان لے آئے اور تم گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں، اے ہمارے پروردگار جو تو نے اتارا ہے ہم اس پر ایمان لے آئے اور ہم نے رسول کی پیروی اختیار کر لی پس تو ہم کو (دین حق کی) گواہی دینے والوں میں سے لکھ لے۔"

حواری عیسیٰ علیہ السلام:

مگر عیسیٰ علیہ السلام معاندین ومخالفین کی دراندازیوں اور ہرزہ سرائیوں کے باوجود اپنے فرض منصبی "دعوۃ الی الحق" میں سرگرم عمل رہتے اور شب و روز بنی اسرائیل کی آبادیوں اور بستیوں میں پیغام حق سناتے اور روشن دلائل اور واضح آیات اللہ کے ذریعہ لوگوں کو قبول حق وصداقت پر آمادہ کرتے رہتے تھے اور خدا اور حکم خدا سے سرکش اور باغی انسانوں کی اس بھیڑ میں ایسی سعید روحیں بھی نکل آتی تھیں جو عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت حق پر لبیک کہتی اور سچائی کے ساتھ دین حق کو قبول کر لیتی تھیں، ان ہی پاک بندوں میں وہ مقدس ہستیاں بھی تھیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شرف صحبت سے فیضیاب ہو کر نہ صرف۔ ایمان ہی لے آئی تھیں بلکہ دین حق کی سربلندی اور کامیابی کے لیے انہوں نے جان و مال کی بازی لگا کر خدمت دین کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا اور اکثر و بیشتر حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ رہ کر تبلیغ ودعوت کو سرانجام دیتی تھیں، اسی خصوصیت کی وجہ سے وہ "حواری" (رفیق) اور "انصار اللہ" (اللہ کے دین کے مددگار) کے مقدس القاب سے معزز وممتاز کی گئیں۔ چنانچہ ان بزرگ ہستیوں نے پیغمبر خدا کی حیات پاک کو اپنا اسوہ بنایا اور سخت سے سخت اور نازک سے نازک حالات میں بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا اور ہر طرح معاون ومددگار ثابت ہوئیں۔

﴿ وَ اِذْ اَوْحَیْتُ اِلَى الْحَوَارِیّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَ بِرَسُوْلِیْ ۚ قَالُوْۤا اٰمَنَّا وَ اشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ۝ ﴾ (المائدہ: ۱۱۱)

"اور (اے عیسیٰ وہ وقت یاد کرو) جبکہ میں نے حواریوں کی جانب (تیری معرفت) یہ وحی کی کہ مجھ پر اور میرے پیغمبر پر ایمان لاؤ تو انہوں نے جواب دیا "ہم ایمان لائے اور اے خدا! تو گواہ رہنا کہ ہم بلاشبہ مسلمان ہیں۔"

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ وَ كَفَرَتْ طَّآىِٕفَةٌ ۚ فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِیْنَ ﴿۱۴﴾ ﴾ (الصف: ١٤)

"اے ایمان والو! تم اللہ کے (دین کے) مددگار ہو جاؤ جیسا کہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے جب حواریوں سے کہا: "اللہ کے راستہ میں کون میرا مددگار ہے" .... تو حواریوں نے جواب دیا "ہم ہیں اللہ (کی راہ) کے مددگار پس بنی اسرائیل کی ایک جماعت ایمان لائی اور ایک گروہ نے کفر اختیار کیا سو ہم نے مومنوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں تائید کی پس وہ (مومن) غالب رہے۔"

گزشتہ سطور میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے یہ حواری بیشتر غریب اور مزدور طبقہ میں سے تھے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت و تبلیغ کے ساتھ "سنت اللہ" یہی جاری رہی ہے کہ ان کی صدائے حق پر لبیک کہنے اور دین حق پر جان سپاری کا مظاہرہ کرنے کے لیے اول غریب اور کمزور طبقہ ہی آگے بڑھتا ہے اور زیردست ہی فداکاری کا ثبوت دیتے ہیں اور وقت کی صاحب اقتدار اور زبردست ہستیاں اپنے غرور اور گھمنڈ کے ساتھ مقابلہ اور معارضہ کے لیے سامنے آتی اور معاندانہ سرگرمیوں کے ساتھ اعلاء کلمۃ اللہ کی راہ میں سنگ گراں بن جاتی ہیں لیکن جب خدائے تعالیٰ کا قانون پاداش عمل اپنا کام کرتا ہے تو نتیجہ میں فلاح و کامرانی ان کمزور فدایانِ حق ہی کا حصہ ہو جاتا ہے اور متکبر و مغرور ہستیاں یا ہلاکت کے قعر مذلت میں جا گرتی ہیں اور یا مقہور و مغلوب ہو کر سرنگوں ہو جانے کے ماسوا کوئی چارہ کار نہیں دیکھتیں۔

حواری عیسیٰ علیہ السلام اور قرآن و انجیل کا موازنہ:

قرآن عزیز نے عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی منقبت بیان کی ہے، سورۂ آل عمران کی آیات تمہارے سامنے ہیں، حضرت مسیح علیہ السلام جب دین حق کی نصرت و یاری کے لیے پکارتے ہیں تو سب سے پہلے جنہوں نے "نحن انصار اللہ" کا نعرہ بلند کیا وہ یہی پاک ہستیاں تھیں، سورۂ صف میں اللہ رب العالمین نے جب مسلمانوں کو مخاطب کر کے ﴿ كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ ﴾ کی ترغیب دی تو "تذکیر بایام اللہ" کے پیش نظر ان ہی مقدس ہستیوں کا ذکر کیا اور ان ہی کی مثال اور نظیر دے کر نصرت حق کے لیے برانگیختہ کیا اور سورۂ مائدہ میں ان کے قبول ایمان اور دعوت حق کے سامنے انقیاد و تسلیم کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ بھی ان کے خلوص، حق طلبی اور حق کوشی کی زندہ جاوید تصویر ہے۔ یہ سب کچھ تو اس وقت کا حال ہے جب تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے درمیان موجود ہیں لیکن آپ کے "رفع الی السماء" کے بعد بھی ان کی پر استقامت اور دین قویم کی فداکارانہ خدمت کے متعلق سورۂ صف کی آیت ۱۴ ﴿ فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِیْنَ ﴿۱۴﴾ ﴾ میں کافی اشارہ موجود ہے اور شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہ) نے اسی بناء پر آیت زیر بحث کی تفسیر کرتے ہوئے تاریخی شہادت کا اس طرح ذکر فرمایا ہے:

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے یاروں (حواریوں) نے بڑی محنتیں کی ہیں تب ان کا دین نشر ہوا، ہمارے حضرت کے پیچھے بھی حنفیوں نے اس سے زیادہ کیا۔"

Marfat.com

مگر اس کے برعکس بائبل (انجیل) بعض مقامات میں اگر ان کی منقبت اور مدح سرائی میں رطب اللسان ہے تو دوسری جانب ان کو بزدل اور منافق ثابت کرتی ہے۔ انجیل یوحنا میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشہور و معتمد علیہ حواری یہودا کے متعلق اس وقت کا حال جب حضرت یسوع علیہ السلام کو یہودی گرفتار کرنا چاہتے ہیں، اس طرح مذکور ہے:

"یہ باتیں کہہ کر یسوع اپنے دل میں گھبرایا اور یہ گواہی دی کہ میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ تم میں سے ایک شخص مجھے پکڑا دے گا۔ شاگرد شبہ کر کے کہ وہ کس کی نسبت کہتا ہے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے.... ایک شخص جس سے یسوع محبت کرتا تھا .... اس نے یسوع کی چھاتی کا سہارا لے کر کہا اے خداوند وہ کون ہے؟ یسوع نے جواب دیا کہ جسے میں نوالہ ڈبو کر دے دوں گا وہی ہے، پھر اس نے نوالہ ڈبو دیا اور لے کر شمعون اسکریوتی کے بیٹے یہوداہ کو دے دیا اور اس نوالہ کے بعد شیطان اس میں سما گیا۔" ✿

اور انجیل متی میں اس شمعون پطرس حواری کے متعلق جو "بقول اناجیل ساری عمر حضرت یسوع کا پیارا اور معتمد علیہ رہا" یہ مسطور ہے:

"شمعون پطرس نے اس سے کہا، اے خداوند تو کہاں جاتا ہے، یسوع نے جواب دیا کہ جہاں میں جاتا ہوں اب تو میرے پیچھے نہیں آ سکتا مگر بعد میں میرے پیچھے آئے گا۔ پطرس نے اس سے کہا اے خداوند میں اب تیرے پیچھے کیوں نہیں آ سکتا، میں تو تیرے لیے اپنی جان دوں گا، یسوع نے جواب دیا، کیا تو میرے لیے اپنی جان دے گا؟ میں تجھ سے سچ سچ کہتا ہوں کہ مرغ بانگ نہ دے گا جب تک کہ تو تین بار میرا انکار نہ کرے گا۔" ✿

اور اسی متی کی انجیل میں تمام شاگردوں (حواریوں) کی بزدلی اور حضرت یسوع کو بے یار و مددگار چھوڑ کر فرار ہو جانے کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے:

"اس پر سارے شاگرد اسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔" ✿

ان حوالجات سے تین ایسی باتیں ثابت ہوتی ہیں جن کو کسی طرح بھی عقل و نقل تسلیم کرنے کو تیار نہیں اوّل یہ کہ جو شاگرد اور حواری حضرت یسوع کے زیادہ قریب، ان کے معتمد علیہ اور ان کی نگاہوں میں محبوب تھے وہ نتیجہ میں نہ صرف بزدل بلکہ "منافق نکلے مگر عقل و نقل کا فیصلہ یہ ہے کہ اگرچہ ہر ایک پیغمبر اور مصلح کی جماعت میں ایک چھوٹا سا گروہ منافقین کا عموماً ہوتا ہے جو اپنی دنیوی اغراض کی خاطر بہ کراہت قلب ظاہر داری کے طور پر شریک جماعت ہونا مفید سمجھتا ہے مگر ایک مصلح اور پیغمبر کے درمیان ہمیشہ سے یہ فرق رہا ہے کہ مصلح خواہ اپنی جماعت کے منافقین سے پوری طرح آگاہ نہ ہو سکے لیکن نبی اور پیغمبر کو "وحی الٰہی" کے ذریعہ شروع ہی سے مخلص اور منافق کی اطلاع دے دی جاتی ہے تاکہ ایک منکر و کافر سے زیادہ جس گروہ سے جماعت حق اور اس کی دعوت و اصلاح کو ضرر پہنچ سکتا ہے، نبی اس کے حالات سے غافل نہ رہے۔ پس اسی پر کوئی منافق کسی وقت اور کسی حالت میں بھی نبی اور پیغمبر کا محبوب معتمد علیہ اور مقرب نہیں ہو سکتا، البتہ یہ ایک جدا امر ہے کہ نبی دین حق کی صالح کی وجہ سے اس کے ساتھ اعراض اور درگذر کا طریق عمل مناسب سمجھے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے ایک صحابی کے اس سوال پر کہ "جب آپ منافقین کے حالات منافقت سے آگاہ ہیں تو ان کا مقابلہ کر کے کیوں ان کو کیفر کردار تک نہیں پہنچا دیتے تاکہ جماعت مسلمین کو ان کی منافقت سے نجات ملے" یہ جواب د

✿ باب ۱۳ آیات ۲۱-۲۷ ✿ متی باب ۲۷ آیات ۴۶ ✿ باب ۲۶ آیات ۵۶

Marfat.com

"اس لیے کہ ان کے قبول ایمان کی ظاہر داری کے بعد ہمارے سخت گیر طریقہ کے متعلق غیر مسلموں کو یہ دھوکا نہ ہو کہ وہ کہہ اٹھیں "محمد ﷺ، اپنے ساتھیوں کو بھی قتل کرنے سے نہیں چوکتے۔"

دوسری بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ یہوداہ کے اندر شیطان نے اس وقت حلول کیا جب حضرت یسوع نے اپنے ہاتھ سے اس کو نوالہ ڈبو کر دیا، مگر یہ بات بھی اس لیے عقل ونقل کے خلاف ہے کہ بزرگوں اور مقدس انسانوں کے ہاتھوں سے جو کچھ ہوتا ہے اس کا اثر برکت، طہارت اور تقدیس تو ہوا کرتا ہے لیکن شیطان کا حلول اور بدی کا نفوذ نہیں ہوا کرتا، بیشک یہ درست ہے کہ جب حق کا ترازو قائم ہوتا ہے تو اس سے کھرا اور کھوٹا دونوں کی حقیقت کا انکشاف ہو جایا کرتا ہے لیکن یہ کبھی نہیں ہوتا کہ اس پیمانہ کے مس کرنے سے کسی کھرے میں کھوٹ پیدا ہو جائے اور انجیل کے اس بیان میں صورت حال پہلی نہیں بلکہ دوسری ہے۔

تیسری بات یہ کہ حضرت یسوع کے تمام ان حواریوں میں سے "جن کی مدح وستائش میں جگہ جگہ بائبل رطب اللسان ہے" ایک، دو، یا دس پانچ نہیں سب کے سب نہایت بزدلی اور غداری کے ساتھ اس وقت حضرت مسیح علیہ السلام سے کنارہ کش ہو گئے، جب دین حق کی حمایت ونصرت کے لیے سب سے زیادہ ان کی ضرورت تھی اور جب کہ پیغمبر خدا علیہ السلام دشمنوں کے نرغہ میں پھنسے ہوئے تھے۔

مگر انجیل کی اس شہادت کے خلاف سورۂ آل عمران میں قرآن عزیز نے یہ شہادت دی ہے کہ اس نازک وقت میں جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں کو دین حق کی نصرت و یاری کے لیے پکارا تو سب نے اولوالعزمی اور فداکارانہ جذبہ کے ساتھ یہ جواب دیا: "نحن انصار اللّٰہ" اور پھر حضرت مسیح علیہ السلام کے سامنے اپنی استقامت دین اور اپنے مخلصانہ ایمان کے متعلق شہادت دے کر نصرت کا پورا پورا یقین دلایا اور پھر سورۂ صف میں قرآن عزیز نے یہ بھی ظاہر کیا کہ ان حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے جو کچھ کہا تھا ان کی موجودگی میں اور ان کے بعد سچی وفاداری کے ساتھ نباہا اور بلاشبہ مومنین صادقین ثابت ہوئے اور اس لیے اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی مدد فرمائی اور ان کو دشمنانِ حق کے مقابلہ میں کامیاب کیا۔

انجیل اور قرآن کے اس موازنہ کو دیکھ کر ایک انصاف پسند یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس معاملہ میں "حق" قرآن کے ساتھ ہے اور علماء نصاریٰ نے انجیل میں تحریف کر کے اس قسم کے گھڑے ہوئے واقعات کا اضافہ اس لیے کیا ہے تاکہ صدیوں بعد کے خود ساختہ عقیدہ "عقیدہ" "صلیب مسیح" سے متعلق یہ داستان صحیح ترتیب پر قائم ہو سکے کہ جب مسیح علیہ السلام کو صلیب پر لٹکایا گیا تو انہوں نے یہ کہتے کہتے جان دے دی:

"ایلی ایلی لماسبقتنی." "اے خدا اے خدا! تو نے مجھے کیوں یکہ وتنہا چھوڑ دیا"

اور کسی ایک شخص نے بھی مسیح علیہ السلام کا ساتھ نہ دیا...... بہرحال حواریوں سے متعلق بائبل کی یہ تصریحات محرف اور خود ساختہ داستان سرائی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔

نزول مائدہ :

مخلص اور فداکار حواریوں کی جماعت اگرچہ صادق الایمان اور راسخ الاعتقاد تھی مگر علمی ومجلسی تکلفات گفت وشنید کے لحاظ سے سادہ لوح اور ضروریات زندگی کے سروسامان کے اعتبار سے غرباء اور ضعفاء کی جماعت تھی اس لیے انہوں نے از راہ سادگی سادہ

Marfat.com

دلی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے یہ درخواست کی کہ جس خدائے برتر میں یہ لامحدود طاقت ہے کہ اس کا ایک نمونہ آپ کی ذات اقدس اور وہ نشان (معجزات) ہیں خدائے تعالیٰ نے جن کو آپ کی تصدیق نبوت و رسالت کے لیے آپ کے ہاتھ پر ظاہر فرمایا اس خدا میں یہ طاقت بھی ضرور ہوگی کہ وہ ہمارے لیے غیب سے ایک دستر خوان نازل کر دیا کرے تا کہ ہم روزی کمانے کی فکر سے آزاد ہو کر باطمینان قلب یاد خدا اور دین حق کی دعوت وتبلیغ میں مصروف رہا کریں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ سن کران کو نصیحت فرمائی کہ اگرچہ خدا کی طاقت بے غایت اور بے نہایت ہے لیکن کسی سچے بندہ کے لیے یہ زیبا نہیں کہ وہ اس طرح خدا کو آزمائے، پس خدا سے ڈرو اور ایسے خیالات سے بچو، یہ سن کر حواریوں نے جواب دیا "ہم اور خدا کو آزمائیں، حاشا ہمارا تو یہ مقصد نہیں، ہمارا تو یہ مطلب ہے کہ رزق کی جدوجہد سے دل کو مطمئن کر کے خدا کے اس عطیہ کو زندگی کا سہارا بنالیں اور آپ کی تصدیق میں ہم کو حق الیقین کا اعتقاد راسخ حاصل ہو جائے اور ہم اس کی خدائی پر کائنات انسانی کے لیے شاہد عدل بن جائیں۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب ان کا بڑھتا ہوا اصرار دیکھا تو بارگاہِ الٰہی میں دعا کی "اے خدا! تو ان کے سوال کو پورا کر اور آسمان سے ایسا مائدہ (دستر خوان نعمت) نازل فرما کہ وہ ہمارے لیے تیرے غضب کا مظہر ثابت نہ ہو بلکہ ہمارے اوّل و آخر سب کے لیے خوشی کی یادگار (عید) بن جائے اور تیرا "نشان" کہلائے اور اس ذریعہ سے ہم کو اپنے غیبی رزق سے شادکام کرے کیونکہ تو ہی بہتر رزق رساں ہے" اس دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی: عیسیٰ تمہاری دعاء قبول ہے، میں اس کو ضرور نازل کروں گا لیکن یہ واضح رہے کہ اس کھلی نشانی نازل ہونے کے بعد اگر ان میں سے کسی نے بھی خدا کے حکم کی خلاف ورزی کی تو پھر ان کو عذاب بھی ایسا ہولناک دوں گا جو کائنات کے کسی انسان کو نہیں دیا جائے گا۔ قرآن عزیز نے نزول مائدہ کے واقعہ کا اس معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ ذکر کیا ہے:

﴿ اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ۖ
قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَ تَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَ نَعْلَمَ اَنْ قَدْ
صَدَقْتَنَا وَ نَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً
مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَ اٰخِرِنَا وَ اٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَ ارْزُقْنَا وَ اَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالَ اللّٰهُ
اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ ﴾

(المائدہ: ۱۱۲-۱۱۵)

"اور (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ حواریوں نے کہا تھا "اے عیسیٰ بن مریم! کیا تمہارا پروردگار ایسا کر سکتا ہے کہ آسمان سے ہم پر ایک خوان اتار دے؟" (یعنی ہماری غذا کے لیے آسمان سے غیبی سامان کر دے) عیسیٰ علیہ السلام نے کہا خدا سے ڈرو (اور ایسی فرمائشیں نہ کرو) اگر تم ایمان رکھتے ہو، انہوں نے کہا (مقصود اس سے قدرت الٰہی کا امتحان نہیں ہے بلکہ) ہم چاہتے ہیں (ہمیں غذا میسر آئے تو) اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل آرام پائیں اور ہم جان لیں کہ تو نے ہمیں سچ بتایا تھا اور اس پر ہم گواہ ہو جائیں۔ اس پر عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے دعا کی "اے اللہ! اے ہمارے پروردگار! ہم پر آسمان

Marfat.com

سے ایک خوان بھیج دے کہ اس کا آنا ہمارے لیے اور ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لیے عید قرار پائے اور تیری طرف سے (فضل وکرم کی) ایک نشانی ہو۔ ہمیں روزی دے تو سب سے بہتر روزی دینے والا ہے" اللہ نے فرمایا: "میں تمہارے لیے خوان بھیجوں گا، لیکن جو شخص اس کے بعد بھی (راہ حق سے) انکار کرے گا تو میں اسے (پاداش عمل میں) عذاب دوں گا، ایسا عذاب کہ تمام دنیا میں کسی آدمی کو بھی ویسا عذاب نہیں دیا جائے گا۔"

یہ مائدہ نازل ہوا یا نہیں؟ قرآن عزیز نے اس کے متعلق کوئی تفصیل نہیں بیان کی اور نہ کسی مرفوع حدیث میں اس کا کوئی تذکرہ پایا جاتا ہے، البتہ آثار صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم میں ضرور تفصیلات مذکور ہیں:

مجاہد اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مائدہ کا نزول نہیں ہوا، اس لیے کہ خدائے تعالیٰ نے اس کے نزول کو جس شرط کے ساتھ مشروط کر دیا مطلب کرنے والوں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ انسان ضعیف البنیان اور کمزوریوں کا مجسمہ ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی لغزش یا معمولی خلاف ورزی کی بدولت اس دردناک عذاب کے سزاوار ٹھہریں اپنے سوال کو واپس لے لیا، علاوہ ازیں اگر مائدہ کا نزول ہوا ہوتا تو وہ ایسا نشانِ الٰہی (معجزہ) تھا کہ نصاریٰ اس پر جس قدر بھی فخر کرتے وہ کم تھا اور ان کے یہاں اس کی جس قدر بھی شہرت ہوتی وہ بے جا نہ ہوتی تاہم ان کے یہاں اس نزول مائدہ کا اس طرح کوئی تذکرہ نہیں پایا جاتا۔ [1]

اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ یہ واقعہ پیش آیا اور مائدہ کا نزول ہوا جمہور کا رجحان اسی جانب ہے البتہ اس کے نزول کی تفصیلات میں مختلف اقوال پائے جاتے ہیں مثلاً صرف ایک دن نازل ہوا یا چالیس روز تک نازل ہوتا رہا؟ اور پھر اترنا بند ہو گیا تو کیوں؟ اور صرف یہی ہوا کہ نازل نہ ہوا یا جن لوگوں کی خلاف ورزی کی وجہ سے بند ہوا ان پر سخت قسم کا عذاب بھی آ پہنچا؟ جو نقول یہ کہتی ہیں کہ مائدہ کا نزول صرف ایک دن نہیں بلکہ چالیس دن تک برابر جاری رہا وہ بند ہو جانے کا سبب یہ بیان کرتی ہیں کہ نزول مائدہ پر حکم یہ ہوا کہ اس کو فقیر مسکین اور مریض ہی کھائیں تونگر اور بھلے چنگے نہ کھائیں مگر چند روز تعمیل کے بعد لوگوں نے آہستہ آہستہ اس کی خلاف ورزی شروع کر دی یا یہ حکم ملا تھا کہ اس کو کھائیں سب مگر اگلے روز کے لیے ذخیرہ نہ کریں مگر کچھ عرصہ کے بعد اس کی خلاف ورزی ہونے لگی اور نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف مائدہ کا نزول ہی بند ہو گیا بلکہ خلاف ورزی کرنے والے خنزیر اور بندر کی شکل میں مسخ کر دیے گئے۔ [2]

بہرحال ان آثار میں جو قدر مشترک ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی تو مشیت باری کا یہ حکم ہوا کہ مائدہ طیار ہو چنانچہ لوگوں کی آنکھوں دیکھتے خدا کے فرشتہ فضاء آسمانی سے اس کو لے کر اترے ادھر فرشتے آہستہ آہستہ اس کو لیے ہوئے اتر رہے تھے اور ادھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام انتہائی خشوع وخضوع کے ساتھ درگاہ الٰہی میں دست بدعا تھے کہ مائدہ آ پہنچا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اوّل دو رکعت نماز شکر ادا کی اور پھر مائدہ (خوان) کو کھولا تو اس میں تلی ہوئی مچھلیاں اور تازہ پھل اور روٹیاں موجود پائیں اور خوان کھولتے ہی ایسی نفیس خوشبو نکلی کہ اس کی مہک نے سب کو مست کر دیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۱۱۶ مگر یوحنا کی انجیل باب ۶ میں تو یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ یہ واقعہ "عید فصح" کے موقع پر پیش آیا۔

[2] نزول مائدہ کا سوال اگرچہ کیا تھا حواریوں نے مگر کیا تھا سب کی جانب سے اس لیے یہ واضح رہے کہ جن نقول میں خلاف ورزی اور اس سے متعلق کا ذکر ہے اس کا اشارہ حواریوں میں سے کسی کی جانب مطلق نہیں ہے کیونکہ یہ بات نصوص قرآنی کے خلاف ہے۔

Marfat.com

نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ کھائیں مگر لوگوں نے اصرار کیا کہ ابتدا آپ کریں، آپ نے ارشاد فرمایا یہ میرے لیے نہیں ہے، تمہاری طلب پر نازل ہوا ہے، یہ سن کر سب گھبرائے کہ نہ معلوم اس کا نتیجہ کیا ہو کہ خدا کا رسول تو نہ کھائے اور ہم کھائیں، آپ نے یہ دیکھ کر ارشاد فرمایا "اچھا فقراء، مساکین، معذورین اور مریضوں کو بلاؤ، یہ ان کا حق ہے تب ہزار ہا بندگانِ خدا نے شکم سیر ہو کر کھایا مگر مائدہ کی مقدار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ❁

اس مسئلہ میں حضرت شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہ) مجاہد اور حسن بصری رحمہ اللہ کے ہم نوا معلوم ہوتے ہیں اور نزول مائدہ سے متعلق ان دونوں جماعتوں سے الگ ایک اور لطیف بات ارشاد فرماتے ہیں۔ موضح القرآن میں ہے:

﴿هَلْ يَسْتَطِيْعُ﴾ "ہو سکے" یہ معنی کہ ہمارے واسطے تمہاری دعا سے اس قدر خرق عادت کرے یا نہ کرے فرمایا ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ﴾ "ڈرو اللہ سے" یعنی بندہ کو چاہیے کہ اللہ کو نہ آزمائے کہ میرا کہا مانتا ہے یا نہیں اگرچہ خداوند! (آقا و مالک) بہتیری مہربانی کرے ﴿وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ﴾ یعنی برکت کی امید پر مانگتے ہیں اور (تاکہ) معجزہ ہمیشہ مشہور رہے۔ آزمانے کو نہیں کہتے ہیں۔ وہ خوان اترا ایک شنبہ کو وہ نصاریٰ کی عید ہے جیسے ہم کو روز جمعہ۔ بعض کہتے ہیں وہ خوان اترا چالیس روز تک اور پھر بعض نے ناشکری کی یعنی حکم ہوا تھا کہ فقراء اور مریض کھائیں نہ محظوظ (تونگر) اور چنگے پھر قریب اسی آدمی سوار اور بندر ہو گئے (مگر) یہ عذاب پہلے یہود میں ہوا تھا پیچھے کسی کو نہیں ہوا۔" ❁

اور بعضے کہتے ہیں (مائدہ) نہ اترا، تہدید سن کر مانگنے والے ڈر گئے نہ مانگا، لیکن پیغمبر کی دعا عبث نہیں اور اس کلام (قرآن) میں نقل کرنا بے حکمت نہیں، شاید اس دعا کا اثر یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت (نصاریٰ) میں آسودگی مال سے ہمیشہ رہی اور جو کوئی ان میں ناشکری کرے تو شاید آخرت میں سب سے زیادہ عذاب پائے۔ اس میں مسلمان کو عبرت ہے کہ اپنا مدعا خرق عادت کی راہ سے نہ چاہے پھر اس کی شکرگزاری بہت مشکل ہے، اسباب ظاہری پر قناعت کرے تو بہتر ہے۔ اس قصہ میں بھی ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ کے آگے حمایت پیش نہیں جاتی۔ ❁

اس سلسلہ میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے موعظت و بصیرت سے متعلق بہت خوب بات ارشاد فرمائی ہے:

"عیسیٰ علیہ السلام سے ان کی قوم نے نزول مائدہ کی درخواست کی تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے جواب ملا "تمہاری درخواست اس شرط کے ساتھ منظور کی جاتی ہے کہ نہ اس میں خیانت کرنا نہ اس کو چھپائے رکھنا اور نہ اس کو ذخیرہ کرنا ورنہ یہ بند کر دیا جائے گا اور تم کو ایسا عبرت ناک عذاب دوں گا جو کسی کو نہ دیا جائے گا۔"

اے معشر عرب! تم اپنی حالت پر غور کرو کہ اونٹوں اور بکریوں کی دم پکڑ کر جنگلوں میں چراتے پھرتے تھے، پھر خدائے تعالیٰ نے اپنی رحمت سے تمہارے درمیان ہی سے ایک برگزیدہ رسول مبعوث فرمایا جس کے حسب و نسب سے تم اچھی طرح واقف ہو، اس نے تم کو یہ خبر دی کہ عنقریب تم عجم پر غالب آ جاؤ گے اور اس پر چھا جاؤ گے۔ اور اس نے تم کو سختی

❁ یہ واقعات بڑی تفصیل کے ساتھ تمام کتب تفسیر میں موجود ہیں۔
❁ شاہ صاحب رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ واقعہ مسخ صحیح نہیں ہے۔
❁ موضح القرآن سورۂ مائدہ

Marfat.com

کے ساتھ منع فرمایا کہ مال و دولت کی فراوانی دیکھ کر ہرگز تم چاندی اور سونے کے خزانے جمع نہ کرنا مگر قسم بخدا کہ زیادہ لیل و نہار نہ گزریں گے کہ تم ضرور سونے چاندی کے خزانے جمع کرو گے اور اس طرح خدائے برتر کے دردناک عذاب کے مستحق بنو گے۔ [1]

"رفع الی السماء" یعنی زندہ آسمان پر اٹھالیا جانا:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے نہ شادی کی اور نہ بودوماند کے لیے گھر بنایا، وہ شہر شہر اور گاؤں گاؤں خدا کا پیغام سناتے اور دین حق کی دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دیتے اور جہاں بھی رات آ پہنچتی وہیں کسی سروسامان راحت کے بغیر شب بسر کر دیتے تھے اور چونکہ ان کی ذات اقدس سے مخلوق خدا جسمانی و روحانی دونوں طرح کی شفا اور تسکین پاتی تھی اس لیے جس جانب بھی ان کا گزر ہو جاتا خلقت کا انبوہ حسن عقیدت کے ساتھ جمع ہو جاتا اور والہانہ محبت کے ساتھ ان پر نثار ہو جانے کو تیار رہتا تھا۔

یہود کو اس دعوت حق کے ساتھ جو بغض و عناد تھا اس نے اس بڑھتی ہوئی مقبولیت کو انتہائی حسد اور سخت خطرہ کی نگاہ سے دیکھا اور جب ان کے مسخ شدہ قلوب کسی طرح اس کو برداشت نہ کر سکے تو ان کے سرداروں، فقیہوں، فریسیوں اور صدوقیوں نے ذات اقدس کے خلاف سازش شروع کی اور طے یہ پایا کہ اس ہستی کے خلاف کامیابی حاصل کرنے کی بجز اس کے کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ بادشاہ وقت کو مشتعل کر کے اس کو دار پر چڑھا دیا جائے۔

گزشتہ چند صدیوں سے یہود کے ناگفتہ بہ حالات کی بدولت اس زمانہ میں یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کی حکومت اپنے باپ دادا کے علاقہ میں سے بمشکل ایک چوتھائی پر قائم تھی اور وہ بھی برائے نام اور اصل حکومت و اقتدار، وقت کے بت پرست شہنشاہ قیصر روم کو حاصل تھا اور اس کی نیابت میں پلاطیس یہودیہ کے اکثر علاقہ کا گورنر یا بادشاہ تھا۔

یہود اگرچہ اس بت پرست بادشاہ کے اقتدار کو اپنی بدبختی سمجھ کر اس سے متنفر تھے مگر حضرت مسیح علیہ السلام کے خلاف قلوب میں مشتعل حسد کی آگ نے اور صدیوں کی غلامی سے پیدا شدہ پست ذہنیت نے ایسا اندھا کر دیا کہ انجام اور نتیجہ کی فکر سے بے پرواہ ہو کر پلاطیس کے دربار میں جا پہنچے اور عرض کیا: "عالی جاہ! یہ شخص نہ صرف ہمارے لیے بلکہ حکومت کے لیے بھی خطرہ بنتا جارہا ہے اگر فوراً ہی اس کا استیصال نہ کیا تو نہ ہمارا دین ہی صحیح حالت میں باقی رہ سکے گا اور اندیشہ ہے کہ کہیں آپ کے ہاتھ سے حکومت کا اقتدار بھی نہ چلا جائے اس لیے کہ اس شخص نے عجیب و غریب شعبدے دکھا کر خلقت کو اپنا گرویدہ بنالیا ہے اور ہر وقت اس گھات میں لگا ہے کہ عوام کی اس طاقت کے بل پر قیصر اور آپ کو شکست دے کر خود بنی اسرائیل کا بادشاہ بن جائے۔ اس شخص نے لوگوں کو صرف دنیوی راہ سے ہی گمراہ نہیں کیا بلکہ اس نے ہمارے دین تک کو بھی بدل ڈالا اور لوگوں کو بد دین بنانے میں منہمک ہے۔ پس اس فتنہ کا انسداد از بس ضروری ہے تاکہ بڑھتا ہوا یہ فتنہ ابتدائی منزل ہی میں کچل ڈالا جائے۔"

غرض کافی گفت و شنید کے بعد پیلاطیس نے ان کو اجازت دے دی کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کو گرفتار کر لیں اور شاہی دربار میں مجرم کی حیثیت سے پیش کریں، بنی اسرائیل کے سردار، فقیہ اور کاہن یہ فرمان حاصل کر کے بے حد مسرور ہوئے اور فخر و مباہات

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۲ سورۂ مائدہ

کے ساتھ ایک دوسرے کو مبارک باد دینے لگے کہ آخر ہماری سازش کارگر ہوئی اور ہماری تدبیر کا تیر ٹھیک نشانہ پر بیٹھ گیا اور کہنے لگے کہ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ خاص موقع کا منتظر رہا جائے اور کسی خلوت اور تنہائی کے موقع پر اس طرح اس کو گرفتار کیا جائے کہ عوام میں ہیجان نہ ہونے پائے۔ انجیل یوحنا میں اس واقعہ سے متعلق یہ کہا گیا ہے:

پس سردار کاہنوں اور فریسیوں نے صدر عدالت کے لوگوں کو جمع کر کے کہا ہم کرتے کیا ہیں؟ یہ آدمی تو بہت معجزے دکھاتا ہے، اگر ہم اسے یونہی چھوڑ دیں تو سب اس پر ایمان لے آئیں گے اور رومی آ کر ہماری جگہ اور قوم دونوں پر قبضہ کر لیں گے اور ان میں سے کائفا نامی ایک شخص نے جو اس سال سردار کاہن تھا ان سے کہا تم نہیں جانتے اور نہ سوچتے ہو کہ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ ایک آدمی امت کے واسطے مرے نہ کہ ساری قوم ہلاک ہو۔ [1]

یہ اس مشورہ کا تذکرہ ہے جو بادشاہ کے پاس جانے سے قبل آپس میں ہوا اور یہ خطرہ ظاہر کیا گیا کہ اگر اس ہستی کو یونہی چھوڑ دیا گیا تو بادشاہ وقت (قیصر) کہیں سلطنت کے لیے خطرہ سمجھ کر رہی سہی برائے نام حکومت یہود کا بھی خاتمہ نہ کر دے۔

اور مرقس کی انجیل میں ہے:

دو دن کے بعد فصح اور عید الفطر ہونے والی تھی اور سردار کاہن اور فقیہ موقع ڈھونڈ رہے تھے کہ اسے کیونکر فریب سے پکڑ کر قتل کریں کیونکہ کہتے تھے کہ عید کو کہیں ایسا نہ ہو کہ بلوہ ہو جائے۔ [2]

دوسری جانب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواریوں کے مکالمہ کو سورۂ آل عمران اور سورۂ صف کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب یہود کے کفر و انکار اور معاندانہ ریشہ دوانیوں کو محسوس کیا تو ایک جگہ اپنے حواریوں کو جمع کیا اور ان سے فرمایا کہ بنی اسرائیل کے سرداروں اور کاہنوں کی معاندانہ سرگرمیاں تم سے پوشیدہ نہیں ہیں، اب وقت کی نزاکت اور کڑی آزمائش و امتحان کی گھڑی کی قربت تقاضا کرتی ہے کہ میں تم سے سوال کروں کہ تم میں کون وہ افراد ہیں جو اس کفر و انکار کے سیلاب کے سامنے سینہ سپر ہو کر خدا کے دین کے ناصر و مددگار بنیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد مبارک سن کر سب نے بڑے جوش و خروش اور صداقت ایمانی کے ساتھ جواب دیا "ہم ہیں اللہ کے مددگار خدائے واحد کے پرستار، آپ گواہ رہیں کہ ہم مسلم و وفا شعار ہیں، اور درگاہِ باری میں اپنی اس اطاعت کوشی پر استقامت کے لیے یوں دست بدعا ہیں اے پروردگار! ہم تیری اتاری ہوئی کتاب پر ایمان لے آئے اور صدق دل کے ساتھ تیرے پیغمبر کے پیرو ہیں، خدایا! تو ہم کو صداقت و حقانیت کے فداکاروں کی فہرست میں لکھ لے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے فریضہ دعوت و تبلیغ کے خلاف یہود بنی اسرائیل کی مخالفانہ سرگرمیوں سے متعلق حالات کا یہ حصہ تو اکثر و بیشتر ایسا ہے کہ قرآن اور انجیل کے درمیان اصولاً اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن اس کے مابعد کے پورے حصہ بیان میں دونوں کی قطعاً جدا جدا راہیں ہیں اور ان کے درمیان اس درجہ تضاد ہے کہ کسی طرح بھی ایک کو دوسری راہ کے قریب نہیں لایا جا سکتا۔ البتہ اس جگہ پہنچ کر یہود اور نصاریٰ دونوں کا باہمی اتحاد ہو جاتا ہے اور دونوں کے بیانات واقعہ سے متعلق ایک ہی عقیدہ پیش کرتے ہیں، فرق ہے تو یہ کہ یہود اس واقعہ کو اپنا کارنامہ اور اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں اور نصاریٰ اس کو یہود بنی اسرائیل کی ایک

[1] باب ۱۱ آیات ۴۷-۵۱ [2] باب ۱۴ آیات ۱-۲

Marfat.com

قابل لعنت جدوجہد یقین کرتے ہیں۔

یہود اور نصاریٰ دونوں کا مشترک بیان یہ ہے کہ یہود کے سرداروں اور کاہنوں کو یہ اطلاع ملی کہ اس وقت یسوع علیہ السلام لوگوں کی بھیڑ سے الگ اپنے شاگردوں کے ساتھ ایک بند مکان میں موجود ہیں، یہ موقع بہترین ہے، اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے فوراً ہی یہ لوگ موقع پر پہنچ گئے اور چاروں طرف سے مکان کا محاصرہ کر کے یسوع علیہ السلام کو گرفتار کر لیا اور توہین وتذلیل کرتے ہوئے پیلاطیس کے دربار میں لے گئے تاکہ وہ ان کو سولی پر لٹکائے اور اگرچہ پیلاطیس نے عیسیٰ علیہ السلام کو بے قصور سمجھ کر چھوڑ دینا چاہا مگر بنی اسرائیل کے اشتعال پر مجبوراً سپاہیوں کے حوالہ کر دیا۔ سپاہیوں نے ان کو کانٹوں کا تاج پہنایا، منہ پر تھوکا، کوڑے لگائے اور ہر طرح کی توہین وتذلیل کرنے کے بعد مجرموں کی طرح سولی پر لٹکا دیا اور دونوں ہاتھوں میں میخیں ٹھونک دیں، سینہ کو برچھی کی انی سے چھید دیا اور اس کسمپرسی کی حالت میں انہوں نے یہ کہتے ہوئے جان دے دی "ایلی ایلی لما سبقتنی" انجیل متی میں اس واقعہ کی تفصیلات کو ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

"سردار کاہن نے اس سے کہا: میں تجھے زندہ خدا کی قسم دیتا ہوں کہ اگر تو خدا کا بیٹا مسیح علیہ السلام ہے تو ہم سے کہہ دے۔ یسوع نے اس سے کہا: تو نے خود کہہ دیا بلکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس کے بعد تم ابن آدم کو قادر مطلق کی داہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں پر آتا دیکھو گے اس پر سردار کاہن نے یہ کہہ کر اپنے کپڑے پھاڑے کہ اس نے کفر بکا ہے، اب ہمیں گواہوں کی کیا حاجت رہی، دیکھو تم نے ابھی یہ کفر سنا ہے تمہاری کیا رائے ہے، انہوں نے جواب میں کہا وہ قتل کے لائق ہے اس پر انہوں نے اس کے منہ پر تھوکا اور اس کے مکے مارے اور بعض نے طمانچے مار کے کہا "اے مسیح ہمیں نبوت سے بتا کہ کس نے تجھے مارا.... جب صبح ہوئی تو سب سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں نے یسوع کے خلاف مشورہ کیا کہ اسے مار ڈالیں اور اسے باندھ کر لے گئے اور پیلاطیس حاکم کے حوالہ کیا.... اور حاکم کا دستور تھا کہ عید پر لوگوں (بنی اسرائیل) کی خاطر ایک قیدی جسے وہ چاہتے تھے چھوڑ دیتا تھا اس وقت برابا نام ان کا ایک مشہور قیدی تھا پس جب وہ اکٹھے ہوئے تو پیلاطیس نے ان سے کہا تم کسے چاہتے ہو کہ میں تمہاری خاطر چھوڑ دوں؟ برابا کو یا یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے؟.... وہ بولے برابا کو، پیلاطیس نے ان سے کہا پھر یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے، کیا کروں، سب نے کہا اس کو صلیب دی جائے اس نے کہا کہ کیوں؟ اس نے کیا برائی کی ہے؟ مگر وہ اور بھی چلا چلا کر بولے کہ اس کو صلیب دی جائے، جب پیلاطیس نے دیکھا کہ کچھ بن نہیں پڑتا الٹا بلوہ ہوتا جاتا ہے تو پانی لے کر لوگوں کے روبرو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا "میں اس راست باز کے خون سے بری ہوں تم جانو" سب لوگوں نے جواب دے کر کہا "کہ اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر" اس پر اس نے برابا کو ان کی خاطر چھوڑ دیا اور یسوع کو کوڑے لگوا کر حوالے کیا تاکہ صلیب دی جائے۔ اس پر حاکم کے سپاہیوں نے یسوع کو قلعہ میں لے جا کر ساری پلٹن اس کے گرد جمع کی اور اس کے کپڑے اتار کر اسے قرمزی چوغہ پہنایا اور کانٹوں کا تاج بنا کر اس کے سر پر رکھا اور ایک سرکنڈا اس کے داہنے ہاتھ میں دیا اور اس کے آگے گھٹنے ٹیک کر اسے ٹھٹھوں میں اڑانے لگے کہ اے یہودیوں کے بادشاہ آداب اور اس پر تھوکا اور وہی سرکنڈا لے کر اس کے سر پر مارنے لگے اور جب اس کا ٹھٹھا کر چکے تو چوغے کو اس پر سے اتار کر پھر اس کے کپڑے اسے پہنائے اور صلیب دینے کو لے گئے۔ اس وقت

Marfat.com

اس کے ساتھ دوڈاکو صلیب پر چڑھائے گئے ایک داہنے اور ایک بائیں اور راہ چلنے والے سر ہلا ہلا کر اس کو لعن طعن کرتے اور کہتے تھے اے مقدس کے ڈھانے والے اور تین دن میں بنانے والے اپنے تئیں بچا اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو صلیب پر سے اتر آ، اسی طرح سردار کاہن بھی فقیہوں بزرگوں کے ساتھ مل کر ٹھٹھے کے ساتھ کہتے تھے اس نے اوروں کو بچایا اپنے تئیں نہیں بچا سکتا.... اور دو پہر سے لے کر تیسرے پہر تک تمام ملک میں اندھیرا چھایا رہا اور تیسرے پہر کے قریب یسوع نے بڑی آواز سے چلا کر کہا: "ایلی ایلی لما سبقتنی "۔"اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو نے مجھ کو کیوں چھوڑ دیا" جو وہاں کھڑے تھے ان میں سے بعض نے سن کر کہا، یہ ایلیا کو پکارتا ہے .... یسوع پھر بڑی آواز سے چلایا اور جان دے دی۔"❶

تفصیلات میں کم و بیش فرق کے ساتھ یہی مفروضہ داستان باقی تینوں انجیلوں میں بھی مذکور ہے۔ چاروں انجیلوں کی اس متفقہ مگر مفروضہ داستان کو مطالعہ کرنے کے بعد طبیعت پر قدرتی اثر یہ پڑتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی موت انتہائی بیکسی اور بے بسی کی حالت میں دردناک طریقہ سے ہوئی اور اگرچہ خدا کے پاک اور مقدس بندوں کے لیے یہ کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی بلکہ مقربین بارگاہ صمدی کے لیے اس قسم کی کڑی آزمائشوں کا مظاہرہ اکثر ہوتا رہا ہے لیکن اس واقعہ کا یہ پہلو اس کے مفروضہ اور گھڑے ہوئے ہونے پر روز روشن کی طرح شاہد ہے کہ حضرت یسوع نے ایک اولوالعزم پیغمبر بلکہ مرد صالح کی طرح اس واقعہ کو صبر و رضاء الٰہی کے ساتھ انگیز نہیں کیا بلکہ ایک انتہائی مایوس انسان کی طرح خدا سے شکوہ کرتے کرتے جان دے دی" ایلی ایلی لما سبقتنی " کہتے ہوئے جان دے دینا مایوسی اور شکوہ کی وہ صورت حال ہے جو کسی طرح بھی حضرت مسیح علیہ السلام کے شایان شان نہیں کہی جاسکتی، پھر اس واقعہ کا یہ پہلو بھی کم حیرت زا نہیں ہے کہ بقول انجیل کے یسوع مسیح نے اس حادثہ سے قبل تین مرتبہ خدائے تعالیٰ سے یہ درخواست کی "اے میرے باپ اگر ہو سکے تو یہ (موت کا) پیالہ مجھ سے ٹل جائے" اور جب یہ درخواست کسی طرح قبول نہ ہوئی تو مایوس ہو کر یہ کہنا پڑا "اگر یہ میرے پئے بغیر نہیں ٹل سکتا تو تیری مرضی پوری ہو۔"

باعث حیرت یہ بات ہے کہ جبکہ عقیدۂ "کفارہ" کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ معاملہ خدا اور اس کے بیٹے (العیاذ باللہ) کے درمیان طے شدہ تھا تو پھر اس درخواست کے کیا معنی اور اگر لوازم بشریت کی بناء پر تھا تو خدا کی مرضی معلوم ہو جانے اور اس پر قناعت کر لینے کے بعد پھر یہ بے صبر اور مایوس انسانوں کی طرح جان دینے کا کیا سبب؟

یہود کی گھڑی ہوئی اس داستان کو چونکہ نصاریٰ نے قبول کر لیا تو یہود از راہ فخر و غرور اس پر بے حد مسرور ہیں اور کہتے ہیں کہ مسیح ناصری اگر "مسیح موعود" ہوتا تو خدائے تعالیٰ اس بے بسی اور بے کسی کے ساتھ اس کو ہمارے ساتھ میں نہ دیتا کہ وہ مرتے وقت تک خدا سے شکوہ کرتا رہا کہ اس کو بچائے مگر خدا نے اس کی کوئی مدد نہ کی حالانکہ ہمارے باپ دادا اس وقت بھی کافی اشتعال دیتے رہے کہ اگر تو حقیقتاً خدا کا بیٹا اور "مسیح موعود" ہے تو کیوں تجھ کو خدا نے ہمارے ہاتھوں اس ذلت سے نہ بچالیا۔

واقعہ یہ ہے کہ نصاریٰ کے پاس اس چبھتے ہوئے الزام کا کوئی جواب نہیں تھا اور واقعہ کی ان تفصیلات کو مان لینے کے بعد "عقیدۂ کفارہ" کی کوئی قیمت باقی نہیں رہ جاتی تھی تب انہوں نے واقعہ کی ان تفصیلات کے بعد ایک پارۂ بیان کا اور اضافہ کیا۔

---

❶ باب ۲۶ آیت ۵۷ تا ۷۵

Marfat.com

یوحنا کی انجیل میں ہے:

لیکن جب انہوں نے یسوع کے پاس آ کر دیکھا کہ وہ مر چکا ہے تو اس کی ٹانگیں نہ توڑ دیں مگر ان میں سے ایک سپاہی نے بھالے سے اس کی پسلی چھیدی اور فی الفور اس سے خون اور پانی بہ نکلا.... ان باتوں کے بعد ارملیتہ کے رہنے والے یوسف نے جو یسوع کا شاگرد تھا یہودیوں کے خوف سے خفیہ طور پر پیلاطیس سے اجازت چاہی کہ یسوع کی لاش لے جائے، پیلاطیس نے اجازت دے دی پس وہ آ کر اس کی لاش لے گیا اور نیکدیمس بھی آیا جو پہلے یسوع کے پاس رات کو گیا تھا اور پچاس سیر کے قریب مر اور عود ملا ہوا لایا۔ پس انہوں نے یسوع کی لاش لے کر اسے سوتی کپڑے میں خوشبودار چیزوں کے ساتھ کفنایا جس طرح کہ یہودیوں میں دفن کرنے کا دستور ہے اور جس جگہ اسے صلیب دی گئی وہاں ایک باغ تھا اور اس باغ میں ایک نئی قبر تھی جس میں کبھی کوئی نہ رکھا گیا تھا پس انہوں نے یہودیوں کی تیاری کے دن کے باعث یسوع کو وہیں رکھ دیا۔ ہفتہ کے پہلے دن مریم مگدلینی ایسے تڑکے کہ ابھی اندھیرا ہی تھا قبر پر آئی اور پتھر کو قبر سے ہٹا ہوا دیکھا پس وہ شمعون پطرس اور اس کے دوسرے شاگرد کے پاس جسے یسوع عزیز رکھتا تھا دوڑی ہوئی گئی اور ان سے کہا کہ خداوند کو قبر سے نکال لے گئے اور ہمیں معلوم نہیں کہ اسے کہاں رکھ دیا.... لیکن مریم باہر قبر کے پاس کھڑی روتی رہی اور جب روتے روتے قبر کی طرف جھک کے اندر نظر کی تو دو فرشتوں کو سپید پوشاک پہنے ہوئے ایک کو سرہانے اور دوسرے کو پائنتی بیٹھے دیکھا جہاں یسوع کی لاش پڑی تھی انہوں نے اس سے کہا اے عورت تو کیوں روتی ہے اس نے ان سے کہا اس لیے کہ میرے خداوند کو اٹھالے گئے اور معلوم نہیں کہ اسے کہاں رکھا یہ کہہ کر وہ پیچھے پھری اور یسوع کو کھڑے دیکھا اور نہ پہچانا کہ یہ یسوع ہے۔ یسوع نے اس سے کہا مریم! وہ پھر کر اس سے عبرانی زبان میں بولی "ربونی" یعنی اے استاد! یسوع نے اس سے کہا مجھے نہ چھو، کیونکہ میں اب تک باپ کے پاس اوپر نہیں گیا لیکن میرے بھائیوں کے پاس جا کر ان سے کہو کہ میں اپنے باپ اور تمہارے باپ کے اور اپنے خدا اور تمہارے خدا کے پاس اوپر جاتا ہوں، مریم مگدلینی نے آ کر شاگردوں کو خبر دی کہ میں نے خداوند کو دیکھا اور اس نے مجھ سے یہ باتیں کہیں۔ پھر اسی دن جو ہفتہ کا پہلا دن تھا شام کے وقت جب وہاں کے دروازے جہاں شاگرد تھے یہودیوں کے ڈر سے بند تھے یسوع آ کر بیچ میں کھڑا ہوا اور ان سے کہا کہ تمہاری سلامتی ہو اور یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھ اور پسلی انہیں دکھائی، پس شاگرد خداوند کو دیکھ کر خوش ہوئے یسوع نے پھر ان سے کہا کہ تمہاری سلامتی ہو جس طرح باپ نے مجھے بھیجا ہے اسی طرح میں بھی تمہیں بھیجتا ہوں اور یہ کہہ کر ان کو پھونکا اور ان سے کہا "روح القدس" لو۔ [1]

ہر ایک شخص معمولی غور و فکر کے بعد بہ سہولت سمجھ سکتا ہے کہ یہ پارۂ بیان پہلے حصہ بیان کے ساتھ غیر مربوط اور قطعاً بے جوڑ بلکہ یہ اندازہ لگانا ہی مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں تفصیلات ایک ہی شخصیت سے وابستہ ہیں کیونکہ پہلا پارۂ بیان ایک ایسی شخصیت مرقع ہے جو بے بس و بیکس مایوس اور خدا سے شاکی نظر آتی ہے اور دوسرا حصہ بیان ایسی ہستی کا رخ روشن پیش کرتی ہے جو خدائی صفات سے متصف ذات باری کی مقرب اور پیش آمدہ واقعات سے مطمئن و مسرور ہے بلکہ ان کے وقوع کی متمنی اور ان کو اپنے

---

[1] انجیل یوحنا باب ۱۹ آیت ۳۳۔ ۳۴ و آیت ۳۸۔ ۴۲ و باب ۲۰ آیات ۱ تا ۲۲

ادائے فرض کا اہم جزو سمجھتی ہے۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

بہر حال حقیقت چونکہ دوسری تھی اور ایک عرصہ دراز کے بعد "عقیدۂ کفارہ" کی بدعت نے نصاریٰ کو اس کے خلاف اس گھڑے ہوئے افسانہ کی تصنیف پر مجبور کر دیا اس لیے قرآن عزیز نے حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق دوسرے گوشوں کی طرح اس گوشہ سے بھی جہالت و تاریکی کا پردہ ہٹا کر حقیقت حال کے رخ روشن کو جلوہ آرا کرنا ضروری سمجھا اور اس نے اپنا وہ فرض انجام دیا جس کو مذاہب عالم کی تاریخ میں قرآن کی دعوت تجدید و اصلاح کہا جاتا ہے۔

اس نے بتایا کہ جس زمانہ میں بنی اسرائیل، پیغمبر حق اور رسول خدا (عیسیٰ بن مریم علیہما السلام) کے خلاف خفیہ تدبیروں اور سازشوں میں مصروف اور ان پر نازاں تھے اسی زمانہ میں خدائے برتر کے قانون قضاء و قدر نے یہ فیصلہ نافذ کر دیا کہ کوئی طاقت اور مخالف قوت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام پر قابو نہیں پا سکتی اور ہماری محکم تدبیر اس کو دشمنوں کے ہر "مکر" سے محفوظ رکھے گی اور نتیجہ یہ نکلا کہ جب بنی اسرائیل نے ان پر نرغہ کیا تو ان کو پیغمبر خدا پر کسی طرح دسترس حاصل نہ ہو سکی اور ان کو بحفاظت تمام اٹھا لیا گیا اور جب بنی اسرائیل مکان میں گھسے تو صورت حال ان پر مشتبہ ہو گئی اور وہ ذلت اور رسوائی کے ساتھ اپنے مقصد میں ناکام رہے اور اس طرح خدا نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا جو عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی حفاظت کے لیے کیا گیا تھا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام نے یہ محسوس فرمایا کہ اب بنی اسرائیل کے کفر و انکار کی سرگرمیاں اس درجہ بڑھ گئی ہیں کہ وہ میری توہین و تذلیل بلکہ قتل کے لیے سرگرم سازش ہیں تو انہوں نے خاص طور سے ایک مکان میں اپنے حواریوں کو جمع کیا اور ان کے سامنے صورت حال کا نقشہ پیش فرما کر ارشاد فرمایا: امتحان کی گھڑی سر پر ہے، کڑی آزمائش کا وقت ہے، حق کو مٹانے کی سازشیں پورے شباب پر ہیں، اب میں تمہارے درمیان زیادہ نہیں رہوں گا اس لیے میرے بعد دین حق پر استقامت، اس کی نشر و اشاعت اور یاری و نصرت کا معاملہ صرف تمہارے ساتھ وابستہ ہو جانے والا ہے، اس لیے مجھے بتاؤ کہ خدا کی راہ میں سچا مددگار کون کون ہے۔ حواریوں نے یہ کلام حق سن کر کہا: "ہم سب ہی خدا کے دین کے مددگار ہیں، ہم سچے دل سے خدا پر ایمان لائے ہیں اور اپنی صداقت ایمانی کا آپ ہی کو گواہ بناتے ہیں، اور یہ کہنے کے بعد انسانی کمزوریوں کے پیش نظر اپنے دعویٰ پر ہی بات ختم نہیں کر دی بلکہ درگاہِ الٰہی میں دست بدعا ہو گئے کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں تو اس پر ہم کو استقامت عطا فرما اور ہم کو اپنے دین کے مددگاروں کی فہرست میں لکھ لے۔

اس جانب سے مطمئن ہو کر اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے فریضہ دعوت و ارشاد کے ساتھ ساتھ منتظر رہے کہ دیکھئے معاندین کی سرگرمیاں کیا رخ اختیار کرتی ہیں اور خدائے برحق کا فیصلہ کیا صادر ہوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں قرآن عزیز کے ذریعہ یہود و نصاریٰ کے ظنون و اوہام فاسدہ کے خلاف "علم و یقین کی روشنی" بخشتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ جس وقت معاندین اپنی خفیہ تدبیروں میں سرگرم عمل تھے اسی وقت ہم نے بھی اپنی قدرت کاملہ کی مخفی تدبیر کے ذریعہ یہ فیصلہ کر لیا کہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے متعلق معاندین حق کی تدبیر کا کوئی گوشہ بھی کامیاب نہیں ہونے دیا جائے گا اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی پوشیدہ تدابیر کے مقابلہ میں کسی کی پیش نہ جا سکے گی اس لیے کہ اس کی تدبیر سے بہتر کوئی تدبیر ہو ہی نہیں سکتی۔

Marfat.com

﴿وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴾ (آل عمران: ۵۴)

"اور انہوں نے (یہود نے عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف) خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے (یہود کے مکر کے خلاف) خفیہ تدبیر کی اور اللہ سب سے بہتر خفیہ تدبیر کا مالک ہے۔"

لغت عرب میں "مکر" کے معنی خفیہ تدبیر (اور دھوکا کرنے) کے ہیں اور علم معانی کے قاعدہ "مشاکلہ" کے مطابق جب کوئی شخص کسی کے جواب یا دفاع (Defence) میں خفیہ تدبیر کرتا ہے تو وہ اخلاق اور مذہب کی نگاہ میں کتنی ہی عمدہ تدبیر کیوں نہ ہو اس کو بھی "مکر" ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسا کہ ہر ایک زبان کے محاورہ میں بولا جاتا ہے "برائی کا بدلہ برائی ہے" حالانکہ ہر شخص یہ یقین رکھتا ہے کہ برائی کرنے والے کے جواب میں اسی قدر مقابلہ کا جواب دینا اخلاق اور مذہب دونوں کی نگاہ میں "برائی" نہیں ہے تاہم تعبیر میں دونوں کو ہم شکل ظاہر کر دیا جاتا ہے اور اسی کو "مشاکلہ" کہتے ہیں اور یہ فصاحت و بلاغت کا اہم جز سمجھا جاتا ہے۔

غرض خفیہ تدبیر دونوں جانب سے تھی، ایک جانب برے بندوں کی بری تدبیر اور دوسری جانب خدائے برتر کی بہترین تدبیر، نیز ایک جانب قادر مطلق کی تدبیر کامل تھی جس میں نقص و خامی کا امکان نہیں اور دوسری جانب دھوکے اور فریب کی خام کاریاں تھیں جو تار عنکبوت ہو کر رہ گئیں۔

آخر وہ وقت آ پہنچا کہ بنی اسرائیل کے سرداروں، کاہنوں، اور فقیہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک بند مکان میں محاصرہ کر لیا، ذات اقدس اور حواری مکان کے اندر بند ہیں اور دشمن چاروں طرف سے محاصرہ کئے ہوئے ہیں، لہٰذا اب قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ وہ کیا صورت ہو کہ جس سے دشمن ناکام رہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کسی طرح کا بھی گزند نہ پہنچا سکے تاکہ خدائے قادر کا وعدۂ حفاظت اور دعویٰ تدبیر خیر پورا ہو تو اس کے متعلق قرآن نے بتایا کہ بیشک خدا کا وعدہ پورا ہوا اور اس کی تدبیر محکم نے عیسیٰ علیہ السلام کو دشمنوں کے ہاتھوں سے ہر طرح محفوظ رکھا اور صورت یہ پیش آئی کہ اس نازک گھڑی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو وحی الٰہی نے بشارت سنائی: "عیسیٰ! خوف نہ کر تیری مدت پوری کی جائے گی (یعنی تم کو دشمن قتل نہیں کر سکیں گے اور نہ تم اس وقت موت سے دوچار ہو گے) اور ہوگا یہ کہ میں تجھ کو اپنی جانب (ملاء اعلیٰ کی جانب) اٹھا لوں گا اور ان کافروں سے ہر طرح تجھ کو پاک رکھوں گا (یعنی یہ تجھ پر کسی قسم کا قابو نہ پاسکیں گے) اور تیرے پیروؤں کو ان کافروں پر ہمیشہ غالب رکھوں گا (یعنی بنی اسرائیل کے مقابلہ میں قیامت تک عیسائی اور مسلمان غالب رہیں گے اور ان کو کبھی ان دونوں پر حاکمانہ اقتدار نصیب نہیں ہوگا، پھر انجام کار میری جانب (موت کے بعد) لوٹ آنا ہے پس میں ان باتوں پر فیصلہ حق دوں گا جن کے متعلق تم آپس میں اختلاف کر رہے ہو۔

﴿اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴾ (آل عمران: ۵۵)

"(وہ وقت ذکر کے لائق ہے) جب اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ (علیہ السلام) سے کہا: "اے عیسیٰ! بے شبہ میں تیری مدت کو پوری کروں گا اور تجھ کو اپنی جانب اٹھا لینے والا ہوں اور تجھ کو کافروں (بنی اسرائیل) سے پاک رکھنے والا ہوں اور جو تیری پیروی کریں

Marfat.com

گے ان کو تیرے منکروں پر قیامت تک کے لیے غالب رکھنے والا ہوں، پھر میری جانب ہی لوٹنا ہے، پھر میں ان باتوں کا فیصلہ کروں گا جن کے بارے میں (آج) تم جھگڑ رہے ہو۔"

﴿ وَ اِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۱۱۰ ﴾ (المائدہ: ۱۱۰)

(قیامت کے دن اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ کو اپنے احسانات شمار کراتے ہوئے فرمائے گا) اور وہ وقت یاد کرو جب میں نے بنی اسرائیل کو تجھ سے روک دیا (یعنی وہ کسی طرح تجھ پر قابو نہ پا سکے) جبکہ تو ان کے پاس معجزات لے کر آیا اور ان میں سے کافروں نے کہہ دیا: یہ تو جادو کے ماسوا اور کچھ نہیں ہے۔"

تو اب جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ اطمینان دلا دیا گیا کہ اس سخت محاصرہ کے باوجود دشمن تم کو قتل نہ کر سکیں گے اور تم کو غیبی ہاتھ ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھا لے گا اور اس طرح دشمنانِ دین کے ناپاک ہاتھوں سے آپ ہر طرح محفوظ کر دیے جائیں گے تو اس جگہ پہنچ کر ایک دوسرا سوال پیدا ہوا کہ یہ کس طرح ہوا اور واقعہ نے کیا صورت اختیار کر لی؟ کیونکہ یہود و نصاریٰ تو کہتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام کو سولی پر بھی لٹکایا اور مار بھی ڈالا تب قرآن نے بتایا کہ مسیح بن مریم علیہما السلام کے قتل و صلیب کی پوری داستان سرتاسر غلط اور جھوٹ ہے بلکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ جب مسیح علیہ السلام کو بقید حیات ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھا لیا گیا اور اس کے بعد دشمن مکان کے اندر گھس پڑے تو ان پر صورت حال مشتبہ کر دی گئی اور وہ کسی طرح نہ جان سکے کہ آخر اس مکان میں سے مسیح علیہ السلام کہاں چلا گیا:۔

﴿ وَّ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝۱۵۷ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝۱۵۸ ﴾ (النساء: ۱۵۷۔۱۵۸)

اور (یہود ملعون قرار دیے گئے) اپنے اس قول پر کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم پیغمبر خدا کو قتل کر دیا حالانکہ انہوں نے نہ اس کو قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا بلکہ (خدا کی خفیہ تدبیر کی بدولت) اصل معاملہ ان پر مشتبہ ہو کر رہ گیا اور جو لوگ اس کے قتل کے بارہ میں جھگڑ رہے ہیں بلاشبہ وہ اس (عیسیٰ علیہ السلام) کی جانب سے شک میں پڑے ہوئے ہیں ان کے پاس حقیقت حال کے بارہ میں ظن (اٹکل) کی پیروی کے سوا علم کی روشنی نہیں ہے اور انہوں نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ ان کو اللہ نے اپنی جانب (ملاء اعلیٰ کی جانب) اٹھا لیا اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔"

قرآن عزیز کا یہ وہ بیان ہے جو یہود و نصاریٰ کے اختراعی فسانہ کے خلاف اس نے حضرت مسیح بن مریم علیہما السلام کے متعلق دیا ہے اب دونوں بیانات آپ کے سامنے ہیں، اور عدل و انصاف کا ترازو آپ کے ہاتھ میں۔ پہلے حضرت مسیح علیہ السلام کی شخصیت اور ان کے دعوت و ارشاد کے مشن کو تاریخی حقائق کی روشنی میں معلوم کیجئے اور اس کے بعد ایک مرتبہ پھر ان تفصیلی واقعات پر نظر ڈالیے جو ایک اولوالعزم پیغمبر، مقرب بارگاہ الٰہی اور نصاریٰ کے عقیدۂ باطل کے مطابق خدا کے بیٹے کو خدا کے فیصلہ کے سامنے مایوس، مضطرب،

Marfat.com

بے یارومددگار اور خدا سے شاکی ظاہر کرتے ہیں اور ساتھ ہی اس تضاد بیان پر بھی غور فرمایئے کہ ایک جانب عقیدۂ کفارہ کی بنیاد صرف اس پر قائم ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام خدا کا بیٹا بن کر آیا ہی اس غرض سے تھا کہ مصلوب ہو کر دنیا کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے اور دوسری جانب صلیب اور قتل مسیح علیہ السلام کی داستان اس اساس پر کھڑی کی گئی ہے کہ جب وہ وقت موعود آ پہنچتا ہے تو خدا کا یہ فرضی بیٹا اپنی حقیقت اور دنیا میں وجود پذیری کو یکسر فراموش کر کے "ایلی ایلی لما سبقتنی" کا حسرت ناک جملہ زبان سے کہتا اور مرضی الٰہی پر اپنی ناخوشی کا اظہار کرتا ہوا نظر آیا ہے، کیا کسی شخص کو یہ سوال کرنے کا حق نہیں ہے کہ اگر نصاریٰ کے بیان کردہ واقعات کے دونوں حصے صحیح اور درست ہیں تو ان دونوں کے باہم یہ تضاد کیسا اور اس عدم مطابقت کے کیا معنی؟

پس اگر ایک حقیقت بیں اور دوررس نگاہ ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اور واقعات وحالات کی ان تمام کڑیوں کو باہم جوڑ کر اس مسئلہ کا مطالعہ کرے تو وہ تصدیق حق کے پیش نظر بلا تامل یہ فیصلہ کرے گی کہ بائبل کی یہ داستان تضاد کی حامل اور گھڑی ہوئی داستان ہے اور قرآن نے اس سلسلہ میں جو فیصلہ دیا ہے وہی حق اور مبنی بر صداقت ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد سے سینٹ پال سے قبل تک نصاریٰ "یہود" کی اس خرافی داستان سے قطعاً بے تعلق تھے لیکن جب سینٹ پال (پولوس رسول) نے تثلیث اور کفارہ پر جدید عیسائیت کی بنیاد رکھی تو کفارہ کے عقیدہ کی استواری کے لیے یہود کی اس خرافی داستان کو بھی مذہب کا جز بنالیا گیا۔

لیکن واقعہ سے متعلق حد درجہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جب کہ چودہ صدیوں سے قرآن حکیم نے عیسیٰ علیہ السلام کی عظمت و جلالت قدر کا اعلان کرتے ہوئے ان کے "رفع الی السماء" کی حقیقت کو یہود ونصاریٰ کی خرافی داستان کے خلاف علم ویقین کی روشنی میں نمایاں اور یہود ونصاریٰ کو دلائل و براہین کے ذریعہ لاجواب اور سرنگوں کر دیا تھا تو اس کے مقابلہ میں آج ایک مدعی اسلام، دعوئے نبوت ومسیحیت کے شوق یا ہندوستان پر مسلط عیسائی حکومت کی خودغرضانہ خوشامد میں یہود ونصاریٰ کے اسی عقیدہ کو دوبارہ زندہ کرنا اور اس پر اپنے "باطل عقیدۂ نبوت" کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے اور پنجاب (قادیان) کا یہ متنبی قرآن عزیز کی تصریحات سے بے نیاز ہو کر نہایت جسارت کے ساتھ ان تمام واقعات کی تصدیق کرتا ہے جو اس سلسلہ میں یہود ونصاریٰ نے اپنے اپنے باطل مزعومہ عقائد کی تکمیل کے لیے اختراع کیے ہیں، وہ کہتا ہے کہ بلاشبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہود نے اسیر کیا، ان کا ٹھٹھا اڑایا، ان کے منہ پر تھوکا، ان کے طمانچے بھی لگائے، ان کو کانٹوں کا تاج بھی پہنایا اور ان کے علاوہ ہر قسم کی توہین وتذلیل کا سلوک کرنے کے بعد ان کو صلیب پر بھی چڑھایا اور اپنے زعم میں ان کو قتل بھی کر ڈالا البتہ یہود ونصاریٰ کی حرف بحرف تصدیق کے بعد بغیر کسی قرآنی نص، حدیثی روایت اور تاریخی شہادت کے اپنی جانب سے یہ اضافہ کرتا ہے کہ جب شاگردوں کے مطالبہ پر نعش ان کے حوالہ کر دی گئی اور وہ تجہیز وتکفین کے لیے آمادہ ہوئے تو دیکھا کہ جسم میں جان باقی ہے تب انہوں نے خفیہ طور پر ایک خاص مرہم کے ذریعہ ان کے زخموں کا علاج کیا اور جب وہ چنگے ہو گئے تو پوشیدہ رہ کر کشمیر کو چلے گئے اور وہاں بھی حیات کے آخری لمحوں تک خود کو چھپائے رکھا اور گمنامی میں وہیں انتقال پا گئے، گویا یوں کہیے کہ یہود ونصاریٰ کی مفروضہ داستان میں حضرت مسیح علیہ السلام سے متعلق توہین وتذلیل کے جس قدر بھی پہلو تھے وہ سب تو متنبی کاذب نے قبول کر لیے باقی ان کی عظمت شان اور جلالت مرتبہ سے متعلق پہلو کو داستان سے خارج کر کے اس کے بجائے ایک ایسا فرضی حصہ جوڑ دیا جس سے ایک جانب نیچر پرستوں کو اپنی جانب مائل کرنے کا سامان مہیا ہو سکے اور دوسری جانب

Marfat.com

عیسیٰ علیہ السلام کی باقی زندگی مبارک کو گمنامی کے ساتھ وابستہ کر کے توہین وتذلیل کا ایک اور گوشہ جو تشنہ سامان رہ گیا تھا اس کی تکمیل ہو جائے۔ ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾

متنبی پنجاب کو یہ سب کچھ کرنے کی کیوں ضرورت پیش آئی؟ اس کی جانب ابھی اشارہ کیا جا چکا ہے اور اس کی تفصیل کے لیے پروفیسر برنی کی کتاب "قادیانی مذہب" لائق مطالعہ ہے یا خود متنبی کاذب کی تصنیفی ہفوات اس حقیقت کو عریاں کرنے میں مدد دیتی ہیں۔

ہمارے پیش نظر تو یہ مسئلہ ہے کہ متنبی پنجاب نے کس طرح قرآن حکیم کی نصوص قطعیہ کے خلاف یہود ونصاریٰ کے عقیدۂ "توہین" "تصلیب" اور قتل عیسیٰ علیہ السلام کی تائید پر بے جا جسارت کا اقدام کیا اور جس حد تک اختلاف کیا اس میں بھی دعویٰ قرآنی کے خلاف ان کی حیات طیبہ کو نامراد و ناکام اور گمنام ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی۔

آپ ابھی سن چکے ہیں کہ قرآن عزیز نے بنی اسرائیل کے مقابلہ میں خدائے تعالیٰ کی نجات سے دعویٰ حفاظت و برتری کو کس قوت بیان کے ساتھ نمایاں کیا ہے:

﴿وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝ اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا﴾ (آل عمران: ۵۴-۵۵)

اور پھر کس زور کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دعوائے حفاظت کو اس شان کے ساتھ پورا کیا کہ دشمن کسی حیثیت سے بھی مسیح بن مریم علیہما السلام پر قابو نہ پا سکے اور ہاتھ تک نہ لگا سکے۔

تو اب قابل غور ہے یہ بات کہ ہم دنیا میں روز وشب یہ مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ اگر کسی صاحب قوت واقتدار ہستی کے عزیز دوست یا مصاحب کے خلاف ان کا دشمن درپے آزار یا قتل کے درپے ہوتا ہے اور یہ سمجھ کر کہ ہم صاحب اقتدار ہستی کی اعانت کے بغیر دشمن کے مقابلہ میں عہدہ برآ نہیں ہو سکتے وہ صاحب اقتدار کی جانب رجوع کرتے ہیں اور یہ ہستی ان کو پوری طرح اطمینان دلاتی ہے کہ دشمن ان کو کسی طرح نقصان نہیں پہنچا سکتا بلکہ ان تک اس کی دسترس ہی نہیں ہونے دی جائے گی تو ہر ایک اہل عقل اس کا یہی مطلب لیتا ہے کہ اب کسی بھی حالت میں ان کو دشمن کا خطرہ باقی نہیں رہا مگر یہ کہ صاحب اقتدار ہستی یا اپنے وعدہ کا ایفاء نہ کرے اور جھوٹا ثابت ہو اور یا دشمن کی طاقت اتنی زیادہ ہو کہ وہ خود بھی اس حمایت ونصرت میں مغلوب ومقہور ہو کر رہ جائے۔

پس جب انسانی دنیا میں یہ اطلاع موصول ہو کہ صاحب اقتدار ہستی کے عزیز، دوست یا مصاحب کو اس کے دشمن نے گرفتار کر لیا، مارا پیٹا، منہ پر تھوکا اور ہر طرح ذلیل ورسوا کر کے اپنے گمان میں مار بھی ڈالا اور مردہ سمجھ کر نعش اس کے عزیزوں کے سپرد کر دی مگر حسب اتفاق نبض دیکھنے سے معلوم ہوا کہ کہیں جان اٹکی رہ گئی ہے لہٰذا علاج معالجہ کیا گیا اور وہ رو بصحت ہو گیا تو دنیاء انسانی اس صاحب اقتدار ہستی کے متعلق کیا رائے قائم کرے گی جس نے اس مظلوم کی حمایت ونصرت کا وعدہ کیا تھا؟ یہ کہ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا یا نہیں کیا؟ ظاہر ہے کہ نہیں کیا خواہ قصداً نہیں کیا یا اس لیے کہ وہ مجبور رہا۔

پس اگر دنیاء انسانی کے معاملات میں صورت حال یہ ہے کہ معلوم نہیں کہ متنبی پنجاب کے عقل ودماغ نے قادر مطلق خدا

متعلق کس ذہنیت کے ماتحت یہ فیصلہ کیا کہ خدا نے عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو ہر قسم کی حفاظت و صیانت کے وعدہ کے باوجود دشمن کے ہاتھوں وہ سب کچھ ہونے دیا جس کو یہود و نصاریٰ کی اندھی تقلید میں متنبی پنجاب نے تسلیم کرلیا اور اشک شوئی کے لیے صرف اس قدر اضافہ کردیا کہ اگرچہ یہود نے صلیب و قتل کے بعد سمجھ لیا تھا کہ روح قفس عنصری سے نکل چکی ہے مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہوا تھا بلکہ رمق جان ابھی غیر محسوس طور پر باقی تھی اس لیے اسی طرح ان کی جان بچ گئی جس طرح موجودہ زمانہ میں اب سے چند سال قبل جیلوں میں پھانسی دینے کا جو طریقہ رائج تھا اس کی وجہ سے کبھی پھانسی پانے کے رمق جان باقی رہ جاتی تھی اور نعش کی سپردگی کے بعد علاج معالجہ سے وہ اچھا ہوجاتا تھا۔

بہرحال ہم تو اس ذات واحد، قادر مطلق خدا پر ایمان رکھتے ہیں جس نے جب کبھی بھی اپنے خاص بندوں (نبیوں اور رسولوں) سے اس قسم کا وعدۂ حفاظت و صیانت کیا ہے تو پھر اس کو پورا بھی ایسی شان سے کیا ہے جو قادر مطلق ہستی کے لیے شایاں اور لائق ہے۔

حضرت صالح علیہ السلام اور ان کی قوم کے منکرین حق کا معاملہ سورۂ نمل میں جس معجزانہ شان کے ساتھ بیان ہوا ہے اس پر غور فرمائیے۔ارشاد باری ہے:

﴿وَ كَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَ لَا يُصْلِحُوْنَ ۝۴۸ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا
بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝۴۹ وَ
مَكَرُوْا مَكْرًا وَّ مَكَرْنَا مَكْرًا وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۵۰ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا
دَمَّرْنٰهُمْ وَ قَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۵۱ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ
يَّعْلَمُوْنَ ۝۵۲ وَ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝۵۳﴾ (النمل: ۴۸-۵۳)

اور شہر میں نو شخص تھے جو (بہت) مفسد تھے اور کوئی کام صلاح کاری کا نہیں کرتے تھے، انہوں نے آپس میں کہا "باہم قسمیں کھاؤ کہ ہم ضرور صالح (علیہ السلام) اور اس کے گھر والوں پر شب خون ماریں گے اور پھر اس کے وارثوں سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت کے وقت موقع پر موجود ہی نہیں تھے اور قسم بخدا ہم ضرور سچے ہیں" اور انہوں نے (صالح علیہ السلام کے خلاف) خفیہ سازش کی اور ہم نے بھی (ان کی سازش کے خلاف) خفیہ تدبیر کی اور وہ ہماری مخفی تدبیر کو نہ سمجھتے تھے پس (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) دیکھو! کہ ان کی خفیہ سازشی تدبیر کا کیا حشر ہوا؟ یہ کہ ہم نے ان کو (مفسدوں کو) اور ان کی سرکش قوم کو سب کو ہلاک کردیا (نگاہ اٹھا کر) دیکھو یہ (قریب ہی) ہیں ان کے گھروں کے کھنڈر ویران ہیں ان کے ظلم کی وجہ سے، بیشک اس واقعہ میں نشانی ہے سمجھ والوں کے لیے اور ہم نے نجات دی ایمان والوں کو جو کہ پرہیز گار تھے۔"

اور پھر مطالعہ کیجئے اس عظیم الشان واقعہ کا جو ہجرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق رکھتا ہے اور سورۂ انفال میں دشمنان حق کی ناکامی کا ابدی اعلان ہے۔

ان دونوں واقعات میں حق و باطل کے معرکوں، دشمنوں کی خفیہ سازشوں اور انبیاء علیہم السلام کی حفاظت کے لیے وعدۂ الٰہی اور

Marfat.com

اس کے بے غل وغش پورا ہونے کا جو نقشہ قرآن عزیز نے پیش کیا ہے، تاریخی نگاہ سے ان پر غور فرمائیے اور فیصلہ کیجئے کہ جس خدا نے صالح علیہ السلام اور خاتم الانبیاء محمد ﷺ کے ساتھ اپنے وعدۂ حفاظت کو اس شان رفیع کے ساتھ پورا کیا ہو۔کیا متنبی پنجاب کے عقیدہ کے مطابق اسی شان معجزانہ کے ساتھ وہ عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں پورا ہوا؟ نہیں ہرگز نہیں، حالانکہ آیات قرآنی شاہد ہیں کہ ان دونوں واقعات کے مقابلہ میں عیسیٰ بن مریم علیہما السلام سے کیے گئے وعدے زیادہ واضح تفصیلات رکھتے ہیں اور ان میں صاف کہا گیا ہے کہ خدا کے بہترین مخفی فیصلہ کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کے دشمن ان کو ہاتھ تک نہ لگا سکیں گے، تب ہی تو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اپنے جن احسانات وانعامات کو شمار کرائے گا ان میں سے ایک بڑا انعام واحسان یہ بھی ہوگا۔

﴿وَ اِذْ كَفَفْتُ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ عَنْكَ﴾ (المائدہ : ۱۱۰)

اور جبکہ ہم نے بنی اسرائیل کو تجھ سے روک دیا تھا۔

متنبی پنجاب کو اگر اپنی نبوت اور مسیحیت کے افتراء اور ڈھونگ کو مضبوط کرنے کے لیے حضرت مسیح علیہ السلام کے زندہ آسمان پر اٹھائے جانے کے خلاف اس درجہ ناگواری تھی جیسا کہ متنبی کاذب کی تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے تب بھی یہود ونصاریٰ کی اس اندھی تقلید کے لیے مقابلہ میں جو نصوص قرآنی کے خلاف "کفر بواح" تک پہنچاتی اور حضرت مسیح علیہ السلام کی شان رفیع کے حق میں باعث توہین وتذلیل وعدۂ الٰہی کی تکذیب کرتی ہے" کیا یہ کافی نہیں تھا۔ کہ تاویل باطل [1] کے پردہ میں اتنا ہی کہہ دیا جاتا کہ وہ اگرچہ بقید حیات آسمان پر نہیں اٹھائے گئے مگر اللہ تعالیٰ نے بند مکان سے کسی طریق پر ان کو دشمنوں کے نرغے سے نکال کر محفوظ کر دیا اور دشمن کسی طرح ان کو نہ پا سکے، لیکن وائے برحال متنبی قادیان کہ خدا کے سچے پیغمبر حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے ساتھ بغض وعناد نے ﴿خَسِرَ الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةَ﴾ کا مصداق بنا کر ہی چھوڑا۔

قادیانی تلبیس اور اس کا جواب:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس معرکۃ الآراء مسئلہ میں "جو ان کی عظمت اور جلالت کا زبردست نشان ہے" سورۂ آل عمران کی آیات کا باہمی ربط اور ترتیب ذکری خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہے کہ متنبی کاذب نے اس میں بھی "تلبیس الحق بالباطل" کا ثبوت دے کر ناواقف کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

قرآن عزیز، سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کے دشمنوں کے نرغہ میں گھر جانے سے متعلق جس تسلی اور وعدہ کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فطری شکل وصورت یہ پیش آئی کہ جب دشمنانِ دین نے حضرت مسیح علیہ السلام کا ایک بند مکان میں محاصرہ کر لیا تو ایک اولوالعزم پیغمبر اور خدائے برحق کے درمیان تقرب کا جو رشتہ قائم ہے اس کے پیش نظر قدرتی طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اب کیا پیش آنے والا ہے، راہ حق میں جاں سپاری یا قدرت الٰہی کا کوئی اور کرشمہ؟ اور اگر دشمنوں سے تحفظ کے لیے کوئی کرشمہ پیش آنے والا ہے تو اس کی کیا شکل ہوگی کیونکہ بظاہر کوئی سامان نظر نہیں آتا؟ اور اگر تحفظ ہوا بھی تو کیا کچھ مصائب

---

[1] تاویل باطل اس لئے کہ حیات عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق دیگر نصوص قرآنی، حدیثی اور اجماع امت کے پیش نظر اس مقام پر یہ تاویل بلاشبہ "باطل" ہے مگر اس سے کم از کم حضرت مسیح علیہ السلام کی توہین اور وعدۂ الٰہی کی تکذیب کا پہلو نہیں نکلتا۔

وآلام اٹھانے کے بعد تحفظ جان ہوگا یا دشمن کسی بھی صورت میں قابو نہ پاسکیں گے؟ تب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کرتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قلب میں فطری طور پر پیدا ہونے والے سوالات کا ترتیب وار اس طرح جواب دیا: "عیسیٰ! میری یہ ذمہ داری ہے کہ میں تیری مقررہ مدت حیات پوری کروں گا یعنی مطمئن رہو کہ تجھ کو دشمن قتل نہ کر پائیں گے" ﴿اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ﴾ "اور صورت یہ ہوگی کہ اس وقت میں تجھ کو اپنی جانب یعنی ملاء اعلیٰ کی جانب اٹھالوں گا" ﴿وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ﴾ اور یہ بھی اس طرح نہیں کہ پہلے سب کچھ مصائب ہو گزریں گے اور پھر ہم تجھ کو آخر میں علاج معالجہ کرا کر اٹھائیں گے، نہیں بلکہ یوں ہوگا کہ تو دشمن کے ناپاک ہاتھوں سے ہر طرح محفوظ رہے گا اور کوئی دشمن تجھ کو ہاتھ تک نہ لگا سکے گا ﴿وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ یہ تو تمہارے فطری سوالات کا جواب ہوا لیکن اس سے بھی زیادہ ہم یہ کریں گے کہ جو تیرے پیرو ہیں (خواہ غلط کار ہوں جیسا کہ نصاریٰ اور خواہ صحیح العقیدہ ہوں جیسا کہ مسلمان) ان کو قیامت تک یہود پر غالب رکھیں گے اور تا قیام قیامت کبھی ان کو حاکمانہ اقتدار نصیب نہیں ہوگا، باقی رہا تمام معاملات کا فیصلہ، سو اس کے لیے (قیامت کا) دن مقرر ہے اس روز سب اختلافات ختم ہو جائیں گے اور حق و باطل کا دوٹوک فیصلہ کر دیا جائے گا۔

زیر بحث آیات کی یہ تفسیر جس طرح سلف صالحین اور اجماع امت کے مطابق ہے اسی طرح اس میں آیات میں کیے گئے متعدد وعدوں کی ترتیب میں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا اور مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی مگر مرزائے قادیانی نے اپنی "مسند مسیحیت و نبوت" کو قائم کرنے کے لیے قرآن، احادیث صحیحہ اور اجماع امت کے خلاف جبکہ یہ دعویٰ کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت ہو چکی تو اس سلسلہ کی آیات میں تحریف معنوی کی ناکام سعی کو بھی ضروری سمجھا اور دعویٰ کیا کہ اگر مسیح علیہ السلام کی موت کے وقوع کو رفع الی السماء اور تطہیر اور تفوق المطیعین علی الکافرین سے قبل تسلیم نہ کیا جائے گا تو ترتیب ذکری میں فرق آ جائے گا اور مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم ماننا پڑے گا اور یہ قرآن عزیز کی شان بلاغت کے خلاف ہے۔ لہٰذا یہ ماننا چاہیے کہ ﴿اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ﴾ کے وعدہ کا وقوع ہو چکا اور عیسیٰ علیہ السلام پر موت آ چکی۔

مرزائے قادیانی کی یہ "تلبیس" اگرچہ ان حضرات سے تو پوشیدہ نہیں رہ سکتی جو عربیت اور قرآن کے اسلوب بیان کا ذوق رکھتے ہیں لیکن عوام کو مغالطہ میں ڈال سکتی ہے اس لیے اس عنوان کے شروع ہی میں آیات کی تفسیر کو اس طرح بیان کر دیا گیا کہ مرزا کی جانب سے جو تلبیس کی گئی ہے وہ خود بخود زائل ہو جائے تاہم مزید تشریح کے لیے یہ اور اضافہ ہے کہ ترتیب ذکری کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کلام میں اگر چند باتیں ترتیب وار ذکر کی گئی ہیں تو ان کا وقوع بھی اس طرح ہونا چاہیے کہ اس کلام میں ذکر کردہ ترتیب بگڑنے نہ پائے اور مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کرنا نہ پڑے اور یہ جب ضروری ہے کہ کلام کی فصاحت و بلاغت کا تقاضا ہی یہ ہو کہ ترتیب ذکری میں فرق نہ آنے پائے ورنہ تو بعض مقامات پر تقدیم و تاخیر کو بھی فصاحت کی جان سمجھا جاتا ہے اور یہ علم معانی کا مشہور مسئلہ ہے۔

پس قرآن کی ان آیات میں جمہور اہل اسلام کی تفسیر کے مطابق ترتیب ذکری بحالہ قائم ہے اس لیے کہ خدا کی جانب سے وعدہ یہ ہے کہ میں تمہاری مقررہ مدت پوری کروں گا ﴿اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ﴾ یعنی تمہاری موت ان دشمنوں کے ہاتھ سے نہیں ہوگی بلکہ اپنی طبعی موت سے مرو گے مگر اس پہلے وعدہ کو پورا کرنے کے لیے متعدد صورتیں ہو سکتی تھیں، یہ کہ دشمنوں پر باہر سے اچانک حملہ ہو اور وہ فرار ہو جائیں یا سب وہیں کھیت رہیں اور حضرت مسیح علیہ السلام ان کی زد سے بچ جائیں، یا یہ کہ قوم عاد و ثمود کی طرح زمین یا آسمان سے قدرتی عذاب آ کر ان سب کو ہلاک کر دے، یا یہ کہ حضرت مسیح علیہ السلام کسی ترکیب سے ان کے نرغہ میں سے محفوظ نکل

جائیں اور ان کی دسترس سے باہر ہو جائیں، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے کرشمہ قدرت سے عیسیٰ علیہ السلام کو مکان بند رہتے ہوئے ملاء اعلیٰ کی جانب اٹھا لے وغیرہ وغیرہ۔ تو قرآن نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خبر دی کہ پہلے وعدہ کا ایفاء مسطورہ بالا آخری شکل یعنی ﴿وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ﴾ کی شکل میں ہوگا اور ہوگا بھی ایسی قدرت کاملہ کے ہاتھوں کہ اس محاصرہ کے باوجود دشمن اپنے ناپاک ہاتھ تجھ کو نہیں لگا سکیں گے اور میں ان کافروں کے ہاتھ سے تجھ کو پاک رکھوں گا ﴿وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ اور ان باتوں کے علاوہ یہ بھی ہوگا کہ میں تیرے پیروؤں کو تیرے منکروں پر قیامت تک غالب رکھوں گا، بہرحال بعد کے یہ تینوں وعدے بالترتیب جب ہی عمل میں آئیں گے کہ پہلے وعدۂ اول وقوع پذیر ہو جائے یعنی تیری موت ان کے ہاتھوں نہ ہو بلکہ اپنی مقررہ مدت پر پہنچ کر طبعی موت آئے۔ ان آیات میں پہلے وعدہ کے متعلق یہ نہیں کہا گیا کہ میں اول تجھ کو ماروں گا اور پھر بالترتیب یہ سب امور انجام دوں گا، کیونکہ یہ قول صرف جاہل ہی کہہ سکتا ہے لیکن جس کو گفتگو کا معمولی بھی سلیقہ ہے وہ ہرگز ایسا کہنے کی جرأت نہیں کرے گا کیونکہ ترتیب ذکری کے لیے یہ تو ہونا چاہیے کہ ان امور کے وقوع میں ایسی صورت نہ پیدا ہو جائے کہ ترتیب میں فرق لا کر تقدیم و تاخیر کا عمل جراحی کرنا پڑے لیکن اگر کوئی شے زمانہ کا امتداد اور طوالت چاہتی ہے اور اس کا آخری حصہ وقوع ان تمام امور کے بعد پیش آتا ہے جو اس کے بعد مذکور تھے مگر ترتیب ذکری میں مطلق کوئی فرق نہیں آتا تو ایسی شکل میں اس وقوع کے متاخر ہو جانے سے کسی عالم کے نزدیک بھی کلام کی فصاحت و بلاغت میں نقص واقع نہیں ہوتا اور نہ اس قسم کے وقوع ترتیبی کا ترتیب ذکری کے ساتھ کوئی تعلق ہوتا ہے۔

پس مسئلہ زیر بحث میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طبعی موت کا وقوع کبھی بھی ہو اس کا ترتیب ذکری سے مطلق کوئی علاقہ نہیں ہے یہاں تو ﴿اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ﴾ کہہ کر یہ بتایا گیا ہے کہ دیے گئے متعدد وعدوں میں پہل اور اولیت اس وعدہ کو حاصل ہے کہ تمہاری موت کا سبب یہ یہود بنی اسرائیل نہیں ہوں گے بلکہ جب بھی یہ مقررہ مدت پوری ہوگی اس طریق پر ہوگی جو عام طور سے میری جانب منسوب کی جاتی ہے (یعنی طبعی موت) اور یہ وعدہ بہرحال باقی تین وعدوں سے پہلے ہی رہا تب ہی تو یہ تینوں وعدے وقوع میں آ سکے، اور اگر کہیں دشمن حضرت مسیح علیہ السلام کی موت کا سبب بن گئے ہوتے تو پھر "رفع" اور "تطہیر" کے لیے کوئی صورت ہی نہ رہ جاتی اور مرزا قادیانی کی طرح باطل اور رکیک تاویلات کی آڑ لینی پڑتی اور آیات زیر بحث کی "روح" فنا ہو کر رہ جاتی اور یہ اس لیے کہ اگر "رفع" سے رفع روحانی اور "تطہیر" سے روحانی پاکی مراد لیے جائیں تو یہ قطعاً بے محل اور بے موقع ہوگا کیونکہ قرآن کے ارشاد کے مطابق یہ وعدے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیے جا رہے ہیں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ بتانا کہ تمہارے متعلق یہود کا یہ اعتقاد "کہ تم کاذب اور ملعون ہو" غلط ہے اور تم مطمئن رہو کہ میں تمہارا رفع روحانی کرنے والا ہوں قطعاً عبث تھا کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیغمبر خدا ہیں اور جانتے ہیں کہ یہود کا افتراء کیا حقیقت رکھتا ہے، نیز یہود کو حضرت مسیح علیہ السلام کے رفع روحانی کا پتہ نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ معاملہ عالم غیب سے متعلق ہے تو خدائے برتر کا یہ ارشاد نہ حضرت مسیح علیہ السلام کی برمحل تسلی کا باعث ہو سکتا تھا اور نہ یہود کے لیے سودمند اور یہی حال دوسرے وعدۂ تطہیر کا ہے بلکہ جب بقول قادیانی یہود کے ہاتھوں حضرت مسیح علیہ السلام صلیب پر چڑھا دیے گئے تو نعش پا لینے کے بعد شاگردوں کا مرہم عیسیٰ لگا کر چنگا کر لینے اور پھر منجانب اللہ جن کی ہدایت و ارشاد کے لیے مامور کیے گئے تھے ان سے جان بچا کر بھاگ جانے اور زندگی بھر گمنامی میں زندگی بسر کرتے رہنے کے بعد ﴿رَافِعُكَ اِلَیَّ﴾ اور ﴿وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ کہہ دینے سے نہ یہود کے عقیدۂ متعلق حضرت مسیح علیہ السلام کی ہی تردید ہوگی اور نہ ایک غیر جانبدار انسان ہی یہ سمجھ سکے گا کہ ایسے موقعہ پر

Marfat.com

جبکہ عیسیٰ علیہ السلام دشمنوں کے نرغے میں ہیں اور جبکہ ان کو یہ یقین ہے کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور موت کے بعد رفع روحانی اور تطہیر لازم شے ہے، ان تسلیوں اور وعدوں کا کیا فائدہ ہے خصوصاً جبکہ ان کے ساتھ دشمن نے وہ سب کچھ کر لیا جو وہ کرنا چاہتا تھا۔

البتہ جمہور اہل حق کی تفسیر کے مطابق آیات قرآنی کی روح اپنی معجزانہ بلاغت کے ساتھ پوری طرح ناطق ہے کہ یہ وعدے حضرت مسیح علیہ السلام سے جس طرح کیے گئے وہ برمحل اور فطری اضطراب کے لیے بلاشبہ باعث تسکین ہیں اور نبی اکرم ﷺ کی معرفت کا وقت کے یہود و نصاریٰ کے وراثتی عقائد باطلہ کی تردید کے لیے کافی اور مدلل۔

جمہور اہل حق کی یہ تفسیر "توفی" کے معنی "مقررہ مدت پوری کرنا" اختیار کر کے کی گئی ہے جس کا حاصل (توفی بمعنی موت) نکلتا ہے لیکن توفی کے یہ حقیقی معنی نہیں ہیں بلکہ بطور کنایہ کے مستعمل ہوئے ہیں کیونکہ لغت عرب میں اس کا مادہ (میٹر) وفی، یفی، وفاء ہے جس کے معنی "پورا کرنے" کے آتے ہیں اور اس کو جب باب تفعل میں لے جا کر "توفی" بناتے ہیں تو اس کے معنی "کسی شے کو پورا پورا لے لینا" یا "کسی شے کو سالم قبضہ میں کر لینا" آتے ہیں (توفی اخذہ وافیا تاماً یقال "توفیت من فلان مالی علیہ") اور چونکہ موت میں بھی، اسلامی عقیدہ کے مطابق روح کو پورا لے لیا جاتا ہے اس لیے کنایہ کے طور پر "کہ جس میں حقیقی معنی بحالہ محفوظ رہا کرتے ہیں" "توفی بمعنی موت مستعمل ہوتا ہے اور کہتے ہیں" "توفاہ اللہ ای اماتہ" لیکن اگر موقع پر دوسرے دلائل ایسے موجود ہوں جن کے پیش نظر توفی کے حقیقی معنی لیے جا سکتے ہوں یا حقیقی کے ماسوا دوسرے معنی بن ہی نہ سکتے ہوں تو اس مقام پر خواہ فاعل "اللہ تعالیٰ" اور مفعول "ذی روح انسان" ہی کیوں نہ ہو وہاں حقیقی معنی "پورا لے لینا" ہی مراد ہوں گے مثلاً آیت:

﴿اللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا﴾ (الزمر: ۴۲)

اللہ پورا لے لیتا ہے جانوں کو ان کی موت کے وقت اور ان جانوں کو جن کو ابھی موت نہیں آئی ہے پورا لے لیتا ہے نیند میں ﴿وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ﴾ کے لیے بھی لفظ "توفی" بولا گیا یعنی ایک جانب یہ صراحت کی جا رہی ہے کہ یہ وہ جانیں (نفوس) ہیں جن کو موت نہیں آئی اور دوسری جانب یہ بھی بصراحت کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نیند کی حالت میں ان کے ساتھ "توفی" کا معاملہ کرتا ہے تو یہاں اللہ تعالیٰ فاعل ہے "متوفی" اور نفس انسانی مفعول ہے "متوفی" مگر پھر بھی کسی صورت سے "توفی بمعنی موت" صحیح نہیں ہیں ورنہ تو قرآن کا جملہ ﴿وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ﴾ العیاذ باللہ مہمل ہو کر رہ جائے گا، یا مثلاً:

﴿وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ﴾ (الانعام: ۶۰)

(اور وہی (اللہ) ہے جو پورا لے لیتا یا قبضہ میں کر لیتا ہے تم کو رات میں اور جانتا ہے جو تم کماتے ہو دن میں) میں بھی کسی طرح توفی بمعنی موت نہیں بن سکتے حالانکہ توفی کا فاعل اللہ اور مفعول انسانی نفوس ہیں یا مثلاً آیت:

﴿حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا﴾ (الانعام: ۶۱)

یہاں تک کہ جب آتی ہے تم میں سے ایک کسی کو موت قبض کر لیتے ہیں یا پورا لے لیتے ہیں اس کو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) میں گر موت ہی کا ہو رہا ہے لیکن پھر بھی ﴿تَوَفَّتْهُ﴾ میں توفی کے معنی موت کے نہیں بن سکتے ورنہ بے فائدہ تکرار لازم آئے گا، یعنی

Marfat.com

﴿اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ﴾ میں جب لفظ "موت" کا ذکر آ چکا تو اب ﴿تَوَفَّتْهُ﴾ میں بھی اگر توفی کے معنی موت ہی کے لیے جائیں تو ترجمہ یہ ہوگا، یہاں تک کہ جب آتی ہے تم میں سے ایک کسی کو موت، موت لے آتے ہیں ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں دوبارہ لفظ موت کا ذکر بے فائدہ ہے اور کلام فصیح و بلیغ اور معجز تو کیا روزمرہ کے محاورہ اور عام بول چال کے لحاظ سے بھی پست اور لاطائل ہو جاتا ہے البتہ اگر "توفی" کے حقیقی معنی "کسی شے پر قبضہ کرنا یا اس کو پورا لے لینا" مراد لیے جائیں تو قرآن عزیز کا مقصد ٹھیک ادا ہوگا اور کلام بھی اپنے حد اعجاز پر قائم رہے گا۔

اب ہر ایک عاقل غور کر سکتا ہے کہ یہ دعویٰ کرنا کہ "توفی" کے حقیقی معنی موت کے ہیں۔ خصوصاً جبکہ فاعل خدا ہو اور مفعول ذی روح کہاں تک صحیح اور درست ہے۔

بہرحال اس موقع پر "موت" اور "توفی" دونوں کا ساتھ ساتھ بیان ہونا اور دونوں کا ایک ہی معمول ہونا اور پھر دونوں کے معنی میں فرق و تفاوت اس بات کے لیے واضح دلیل ہے کہ یہ دونوں مرادف الفاظ نہیں ہیں اور جس طرح لیث و اسد بمعنی شیر) ابل و جمل بمعنی اونٹ) نون و حوت بمعنی مچھلی) وغیرہ اسماء کا اور جمع، شمل، کسب بمعنی جمع ہونا) اور لبث مکث بمعنی ٹھہرنا) اور عطش، ظما پیاس) اور جوع، سغب بمعنی بھوک) مصادر کا حال ہے، موت اور توفی کے درمیان وہ معاملہ نہیں ہے بلکہ ان کے حقیقی معانی میں نمایاں فرق ہے۔ اور مثلاً آیت:

﴿فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِى الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ﴾ (النساء: ۱۵)

"پس روکے رکھو ان (عورتوں) کو گھروں میں یہاں تک کہ لے لے ان کو موت"

میں موت کو فعل توفی کا فاعل قرار دیا گیا ہے اور ہر ایک زبان کی نحو (گرامر) کا یہ مسئلہ ہے کہ فاعل اور فعل ایک نہیں ہوتے کیونکہ فعل، فاعل سے صادر ہوتا ہے، عین ذات فاعل نہیں ہوا کرتا تو اس سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ توفی کے حقیقی معنی "موت" کے ہرگز ہرگز نہیں ہیں، ورنہ اس کا اطلاق جائز نہیں ہو سکتا تھا۔ ان تین مقامات کے علاوہ سورہ بقرہ کی آیت:

﴿ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ﴾ (البقرہ: ۲۸۱)

پھر پورا دیا جائے گا ہر ایک نفس کو جو کچھ اس نے کمایا ہے۔"

اور سورہ نحل کی آیت:

﴿وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ﴾ (النحل: ۱۱۱)

"اور پورا دیا جائے گا ہر نفس کو جو کچھ اس نے کمایا۔"

میں بھی توفی کا فاعل اللہ تعالیٰ اور مفعول نفس انسانی ہے تاہم یہاں توفی بمعنی موت نہیں بن سکتے اور بہت واضح اور صاف بات ہے۔

غرض ان آیات میں باوجود اس امر کے کہ "توفی" کا فاعل اللہ تعالیٰ اور اس کا مفعول "انسان یا نفس انسانی" ہے پھر بھی باجماع اہل لغت و تفسیر "موت کے معنی" نہیں ہو سکتے خواہ اس لیے کہ دلیل اور قرینہ اس معنی کے خلاف ہے اور یا اس لیے کہ اس مقام

پر توفی کے حقیقی معنی (پورا لے لینا یا قبض کر لینا) کے ماسواء "موت کے معنی" کسی طرح بن ہی نہیں سکتے۔

تو مرزائے قادیانی کا یہ دعویٰ کہ "توفی" اور "موت" مرادف الفاظ ہیں یا یہ کہ توفی کا فاعل اگر اللہ تعالیٰ اور مفعول، انسان یا نفس انسانی ہو تو اس جگہ صرف "موت" ہی کے معنی ہوں گے، دونوں دعوے باطل اور نصوص قرآنی کے قطعاً مخالف ہیں۔

﴿هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○﴾

توفی اور موت یقیناً مترادف الفاظ نہیں ہیں اور توفی کے حقیقی معنی "موت" نہیں بلکہ "پورا لے لینا یا قبض کر لینا" ہیں۔ قرآن عزیز سے اس کی ایک واضح دلیل یہ ہے کہ پورے قرآن میں کسی ایک جگہ بھی موت کا فاعل اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو قرار نہیں دیا گیا مگر اس کے برعکس توفی کا فاعل متعدد مقامات پر ملائکہ (فرشتوں) کو ٹھہرایا ہے مثلاً سورۂ نساء میں ہے:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ (النساء: ۹۷)

"بیشک وہ لوگ جن کو فرشتوں نے قبض کر لیا یا پورا پورا لے لیا۔"

اور سورۂ انعام میں ہے: ﴿تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا﴾ "قبض کر لیا یا پورا لے لیا" اس کو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتوں) نے اور سورۂ سجدہ میں ہے ﴿قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ﴾ (اے محمد ﷺ) کہہ دیجئے قبض کرے گا تم کو موت کا فرشتہ)" اور سورۂ انفال میں ہے: ﴿وَلَوْ تَرٰٓى إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ (الانفال: ۵۰) "اور کاش کہ تو دیکھے جس وقت کہ قبض کرتے ہیں فرشتے ان لوگوں (کی روحوں) کو جنھوں نے کفر کیا ہے۔

ان تمام مقامات پر اگرچہ توفی "کنایۃ" بمعنی موت استعمال ہوا ہے لیکن پھر بھی چونکہ اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی بجائے ملائکہ اور ملک الموت کی جانب ہو رہی تھی اس لیے لفظ "توفی" کا اطلاق کیا گیا اور لفظ "موت" استعمال نہیں کیا گیا اور یہ صرف اس لیے کہ موت تو اللہ کا فعل ہے اور موت کے وقت انسان کا یعنی روح انسانی کا قبض کرنا اور اس کا پورا پورا لے لینا یہ فرشتوں کا عمل ہے، تو جن مقامات میں یہ بتانا مقصود ہے کہ جب خدا کسی کی اجل پوری کر دیتا اور موت کا حکم صادر فرماتا ہے تو اس کی صورت عمل کیا پیش آتی ہے ان مقامات میں موت کا اطلاق ہرگز موزوں نہیں تھا بلکہ "توفی" کا لفظ ہی اس حقیقت کو ادا کر سکتا تھا۔

موت اور توفی کے درمیان قرآنی اطلاقات کے پیش نظر ایک بہت بڑا فرق یہ بھی ہے کہ قرآن عزیز نے جگہ جگہ "موت" اور "حیات" کو تو مقابل ٹھہرایا ہے لیکن "توفی" کو کسی ایک مقام پر بھی "حیات" کا مقابل قرار نہیں دیا۔ مثلاً سورہ ملک میں ہے:

﴿الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ......﴾ (الملک: ۲)

"خدا ہی وہ ذات ہے جس نے پیدا کیا موت کو اور زندگی کو۔ اور سورۂ فرقان میں ہے:

﴿وَلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً﴾ (الفرقان: ۳)

"اور وہ نہیں مالک ہیں موت کے اور نہ حیات کے۔"

اور اسی طرح ان دونوں کے مشتقات کو مقابل ٹھہرایا ہے مثلاً: ﴿كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى﴾ (البقرہ) ﴿يُحْيِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ (روم)

﴿فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ (البقرہ) ﴿وَ اُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (آل عمران) ﴿وَهُوَ يُحْيِ الْمَوْتٰى﴾ (شوریٰ) (وغیر ذلک کثیراً) البتہ توفی کے حقیقی معنی میں چونکہ یہ وسعت موجود ہے کہ اسلام کے نقطہ نظر سے موت کی جو حقیقت ہے بطریق کنایہ اس پر بھی حسب موقعہ اس کا اطلاق ہو سکتا ہے تو یہ استعمال اور اطلاق بھی جائز ٹھہرا اور اس میں کسی کو بھی اختلاف نہیں۔

"توفی" کے معنی کی اس مفصل تشریح و توضیح کا حاصل یہ ہوا کہ لغت عرب اور قرآنی اطلاقات دونوں اس کے شاہد ہیں کہ توفی اور موت دونوں کے حقیقی معنی میں بھی اور دونوں کے اطلاقات میں بھی واضح فرق ہے اور دونوں مرادف الفاظ نہیں ہیں خواہ توفی کا فاعل اللہ تعالیٰ اور مفعول "انسان اور روح انسانی" ہی کیوں نہ ہو۔ مگر اسلامی نقطہ نظر سے چونکہ موت ایک ایسی حقیقت کا نام ہے جس پر بطریق "توسع" اور "کنایہ" توفی کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ پس جس مقام پر قرینہ اور محل استعمال کا تقاضا یہ ہوگا کہ وہاں توفی بول کر کنایۃً موت کے معنی لیے جانے چاہئیں تو اس جگہ "موت" کے معنی مراد ہوں گے لیکن اس کے برعکس اگر دلیل، قرینہ اور محل استعمال حقیقی معنی کا متقاضی ہے تو اس جگہ وہی معنی مراد ہوں گے اور ان ہی کو مقدم سمجھا جائے گا خواہ کنائی معنی وہاں قطعاً نہ بن سکتے ہوں اور خواہ بن سکتے ہوں مگر محل استعمال اور دوسرے دلائل اس کو مرجوح یا ممنوع قرار دیتے ہوں۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو بہ نظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد لغت کے مشہور امام ابوالبقاء نے یہ تصریح کی ہے کہ عوام میں توفی کے معنی اگرچہ "موت" کے سمجھے جاتے ہیں مگر خواص کے نزدیک اس کے معنی "پورا لے لینا" اور "قبض کرنا" ہیں فرماتے ہیں:

التوفی الاماتة و قبض الروح و علیه استعمال العامة والاستیفاء و اخذ الحق و علیه استعمال البلغاء.

الحاصل، سورۂ مائدہ کی آیت ﴿اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ﴾ میں اگر حقیقی معنی مراد ہوں، جیسا کہ جلیل القدر علماء تفسیر و لغت نے اختیار کیے ہیں۔ تب بھی مرزائے قادیانی کے علی الرغم آیات زیر بحث کا یہ مطلب ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ تسلی دی گئی "اے عیسیٰ! میں تجھ کو پورا پورا لے لینے والا ہوں یا تجھ کو قبض کرنے والا ہوں اور صورت یہ ہوگی کہ میں تجھ کو اپنی جانب (ملاء اعلیٰ کی جانب) اٹھا لینے والا ہوں اور تجھ کو دشمنوں کے ناپاک ہاتھوں سے پاک رکھنے والا ہوں..... الخ" یعنی جب شروع میں یہ بتایا کہ تجھ کو قبض کر لیا جائے گا یا پورا لے لیا جائے گا تو قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ قبض کرنے اور پورا لے لینے کی مختلف شکلیں ہیں مثلاً ایک یہ کہ موت آ جائے اور روح کو قبض کر لیا جائے اور پورا لے لیا جائے اور دوسری یہ کہ زندہ ملاء اعلیٰ کی جانب (اپنی جانب) اٹھا لیا جائے تو یہاں کون سی صورت پیش آئے گی۔ پس اس کو صاف اور واضح کرنے کے لیے کہا گیا کہ دوسری شکل اختیار کی جائے گی تاکہ دشمنوں کی سازشوں کے مقابلہ میں معجزانہ تدبیر کے ذریعہ وعدۂ الٰہی ﴿وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ﴾ پورا ہو اور ﴿وَ اِذْ كَفَفْتُ بَنِیْۤ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ﴾ کا عظیم الشان مظاہرہ ہو جائے اور "توفی" اور "رفع" ہو جانے پر نتیجہ یہ نکلے کہ ذات اقدس کافروں کے ہاتھ سے ہر طرح محفوظ ہو جائے اور اس طرح وعدۂ ربانی ﴿وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ بغیر کسی تاویل کے صحیح ہو جائے اور تاویل باطل کے ذریعہ شک اور تردد یا حقیقت حال سے انکار صرف ان ہی قلوب کا حصہ رہ جائے جو قرآن سے علم حاصل کرنے کی بجائے اول اپنے ذاتی اوہام و ظنون کو راہنما بناتے اور پھر قرآن کے منطوق و مفہوم کے خلاف اس کے منہ میں اپنی زبان رکھ دینا چاہتے ہیں اور اس سے وہ کہلانا چاہتے ہیں جو وہ خود کہنا نہیں چاہتا مگر وہ قرآن عزیز کی اس صفت سے غافل رہتے ہیں:

Marfat.com

﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ﴾ (السجدہ: ۴۲)

"اس قرآن کے آگے سے اور نہ اس کے پیچھے سے (کسی جانب سے بھی) باطل نہیں پھٹک سکتا، یہ اتارا ہوا ہے ایسی ہستی کی جانب سے جو حکمت والی، خوبیوں والی ہے۔"

متنبی پنجاب کو جب قرآن عزیز کی ان نصوص سے متعلق تحریف معنوی میں ناکامی ہوئی اور خسران کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا تو مجبور ہو کر اور قرآن عزیز کے اطلاقات، احادیث صحیحہ کی اطلاعات اور اجماع امت کے فیصلہ کو پس پشت ڈال کر "فلسفہ" کی آغوش میں پناہ لینے کا ارادہ کیا اور اپنی تصانیف میں یہ ہرزہ سرائی کی کہ اگر حضرت مسیح علیہ السلام آسمان پر زندہ اٹھا لیے گئے تو یہ عقل کے خلاف ہے اس لیے کہ کوئی مادی جسم ملاء اعلیٰ تک پرواز نہیں کر سکتا اور کر بھی جاتا تو اتنی طویل مدت کیسے زندہ ہے اور وہاں کھانے، پینے اور رفع حاجت کرنے کی صورت کیسے عمل میں آ سکتی ہے؟

قدرت الٰہی کے معجزانہ افعال کو خلاف عقل کہہ کر بات اگر ختم ہو سکتی تو شاید قادیانی کی یہ فلسفیانہ موشگافی درخور اعتناء سمجھی جا سکتی۔ لیکن آج فلسفہ جدید بہ شکل سائنس ترقی کر کے جس حد تک پہنچ چکا ہے وہاں نظریات (Theores) نہیں بلکہ مشاہدات اور عملیات (Practicles) اس بات کو ثابت کر رہے ہیں کہ فضاء کے موانعات کو اگر آہستہ آہستہ ہٹا دیا جائے یا ان کو ضبط (Control) میں لے آیا جائے تو مادی جسم کے لیے غیر معلوم بلندی تک پہنچنا ممکن العمل ہو جائے گا اور اس کے لیے جوجدوجہد وہ کر رہے ہیں اس کو ممکن العمل سمجھ کر ہی کر رہے ہیں اور سائنٹیفک (Scientific) طریقہ پر کر رہے ہیں، پس اگر آج کا انسان میلوں اوپر ہوائی جہاز کے ذریعہ جا سکتا ہے اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ ہزاروں میل سے مادی انسان کے ساتھ باتیں کرتے وقت اس کے جسم کی تصویر لے سکتا ہے اور ہوا اور آفتاب کی لہروں اور شعاعوں پر کنٹرول کر کے ہزاروں میل تک اپنی آواز کو بذریعہ ریڈیو نشر کر سکتا ہے اور ہزاروں برس کے گزرے ہوئے واقعات کو فضاء میں نظم کر کے آج اس طرح سنا سکتا ہے گویا وہ سب کچھ اس وقت ہو رہا ہے تو اس انسان کے خالق بلکہ خالق کائنات کے متعلق از راہِ تفلسف یہ کہنا کہ وہ مادی جسم کو ملاء اعلیٰ تک کیسے لے جا سکتا ہے اپنی غباوت پر مہر کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔

اور اگر ادویات اور غذاؤں اور حفظان صحت کے مختلف طریقوں سے عمر طبعی کو دوگنا اور تین گنا کیا جا سکتا اور کیا جا رہا ہے نیز اگر مختلف غذاؤں کے اثرات و نتائج میں یہ فرق ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے کہ کسی سے فضلہ زیادہ بنے اور کسی سے بہت کم بنے اور کسی سے قطعاً نہ بنے بلکہ وہ خالص خون کی شکل میں تحلیل ہو جائے اور اگر انسان اپنی ریاضتوں اور مجاہدوں کے ذریعہ روحانی قوت کو بڑھا کر آج اس دنیا میں دنوں، ہفتوں بلکہ مہینوں بغیر خورد و نوش زندہ رہ سکتا ہے تو مجبور انسانوں کی ان کامیاب کوششوں کو صحیح سمجھنے کے باوجود خالق ارض و سماوات کی جانب حضرت مسیح علیہ السلام کی رفعت آسمانی پر مسطورۂ بالا شکوک پیش کرنا یا ان کے پیش نظر ان کی بجسد عنصری ملاء اعلیٰ تک پہنچنے اور وہاں زندہ رہنے کا انکار کرنا اگر جہالت نہیں تو اور کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص علمی حقائق سے ناآشنا اور علوم قرآن سے محروم ہے وہ "خلاف عقل" اور "ماوراء عقل" ان دونوں کے درمیان فرق کرنے سے عاجز ہے اور اس لیے ہمیشہ ماوراء عقل کو خلاف عقل کہہ کر پیش کرتا رہتا ہے۔

دراصل انسان کی فکری گمراہیوں کا سرچشمہ صرف دو ہی باتیں ہیں ایک یہ کہ انسان "عقل" سے اس درجہ بے بہرہ ہو جائے

Marfat.com

کہ ہر ایک بات بے سمجھے بوجھے مان لے اور اندھوں کی طرح ہر ایک راہ پر چلنے لگے، دوسری بات یہ کہ جو حقیقت بھی عقل سے بالاتر نظر آئے اس کو فوراً جھٹلا دے اور یہ یقین کرلے کہ جس شے کو اس کی سمجھ یا چند انسانوں کی سمجھ ادراک نہیں کرسکتی وہ شے حقیقتاً وجود نہیں رکھتی اور تکذیب کے لائق ہے حالانکہ بہت سی باتیں وہ ہیں جو ایک دور کے تمام عقلاء کے نزدیک ماوراء عقل سمجھی جاتی ہیں، اس لیے کہ ان کی عقلیں ان باتوں کا ادراک کرنے سے عاجز رہیں مگر وہی باتیں علمی ترقی کے دوسرے دور میں جا کر نہ صرف ممکن الوقوع قرار پاتی بلکہ مشاہدہ اور تجربہ میں آجاتی ہیں پس اگر ہر ایک وہ شے جو کسی ایک انسان یا جماعت یا اس کے دور کے تمام اہل عقل کے نزدیک ماوراء عقل تھی "خلاف عقل" کہلانے کی مستحق تھی تو وہ دوسرے دور میں کیوں عقل کے لیے ممکن ہوئی بلکہ مشاہدہ میں آگئی۔

قرآن عزیز نے گمراہی کی اس پہلی حالت کو (جہل، ظن، خرص، الکل) سے تعبیر کیا ہے اور دوسری حالت کو "الحاد" کہا ہے اور یہ دونوں حالتیں "علم و عرفان" سے محرومی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ خلاف عقل اور ماوراء عقل کے درمیان یہ فرق ہے کہ خلاف عقل بات وہ ہو سکتی ہے جس کے نہ ہوسکنے کے متعلق علم و یقین کی روشنی میں مثبت دلائل و براہین موجود ہوں اور عقل، دلیل و برہان اور علم یقین سے یہ ثابت کرتی ہو کہ ایسا ہونا ناممکن اور محال ذاتی ہے اور ماوراء عقل اس بات کو کہتے ہیں کہ بعض باتوں کے متعلق عقل ہی کا یہ فیصلہ ہے کہ چونکہ انسانی عقل کا ادراک ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھتا اور حقیقت اسی حد پر ختم نہیں ہو جاتی، لہٰذا ہر وہ بات جو عقل کے احاطہ میں نہ آسکتی ہو مگر اس کے انکار پر علم و یقین کے ذریعہ برہان و دلیل بھی دی جا سکتی ہو تو ایسی بات کو خلاف عقل نہیں بلکہ ماوراء عقل کہیں گے۔

خلاف عقل اور ماوراء عقل کے درمیان امتیاز ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ جن چیزوں کو کل کی دنیا میں عام طور پر خلاف عقل کہا جاتا رہا ان کو اہل دانش و بینش نے خلاف عقل نہ سمجھتے ہوئے موجودہ دور میں ممکن بلکہ موجود کر دکھایا اور کل یہی عقل کی ترقی آج کی بہت سی ماوراء عقل باتوں کو احاطہ عقل میں لاسکے گی اور نہ معلوم یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔

پس جو شخص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بجسد عنصری رفع الی السماء کا اس لیے منکر ہے کہ عقلی فلسفہ اس کا انکار کرتا ہے تو اس کا یہ دعویٰ "برہان و دلیل اور علم و یقین کی جگہ محض جہل، ظن، الکل کے ماتحت ہے" اور ایسے حضرات کے لیے پھر عالم غیب کی تمام ماوراء عقل باتوں، مثلاً وحی، فرشتہ، جنت، جہنم، حشر، معاد، معجزہ وغیرہ تمام باتوں کو خلاف عقل کہہ کر جھٹلا دینا چاہیے۔ قرآن عزیز نے ان ہی جیسے منکرین حق کے متعلق صاف صاف مکذبین کا لقب تجویز کر دیا ہے:

﴿بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَ لَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾ (یونس: ۳۹)

"نہیں یہ بات نہیں ہے (جیسا کفار کہتے ہیں) اصل حقیقت یہ ہے کہ جس بات پر یہ اپنے علم سے احاطہ نہ کر سکے اور جس بات کا نتیجہ ابھی پیش نہیں آیا اس کے جھٹلانے پر آمادہ ہو گئے۔ ٹھیک اسی طرح انہوں نے بھی جھٹلایا تھا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں تو دیکھو ظلم کرنے والوں کا کیسا کچھ انجام ہو چکا ہے۔"

آیت ﴿كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ﴾ کہہ کر جس حقیقت کا اعلان کیا گیا ہے "یعنی انسان کی عقل جس بات کا ادراک

Marfat.com

کر سکے اس کو دلیل و برہان اور علم یقین کے بغیر ہی جھٹلا دینا اور صرف اس بناء پر انکار کر دینا کہ یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے" اس کی ایک نظیر مرزائے قادیانی کا وہ انکار ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے "رفع الی السماء" سے متعلق ہے اور اس کے خلیفہ مسٹر لاہور کی فلسفیانہ موشگافیاں بھی اسی بے دلیل انکار و جحود کا شعبہ ہیں۔

اس حربہ کو بھی کمزور سمجھ کر متنبی پنجاب نے پھر رخ بدلا اور یہ دعویٰ کیا کہ اس موقع کے علاوہ قرآن کے کسی مقام سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ "رفع" سے "رفع روحانی" کے ماسواء کوئی معنی لیے گئے ہیں یعنی مادی شے کی جانب رفع کی نسبت کی گئی ہو لہٰذا اس مقام پر بھی رفع روحانی کے علاوہ معنی لینا قرآن کے اطلاق استعمال کے خلاف ہے۔

مگر متنبی کاذب کا یہ دعویٰ اوّل تو بنیاداً ہی غلط ہے کیونکہ اگر کسی لفظ کے محل استعمال سے یا قرآن ہی کی دوسری نصوص سے ایک معنی متعین ہیں تب یہ سوال پیدا کرنا کہ "یہی استعمال دوسرے کسی مقام پر جب تک ثابت نہیں ہوگا قابل تسلیم نہیں" حد درجہ کی نادانی ہے تاوقتیکہ دلیل سے یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ لغت عرب میں اس لفظ کا اس معنی میں استعمال جائز ہی نہیں اور اگر اتمام حجت کے طور پر اس قسم کے لچر سوال یا دعوے کو قابل جواب، یا لائق رَدّ سمجھا ہی جائے تو سورۂ والنازعات کی یہ آیت کافی ووافی ہے:

﴿ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰهَا ﴿٢٧﴾ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿٢٨﴾﴾ (النازعات: ۲۷-۲۸)

"(اے افراد نسل انسانی) خلقت اور پیدائش کے لحاظ سے کیا تم زیادہ بھاری اور بوجھل ہو یا آسمان، جس کو خدا نے بنایا اور اس کے بوجھل جسم کو بلند کیا۔"

اور ایک آسمان پر ہی کیا موقوف ہے یہ ہم سے لاکھوں اور کروڑوں میل دور فضاء میں سورج، چاند اور ستاروں کو خدائے برتر نے جو بلندی اور رفعت عطاء کی ہے کیا یہ سب کے سب مادی اجسام نہیں ہیں؟ اور اگر ہیں اور یقیناً ہیں تو جس خالق ارض وسماوات نے ان مادی اجسام کا رفع کیا ہے، وہ اگر ایک انسانی مخلوق کا رفع آسمانی کر دے تو اس کو قرآن کے اطلاق و استعمال کے خلاف کہنا غباوت اور جہالت نہیں تو اور کیا ہے، البتہ ثبوت درکار ہے تو اس کے لیے قرآن عزیز کی نصوص، صحیح احادیث اور اجماع امت سے زیادہ موثق ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع سماوی اور چند جذباتی باتیں:

مرزائے قادیانی نے اگرچہ اس مسئلہ میں جمہور کے خلاف یہود و نصاریٰ کی پیروی میں تحریف مطالب کی کافی سعی ناکام کی ہے اور مسٹر لاہوری نے بھی تفسیر قرآن میں تحریف معنوی کے ذریعہ اپنے مقتداء کی مدد کی، تاہم دل کا چور ان کو مطمئن نہیں کر سکا اور اس لیے انہوں نے دلائل و براہین کی جگہ جذبات کو دلیل راہ بنایا اور کبھی تو یہ کہا کہ جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر زندہ تسلیم کرتے ہیں وہ ان کو خاتم الانبیاء محمد ﷺ پر فضیلت دیتے ہیں کہ آپ ﷺ زمین پر ہوں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر، یہ تو سخت توہین کی بات ہے۔

لیکن علمی حلقوں میں اس لچر اور لوچ جذبہ کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے جبکہ ہر ایک مذہبی انسان اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہے کہ اگرچہ فرشتے، ہمیشہ بقید حیات ملاء اعلیٰ میں موجود اور سکونت پذیر ہیں تاہم ان سب کے مقابلہ میں بلکہ ان کی جلیل القدر

Marfat.com

ہستیوں مثلاً جبرئیل و میکائیل کے مقابلہ میں بھی ایک مفضول سے مفضول نبی کا رتبہ بہت بلند اور عالی ہے، حالانکہ وہ نبی زمین پر مقیم رہا ہے اور جبرئیل کا قیام ملاء اعلیٰ کے بھی بلند تر مقام پر رہتا ہے چہ جائیکہ خاتم الانبیاء ﷺ کا مرتبہ جلیل کہ جس کی عظمت ...... "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" میں مضمر ہے، علاوہ ازیں نبی اکرم ﷺ نے شب معراج میں "قاب قوسین او ادنیٰ" کا جو تقرب پایا ہے وہ نہ کسی ملک اور فرشتہ کو حاصل ہوا اور نہ کسی نبی اور رسول کو، اس لیے حضرت مسیح علیہ السلام کا رفع آسمانی اس "رفعت" کو پہنچ ہی نہیں سکتا جو اسریٰ میں آپ کو حاصل ہوئی۔ بہر حال فاضل و مفضول کے درمیان فرق مراتب کے لیے تنہا ملاء اعلیٰ کا قیام معیار فضیلت نہیں ہے خصوصاً اس "افضل ہستی" کے مقابلہ میں جس کی فضیلت کا معیار خود اس کا وجود باجود ہو اور جس کی ذات قدسی صفات خود ہی منبع فضائل اور مرجع کمالات ہو ایسی ہستی سے تو "مقام" عزت و مرتبہ پاتا ہے نہ کہ وہ ذات گرامی۔

حسن یوسفؑ، دم عیسیٰؑ، ید بیضاء داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اور کبھی یہ کہا کہ جو شخص عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ تسلیم کرتا ہے وہ "العیاذ باللہ" نبی اکرم ﷺ کی اس لیے توہین کرتا ہے کہ وہ بقید حیات نہیں رہے اور اس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پھر ذات اقدس پر برتری حاصل ہو گئی۔

یہ مقولہ پہلے سے بھی زیادہ بے کیف اور بے معنی ہے بلکہ سرتاسر غلط بنیاد پر قائم، اس لیے کہ کون اہل عقل اور ذی ہوش کہہ سکتا ہے کہ "زندگی" بھی فاضل و مفضول کے درمیان معیار فضیلت ہے، اس لیے کہ زندگی کی قیمت ذاتی کمالات وفضائل سے ہے نہ اس لیے کہ وہ زندگی ہے، پھر "معیار فضیلت" کی اس بحث سے قطع نظر اس موقع پر نبی اکرم ﷺ کے مسئلہ فضیلت کو درمیان لانا اس لیے بھی قطعاً بے محل ہے کہ جبکہ قرآن عزیز کی نصوص نے تمام کائنات پر آپ ﷺ کی برتری کو ثابت کر دیا اور آپ کی سیرت نے زندہ شہادت بن کر ان نصوص کی تصدیق کر دی تو کسی بھی انسان کی "زندگی" یا "رفع آسمانی" یا اور کوئی "وجہ فضیلت" اس کے مقابلہ میں نہیں لائی جاسکتی، اور ہر ایک حالت و صورت میں "فضل کلی" اسی جامع کمالات ہستی کو حاصل رہے گا۔

وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ کی تفسیر:

اس مسئلہ کو ختم کرنے سے پہلے اب ایک بات باقی رہ جاتی ہے کہ سورۂ نساء کی مسطورہ بالا آیت میں ﴿ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ﴾ کی کیا تفسیر ہے؟ یعنی وہ کیا اشتباہ تھا جو یہودیوں پر طاری کر دیا گیا تو قرآن عزیز اس کا جواب اس مقام پر بھی اور آل عمران میں بھی ایک ہی دیتا ہے اور وہ "رفع الی السماء" ہے، آل عمران میں اس کو وعدہ کی شکل میں ظاہر کیا ﴿ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ ﴾ اور نساء میں ایفاء وعدہ کی صورت میں یعنی ﴿ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ﴾ جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ محاصرہ کے وقت جب منکرین حق گرفتاری کے لیے اندر گھسے تو وہاں عیسیٰ علیہ السلام کو نہ پایا، یہ دیکھا تو سخت حیران ہوئے اور کسی طرح اندازہ نہ لگا سکے کہ صورت حال کیا پیش آئی اور اس طرح ﴿ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ﴾ کا مصداق بن کر رہ گئے، اس کے بعد قرآن کہتا ہے:

﴿ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ۭ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًۢا ﴾ (النساء: ۱۵۷)

اشتباہ کے بعد جو صورت حال پیش آئی اس کا نقشہ بیان کیا گیا ہے اور اس سے دو باتیں بصراحت ظاہر ہوتی ہیں: ایک

Marfat.com

کہ یہود اس سلسلہ میں اس طرح شک میں پڑ گئے تھے کہ گمان اور اٹکل کے ماسوا ان کے پاس علم و یقین کی کوئی صورت باقی نہیں رہ گئی تھی اور دوسری بات یہ کہ انہوں نے کسی کو قتل کر کے یہ مشہور کیا کہ انہوں نے "مسیح علیہ السلام" کو قتل کر دیا اور یا پھر آیت زمانہ نبوت محمدی کے یہود کا حال بیان کر رہی ہے۔

پس قرآن عزیز کے ان واضح اعلانات کے بعد جو حضرت مسیح علیہ السلام کی حفاظت و صیانت کے سلسلہ میں کیے گئے ہیں اور جن کو تفصیل کے ساتھ سطور بالا میں بیان کر دیا گیا ہے ان دو باتوں کی جزئی تفصیلات کا تعلق آثار صحابہ رضی اللہ عنہم اور تاریخی روایات پر رہ جاتا ہے اور اس سلسلہ میں صرف ان ہی روایات و آثار کو قابل تسلیم سمجھا جائے گا جو اپنی صحت روایت کے ساتھ ساتھ ان بنیادی تصریحات سے نہ ٹکراتی ہوں جن کا ذکر متعدد مقامات پر قرآن عزیز نے بصراحت کر دیا ہے اور (القرآن یفسر بعضہ بعضا) قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی خود ہی تفسیر کر دیتا ہے" کے اصول پر جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دشمن ہاتھ تک نہ لگا سکے اور وہ محفوظ ملاء اعلیٰ کی جانب اٹھا لیے گئے اور جیسا کہ حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام کی بحث میں ابھی نصوص قرآنی سے ثابت ہوگا کہ وہ وقوع قیامت کے لیے "نشان" ہیں۔ اور اس لیے دوبارہ کائنات ارضی میں واپس آ کر اور مفوضہ خدمت انجام دے کر پھر موت سے دوچار ہوں گے۔

شخص مقتول و مصلوب سے متعلق آثار و تاریخ کی جو ملی جلی روایات ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ "سبت کی شب" میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام بیت المقدس کے ایک بند مکان میں اپنے حواریوں کے ساتھ موجود تھے کہ بنی اسرائیل کی سازش سے دمشق کے بت پرست بادشاہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری کے لیے ایک دستہ بھیجا، اس نے آ کر محاصرہ کر لیا۔ اسی اثناء میں اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو ملاء اعلیٰ کی جانب اٹھا لیا۔ جب سپاہی اندر داخل ہوئے تو انہوں نے حواریوں میں ایک ہی شخص کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہم شبیہ پایا۔ اور اس کو گرفتار کر کے لے گئے اور پھر اس کے ساتھ وہ سب کچھ ہوا جس کا ذکر گزشتہ سطور میں ہو چکا ہے۔ ان ہی روایات میں بعض اس کا نام یودس بن کریا یوطا بیان کرتے ہیں اور بعض جرجس اور دوسرے داؤد بن لوزا کہتے ہیں۔

پھر ان روایات میں سے بعض میں ہے کہ یہ شخص مقتول اپنی خلقت ہی میں حضرت مسیح علیہ السلام کا مشابہ اور ان کا نقش ثانی تھا، اسرائیلیات انجیلی میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں میں سے یہودا اسخرلوطی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا شبیہ تھا اور بعض روایات میں ہے کہ جب یہ نازک گھڑی آ پہنچی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حواریوں کو دعوت و تبلیغ حق سے متعلق تلقین و ہدایات کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی مجھ کو مطلع کر دیا ہے کہ میں ایک مدت تک کے لیے ملاء اعلیٰ کی جانب اٹھا لیا جاؤں گا اور یہ واقعہ مخالفین اور متبعین دونوں کے لیے سخت آزمائش و امتحان بن جانے والا ہے۔ لہٰذا تم میں سے جو شخص اس پر آمادہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو میرا شبیہ بنا دے اور وہ خدا کی راہ میں جام شہادت پائے اس کو جنت کی بشارت ہے تب ایک حواری نے پہل کی اور خود کو اس کے لیے پیش کیا اور منجانب اللہ وہ حضرت کا ہم شکل ہو گیا اور سپاہیوں نے اس کو گرفتار کر لیا۔ [1]

یہ تفصیلات نہ قرآن میں مذکور ہیں اور نہ احادیث مرفوعہ میں اس لیے وہ صحیح ہوں یا غلط نفس مسئلہ اپنی جگہ اٹل ہے اور قرآن کی آیات میں منصوص، اس لیے اصحاب ذوق کو اختیار ہے کہ وہ صرف قرآن کے اس اجمال پر ہی قناعت کریں کہ حضرت مسیح علیہ السلام

---

[1] واقعات کی یہ تفصیلات تاریخ ابن کثیر ج ۲ اور کتب تفسیر میں منقول ہیں۔

Marfat.com

کا رفع الی السماء اور ہر طرح دشمنوں سے تحفظ نیز یہود پر معاملہ کا مشتبہ ہو کر کسی دوسرے کو قتل کرنا یہود و نصاریٰ کے پاس اس سلسلہ میں علم و یقین سے محروم ہو کر ظن و تخمین اور شک و شبہ میں مبتلا ہو جانا اور قرآن کا حقیقت واقعہ کو علم و یقین کی روشنی میں ظاہر کر دینا یہ سب حقائق ثابت ہیں: ﴿وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ﴾ اور ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْهِ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ....الایة﴾ کی تفسیر میں ان روایات کی تفصیلات کو بھی قبول کر لیں اور یہ سمجھ کر تسلیم کریں کہ زیر بحث آیات کی تفسیر ان تفصیلات پر موقوف نہیں ہے بلکہ یہ امر زائد ہے جو آیات کی تفسیر صحیح کے لیے مؤید ہے۔

حیات عیسیٰ علیہ السلام:

سورۂ آل عمران، مائدہ اور نساء کی زیر بحث آیات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق حکمت الٰہی کا یہ فیصلہ صادر ہوا کہ ان کو بقید حیات ملاء اعلیٰ کی جانب اٹھا لیا جائے اور وہ دشمنوں اور کافروں سے محفوظ اٹھا لیے گئے۔ لیکن قرآن نے اس مسئلہ میں صرف اسی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ حسب موقعہ ان کی حیات امروز پر نصوص قطعیہ کے ذریعہ متعدد جگہ روشنی ڈالی ہے اور ان مقامات میں اس جانب بھی اشارات کیے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی حیات طویل اور رفع الی السماء میں کیا حکمت مستور تھی تاکہ اہل حق کے قلوب تازگی ایمان سے شگفتہ ہو جائیں اور باطل کوش اپنی کور باطنی پر شرمائیں۔

لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ:

﴿وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۝﴾ (النساء:۱۵۹)

"اور کوئی اہل کتاب میں سے باقی نہ رہے گا مگر یہ کہ وہ ضرور ایمان لائے گا عیسیٰ (علیہ السلام) پر اس (عیسیٰ علیہ السلام) کی موت سے پہلے اور وہ (عیسیٰ علیہ السلام) قیامت کے دن ان پر (اہل کتاب پر) گواہ بنے گا۔"

اس آیت سے قبل آیات میں وہی مسطورۂ بالا واقعہ مذکور ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو نہ صلیب پر چڑھایا گیا اور نہ قتل کیا گیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب اٹھا لیا، یہ یہود و نصاریٰ کے اس عقیدہ کی تردید ہے جو انہوں نے اپنے باطل زعم اور انکل سے قائم کر لیا تھا، ان سے کہا جا رہا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق صلیب پر چڑھائے جانے اور قتل کیے جانے کا دعویٰ قابل لعنت ہے کیونکہ بہتان اور لعنت توام ہیں، اس کے بعد اس آیت میں امر اول کی تصدیق میں اس جانب توجہ دلائی جا رہی ہے کہ آج اگر اس ملعون عقیدہ پر فخر کر رہے ہو تو وہ وقت بھی آنے والا ہے جب عیسیٰ بن مریم علیہما السلام خدائے برتر کی حکمت و مصلحت کو پورا کرنے کے لیے کائنات ارضی پر واپس تشریف لائیں گے اور اس عینی مشاہدہ کے وقت اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) میں سے ہر ایک موجود ہستی کو قرآن کے فیصلہ کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آنے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہے گا اور پھر جب وہ اپنی مدت حیات ختم کر کے موت کی آغوش سے دوچار ہو جائیں گے تو قیامت کے دن اپنی امت (اہل کتاب) پر اسی طرح گواہ ہوں گے جس طرح تمام انبیاء و مرسلین اپنی اپنی امتوں پر شاہد بنیں گے۔

یہ حقیقت کچھ مخفی نہیں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اگرچہ یہود و نصاریٰ دونوں واقعہ صلیب و قتل پر متفق ہیں لیکن اس سلسلہ

Marfat.com

میں دونوں کے عقائد کی بنیاد قطعاً متضاد اصول پر قائم ہے، یہود، حضرت مسیح علیہ السلام کو مفتری اور کاذب کہتے اور دجال [1] سمجھتے ہیں اور اس لیے فخر کرتے ہیں کہ انہوں نے یسوع مسیح علیہ السلام کو صلیب پر بھی چڑھایا اور پھر اس حالت میں مار بھی ڈالا۔ اس کے برعکس نصاریٰ کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا کا پہلا انسان آدم علیہ السلام گنہگار تھا اور ساری دنیا گنہگار تھی اس لیے خدا کی صفت "رحمت" نے ارادہ کیا کہ دنیا کو گناہوں سے نجات دلائے اس لیے اس کی صفت "رحمت" نے ابنیت (بیٹا ہونا) کی شکل اختیار کی اور اس کو دنیا میں بھیجا تا کہ وہ یہود کے ہاتھوں سولی پر چڑھے اور مارا جائے اور اس طرح ساری کائنات ماضی و مستقبل کے گناہوں کا "کفارہ" بن کر دنیا کی نجات کا باعث بنے۔

سورۂ نساء کی آیات میں قرآن عزیز نے صاف صاف کہہ دیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل کے دعویٰ کی بنیاد کسی بھی عقیدہ پر بنی ہو لائق لعنت اور باعث ذلت وخسران ہے۔ خدا کے سچے پیغمبر کو مفتری سمجھ کر یہ عقیدہ رکھنا بھی لعنت کا موجب اور خدا کے بندے اور مریم علیہا السلام کے بطن سے پیدا انسان کو خدا کا بیٹا بنا کر اور "کفارہ" کا باطل عقیدہ تراش کر مسیح علیہ السلام کو مصلوب و مقتول تسلیم کرنا بھی گمراہی اور علم وحقیقت کے خلاف اٹکل کا تیر ہے اور اس سلسلہ میں صحیح اور مبنی برحقیقت فیصلہ وہی ہے جو قرآن نے کیا ہے اور جس کی بنیاد "علم ویقین اور وحی الٰہی" پر قائم ہے۔

پس آج جبکہ تمہارے سامنے اس اختلاف کے فیصلہ کے لیے جو شک وظن کی شکستہ بنیادوں پر قائم تھا علم ویقین کی روشنی آ چکی ہے پھر بھی تم اپنے ظنون کاسدہ اور اوہام فاسدہ پر اصرار کر رہے ہو اور حضرت مسیح علیہ السلام سے متعلق باطل عقیدہ کو ترک کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے ہو تو قرآن کا ایک دوسرا فیصلہ اور وحی الٰہی کا یہ اعلان بھی سن لو کہ تمہاری نسلوں پر وہ وقت بھی آنے والا ہے جب قرآن کے اس صحیح فیصلہ اور اعلانِ حق کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام ملاء اعلیٰ سے کائنات ارضی کو واپس ہوں گے اور ان کی یہ آمد ایسی مشاہد ہوگی کہ یہود ونصاریٰ میں سے ایک فرد بھی ایسا نہ رہے گا جو بادل خواستہ یا بادل ناخواستہ اس ذات گرامی پر یہ ایمان نہ لے آئے کہ بلاشبہ وہ خدا کے سچے رسول ہیں، خدا کے بیٹے نہیں برگزیدہ انسان ہیں، مصلوب و مقتول نہیں ہوئے تھے، بقید حیات ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں:

﴿وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ﴾

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ سورۂ آل عمران اور سورۂ مائدہ کی طرح اس جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے لفظ "توفی" نہیں بولا گیا بلکہ بصراحت لفظ "موت" استعمال کیا گیا ہے، یہ کیوں؟ صرف اس لیے کہ ان دونوں مقامات پر جس حقیقت کا اظہار مقصود ہے اس کے لیے "توفی" ہی مناسب ہے جیسا کہ سورۂ آل عمران سے متعلق آیات کی تشریح وتفسیر میں گزر چکا اور سورۂ مائدہ سے متعلق آیت کی تفسیر میں عنقریب بیان ہوگا اور اس جگہ چونکہ براہ راست "موت" ہی کا تذکرہ مطلوب ہے اور اس حالت کا ذکر ہے جس کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام بھی ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ﴾ کا مصداق بننے والے ہیں اس لیے یہاں "موت" کو بصراحت لانا ہی از بس ضروری تھا اور یہ مزید برہان ہے اس دعویٰ کے لیے کہ آل عمران اور مائدہ میں لفظ "موت" کی جگہ "توفی" کا اطلاق بلاشبہ

---

[1] دجال دجل سے ماخوذ ہے جس کے معنی "فریب" ہیں۔

خاص مقصد رکھتا ہے ورنہ جس طرح ان دونوں مقامات پر "توفی" کا اطلاق کیا گیا تھا اسی طرح یہاں بھی کیا جاتا، یا جس طرح اس جگہ لفظ "موت" کا اطلاق کیا گیا ہے اسی طرح ان دونوں مقامات پر بھی لفظ موت ہی کا استعمال ہونا چاہیے تھا مگر قرآن عزیز کے ان دقیق اسالیب بیان کے فرق کا فہم طالبین حق کا ہی حصہ ہے نہ کہ مرزائے قادیانی اور مسٹر لاہوری جیسے اصحاب زیغ کا جو اپنی خاص اغراض ذاتی کے پیش نظر پہلے ایک نظریہ ایجاد کر لیتے ہیں اور بعد ازاں اس سلسلہ کی تمام آیات قرآنی کو اسی کے سانچہ میں ڈھال کر اس کا نام "تفسیر قرآن" رکھتے ہیں۔

بہر حال جمہور کے نزدیک آیت زیر عنوان کی تفسیر یہی ہے جو سپرد قلم کی جا چکی، مشہور محدث، جلیل القدر مفسر اور اسلامی مؤرخ عمادالدین بن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اس تفسیر کو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے بسند صحیح نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

قتادہ، عبدالرحمٰن اور بہت سے مفسروں کا یہی قول ہے اور یہی قول حق ہے جیسا کہ عنقریب ہم دلیل قاطع سے اس کو ثابت کریں گے۔ (انشاء اللہ تعالیٰ) [1]

اور سرتاج محدثین ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی کی تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اسی تفسیر پر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یقین کیا ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس تفسیر کو ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے روایت سعید بن جبیر اور ابو رجاء نے بھی حسن رضی اللہ عنہ سے بسند صحیح روایت کیا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ﴿قَبْلَ مَوْتِهٖ﴾ یعنی قبل موت عیسیٰ علیہ السلام قسم بخدا بیشک وشبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بقید حیات ہیں اور جب وہ آسمان سے اتریں گے تو سب اہل کتاب ان پر ایمان لے آئیں گے اور ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اسی تفسیر کو اکثر اہل علم سے نقل کیا ہے اور ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے اسی تفسیر کو ترجیح دی ہے۔" [2]

مگر اس صحیح تفسیر کے علاوہ کتب تفسیر میں احتمال عقلی کے طور پر دو قول اور بھی منقول ہیں مگر وہ دونوں بلحاظ سند ضعیف اور ناقابل اعتماد اور بلحاظ سیاق و سباق (یعنی آیت زیر بحث سے قبل اور بعد کی آیات کے لحاظ سے) غلط اور ناقابل التفات ہیں یعنی ایسے احتمالات عقلی جو نقل اور آیات کے باہمی نظم و ترتیب کے خلاف ہیں۔

ان ہر دو معنی میں سے ایک معنی یہ ہیں کہ "موتہ" میں جو ضمیر ہے اس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بجائے اہل کتاب کی جانب لوٹایا جائے اور آیت کا ترجمہ یوں کیا جائے "اور اہل کتاب میں سے کوئی فرد ایسا نہیں ہے جو اپنی موت سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لے آتا ہو" یعنی اگرچہ یہود و نصاریٰ اپنی زندگی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق قرآن کے بتائے ہوئے عقیدے پر ایمان نہیں لاتے اور اپنے اپنے عقیدہ پر قائم رہتے ہیں لیکن جب ان کو "موت" آ دباتی ہے تو وہ اس آخری حالت میں "جو نزع کا وقت کہلاتا ہے" صحیح عقیدہ کے مطابق ایمان لے آتے ہیں اور اہل کتاب کے ہر ایک فرد پر بلا استثناء یہی حالت گزرتی ہے اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ "اہل کتاب کا ہر ایک فرد اپنی موت سے پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آتا ہے" یعنی جب وہ عالم دنیا سے منقطع ہو کر عالم غیب سے وابستہ ہو رہا ہوتا ہے اس وقت اس پر اصل حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بیشک خدا کے سچے پیغمبر تھے۔

---

[1] ابن کثیر ج ۱ [2] فتح الباری شرح بخاری ج ۶ ص ۳۰۴

Marfat.com

پس اس بات سے قطع نظر کہ یہ دونوں تفسیریں نقل روایت کے اعتبار سے نا قابل اعتماد اور غیر صحیح اور آیات کے سیاق و سباق کے خلاف ہیں عقلی نقطہ نظر سے بھی غلط ہیں اس لیے کہ اگر آیت کے معنی یہ ہیں جو سطور بالا میں نقل کیے گئے تب یہ آیت اپنے مقصد بیان کے خلاف بے معنی اور بے نتیجہ ہو جاتی ہے (العیاذ باللہ) کیونکہ قرآن عزیز دوسرے مقامات پر صاف کہہ چکا ہے کہ جب انسان عالم دنیا سے کٹ کر عالم غیب سے وابستہ ہو جاتا ہے اور نزع کی یہ کیفیت اس پر طاری ہو جاتی ہے کہ جو معاملات اس ساعت سے قبل تک اس کے لیے غیب کے معاملات تھے وہ مشاہدہ میں آنے شروع ہو جاتے ہیں تو اس وقت اس کے اعمال و کردار کا صحیفہ لپیٹ دیا جاتا ہے اور اب تبدیلی اعتقاد کا کوئی نتیجہ اور ثمرہ نہیں ملتا یعنی اس وقت کا نہ اقرار و اعتراف معتبر اور نہ انکار مستند۔

﴿فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَ كَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ۝ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَ خَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ۝﴾ (الزمر: ۸۳-۸۵)

"پس جب آئے ان کے پاس پیغمبر واضح دلائل لے کر تو اس چیز سے خوش ہوئے جو ان کے پاس علم سے تھی اور گھیر لیا ان کو اس چیز نے جس کی وہ مذاق بناتے تھے پس جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو انہوں نے کہا ہم خدائے واحد پر ایمان لے آئے اور جن چیزوں کو ہم اس کا شریک بناتے تھے اس سے منکر ہوئے، پس نہیں نافع ہوا ان کا (یہ) ایمان جب انہوں نے ہمارے عذاب کا مشاہدہ کر لیا یہ اللہ کی سنت ہے جو اس کے بندوں میں ہمیشہ جاری رہی اور اس موقع پر کافروں نے زیاں پایا۔"

﴿وَ لَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَ لَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَ هُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝﴾ (النساء: ۱۸)

"لیکن ان لوگوں کی توبہ، توبہ نہیں ہے جو (ساری عمر تو) برائیاں کرتے رہے لیکن جب ان میں سے کسی کے آگے موت آ کھڑی ہوئی تو کہنے لگا اب میں توبہ کرتا ہوں، (ظاہر ہے کہ ایسی توبہ سچی توبہ نہیں ہوتی) اسی طرح ان لوگوں کی توبہ بھی توبہ نہیں ہے جو دنیا سے کفر کی حالت میں جاتے ہیں ان تمام لوگوں کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

تو ایسی صورت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا معنی رکھتا ہے؟ انسان جب اس حالت پر پہنچ جاتا ہے تو اس کے سامنے سے غیب کے پردے ہٹ جاتے ہیں اور برزخ، ملائکۃ اللہ، عذاب یا راحت، جنت و جہنم، غرض دین حق کی تعلیم کردہ غیب کی ساری حقیقتیں اس پر منکشف ہو جاتی ہیں اور اس میں یہود و نصاریٰ کی ہی خصوصیت کیا ہے یہ حالت تو ہر ایک ابن آدم پر گزرنے والی ہے نیز جب اس قسم کا ایمان قابل قبول ہی نہیں ہے تو اس کا ذکر اسی اسلوب کے ساتھ ہونا چاہیے تھا جو غرق فرعون کے وقت فرعون کے ایمانی اعتراف و اقرار کے لیے اختیار کیا گیا اور جس میں اس وقت کی ایمانی پکار کی بے وقتی ظاہر کی گئی ہے نہ کہ

Marfat.com

ایسے اسلوب بیان کے ساتھ گویا مستقبل میں ہونے والے کسی ایسے عظیم الشان واقعہ کی خبر دی جا رہی ہے جو مخاطبین (یہود و نصاریٰ) کے عقائد و عزائم کے خلاف حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق قرآن کی تصدیق اور اس کے اٹل فیصلہ کی زندہ شہادت بن کر پیش آنے والا ہے ورنہ تو ایک عیسائی اور یہودی پنجۂ موت میں آ جانے کے وقت جان عزیز سپرد کر دینے سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا تب کیا اور نہ لایا تب کیا، اس کی یہ تصدیق کائنات انسانی کے علم و ادراک سے باہر صرف اس کے اور خدا کے درمیان تعلق رکھتی ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی بات کا ایسے موقع پر تذکرہ کرنا قطعاً بے محل ہے جہاں ایک قوم کو اس کے ایک خاص عقیدہ پر ملزم و مجرم بنانے کے لیے فیصلہ حق کی تائید کے لیے ماضی اور مستقبل میں کائنات ارضی پر پیش آنے والے واقعات کو پیش کیا جا رہا ہے جیسا کہ آیت کے سیاق و سباق سے واضح ہو رہا ہے علاوہ ازیں ان احتمالات کی یہاں اس لیے بھی گنجائش نہیں ہے کہ غرغرہ کے وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اس قسم کا ایمان تو ہر اس اہل کتاب سے متعلق ہے جو اس آیت کے نزول سے کچھ دن قبل یا صدیوں قبل گزر چکے اور مر کھپ چکے ہیں۔ لہٰذا اگر آیت میں یہ مضمون بیان کرنا مقصود تھا تو اس کے لیے مؤکد مستقبل کی یہ تعبیر ﴿لَيُؤْمِنَنَّ﴾ فصاحت و بلاغت کلام کے بالکل خلاف ہے اس کے لیے تو ایسی تعبیر کی ضرورت تھی جو ماضی، حال اور استقبال تینوں زمانوں پر حاوی ہوتی تا کہ قرآن کا مفہوم اپنے توسع کے لحاظ سے پوری طرح ادا ہوتا۔

نیز دوسرے معنی تو اس لیے بھی قطعاً غلط اور بے محل ہیں کہ اس آیت سے قبل اور بعد کی آیات ہیں یعنی سیاق و سباق میں خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہی نہیں ہے کیونکہ شروع آیات میں صرف حضرت مسیح علیہ السلام کا ذکر ہو رہا ہے اور اس آیت کے آخر میں یہ ارشاد ہوا ہے: ﴿وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا﴾ اور واضح ہے یہ بات کہ اس جگہ شاہد سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں اور ﴿عَلَيْهِمْ﴾ کی ضمیر سے ان کی امت تو پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیے بغیر درمیان کی کسی ضمیر کا مرجع ذات اقدس کو قرار دینا نہ صرف یہ کہ فصاحت و بلاغت کے منافی ہے بلکہ قاعدۂ عربیت کے قطعاً خلاف اور انتشار ضمائر کا موجب ہے۔

غرض بے غل و غش صحیح معنی وہی ہیں جو جمہور نے اختیار کیے ہیں اور یہ دونوں خود ساختہ احتمالات آیت کی تفسیر تو کیا صحیح احتمال کہلانے کے بھی مستحق نہیں ہیں۔ ❶

حیاۃ و نزول عیسیٰ علیہ السلام اور احادیث صحیحہ:

قرآن عزیز نے جس معجزانہ اختصار کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع سماوی، حیات امروز اور علامت قیامت بن کر نزول من السماء کے متعلق تصریحات کی ہیں صحیح ذخیرہ احادیث نبوی میں ان آیات ہی کی تفصیلات بیان کر کے ان حقائق کو روشن کیا گیا ہے۔ چنانچہ امام حدیث بخاری اور مسلم نے صحیحین (صحیح بخاری، صحیح مسلم) میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت متعدد طریقہ ہائے

---

❶ اس مقام کے علاوہ سورۂ زخرف کی آیت ﴿مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ اور سورۂ آل عمران کی ابتداء سے بیاسی آیات تک جو وفد نجران سے تعلق رکھتی ہیں یہ سب مقامات و دلالۃ النص یا اشارۃ النص کی شکل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کے لئے دلیل برہان ہیں اور اگرچہ ان کی تفصیلات اور وجوہ استشہاد میرے پاس مدون و مرتب ہیں تاہم کتاب کی طوالت کے خوف سے اس جگہ ان کو نظر انداز دیا گیا ہے بقوت فرصت انشاء اللہ مستقل مضمون کی صورت میں ہدیہ ناظرین ہوگا، اور یا پھر حجۃ الاسلام علامہ محمد انور شاہ نور اللہ مرقدہ کی کتاب "عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام" اس مقصد کے لئے قابل مراجعت ہے۔

Marfat.com

سند سے نقل کی ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والذی نفسی بیدہ لیوشکن ان ینزل فیکم ابن مریم حکما عدلاً فیکسر الصلیب ویقتل الخنزیر ویضع الجزیة ویفیض المال حتی لا یقبلہ احد وحتی تکون السجدة الواحدة خیرا لہ من الدنیا و ما فیھا ثم قال ابوھریرة رضی اللہ عنہ اقرؤا ان شئتم ﴿وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا﴾ ❶

"رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے ضرور وہ وقت آنے والا ہے کہ تم میں عیسیٰ بن مریم حاکم عادل بن کر اتریں گے، وہ صلیب کو توڑیں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے (یعنی موجودہ عیسائیت کو مٹائیں گے) اور جزیہ اٹھا دیں گے (یعنی نشان الٰہی کے مشاہدہ کے بعد اسلام کے سوا کچھ بھی قبول نہیں ہوگا اور اسلامی احکام میں بارشاد رسول اللہ ﷺ جزیہ کا حکم اسی وقت تک کے لیے ہے) اور مال کی اس درجہ کثرت ہوگی کہ کوئی اس کو قبول کرنے والا نہیں ملے گا اور خدا کے سامنے ایک سجدہ دنیا و مافیہا سے زیادہ قیمت رکھے گا (یعنی مالی کثرت کی وجہ سے خیرات و صدقات کے مقابلہ میں عبادت نافلہ کی اہمیت بڑھ جائے گی) پھر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر تم (قرآن سے اس کا استشہاد) چاہو تو یہ آیت پڑھو ﴿وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ...... الایة﴾ اور کوئی اہل کتاب میں سے نہ ہوگا مگر (عیسیٰ علیہ السلام کی) موت سے پہلے اس پر (عیسیٰ پر) ضرور ایمان لے آئے گا اور وہ (عیسیٰ علیہ السلام) قیامت کے دن ان پر گواہ ہوگا۔"

② بخاری اور مسلم میں بسند نافع مولیٰ ابوقتادہ انصاری رضی اللہ عنہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بھی منقول ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیف انتم اذا نزل ابن مریم فیکم و امامکم منکم. ❷

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم میں ابن مریم اتریں گے اور اس حالت میں اتریں گے کہ تم ہی میں سے ایک شخص تمہاری امامت کر رہا ہوگا۔"

ان دونوں روایات کے علاوہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے متعدد طریقہ ہائے سند سے اور روایات بھی صحیحین: مسند احمد اور سنن ❸ میں درج ہیں جو یہی مفہوم و معنی ادا کرتی ہیں، ان میں سے ایک زیادہ مفصل ہے اور مسئلہ زیر بحث کے بعض دوسرے پہلوؤں کو بھی نمایاں کرتی ہے۔ مسند احمد میں ہے:

③ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال الانبیاء اخوة لعلات امھاتھم شتّی و دینھم واحد و انّی اولی النّاس بعیسی بن مریم لانہ لم یکن نبی بینی و بینہ و انہ نازل فاذا رائیتموہ فاعرفوہ رجلٌ مربوعٌ الی الحمرة والبیاضِ علیہ ثوبان ممصّران کان رأسہ یقطر ان لم یصبہ بلل فیدق الصلیب و یقتل الخنزیر و یضع الجزیة و یدعوالناس الی الاسلام و یھلک اللہ فی زمانہ المسیح الدّجال ثم تقع الامانة علی الارض حتّی ترتع الاسود مع الابل والنمار مع البقر والذئاب مع الغنم و یلعب الصبیان بالحیات لا تضرھم فیمکث اربعین سنة ثم یتوفّی و یصلی علیہ المسلمون

❶ کتاب الانبیاء ❷ ایضاً ❸ ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ

Marfat.com

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تمام انبیاء اصول دین میں علاتی بھائیوں کی طرح ہیں، دین سب کا ایک اور فروع دین مختلف اور میں دوسرے انبیاء کے مقابلہ میں عیسیٰ بن مریم علیہ السلام سے زیادہ قریب ہوں اس لیے کہ ان کے اور میرے درمیان کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا اور بلاشبہ وہ کائنات ارضی پر اتریں گے، پس جب تم ان کو دیکھو تو اس حلیہ سے پہچان لینا: میانہ قد، سرخ و سفید رنگ ہوگا ان کے جسم پر دو سرخی مائل رنگ کی چادریں ہوں گی ایسا معلوم ہوگا گویا فی الحال غسل کر کے آ رہے ہیں اور سر سے پانی کے قطرے موتی کی طرح ٹپک پڑنے والے ہیں۔ وہ صلیب کو توڑیں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے (موجودہ عیسائیت کا خاتمہ کر دیں گے) اور جزیہ اٹھا دیں گے اور لوگوں کو "اسلام" کی دعوت دیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے زمانہ میں تمام ادیان و ملل کو مٹا دے گا اور صرف ایک ہی دین "دین اسلام" باقی رہ جائے گا اور اللہ تعالیٰ ان ہی کے زمانہ میں مسیح دجال کو ہلاک کرے گا پھر کائنات میں "امانت" (امر خیر) جگہ کر لے گی حتیٰ کہ شیر اونٹوں کے ساتھ، چیتے گائے بیلوں کے ساتھ، بھیڑیے بکریوں کے ساتھ چرتے نظر آئیں گے اور بچے سانپوں کے ساتھ کھیلیں گے، اور ان کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا، پس عیسیٰ علیہ السلام چالیس سال اس زمین پر زندہ رہیں گے پھر وفات پا جائیں گے اور مسلمان ان کے جنازہ کی نماز ادا کریں گے۔"

اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث روایت کی گئی اس میں خروج دجال کا ذکر کرتے ہوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک مذکور ہے:

④ فاذا جاؤا الشام خرج فبيناهم يعدّون القتال يسوون الصفوف اذا قيمت الصلوة فينزل عيسٰى بن مريم...الخ

"پس جب مسلمان ملک شام پہنچیں گے تو دجال کا خروج ہوگا ابھی مسلمان اس کے مقابلہ میں جنگ کی تیاریاں کر رہے ہوں گے۔ صفیں درست کرتے ہوں گے کہ نماز کے لیے اقامت ہونے لگے گی۔ اس درمیان میں عیسیٰ علیہ السلام بن مریم کا نزول ہوگا اور وہ مسلمانوں کی امامت کا فرض انجام دیں گے۔"

اور صحیح مسلم میں حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے ایک طویل روایت منقول ہے جس میں یہ مذکور ہے:

اذا بعث الله المسيح بن مريم (عليه السلام) فينزل عند المنارة البيضاء شرقى دمشق بين مهرودتين واضعًا كفيه على اجنحة ملكين اذا طأطأ رأسه قطر و اذا رفعه تحدّر منه جمانٌ كاللؤلوء..... الخ

"ابھی دجال ایک مسلمان پر اپنے شیطانی کرشموں کی آزمائش کر ہی رہا ہوگا) کہ اللہ تعالیٰ مسیح بن مریم علیہ السلام کو بھیج دے گا وہ جب کائنات ارضی پر اتریں گے تو مسجد دمشق کے مشرقی جانب کے سفید منارہ پر اتریں گے اور ان کے بدن پر (سرخی مائل) گہری زرد رنگ کی دو چادریں ہوں گی (یعنی ایک بدن کے اوپر کے حصہ پر اور دوسری زیریں حصہ بدن پر لپٹی ہوگی) اور دو فرشتوں کے بازوؤں پر سہارا لیے ہوں گے۔ جب سر جھکائیں گے تو سر سے پانی ٹپک پڑنے لگے گا اور جب سر اٹھائیں گے تو پانی کے قطرے موتیوں کی طرح ٹپکیں گے (یعنی غسل کیے آ رہے ہوں گے)۔"

اور مختلف طریقہ ہائے سند سے امام احمد نے مسند میں اور ترمذی رحمہ اللہ نے سنن میں حضرت مجمع بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے بسند صحیح یہ روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

Marfat.com

یقتل ابن مریم الدّجال بباب لُدّ. ❶

"ابن مریم، دجال کو باب لد پر قتل کریں گے۔"

امام ترمذی اس روایت کو نقل کر کے فرماتے ہیں "هذا حديث صحيح" اور اس کے بعد ان حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی فہرست شمار کراتے ہیں جن سے نزول عیسیٰ بن مریم علیہ السلام اور ان کے ہاتھوں قتل دجال سے متعلق روایات کتب حدیث میں منقول ہیں فرماتے ہیں:

اور اس باب میں حضرت عمران بن حصین، نافع بن عیینہ، ابو برزہ اسلمی، حذیفہ بن اسید، ابو ہریرہ، کیسان، عثمان بن العاص، جابر بن عبداللہ، ابوامامہ باہلی، ابن مسعود، عبداللہ بن عمرو بن العاص، سمرۃ بن جندب، نواس بن سمعان، عمرو بن عوف، حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہم سے بھی روایات منقول ہیں۔ ❷

امام احمد رحمہ اللہ نے مسند میں امام مسلم رحمہ اللہ نے صحیح میں اور اصحاب سنن نے سنن میں، بروایت حضرت حذیفہ بن الاسیدی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے:

قال اشرف علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من غرفة و نحن نتذکر الساعة فقال: لا تقوم الساعة حتی تروا عشر ایات، طلوع الشمس من مغربها والدخان والدابة، و خروج یاجوج و ماجوج و نزول عیسی بن مریم و الدجال و ثلثة خسوف خسف بالمشرق و خسف بالمغرب و خسف بجزیرة العرب و نار تخرج من قعرعدن تسوق و تحشر الناس تبیت معهم حیث باتوا و تقیل معهم حیث قالوا. ❸

"حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم (صحابہ) ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے قیامت کے متعلق بات چیت کر رہے تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بالا خانہ سے جھانکا اور ارشاد فرمایا: "قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک تم دس نشان نہ دیکھ لو گے۔ آفتاب کا مغرب سے طلوع، دخان (دھواں) دابۃ الارض، خروج یاجوج و ماجوج، عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کا نزول، دجال کا خروج، تین مقامات میں خسوف کا پیش آنا (زمین میں دھنس جانا) مشرق میں مغرب میں اور جزیرۃ العرب میں، آگ کا قعر عدن سے نکلنا جو لوگوں کو سمیٹ لے جائے گی اور جب رات کو لوگ آرام کریں گے تو وہ بھی ٹھہر جائے گی اور جب دوپہر کو قیلولہ کریں گے تب بھی وہ ٹھہری رہے گی۔"

اور محدث ابن ابی حاتم نے اور جلیل القدر محدث و مفسر ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے بروایت حسن بصری رحمہ اللہ بسند صحیح حیات و نزول عیسیٰ بن مریم علیہ السلام سے متعلق ایک روایت نقل کی ہے اس میں ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الیهود ان عیسی لم یمت و انه راجع الیکم قبل یوم القیمة.

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے فرمایا: "عیسیٰ علیہ السلام مرے نہیں اور بلاشبہ وہ قیامت سے پہلے تمہاری جانب لوٹ کر آئیں گے۔"

اسی طرح ابن ابی حاتم اور ابن جریر رحمہما اللہ نے سورۂ نساء کی آیات متعلقہ وفد نجران کی تفسیر کرتے ہوئے اصول حدیث کے

---

❶ لد دمشق کی شہر پناہ کا ایک دروازہ ہے۔ ❷ ترمذی باب نزول عیسیٰ بن مریم علیہ السلام

❸ حدیث میں جن علامات کا ذکر ہے وہ سب تشریح طلب ہیں مگر یہاں ان کی تشریحات بے محل ہیں اس لئے نظر انداز کر دی گئیں، عام تشریحات کتب تفسیر و حدیث میں اور شاہ رفیع الدین دہلوی نور اللہ مرقدہ کے رسالہ علامات قیامت میں قابل مطالعہ ہیں۔

Marfat.com

نقطۂ نظر سے بہ سند حسن ایک طویل روایت ربیع بن انس رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے اس میں بھی بصراحت یہ مذکور ہے:

فقال لهم النبی صلی اللہ علیہ وسلم الستم تعلمون ان ربنا حیّ لا یموت و ان عیسٰی یأتی علیه الفناء. ❶

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد سے فرمایا: کیا تم نہیں جانتے کہ بلاشبہ ہمارا پروردگار زندہ ہے جس کے لیے موت نہیں ہے اور بلاشبہ عیسیٰ علیہ السلام کو فنا (موت) سے دوچار ہونا ہوگا۔"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ لفظ "یأتی" فرمایا ہے جو مستقبل کے لیے بولا جاتا ہے لفظ "اتی" نہیں فرمایا جو ماضی کے لیے مخصوص ہے۔

اور بیہقی نے کتاب الاسماء والصافات میں اور محدث علی متقی گجراتی نے کنز العمال میں باسناد حسن و صحیح اس سلسلہ میں جو روایات نقل فرمائی ہیں ان میں نزول عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر کے ساتھ "من السماء" کا لفظ صراحت سے موجود ہے۔ ❷

یہ اور اسی قسم کا کثیر ذخیرۂ حدیث ہے جو حیات و نزول عیسیٰ بن مریم علیہ السلام پیغمبر بنی اسرائیل (علیہ السلام) سے متعلق کتب حدیث و تفسیر میں منقول ہے اور جو قوت سند کے لحاظ سے صحیح اور حسن سے کم رتبہ نہیں رکھتا اور باعتبار شہرت و تواتر روایات جن کا یہ حال ہے کہ حسب تصریح امام ترمذی، حافظ حدیث عماد الدین بن کثیر، حافظ حدیث ابن حجر عسقلانی اور دیگر آئمہ حدیث سولہ جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کو روایت کیا ہے جن میں سے بعض صحابہ کا یہ دعویٰ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تصریحات سینکڑوں صحابہ رضی اللہ عنہم کے مجمع میں خطبہ دے کر فرمائیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بغیر کسی انکار و اجنبیت کے ان روایات کو خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے دورِ خلافت میں علیٰ رؤس الاشہاد سناتے تھے۔ چنانچہ ان جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم سے جن ہزارہا شاگردوں نے سنا ان میں سے یہ عظیم المرتبہ ہستیاں قابل ذکر ہیں جن میں ہر فرد روایت حدیث میں ضبط و حفظ، ثقاہت و علمی تبحر کے پیش نظر امامت و قیادت کا درجہ رکھتا ہے: مثلاً سعید بن المسیب، نافع مولیٰ ابوقتادہ، حنظلہ بن علی الاسلمی، عبدالرحمٰن بن آدم، ابوسلمہ، ابوعمرہ، عطاء بن بشار، ابوسہیل، موثر بن غفارہ، یحییٰ بن ابی عمرو، جبیر بن نفیر، عروہ بن مسعود ثقفی، عبداللہ بن زید انصاری، ابوزرعہ، یعقوب بن عامر، ابونصرہ ابوالطفیل رحمہم اللہ۔

پھر ان علماء کبار اور محدثین اعلام سے جن بے شمار تلامذہ نے سنا ان میں سے راویان حدیث کے طبقہ میں جن کو حدیث اور علوم قرآن کا رتبہ بلند حاصل ہے اور جو اپنے اپنے وقت کے "امام الحدیث" اور "امیر المومنین فی الحدیث" تسلیم کیے گئے ہیں، بعض کے اسماء گرامی یہ ہیں: ابن شہاب زہری، سفیان بن عیینہ، لیث، ابن ابی ذئب، اوزاعی، قتادہ، عبدالرحمٰن بن ابی عمرہ، سہیل، جبلہ بن سہیم، علی بن زید، ابورافع، عبدالرحمٰن بن جبیر، نعمان بن سالم، معمر، عبداللہ بن عبیداللہ رحمہم اللہ۔

غرض ان روایات و احادیث صحیحہ کا صحابہ، تابعین، تبع تابعین یعنی خیر القرون کے طبقات میں اس درجہ شیوع ہو چکا تھا اور وہ بغیر کسی انکار کے اس درجہ لائق قبول ہو چکی تھیں کہ آئمہ حدیث کے نزدیک حضرت مسیح علیہ السلام کی حیات و نزول سے متعلق ان احادیث کو مفہوم و معنی کے لحاظ سے درجۂ "تواتر" حاصل تھا اور اسی لیے وہ بے جھجک اس مسئلہ کو "احادیث متواترہ" سے ثابت اور مسلم کہتے تھے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ روایت حدیث کے تمام طبقات و درجات میں ان روایات کو "تلقی بالقبول" کا یہ درجہ حاصل رہا ہے کہ ہر دور میں اس کے رواۃ میں "ائمہ حدیث" اور روایت حدیث کے "مدار" نظر آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان مرفوع و موقوف

---

❶ تفسیر ابن جریر ج ۵ ❷ کتاب الاسماء والصفات صفحہ ۳۰۱ و کنز العمال ج ۷ ص ۲۶۸

صحابہ رضی اللہ عنہم احادیث اور روایات کے ناقلین میں امام احمد، امام بخاری، امام مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ جیسے اصحاب صحیح و سنن، ائمہ حدیث کے اسماء گرامی شامل ہیں اور وہ باتفاق ان روایات کی صحت و حسن کے قائل ہیں، چنانچہ یہ اور اسی قسم کی احادیث صحیحہ کا ذکر کرتے ہوئے مشہور محدث و مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں اول یہ عنوان قائم کرتے ہیں:

ذکر الاحادیث الواردۃ فی نزول عیسٰی بن مریم (علیہما الصلٰوۃ والسلام) الی الارض من السماء فی اٰخر الزمان قبل یوم القیٰمۃ.

"ان احادیث کا ذکر جو حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے آسمان سے زمین پر اترنے کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔" [1]

اور اس کے بعد سلسلہ کی احادیث کو نقل کرنے کے بعد آخر میں یہ تحریر فرماتے ہیں:

فھذہ احادیث متواترۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من روایۃ ابی ھریرۃ و ابن مسعود و عثمان بن العاص و ابی امامۃ والنواس بن سمعان و عبداللہ بن عمرو بن العاص و مجمع بن حارثۃ و ابی شریحۃ و حذیفۃ بن اسید رضی اللہ عنہم و فیھا دلالۃ علٰی صفۃ نزولہ و مکانہ.... الخ [2]

"پس یہ ہیں وہ احادیث جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے درجہ تک منقول ہوئی ہیں اور یہ نقل روایت (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ) ابوہریرہ، ابن مسعود، عثمان بن العاص، ابوامامہ، نواس بن سمعان، عبداللہ بن عمرو بن العاص، مجمع بن حارثہ، ابی شریحہ، حذیفہ بن اسید رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے اور ان روایات میں عیسیٰ بن مریم کے طریقہ نزول اور مکان نزول سے متعلق بھی رہنمائی موجود ہے۔"

اور حافظ حدیث ابن حجر عسقلانی (نور اللہ مرقدہٗ) علامہ ابوالحسین آبری رحمۃ اللہ علیہ سے نزول عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق احادیث کے تواتر کو فتح الباری میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کرتے ہیں:

"ابوالحسن خسعی ابری سے منقول ہے کہ احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس بارہ میں تواتر کو پہنچ چکی ہیں کہ مہدی اسی امت میں سے ہوں گے اور عیسیٰ علیہ السلام ان کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔"

اور تلخیص الحبیر کتاب الطلاق کے ضمن میں یہ تحریر فرماتے ہیں:

قال ابوالحسن الخسعی الابری بان المھدی من ھذہ الامۃ و ان عیسٰی یصلّی خلفہ.... الخ

"لیکن رفع عیسیٰ علیہ السلام کا معاملہ تو تمام علماء حدیث و تفسیر کا اس پر اجماع ہے کہ وہ اپنے جسد عنصری کے ساتھ ہنوز زندہ ہیں (اور وہی قریب قیامت نازل ہوں گے)۔"

اور محدث عصر محقق وقت علامہ سید محمد انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ "عقیدۃ الاسلام" میں اس "تواتر" کی تائید میں یہ تحریر فرماتے ہیں:

وللمحدّث العلّامۃ الشوکانی رسالۃ سمّاھا التوضیح فی تواتر ماجاء فی المنتظر والدجال والمسیح ذکر

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۱ص ۵۸۳،۵۷۸

[2] حضرت استاذ کا یہ رسالہ اپنے موضوع میں بے نظیر تصنیف ہے، عربی زبان میں تحریر ہے اور علماء وطلبہ دونوں کے لئے لائق مطالعہ ہے۔ مصنف قصص القرآن اس سلسلہ کے اکثر مباحث میں اسی رسالہ کا خوشہ چین ہے۔

Marfat.com

فیہا تسعة و عشرین حدیثا فی نزوله علیه السّلام ما بین صحیح و حسن و صالح هذا و ازین منه مرفوع و اما الأثار فتفوت الاحصاء.... الخ

اور محدث علامہ شوکانی نے ایک رسالہ تصنیف کیا ہے جس کا نام یہ رکھا ہے "التوضیح فی التواتر ماجاء فی المنتظر والدجال والمسیح" اس رسالہ میں انہوں نے انتیس احادیث حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے متعلق نقل کی ہیں جو اصول حدیث کے لحاظ سے صحیح، حسن، صالح تینوں درجات کو شامل ہیں اور مرفوع احادیث اس تعداد سے بھی زیادہ موجود ہیں اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم تو بیشمار ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع سماوی اور حیات ونزول من السماء پر امت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ چنانچہ علم عقائد وکلام کی مشہور ومستند کتاب عقیدہ سفارینی میں امت کے اس اجماع کی تصریح موجود ہے۔

و منها ای من علامات السّاعة العظمی العلامة الثالثة ان ینزل من السّماء سید (المسیح) عیسٰی بن مریم (علیه السّلام) و نزوله ثابت بالکتاب و السنة و اجماع الامة و اما الاجماع فقد اجمعت الامة علی نزوله و لم یخالف فیه احد من اهل الشریعة و انما انکر ذٰلك الفلاسفة والملاحدة مما لا یعتد بخلافه. [1]

"اور علامات قیامت میں سے تیسری علامت یہ ہے کہ حضرت (مسیح علیہ السلام) عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) آسمان سے اتریں گے اور ان کا آسمان سے اترنا کتاب (قرآن) سنت (حدیث) اور اجماع امت سے قطعاً ثابت ہے (قرآن وحدیث سے نزول ثابت کرنے کے بعد فرماتے ہیں) جہاں تک اجماع امت کا تعلق ہے تو اس میں ذرا شبہ نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان سے نازل ہونے پر امت کا اجماع ہے اور اس بارہ میں پیروان شریعت اسلامی میں سے کسی ایک کا بھی خلاف موجود نہیں البتہ فلسفیوں اور ملحدوں نے نزول عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا ہے اور اسلام میں ان کا انکار قطعاً بے وقعت ہے۔"

حیات ونزول مسیح علیہ السلام کی حکمت:

گزشتہ سطور میں حیات نزول مسیح علیہ السلام کو دلائل و براہین کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے جو ایک منصف اور طالب حق کو علم یقین عطا کرتے ہیں، اب مزید طمانیت قلب کے لیے ان چند حکمتوں کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جن کو علماء حق نے اس سلسلہ میں بیان فرمایا ہے لیکن اس کے مطالعہ سے قبل یہ حقیقت بہرحال پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور اس کی مشیت کی مصلحتوں کا احاطہ عقل انسانی کے لیے ناممکن ہے اور مخلوق، خالق کائنات کے اسرار وحکم پر عبور بھی کیسے کر سکتی ہے؟ تاہم علماء امت، فراست مومن اور علم حق کی راہ سے دین اور احکام دین کے اسرار ومصالح پر قلم فرسائی کرتے اور اپنی محدود دسترس کے مطابق اس موضوع پر علمی حقائق کا اظہار کرتے آئے ہیں۔

---

[1] صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے تین زمانوں کو "خیر القرون" کہا جاتا ہے چونکہ نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تینوں کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے ((خیر القرون قرنی، ثم الذین یلونهم، ثم الذین یلونهم)) سب سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر ان لوگوں کا جو اس زمانہ سے قریب ہیں اور پھر ان کا جو اس دوسرے زمانہ سے متصل ہیں اور اس کے بعد فرمایا "پھر جھوٹ کی کثرت ہو جائے گی یعنی اس ہر سہ ادوار کے بعد اکثریت کے اندر دین انحطاط پیدا ہو جائے گا اور اسلامی خصوصیات اخلاق مٹ جائے گی۔

Marfat.com

اسلامی دور کی علمی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ دورِ اوّل میں علم الاسراء کی امامت کا شرف عمر بن الخطاب، علی بن ابی طالب اور صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہم کو حاصل تھا، اور اس کے بعد اگرچہ ہر ایک صدی میں دو چار علماء ربانی اس کے ماہر و محقق رہے ہیں لیکن خصوصیت کے ساتھ خلیفہ اموی عمر بن عبدالعزیز، امام ابوحنیفہ، علامہ عزالدین بن عبدالسلام مصری، حافظ ابن تیمیہ، امام غزالی، رومی، سید مرتضیٰ زبیدی اور شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہم اللہ کو اس علم سے خاص مناسبت تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں ان کو فطری ملکہ عطا فرمایا تھا۔

بہرحال حکمت کی حیثیت لطائف و نکات کی ہوتی ہے اور اس کو دلیل و حجت کا مرتبہ نہیں دیا جا سکتا اس لیے زیر بحث مسئلہ میں بھی "حکمت و مصلحت" کا ذکر اسی نقطہ نظر سے سمجھنا چاہیے۔ واللہ اعلم بالصواب و لکل شیء عندہ فصل الخطاب۔

① یہود بنی اسرائیل اپنی مذہبی کتابوں کی پیشین گوئیوں اور بشارتوں میں یہ پڑھ چکے تھے کہ ان کو دو شخصیتوں "مسیح ہدایت" اور "مسیح ضلالت" سے سابقہ پڑے گا، اس لیے وہ منتظر تھے کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد "مسیح ہدایت" کا ظہور کب ہوتا ہے لیکن شومیٔ قسمت کہ جب مسیح ہدایت کا ظہور ہوا تو انہوں نے بغض و حسد کی راہ سے اس کو "مسیح ضلالت" کہہ کر رد کر دیا اور صرف یہی نہیں بلکہ آمادۂ قتل ہو گئے اور چونکہ قتل انبیاء ان کا دستور رہا تھا اس لیے وہ اس پر ہر وقت جری رہتے تھے، پس جبکہ وہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح ان کے قتل کے بھی قائل ہو گئے تو یہ تعجب خیز بات نہ ہوئی کہ جب مسیح ضلالت (دجال) کا خروج ہو تو یہود اس کو مسیح ہدایت کہہ کر قومی حیثیت سے اس کے پیرو ہو جائیں کیونکہ مذہبی تعلیم کے پیش نظر ان پر مسیح ہدایت کا اتباع ضروری تھا اور جب وہ مسیح ہدایت کو مسیح ضلالت کہہ کر قتل کر چکے تو اب مسیح ضلالت کو ہی اس کے دعوے کے مطابق مسیح ہدایت تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے مگر مشیت الٰہی فیصلہ کر چکی تھی کہ مسیح ضلالت کی گمراہی کا فتنہ چونکہ عظیم الشان ہوگا اور وہ اول خدائی کا دعویٰ کرے گا اور اس کے بعد مسیح ہدایت بنے گا اس لیے اس کا خروج قیامت کے قریب ہی ہونا چاہیے جو دورِ فتن یعنی فتنوں کی آماجگاہ ہوگا اس لیے حکمت الٰہی کا یہ بھی منشاء ہوا کہ "مسیح ہدایت" کو یہود کے فتنہ سے اس طرح بچا لیا جائے کہ وہ اس کو ہاتھ بھی نہ لگا سکیں اور جب وہ وقت آ پہنچے کہ مسیح ضلالت اپنی گمراہی کا علم بلند کرے تو مسیح ہدایت ملاء اعلیٰ سے کائنات ارضی پر اترے اور یہود بنی اسرائیل جو کہ بہ تعداد کثیر مسیح ضلالت کے پیرو ہو رہے ہوں گے، اپنی آنکھوں سے حق و باطل کا مشاہدہ کر لیں اور جب مسیح ہدایت کے مقدس ہاتھوں سے مسیح ضلالت کا خاتمہ ہو جائے تو ﴿ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴾ حق الیقین بن کر ان کی نگاہوں کے سامنے آ جائے اور اس طرح قبول حق کے ماسواء ان کے لیے دوسرا چارۂ کار باقی ہی نہ رہے اور یا پھر وہ بھی مسیح ضلالت کے ساتھ "فی النار" کر دیے جائیں۔

نیز یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ ادیان و ملل کی تاریخ میں صرف یہود ہی ایک ایسی جماعت ہے جس نے اپنے انبیاء علیہم السلام کے خون ناحق سے ہاتھ رنگے تھے وہ صرف "نبی" ہی تھے جو ﴿علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل﴾ کے مصداق تھے مگر کوئی صاحب شریعت رسول ان کے اس قتل ناحق کا مظلوم نہیں بنا تھا اس لیے یہ پہلا موقعہ تھا کہ انہوں نے ایک جلیل القدر رسول (عیسیٰ بن مریم علیہما السلام) کو قتل کرنے کا نہ صرف ارادہ کیا بلکہ دنیوی اسباب کے لحاظ سے مکمل تیاری کر لی تھی تب مشیت حق نے یہ فیصلہ کیا کہ مسیح ہدایت کو اس طرح بچا لیا جائے کہ خود یہود کو بھی محسوس ہو جائے کہ وہ مسیح بن مریم علیہما السلام پر دسترس نہ پا سکے، لہٰذا فیصلہ مشیت بروئے کار آیا اور حضرت مسیح علیہ السلام کو ملاء اعلیٰ کی جانب اٹھا لیا گیا اور تمام دنیوی اسباب ہیچ ہو کر رہ گئے لیکن اس احساس کے باوجود چونکہ حقیقت

Marfat.com

کو قتل کر دیا۔ ادھر متبعین مسیح ہدایت (نصاریٰ) کی بدبختی دیکھئے کہ کچھ عرصہ کے بعد پولوس رسول نے ان میں عقیدۂ تثلیث و کفارہ کی بدعت پیدا کر کے یہود کے گھڑے ہوئے افسانہ صلیب کو بھی داخل عقیدہ کر دیا اور اب یہود و نصاریٰ دونوں جماعتیں اس گمراہی میں مبتلاء ہو گئیں کہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام صلیب پر چڑھا کر قتل کر دیئے گئے۔ تب قرآن عزیز نے نازل ہو کر حق و باطل کے درمیان فیصلہ سنایا اور حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق دونوں جماعتوں نے جو دو الگ الگ رخ اختیار کیے تھے اور پھر ایک مسئلہ میں دونوں کا اتفاق بھی ہو گیا تھا ان سب کے متعلق علم یقین کے ذریعہ حقیقت حال کو واشگاف اور دونوں گمراہیوں کو واضح کر کے قبول حق کے لیے دعوت دی مگر جماعتی حیثیت سے دونوں نے انکار کر دیا اور حضرت مسیح علیہ السلام سے متعلق اپنے اپنے گمراہ کن عقیدہ پر قائم رہے مگر عالم الغیب والشہادۃ چونکہ ان حقائق کا ان کے وقوع سے قبل عالم و دانا تھا اس لیے اس کی حکمت کا یہ بھی تقاضا ہوا کہ مسیح ہدایت کو کائنات ارضی پر اس وقت دوبارہ بھیجا جائے جب مسیح ضلالت کا بھی خروج ہو چکے تا کہ یہود و نصاریٰ کے سامنے حقیقت حال مشاہدہ کے درجہ میں روشن ہو جائے یہود آنکھوں سے دیکھ لیں کہ جس کے قتل کے مدعی تھے قدرت الٰہی کے کرشمے کی بدولت وہ بقید حیات موجود ہے اور نصاریٰ نادم ہوں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی سچی پیروی چھوڑ کر جو گمراہ کن عقیدہ اختیار کیا تھا وہ سرتاپا باطل اور ہیچ تھا اور اس طرح ہدایت و ضلالت کے معرکہ میں حق کی سربلندی اور باطل کی پستی کا دونوں مشاہدہ کر کے قرآن عزیز کی تصدیق پر مجبور ہو جائیں اور دونوں جماعتیں "ایمان حق" کو برضاء و رغبت اختیار کر لیں اور اپنے باطل عقائد پر شرمسار و سرنگوں ہو جائیں۔ اور چونکہ ان دونوں جماعتوں کے علاوہ ہدایت و ضلالت کا یہ مشاہدہ و مظاہرہ دوسرے اہل باطل بھی کریں گے اس لیے وہ بھی حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں گے اور اس طرح احادیث صحیحہ کے مطابق اس زمانہ میں کائنات ارضی کا صرف ایک ہی مذہب ہوگا اور وہ "اسلام" ہوگا۔

حال تک نہ پہنچ سکے اور ظن و گمان ہی کے قعر میں پڑے رہے گو اپنی بات رکھنے کے لیے مشہور یہی کرتے رہے کہ ہم نے مسیح بن مریم علیہما السلام

④ ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝﴾

(الفتح: ۲۸)

ادیان و ملل کی تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور معاندین حق کے درمیان "سنت اللہ" کے دو مستقل دور رہے ہیں۔ پہلا دور حضرت نوح علیہ السلام سے شروع ہو کر حضرت لوط علیہ السلام پر ختم ہوتا ہے اس دور میں سنت اللہ یہ رہی کہ جب قوموں نے اپنے پیغمبروں کی صدائے حق پر کان نہ دھرا بلکہ برابر اس کا تمسخر کرتی اور اس کے پیغام حق کے آڑے آتی رہیں، تب اللہ تعالیٰ کے عذاب نے ان کو ہلاک کر دیا اور دوسروں کے لیے ان کو باعث عبرت و بصیرت بنا دیا اور دوسرا دور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شروع ہو کر خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا ہے اس دور میں سنت اللہ کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ جب اعداء حق اور دشمنان دین قویم نے کلمہ حق کی مخالفت پر اصرار کیا اپنے پیغمبروں کو ایذا دی اور ان کے ساتھ تمسخر کو اپنا نصب العین بنا لیا تو اللہ تعالیٰ نے ان قوموں کو ہلاک کرنے کی بجائے اپنے پیغمبروں کو یہ حکم دیا کہ وہ خدا کی راہ میں وطن چھوڑ دیں اور ہجرت کر جائیں، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے پیغمبر ہیں جنہوں نے قوم [1] کے سامنے یہ اعلان کیا:

---

[1] یہ حضرت ابراہیم کی اپنی قوم نہیں تھی اس لئے کہ یہ نبی سام (سامی) تھے اور نماردہ عراق اور ان کی قوم بنی حام (حامی) تھے۔

Marfat.com

﴿ إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَىٰ رَبِّي ۖ إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴾ (عنکبوت: ۲۶)

اور عراق سے شام کی جانب ہجرت فرما گئے۔

پھر یہی صورت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیش آئی اور وہ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے شام کو ہجرت کر گئے مگر فرعون اور اس کے لشکریوں نے چونکہ مزاحمت کی اور ہجرت کے بھی آڑے آئے اس لیے وہ بحر قلزم میں غرق کر دیئے گئے۔

اور یہی صورت نبی اکرم ﷺ کو پیش آئی کہ جب قریش مکہ نے اذیت، تمسخر، دین حق کے ساتھ تصادم، اعمال دین کی مزاحمت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تب مشیت الٰہی کا فیصلہ ہوا کہ آپ ﷺ مکہ سے مدینہ کو ہجرت کر جائیں، چنانچہ ہر قسم کی نگرانی اور مکان کے ہر طرف محاصرہ کے باوجود کرشمہ قدرت سے آپ ﷺ محفوظ و مامون مدینہ ہجرت کر گئے۔

"سنت اللہ" کے اسی دور میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی اور ان کی قوم بنی اسرائیل نے ان کے ساتھ اور ان کی دعوت حق کے ساتھ بھی وہ سب کچھ کیا جو معاندین حق اور دشمنان دین اپنے پیغمبروں کے ساتھ کرتے رہے تھے اور ان میں ایک یہ خصوصیت زیادہ تھی کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام سے قبل چند انبیاء کو قتل تک کر چکے تھے اور اب حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل کے درپے تھے، اسی کے ساتھ یہ مسطورۂ بالا حقیقت بھی فراموش نہیں رہنی چاہیے کہ یہود مسیح ہدایت اور مسیح ضلالت دو مسیح کے منتظر تھے اور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو مسیح ضلالت قرار دے کر آج بھی مسیح ہدایت کے منتظر ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کا یہ فیصلہ ہوا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی ہجرت، کائنات ارضی کی بجائے ملاء اعلیٰ کی جانب ہو تاکہ مقررہ وقت آنے پر وہ مسیح ہدایت اور مسیح ضلالت کے درمیان مشاہدہ سے امتیاز کر سکیں اور ایک جانب اگر مسیح ہدایت کو مسیح ہدایت سمجھیں تو دوسری جانب قرآن کے فیصلہ حق کی صداقت وحقانیت کو دیکھ کر دین حق "اسلام" کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں اور ساتھ ہی نصاریٰ کو بھی اپنی جہالت اور یہود کی کورانہ تقلید پر ندامت ہو اور وہ بھی تعلیم قرآن کی صداقت پر یقین واعتقاد کے ساتھ شہادت دینے پر آمادہ ہو جائیں۔

کچھ عجیب صورت حال ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اور خاتم الانبیاء محمد کریم ﷺ کے درمیان دعوت وتبلیغ حق، اور معاندین کی جانب سے حق کی معاندت ومخالفت، اور پھر اس کے نتائج وثمرات میں بہت ہی زیادہ مشابہت پائی جاتی ہے دونوں کی اپنی قوم نے دونوں کو جھٹلایا دونوں کی قوموں نے سازش قتل کے بعد مکانوں کا محاصرہ کیا قدرت حق کے کرشمۂ اعجاز نے دونوں کو دشمنوں کی دسترس سے ہر طرح محفوظ رکھا، دونوں کے لیے ہجرت کا معاملہ پیش آیا، البتہ نبی اکرم ﷺ کی چونکہ بعثت عامہ تھی اور اس کی دعوت وتبلیغ کے لیے ذات اقدس ﷺ کا کرۂ ارضی پر قیام مسلسل ضروری تھا، اس لیے مکہ سے مدینہ کو ہجرت کا حکم ہوا اور عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام چونکہ قوم کو دعوت حق پہنچا چکے تھے اور ایک خاص مقصد عظیم کے پیش نظر ان کا مدت مدید کے بعد کائنات ارضی پر موجود ہونا ضروری تھا اس لیے ان کو ہجرت ارضی کی بجائے ہجرت سماوی پیش آئی پھر جس طرح نبی اکرم ﷺ نے اپنے زمانہ کے قائد ضلالت "امیہ بن خلف" کو اپنے حربہ سے قتل کیا، عیسیٰ بن مریم علیہما السلام بھی اپنی قوم کے مسیح ضلالت دجال کو قتل کریں گے اور جس طرح نبی اکرم ﷺ کو ہجرت کے بعد آپ ﷺ کے وطن مکہ پر قدرت حق نے اقتدار عطا فرما دیا، عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کا نزول بھی شام ہی کے اس مشہور شہر میں ہوگا جس سے اپنی قوم کی معاندانہ سازشوں کی بناء پر ملاء اعلیٰ کی جانب ہجرت پیش آئی تھی اور بیت المقدس، دمشق اور شام کے پورے ملک پر

یہود کے علی الرغم ان کی حکومت ہوگی۔ ①

③ حضرت مسیح علیہ السلام سے پہلے قتل انبیاء علیہم السلام نے یہود کو اس درجہ گستاخ اور بے باک بنا دیا تھا کہ وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ کسی ہستی کے متعلق یہ فیصلہ کہ وہ نبی صادق ہے یا متنبی کاذب ہمارے ہاتھ میں ہے اور جس کو ہم اور ہمارے فقیہ "کاذب" قرار دے دیں وہ واجب القتل ہے۔ چنانچہ اسی زعم باطل میں انہوں نے عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو مسیح ضلالت کہا اور ان کے فقیہوں نے قتل کا فتویٰ صادر کر دیا۔ حالانکہ وہ جلیل القدر ہستی تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل میں اس پایہ کا کوئی پیغمبر مبعوث ہی نہیں ہوا تھا اور اس نے جدید پیغام حق (انجیل) کے ذریعہ روحانیت کی مردہ کھیتی میں دوبارہ جان ڈال دی تھی، تب اللہ تعالیٰ کی مشیت کا فیصلہ ہوا کہ ہمیشہ کے لیے بنی اسرائیل کے اس زعم باطل کو پاش پاش کر دیا جائے اور دکھا دیا جائے کہ رب العالمین، خالق کائنات جس کی حفاظت کا وعدہ کر لے کائنات کی کوئی ہستی یا مجموعہ کائنات بھی اس پر دسترس نہیں پا سکتی چنانچہ ید قدرت نے اس وقت اس مقدس ہستی کو جسد عنصری کے ساتھ ملاء اعلیٰ کی جانب اٹھا لیا جبکہ مکان کے محاصرہ کے ساتھ دشمنوں نے اس کی حفاظت جان کے تمام وسائل دنیوی مسدود کر دیے تھے۔

پھر اس واقعہ نے ایک نئی صورت پیدا کر دی وہ یہ کہ مذاہب کی تاریخ میں صرف حضرت مسیح علیہ السلام ہی کی شخصیت ایسی ہے جن کے قتل و عدم قتل کے متعلق حق و باطل کے درمیان سخت اختلاف پیدا ہوا اور یہود و نصاریٰ کے باہم واقعہ صلیب و قتل پر اتفاق کے باوجود دو باطل اور متضاد عقائد کی کشمکش نظر آنے لگی۔ یہود قتل و صلیب کی وجہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک وہ مسیح ضلالت تھے اور نصاریٰ وجہ صلیب یہ بتاتے ہیں کہ وہ خدا کے بیٹے تھے جو کائنات کے گناہوں کا کفارہ بننے کے لیے بھیجے گئے تھے تاکہ پاپی دنیا پاپ سے پاک ہو جائے اور صدیوں بعد جب قرآن نے "امر حق" کو واضح اور مسیح بن مریم علیہما السلام سے متعلق حقیقت حال کو روشن کیا تب بھی دونوں جماعتوں نے جماعتی حیثیت سے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ لہٰذا قدرت حق کا فیصلہ ہوا کہ خود مسیح بن مریم علیہما السلام ہی وقت موعود پر نازل ہو کر قرآن کے فیصلہ کی تصدیق کر دیں اور یہود و نصاریٰ کے باطل عقائد کا خود بخود اس طرح خاتمہ ہو جائے اور اس کے بعد مدعیان اہل کتاب کو شرک و باطل کی پیروی کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رہے اور خدا کی حجت ان پر تمام ہو جائے۔

نیز جبکہ اللہ تعالیٰ نے کائنات ہست و بود کے لیے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ خدا کی ہستی کے ماسوا ہر ایک وجود کو فنا اور موت ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ﴾ .... ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ﴾ اور یہ ظاہر ہے کہ ملاء اعلیٰ اور عالم قدس مقام موت نہیں ہے بلکہ مقام حیات ہے اس لیے از بس ضروری ہے کہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام بھی موت کا ذائقہ چکھیں اور اس کے لیے کائنات ارضی اتریں تاکہ زمین کی امانت زمین ہی کے سپرد ہو اس لیے "حیات و رفع" کے بعد "نزول ارضی" مقدر ہوا۔ ②

علماء حق نے حیات و نزول عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق جو "اسرار و حکم" بیان فرمائے ہیں یہاں ان کا احاطہ مقصود نہیں ہے اس مختصر چند حکمتوں کا ذکر کر دیا گیا ورنہ محدث عصر علامہ سید محمد انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ نے اس سلسلہ میں ایک طویل مقالہ ع... الاسلام میں سپرد قلم فرمایا ہے جو لائق مطالعہ ہے حضرت استاد نے نہایت لطیف مگر دقیق پیرایہ بیان میں کائنات عالم کو "انسان کب...

① خلاصہ از عقیدۃ الاسلام ② فتح الباری ج ۶

Marfat.com

انسان کو "عالم صغیر" قرار دے کر ان ہر دو عالم کی حیات و موت پر جو بحث فرمائی ہے اس سے حضرت مسیح علیہ السلام کے رفع اور قرب قیامت میں کائنات ارضی کی جانب رجوع کی حکمت بہت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے لیکن یہ کتاب چونکہ اس دقیق بحث کی متحمل نہیں ہے اس لیے اپنی جگہ قابل مراجعت ہے۔

آخر میں اب اپنی جانب سے چند جملے اس سلسلہ میں اضافہ کر کے اس مبحث کو ختم کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

④ قرآن عزیز میں "میثاق انبیاء" سے متعلق یہ ارشاد باری ہے:

﴿وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝۸۱﴾ (آل عمران: ۸۱)

"اور وہ وقت قابل ذکر ہے جبکہ اللہ نے نبیوں سے (یہ) عہد لیا کہ جب تمہارے پاس (خدا کی جانب سے) کتاب اور حکمت آئے پھر ایسا ہو کہ تمہاری موجودگی میں ایک رسول (محمد ﷺ) آئے جو تصدیق کرتا ہوا ان کتابوں کی جو تمہارے پاس ہیں ضرور تم اس پر ایمان لانا اور ضرور اس کی مدد کرنا، اللہ نے کہا: کیا تم نے اقرار کیا؟ انہوں نے جواب دیا ہاں ہم نے اقرار کیا، اللہ نے کہا: پس تم اپنے اس عہد پر گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔"

آل عمران کی ان آیات میں حسب تفسیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما [1] اس عہد و پیان کا تذکرہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ازل میں خاتم الانبیاء محمد ﷺ کے متعلق انبیاء و رسل علیہم السلام سے لیا، قرآن کے اسلوب بیان کے مطابق اگرچہ یہ خطاب انبیاء و رسل کی معرفت ان کی امتوں سے تھا کہ ان میں سے جو امتیں خاتم الانبیاء ﷺ کا زمانہ مبارک پائیں تو ان پر ایمان لائیں اور دعوت حق میں ان کی نصرت و یاری کریں۔ چنانچہ ہر ایک پیغمبر نے اپنے اپنے دور میں تعلیم حق کے ساتھ ساتھ خدا کے اس وعدہ کو بھی یاد دلایا اور ان میں سے اہل حق نے وعدہ دیا اور اقرار کیا کہ ضرور ان پر ایمان لائیں گے اور پیغام حق میں ان کی مدد کریں گے۔

تو یہ "میثاق النبیین" اگرچہ اس طرح پورا ہوتا رہا تاہم ازل میں چونکہ اس عہد و میثاق کے اول مخاطب حضرات انبیاء و رسل تھے اس لیے اس میثاق کی عملی حیثیت کا تقاضا تھا کہ خود انبیاء و رسل میں سے بھی کوئی نبی یا رسول اس عہد و میثاق کا عملی مظاہرہ کر کے دکھائے تاکہ یہ خطاب اولین براہ راست بھی مؤثر ثابت ہو مگر ﴿ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ﴾ میں بقاعدۂ عربیت خطاب تھا ان تمام انبیاء و رسل سے جو ذات اقدس ﷺ سے پہلے اس کائنات ارضی میں مبعوث ہونے والے تھے کیونکہ ازل ہی میں محمد ﷺ کے لیے یہ مقرر ہو چکا تھا ﴿وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ﴾ پس محمد ﷺ کی صفت "خاتم النبیین" اور ازل سے مقدر "میثاق النبیین" کا

---

[1] عن علي و ابن عباس في تفسيز أيه ما بعث الله نبيا من الانبياء الا اخذ عليه الميثاق لئن بعث الله محمدا و هو حي ليؤمنن به ولينصرنه وامره ان ياخذ الميثاق على امته لئن بعث محمد و هم احياء ليؤمنن به ولينصرنه. (تفسیر ابن کثیر ج ۱)
اللہ تعالیٰ نے انبیاء میں سے جس نبی کو بھی کسی قوم کی رشد و ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا تو اس سے یہ عہد ضرور لیا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی اس وقت زندہ ہو جبکہ محمد ﷺ کی بعثت ہوگی تو تم ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور اس کی مدد کرنا اور ان سے یہ بھی کہا کہ وہ اپنی اپنی امتوں سے بھی یہی عہد و پیان لیں کہ ان میں سے جو اس وقت موجود ہوں وہ اس پر ایمان لائیں اور اس کی مدد کریں۔

Marfat.com

اجتماع صرف اسی ایک شکل میں ممکن تھا کہ انبیاء سابقین میں کوئی ایک پیغمبر بعثت محمد ﷺ کے بعد نزول فرمائیں اور وہ اور ان کی امت دنیاء انسانی کے سامنے خاتم الانبیاء ﷺ پر ایمان لائیں اور "دین حق" کی مدد و نصرت کا مظاہرہ کریں تاکہ ﴿لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ﴾ کا وعدہ حق پورا ہو۔

گذشتہ صفحات میں یہ حقیقت بخوبی عیاں ہو چکی ہے کہ اگرچہ تمام انبیاء و رسل اپنے اپنے زمانہ میں محمد ﷺ کی بشارات دیتے چلے آتے تھے لیکن یہ خصوصیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کے حصہ میں آئی کہ وہ ذات اقدس ﷺ کی بعثت کے لیے تمہید اور براہ راست منادی و مبشر بنے اور بنی اسرائیل کو تعلیم حق دیتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا:

﴿اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَىَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِىْ مِنْۢ بَعْدِى اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ﴾ (سورۃ الصف: ٦)

اور حقیقت یہ ہے کہ خاتم انبیاء بنی اسرائیل ہی کا یہ حق تھا کہ وہ خاتم الانبیاء والرسل کی بعثت کا "مناد" اور "مبشر" ہو اس لیے حکمت ربانی کا یہ فیصلہ ہوا کہ میثاق النبیین کے وقار کے لیے ان ہی کو منتخب کیا جائے اور اس معاملہ میں وہی تمام انبیاء و رسل کی نمائندگی کریں تاکہ امتوں کی جانب سے ہی نہیں بلکہ براہ راست انبیاء و رسل کی جانب سے وفاء عہد کا عملی مظاہرہ ہو سکے، اسی حقیقت کے پیش نظر نبی اکرم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا:

((انا اولی الناس بعیسی ابن مریم والانبیاء اولاد علات لیس بینی و بینه نبی)).

مگر قرآن چونکہ خدا کا آخری پیغام ہے اور ﴿اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ کے وعدۂ الٰہی نے رہتی دنیا تک اس کو تحریف سے محفوظ کر دیا ہے اس لیے قدرتی طور پر اس کی تعلیم کے ثمرات دوسرے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے مقابلہ میں مدت طویل تک اپنا کام کرتے رہیں گے اور اس کی روشنی سے قلوب کو گرمانے اور اطاعت ربانی کے لیے مشتعل کرنے کے لیے علماء امت انبیاء بنی اسرائیل کی طرح خدمت حق انجام دیتے رہیں گے۔ لیکن جب بعثت محمد ﷺ کو گزرے ہوئے بہت ہی طویل عرصہ ہو جائے گا اور امت مرحومہ کے عملی قومی اور اجتماعی اعضاء میں انتہائی اضمحلال پیدا ہو کر یہ کیفیت ہو جائے گی کہ ان کی بیداری اور تیز روی کے لیے صرف علماء حق کی روحانیت ہی کافی ثابت نہیں ہو گی وہ وقت اس کا متقاضی ہو گا کہ کوئی "قائم بالحجۃ" ان کو سنبھالے اور اس لیے مشیت الٰہی نے مقدر کیا کہ جو ہستی عیسیٰ بن مریم علیہ السلام انبیاء و رسل کے میثاق ازل کی نمائندگی کے لیے مامور ہے اس کا ایسے ہی وقت نزول ہو اور وہ امت محمد ﷺ کے درمیان رہ کر ذات اقدس ﷺ کی نیابت اور امت کی امامت کا فرض انجام دے اور ﴿لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ﴾ کا عملی مظاہرہ کر کے دکھائے۔

اب کرشمہ قدرت دیکھیے کہ ازل کے ان مقدرات نے جو کہ ملاء اعلیٰ سے تعلق رکھتے تھے کائنات ارضی میں کس طرح اپنی بساط بچھائی؟ بنی اسرائیل اپنے جلیل القدر پیغمبر کے قتل کے لیے سازش مکمل کر چکے ہیں شاہی دستہ چہار جانب سے مکان کو محصور کیے ہوئے ہے مگر قدرت حق اپنا کام اس طرح نہیں کرتی کہ معجزانہ کرشمہ کے ذریعہ ان کو محفوظ وہاں سے نکال کر خدا کی وسیع زمین کے دوسرے حصہ میں "ہجرت" کرا دیتی نہیں بلکہ ہوا یہ کہ ان کو ملاء اعلیٰ کی ہجرت کے لیے محفوظ و مامون زندہ اٹھا لیا اور سازش و محصور

Marfat.com

کرنے والوں کو ظن وریب کی دلدل میں پھنسا کر ان کے لیے خسر الدنیا والآخرۃ کا نشان عطاء کر دیا اور پھر ارضی انسان کے ارضی احکام کے لیے وہ وقت مقرر کر دیا جو "میثاق النبیین" کی نمائندگی کے لیے موزوں تھا، یہی ہے وہ حقیقت جس کو زبان وحی ترجمان نے اس طرح ظاہر فرمایا: "والذی نفسی بیدہ لیوشکن ان ینزل فیکم ابن مریم حکما عدلا" اور اسی کو نص قرآن نے یوں واضح کیا ہے: ﴿وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ﴾۔

پھر یہ ہستی میثاق انبیاء ورسل کی نمائندگی کا اس طرح حق ادا کرے گی کہ جب اس کا نزول ہوگا تو اس کرشمہ قدرت کو دیکھ کر مسلمانوں کے قلوب تصدیق قرآن اور تازگی ایمان سے روشن ہو جائیں گے اور وہ حق الیقین کے درجہ میں یقین کریں گے کہ بلاشبہ راہ مستقیم صرف اسلام ہی ہے اور مخبر صادق کی جس طرح یہ خبر صادق نکلی عالم غیب سے متعلق اس کی تمام خبریں اسی طرح حق اور بلاشبہ حق ہیں اور نصاریٰ بحیثیت قوم اپنے باطل عقیدۂ تثلیث وکفارہ پر نادم وشرمسار ہوں گے اور قرآن اور محمد ﷺ پر ایمان لانے کو اپنے لیے راہ نجات اور راہ سعادت یقین کریں گے اور یہود جب مسیح ہدایت اور مسیح ضلالت کے معرکہ حق و باطل کا مشاہدہ کر لیں گے اور مسیح ہدایت کے نزول سے اپنے دعوائے قتل وصلیب کے ملعون عقیدہ کو باطل پا لیں گے تو اب ان کو بھی "ایمان بالحق" کے سواء کوئی چارۂ کار نہیں رہے گا اور مسیح ضلالت کے رفقاء کے علاوہ وہ سب ہی "مسلم" بن جائیں گے یہی ہے قرآن کی وہ خبر صادق ﴿وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ﴾ مسلمانوں میں ایمان کی تازگی وشگفتگی نصاریٰ اور یہود میں تبدیلی عقائد کا حیرت انگیز انقلاب دیکھ کر اب مشرک جماعتوں پر بھی قدرتی اثر پڑے گا اور ساتھ ہی خدا کے مقدس پیغمبر کے زبردست روحانی اثرات کارفرما ہوں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بھی حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں گے اور اس طرح وحی ترجمان حامل قرآن محمد ﷺ کا یہ ارشاد اپنی صداقت کو نمایاں کرے گا۔ ویدعوالناس الی الاسلام ویھلک اللہ فی زمانہ الملل کلھا الا السلام ویھلک اللہ فی زمانہ الدجال.

اس تفصیل سے یہ بھی روشن ہو گیا کہ قرآن اور احادیث کی تصریحات ثابت کر رہی ہیں کہ اگر اس فرض کی انجام دہی کے لیے کوئی جدید نبی مبعوث ہوتا تو ایک جانب نبی اکرم ﷺ کا خصوصی شرف "خاتم النبین" باقی نہ رہتا اور دوسری جانب "میثاق النبیین" کے خطاب اوّلین کا عملی مظاہرہ عالم وجود میں نہ آتا کیونکہ وہ ہستی بہرحال محمد ﷺ کی امت ہی میں سے ہوتی۔ البتہ سابقہ نبی کی آمد نقلاً اور عقلاً دونوں حیثیت سے شرف خصوصی "خاتم النبین" کے لیے بھی قادح نہیں ہے اور "میثاق النبیین" کو بھی پورا کرتی ہے۔

واقعات نزول صحیح احادیث کی روشنی میں:

گذشتہ صفحات میں نزول عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق جو صحیح احادیث ذکر کی گئیں اور ان سے اور بعض دوسری صحیح احادیث سے جو تفصیلات ظاہر ہوتی ہیں ان کو ترتیب کے ساتھ یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

قیامت کا دن اگرچہ معین ہے مگر ذات باری کے ماسواء کسی کو اس کا علم نہیں ہے اور اس کا وقوع اچانک ہوگا ﴿عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾ اور قیامت کا علم خدا ہی کو ہے ﴿حَتّٰۤى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً﴾ حتیٰ کہ ان پر اچانک قیامت کی گھڑی آ جائے گی ﴿لَا تَاْتِیْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً﴾ "قیامت ان پر نہیں آئے گی مگر اچانک" اور حدیث جبرئیل علیہ السلام میں ہے:

((ما المسئول عنها باعلم من السائل))

"(جبرئیل علیہ السلام نے کہا) قیامت کے بارہ میں آپ سے زیادہ مجھے بھی علم نہیں جو اجمالی علم آپ کو ہے اسی قدر مجھ کو بھی ہے۔"

Marfat.com

اور ایک اور حدیث میں ہے:

((سمعت رسول اللہ ﷺ یقول قبل ان یموت بشھر: تساء لون عن الساعة و انما علمھا عند اللہ)).

”تم مجھ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہو تو اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے“۔

البتہ قرآن عزیز اور احادیث صحیح نے چند ایسی علامات بیان کی ہیں جو قیامت کے قریب پیش آئیں گی اور ان سے صرف اس کے نزدیک ہو جانے کا پتہ چل سکتا ہے، ان ”اشراط ساعت“ میں سے ایک بڑی علامت حضرت مسیح علیہ السلام کا ملاء اعلیٰ سے نزول ہے جس کی تفصیلات یہ ہیں:

”مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان سخت معرکہ جنگ برپا ہو رہا ہوگا اور مسلمانوں کی قیادت و امامت سلالہ رسول اللہ ﷺ میں سے ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہوگی جس کا لقب ”مہدی“ ہوگا اس معرکہ آرائی کے درمیان ہی میں مسیح ضلالت ”دجال“ کا خروج ہوگا یہ نسلاً یہودی اور یک چشم ہوگا کرشمہ قدرت نے اس کی پیشانی پر (ک، ا، ف، ر) کافر لکھ دیا ہوگا جس کو اہل ایمان فراست ایمانی سے پڑھ سکیں گے اور اس کے دجل و فریب سے جدا رہیں گے۔ یہ اوّل خدائی کا دعویٰ کرے گا اور شعبدہ بازوں کی طرح شعبدے دکھا کر لوگوں کو اپنی جانب توجہ دلائے گا مگر اس سلسلہ کو کامیاب نہ دیکھ کر کچھ عرصہ کے بعد مسیح ہدایت ہونے کا مدعی ہوگا یہ دیکھ کر یہود بکثرت بلکہ قومی حیثیت سے اس کے پیرو ہو جائیں گے اور یہ اس لیے ہوگا کہ یہود مسیح ہدایت کا انکار کر کے ان کے قتل کا ادعاء کر چکے ہیں اور مسیح ہدایت کی آمد کے آج تک منتظر ہیں اسی حالت میں ایک روز دمشق (شام) کی مسجد جامع میں مسلمان منہ اندھیرے نماز کے لیے جمع ہوں گے نماز کے لیے اقامت ہو رہی ہوگی اور مہدی موعود امامت کے لیے مصلے پر پہنچ چکے ہوں گے کہ اچانک ایک آواز سب کو اپنی جانب متوجہ کر لے گی مسلمان آنکھ اٹھا کر دیکھیں گے تو سپید بادل چھایا ہوا نظر آئے گا اور تھوڑے سے عرصہ میں یہ مشاہدہ ہوگا کہ عیسیٰ علیہ السلام دو زرد حسین چادروں میں لپٹے ہوئے اور فرشتوں کے بازوؤں پر سہارا دیئے ہوئے ملاء اعلیٰ سے اتر رہے ہیں فرشتے ان کو مسجد کے منارہ شرقی پر اتار دیں گے اور واپس چلے جائیں گے اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تعلق کائنات ارضی کے ساتھ دوبارہ وابستہ ہو جائے گا اور وہ عام قانون فطرت کے مطابق صحن مسجد میں اترنے کے لیے سیڑھی کے طالب ہوں گے فوراً تعمیل ہوگی اور وہ مسلمانوں کے ساتھ نماز کی صفوں میں آ کھڑے ہوں گے مسلمانوں کا امام (مہدی موعود) از راہ تعظیم پیچھے ہٹ کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے امامت کی درخواست کرے گا۔ آپ فرمائیں گے کہ یہ اقامت تمہارے لیے کہی گئی ہے اس لیے تم ہی نماز پڑھاؤ۔ فراغت نماز کے بعد اب مسلمانوں کی امامت حضرت مسیح علیہ السلام کے ہاتھوں میں آ جائے گی اور وہ حربہ لے کر مسیح ضلالت (دجال) کے قتل کے لیے روانہ ہو جائیں گے اور شہر پناہ کے باہر اس کو باب لد پر مقابل پائیں گے دجال سمجھ جائے گا کہ اس کے دجل اور زندگی کے خاتمہ کا وقت آ پہنچا اس لیے خوف کی وجہ سے رانگ کی طرح پگھلنے لگے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آگے بڑھ کر اس کو قتل کر دیں گے اور پھر جو یہود دجال کی رفاقت میں قتل سے بچ جائیں گے وہ اور عیسائی سب اسلام قبول کر لیں گے اور مسیح ہدایت کی پیروی کے لیے مسلمانوں کے شانہ بشانہ کھڑے نظر آئیں گے اس کا اثر مشرک جماعتوں پر بھی پڑے گا اور اس طرح اس زمانہ میں اسلام کے ماسوا کوئی مذہب باقی نہیں رہے گا۔

ان واقعات کے کچھ عرصہ بعد یاجوج ماجوج کا خروج ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام مسلمانوں کو اس

Marfat.com

سے محفوظ رکھیں گے، حضرت مسیح علیہ السلام کا دورِ حکومت چالیس [1] سال رہے گا اور اس درمیان میں وہ ازدواجی زندگی بسر کریں گے اور ان کے دورِ حکومت میں عدل و انصاف اور خیر و برکت کا یہ عالم ہوگا کہ بکری اور شیر ایک گھاٹ پر پانی پئیں گے اور بدی اور شرارت کے عناصر دب کررہ جائیں گے۔ [2]

وفات مسیح علیہ السلام :

چالیس سالہ دورِ حکومت کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کا انتقال ہو جائے گا اور نبی اکرم ﷺ کے پہلو میں دفن ہوں گے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں ہے:

((فیمکث اربعین سنة ثم یتوفی و یصلی علیه المسلمون و یدفنونه)). [3]

"پھر وہ کائنات ارضی پر اتر کر چالیس سال قیام کریں گے اور اس کے بعد وفات پا جائیں گے اور مسلمان ان کے جنازہ کی نماز پڑھیں گے اور ان کو دفن کر دیں گے۔"

اور ترمذی نے بسند حسن محمد بن یوسف بن عبداللہ بن سلام کے سلسلہ سے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے:

((قال مکتوب فی التوراة صفة محمد و عیسی ابن مریم یدفن معه)). [4]

"عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے فرمایا تورات میں محمد ﷺ کی صفت (حلیہ و سیرت) مذکور ہے اور یہ بھی مسطور ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام ان کے ساتھ (پہلو میں) دفن ہوں گے۔"

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا :

سورۂ مائدہ میں حضرت مسیح علیہ السلام کے مختلف حالات کا تذکرہ کیا گیا ہے پھر آخر سورہ بھی ان ہی کے تذکرہ پر ختم ہوتی ہے۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے اول قیامت کے اس واقعہ کا نقشہ کھینچا ہے جب انبیاء علیہم السلام سے ان کی امتوں کے متعلق سوال ہوگا اور وہ غایت ادب سے اپنی لاعلمی کا اظہار کریں گے اور عرض کریں گے خدایا! آج کا دن تو نے اس لیے مقرر فرمایا ہے کہ ہر معاملہ میں حقائق امور کے پیش نظر فیصلہ سنائے اور ہم چونکہ صرف ظواہر ہی پر کوئی حکم لگا سکتے ہیں اور قلوب اور حقائق کا دیکھنے والا تیرے سواء کوئی نہیں اس لیے آج ہم کیا شہادت دے سکتے ہیں، صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں تو علام الغیوب ہے اس لیے تو ہی سب کچھ جانتا ہے۔

﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ۭ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۱۰۹﴾ (المائدہ: ۱۰۹)

[1] اور مسلم میں ہے کہ دورِ حکومت سات سال رہے گی حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تطبیق کی صورت یہ ہے کہ جب مسیح علیہ السلام کا رفع سماوی ہوا اس وقت ان کی عمر تینتیس سال تھی اور نزول کے بعد سال سال مزید بقید حیات رہیں گے، اس طرح کائنات ارضی میں کل مدت حیات چالیس سال ہو جائے گی۔

[2] ماخوذ از صحیح احادیث عن ابن عساکر فی تاریخہ

[3] اس سے قبل یہ حدیث مکمل نقل کی گئی ہے۔ اس کو ابن ابی شیبہ نے مصنف میں، امام احمد نے مسند میں، ابوداؤد نے سنن میں، ابن جریر نے تفسیر میں اور ابن حبان نے صحیح میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

[4] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۵۸۴

Marfat.com

”وہ دن (قابل ذکر ہے) جبکہ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو جمع کرے گا پھر کہے گا تم (اپنی اپنی امتوں کی جانب سے) کیا جواب دیئے گئے؟ وہ (پیغمبر) کہیں گے (تیرے علم کے سامنے) ہم کچھ نہیں جانتے بلاشبہ تو ہی غیب کی باتوں کا خوب جاننے والا ہے۔“

ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا ﴿لَا عِلْمَ لَنَا﴾ فرمانا علم حقیقی کی نفی پر ہی مبنی ہوگا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ وہ درحقیقت اپنی امتوں کے جواب سے لاعلم ہیں کہ کس نے ایمان کو قبول کیا اور کس نے انکار کیا کیونکہ جواب کا مقصد اگر یہ ہو تو یہ صریح جھوٹ اور کذب بیانی ہے اور انبیاء علیہم السلام کی جانب اس عمل بد کی نسبت ناممکن ہے اس لیے انبیاء علیہم السلام کا یہ جواب مسطورہ بالا حقیقت کے ہی پیش نظر ہوگا۔ ظاہر حالات کے علم سے انکار پر مبنی نہیں ہوگا اس کے لیے خود قرآن عزیز ہی شاہد عدل ہے کیونکہ وہ متعدد جگہ یہ کہتا ہے کہ قیامت کے دن انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی امتوں پر شہادت دیں گے کہ ہم نے ان تک خدا کا پیغام پہنچا دیا تھا اور یہ کہ انہوں نے ہماری دعوت کو قبول کیا یا رد کر دیا۔ تو ان ہر دو مقامات پر نظر رکھنے کے بعد یوں کہا جائے گا کہ پاس ادب کے طریقہ پر اول انبیاء علیہم السلام کا یہی جواب ہوگا جو مائدہ میں مذکور ہے لیکن جب ان کو خدائے برتر کا یہ حکم ہوگا کہ وہ صرف اپنے علم کے مطابق شہادت دیں تب وہ شہادت دیں گے۔

﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا ۝﴾ (النساء: ۴۱)

”پھر (اے پیغمبر!) کیا حال ہوگا اس دن (یعنی قیامت کے دن) جب ہم ہر ایک امت سے ایک گواہ طلب کریں گے (یعنی اس کے پیغمبر کو طلب کریں گے جو اپنی امت کے اعمال و احوال پر گواہ ہوگا) اور ہم تمہیں بھی ان لوگوں پر گواہی دینے کے لیے طلب کریں گے۔“

﴿وَجِيءَ بِالنَّبِيِّينَ وَالشُّهَدَاءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِالْحَقِّ﴾ (الزمر: ۶۹)

”اور لائے جائیں گے (قیامت کے دن) انبیاء اور شہداء اور فیصلہ کیا جائے گا ان لوگوں کے درمیان اچھائی اور برائی کا حق کے ساتھ۔“

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی ﴿لَا عِلْمَ لَنَا﴾ کی یہی تفسیر بیان فرمائی ہے:

عن ابن عباس ﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ ...الاية﴾ يقولوا الربّ عزوجل لا علم لنا الا علم انت اعلم به منا۔ [1]

”حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ آیت ﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ الرُّسُلَ.... الاية﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: انبیاء علیہم السلام رب عزوجل سے عرض کریں گے، ہم کو کوئی علم نہیں ہے مگر ایسا علم کہ جس کے متعلق تو ہم سے بہتر جانتا ہے۔“

اور شیخ المحققین علامہ سید انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ آیت کے جملہ ﴿لَا عِلْمَ لَنَا﴾ کو ”علم حقیقی کے انکار“ پر محمول کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

---

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۱

"یہ بات مسلم ہے کہ ایک انسان کو..... خواہ وہ کسی درجہ اور رتبہ کا ہو..... دوسرے انسان کے متعلق جو کچھ بھی معلوم ہوتا ہے وہ علم حقیقی کے لحاظ سے "ظن" کے درجہ سے آگے "علم" تک نہیں پہنچتا، اس بناء پر نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

((نحن نحکم بالظواهر و الله متولی السرائر)).

"ہم ظاہر معاملات پر حکم لگاتے ہیں اور بھیدوں اور حقیقتوں پر تو صرف خدا کو ہی قابو حاصل ہے۔"

نیز ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ذات اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"تم میرے پاس اپنے جھگڑے لاتے ہو اور بعض تم میں سے زیادہ چرب زبان ہوتے ہیں اور مجھ کو علم غیب نہیں ہے کہ حقیقت سے آگاہ ہو جایا کروں اس لیے جو بھی فیصلہ دیتا ہوں ظاہر حالات پر ہی دیتا ہوں تو یاد رہے کہ جو شخص بھی اپنی چرب زبانی سے کسی بھائی کا ادنیٰ سا ٹکڑا بھی ناحق حاصل کرے گا تو بلاشبہ جہنم کا ٹکڑا حاصل کرلے گا۔"[1]

بہرحال قرآن عزیز، احادیث رسول ﷺ، آثار صحابہ رضی اللہ عنہم، اور اقوال علماء سب یہی ظاہر کرتے ہیں کہ اس موقعہ پر انبیاء علیہم السلام کا جواب "عدم علم" کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ از راہ پاس ادب "حقیقی علم پر انکار" کو واضح کرتا ہے۔

غرض ذکر یہ تھا کہ اصل مقام پر اصل تذکرہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس واقعہ کا ہو رہا ہے جو قیامت میں پیش آئے گا جبکہ اللہ تعالیٰ ان پر اپنے انعامات شمار کرانے کے بعد ان سے ان کی امت کے متعلق سوال کرے گا اور حسب حال جوابات پیش کریں گے مگر سابق آیات میں چونکہ دوسرے مطالب ذکر ہوئے تھے اس لیے ان سے امتیاز پیدا کرنے کے لیے تمہیداً قیامت میں ہونے والے ان سوال و جواب کا ذکر ضروری ہوا جو عام طور پر انبیاء علیہم السلام سے ان کی امتوں کے متعلق کیے جائیں گے اور اس لیے بھی یہ تذکرہ ضروری تھا کہ اگلی آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جواب کا ذکر کیا گیا ہے اس کا پیراۂ بیان بھی انبیاء علیہم السلام کے جواب کے ساتھ مطابق رکھتا ہے:

﴿وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ ۗ بِحَقٍّ ؕؔ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَ لَاۤ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ۝۱۱۶ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِیْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبَّكُمْ ۚ وَ كُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ ؕ وَ اَنْتَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ۝۱۱۷ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝۱۱۸﴾ (المائدہ: ۱۱۶۔۱۱۸)

"اور (وہ وقت بھی قابل ذکر ہے) جب اللہ تعالیٰ عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام سے کہے گا "کیا تو نے لوگوں (بنی اسرائیل) سے کہہ دیا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو دونوں کو اللہ کے ماسواء خدا بنالینا" عیسیٰ علیہ السلام کہیں گے "پاکی تجھ کو ہی زیبا ہے میرے لیے کیسے ممکن

---

[1] عقیدۃ الاسلام ص ۱۶۵

Marfat.com

تھا کہ میں وہ بات کہتا جو کہنے کے لائق نہیں اگر میں نے یہ بات ان سے کہی ہوتی تو یقیناً تیرے علم میں ہوتی (اس لیے کہ) تو وہ سب کچھ جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں تیرا بھید نہیں پا سکتا بلاشبہ تو غیب کی باتوں کا خوب جاننے والا ہے، میں نے اس بات کے ماسواء جس کا تو نے مجھ کو حکم دیا ان سے اور کچھ نہیں کہا" وہ یہ کہ صرف اللہ ہی کی پوجا کرو جو میرا اور تمہارا سب کا رب ہے" اور میں ان پر اس وقت تک کا گواہ ہوں جب تک میں ان کے درمیان رہا پھر جب تو نے مجھ کو قبض کر لیا تب تو ہی ان پر نگہبان تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے اگر تو ان سب کو عذاب چکھائے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر ان کو بخش دے پس تو ہی بلاشبہ غالب حکمت والا ہے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب اپنا جواب دے چکیں گے تب اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرمائے گا:

﴿قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ۭ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۱۱۹﴾ (المائدہ: ۱۱۹)

"اللہ تعالیٰ فرمائے گا یہ ایسا دن ہے کہ جس میں راستبازوں کی راستبازی ہی کام آ سکتی ہے، ان ہی کے لیے بہشت ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور وہ خدا سے اور خدا ان سے راضی (کا مقام اعلیٰ پائیں گے) یہ بہت ہی بڑی کامیابی ہے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب ایک جلیل القدر پیغمبر کی عظمت و شان کے عین مطابق ہے وہ پہلے بارگاہ رب العزت میں عذر خواہ ہوں گے کہ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں ایسی نامناسب بات کہتا جو قطعاً حق کے خلاف ہے ﴿سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۤ بِحَقٍّ﴾ پھر پاس ادب کے طور پر خدا کے علم حقیقی کے سامنے اپنے علم کو ہیچ اور بے علمی کے مترادف ظاہر کریں گے ﴿اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ۭ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ﴾ اور اس کے بعد اپنے فرض کی انجام دہی کا حال گزارش کریں گے ﴿مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ﴾ اور پھر امت نے اس دعوت حق کا جواب کیا دیا؟ اس کے متعلق ظاہر امور کی شہادت کا بھی اس اسلوب کے ساتھ ذکر کریں گے جس میں ان کی شہادت خدا کی شہادت کے مقابلہ میں بے وقعت نظر آئے ﴿وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۭ وَاَنْتَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝﴾ اور اس کے بعد یہ جانتے ہوئے کہ امت میں مومنین قانتین بھی ہیں اور منکرین جاحدین بھی، وقوع عذاب اور طلب مغفرت کا اس انداز میں ذکر کریں گے جس سے ایک جانب خدا کے مقرر کردہ پاداش عمل کے قانون کی خلاف ورزی بھی مترشح نہ ہو اور دوسری جانب امت کے ساتھ رحمت و شفقت کے جذبہ کا جو تقاضا ہے وہ بھی پورا ہو جائے ﴿اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝﴾ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام عرض داشت یا جواب کے مضمون کو ختم کر چکے تو رب العالمین نے اپنے قانون عدل کا یہ فیصلہ سنا دیا تاکہ مستحق رحمت و مغفرت کو مایوسی نہ پیدا ہو بلکہ مسرت و شادمانی سے ان کے قلوب روشن ہو جائیں اور مستحق عذاب غلط توقعات قائم نہ کر سکیں ﴿هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ۭ ... الایۃ﴾

ان تمام تفصیلات کا حاصل یہ ہے کہ آیات زیر بحث کا سیاق و سباق صراحت کرتا ہے کہ یہ واقعہ قیامت کے روز پیش آئے

گا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ملاء اعلیٰ پر اٹھا لیے جانے کے وقت پیش نہیں آیا۔ اس لیے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کی ابتداء ﴿یَوۡمَ یَجۡمَعُ اللّٰہُ الرُّسُلَ ... الایۃ﴾ سے کرنا اور انتہاء واقعہ ﴿ھٰذَا یَوۡمُ یَنۡفَعُ الصّٰدِقِیۡنَ صِدۡقُھُمۡ ... الایۃ﴾ پر ہونا روز قیامت کے ماسواء اور کسی دن پر صادق نہیں آ سکتا اور اس ایک قطعی بات کے علاوہ دوسرے کسی احتمال کی مطلق گنجائش نہیں ہے۔

نیز یہ تفصیلات واضح کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی امت کے قبول و انکار کے حالات سے آگاہی کے باوجود آیات مائدہ میں مذکور اسلوب بیان اس لیے اختیار فرمائیں گے کہ دوسرے انبیاء ورسل علیہم السلام بھی مقام کی نزاکت حال اور رب العزت کے دربار میں غایت پاس ادب کے لیے یہی اسلوب بیان اختیار فرمائیں گے۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اور انبیاء علیہم السلام کے جوابات میں اسلوب بیان کی یکسانیت کے باوجود اجمال وتفصیل کا فرق صرف اس لیے ہے کہ زیر بحث آیات میں اصل مقصود حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی امت کے قبول و انکار اور ان کے نتائج وثمرات کا تذکرہ ہے اور انبیاء علیہم السلام کا ذکر صرف واقعہ کی تمہید کے طور پر ہے۔

حقیقت حال کے اس انکشاف کے بعد اب جمہور امت مسلمہ کے خلاف خلیفہ قادیانی مسٹر محمد علی لاہوری کی تحریف معنوی بھی قابل مطالعہ ہے کہتے ہیں کہ سورۂ مائدہ میں مذکور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور پروردگار عالم کا یہ سوال و جواب اس وقت پیش آ چکا جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نعش ملنے پر شاگردوں نے ان کا علاج کر کے چنگا کر لیا اور پھر وہ شام سے فرار ہو کر مصر اور مصر سے کشمیر پہنچے اور گمنامی کی حالت میں انتقال فرما گئے۔ مسٹر لاہوری نے اپنے دعوے میں دو دلائل پیش کیے ہیں: ایک یہ کہ عربیت کے قاعدے سے لفظ "اذ" ماضی کے لیے مستعمل ہے نہ کہ مستقبل کے لیے اور دوسری دلیل یہ کہ اگر جمہور کے عقیدہ کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کا انتقال نہیں ہوا اور وہ قیامت کے قریب نازل ہوں گے تو ضروری ہے کہ ان کو اپنی امت (نصاریٰ) کے عقیدہ الوہیت مسیح علیہ السلام اور تثلیث کا علم ہو چکا ہوگا کیونکہ نصاریٰ نے ان کے رفع کے زمانہ تک تثلیث کو نہیں اپنایا تھا اور اگر ایسا ہوتا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب ایسے اسلوب پر نہ ہوتا جس سے ان کی لاعلمی ظاہر ہوتی ہے۔

مسٹر لاہوری نے قرآن کی تحریف معنوی پر یہ اقدام یا تو اس لیے کیا کہ اپنے مرشد متنبی قادیان (علیہ ما علیہ) کے دعوائے مسیحیت کو قوت پہنچائیں اور مغالطہ اور سفسطہ سے کام لے کر "خسران مبین" کا سامان مہیا کریں اور یا پھر وہ قواعد عربیت سے اس درجہ ناواقف ہیں کہ نہ ان کو نحو کے معمولی استعمالات ہی کا علم ہے اور نہ وہ آیات قرآنی کے سیاق و سباق کا ہی کچھ درک رکھتے ہیں اور صرف جاہلانہ دعاوی پر دلیر نظر آتے ہیں۔

جن قوانین عربیت میں "اذ" اور "اذا" کے درمیان یہ فرق بیان کیا گیا ہے کہ "اذ" اگر فعل مستقبل پر بھی داخل ہو تب بھی "ماضی" کے معنی دیتا ہے اور "اذا" اگرچہ فعل ماضی پر بھی داخل ہو تب بھی مستقبل کے معنی دیا کرتا ہے ان ہی قوانین میں علماء معانی و بلاغت یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی گزرے ہوئے واقعہ کو اس طرح پیش کرنے کے لیے گویا وہ زمانہ حال میں پیش آ رہا ہے صیغہ مستقبل سے تعبیر کر لیا کرتے ہیں یعنی اس کے لیے "اذا" کا استعمال جائز رکھتے بلکہ مستحسن سمجھتے اور اس کو "استحضار" اور "حکایۃ الحال" کہتے ہیں اور اسی طرح مستقبل میں ہونے والے ایسے واقعہ کو جس کے وقوع سے متعلق یہ یقین دلانا ہو کہ وہ ضرور ہو کر رہے گا اور ناممکن ہے کہ اس کے خلاف ہو سکے اکثر ماضی کے صیغہ سے تعبیر کرنا مستحسن سمجھتے بلکہ بلاغت تعبیر کے لحاظ سے ضروری اور

مفید یقین کرتے ہیں کیونکہ اس طرح مخاطب اور سامع کے سامنے ہونے والے واقعہ کا نقشہ اس طرح آ جاتا ہے گویا وہ ہو گزرا ہے اور یہ بھی "استحضار" ہی کی ایک صورت سمجھی جاتی ہے دور کیوں جایئے لفظ "اذ" کا استعمال مستقبل کے لیے خود قرآن عزیز میں متعدد مقامات پر ثابت ہے:

﴿وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا یٰلَیْتَنَا نُرَدُّ وَ لَا نُكَذِّبَ بِاٰیٰتِ رَبِّنَا وَ نَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ۝﴾(الانعام: ۲۷)

"اور کاش کہ تو دیکھے جس وقت کہ وہ کھڑے کیے جائیں گے آگ (جہنم) کے اوپر پس کہیں گے اے کاش کہ ہم لوٹا دیئے جائیں دنیا میں اور نہ جھٹلائیں ہم اپنے رب کی نشانیوں کو اور ہو جائیں ہم ایمان والوں میں سے۔"

اسی طرح سورۂ انعام میں روز قیامت مجرموں کی حالت کا اس طرح ذکر کیا ہے:

﴿وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ؕ قَالَ اَلَیْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَ رَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ۝﴾(الانعام: ۳۰)

"اور کاش کہ تو دیکھے، جب وہ اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے تو (پروردگار) کہے گا کیا یہ حق نہیں ہے؟ وہ کہیں گے قسم ہے پروردگار کی یہ (روز حشر) حق اور سچ ہے پس پروردگار کہے گا تو چکھو اس کے بدلہ میں عذاب جو تم کفر کیا کرتے تھے۔"

اور ان ہی مجرمین کی روز قیامت حالت کا نقشہ سورۂ سبا میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

﴿وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَ اُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِیْبٍۙ۝ وَّ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖ﴾(سبا: ۵۱-۵۲)

"اور کاش کہ تو دیکھے جبکہ وہ (منکرین) گھبرائیں گے، پس نہیں بھاگ سکیں گے اور پکڑے جائیں گے قریب سے اور کہیں گے ہم (اب) اس پر ایمان لے آئے۔"

اور سورۂ سجدہ میں اس حقیقت کو ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے:

﴿وَ لَوْ تَرٰۤى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ﴾(السجدہ: ۱۲)

"اور کاش کہ تو دیکھے جبکہ مجرم اپنا سر نیچے ڈالے ہوئے ہوں گے اپنے رب کے سامنے۔"

یہ اور اسی قسم کے متعدد مقامات ہیں جن میں مستقبل کے واقعات کو ماضی کے ساتھ تعبیر کیا گیا اور اس لیے لفظ "اذ" کا استعمال مفید سمجھا گیا پس جس طرح ان مقامات میں ﴿اذ وقفوا، قال، قالوا اذ فزعوا، واخذوا، اذ المجرمون ناکسوا﴾ تمام افعال لفظ "اذ" کے باوجود مستقبل کے معنی دے رہے ہیں اسی طرح ﴿اذ قال الله یعیسی﴾ کے استعمال کو مستقبل کے لیے سمجھئے اور جس طرح ان تمام مقامات کے سیاق و سباق دلالت کر رہے ہیں کہ ان واقعات کا تعلق روز قیامت سے ہے ٹھیک آیات مائدہ کی زیر بحث آیات کا سیاق و سباق صراحت کر رہا ہے کہ اس واقعہ کا تعلق قیامت کے دن سے ہے۔

Marfat.com

قاعدۂ عربیت کی اس حقیقت افروز تحقیق کے بعد مسٹر لاہوری کی دوسری دلیل پر نظر ڈالیے تو وہ اس سے بھی زیادہ لچر نظر آئے گی اس لیے کہ گذشتہ تحقیق سے یہ واضح ہو چکا کہ سورۂ مائدہ کی آیات زیر بحث میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب ہرگز اس بات پر مبنی نہیں ہے کہ ان کو اپنی امت کی گمراہی کا علم نہیں ہوگا اور وہ اپنی لاعلمی ظاہر کریں گے، ایک مرتبہ ان آیات پر پھر غور کرو گے تو صاف نظر آئے گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اصل جواب صرف یہ ہے:

﴿مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِیْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبَّكُمْ ۚ﴾

اور اول آخر باقی آیات میں یا جواب کے مناسب حال تمہید ہے اور یا اللہ تعالیٰ کی جلالت و جبروت اور اپنی بیچارگی و درماندگی بلکہ عبودیت کا اظہار ہے جس میں ایک جلیل القدر پیغمبر کی شان کے مناسب حضرۃ القدس کے سامنے شہادت پیش کی گئی ہے علاوہ ازیں اگر مسٹر لاہوری کا یہ قول صحیح مان لیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع سماوی تک نصاریٰ نے چونکہ تثلیث کا عقیدہ نہیں اختیار کیا تھا اس لیے انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ کا یہ سوال کیا معنی رکھتا ہے:

﴿ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ﴾

کیا العیاذ باللہ اس کا یہ مطلب نہ ہوا کہ خدا نے عیسیٰ علیہ السلام کی امت پر جھوٹا الزام لگایا؟ پھر یہ کیا کم حیرت کی بات ہے کہ قادیانی اور لاہوری ایک جانب تو یہ کہہ رہے ہیں مگر اس کے قطعاً متضاد "آئینہ کمالات" میں قادیانی نے یہ کہا ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام کی روح کو یہ معلوم ہوا اور اس کو بتایا گیا کہ اس کی امت کس طرح شرک میں مبتلاء ہوگئی تب عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی، خدایا! تو میرا مثیل نازل فرما تاکہ میری امت اس شرک سے نجات پائے اور تیری سچی پرستار بنے۔

ببیں تفاوت رہ از کجا ست تا بکجا

حقیقت یہ ہے کہ قادیانی اور لاہوری کی تفسیر کا معیار یہ نہیں ہے کہ وہ قرآن کی آیات کے مطالب قرآن کی زبان سے سننا چاہتے ہیں بلکہ پہلے سے ایک باطل عقیدہ کو عقیدہ بناتے ہیں اور پھر اس کے سانچہ میں قرآن کو ڈھالنا چاہتے ہیں اور جب قرآن اس سانچہ میں ڈھلنے سے انکار کرتا ہے تو تحریف کے حربہ سے زبردستی اس پر مشق ستم کرنا چاہتے ہیں مگر وہ ایسا کرتے وقت میں اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ قرآن امت کی ہدایت کے لیے رہتی دنیا تک امام الہدیٰ ہے۔ اس لیے کوئی "ملحد و زندیق" خواہ کتنی ہی تحریف معنوی کی کوشش کرے ہمیشہ ناکام اور خاسر رہے گا اور خود قرآنی اطلاقات ہی اس کے عقیدہ وفکر کے بطلان کے لیے ناطق ہوں گے بلکہ بمصداق، دروغ گورا حافظہ نہ باشد، وہ اکثر اپنے ہی متضاد اقوال کی بھول بھلیاں میں پھنس کر اپنی کذب بیانی اور تفسیری افتراء پر مہر لگا لیتا ہے جس کی تازہ شہادت ابھی سطور بالا میں نقل ہو چکی ہے۔

فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ:

حیات و رفع مسیح علیہ السلام سے متعلق گزشتہ مباحث میں "توفی" کی حقیقت پر کافی روشنی پڑ چکی ہے اور سورۂ مائدہ کی آیات مسطورہ بالا کی تفسیر کے بھی تمام پہلو واضح ہو چکے ہیں تاہم قرآن کے اعجاز بلاغت اور اسلوب بیان کی لطافت سے مستفید ہونے کے

Marfat.com

لیے چند سطور اس مسئلہ پر بھی سپرد قلم کر دینا مناسب ہے کہ اس مقام پر قرآن نے عیسیٰ علیہ السلام کے قیام ارضی کو ﴿مَا دُمْتُ فِيهِمْ﴾ سے اور کائنات ارضی سے انقطاع تعلقات کو ﴿تَوَفَّيْتَنِي﴾ سے کیوں تعبیر کیا۔

گزشتہ سطور میں لغت اور معانی کے حوالوں سے یہ تو ثابت ہو چکا کہ "توفی" کے حقیقی معنی "اخذ و تناول" (لے لینے اور قبضہ میں کر لینے) کے ہیں اور موت کے معنی میں بطور کنایہ اس کا استعمال ہوتا ہے اور یہ کہ کنایہ میں حقیقی معنی برابر ساتھ ساتھ رہتے ہیں مجاز کی طرح یہ نہیں ہوتا کہ حقیقی معنی سے جدا ہو کر لفظ غیر موضوع لہ میں استعمال ہونے لگے۔ پس اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق قرآن کا عقیدہ یہ ہوتا کہ ان کو موت آ چکی اور سوال و جواب کا یہ سلسلہ موت کے اسی وقت سے متعلق ہے نہ کہ قیامت کے دن سے تو پھر بلاغت و معانی کا تقاضا یہ تھا کہ اس موقع پر "حیات" اور "موت" ایک دوسرے کے متضاد الفاظ کو استعمال کیا جاتا تا کہ یہ حیثیت واضح ہو سکتی کہ سوال و جواب کا معاملہ "موت" کے ہم قرین ہے اور پھر لفظ "موت" کی صراحت اپنے مقابل لفظ "حیات" کی طالب ہوتی مگر قرآن نے ان دونوں الفاظ کی بجائے ﴿مَا دُمْتُ فِيهِمْ﴾ کو "حیات" کی اور "توفی" کو "موت" کی جگہ استعمال کیا ہے تو یہ کس لیے اور کس مقصد سے یا بغیر کسی حکمت و مصلحت کے یہ اسلوب اختیار کر لیا؟ جمہور امت تو اس کا ایک ہی جواب رکھتی ہے اور وہ یہ کہ قرآن نے دوسرے مقامات کی طرح اس مقام پر بھی اعجاز و ایجاز سے کام لیا ہے اور ان دو لفظوں میں وہ حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی، رفع، نزول اور موت تمام مراحل کو سمو دینا چاہتا ہے وہ اگر یہ کہتا "ما حییت" "میں جب تک زندہ رہا" اور "فلما امتنی" "پس جب تو نے مجھ کو موت دے دی" تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی عام حالات کے مطابق دو ہی مراحل پیش آئے ہیں "زندگی" اور "موت" ان دونوں مرحلوں کے درمیان کوئی خاص صورت حال پیش نہیں آئی، لیکن جبکہ یہ خلاف واقعہ تھا اور ان کی زندگی اور موت کے درمیان دو اہم مراحل پیش آ چکے ہوں گے: ایک "ملاء اعلیٰ کی جانب بقید حیات رفع، اور دوسرے کائنات ارضی پر دوبارہ رجوع (نزول)" اس لیے از بس ضروری ہوا کہ حیات اور موت کی جگہ دو ایسے الفاظ اختیار کیے جائیں جو ان چاروں مراحل پر صادق آ سکیں اور جبکہ متعدد مقامات پر حسب حال ان مراحل کی تفصیل بیان ہو چکی ہے تو اعجاز بلاغت کا یہی تقاضا ہے کہ اب ان کو ایجاز و اختصار کے ساتھ بیان کیا جائے۔

صورت حال کا یہی نقشہ تھا جس کے لیے قرآن عزیز نے "ما حییت" کی جگہ "ما دمت فیھم" استعمال کیا تا کہ یہ جملہ اختصار کے ساتھ حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی کے دونوں حصوں پر حاوی ہو جائے اس حصہ پر بھی جو ابتداء زندگی سے شروع ہو کر "رفع الی السماء" پر ختم ہوتا ہے اور اس حصہ پر بھی جو "نزول ارضی" سے شروع ہو کر "موت" پر جا کر ختم ہو جاتا ہے اور اسی طرح قرآن نے "فلما امتنی" کا اسلوب بیان اختیار کیا تا کہ یہ جملہ بھی پہلے کی طرح باقی دونوں مرحلوں کو اپنے اندر سمو لے اس مرحلہ کو بھی جو "رفع الی السماء" کی صورت میں پیش آیا اور اس مرحلہ کو بھی جو نزول کے بعد "موت" کی صورت میں نمودار ہوا کیونکہ موت سے صرف ایک ہی حقیقت ظاہر ہو سکتی تھی مگر "توفی" میں بیک وقت دونوں حقیقتیں موجود تھیں، حقیقی معنی کے لحاظ سے صرف "اخذ و تناول" اور کنایہ کے اعتبار سے اخذ و تناول کے ساتھ ساتھ "موت" جیسا کہ سطور بالا میں "کنایہ" اور "مجاز" کے باہمی فرق سے معلوم ہو چکا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام عرض کریں گے خدایا! جو وقت میں نے ان کے درمیان گزارا اس کے لیے تو بیشک میں شاہد ہوں لیکن "توفی" کے اوقات میں ان پر فقط تو ہی نگہبان رہا باقی تیری شہادت تو ہر حالت میں ہر وقت ہر شے پر حاوی ہے۔

Marfat.com

مسئلہ متعلقہ کی یہ پوری بحث اس سے قطع نظر کہ نبی معصوم ﷺ نے آیات کی تفسیر میں کیا ارشاد فرمایا ہے لغت، معانی، بلاغت کے پیش نظر تھی ورنہ ان آیات کی تفسیر میں ایک مومن صادق کے لیے وہ صحیح مرفوع احادیث کافی ہیں جن کو محدثین نے بسند صحیح روایت کیا ہے مثلاً مشہور محدث حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ نے بروایت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے جو حدیث نقل کی ہے اس کا ترجمہ یہ ہے:

جب قیامت کا دن ہوگا تو تمام انبیاء علیہم السلام کو اور ان کی امتوں کو بلایا جائے گا اور عیسیٰ علیہ السلام بھی بلائے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اول ان کے سامنے اپنی ان نعمتوں کو شمار کرائے گا جو دنیا میں ان پر نازل ہوتی رہیں اور عیسیٰ علیہ السلام ان سب کا اعتراف کریں گے اس کے بعد اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا:

﴿ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾

تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام انکار فرمائیں گے پھر نصاریٰ بلائے جائیں گے اور ان سے سوال کیا جائے گا تو وہ دروغ بیانی کرتے ہوئے کہیں گے کہ ہاں عیسیٰ علیہ السلام نے ہم کو یہی تعلیم دی تھی، یہ سن کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر سخت خوف طاری ہو جائے گا، بدن کے بال کھڑے ہو جائیں گے اور خشیت الٰہی سے ان کا رواں رواں بارگاہ صمدی میں سجدہ ریز ہو جائے گا اور یہ مدت ایک ہزار سال معلوم ہوگی حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نصاریٰ کے خلاف حجت قائم کر دی جائے گی اور ان کی خود ساختہ صلیب پرستی کا راز فاش کر دیا جائے گا اور پھر ان کو جہنم میں جھونک دیئے جانے کا حکم ہو جائے گا۔ [1]

اور محدث ابن ابی حاتم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بسند صحیح یہ روایت نقل کی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "کہ اللہ تعالیٰ جب قیامت کے دن عیسیٰ علیہ السلام سے ان کی امت کے متعلق سوال کرے گا تو اپنی جانب سے عیسیٰ علیہ السلام پر جواب بھی القاء کر دے گا" اور اس القاء کے متعلق نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر القاء ہوگا کہ وہ یہ جواب دیں:

﴿سُبْحٰنَكَ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ ۗ بِحَقٍّ﴾ [2]

اور صحیحین (بخاری و مسلم) اور سنن میں جو حدیث شفاعت منقول و مشہور ہے اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح قیامت میں تمام انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی امتوں سے متعلق اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہوں گے اور معاملہ کے پیش آنے سے قبل خائف و ہراساں ہوں گے حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ان میں سے ایک ہوں گے اور ان پر یہ خوف طاری ہو رہا ہوگا کہ جب ان سے امت کی مشرکانہ بدعت پر سوال ہوگا تو وہ درگاہ صمدی میں کس طرح اس سے عہدہ برآ ہو سکیں گے؟

الحاصل سورۂ مائدہ کی ان آیات کی تفسیر وہی صحیح ہے جو جمہور امت کی جانب سے منقول ہے اور قادیانی اور لاہوری کی تفسیر برائے الحاد و زندقہ سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتی۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۲ سورۂ مائدہ [2] ایضاً

Marfat.com

حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت اصلاح اور بنی اسرائیل کے فرقے:

گزشتہ مباحث میں پڑھ چکے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل عطاء کی تھی اور یہ الہامی کتاب دراصل توراۃ کا تکملہ تھی یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیمی اساس اگرچہ توراۃ ہی پر قائم تھی مگر یہود کی گمراہیوں مذہبی بغاوتوں اور سرکشیوں کی وجہ سے جن اصلاحات کی ضرورت تھی اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کی معرفت انجیل کی شکل میں ان کے سامنے پیش کر دیا تھا، حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت سے پہلے یہود کی اعتقادی اور عملی گمراہیاں اگرچہ بے شمار حد تک پہنچ چکی تھیں اور حضرت مسیح علیہ السلام نے مبعوث ہو کر ان سب کی اصلاح کے لیے قدم اٹھایا، تاہم چند اہم بنیادی باتیں خصوصیت کے ساتھ قابل اصلاح تھیں جن کی اصلاح کے لیے حضرت مسیح علیہ السلام بہت زیادہ سرگرم عمل رہے۔

① یہود کی ایک جماعت کہتی تھی کہ انسان کے اعمال نیک و بد کی سزا اسی دنیا میں مل جاتی ہے باقی قیامت، آخرت، آخرت میں جزا وسزا، حشر ونشر، یہ سب باتیں غلط ہیں یہ "صدوقی" تھے۔

② دوسری جماعت اگرچہ ان تمام چیزوں کو حق سمجھتی تھی مگر ساتھ ہی یہ یقین رکھتی تھی کہ وصول الی اللہ کے لیے از بس ضروری ہے کہ لذات دنیا اور اہل دنیا سے کنارہ کش ہو کر "زہادت" کی زندگی اختیار کی جائے۔ چنانچہ وہ بستیوں سے الگ خانقاہوں اور جھونپڑیوں میں رہنا پسند کرتے تھے مگر یہ جماعت حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت سے کچھ پہلے اپنی یہ حیثیت بھی کھو چکی تھی اور اب ترک دنیا کے پردہ میں دنیا کی ہر قسم کی گندگی میں آلودہ نظر آتی تھی ظاہر رسم وطریق زاہدوں کا سا ہوتا مگر خلوت کدوں میں وہ سب کچھ نظر آتا جن سے رندان بادہ خوار بھی ایک مرتبہ حیا سے آنکھیں بند کر لیں، یہ "فریسی" کہلاتے تھے۔

③ تیسری جماعت مذہبی رسوم اور خدمت ہیکل سے متعلق تھی لیکن ان کا بھی یہ حال تھا کہ جن رسوم اور خدمات کو لوجہ اللہ کرنا چاہیے تھا اور جن اعمال کے نیک نتائج خلوص پر مبنی تھے ان کو تجارتی کاروبار بنا لیا تھا اور جب تک ہر ایک رسم اور خدمت ہیکل پر بھینٹ اور نذر نہ لے لیں قدم نہ اٹھائیں حتیٰ کہ اس مقدس کاروبار کے لیے انہوں نے توراۃ کے احکام تک میں تحریف کر دی تھی یہ "کاہن" تھے۔

④ چوتھی جماعت ان سب پر حاوی اور مذہب کی اجارہ دار تھی اس جماعت نے عوام میں آہستہ آہستہ یہ عقیدہ پیدا کر دیا تھا کہ مذہب اور دین کے اصول واعتقادات کچھ نہیں ہیں مگر "وہ" جن پر وہ صاد کر دیں، ان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا دیں، احکام دین میں اضافہ یا کمی کر دیں جس کو چاہیں جنت کا پروانہ لکھ دیں اور جس کو چاہیں جہنم کی سند تحریر کر دیں۔ خدا کے یہاں ان کا فیصلہ اٹل اور انمٹ ہے غرض بنی اسرائیل کے "ارباباً من دون اللّٰہ" بنے ہوئے تھے اور تورات کی لفظی اور معنوی ہر قسم کی تحریف میں اس درجہ جری تھے کہ اس کو دنیا طلبی کا مستقل سرمایہ بنا لیا تھا اور عوام وخواص کی خوشنودی کے لیے ٹھہرائی ہوئی قیمت پر احکام دین کو بدل ڈالنا ان کا مشغلہ دینی تھا یہ "احبار" یا "فقیہ" تھے۔

یہ تھیں وہ جماعتیں اور یہ تھے ان کے عقائد واعمال جن کے درمیان حضرت مسیح علیہ السلام مبعوث ہوئے اور جن کی اصلاح حال کے لیے ان کی بعثت ہوئی انہوں نے ہر ایک جماعت کے فاسد عقائد واعمال کا جائزہ لیا رحم وشفقت کے ساتھ ان کے عیوب ونقائص

پر نکتہ چینی کی ان کو اصلاح حال کے لیے ترغیب دی اور ان کے عقائد و افکار اور ان کے اعمال و کردار کی نجاستوں کو دور کر کے ان کا رشتہ خالق کائنات اور ذات واحد کے ساتھ دوبارہ قائم کرنے کی سعی کی۔ مگر ان بدبختوں نے اپنے اعمال سیاہ کی اصلاح سے یکسر انکار کر دیا اور نہ صرف یہ بلکہ ان کو "مسیح ضلالت" کہہ کر ان کی دعوت حق و ارشاد کے دشمن اور ان کے خلاف سازشیں کر کے ان کی جان کے درپے ہو گئے۔

اناجیل اربعہ:

حضرت مسیح علیہ السلام پر جو انجیل نازل ہوئی تھی کیا موجودہ چاروں انجیلیں وہی ہیں یا یہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد کی تصانیف ہیں؟ اس کے متعلق تمام اہل علم کا جن میں نصاریٰ بھی شامل ہیں اتفاق ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی انجیل نہیں ہے اور نہ اس کا ترجمہ ہے لیکن پھر ان موجودہ انجیلوں کے متعلق عیسائی کیا کہتے ہیں اور ناقدین کی رائے کیا ہے یہ مسئلہ تفصیل طلب ہے۔

یہ بات بہرحال تسلیم شدہ ہے کہ موجودہ چاروں انجیلوں کے متعلق نصاریٰ کے پاس کوئی ایسی سند موجود نہیں جس کی بناء پر وہ یہ کہہ سکیں کہ ان کی روایات کا سلسلہ یا ان کی ترتیب و تالیف کا زمانہ حضرت مسیح علیہ السلام یا ان کے شاگردوں (حواریوں) تک پہنچتا ہے نہ اس کے لیے کوئی مذہبی سند ہے اور نہ تاریخی، بلکہ اس کے خلاف خود عیسائیت کی مذہبی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ پہلی صدی عیسوی سے چوتھی صدی عیسوی کے اوائل تک عیسائیوں میں اکیس سے زیادہ انجیلیں الہامی یقین کی جاتی اور رائج و معمول بہا تھیں لیکن ۳۲۵ء میں نالیسیا کی کونسل نے ان میں سے صرف چار کو منتخب کر کے باقی کو متروک قرار دے دیا اور سخت حیرت کا مقام ہے کہ کونسل کا یہ انتخاب کسی تاریخی اور علمی بنیاد پر نہیں ہوا بلکہ ایک طرح کی فال نکالی گئی اور اس کو الہامی اشارہ تسلیم کر لیا گیا، چنانچہ ان اکیس سے زائد انجیلوں میں سے بعض یورپ کے قدیم کتب خانوں میں پائی گئی ہیں مثلاً انیسویں صدی میں ویٹیکان کے مشہور کتب خانہ سے متروک اناجیل کا ایک نسخہ برآمد ہوا تھا جس میں موجودہ چاروں انجیلوں سے بہت کچھ زائد موجود ہے موجودہ نسخوں میں سے سینٹ لوقا کی انجیل میں خصوصیت کے ساتھ حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش کا واقعہ تفصیل سے درج ہے لیکن سورۂ مریم میں قرآن عزیز نے اس واقعہ کو جس طرح حضرت مریم علیہا السلام کی پیدائش اور ہیکل میں تربیت کے ذکر سے شروع کیا ہے نہ لوقا کی انجیل میں اس کا ذکر ہے اور نہ باقی تینوں انجیلوں میں۔ ویٹیکان کے اس نسخہ میں یہ واقعہ ٹھیک سورۂ مریم میں مذکور واقعہ کی طرح درج ہے۔ [1]

اسی طرح سولہویں صدی میں روما کے مشہور پوپ سکٹس (Skits) کے قدیم کتب خانہ میں ایک اور متروک انجیل کا نسخہ برآمد ہوا جس کا نام انجیل برنابا ہے، یہ نسخہ پوپ کے مقرب لاٹ پادری فرامرینو نے پڑھا اور پوپ کی اجازت کے بغیر کتب خانہ سے چرا لایا چونکہ اس میں خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق کثرت سے واضح اور صاف بشارتیں موجود تھیں حتیٰ کہ "احمد" نام تک مذکور تھا نیز الوہیت مسیح علیہ السلام کے خلاف عقیدہ کی تعلیم پائی جاتی تھی اس لیے وہ لاٹ پادری مسلمان ہو گیا حال ہی میں اس کا عربی ترجمہ مصر میں علامہ سید رشید رضا مرحوم نے المنار پریس سے شائع کیا ہے جو قابل مطالعہ ہے، ڈاکٹر سعادہ نے اس کے مقدمہ میں جو قابل قدر علمی تحقیق پیش کی ہے اس میں ہے کہ اس انجیل کا پتہ پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں اس تاریخی منشور (حکم نامہ) سے چلتا ہے جو

---

[1] ترجمان القرآن جلد دوم

Marfat.com

خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عیسائیوں کے پوپ گلیسوس کی جانب سے کلیساؤں کے نام بھیجا گیا تھا اور جس میں ان کتابوں کے نام درج تھے جن کا پڑھنا پڑھانا عیسائیوں پر حرام کیا گیا تھا ان ہی میں انجیل برنابا کا نام بھی شامل تھا۔

علاوہ ازیں محققین یورپ بھی آج اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے ابتدائی تین صدیوں میں ایک سو سے زائد انجیلیں پائی جاتی تھیں جو بعد میں چار کو چھوڑ کر باقی متروک کر دی گئیں اور کلیسہ کے فیصلہ کے مطابق ان کا پڑھنا حرام کر دیا گیا اس لیے آہستہ آہستہ وہ سب مفقود ہوتی چلی گئیں اور کہتے ہیں کہ ان مفقود نسخوں میں ایک مشہور انجیل، انجیل ایگنٹس (انجیل اغنطس) بھی تھی جو اب ناپید ہے۔

نیز یہ بات بھی خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہے کہ سینٹ پال (پولوس رسول) کے جو خطوط ہیں اور جن پر موجودہ عیسائیت کی بنیادیں قائم ہیں ان کے مطالعہ سے جگہ جگہ یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگوں کو خبردار کرتا اور ڈراتا ہے کہ وہ ان انجیلوں کی جانب توجہ نہ دیں جو حضرت مسیح علیہ السلام کے نام کی بجائے دوسرے ناموں سے منسوب ہیں کیونکہ مجھ کو روح القدس نے اسی کے لیے مامور کیا ہے کہ میں انجیل مسیح علیہ السلام کی حمایت کروں، اسی کو اسوہ بناؤں اور اس کی تعلیم کو تمام عیسائی دنیا میں پھیلاؤں، چنانچہ حسب ذیل جملے اس کی صراحت کرتے ہیں کہ اس کے نزدیک مسیح علیہ السلام کی انجیل عیسائیوں میں متروک ہو چکی تھی اور بعد کی بے سند انجیلوں کا عام رواج ہو گیا تھا اور ان ہی میں سے یہ چار ہیں جو نالیسیا کی کونسل نے بغیر کسی سند کے فال کے ذریعہ صحیح تسلیم کر لیں۔

اب ان چار کا حال بھی سنئے۔ ان میں سے سب سے قدیم متی کی انجیل تسلیم کی جاتی ہے، بایں ہمہ اس کے متعلق نصاریٰ میں سے علماء متقدمین تو بالاتفاق اور علماء موجودہ میں سے اکثر اس کے قائل ہیں کہ موجودہ انجیل متی اصل نہیں ہے بلکہ اس کا ترجمہ ہے اس لیے کہ اصل کتاب عبرانی میں تھی جو اب ناپید ہے اور ضائع ہو گئی لیکن یہ اصل کا ترجمہ ہے یا اس میں بھی تحریف ہوئی ہے اس کے متعلق کوئی تاریخی سند موجود نہیں حتیٰ کہ مترجم کا نام تک معلوم نہیں اور نہ یہ پتہ کہ کس زمانہ میں یہ ترجمہ ہوا اور مشہور عیسائی عالم جرجیس زو بن الفتوحی اللبنانی نے اپنی کتاب میں تصریح کی ہے کہ متی نے اپنی انجیل بیت المقدس میں بیٹھ کر ۳۹ء میں عبرانی میں تصنیف کی تھی جیسا کہ مقدس ایرونیوس نے کہا ہے کہ اوسپیوس نے اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے کہ متی کی انجیل کا یونانی ترجمہ اصل نہیں ہے اور جب بانیتوس نے یہ ارادہ کیا تھا کہ وہ ہندوستان جا کر عیسائیت کی تبلیغ کرے تو اس نے متی کی انجیل کو عبرانی میں مکتوب اسکندریہ کے کتب خانہ قیصر میں محفوظ دیکھا تھا مگر وہ نسخہ مفقود ہو گیا اور نہیں کہا جا سکتا کہ کس زمانہ میں کس شخص نے یونانی زبان میں موجودہ ترجمہ کو روشناس کرایا۔ [1]

دوسری انجیل مرقس کی ہے اس کے متعلق مشہور عیسائی عالم پطرس گواماگ اپنی کتاب مروج الاخبار فی تراجم الابرار میں مرقس کی سوانح حیات پر لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ نسل یہودی لاوی اور پطرس حواری عیسیٰ علیہ السلام کا شاگرد تھا۔ رومیوں نے جب عیسائیت اختیار کر لی تو ان کے مطالبہ پر یہ انجیل تصنیف کی، یہ الوہیت مسیح علیہ السلام کا منکر تھا اور اس نے اپنی انجیل میں اس حصہ کو بھی نہیں لیا جس میں حضرت مسیح علیہ السلام پطرس کی مدح کرتے ہیں یہ ۶۸ء میں اسکندریہ کے قید خانہ میں قتل ہوا بت پرستوں نے اس کو قتل کر دیا۔ [2]

---

[1] الفارق بین المخلوق والخالق ج ۱ ص ۲۰ ماخوذ جرجیس زو بن البنانی مطبوعہ بیروت

[2] قصص الانبیاء للنجار۔

اور عیسائی دنیا کو اس بارے میں اختلاف ہے کہ مرقس کی انجیل کب تصنیف ہوئی۔ چنانچہ الفارق کے مصنف مرشد الطالبین ص ۱۷۰ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ علماء نصاریٰ کا خیال یہ ہے کہ یہ پطرس کی نگرانی میں ۶۱ء میں تصنیف ہوئی۔ [1]

تیسری انجیل سینٹ لوقا کی انجیل ہے جس قدر اختلاف علماء نصاریٰ میں متی کی انجیل سے متعلق ہے اس سے بھی زیادہ لوقا کی انجیل کی صحت و عدم صحت کے متعلق اختلاف ہے چنانچہ الفارق کے مصنف نے اس سلسلہ میں خود علماء نصاریٰ کے ہی اقوال نقل کیے ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ یہ الہامی کتاب نہیں ہے وہ فرماتے ہیں کہ مسٹر گنڈل اپنے رسالہ "الہام" میں دعویٰ کرتا ہے کہ لوقا کی انجیل الہامی نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ لوقا نے خود اپنی انجیل کی ابتداء میں یہ لکھا ہے کہ یہ (انجیل) اس نے ثاوفیلس کے ساتھ خط و کتابت کی بناء پر لکھی ہے وہ اس کو مخاطب کر کے لکھتا ہے کہ مسیح علیہ السلام کی باتیں جن لوگوں نے آنکھوں سے دیکھی تھیں انہوں نے ہم تک جس طرح پہنچائی ہیں ان کو بہت سے لوگ ہم سے نقل کر رہے ہیں اس لیے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کو خود ہی صحیح طریقہ پر جمع کر دوں تا کہ تم کو صحیح حقیقت معلوم ہو جائے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس نے حضرت مسیح علیہ السلام کا زمانہ نہیں پایا، اور محققین نصاریٰ یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ لوقا کی انجیل مرقس کی انجیل کے بعد وجود میں آئی ہے اور پطرس اور پولوس کے مرنے کے بعد تصنیف کی گئی ہے۔ [2]

اصل بات یہ ہے کہ لوقا انطاکیہ میں طبابت کرتا تھا اس نے مسیح علیہ السلام کو نہیں دیکھا اور مسیحیت کو سینٹ پال (پولوس) سے سیکھا ہے اور پولوس کے متعلق یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ وہ دراصل متعصب یہودی اور عیسائیت کا بدترین دشمن تھا اور نصاریٰ کے خلاف علی الاعلان اپنی جدوجہد جاری رکھتا تھا مگر جب اس نے یہ دیکھا کہ اس کی ہمہ قسم کی مخالفتوں اور رکاوٹوں کے باوجود مسیحیت کی ترقی ہوتی جا رہی ہے اور رو کے نہیں رکتی تب اس نے یہودیانہ مکر وفریب سے کام لیا اور اعلان کیا کہ عجب معجزہ ہوا میں بحالت صحت تھا کہ ایک دم اس طرح زمین پر گرا جیسا کہ کوئی کشتی میں بچھاڑ دیتا ہے اور اس حالت میں حضرت مسیح علیہ السلام نے مجھ کو چھوا اور پھر سخت زجر و توبیخ کی کہ آئندہ تو ہرگز میرے پیروؤں کے خلاف کوئی اقدام نہ کرنا پس میں اسی وقت حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان لے آیا اور پھر حضرت مسیح علیہ السلام کے حکم سے میں مسیحی دنیا کی خدمت کے لیے مامور ہو گیا انہوں نے مجھ کو فرمایا کہ میں لوگوں کو مسیح علیہ السلام کی انجیل کی بشارت سنا دوں اور اس کے اتباع کی ترغیب دوں۔ چنانچہ اس نے آہستہ آہستہ "کلیسہ" پر ایسا قبضہ کیا کہ دین عیسوی کی اصل صداقتوں کو مٹا کر بدعتوں اور برائیوں کا مجموعہ بنا دیا، الوہیت مسیح علیہ السلام تثلیث و ابنیت اور کفارہ کی بدعت ایجاد کر کے مسیحیت کو وثنیت میں تبدیل کر دیا اور شراب، مردار اور خنزیر سب کو حلال بنا دیا۔ یہی وہ مسیحیت ہے پولوس کے صدقہ میں جس سے آج دنیا روشناس ہے اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ پولوس کے شاگرد لوقا کی انجیل الہامی انجیل ہے اور جیروم کہتا ہے کہ بعض قدیم علماء نصاریٰ اس کے قائل ہیں کہ لوقا کی انجیل کے ابتدائی دو باب الہامی نہیں الحاقی ہیں کیونکہ یہ اس نسخہ میں موجود نہیں ہیں جو مارسیوں فرقہ کے نسخوں میں ہے، اور مشہور نصرانی عالم اکہارن لکھتا ہے کہ لوقا کی انجیل کے باب ۲۲ آیات ۴۳۔۴۷ الحاقی ہیں، وہ یہ بھی کہتا ہے کہ معجزات سے متعلق جو بیان ہے اس میں کذب بیانی اور شاعرانہ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے جو غالباً کاتب کی جانب سے اضافہ ہیں لیکن صدق کا کذب سے امتیاز حد درجہ دشوار ہے اور کلی میش لکھتا ہے کہ متی اور مرقس کی انجیلیں بہت جگہ آپس میں مخالف اور متضاد

---

[1] الفارق ص ۳۱۶ [2] قصص الانبیاء للنجار ص ۴۷۷، ۴۷۹

واقعات کی حامل ہیں لیکن جس معاملہ میں دونوں کا اتفاق ہو اس کو لوقا کی انجیل کے بیان پر ترجیح حاصل ہے۔ (۱) اور یہ واضح رہے کہ لوقا کی انجیل میں بیس سے زیادہ مواقع پر متی کی انجیل سے اضافہ ہے اور مرقس کی انجیل سے تو اس سے بھی کہیں زیادہ۔ (۲) پس ان تمام دلائل سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ لوقا کی انجیل ہرگز الہامی نہیں ہے اور نہ کسی حواری کی تصنیف ہے۔

چوتھی انجیل یوحنا کی ہے اس کے متعلق نصاریٰ کا عام عقیدہ یہ ہے کہ یہ حضرت مسیح علیہ السلام کے محبوب شاگرد یوحنا زبدی کی ہے زبدی صیاد، یوحنا کے والد کا نام تھا، جلیل کے بیت صیدا میں ولادت ہوئی اور حواری۔ عیسیٰ علیہ السلام کا شرف حاصل ہوا اور نصاریٰ میں مشہور بارہ حواریوں میں سے سب سے زیادہ ان ہی کو تقدیس حاصل ہے۔ جرجیس زوبین اللبنانی لکھتا ہے کہ جس زمانہ میں شیرنیطوس اور بیسوں اور ان کی جماعت اپنے عقیدہ کی تشہیر کر رہی تھی کہ الوہیت مسیح علیہ السلام کا عقیدہ باطل ہے وہ بشر تھے اور حضرت مریم علیہا السلام کے بطن سے پیدا ہوئے اور حضرت مریم علیہا السلام سے قبل وہ عالم وجود میں نہیں تھے اس زمانہ میں ۹۶ء میں پادریوں، لاٹ پادریوں کی مجلس مشاورت ہوئی اور انہوں نے یوحنا کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست پیش کی کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کی باتیں تحریر کریں اور جو باتیں دوسری انجیلوں میں پائی جاتی ہیں ان کے ماسواء جو کچھ معلوم ہو وہ لکھیں خصوصیت سے الوہیت مسیح کا مسئلہ ضرور لکھیں تاکہ شیرنیطوس وغیرہ کی جماعت کے خلاف ہمارے ہاتھ مضبوط ہوں تب یوحنا ان کی بات نہ ٹال سکے اور یہ انجیل لکھنے پر مجبور ہوئے (۳) مگر اس کے باوجود مسیحی علماء زمانہ تصنیف کی تعیین میں مختلف نظر آتے ہیں بعض کہتے ہیں ۶۵ء میں تالیف ہوئی اور بعض ۹۶ء اور بعض ۹۸ء میں تصنیف ہونا بیان کرتے ہیں۔

مگر ان کے مقابلہ میں ان مسیحی علماء کی تعداد کم نہیں ہے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یوحنا کی انجیل، حواری یوحنا کی تصنیف ہرگز نہیں ہے چنانچہ کیتھولک ہیرالڈ (۴) جلد نمبر ۷ میں پروفیسر لن سے منقول ہے کہ انجیل یوحنا از ابتداء تا انتہاء مدرسہ اسکندریہ کے ایک طالب علم کی تصنیف ہے اور برٹش نیدر لکھتا ہے کہ انجیل یوحنا اور رسائل یوحنا ان میں سے کوئی ایک بھی حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگرد یوحنا کی تصنیف نہیں ہے بلکہ کسی شخص نے دوسری صدی کے اوائل میں اس کو تصنیف کر کے اس لیے یوحنا کی جانب منسوب کر دیا تاکہ وہ لوگوں میں مقبول و مشہور بن جائے اور صاحب الفارق کہتے ہیں کہ مشہور مسیحی عالم کروتیس کا بیان ہے کہ یہ انجیل شروع میں بیس ابواب پر مشتمل تھی بعد میں افاس کے کنیسہ نے اس میں اکیسویں باب کا اضافہ کر دیا جبکہ یوحنا کا انتقال ہو چکا تھا (۵) ان حوالجات سے یہ بخوبی آشکارا ہوتا ہے کہ بلاشبہ یوحنا حواری کی انجیل نہیں ہے اور صرف اس مقصد سے تصنیف کر کے یوحنا کی جانب منسوب کی گئی کہ الوہیت مسیح علیہ السلام کے عقیدہ کنیسہ کو قوت پہنچائی جائے اور اصلاح عقیدہ کی جو آواز کبھی کبھی مسیحی دنیا میں اٹھتی تھی اس کو دبایا جائے۔

چہارگانہ اناجیل کے متعلق مسطورہ بالا مختصر تنقیدات کے علاوہ ان کے الہامی نہ ہونے کے دو واضح دلائل یہ بھی ہیں کہ ان چاروں انجیلوں میں حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی کے وقائع درج ہیں حتیٰ کہ نصاریٰ کے زعم کے مطابق ان کی گرفتاری، صلیب، قتل، مر کر جی اٹھنے اور حواریوں پر ظاہر ہونے وغیرہ تک کے حالات بھی موجود ہیں۔ پس اگر یہ اناجیل انجیل مسیح علیہ السلام یا اس کا کوئی حصہ ہوتیں تو ان میں ان باتوں کا قطعاً تذکرہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ واقعات تو مسیح علیہ السلام کے بعد ان کے شاگرد جمع کرتے اور ان کو ایک تاریخی

---

(۱) قصص الانبیاء ص ۴۷۷ (۲) ایضاً ص ۴۷۷ (۳) قصص الانبیاء ص ۴۷۷
(۴) مطبوعہ ۱۸۴۴ء (۵) الفارق ص ۳۴۲-۳۴۱

Marfat.com

حیثیت حاصل ہوتی نہ کہ وہ کتاب اللہ کہلانے کے مستحق ہوتے اور یہ کہ جس طرح ان انجیلوں کے مصنفین کے بارہ میں اختلاف ہے اسی طرح ان تصنیفات کے باہم روایات واقعات میں بھی تناقص اور سخت اختلاف پایا جاتا ہے یعنی بعض معجزات وعجیب واقعات ایسے ہیں جو ایک انجیل میں پائے جاتے ہیں اور دوسری انجیل میں ان کا اشارہ تک نہیں ہے یا بعض میں ایک واقعہ جس طرح مذکور ہے دوسری میں کچھ زیادتی یا کمی کے ساتھ ایسے طریقہ پر بیان ہوا ہے کہ پہلی انجیل کے بیان میں اور اس میں صریح تضاد اور خلاف نظر آتا ہے مثلاً صلیب مسیح علیہ السلام کا واقعہ اناجیل میں تضاد بیان کے ساتھ منقول ہے۔

یہ بات بھی کم حیرت کے لائق نہیں ہے کہ یہ اناجیل اربعہ جن جن زبانوں میں منقول ہوئی ہیں ان کی عبارات وکلمات کے بقاء وتحفظ کی کبھی پرواہ نہیں کی گئی بلکہ ایک ہی زبان کے مختلف ایڈیشنوں اور اشاعتوں میں بہ کثرت الفاظ اور جملوں کی تبدیلی، کمی اور بیشی موجود ہے خصوصاً جن مقامات پر علماء نصاریٰ اور علماء اسلام کے درمیان بشارات کے سلسلہ میں یہ بحث آ گئی ہے کہ ان کا مصداق خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یا حضرت مسیح علیہ السلام یا کوئی اور نبی، نیز جن مقامات پر الوہیت مسیح علیہ السلام کی صراحت میں فرق پڑتا نظر آتا ہو ان کو کافی تختہ مشق بنایا جاتا رہا ہے...... اگر تحریفات لفظی ومعنوی اور تضاد بیان کی تفصیلات وتشریحات کو بہ نظر وسیع مطالعہ کرنا ہو تو اس کے لیے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی اظہار الحق وحافظ ابن قیم کی ہدایۃ الحیاری، باجہ جی زادہ کی الفارق بین المخلوق والخالق، اور مولانا آل نبی امروہی کی اظہار حق لائق دید کتابیں ہیں۔

غرض موجودہ چاروں انجیلیں الہامی انجیلیں نہیں ہیں نہ ان کے الہامی ہونے کی روایتی سند ہے اور نہ تاریخی، نہ ان کے مصنفین کے متعلق قطعی اور یقینی علم حاصل ہے اور نہ زمانہائے تصانیف ہی متعین ہیں بلکہ اس کے خلاف پولوس کے بیانات ان کتابوں کی تاریخی حیثیت مضامین ومطالب کا باہمی تضاد وتغیر اسی پر شاہد ہیں کہ یہ ہرگز انجیل مسیح علیہ السلام یا اس کا حصہ نہیں ہیں اور یہ کہ انجیل مسیح علیہ السلام نصاریٰ کے ہی ہاتھوں اول تحریف لفظی ومعنوی کا شکار ہوئی اور اس کے بعد مفقود ہوگئی بلکہ ان چہارگانہ انجیلوں میں سے کوئی بھی اصل نہیں ہے بلکہ یونانی اور اس سے منقول دوسری زبانوں کے تراجم ہیں جو تبدیلی وتغیر اور نقص وازدیاد کا برابر شکار ہوتے رہے ہیں اور صرف یہی نہیں کہ یہ اناجیل اربعہ انجیل مسیح علیہ السلام نہیں ہیں بلکہ کسی علمی تاریخی اور مذہبی سند سے ان کا شاگردان مسیح علیہ السلام کی تصنیف ہونا بھی ثابت نہیں ہے بلکہ بعد کے مصنفین کی تصانیف ہیں البتہ ان تراجم میں مواعظ ونصائح اور مقامات حکمت کے سلسلہ میں ایک حصہ ایسا ضرور ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کے ارشادات عالیہ سے ماخوذ ہے اس لیے نقل میں کہیں کہیں اصل کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔

قرآن اور انجیل:

قرآن عزیز کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ جس طرح خدا ایک ہے اسی طرح اس کی صداقت بھی ایک ہی ہے اور وہ کبھی کسی خاص قوم، خاص جماعت اور خاص گروہ کی وراثت نہیں رہی بلکہ ہر قوم اور ہر ملک میں خدا کی رشد وہدایت کا پیغام ایک ہی احساس وبنیاد پر قائم رہتے ہوئے اس کے سچے پیغمبروں یا ان کے نائبوں کے ذریعے ہمیشہ دنیا کے لیے راہ مستقیم کا داعی اور منادر رہا ہے اور اسی کا نام "صراط مستقیم" اور "اسلام" ہے اور قرآن اسی بھولے ہوئے سبق کو یاد دلانے آیا ہے اور یہی وہ آخری پیغام ہے جس نے تمام مذاہب کی صداقتوں کو اپنے اندر سمو کر کائنات ارضی کی ہدایت کا بیڑا اٹھایا ہے اور اسی لیے اب اس کا انکار گویا خدا کی تمام صداقتوں کا

Marfat.com

انکار ہے۔ اسی بنیادی تعلیم کے پیش نظر اس نے حضرت مسیح علیہ السلام کی عظمت شان کو سراہا اور یہ اعتراف کیا کہ بلاشبہ انجیل الہامی کتاب اور خدا کی کتاب ہے لیکن ساتھ ہی جگہ جگہ یہ بھی بہ دلائل بتلایا کہ علماء اہل کتاب نے ان کی سچی تعلیم کو بدل ڈالا اور ہر قسم کی تحریف کر کے اس کی تعلیم کو شرک و کفر کی تعلیم بنا دیا۔ مگر بعض بعض مقامات پر اہل کتاب کو توراۃ و انجیل کے خلاف عمل پر ملزم بناتی ہوئی موجودہ تورات و انجیل کے حوالے بھی دیتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول قرآن کے وقت اصل نسخے بھی اگرچہ محرف شکل میں ہی کیوں نہ ہوں پائے جاتے تھے۔ بہر حال اس وقت بھی یہ دونوں کتابیں لفظی اور معنوی دونوں قسم کی تحریفات سے اس درجہ مسخ ہو چکی تھیں کہ وہ تورات موسیٰ اور انجیل مسیح علیہ السلام کہلانے کی مستحق نہیں رہی تھیں۔ چنانچہ قرآن نے اصل کتابوں کی عظمت اور اہل کتاب کے ہاتھوں ان کی تحریف اور ان کا مسخ دونوں کو واضح طور پر بیان کیا ہے:

﴿ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ اَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ۙ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ اَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ﴾ (آل عمران: ۳-۴)

"(اے محمد ﷺ!) اللہ نے تجھ پر کتاب کو اتارا حق کے ساتھ جو تصدیق کرنے والی ہے ان کتابوں کی جو اس کے سامنے ہیں اور اتارا اس نے تورات اور انجیل کو (قرآن سے) پہلے جو ہدایت ہیں لوگوں کے لیے اور اتارا فرقان (حق و باطل میں فرق کرنے والا)۔"

﴿ وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ۚ ﴾ (آل عمران: ۴۸)

"اور سکھاتا ہے وہ کتاب کو، حکمت کو، توراۃ کو، انجیل کو۔"

﴿ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَ مَاۤ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَ الْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ ﴾ (آل عمران: ۶۵)

"اے اہل کتاب! تم کس لیے ابراہیم (علیہ السلام) کے بارے میں جھگڑتے ہو اور حال یہ ہے کہ توراۃ اور انجیل کا نزول نہیں ہوا، مگر ابراہیم (علیہ السلام) کے بعد، پس کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔"

﴿ وَ قَفَّيْنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۪ وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّ نُوْرٌ ۙ وَّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ هُدًى وَّ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ وَ لْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ؕ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ ﴾ (المائدہ: ۴۶-۴۷)

"اور پیچھے بھیجا ہم نے عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام) کو جو تصدیق کرنے والا ہے اس کتاب کی جو سامنے ہے تورات اور دی ہم نے اس کو انجیل جس میں ہدایت اور نور ہے اور جو اپنے سے پہلی کتاب تورات کی تصدیق کرتی ہے اور سرتا سر ہدایت اور نصیحت

ہے پرہیزگاروں کے لیے اور چاہیے کہ اہل انجیل اس کے مطابق فیصلہ دیں جو ہم نے انجیل میں اتار دیا ہے اور جو اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے موافق فیصلہ نہیں دیتا پس یہی لوگ فاسق ہیں۔"

﴿وَ لَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِیْلَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَ كَثِیْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا یَعْمَلُوْنَ ﴾ (المائدہ: ٦٦)

"اور اگر وہ تورات اور انجیل کو قائم رکھتے (تحریف کر کے ان کو مسخ نہ کر ڈالتے) اور اس کو قائم رکھتے جو ان کی جانب ان کے پروردگار کی جانب سے نازل ہوا ہے تو البتہ وہ (فارغ البالی کے ساتھ) کھاتے اپنے اوپر سے اور اپنے نیچے سے بعض ان میں میانہ رو صلاح کار ہیں اور اکثر ان کے بدعمل ہیں۔"

﴿قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَیْءٍ حَتّٰى تُقِیْمُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِیْلَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ﴾ (المائدہ: ٦٨)

"(اے محمد ﷺ!) کہہ دیجئے: اے اہل کتاب تمہارے لیے ٹکنے کی کوئی جگہ نہیں ہے جب تک تورات اور انجیل اور اس شے کو جس کو تمہارے پروردگار نے تم پر نازل کیا قائم نہ کرو (تاکہ اس کا نتیجہ قرآن کی تصدیق نکلے)۔"

﴿وَ اِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِیْلَ ۚ﴾ (المائدہ: ١١٠)

"اور جب میں نے تجھ کو (اے عیسیٰ علیہ السلام) سکھائی کتاب حکمت تورات اور انجیل۔"

﴿اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ ٘﴾ (الاعراف: ١٥٧)

"(نیکوکار) وہ شخص ہیں جو پیروی کرتے ہیں الرسول کی جو نبی اُمی ہے اور جس کا ذکر اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں۔"

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَ یُقْتَلُوْنَ ۫ وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ﴾ (التوبہ: ١١١)

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے خرید لیا ہے مومنوں سے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو اس بات پر کہ ان کے لیے جنت ہے وہ اللہ کے راستہ میں جنگ کرتے ہیں پس قتل کرتے ہیں اور قتل ہوتے ہیں ان کے لیے اللہ کا وعدہ سچا ہے جو تورات اور انجیل میں کیا گیا ہے۔"

غرض یہ مدح و منقبت ہے اس تورات اور انجیل کی جو تورات موسیٰ اور انجیل عیسیٰ کہلانے کی مستحق اور درحقیقت کتاب اللہ لیکن یہود و نصاریٰ نے ان الہامی کتابوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ اس کا حال بھی قرآن ہی کی زبان سے سنئے:

﴿ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَ قَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾ (البقرہ: ۷۵)

"کیا تم توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مان لیں گے حالانکہ ان میں ایک گروہ ایسا تھا جو اللہ کا کلام سنتا تھا پھر اس کو بدل ڈالتا تھا باوجود اس بات کے کہ وہ اس کے مطالب کو سمجھتا تھا اور دیدہ و دانستہ تحریف کرتے تھے۔"

﴿ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَ وَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۝ ﴾ (البقرہ: ۷۹)

"پس افسوس ان (مدعیان علم) پر جن کا شیوہ یہ ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں پھر لوگوں سے کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور یہ سب کچھ اس لیے کرتے ہیں تاکہ اس کے معاوضہ میں ایک حقیر سی قیمت دنیوی فائدہ کی حاصل کریں پس افسوس اس پر جو کچھ وہ لکھتے ہیں اور افسوس اس پر جو کچھ وہ اس ذریعہ سے کماتے ہیں۔"

﴿ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ﴾ (النساء: ۴۶)

"وہ اہل کتاب، کتاب اللہ (تورات و انجیل) کے کلمات کو ان کے محل و مقام سے بدل ڈالتے ہیں یعنی تحریف لفظی اور معنوی دونوں کرتے ہیں۔"

ان کے علاوہ ثمن قلیل (معمولی پونجی) کے عوض آیات اللہ کی فروخت کرنے کے متعلق تو بقرہ، آل عمران، نساء، توبہ میں متعدد آیات موجود ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ، تورات و انجیل کی بیع دونوں طرح کیا کرتے تھے، تحریف لفظی کے ذریعہ بھی اور تحریف معنوی کے سلسلہ سے بھی۔ گویا سیم و زر کے لالچ سے عوام و خواص کی خواہشات کے مطابق کتاب اللہ کی آیات میں لفظی و معنوی تحریف ان کے فروخت کرنے کی حیثیت رکھتی ہے جس سے بڑھ کر شقاوت بدبختی کا دوسرا کوئی عمل نہیں اور جو ہر حالت میں موجب لعنت ہے۔

انجیل اور حواری عیسیٰ علیہ السلام :

مفسرین عام طور پر حواری کو "حور" سے ماخوذ کہتے ہیں جس کے معنی کپڑے کی سپیدی کے ہیں جب کپڑا دھل جانے کے بعد سپید ہو جاتا ہے تو اہل عرب کہا کرتے ہیں "حار الثوب" اس لیے دھوبی کو "حواری" کہتے ہیں اور "حواریون" اس کی جمع آتی ہے۔ اس معنی کے پیش نظر حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگردوں کو یا اس لیے حواری کہتے ہیں کہ ان میں سے اکثر دھوبی اور مچھیرے کا پیشہ کرتے تھے اور یا اس لیے کہ جس طرح دھوبی کپڑا صاف کر دیتا ہے یہ بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم سے لوگوں کے قلوب کو روشن کر دیا کرتے تھے حواری کے معنی ناصر و مددگار اور ناصح کے بھی آتے ہیں اور عبدالوہاب نجار فرماتے ہیں کہ نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں "شاگرد" کہتے ہیں یہ تعبیر بے اصل نہیں ہے بلکہ اس حقیقت پر مبنی ہے کہ یہ اصل کے اعتبار سے "حبور" عبرانی لفظ ہے جس کے م "شاگرد" کے ہیں اور اس کی جمع "حبوریم" آتی ہے یہی حبوریم ہے جو عربی میں جا کر حواری اور حوارین کہلایا۔

Marfat.com

حواریین عیسیٰ علیہ السلام کا گذشتہ صفحات میں تفصیل سے ذکر آ چکا ہے لیکن قرآن عزیز نے صرف "حواریون" کہہ کر مجمل تذکرہ کیا ہے، کسی کا نام مذکور نہیں ہے، انجیل نے البتہ ان کے نام بھی بتلائے ہیں اور تعداد بھی۔ چنانچہ متی کی انجیل کے باب ۱ میں بارہ نام شمار کیے ہیں اور چار انجیلوں سے خارج برنابا کی متروک انجیل کے باب ۱۴ میں بھی یہی تعداد مسطور ہے البتہ چند ناموں میں اختلاف پایا جاتا ہے، نقشہ حسب ذیل ہے:

انجیل متی

نمبر شمار	نام
۱	پطرس (سمعان)
۲	اندراوس پطرس کا بھائی
۳	یعقوب بن زیدی
۴	یوحنا (یعقوب کا بھائی)
۵	فیلپس
۶	برثولماوس
۷	توما
۸	متی العشار
۹	یعقوب بن حلفی
۱۰	لبادس (ملقب بہ تداوس)
۱۱	مسعان القانوی
۱۲	یہودا الخریوطی

انجیل برنابا

نمبر شمار	نام
۱	پطرس الصیاد (سمعان)
۲	اندراوس
۳	برنابا
۴	یعقوب بن زیدی
۵	یوحنا بن زبدی
۶	فیلپس
۷	برثولماوس
۸	تداوس
۹	یعقوب بن حلفی
۱۰	یہودا
۱۱	متی العشار
۱۲	یہدا الخطر یوطی [1]

دونوں انجیلوں کے درمیان صرف دو ناموں میں اختلاف ہے، متی میں توما اور سمعان قانوی ہیں اور برنابا میں ان کی جگہ خود برنابا اور تداوس ہیں ان میں کون صحیح کہتا ہے؟ اس کا فیصلہ مشکل ہے لیکن دلیل کی روشنی میں یہ کہنا بہت آسان ہے کہ کلیسہ کی کونسل نے بے دلیل اور بے سند صرف اس بنا پر برنابا اور اس کے رفیق تداوس کے نام منظور کر دیئے کہ ان دونوں کی روایات الوہیت مسیح علیہ السلام اور کفارہ کے خلاف سچی عیسائیت پر مبنی تھیں اور یہ کلیسہ کے اس عقیدہ کے قطعاً خلاف تھیں جو سینٹ پال کی محرف عیسائیت کا مقبول عقیدہ تھا اور ہے مگر عجیب بات یہ ہے کہ اگرچہ برنابا کا نام موجودہ عیسائیت میں حواریوں سے خارج سمجھا جاتا ہے تاہم ان رسولوں کی فہرست میں آج بھی موجود ہے جنھوں نے ملکوں میں خدائی بادشاہت کا اعلان کیا اور مسیحی دین کی دعوت وتبلیغ کا فرض انجام دیا۔

[1] قصص الانبیاء للنجار ص ۴۸۲۔

Marfat.com

حضرت مسیح علیہ السلام اور موجودہ مسیحیت:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم حق کا خلاصہ گذشتہ بیانات میں سپرد قلم ہو چکا ہے وہ خدا کے سچے پیغمبر حق وصداقت کے داعی دین مبین کے ہادی و مبلغ تھے اور خدا کے تمام سچے پیغمبروں کی طرح ان کی تعلیم بھی پہلی صداقتوں کی موید اور وقت کی انفرادی و اجتماعی ضروریات کے انقلابات وحوادث کے مناسب حال انجیل کی شکل میں اصلاح وانقلاب کے لیے منادی تھی، توحید خالص، معرفت کردگار کے لیے کردگار سے ہی بلاوسیلہ تقرب، محبت و شفقت، رحمت وعفو کی اخلاقی برتری ان کی پاک تعلیم کا نچوڑ تھا، لیکن انسانی انقلابات کی ذہنی تاریخ میں اس سے زیادہ حیرت اور تعجب کی غالباً کوئی بات نہ ہو کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی مقدس تعلیم ہی کے نام پر موجودہ مسیحیت، توحید کی جگہ تثلیث، معرفت حق کے لیے ابنیت کا عقیدہ، نجات کے لیے علم وعمل کی درستکاری کی جگہ کفارہ پر ایمان جیسی مشرکانہ اور جاہلانہ بدعات کی تبلیغ اور نشر واشاعت میں سرگرم عمل ہے۔

تثلیث؟:

بستانی نے دائرۃ المعارف (Encyclopaedia) میں اس مسئلہ پر مسیحی نقطہ نظر سے سیر حاصل بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عیسائی مذہب نے سب سے پہلے تثلیث کا نام "رسولوں کے عہد" میں سنا، اس سے قبل مسیحیت اس عقیدہ سے قطعاً نا آشنا تھی اور رسولوں کا عہد سینٹ پال (پولوس رسول) سے شروع ہوتا ہے۔ یہ وہی حضرت ہیں جن کی بدولت دین مسیحی نے نیا جنم لیا اور جن کی یہودیت نے از راہ تعصب مسیحی صداقت وتوحید کے عقیدہ کو وثنیت اور شرک سے آلودہ کر کے کامیابی کا سانس لیا، یہ عقیدہ دراصل وثنی (بت پرستانہ) فلسفہ کی موشگافیوں کی پیداوار اور صنم پرستانہ عقیدہ "اوتار" کی صدائے بازگشت ہے اور اس حقیقت پر مبنی ہے کہ ذات یا صفات خداوندی بشکل انسانی کائنات ارضی میں وجود پذیر ہو سکتی ہے گویا یہ عقیدہ فلاسفہ ہیلانیسن اور غنوسطینین کے عقائد فلسفیانہ کا ایک معجون مرکب ہے۔ چنانچہ تاریخ قدیم سے پتہ چلتا ہے کہ دوسری صدی عیسوی میں انطاکیہ کے بشپ (Bushap) تھیوفیلوس نے سب سے پہلے اس سلسلہ میں ایک یونانی کلمہ "ٹریاس" کا استعمال کیا اس کے بعد ایک دوسرے بشپ ترتلیانوس نے اس کے قریب قریب ایک لفظ تیر نتیاس ایجاد کیا، یہی وہ یونانی لفظ ہے جو موجودہ مسیحی عقیدہ "ثالوث" (تثلیث) مرادف اور ہم معنی ہے۔ اگر اس مسئلہ کی حقیقت کو ذرا اور گہری نظر سے دیکھنے کی کوشش کی جائے تو تاریخی حقائق سے یہ بات نمایاں نظر آئے گی کہ ثالوث کا عقیدہ دراصل مسیحیت اور وثنیت کی اس آمیزش کا نتیجہ ہے جو مسیحیت کے غلبہ اور وثنیت (بت پرستی) کی مغلوبیت کی وجہ سے پیش آیا خصوصاً جب مصری بت پرستوں نے اس مذہب کو قبول کیا تو انہوں نے اس عقیدہ کو بہت ترقی دی اور فلسفیانہ دقیقہ سنجیوں کے ساتھ اس کو علمی بحث بنا دیا۔ مسیحیت قبول کر لینے کے بعد بت پرستوں پر جو ردعمل ہوا اس کے نتیجہ میں سے ایک اہم بات یہ تھی کہ ان کی خواہش ہمیشہ یہ رہی کہ وہ کس طرح گذشتہ وثنیت کی موجودہ مسیحیت کے ساتھ مطابقت پیدا کریں؟ تا کہ اس طرح قدیم وجدید دونوں ادیان کے ساتھ ربط قائم رہ سکے، چنانچہ بقول مولانا ابوالکلام آزاد "اسکندریہ کے فلسفہ آمیز اصنامی تخیل سیراپیز (Serapis) سے تثلیثی وحدت کی اصل لی گئی اور ایزیز (Isis) کی جگہ حضرت مریم علیہا السلام کو اور ہورس (Hors) کی حضرت مسیح علیہ السلام کو دی گئی" اور اس یونانی اور مصری فلسفیانہ وثنیت کی بدولت موجودہ مسیحیت میں الوہیت مسیح علیہ السلام اور تثلیث "کلیسہ" کا مقبول عقیدہ بن گیا۔

Marfat.com

یہ عقیدۂ تثلیث ابھی سن طفولیت ہی میں تھا کہ علماء نصاریٰ میں اس کے رد و قبول پر معرکۃ الآراء بحثیں شروع ہوگئیں "نیقاد" کی کونسل میں مشرقی گرجاؤں میں اور خصوصی اور عمومی مجالس میں جب بحث نے طول کھینچا تو کلیسہ نے فیصلہ دیا کہ مسئلہ ثالوث (تثلیث) حق اور اس کے خلاف "الحاد" ہے ان ملحد جماعتوں اور فرقوں میں نمایاں فرقہ "ابیونیین" ہے جو کہتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام انسان محض تھے۔ دوسرا "سابلیین" ہے جس کا خیال ہے کہ خدا ذات واحد ہے اور اب ابن، روح القدس، یہ مختلف صورتیں ہیں جن کا اطلاق مختلف حیثیتوں سے ذات واحد ہی پر ہوتا ہے۔ تیسرا فرقہ "آریوسیین" ہے اس کا عقیدہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اگرچہ "ابن اللہ" ہیں مگر "اب" کی طرح ازلی نہیں ہیں بلکہ کائنات بلند و پست سے قبل "اب" کی تخلیق سے مخلوق ہوا ہے اور اس لیے وہ "اب" سے نیچے اور اس کی قدرت کے سامنے مغلوب و خاضع ہے اور چوتھا فرقہ "مقدونیین" ہے ان کا کہنا ہے کہ "اب" اور "ابن" دو ہی اقنوم ہیں "روح القدس" اقنوم نہیں ہے بلکہ مخلوق ہے۔

کلیسہ نے ان کو اور اسی قسم کے دوسرے فرقوں کو "ملحد" قرار دے کر نیقادی کی کونسل منعقدہ ۳۲۵ء اور قسطنطنیہ کی کونسل منعقدہ ۳۸۱ء کے مطابق ثالوث (تثلیث) کو مسیحی عقیدہ کی بنیاد تسلیم کیا اور فیصلہ دیا کہ "اب" اور "ابن" اور "روح القدس" تینوں جدا جدا مستقل اقنوم (اصل ہیں) اور عالم لاہوت میں تینوں کی وحدت ہی خدا ہے گویا اس طرح ریاضی اور علم ہندسہ کے اٹل اور ناقابل انکار بدیہی مسئلہ کے خلاف یا یوں کہئے کہ بداہۃً عقل کے خلاف یہ تسلیم کر لیا کہ "ایک" تین ہے اور "تین" ایک اور یہ بھی کہا کہ "ابن" ازل ہی میں "اب" سے پیدا ہوا اور "روح القدس" کا صدور بھی ازل ہی میں "اب" سے ہوا ہے اور پھر ۵۸۹ء میں طلیطلہ کونسل نے یہ ترمیم منظور کر لی کہ "روح القدس" کا صدور "اب" سے ہی نہیں بلکہ "اب" اور "ابن" دونوں سے ہوا ہے۔ اس ترمیم کو "لاطینی کلیسہ" نے تو بغیر چون و چرا تسلیم کر لیا اور اس کو کلیسہ کا عقیدہ بنا لیا لیکن "یونانی کلیسہ" اول تو خاموش رہا مگر اس کے کچھ عرصہ کے بعد اس ترمیم کو بدعت قرار دے کر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس باہمی اختلاف نے اس قدر شدید صورت اختیار کر لی کہ "یونانی کلیسہ" اور "کیتھولک لاطینی کلیسہ" کے درمیان کبھی اتفاق و اتحاد پیدا نہ ہو سکا۔

ثالوث یا تثلیث کا یہ عقیدہ دین مسیحی کے رگ و پے میں خون کی طرح ایسا سرایت کر گیا کہ مسیحی کے بڑے فرقوں رومن کیتھولک اور پراٹسٹنٹ کے درمیان سخت بنیادی اختلافات کے باوجود بنیادی طور پر اس میں اتفاق ہی رہا اور صرف یہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ قابل حیرت ہے یہ بات کہ لوتھر کی جماعت اور اصلاح پسند کلیساؤں نے بھی ایک عرصہ دراز تک اس کیتھولک عقیدہ کو ہی بغیر کسی اصلاح و ترمیم کے عقیدہ تسلیم کر لیا البتہ تیرھویں صدی عیسوی میں فرقہ لاہوتی کی اکثریت نے اور جدید فرقوں سوسینیائی، جرمانی، موحدین اور عمومیین وغیرہم نے اس عقیدہ کو نقل و عقل کے خلاف کہہ کر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ [1]

یہ ہے مسیحیت میں عقیدۂ تثلیث کی وہ مختصر تاریخ جس سے یہ حقیقت بخوبی آشکارا ہو جاتی ہے کہ دین مسیحی کی حقیقی صداقت کی تباہی کا راز اسی الحاد اور مشرکانہ بدعت کے اندر پوشیدہ ہے جو صنم پرستانہ تخیل کا رہین منت ہے۔

عقیدۂ ثالوث کیا شے ہے اور "اب" "ابن" "روح القدس" کی تعبیرات کی حقیقت کیا ہے یہ مسئلہ بھی مسیحیت کے ان مباحث میں سے ہے جن کا فیصلہ کن جواب کبھی نہ مل سکا اور جس قدر اس کو صاف اور واضح کرنے کی کوشش کی گئی اس میں الجھاؤ اور

[1] دائرہ المعارف للبستانی ج ۶ ص ۳۰۵ کلمہ (ثالوث)

پیچیدگی کا اضافہ ہی ہوتا گیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ جس عقیدہ کو مسیحیت میں اساسی اور بنیادی حیثیت حاصل تھی وہی "معمہ" بن کر رہ گیا اور قدیم وجدید علماء نصاریٰ کو یہ کہنا پڑا کہ تثلیث میں توحید ہے اور توحید میں تثلیث، یہ مذہب کا ایسا مسئلہ ہے جو دنیا میں حل نہیں ہوسکتا اور دوسرے عالم میں پہنچ کر ہی یہ عقیدہ حل ہوگا۔ اس لیے یہاں اس کو عقل سے سمجھنے کی کوشش کرنا فضول ہے بلکہ خوش عقیدگی کے ساتھ قبول کر لینا ہی نجات کی راہ ہے۔ چنانچہ اواخر انیسویں صدی کے مشہور عیسائی عالم پادری فنڈر نے "میزان الحق" میں یہی بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

تاہم اس صنم پرستانہ فلسفہ کی جو تشریحات کی گئی ہیں ان کو مختصر طور پر یوں سمجھنا چاہیے کہ اس کائنات ہست و بود کو جس میں ہم بس رہے ہیں "عالم ناسوت" کہا جاتا ہے اور ملاء اعلیٰ کہ جس کا تعلق عالم غیب سے ہے وہ اور اس سے ماوراء جہاں نہ زمین و زماں کا گزر اور نہ مکین و مکان کا جہاں سب کچھ ہے لیکن مادیت سے بالاتر اور وراء الوراء ہے اس کا نام "عالم لاہوت" ہے تو جب زیر و بالا اور بلند و پست کچھ بھی نہ تھا اور ازل کی غیر محدود وسعت میں "وقت" ایک بے معنی لفظ تھا اس وقت تین اقنوم [1] تھے "باپ" "بیٹا" "روح القدس" اور ان ہی تین اقانیم کی مجموعی حقیقت کا نام "خدا" ہے۔ رومن کیتھولک، پراٹسٹنٹ اور ان دونوں سے جدا کلیسۂ شرقی تینوں ہی اس پر متفق ہیں اور اسی کو دین مسیحیت کی روح یقین کرتے ہیں اور بڑی جسارت کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں کہ کتاب مقدس کی تصریحات اسی کا اعلان کرتی ہیں۔

اس عجوبہ روزگار عقیدہ نے اس حد پر پہنچ کر جو نئے نئے مباحث و افکار پیدا کیے ان کا مطالعہ کرنے سے دیدۂ حیرت اور چشم عبرت کے لیے بہت کچھ سامان مہیا ہو جاتا ہے، بڑی بڑی مذہبی کونسلوں، بڑے بڑے کلیساؤں کے بشپوں اور پاپاؤں نے اس عقیدہ کی تشریح میں یہ عجیب وغریب مباحث پیدا کیے کہ "اقنوم اول" باپ سے کس طرح اقنوم ثانی بیٹے کی ولادت ہوئی اور پھر باپ سے یا باپ اور بیٹے دونوں سے کس طرح اقنوم ثالث "روح القدس" پھوٹ کر نکلی یا کس طرح اس کا صدور ہوا اور یہ کہ ان کے باہم نسبت کیا ہے اور ان کے جدا جدا کیا القاب وصفات ہیں جو ایک دوسرے کو آپس میں متمائز کرتے ہیں اور پھر جب یہ تثلیث توحید بن جاتی ہے تو اس کی صفات والقاب کی کیا صورت ہو جاتی ہے، نیز یہ کہ جس کو ہم خدا کہتے ہیں اس میں تینوں اقانیم برابر کے شریک ہیں یا کوئی ایک پورا اور دوسرے دو جزوی حصہ دار ہیں اور جزوی شرکت ہے تو کس نسبت اور تعلق سے ہے؟ غرض خدائے برتر کی مقدس اور پاک ہستی کو معاذ اللہ کمہار کے چاک پر رکھا ہوا برتن فرض کر کے جس طرح اس کو بنایا اور تیار کیا ہے اور توحید خالص کو تباہ و برباد کر کے جس طرح شرک وترکیب کا نیا سانچہ ڈھالا ہے دنیائے مذاہب و ادیان کی تاریخ میں ایسا مذہبی تغیر و انقلاب چشم فلک نے نہ کبھی دیکھا نہ سنا ان ھذا لشیء عجاب۔ بہرحال "باپ" "بیٹا" "روح القدس" کی جدا جدا تفصیلات و تشریحات اور پھر وحدت سے ترکیب اور ترکیب سے وحدت کی عجوبہ زا تعبیرات کی ایک بھول بھلیاں ہے جس کا کہیں اور چھور نظر ہی نہیں آتا اور جب کہنے والا ہی لفظی تعبیرات کے علاوہ "حقیقت" سمجھنے سے عاری ہے تو سننے والا کیا خاک سمجھ سکتا ہے۔

باپ: اقانیم ثلاثہ میں "اب" پہلا اقنوم ہے۔ اسی سے اقنوم ثانی کی ولادت ہوئی اور "عالم لاہوت" میں یہ کبھی بھی دوسرے اور تیسرے اقانیم سے جدا نہیں ہوتا، مگر مسیحی فرقوں میں کنیسہ کی عام تعلیم کے مطابق اکثر فرقے یہ کہتے ہیں کہ وحدت لاہوت میں تینوں

[1] اقنوم کے معنی "اصل"

کا درجہ مساوی ہے اور کسی کو کسی پر برتری حاصل نہیں ہے اور آریوسی کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے بلکہ دوسرا اقنوم "بیٹا" اقنوم اول کی طرح ازلی نہیں ہے البتہ عالم بالا و پست سے غیر معلوم مدت پہلے اقنوم اول سے پیدا ہوا ہے اس لیے اس کا درجہ "باپ" کے بعد اور اس سے کم ہے اور مقدونی فرقہ کہتا ہے کہ صرف وہی اقنوم ہیں "باپ" اور "بیٹا" اور "روح القدس" مخلوق ہے اور فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے جس کا پایہ تمام ملائکۃ اللہ سے بلند ہے اور طلیطلہ کی کونسل کا فیصلہ یہ ہے کہ روح القدس "باپ" اور "بیٹا" دونوں سے پھوٹ کر نکلی ہے یا دونوں سے ہی اس کا صدور ہوا ہے مگر قسطنطنیہ کی کونسل روح القدس کو صرف باپ ہی سے صادر ہونا بتلاتی ہے اور قدیم و جدید فرقوں میں سے ایک بڑی جماعت اقنوم ثالث مریم علیہا السلام کی تسلیم کرتی اور روح القدس کے اقنوم ہونے کا انکار کرتی ہے۔

بیٹا: عربی میں "ابن" فرنچ میں "فی"..... اور انگریزی میں (Son) اور اُردو میں "بیٹا" کہتے ہیں، یہ اس شکل انسانی پر بولا جاتا ہے جو عام قانون قدرت کے مطابق مرد و عورت کے جنسی تعلقات کا نتیجہ ہوتا ہے مگر عقیدۂ ثالوث کے مطابق وہ عالم لاہوت میں "باپ" سے جدا بھی نہیں ہے اور پیدا بھی ہے اور پھر بعض کے نزدیک اس کی پیدائش ازلی ہے اور بعض کے نزدیک غیر ازلی، آگے چل کر کہتے ہیں کہ جب "باپ" کی مشیت کا فیصلہ ہوا تو اقنوم ثانی "بیٹا" عالم ناسوت (کائنات ہست و بود) میں مریم کے بطن سے پیدا ہو کر "مسیح" کہلایا اور بعض کا تو یہ دعویٰ ہے کہ خود باپ ہی عالم ناسوت میں بیٹا بن کر مریم کے بطن سے تولد ہوا اور مسیح علیہ السلام کی شکل میں روشناس ہوا اور طرفہ تماشا یہ کہ بعض کے نزدیک تو اقنوم ثانی "ابن" کو اقنوم اول "اب" پر برتری اور تفوق حاصل ہے۔

روح القدس: اسی طرح "روح القدس" کے متعلق بھی سخت اختلاف ہے: کوئی کہتا ہے کہ وہ اقنوم ہی نہیں ہے اس لیے عالم لاہوت میں اس کو الوہیت حاصل نہیں ہے۔ چنانچہ مکدونی اور آریوسی کہتے ہیں کہ وہ ملائکۃ اللہ میں سے ہے اور ان میں سب سے برتر و بلند ہے اور ماراتونیوس کہتا ہے کہ "روح القدس" کی تعبیر مجاز ہے اور اللہ تعالیٰ کے افعال پر مجازاً اس کا اطلاق کیا جاتا ہے ورنہ الگ سے کوئی حقیقت نہیں ہے اس بناء پر اس قول کے قائلین کو "مجازئین" کہا جاتا ہے اور علماء جدید میں کلارک کہتا ہے کہ الہامی کتابوں عہد نامہ قدیم و جدید میں کسی ایک جگہ بھی "الوہیت" کا درجہ نہیں دیا گیا، فرقہ مکدونی نے الوہیت روح القدس کا انکار کرتے ہوئے شد و مد سے یہ کہا ہے کہ اگر جوہر الوہیت میں روح القدس کو بھی دخل ہوتا تو یا وہ مولود ہوتی یا غیر مولود، اگر مولود ہے تو اس کے اور "ابن" کے درمیان کیا فرق رہا اور اگر غیر مولود ہے تو اس کے اور "اب" کے درمیان کیا امتیاز ہے۔

ان کے مقابلہ میں دوسری جماعتیں کہتی ہیں کہ "روح القدس" کو بھی الوہیت حاصل ہے یوسیو رومانی کہتا ہے کہ "روح القدس" کا صدور "اب" اور "ابن" دونوں سے ہوا اور وہ ان کے جوہر نفس سے ہے اور دونوں کے ساتھ وحدت لاہوت میں "الٰہ" ہے اور اثناسیوس کہتا ہے کہ روح القدس کی الوہیت ناقابل انکار ہے اور کتب سماویہ میں روح پر "الٰہ" کا اور اللہ پر "روح" کا اطلاق ثابت و مسلم ہے اور اس کی جانب ان ہی امور کی نسبت کی گئی ہے جن کا تعلق ذاتِ خدا کے ماسوا اور کسی سے نہیں ہے مثلاً تقدیس ذات، معرفت جمیع حقائق وغیرہ اور یہ عقیدہ قدیم سے چلا آتا ہے جیسا کہ نظم وسولجیا سے ثابت ہے جس کی قدامت تالیف سب کے نزدیک مسلم ہے اس میں الوہیت "روح القدس" کا اعتراف موجود ہے اور مولٹ لفیلو پیٹرس نے انکار الوہیت روح پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ نصاریٰ کے نزدیک خدائے حقیقی کی توحید کا تثلیث میں مضمر ہونا ایک مسلم حقیقت ہے پھر روح کو الوہیت سے خارج کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا اور مکدونیوں کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے مار اثناسیوس کہتا ہے کہ کتب سماوی میں روح کو ابن نہیں کہا گیا بلکہ روح

Marfat.com

الاب اور روح الابن کے اطلاقات پائے جاتے ہیں لہٰذا اس کو "ابن" یا "اب" کہنا صحیح نہیں اور نہ اس کو الوہیت سے نکال کر مخلوق کہنا درست ہوسکتا ہے اور ادراک بشری عاجز ہے کہ ان فلسفیانہ بحثوں سے "روح القدس" کی حقیقت تک پہنچ سکے البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فقط تولید (پیدا ہونا) ہی تنہا ایسا واسطہ نہیں ہے جو "اب" کے ساتھ قائم ہو بلکہ انبثاق (صدور یا پھوٹ نکلنا) بھی ایک شکل ہوسکتی ہے مگر ہم اس دنیا میں تولید و انبثاق کے درمیان فرق ظاہر کرنے پر قادر نہیں ہیں البتہ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ تولید و انبثاق دونوں کا "اب" کے ساتھ ازلی و ابدی اور تلازم کا تعلق ہے۔ پس ہمارے لیے یہ ہرگز مناسب نہیں ہے کہ فلاسفہ قدیم (فلاسفہ یونان) کی طرح "روح القدس" اور "اب" کے درمیان فلسفیانہ موشگافیوں کے ذریعہ وہ اعتقادات قبول کرلیں جو انہوں نے خدا سے صدور ارواح کے متعلق پیدا کر لیے ہیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ وہ اختلافات بھی پیش نظر رہنے چاہئیں جو گزشتہ سطور میں بیان ہوچکے ہیں کہ بعض کلیسہ "روح القدس" کا فقط اقنوم اول (باپ) سے صادر ہونا مانتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ "باپ" اور "بیٹا" دونوں سے اس کا صدور ہوا ہے، یہ اختلاف بھی عیسائی فرقوں کے درمیان سخت کشاکش کا سبب رہا ہے کیونکہ ۳۸۱ء میں منعقدہ کونسل قسطنطنیہ نے "منشور ایمانی" میں یہ واضح کردیا تھا کہ روح القدس کا صدور "باپ" ہی سے ہوا ہے اور عرصہ تک یہی عقیدہ مسیحی دنیا میں نافذ رہا لیکن ۴۴۷ء میں اول ہسپانیہ کے کلیسہ نے پھر فرانس کے کلیسہ نے اور اس کے بعد تمام لاطینی رومن کلیساؤں نے اس ترمیم کو جزء عقیدہ بنایا کہ "روح القدس" کا صدور اقنوم اول (باپ) اور اقنوم ثانی (بیٹا) دونوں سے ہوا ہے، عیسائی علماء کہتے ہیں کہ دراصل یہ بحث ۸۶۶ء میں سب سے پہلے شرق کے بطرق فوتیوس نے اس لیے پیدا کی کہ اس کی اور اس کی جماعت کی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح شرق (یونان) کے کلیسہ کو غرب (روم) کے کلیسہ سے جدا کردیا جائے اور مشرق و مغرب کے کلیساؤں کا اتحاد باقی نہ رہنے دیا جائے، اسی خیال کی تائید و تقویت کے لیے ۱۰۴۳ء میں بطریق میخائیل کرولاریوس نے اس عقیدہ کو بہت جلد شائع کیا اور آخر کار صدیوں تک ان اختلافات نے کلیسہ ہائے مشرق و مغرب کے درمیان مخالفانہ کشمکش کو قائم رکھا اور دونوں کلیسہ ایک دوسرے پر یہ الزام قائم کرتے رہے کہ مخالف کلیسہ نے مسیحیت میں الحاد و بدعت کی آمیزش کرکے حقیقی مذہب کو مٹا ڈالا ہے اور رومن کیتھولک اور پراٹسٹنٹ کی بالعموم اور کلیساؤں کے مختلف فرقوں کی بالخصوص کشمکش کا یہ سلسلہ اس وقت تو انتہائی شدت اختیار کرچکا تھا اور باہم ہولناک خونریزیوں اور بہیمانہ مظالم کا جہنم بن چکا تھا جبکہ اسلام اعتقادات کی سادگی، اعمال صالحہ کی پاکیزگی اور اپنی علمی و عملی روحانیت کی شگفتگی کی بدولت "امن عام" اور "رحمت" کا نیر درخشاں بنا ہوا تھا۔

ازمنہ مظلمہ اور اصلاح کنیسہ کی آواز:

یہ وہ زمانہ تھا جب عیسائیوں کے مذہبی کلیسہ معمولی معمولی اختلافات کی بناء پر پوپ کی حکومت اور پیروان پوپ کی حکومتوں کے ذریعہ ایک دوسری جماعت کو گردن زدنی اور کشتنی قرار دیتی اور ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کو وحشت ناک عذابوں میں مبتلاء کر کے قتل کردیا کرتی تھیں اسی بناء پر مؤرخین تاریخ کے اس دور کی ازمنہ مظلمہ (زمانہ ہائے تاریک) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

قرآن نے حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق جس حقیقت اور صداقت کا اظہار کیا تھا پوپ اور کلیسا سے مرعوبیت نے اگرچہ ایک مدت مدید تک عیسائیوں کو اس طرف متوجہ نہیں ہونے دیا مگر پھر بھی یہ صدائے حق اثر کیے بغیر نہ رہ سکی اس کی تفاصیل اگرچہ خاتم

الانبیاء محمد ﷺ کی حیات طیبہ میں مذکور ہوں گی لیکن یہاں صرف اس قدر اشارہ کرنا مقصود ہے کہ رومن کیتھولک، پراٹسٹنٹ اور دوسرے فرقوں نے بغیر کسی جھجک کے سینٹ پال کی تحریف (تثلیث) مسیحیت کا بنیادی عقیدہ تسلیم کر لیا تھا اور اگرچہ بعض چھوٹی جماعتوں یا افراد نے کبھی کبھی اس کے خلاف آواز اٹھائی مگر وہ آواز دب کر رہ گئی اور نقار خانہ میں طوطی کی صدا سے زیادہ اس کی حیثیت نہ بن سکی مثلاً ۳۲۵ء اور ۳۸۱ء میں جب نیقادی کونسل اور قسطنطنیہ کونسل نے تثلیث کو دین مسیحی کی بنیاد قرار دیا اس وقت ابوئیین نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام صرف انسان ہیں اور الوہیت کا ان سے کوئی علاقہ نہیں اور سابلیین کہتے تھے کہ اقانیم ثلاثہ، تین مختلف جوہر نہیں ہیں بلکہ وحدت لاہوتی کی مختلف صورتیں اور تعبیریں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ صرف اپنی ذات واحد کے لیے اطلاق کرتا ہے تاہم اس وقت تک چونکہ پوپ اور کلیسہ کے فیصلے خدائی فیصلے سمجھے جاتے تھے اور بشپ اور پاپا "اربابًا من دون اللّٰہ" یقین کیے جاتے تھے اس لیے ان اصلاحی آوازوں کو "الحاد" کہہ کر دبا دیا گیا مگر جب صلیبی جنگوں نے عیسائیوں کو مسلمانوں کے اتنے قریب کر دیا کہ انہوں نے اسلام کے اعتقادی اور عملی نظام کا بہت کچھ نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اسلام سے متعلق بطارقہ (Batariqa) بساقفہ (Bishaqifa) کی غلط بیانی اور بہتان ان پر ظاہر ہونے لگی تب ان میں بھی آزادی فکر نے کروٹ لی اور کورانہ تقلید کو شکست و ریخت کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ چنانچہ لوتھر کی آواز پہلی صدائے حق تھی جس نے جرأت کے ساتھ "اربابًا من دون اللّٰہ" کے بتوں کو ماننے سے انکار کر دیا اور پوپ کے مقابلہ میں کتاب مقدس کی پیروی کی دعوت دی مگر آپ کو تعجب ہوگا یہ سن کر کہ پوپ کی جانب سے لوتھر کے خلاف جو الحاد اور بددینی کے الزامات لگائے گئے تھے ان میں سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ یہ در پردہ "مسلمان" ہوگیا ہے اور پاپا کے خلاف اس کی صدا قرآن کی صدائے بازگشت ہے۔

بہرحال یہی وہ صدائے اصلاح تھی جو بلاشبہ اسلام کی دعوت تفکر و تعقل سے متاثر ہو کر آہستہ آہستہ "اصلاح کنیسہ" کے نام سے مسیحی دنیا میں گونج اٹھی اور آگ کی طرح ہر طرف اس کے شعلے نظر آنے لگے ان ہی اصلاحات میں سے ایک اہم اصلاحی تخیل یہ بھی تھا کہ عقیدۂ ثالوث کتاب مقدس (عہدنامہ جدید) کے قطعاً خلاف ہے۔ چنانچہ تیرھویں صدی عیسوی میں قدیم لاہوتی فرقہ کے جمہور نے نسطوری فرقہ کے جماعتی فیصلہ نے اور جدید جماعتوں میں سے سوسینیانیین .... جرمانیین .... موحدین..... اور عمومیین اور دوسری جماعتوں نے تعلیم کلیسا کے خلاف مذہبی بغاوت کرتے ہوئے صاف کہہ دیا کہ تثلیث کا عقیدہ نقل و عقل دونوں کے خلاف اور ناقابل تسلیم ہے اور اگرچہ قومی و مذہبی عصبیت نے ان کو اسلامی عقیدہ کا پیرو ہونے سے باز رکھا تاہم انہوں نے عقیدۂ تثلیث کی مختلف شکلوں کے ساتھ ایسی تعبیرات کرنی شروع کر دیں جس سے عقیدۂ ثالوث باطل ہو کر توحید الٰہی کے پاک اور مقدس جراثیم پیدا ہونے لگے مثلاً سوئڈنبرگ نے کہا: "اقانیم ثلاثہ" "باپ" "بیٹا" "روح القدس" کا تعلق حضرت مسیح علیہ السلام کی ذات کے ماسوا ذات احدیت سے نہیں ہے یعنی مسیح علیہ السلام کی ذات اپنی طبع لاہوتی کے پیش نظر "باپ" ہے اور عالم ناسوت میں انسانی شکل کی تقید کی وجہ سے "بیٹا" اور اقنوم ثانی" ہے اور اس حیثیت سے کہ روح القدس کا صدور اس سے ہوا ہے وہ اقنوم ثالث "روح" ہے غرض "ثالوث" کا تعلق صرف حضرت مسیح علیہ السلام سے ہے اور کانٹ (Cant) کہتا ہے کہ عقیدۂ ثالوث کے یہ معنی نہیں ہیں کہ "باپ" "بیٹا" "روح القدس" بلکہ یہ عالم ذات میں خدائے برتر کی تین بنیادی صفات کی جانب اشارہ ہے جو باقی تمام صفات کے لیے مصدر اور منبع کی حیثیت رکھتی ہیں اور وہ "قدرت" (اب) حکمت (ابن) اور "محبت" (روح) ہیں یا اللہ کے ان تین افعال کی جانب اشارہ ہے جو "خلق" "حفظ" اور "ضبط" کے

Marfat.com

نام سے بھی تعبیر کیے جاتے ہیں اور ہیگن اور شیلنگ نے اس خیال کی کافی اشاعت کی کہ عقیدۂ ثالوث حقائق کی طرح کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ایک تخیلی نظریہ ہے ان کی مراد یہ ہے کہ جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے خدائے برتر کی ذات وحدہ لاشریک لہٗ ہے اور مسیح علیہ السلام مخلوق خدا، لیکن عام خیال و تصور میں جب ہم لاہوتی عالم کی جانب پرواز کرتے ہیں تو ہمارا خیال اس عالم میں خدا، مسیح علیہ السلام اور روح القدس کو "اب" "ابن" اور "روح" کی تعبیرات دیتا اور ان کے باہم تعلق کو اقانیم ثلاثہ کی حیثیت میں دیکھتا ہے۔

"عقلیین" "لوتھرین" اور "موحدین" اور "جرمانیین" کے علاوہ بھی بہت لوگ ہیں جو سابلیین کے عقیدہ کو اختیار کر کے ایک بڑی جماعت کی شکل اختیار کر رہے ہیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یورپ کی نشاۃ جدید میں بھی عام طور پر تمام کلیساؤں کا ثالوث (تثلیث) پر ہی عقیدہ ہے اور ان کے نزدیک اس کلمہ کی تعبیر وہی ہے جو چوتھی صدی عیسوی میں متعدد مذہبی کونسلوں نے کی اور جو بلاشبہ شرک جلی اور توحید کے یکسر منافی ہے۔

قرآن اور عقیدۂ تثلیث:

نزول قرآن کے وقت جمہور مسیحی جن بڑے فرقوں میں تقسیم تھے ثالوث کے متعلق ان کا عقیدہ تین جدا جدا اصولوں پر مبنی تھا ایک فرقہ کہتا تھا کہ مسیح علیہ السلام عین خدا ہے اور خدا ہی بشکل مسیح علیہ السلام دنیا میں اتر آیا ہے اور دوسرا فرقہ کہتا ہے کہ مسیح ابن اللہ (خدا کا بیٹا) ہے۔ اور تیسرا کہتا تھا کہ وحدت کا راز تین میں پوشیدہ ہے۔ باپ، بیٹا، مریم اور اس جماعت میں بھی دو گروہ تھے اور دوسرا گروہ حضرت مریم علیہا السلام کی جگہ "روح القدس" کو اقنوم ثالث کہتا تھا، غرض وہ حضرت مسیح علیہ السلام کو ثالث ثلاثہ (تین میں کا تیسرا) تسلیم کرتے تھے اس لیے قرآن کی صدائے حق نے تینوں جماعتوں کو جدا جدا بھی مخاطب کیا ہے اور یکجا بھی اور دلائل و براہین کی روشنی میں مسیحی دنیا پر یہ واضح کیا ہے کہ اس بارہ میں راہ حق ایک اور صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ مسیح علیہ السلام مریم علیہا السلام کے بطن سے پیدا شدہ انسان اور خدا کا سچا پیغمبر اور رسول ہے باقی جو کچھ بھی کہا جاتا ہے وہ باطل محض ہے...... خواہ اس میں تفریط ہو جیسا کہ یہود کا عقیدہ ہے کہ العیاذ باللہ وہ شعبدہ باز اور مفتری تھے یا افراط ہو جیسا کہ نصاریٰ کا عقیدہ ہے کہ وہ خدا ہیں اور خدا کے بیٹے ہیں یا تین میں کے تیسرے ہیں۔

قرآن عزیز نے صرف یہی نہیں کیا کہ نصاریٰ کے تردیدی پہلو کو ہی اس سلسلہ میں واضح کیا ہو بلکہ اس کے علاوہ حضرت مسیح علیہ السلام کی شان رفیع کی اصل حقیقت کیا ہے اور عند اللہ ان کو کیا قربت حاصل ہے، اس پر بھی نمایاں روشنی ڈالی ہے تاکہ اس طرح یہود کے عقیدہ کی بھی تردید ہو جائے اور افراط و تفریط سے جدا راہ حق آشکارا نظر آنے لگے۔

حضرت مسیح علیہ السلام خدا کے مقرب اور برگزیدہ رسول ہیں:

﴿قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ۟ؕ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۟ۙ﴿۳۰﴾ وَّ جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ ۪ وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ﴿۳۱﴾ وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ ؗ وَ لَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا ﴿۳۲﴾ وَ السَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَ یَوْمَ اَمُوْتُ وَ یَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا ﴿۳۳﴾﴾ (مریم: ۳۰-۳۳)

"(مسیح علیہ السلام نے کہا) بیشک میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس نے مجھ کو نبی بنایا ہے اور مجھ کو مبارک ٹھہرایا جہاں بھی میں رہوں اور اس نے مجھ کو نماز کی اور زکوٰۃ کی وصیت فرمائی جب تک بھی زندہ رہوں اور اس نے مجھ کو میری والدہ کے لیے نیکوکار بنایا اور مجھ کو سخت گیر اور بدبخت نہیں بنایا مجھ پر سلامتی ہو جب میں پیدا ہوا جب میں مرجاؤں اور جب حشر کے لیے زندہ اٹھایا جاؤں۔"

﴿اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَ جَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۟ وَ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓىِٕكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ۝ وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَ اتَّبِعُوْنِ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝﴾ (الزخرف: ۵۹-۶۱)

"وہ (مسیح علیہ السلام) نہیں ہے مگر ایسا بندہ جس پر ہم نے انعام کیا اور میں نے اس کو مثال بنایا ہے بنی اسرائیل کے لیے اور اگر ہم چاہتے تو کر دیتے ہم تم میں سے فرشتے زمین میں چلنے پھرنے والے اور بلاشبہ وہ (مسیح علیہ السلام) نشان ہے قیامت کے لیے۔ پس اس بات پر تم شک نہ کرو اور میری پیروی کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔"

﴿وَ اِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ﴾ (الصف: ۶)

"اور (وہ وقت یاد کرو) جب عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نے کہا اے بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمہاری جانب اللہ کا رسول ہوں تصدیق کرنے والا ہوں جو میرے سامنے ہے تورات اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہے۔"

حضرت مسیح علیہ السلام نہ خدا ہیں نہ خدا کے بیٹے:

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾ (المائدہ: ۱۷)

"بلاشبہ ان لوگوں نے کفر اختیار کر لیا جنھوں نے یہ کہا "بیشک اللہ وہی مسیح بن مریم" ہے" کہہ دیجیے کہ اگر اللہ یہ ارادہ کر لے کہ مسیح بن مریم (علیہما السلام)، مریم اور کائنات زمینی پر جو کچھ بھی ہے سب کو ہلاک کر ڈالے تو کون شخص ہے جو اللہ سے (اس کے خلاف) کسی شے کے مالک ہونے کا دعویٰ کر سکے اور اللہ کی بادشاہت ہے آسمانوں کی اور زمین کی وہ جو چاہتا ہے اس کو پیدا کر سکتا ہے اور اللہ ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے۔"

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَ قَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ

اَنۡصَارٍ ۝۷۲﴾(المائدہ:۷۲)
"بلاشبہ ان لوگوں نے کفر اختیار کیا جنھوں نے کہا بلاشبہ اللہ وہی مسیح بن مریم (علیہما السلام) ہے۔حالانکہ مسیح (علیہ السلام) نے یہ کہا: اے بنی اسرائیل اللہ کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے بیشک جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے پس یقیناً اللہ نے اس پر جنت کو حرام کردیا ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ظالموں کے لیے کوئی مدد نہیں ہے۔"

﴿وَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبۡحٰنَهٗ ؕ بَلۡ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوۡنَ ۝۱۱۶﴾(البقرہ:۱۱۶)
"اور انہوں نے کہا: اللہ نے "بیٹا" بنالیا ہے وہ ذات تو ان باتوں سے پاک ہے بلکہ (اس کے خلاف) اللہ کے لیے ہی ہے جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے ہر شے اللہ کے لیے تابع دار ہے۔"

﴿اِنَّ مَثَلَ عِيۡسٰى عِنۡدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ۝۵۹﴾ (آل عمران:۵۹)
"بلاشبہ عیسیٰ (علیہ السلام) کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے کہ اس کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر اس کو کہا ہو جا تو وہ ہو گیا۔"

﴿يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِىۡ دِيۡنِكُمۡ وَلَا تَقُوۡلُوۡا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الۡحَـقَّ ؕ اِنَّمَا الۡمَسِيۡحُ عِيۡسَى ابۡنُ مَرۡيَمَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَ لۡقٰٮهَاۤ اِلٰى مَرۡيَمَ وَرُوۡحٌ مِّنۡهُ ۖ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَلَا تَقُوۡلُوۡا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوۡا خَيۡرًا لَّـكُمۡ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبۡحٰنَهٗۤ اَنۡ يَّكُوۡنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيۡلًا ۝۱۷۱﴾(النساء:۱۷۱)
"اے اہل کتاب اپنے دینی معاملہ میں حد سے نہ گزرو اور اللہ کے بارے میں حق کے ماسوا کچھ نہ کہو بلاشبہ مسیح ابن مریم (علیہما السلام) اللہ کے رسول ہیں اور اس کا کلمہ ہیں جس کو اس نے مریم پر ڈالا (یعنی بغیر باپ کے اس کے حکم سے مریم کے بطن میں وجود پذیر ہوئے) اور اس کی روح ہیں۔ پس اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور تین (اقانیم) نہ کہو اس سے باز آجاؤ تمہارے لیے بہتر ہوگا بلاشبہ اللہ خدائے واحد ہے پاک ہے اس سے کہ اس کا بیٹا ہو، اسی کے لیے ہے (بلا شرکت غیرے) جو کچھ بھی ہے آسمانوں اور زمین میں اور کافی ہے اللہ "وکیل" ہو کر۔"

﴿بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ اَنّٰى يَكُوۡنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمۡ تَكُنۡ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَىۡءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ۝۱۰۱﴾(الانعام:۱۰۱)
"وہ (خدا) موجد ہے آسمانوں اور زمین کا اس کے لیے بیٹا کیسے ہو سکتا ہے اور نہ اس کی بیوی ہے اور اس نے کائنات کی ہر شے کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر شے کا جاننے والا ہے۔"

﴿مَا الۡمَسِيۡحُ ابۡنُ مَرۡيَمَ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَاُمُّهٗ صِدِّيۡقَةٌ ؕ كَانَا يَاۡكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ﴾(المائدہ:۷۵)

Marfat.com

"مسیح بن مریم (علیہ السلام) نہیں ہیں مگر خدا کے رسول بلاشبہ ان سے پہلے رسول گزر چکے ہیں اور ان کی والدہ صدیقہ ہیں، یہ دونوں کھانے کھاتے تھے، (یعنی دوسرے انسانوں کی طرح کھانے پینے وغیرہ امور میں وہ بھی محتاج تھے)۔"

﴿لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَ لَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَ مَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ يَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ۝﴾ (النساء: ۱۷۲)

"ہرگز مسیح (علیہ السلام) اس سے ناگواری نہیں اختیار کرے گا کہ وہ اللہ کا بندہ کہلائے اور نہ مقرب فرشتے حتیٰ کہ روح القدس "جبرئیل" ناک بھویں چڑھائیں گے اور جو عبادت سے ناگواری کا اظہار کرے اور غرور اختیار کرے تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنی جانب اکٹھا کرے گا یعنی جزا و سزا کے دن سب حقیقت حال کھل جائے گی۔"

﴿وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝﴾ (التوبہ: ۳۰)

"اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر خدا کا بیٹا ہے اور نصاریٰ کہتا ہے مسیح (علیہ السلام) خدا کا بیٹا ہے یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں ریس کرنے لگے اگلے کافروں کی بات کی اللہ ان کو ہلاک کرے کہاں سے پھرے جاتے ہیں۔"

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۙ وَ لَمْ يُوْلَدْ ۝ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝﴾ (الاخلاص: ۱-۴)

"اے (محمدؐ) کہہ دیجئے اللہ یکتا ہے، اللہ بے نیاز ہستی ہے، نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا اور کائنات میں کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔"

قرآن نے اس سلسلہ میں اپنی صداقت اور اصلاح عقائد و اعمال کا جو مدلل اور واضح اعلان کیا اس کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ موجودہ کتاب مقدس کے محرف اور مسخ کر دیے جانے کے باوجود جس شکل و صورت میں آج موجود ہے وہ کسی ایک مقام پر بھی "ثالوث" کے اس عقیدہ کا پتہ نہیں دیتی جس کی تفصیلات و تشریحات ابھی سطور بالا میں علماء نصاریٰ، مذہبی کونسلوں اور کلیساؤں سے نقل ہو چکی ہیں اور بجز تعبیر کے جگہ جگہ حضرت مسیح علیہ السلام کی زبان سے خدا کو "باپ" اور خود کو "بیٹا" ظاہر کیا گیا ہے اس کے لیے اور کوئی ثبوت واضح اور مصرح طور پر مہیا نہیں ہے۔ پس اگر ہم اس سے قطع نظر بھی کر لیں کہ یہ تعبیرات "تحریفی" اور صنم پرستی کے تخیل کی رہین منت ہیں اور اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیں کہ خدائے برتر کی جانب سے سچی الہامی انجیل میں بھی یہ تعبیرات موجود تھیں تب بھی ان سے نصاریٰ کا عقیدۂ "تثلیث" کسی طرح صحیح ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ "ابن" کا لفظ اگرچہ حقیقی معنی کے لحاظ سے اس انسان پر بولا جاتا ہے جو کسی کی صلب یا کسی کے بطن سے مادہ منویہ کے ذریعہ پیدا ہوا ہو، تاہم محاورات زبان اور اہل زبان کے استعمالات و اطلاقات شاہد ہیں کہ یہ لفظ کبھی مجاز کے طور پر اور کبھی تشبیہ یا کنایہ کے طریق سے اور بھی مختلف معانی پر بولا جاتا ہے مثلاً ایک بڑی عمر کا شخص اپنے سے چھوٹے کو مجازاً "ابن" (بیٹا) کہہ دیا کرتا ہے یا بادشاہ اپنی رعایا کو "اولاد" کہہ کر خطاب کرتا ہے یا استاد اپنے شاگردوں کو "بیٹا" کہہ کر پکارتا ہے یا جو شخص کسی علم و ہنر کا ماہر یا اس کی خدمت میں سرشار ہوتا ہے تو اس کو کنایۃً اس علم و ہنر کا بیٹا کہہ کر یاد کرتے ہیں اور کہا کرتے ہیں "ابن القانون" "ابن الفلسفہ" "ابن الفلاحۃ" "ابن الحدادہ" یا دنیا طلبی کی حرص و آرزو میں اگر حد

سے گزر چکا ہے تو اس کو "ابن الدراہم" "ابن الدنانیر" کہہ دیا کرتے ہیں، اسی طرح مسافر کو "ابن السبیل" مشہور شخصیت کو "ابن جلا" بڑے ذمہ دار انسان کو "ابن لیلہا" آنے والے دن سے بے پرواہ شخص کو "ابن یومیہ" دنیا ساز ہستی کو "ابن الوقت" کہتے ہیں یا جس کے اندر کوئی وصف نمایاں طور پر موجود ہوتا ہے تو اس وصف کی جانب لفظ ابن کو منسوب کر کے ذات موصوف کو یاد کرتے ہیں مثلاً صبح کو "ابن ذکاء" کہتے ہیں اور ان تمام مثالوں سے زیادہ یہ کہ انبیاء بنی اسرائیل اپنی امتوں کو ابناء اور اولاد کے ساتھ ہی خطاب کرتے اور نصائح و مواعظ میں یہ ظاہر فرماتے ہیں کہ امم و اقوام انبیاء علیہم السلام کی روحانی اولاد ہوتی ہیں۔

اور یہی حال "اب" اور "باپ" کے اطلاقات و استعمالات کا ہے، ایک جھوٹا اپنے بڑے کو، ایک ضرورت منداپنے مربی کو، ایک شاگرد اپنے استاد کو، ایک امتی اپنے نبی رسول کو "اب" اور "باپ" کہنا فخر سمجھتا ہے حالانکہ ظاہر ہے کہ اس قسم کے تمام اطلاقات مجاز، کنایہ اور تشبیہ کے طور پر کیے جاتے ہیں اسی طرح بے نظیر مقرر اور خطیب کو "ابوالکلام" بہترین انشاء پرداز کو "ابوالقلم" ماہر نقاد کو "ابوالنظر" ڈراؤنی اور ہیبت ناک شے کو "ابوالہول" سخی کو "ابوالنجاد" فن کاشتکاری کے ماہر کو "ابوالفلاحہ" صنعت و حرفت کے حاذق کو "ابوالصنع" شب و روز بولتے رہتے ہیں۔

تو ان اطلاقات کے پیش نظر بآسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ کتاب مقدس میں ذات احدیت پر اب (باپ) کا اطلاق رب حقیقی کی حیثیت میں اور حضرت مسیح علیہ السلام پر ابن (بیٹا) کا اطلاق محبوب و مقبول الٰہی کی حیثیت میں ہوا ہے یعنی جس طرح باپ اور بیٹے کے درمیان محبت و شفقت کا رشتہ مضبوط و مستحکم ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ محبت و شفقت کا وہ رشتہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے اور اس کے مقدس پیغمبر مسیح علیہ السلام کے درمیان قائم ہے، ایک صحیح حدیث میں بھی نبی اکرم ﷺ نے اس استعارہ اور تشبیہ کو استعمال فرماتے ہوئے کہا ہے:

الخلق عیال اللہ "تمام مخلوق خدا کا کنبہ ہے۔"

پس روزمرہ کے محاورات و اطلاقات کو نظر انداز کر کے کتاب مقدس کے لفظ "اب" اور "ابن" کے ایسے معانی و مطالب مراد لینا جو صریح شرک کے مترادف ہوں بلکہ اس سے بھی زیادہ قباحت و شناعت کے ساتھ خدا کی ہستی کو تین اقانیم سے مرکب ظاہر کرتے اور خدا کے حصے بخرے بناتے ہوں، کسی طرح بھی جائز نہیں ہو سکتا اور صریح ظلم اور اقدام شرک ہے (تعالی اللہ علوا کبیرا) بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ ان ہی اناجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ ارشاد مذکور ہے۔ ❁

"میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ تم آسمان کو کھلا ہوا اور خدا کے فرشتوں کو اوپر جاتے ہوئے اور ابن آدم (مسیح علیہ السلام) پر اترتے دیکھو گے۔"

اور باب ۱۳ میں بصراحت خود کو "رسول" کہا ہے:

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ نوکر اپنے مالک سے بڑا نہیں ہوتا اور نہ "رسول" اپنے بھیجنے والے سے۔"

اور باب ۴ میں ہے:

"کیونکہ یسوع نے خود گواہی دی کہ "نبی" اپنے وطن میں عزت نہیں پاتا۔"

اور باب ۳ میں ہے:

❁ باب ۱ آیت ۵۱

Marfat.com

"اور آسمان پر کوئی نہیں چڑھا سوائے اس کے جو آسمان سے اترا یعنی ابن آدم جو آسمان میں ہے۔"

اور باب ٦ میں ہے:

"پس جو معجزہ اس نے دکھایا وہ لوگ اسے دیکھ کر کہنے لگے جو نبی دنیا میں آنے والا تھا وہ فی الحقیقت یہی ہے۔"

اور انجیل متی میں ہے: ❶

"لیکن اس لیے کہ تم جان لو کہ ابن آدم (مسیح علیہ السلام) کو زمین پر گناہوں کے معاف کرنے کا اختیار ہے۔"

علاوہ ازیں اگر عہد نامہ جدید میں حضرت مسیح علیہ السلام کے لیے "ابن" کا اطلاق موجود ہے تو نیکوکار انسانوں پر بھی "ابناء اللہ" اور بدکاروں کے لیے "ابناء ابلیس" کا اطلاق پایا جاتا ہے۔ چنانچہ انجیل متی میں ہے۔ ❷

"مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیونکہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے۔"

اور انجیل یوحنا میں ہے: ❸

"یسوع نے ان سے کہا: اگر تم ابراہیم کے فرزند ہوتے تو ابراہیم کے سے کام کرتے...... انہوں نے اس سے کہا ہم حرام سے پیدا نہیں ہوئے ہمارا ایک باپ ہے یعنی خدا۔"

لہٰذا عقیدۂ تثلیث میں نصاریٰ کے لیے موجودہ کتاب مقدس سے بھی کوئی حجت و دلیل نہیں ملتی اور اس لیے بغیر کسی شک و ریب کے یہ کہنا حق ہے کہ یہ عقیدۂ تثلیث صنم پرستانہ عقائد کے امتزاج کا نتیجہ ہے۔

لائق توجہ بات:

یہ بات کبھی فراموش نہیں ہونی چاہیے کہ ادیان ملل سابقہ کے مسخ و تحریف میں تحریف کرنے والوں کو اس سے بہت زیادہ مدد ملی کہ بنیادی عقائد میں صراحت اور وضاحت کی جگہ وقت کے معبروں، مفسروں اور ترجمانوں نے کنایات، استعارات اور تشبیہات سے بہت زیادہ کام لیا، ان تعبیرات کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب ان مذاہب حق کا صنم پرستوں اور فلسفیوں سے واسطہ پڑا اور انہوں نے کسی نہ کسی طرح اس دین حق کو قبول کر لیا تو اپنے فلسفیانہ اور مشرکانہ افکار و خیالات کے لیے ان ہی استعارات اور تشبیہات کو پشت پناہ بنایا اور آہستہ آہستہ ملت حقیقی کی شکل و صورت بدل کر اس کو معجون مرکب بنا ڈالا، اسی حقیقت کے پیش نظر قرآن عزیز نے وجود باری، توحید، رسالت، الہامی کتب، ملائکۃ اللہ، غرض بنیادی عقائد میں ذو معنی الفاظ، پر پیچ تشبیہات اور توحید میں خلل انداز استعارات و کنایات کی بجائے واضح صریح اور غیر مبہم اطلاقات کو اختیار کیا ہے تاکہ کسی ملحد، زندیق اور مشرک فلسفی کو توحید خالص میں شرک اور اوہام و ظنون کی نکتہ آفرینیوں کا موقع ہاتھ نہ آنے پائے اور اگر کوئی شخص اس کے باوجود بھی بے جا جسارت کرے تو خود قرآن عزیز کی نصوص صریحہ ہی اس کے الحاد کو پاش پاش کر دیں۔

کفارہ:

موجودہ مسیحیت کا دوسرا عقیدہ جس نے دین مسیحیت کی حقیقت کو برباد کر ڈالا "کفارہ" کا عقیدہ ہے اس کی بنیاد اس تخیل پر

❶ باب ۹ آیت ٦ ❷ باب ۵ آیت ۹ ❸ باب ۸ آیت ۴۰۔۴۱

قائم ہے کہ تمام کائنات" جس میں نیکوکار اور انبیاء ورسل سب ہی شامل ہیں" ابتداء آفرینش سے ہی گنہگار ہے، آخر رحمت الٰہی کو جوش آیا اور اس کی مشیت نے ارادہ کیا کہ بیٹے کو کائنات ارضی میں بھیجے اور وہ مصلوب ہو کر اول و آخر تمام کائنات کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے اور اس طرح دنیا کو نجات اور مکتی حاصل ہو سکے لیکن اس عقیدے کے قوام بنانے کے لیے چند ضروری اجزاء کی ضرورت تھی جن کے بغیر یہ عمارت کھڑی نہیں کی جا سکتی تھی اس لیے "عہد رسول" میں سب سے پہلے مسیحیت نے یہودیت کے اس عقیدے کو تسلیم کر لیا کہ ان کو صلیب پر بھی چڑھایا گیا اور مار بھی ڈالا گیا اور اس کو شرف قبولیت دینے کے بعد دوسرا قدم یہ اٹھایا کہ "الوہیت" کے باوجود مسیح علیہ السلام کا صلیب پانا اور قتل ہونا اپنے لیے نہیں بلکہ کائنات کی نجات کے لیے تھا چنانچہ جب اس پر یہ حادثہ گزر لیا تو اس نے پھر الوہیت کی چادر اوڑھ لی اور عالم لاہوت میں باپ اور بیٹے کے درمیان دوبارہ لاہوتی رشتہ قائم ہو گیا۔

پس جب مذہب میں خدائے برتر کے ساتھ صحت عقیدہ اور نیک عملی مفقود ہو کر نجات کا دارومدار عمل کردار کی بجائے "کفارہ" پر قائم ہو جائے اس کا حشر معلوم؟

قرآن نے اسی لیے جگہ جگہ یہ واضح کیا ہے کہ نجات کے لیے عقیدہ کی صحت یعنی صحیح خدا پرستی اور نیک عملی کے ماسوا کوئی دوسری راہ نہیں ہے اور جو شخص بھی اس "راہ مستقیم" کو ترک کر کے خوش عقیدگی اور اوہام و ظنون کو اسوہ بنائے گا اور نیک عملی اور صحیح خدا پرستی پر گامزن نہ ہو گا بلاشبہ گمراہ ہے اور راہ مستقیم سے یکسر محروم۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ هَادُوْا وَ النَّصٰرٰی وَ الصّٰبِـِٕیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝۶۲﴾ (البقرہ: ٦٢)

"جو لوگ اپنے کو مومن کہتے ہیں اور جو یہودی ہیں اور جو نصاریٰ ہیں اور جو صابی ہیں ان میں سے جو بھی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لے آیا اور اس نے نیک عمل کیے تو یہی وہ شخص ہیں جن کا اجر ان کے پروردگار کے پاس ہے، نہ ان پر خوف طاری ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔"

یعنی قرآن کی دعوت اصلاح ادیان و ملل کا مقصد یہ نہیں ہے کہ یہودی، نصرانی صابی گروہوں کی طرح ایک نیا گروہ مومنوں کے نام سے اس طرح اضافہ کر دے کہ گویا وہ بھی ایک قومی، نسلی یا ملکی گروہ بندی ہے کہ خواہ اس کی خدا پرستانہ زندگی اور عملی زندگی کتنی ہی غلط اور برباد ہو یا سرے سے مفقود ہو مگر اس گروہ بندی کا فرد ہونے کی وجہ سے ضرور کامیاب اور خدا کی جنت و رضا کا مستحق ہے۔

قرآن کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے بلکہ وہ یہ اعلان کرنے آیا ہے کہ اس کی دعوت حق سے پہلے کوئی شخص کسی بھی گروہ اور مذہبی جماعت سے تعلق رکھتا ہو اگر اس نے (قرآن کی تعلیم حق) کے مطابق خدا پرستی اور نیک عملی کو اختیار کر لیا ہے تو بلاشبہ وہ نجات یافتہ اور کامیاب ہے ورنہ تو وہ اگر مسلمان گھر میں پیدا ہوا پلا اور بڑھا اور اسی سوسائٹی میں زندگی گزار کر مر گیا مگر قرآن کی دعوت حق کے مطابق خدا پرستی اور نیک عملی دونوں سے محروم رہا یا مخالف تو اس کے لیے نہ کامیابی ہے اور نہ فوز و فلاح۔ باقی رہا مسیحیت کے کفارہ کا خصوصی مسئلہ تو قرآن نے اس کے ابطال اور تردید کے لیے یہ راہ اختیار کی کہ جن بنیادوں پر اس کو قائم کیا گیا تھا ان کی ہی جڑ کاٹ دی، چنانچہ گذشتہ سطور میں صلیب اور قتل مسیح علیہ السلام کے انکار، رفع الی السماء کے اثبات کے مبحث میں اس پر کافی روشنی پڑ چکی ہے۔

حضرت محمد ﷺ

○ محمد ﷺ اور قرآن ○ بشارات النبی ﷺ ○ صبح سعادت ○ تاریخ ولادت کی تحقیق ○ نسب مبارک یتیمی ○ بت پرستی سے نفرت ○ خلوت پسندی اور عبادت الٰہی کا ذوق ○ حقیقت وحی ○ صاحب وحی کی معرفت کی وجدانی دلیل ○ بعثت ○ حدیث بخاری ○ بشریت اور نبوت کا باہمی تعلق ○ نبی اور مصلح ○ کیفیت وحی اور بعض مستشرقین کی گمراہی ○ نزول وحی کا پہلا دور ○ نزول وحی کا دوسرا دور ○ دعوت وارشاد کی پہلی منزل ○ دعوت وارشاد کی دوسری منزل ○ دعوت وارشاد کی تیسری منزل ○ (بعثت عامہ) دعوت اسلام کا مجمل خاکہ ○ قرآن اور تجدید دعوت ○ توحید ورسالت ○ یوم آخرت ○ اسرائی (معراج) ○ ہجرت ○ غزوات ○ غزوۂ بدر ○ غزوۂ اُحد ○ غزوۂ خندق یا احزاب ○ واقعہ حدیبیہ ○ معاہدہ صلح ○ فتح مکہ (الفتح الاعظم) ○ حاطب بن بلتعہ کا واقعہ ○ بت شکنی ○ خطبۂ غزوۂ حنین ○ غزوۂ تبوک اور قبول توبہ کا عجیب واقعہ ○ غزوات اور نتائج وبصائر ○ تبنی ○ خرافی داستان ○ بصائر ○ بنو نضیر ○ بصیرت ○ واقعہ افک ○ موعظت بناء فاسق ○ موعظت ○ مسجد ضرار ○ وفات یا وصل بالرفیق الاعلیٰ ○ عبرت وموعظت

محمد ﷺ اور قرآن:

قرآن کلام الٰہی ہے اور خاتم الانبیاء محمد ﷺ اس کے مہبط ہیں وہ ان پر نازل ہوا ہے، قرآن علم ویقین کی روشنی ہے اور ذات اقدس ﷺ اس کا عملی نمونہ اسوہ اور نقشہ ہیں ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ قرآن رشد وہدایت ہے اور محمد ﷺ راشد وہادی، قرآنی حق وصداقت کے لیے دعوت وپیغام ہے اور نبی اکرم ﷺ اس کے داعی اور پیغامبر، اس لیے قرآن کا ہر ایک جملہ اور اس کی ہر ایک آیت کسی نہ کسی حیثیت میں ذات قدسی صفات سے تعلق رکھتی ہے تو اب کس طرح یہ کہا جائے کہ قرآن میں اتنی جگہ اس مقدس ہستی کا ذکر ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے چند صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ آپ نبی اکرم ﷺ کے کچھ حالات زندگی ہم کو سنائیں، صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے نگاہ تعجب سے دریافت کیا: کیا تم قرآن نہیں پڑھتے جو مجھ سے خلق نبی کے متعلق سوال کرتے ہو۔ (فان خلقہ کان القران) آپ ﷺ کی تمام اخلاقی زندگی قرآن کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی تھی، قرآن جو کچھ کہتا ہے محمد ﷺ نے اسی کو کر دکھایا۔

Marfat.com

پس قرآن کے کسی حصہ کو سامنے لانا گویا حیات طیبہ کا پیش نظر لے آنا ہے۔
البتہ قرآن عزیز نے جن آیات میں آپ ﷺ کے اسمائے گرامی یا اوصاف عالی کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ﴿یا ایہا النبی﴾ اور ﴿یا ایہا الرسول﴾ کہہ کر مخاطب کیا، اس کی تفصیل مسطورۂ ذیل نقشہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس نقشہ میں نبی، اور رسول، کے علاوہ جن اسماء اور اوصاف کی تفصیل مسطور ہے وہ یہ ہیں:

(۱) محمد	(۲) احمد	(۳) عبداللہ	(۴) شاہد	(۵) بشیر	(۶) نذیر
(۷) مبشر	(۸) مذکر	(۹) عزیز	(۱۰) رؤف	(۱۱) رحیم	(۱۲) امین
(۱۳) مزمل	(۱۴) مدثر	(۱۵) منذر	(۱۶) ہادی	(۱۷) یٰسین	(۱۸) رحمۃ
(۱۹) نعمت	(۲۰) طٰہٰ	(۲۱) نور	(۲۲) حق	(۲۳) سراج منیر	(۲۴) شہید
(۲۵) داعی الی اللہ	(۲۶) خاتم النبیین	(۲۷) نبی	(۲۸) رسول	(۲۹) عبدہ	

نقشہ

نام یا صفت	نام سورۃ	آیات
(۱) محمد	آل عمران	۱۴۴
	احزاب	۴۰
	محمد	۱
	الفتح	۲۹
(۴) شاہد	احزاب	۴۶
	مزمل	۱۵
(۶) بشیر	اعراف	۱۸۸
	ھود	۲
	سبا	۲۸
	فاطر	۲۴
(۸) مذکر	الغاشیہ	۲۱
(۹) سراج منیر	فاطر	۴۶
(۱۰) داعی الی اللہ	فاطر	۴۶
(۱۱) حق	یونس	۱۰۸

نام یا صفت	نام سورۃ	آیات
(۲) احمد	صف	۶
	حدید	۹
(۳) عبداللہ	جن	۱۹
	کہف	۱
	الفتح	۹
(۵) مبشر	احزاب	۴۶
	الفتح	۹
	فرقان	۵۶
	نساء	۱۹
(۷) نذیر	بقرہ	۱۱۹
	عنکبوت	۵۰
	نساء	۱۹
	اعراف	۱۸۸
	ھود	۲

Marfat.com

(۱۲) عزیز	توبہ	۱۲۸
(۱۳) رؤف	توبہ	۱۲۸
(۱۴) رحیم	توبہ	۱۲۸
(۱۵) امین	دخان	۱۹
(۱۶) نور	مائدہ	۱۵
(۱۷) نعمۃ	بقرہ	۲۳۱
	نمل	۸۱
(۱۸) ھادی	روم	۵۳
(۱۹) رحمۃ	انبیاء	۱۱۷
(۲۰) طٰہٰ	طٰہٰ	۱
(۲۲) مزمل	مزمل	۱
(۲۴) منذر	نمل	۹۲
(۲۶) نبی	آل عمران	۱۶۱
	اعراف	۱۵۷،۱۵۶
	مائدہ	۸۱
	انفال	۶۴،۶۵،۶۷،۷۰
	براۃ	۶۱،۷۳،۱۱۳
	حجرات	۲
	احزاب	۱،۲۸،۳۲،۳۸،۴۶
	فاطر	۵۰،۵۲
	تحریم	۱،۳،۸،۹
	طلاق	۱
	ممتحنہ	۱۲
	حجر	۸۹
	فاطر	۲۳،۲۴،۲۷،۴۲،۴۶
	الفتح	۹
	الذاریات	۵۰_۵۱
	ملک	۸،۹،۱۷،۲۶
	فرقان	۵۶
	البقرہ	۱۱۹
	سبا	۲۸،۴۶
	صٓ	۷
	احقاف	۵
(۲۱) یٰسٓ	یٰسین	۱
(۲۳) مدثر	مدثر	۱
(۲۵) خاتم النبیین	احزاب	۴۰
(۲۷) رسول	بقرہ	۲۵۰،۱۴۶
	آل عمران	۲۳،۸۱،۸۲،۱۰۱،۱۳۲
		۱۵۳،۱۷۲،۱۷۹،۱۸۳
	نساء	۱۴،۵۲،۶۱،۶۴،۶۹،۷۹
		۸۰،۱۰۰،۱۱۵،۱۶۲،۱۷۰
	مائدہ	۱۵،۳۲،۴۱،۵۵،۵۶،۶۷
		۸۲،۹۲،۹۹،۱۴۰
	اعراف	۱۵۷،۱۵۸
	انفال	۱،۱۲،۲۴
	توبہ	۱،۲،۷،۱۶،۲۴،۲۶،۲۹
		۳۳،۵۴،۵۹،۶۳،۶۵،۸۰
		۸۱،۸۴،۸۶،۸۸،۹۱،۹۴

(۲۷) رسول	نحل	۱۱۳
	اسراء	۹۳
	حج	۷۸
	مومن	۷۸
	زخرف	۲۹
	جمعہ	۲
	صف	۹،۱۱،۶۶
	حشر	۴،۶،۷،۸
	ممتحنہ	۱
	جن	۲۲،۲۸
	الحاقہ	۴۲
	نور	۴۷،۴۸،۵۱،۵۲،
		۵۴،۵۶،۶۲،۶۳
(۲۸) شہید	بقرہ	۱۴۳
	نساء	۴۱
	نحل	۸۹
	حج	۷۸
	فرقان	۷،۲۷،۳۰،۴۱
	طلاق	۱۱

		۹۷،۹۹،۱۰۵،۱۰۷،۱۲۸
(۲۷) رسول	عنکبوت	۱۸
	حجرات	۱،۳،۸،۱۴،۱۵
	الفتح	۹،۱۲،۱۳،۱۷،۲۶،۲۷
		۲۸،۹۶
	احزاب	۶،۲۱،۲۹،۳۱،۳۳،۳۹،۴۰
	فاطر	۵۲،۵۷،۷۱
	دخان	۱۴،۱۹
	حدید	۷،۸،۲۹
	مجادلہ	۵،۸،۹،۱۲،۱۳،۲۰،۲۲
	محمد	۳۲،۳۳
	منفقون	۱،۷،۸
	تغابن	۸،۱۲

(۲۹) عبدہ	الفرقان	۱
	اسراء	۱

قرآن عزیز اور صحیح احادیث میں نبی اکرم ﷺ کے جن اسماء وصفات کا ذکر ہے علماء اسلام نے اس پر مستقل تصانیف کی ہیں اور ابن دحیہ پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے اس پر قلم اٹھایا۔ان کے علاوہ ابن کثیر، بیہقی، ابن عساکر (رحمہم اللہ) جیسے محدثین نے ان تمام احادیث وآثار کو یکجا جمع کر دیا ہے جن میں آپ ﷺ کے اسمائے صفات اور القاب مذکور ہیں، مشہور محدث ابوبکر بن عربی نے شرح ترمذی میں ان کی شمار چونسٹھ کرائی ہے بعض نے ننانوے بعض نے تین سو اور بعض اہل علم نے ان کو ایک ہزار تک پہنچایا[1] ہے۔ مگر یہ کثرت تعداد اس لیے صحیح نہیں ہے کہ اس شمار میں ان تمام انتسابات کو بھی شامل کر لیا گیا ہے جو کسی مناسبت حال سے آپ ﷺ

[1] فتح الباری ج ۶ ص ۴۳۵

Marfat.com

کی جانب منسوب ہیں اگرچہ بحیثیت اسماء صفات یا القاب کے ان کا اطلاق ذات اقدس پر صحیح نہیں ہو سکتا مثلاً آپ ﷺ نے انبیاء علیہم السلام اور اپنے درمیان صفت نبوت کے تعلق کو ظاہر اور ختم نبوت کو واضح کرنے کے لیے خود کو قصر نبوت کی آخری لبنہ (اینٹ) فرمایا ہے تو جن بزرگوں کو آپ ﷺ کے اسماء وصفات کی کثرت سے شغف تھا انہوں نے صفات النبی میں "اللبنہ" کو بھی شمار کر لیا۔ [1]

بخاری کی ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "میرے پانچ نام ہیں: محمد ہوں، احمد ہوں، ماحی ہوں یعنی کفر و شرک کو مٹانے والا ہوں، حاشر ہوں۔ اس لیے کہ قیامت کے دن تمام کائنات سے پہلے میں حضرت حق کی بارگاہ میں حاضر ہوں گا۔ اور عاقب ہوں (بقول زہری آخری پیغمبر ہوں) حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: پانچ کا یہ عدد حصر کے لیے نہیں ہے بلکہ اس جگہ ان اسماء وصفات کا ذکر ہے جو کتب سابقہ اور امم واقوام ماضیہ میں آپ ﷺ سے متعلق مشہور ومعروف اور بشارات وپیشین گوئیوں میں مسطور تھے۔ ابن حجر رحمہ اللہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ باتفاق علماء اسلام قرآن میں آپ ﷺ کے جو اسماء وصفات مذکور ہیں وہ یہ ہیں:

الشاهد، البشير، النذير، المبين، الداعي الى الله، السراج المنير، المذكر، الرحمة، النعمة، الهادي، الشهيد، الامين، المزمل، المدثر۔ لیکن ہماری فہرست کے مقابلہ میں یہ فہرست ناقص ہے جن اسماء وصفات کا ذکر نقشہ میں ہے وہ بھی جمہور کے نزدیک مسلم، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ احادیث میں مذکور اسماء وصفات میں سے حسب ذیل صفات بہت مشہور ومعروف ہیں: المتوكل، المختار، المصطفى، الشفيع المشفع، الصادق المصدوق۔

بہرحال محمد اور احمد ﷺ دو اسماء اعلام (نام ہیں) اور باقی اسماء صفات والقاب ہیں اور قرآن میں آپ ﷺ کے نام پاک کے انتساب سے ایک سورت کا نام سورۂ محمد ہے جس کے شروع میں ہی آپ ﷺ کا اسم گرامی مذکور ہے:

﴿وَ اٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ﴾ (محمد:۲)

اور صرف ایک جگہ سورۂ صف میں احمد منقول ہے یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کی اس بشارت کے تذکرہ میں یہ نام آیا ہے جو آپ ﷺ کی آمد سے متعلق انہوں نے بنی اسرائیل کو سنائی تھی:

﴿وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ ؕ﴾

یہ حقیقت بھی قابل فراموش نہیں ہے کہ آپ ﷺ کے اسماء وصفات محض رسمی نہیں ہیں کہ والدین نے جو چاہا نام رکھ دیا اور احباب واصحاب نے جس صفت ولقب سے جی چاہا پکار لیا بلکہ ان اسماء صفات کا آپ ﷺ کی زندگی اور آپ ﷺ کے اخلاق و اعمال کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے جیسا کہ ابھی ماحی، حاشر اور عاقب کے متعلق خود زبان وحی ترجمان سے سن چکے ہو یا مثلاً محمد اس ہستی کو کہتے ہیں جس کے تذکرے ہمیشہ خوبی اور نیک گوئی کے ساتھ ہوتے ہوں، یہ انبیاء سابقین علیہم السلام کی بشارات اور مستقبل میں تذکرہائے حیات کی جانب اشارہ ہے اور احمد اس ذات پر اطلاق ہوتا ہے جو سب سے زیادہ حمد الٰہی کے لیے نغمہ سنج ہو یہ ذات اقدس کی عبدیت کاملہ اور انسان کامل ہونے کو ظاہر کرتا ہے بلاشبہ آپ ﷺ خدا پرست انسانوں کے لیے مبشر و بشیر اور فتنہ جو مفسدوں، کافروں اور مشرکوں کے لیے منذر و نذیر ہیں، روز قیامت، صادق و کاذب دونوں پر شاہد و شہید ہیں، چشم حق بین اور گوش حق نیوش کے

[1] فتح الباری ج ۶ ص ۴۳۶

Marfat.com

لیے مذکر (ناصح) ہیں، راہ حق سے بھٹکے ہوؤں کے لیے ہادی اور خدا سے بھاگے ہوؤں کے لیے داعی ہیں ان کا وجود رحمۃ ہے کائنات عالم کے لیے اور ان کی ہستی نظام کائنات کے لیے نعمت ہے، جہل و شرک کے لیے نور ہیں اور پیغام الٰہی کے لیے نبی و رسول، مصائب و آلام میں عزیز ہیں اور نوع انسانی کے ہر ایک گوشۂ حیات کے لیے رؤف و رحیم، ان کی صدا، صدائے حق ہے اور ان کی ذات الصادق الامین، قرآن خدا کا آخری پیغام ہے اس لیے وہ خاتم النبیین ہیں، ان کی بعثت عالمگیر ہے اس لیے طٰہٰ و یٰسین ہیں اور آسمان نبوت کے سراج منیر ہیں اور کائنات و رسالت کے بشیر و نذیر، عالم ادیان و ملل کی سلطانی کے باوجود گدائے کملی پوش ہیں اس لیے مزمل ہیں اور مدثر، پھر باایں ہمہ حسن و کمال ﴿اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ﴾ اور ﴿لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ﴾ کے مصداق ہیں اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَ سَلِّمْ وَ بَارِكْ عَلَيْهِ۔ خدا پر توکل اس کا شعار ہے اس لیے متوکل اس کا وصف عالی وقار ہے اور وہ خدائے برحق کا برگزیدہ و مختار ہے بارگاہ الٰہی میں ابرار و مقربین سے بھی زیادہ مصطفیٰ، مجتبیٰ نیکوکار و صالحین کے لیے الشفیع المشفع اور ہر ایک شعبہ ہائے حیات میں الصادق المصدوق ہے۔ (ﷺ)

ہم جانتے ہیں کہ اظہار مقصد کے لیے یہ اشارات کافی نہیں ہیں بلکہ اپنے معنوی مناسبات کے لحاظ سے ہر ایک وصف و نام قرآن سے شہادت کا طالب ہے اور قرآن کی شہادت بلاشبہ ہر ایک گوشہ کی تفصیل کے لیے شاہد عدل لیکن افسوس کہ کتاب کا موجودہ ترتیبی نقشہ اس کا متحمل نہیں ہے اس لیے صرف آیات کے حوالجات اور ارشادات پر ہی اکتفا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

بشارات النبی ﷺ:

﴿وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾﴾ (آل عمران: ۸۱)

"اور (وہ وقت یاد کرو) جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد کیا کہ میں تم کو جو کچھ کتاب اور حکمت عطاء کروں اور پھر تمہارے پاس وہ پیغمبر آئے جو ان کتابوں کی تصدیق کرتا ہو جو تمہارے پاس ہیں تم ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور اس کی مدد کرنا (پھر) اللہ نے فرمایا کیا تم اس عہد کا اقرار کرتے ہو اور اس کو میرا اہم عہد سمجھ کر قبول کرتے ہو تو انہوں نے کہا بیشک ہم اقرار کرتے ہیں اللہ نے فرمایا اب تم اس عہد پر گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ بنتا ہوں۔"

حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اس آیت "میثاق" میں اس عہد و میثاق کا تذکرہ ہے جو ازل میں تمام انبیاء و رسل علیہم السلام سے خاتم الانبیاء ﷺ کے متعلق لیا گیا، خطاب اگرچہ براہ راست انبیاء علیہم السلام سے ہے مگر مقصود و مراد میں ان کی امتیں بھی شامل ہیں کیونکہ عمومی طور پر ان ہی کے ذریعہ وفاء عہد کا مظاہرہ ہونے والا تھا۔

اس عہد میثاق کو اس درجہ اہمیت کیوں حاصل ہے؟ یہ بات کچھ تمہید کی محتاج ہے مادیات و روحانیت پر فاعل مختار ایک ہی ہستی ہے اور وہ خدا ہے مگر مادیات میں خدائے برتر کے جاری قانون فطرت کا ہم شب و روز مشاہدہ کرتے رہتے ہیں اور وہ ہم کو محسوس نظر آتا ہے اس کے برعکس عالم روحانیات حواس خمسہ سے بلند احساسات تعقل و تفکر کا محتاج ہے یہاں وجدان و شعور جب عقل و فکر کو رہنما بناتے اور دونوں راہنما ریب و شک اور اوہام و ظنون سے محفوظ "سلیم" بن کر رہنمائی کا حق ادا کرتے ہیں تو انسان کے سامنے روز

روشن کی طرح یہ حقیقت چمک اٹھتی ہے کہ خدائے واحد کی احدیت و یکتائی عالم ما یات اور روحانیت میں ایک ہی قسم کے قانون فطرت کو نافذ رکھتی ہے۔

اب ذرا دیدۂ عبرت کو وا کیجئے اور کائنات ہست و بود پر نظر ڈالیے تو یہ حقیقت ہر جگہ ابھری ہوئی ملے گی کہ ذات واحد کے ماسواء یہاں کائنات کی ہر ایک شے کے لیے دو ہی سرحدیں مقرر ہیں آغاز و انجام اور درمیان کی تمام کڑیاں نشوو ارتقاء کے لیے وقف ہیں ہر ایک چیز شروع ہوتی اور درمیانی دور میں ترقی پذیر رہتی اور پھر حد کمال کو پہنچ کر اپنی ضرورت کو پورا کر دیتی ہے اس کو انجام اور شروع کو آغاز کہتے ہیں۔

روحانیات میں بھی یہی سلسلہ جاری ہے نسل انسانی کا جب آدم علیہ السلام سے آغاز ہوا تو مادی وجود کے ساتھ خدا کی معرفت یعنی خدا پرستی کی امانت کو بھی ساتھ لایا وہ اگر ایک جانب نسل انسانی کے مادی باپ تھے تو دوسری جانب خدا کی بخشی ہوئی ہدایت و صداقت کے لیے "نبی" اور "ایلچی" بھی تھے اور جب کہ خدا کی ہستی ایک اور اس کی بنیادی صداقت و ہدایت کا پیغام بھی ایک ہے تو ضروری ہوا کہ نوع انسانی کی رشد و ہدایت اور خدا پرستی کی بنیادی تعلیم کا سلسلہ بھی ایک ہی لڑی میں پرو یا جائے اور آغاز سے انجام تک اس سلسلہ کی تمام کڑیاں ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہوں کہ ان میں سے کسی ایک کی بھی تکذیب گویا پورے سلسلۂ روحانیت کی تکذیب کے مرادف ہو۔ چنانچہ اس حقیقت کو قرآن نے اس طرح ظاہر کیا ہے:

﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ (البقرہ: ۲۸۵)

"ہم ایمان و تصدیق میں خدا کے کسی ایک پیغمبر کے درمیان بھی تفریق جائز نہیں رکھتے۔"

اور اسی کو زبان وحی ترجمان نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

((نحن بنو علات دیننا واحد)).

"ہم تمام انبیاء ورسل کی تعلیمات اصل و بنیاد میں اسی طرح ایک ہیں جیسا کہ علاتی بھائی کہ ان سب کا باپ ایک ہی ہے۔"

پھر اس سلسلۂ روحانیت کی اگرچہ تمام کڑیاں ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ ہیں۔ مگر آغاز اور نشوونما اور دور کمال و انجام کے پیش نظر اسی طرح باہم فرق مراتب رکھتی ہیں جس کا مظاہرہ ہم کو عالم مادیات کے مختلف سلسلوں میں نظر آتا ہے اور جس کو ہم فطری (Natural) کہتے ہیں اور ان درجات و مراتب میں بھی درجہ کمال کو جس سے کہ انجام کی سرحد ملتی ہے سب سے زیادہ رفعت و بلندی حاصل ہوتی ہے کیونکہ وہی اس سلسلہ کا محور و مرکز (Center) اور قطب رحی (چکی کی کیلی) ہوتا اور وابستہ و پیوستہ کی منزل مقصود سمجھا جاتا ہے۔

چنانچہ کائنات کی ہر شے کی طرح خود عالم انسانی نے بھی اس ربع مسکوں پر عہد طفولیت گزارا ہے، اس وقت دنیائے انسانی ایک چھوٹے سے کنبے کی طرح آباد تھی اور نسل انسانی کا باپ ہی روحانی طبیب بھی تھا لیکن جب سلسلۂ بود و ماند آہستہ آہستہ خاندانوں، برادریوں قبیلوں سے آگے بڑھ کر قوموں اور جغرافیائی نسلوں میں تقسیم ہونے لگا اور وحدت نے کثرت کی ہی شکل نہیں اختیار کر لی بلکہ کثرت میں بھی تنوع پیدا ہونے لگا تو ان مادی نشوونما اور ترقیوں کے ساتھ ساتھ روحانی رشد و ہدایت نے بھی نقطۂ

Marfat.com

وحدت پر قائم رہتے ہوئے تنوع اور کثرت کی شکل اختیار کر لی یعنی ہر ایک قوم و ملک میں جدا جدا ہادی و رہنما اور پیغمبر مبعوث ہونے لگے بلکہ بعض حالات میں ایک قوم میں بیک وقت متعدد نبیوں نے دعوت حق میں ایک دوسرے کی اعانت کا فرض انجام دیا۔ اگرچہ ان کی دعوتوں کی بنیاد سر تا سر ایک ہی "اصل و بنیاد" پر قائم تھی۔

﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝﴾ (البقرہ: ۲۱۳)

"ابتداء میں ایسا تھا کہ لوگ الگ الگ گروہوں میں بٹے ہوئے نہیں تھے ایک ہی قوم و جماعت تھے (پھر ایسا ہوا کہ باہم دگر مختلف ہو گئے اور الگ الگ ٹولیاں بن گئیں) پس اللہ نے (یکے بعد دیگر) نبیوں کو مبعوث کیا وہ (ایمان و عمل کی برکتوں کی) بشارت دیتے اور (انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈراتے تھے۔ نیز ان کے ساتھ کتاب الٰہی نازل کی گئی تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کرنے لگے تھے ان میں وہ فیصلہ کر دینے والی ہو (اور تمام لوگوں کو راہ حق پر متحد کر دے) جو لوگ باہم دگر مختلف ہوئے تو اس لیے نہیں ہوئے کہ ہدایت سے محروم اور حقیقت سے بے خبر تھے، نہیں وحی الٰہی کے واضح احکام ان کے سامنے تھے مگر پھر بھی محض آپس کی ضد اور مخالفت سے اختلاف کرنے لگے تھے بالآخر اللہ نے ایمان والوں کو (دین کی) وہ حقیقت دکھا دی جس میں لوگ مختلف ہو رہے تھے۔ اور اللہ جسے چاہتا ہے دین کی سیدھی راہ دکھلا دیتا ہے۔"

﴿وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۝﴾ (یونس: ۱۹)

"اور (ابتداء میں) انسانوں کی ایک ہی امت تھی پھر الگ الگ ہو گئے اور اگر تمہارے پروردگار کی جانب سے پہلے سے ایک بات نہ ٹھہرا دی گئی ہوتی تو جن باتوں میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں ان کا فیصلہ کبھی کا ہو چکا ہوتا۔"

لیکن خدائے واحد کی جانب سے رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ اگرچہ وقتی تقاضا کے پیش نظر ہزاروں برس تک قوموں اور ملکوں میں تنوع اختیار کیے رہا۔ تاہم وہ اپنے مقصد وحدت کو فراموش نہ کر سکا اور بنیادی وحدت کے ساتھ اس عارضی کثرت کو بھی ایک ہی نقطۂ وحدت پر لانے کے لیے اس وقت تک برابر حرکت کرتا رہا جب تک کہ اپنے مرکز وحدت اور مقصد کمال کو نہ پا سکا۔

یعنی خدا کی صداقت کا پیغام اگرچہ جدا جدا قوموں اور ملکوں میں نبیوں اور پیغمبروں کی زبانی پہنچایا جاتا رہا اور گو ان تمام پیغامات میں فروعی اور وقتی تنوع سے قطع نظر اساسی اور بنیادی وحدت قائم رہی مگر خدا کی وحدانیت اور اس کے پیغام کی اساسی وحدت کا تقاضہ یہی تھا کہ یہ مختلف دعوتیں اور پیغامات سمٹ کر ایک ایسے نقطہ اور مرکز پر آ جائیں کہ وہ تمام کائنات کے لیے بیک وقت اور رہتی دنیا تک ایک ہی پیغام بن کر اپنی نمود دکھلائے اور ایک ایسا پیغمبر مبعوث ہو جس کی بعثت، بعثت عام ہو اور جس کی دعوت، عالمگیر

دعوت ہوتا کہ پھر اس تنوع اور کثرت کی ضرورت باقی نہ رہے۔

عالم روحانیات کی اپنی "مثل اعلیٰ" یا اپنے محور و مرکز کی جانب یہ حرکت جب کہ عالم مادیات کے نشوونما وارتقاء کے متناسب حالات سے وابستہ تھی اور خالق کائنات کا قانون فطرت جب کہ دونوں سمتوں میں ایک ہی اصل پر کارفرما ہے تو یہ بھی ازبس ضروری ہوا کہ روحانیت کے کمال و ارتقاء کا یہ دور مادی عالم کے ایسے دور کے ساتھ رونما ہو کہ کائنات انسانی کے ارتقاء دماغی و عقلی کی استعدادات اپنے رشد وکمال کے ایسے نقطہ پر پہنچ جائیں کہ حجاب مستقبل میں مستور تمام ترقیاں اسی ارتقاء کا نتیجہ کہلائیں اور گو اس سلسلہ میں ایک مدت کیوں نہ ہو جائے مگر کائنات ارضی کا یہ پورا مادی کارخانہ اسباب مادی کی بناء پر ایک کنبہ اور ایک خاندان بن کر رہ جائے اور ملکوں اور قوموں کی بہتات وکثرت کے باوجود کسی ایک گوشہ کے حرکت وسکون کے اثر سے تمام کائنات متاثر ہونے پر مجبور ہو جائے تاکہ اس وقت عالم روحانیات کا آخری نقطۂ ارتقاء کائنات انسانی کے عقل و دماغ کو اپنی دعوت کی یکتائی و وحدت سے متاثر کر سکے اور دنیا دانستہ یا نادانستہ اسی کے بتلائے ہوئے سوسائٹی کے نظام کو آہستہ آہستہ اپنا کر عملاً خدا کا ایک کنبہ بن جائے اور مساوات عالم اور اخوت ہمہ گیر کا مظاہرہ کر دکھائے اور نتیجہ یہ نکلے کہ دین حق صرف تعلیم قرآن ہی میں منحصر ہو کر رہ جائے۔

تاریخ اقوام وملل شاہد ہے کہ قرآن کی دعوت واصلاح کی صدائے حق نے جب چھٹی صدی عیسوی میں دنیا کو پکارا ہے اس وقت دنیا کے تمام مذاہب وادیان خود اصحاب مذاہب کے تاریخی اقوال کے مطابق اپنی حقیقی روشنی کو یکسر فراموش کر چکے تھے ❁ اور دنیا کے ہر گوشے اور ہر سمت میں مذہب و دھرم اور نظام سوسائٹی تنگی وتاریکی اختیار کر چکا تھا اس وقت قرآن کی آواز پہلی آواز تھی جس نے دنیا کے مذاہب اور ان کی سوسائٹی کے ابتر نظام میں نیا انقلاب پیدا کر دیا اور اقوام وامم نے بہ عجلت یا بہ دیر، اعتراف واقرار کے ساتھ یا حاسدانہ انکار کے ساتھ مذہب اور سوسائٹی دونوں میں اسی کی اصطلاحات کو اپنایا اور قبول اصلاحات کے بغیر آنے والی دنیا میں اپنے وجود کو قائم نہ رکھ سکے۔

توحید کامل اور خالص خدا پرستی، نسل وخاندان یا کفارہ کی جگہ خدا پرستی اور نیک عملی پر مدار نجات، نسلی غرور وتفاخر کا انہدام، کاسٹ سسٹم کا خاتمہ، حقوق انسانیت میں تمام افراد انسانی کی مساوات، اخوت عام کی داغ بیل، رواجی غلامی کے خلاف اصلاح و انقلاب کی تشکیل، عورتوں کے لیے حقوق انسانیت میں مساوات کا اعلان اور حقوق صنفی میں امتیازی احکامات، انقلاب و اصلاح، وراثت، ازدواجی زندگی میں ظالمانہ رواج کا خاتمہ اور جدید مفید اصلاحات (خلع وطلاق وغیرہ) زکوٰۃ کے وجوب، سود وقمار کی حرمت اور دوسری اصلاحات کے ذریعہ اقتصادی نظام میں بنیادی انقلاب، انفرادی اور اجتماعی ملکیت کی تسلیم اور دونوں کے مابین تجدیدی اعتدال کا اعلان سیاسی اور ملکی نظام میں بادشاہت شخصی اور پارٹی اقتدار کے خاتمہ کے ساتھ شوروی نظام کی تشکیل ایسے اہم امور ہیں کہ آج کی دنیا میں ہر ایک انصاف پسند عاقل کے نزدیک ان کی صداقت وافادیت تسلیم ہے اور اگر یہ صحیح ہے تو بلاشبہ یورپ وایشیا میں افریقہ وامریکہ میں سوسائٹی کے نظام اور مذہب ودھرم کی اصلاح کے نام سے جو صدائیں بھی اس تعلیم اور اعلان حق کے بعد اٹھیں اگر بغیر کسی تعصب کے تاریخی انقلابات پر غور کیجئے گا تو ان میں بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی صدا کی بازگشت پائیں گے جو چھٹی صدی عیسوی میں فاران کی چوٹی سے بلند ہوئی اور جس نے ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾ کو تاریخ عالم میں سچ کر دکھایا۔

❁ اس سلسلہ کے حوالجات آئندہ تعلیم الاسلام اور مسئلہ خاتم النبیین کے مبحث میں ذکر ہوں گے۔

تاریخی حقائق کی اس روشنی میں اب پھر ہم کو گذشتہ مضمون کی جانب واپس جانا چاہیے کہ جبکہ مادی استعدادات نشوونما پا رہے تھے اور چند صدیوں بعد جو قوموں کے انقلابات و اصلاحات کے لیے چند برسوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں، مادی اسباب کی بدولت یہ سارا کارخانہ عالم ایک کنبہ بن جانے والا تھا۔ اس وقت از بس ضروری ہوا کہ "وحدت مذہب" کی روحانی صدا بلند ہو اور اس کی صدائے حق کسی خاص قوم اور ملک کی بجائے کائنات کے ہر گوشہ کے لیے یکساں حیثیت رکھے۔

پس منشائے تقدیر الٰہی یہ ہوا کہ ایسے پیغام اور پیغامبر کی نصرت وحمایت کے لیے ازل ہی میں انبیاء و رسل سے عہد و میثاق لیا جائے اور ان کو مطلع کیا جائے کہ جب وہ پیغام کامل اور "آخری صدائے حق" بلند ہو جس کا تعلق رہتی دنیا تک تمام کائنات ارضی کے ساتھ یکساں طور پر وابستہ ہے تو وہ اور ان کی امتیں اس کو قبول کریں اور اس کی مدد فرض سمجھیں کیونکہ کائنات روحانی کا یہی مرکز وحدت اور نقطۂ مثل اعلیٰ ہے۔ چنانچہ یہی وہ عہد میثاق ہے جس کو تمام امتوں نے اپنے اپنے دور میں اپنے پیغمبروں اور نبیوں کی معرفت "بشارات" کی شکل میں سنا اور آج بھی دنیا کے تمام مذاہب و ادیان میں خواہ وہ امتداد زمانہ کی بناء پر شرک کی آلودگیوں سے قطعاً منحرف ہو چکے ہوں یا ان میں تحریف و صداقت کا امتزاج قریبی دور سے وابستہ ہو۔ اوتار یا نبی مرسل کی معرفت کے ساتھ ایک "منتظر ہستی" کا مشترک عقیدہ پایا جاتا ہے۔ "یہود "مسیح" کے علاوہ بھی "ایلیا" یا وہ نبی کہہ کر اس کی آمد کے منتظر ہیں، نصاریٰ بھی ہر قسم کی تحریف کے باوجود مسیح کے بعد فارقلیط (پیراکلیوطاس) بمعنی (احمد) یا "روح حق" یا "ناصر" وغیرہ صفات کے تعارف سے اسی کے انتظار میں ہیں۔ مجوس آج تک ایک "نجات دہندہ" کا انتظار کر رہے ہیں اور ویدک دھرم (سناتن دھرم) ہندوؤں میں بھی ایک "اوتار" کا انتظار ہو رہا ہے اور آج عقلیت کے نام پر اس "ہستی منتظر" کے عقیدہ کو کتنا ہی مضحکہ خیز سمجھا جائے اور خود مذہبی افراد اپنے اپنے مذہب کے اس عقیدہ کو کیسا ہی غیر معقول کیوں نہ ٹھہرائیں لیکن ان کے پاس اس کا جواب کچھ نہیں ہے کہ مذاہب و ادیان کے موجودہ اختلافات کے باوجود چھوٹے سے ناستک گروہ کو چھوڑ کر ہزار ہا برس کائنات انسانی میں اس عقیدہ کا کسی نہ کسی شکل میں مشترک عقیدہ بنا رہنا اس کے "حقیقت" ہونے کی ناقابل انکار دلیل ہے۔ البتہ یہ بات جدا ہے کہ جس طرح یہود نے از راہِ حسد "مسیح ہدایت" کے انتظار کے باوجود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قبول نہ کیا اسی طرح مذاہب عالم کی اقلیت کو چھوڑ کر جو کہ حلقہ بگوش اسلام ہوگئی ان کی اکثریت نے محمد ﷺ کو قومی و ملکی عصبیت اور گروہ بندی کی بندشوں کی وجہ سے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا یا ان کی دعوت حق کو عرب کے لیے محدود قرار دے کر خود کو اس سے علیحدہ کر لیا۔

بہرحال ہندوستان کا قدیم مذہب چونکہ حقیقت مذہب کو فراموش کر چکا اور اس کی موجودہ شکل نے کسی طرح قدیم شکل و صورت کو بدل کر نیا رخ اختیار کر لیا اور اس کی تاریخ خود اس کے اپنے پاس بھی نہیں ہے اور اب اس کی تمام بنیاد صرف آبائی رسوم پر یا چند مخصوص فلسفیانہ عقائد پر قائم ہے اس لیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ "منتظر ہستی" کے متعلق جو روایات رکھتے ہیں ان کی اصل حقیقت کیا تھی اور یہی حال بدھست کا بھی ہے اس لیے ہم ابوریحان بیرونی اور بعض دیگر مفسروں اور مؤرخوں کے ان بیانات سے قطع نظر کرتے ہیں جو انہوں نے ہندوؤں کے عقیدہ "کلنکی اوتار" کے "شنبل" میں نزول کو محمد ﷺ پر منطبق کرنے کی سعی کی ہے۔

اور یہاں صرف یہود و نصاریٰ پر نازل کتب سماویہ تورات، زبور اور انجیل سے ہی ان بشارات کو پیش کر دینا مناسب سمجھتے ہیں جن میں تحریف کے باوجود اب بھی اصل کتاب کی چمک باقی ہے اور علمائے یہود و نصاریٰ کے پاس انطباق کے انکار کی موجہ دلیل

Marfat.com

موجود نہیں ہے، چنانچہ حضرت مولانا رحمت اللہ (نور اللہ مرقدہ) کی میزان الحق اور حافظ ابن قیم کی ہدایۃ الحیاری اور باجہ جی زادہ کی الفارق وغیرہ کتب سے اور ان مناظرات مطبوعہ سے ظاہر ہوتا ہے جو علماء نصاریٰ اور علماء اسلام کے درمیان ان بشارات سے متعلق پیش آئے ہیں اور جن کے متعلق بعض علماء نصاریٰ کو اقرار و اعتراف کے ماسوا کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا۔

تورات اور بشارات:

تورات کتاب استثناء میں ہے:

خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اس کی طرف کان دھریو، اس سب کی مانند جو تو نے خداوند اپنے خدا سے حوب میں مجمع کے دن مانگا اور کہا کہ ایسا نہ ہو کہ میں خداوند اپنے خدا کی پھر سنوں اور ایسی شدت کی آگ پھر دیکھوں تاکہ میں مر نہ جاؤں اور خداوند نے مجھے کہا کہ انہوں نے (بنی اسرائیل نے) جو کچھ کہا سو اچھا کیا۔ "میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔" اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو کہ جنھیں وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا لیکن وہ بھی اگر ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اسے حکم نہیں دیا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے۔ [1]

نشان زدہ جملوں کو غور سے پڑھیے اور پھر ہر ایک جملہ کی حقیقت کو تاریخی روشنی میں دیکھیے تو تاریخ کا بے لاگ فیصلہ ایک اور صرف ایک ہی ہوگا اور وہ یہ کہ اس بشارت کا مصداق ذات اقدس محمد ﷺ کے ماسوا دوسری کوئی ہستی نہیں ہے۔

بشارت کا پہلا جملہ یہ ہے: "میں ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا۔" تاریخ کہتی ہے کہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں بنی اسمٰعیل کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں جو اس کا مصداق بن سکے اور بنی اسمٰعیل میں محمد ﷺ کے ماسوا کوئی نبی ہی نہیں ہوا جو موسیٰ علیہ السلام کی مانند کہلایا جا سکے اور دوسرا جملہ ہے: "میں اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اس سے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔" اس جملہ کو ایک بار پھر غور سے پڑھیے اور اس کے بعد قرآن کی ان آیات کا مطالعہ کیجیے جن میں بعینہٖ یہی صفات نبی اکرم ﷺ کے لیے مذکور ہیں:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝﴾ (النجم: ۳۔۴)

"وہ (محمد ﷺ) اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں خدا کی وحی سے کہتے ہیں جو ان پر وحی کی جاتی ہے۔"

﴿فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ۝﴾ (مریم: ۹۷)

"پس بے شبہ ہم نے اس (قرآن) کو تیری زبان پر آسان کر دیا تاکہ تو اس کے ذریعہ متقیوں کو بشارت دے اور کج راہوں کو (عذاب الٰہی سے) ڈرائے۔"

---

[1] باب ۱۸ آیت ۱۵۔۲۱

Marfat.com

﴿ وَ اِنَّهٗ لَتَنۡزِيۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ؕ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوۡحُ الۡاَمِيۡنُ ۙ۝ عَلٰى قَلۡبِكَ لِتَكُوۡنَ مِنَ الۡمُنۡذِرِيۡنَ ۝
بِلِسَانٍ عَرَبِىٍّ مُّبِيۡنٍ ؕ۝ وَ اِنَّهٗ لَفِىۡ زُبُرِ الۡاَوَّلِيۡنَ ۝ ﴾ (الشعراء: ۱۹۲-۱۹۵)

"اور یقیناً یہ جہانوں کے پروردگار کا اتارا ہوا ہے اس کو روح الامین (جبرئیل) نے تیرے قلب پر اتارا تاکہ تو گمراہوں کو (اعمال بد کے نتائج سے) ڈرانے والوں میں سے ہو یہ ہے صاف عربی زبان میں اور اس کا ذکر پہلی کتابوں میں موجود ہے۔"

بشارات کے جملوں اور قرآن کی ان آیات کے اسلوب بیان کا مطالعہ کرنے کے بعد کون انکار کرسکتا ہے کہ یہ دونوں کسی ایک ہی ہستی کی صفات کا ذکر ہے اب تیسرے جملہ کو پڑھیے: "جو کوئی میری باتوں کو جنھیں وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا۔" اور ساتھ ہی ان آیات قرآنی کا مطالعہ کیجیے:

﴿ فَكَيۡفَ اِذَا جِئۡنَا مِنۡ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيۡدٍ وَّجِئۡنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيۡدًا ؕ۝ يَوۡمَٮِٕذٍ يَّوَدُّ الَّذِيۡنَ
كَفَرُوۡا وَعَصَوُا الرَّسُوۡلَ لَوۡ تُسَوّٰى بِهِمُ الۡاَرۡضُ ؕ وَلَا يَكۡتُمُوۡنَ اللّٰهَ حَدِيۡثًا ۝ ﴾ (النساء: ۴۱-۴۲)

"اور پھر (اے پیغمبر!) کیا حال ہوگا اس دن (قیامت کے دن) جب کہ ہم ہر ایک امت میں سے ان پر ایک گواہ طلب کریں گے، اور ہم تم کو ان سب پر گواہ بنائیں گے سو جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اور الرسول (محمد ﷺ) کی نافرمانی کی وہ اس دن یہ پسند کریں گے کاش کہ (وہ دھنس جائیں اور) زمین ان کے اوپر برابر ہو جائے اور اُس دن یہ اللہ سے کوئی بات بھی پوشیدہ نہ رکھ سکیں گے۔"

غور کیجیے کہ دونوں عبارتوں میں کس درجہ مطابقت ہے اور سب کے بعد اس فقرے کو بامعان نظر دیکھیے لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے حکم نہیں دیا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے۔" اور پھر قرآن کی اس آیت کو بھی پڑھیے اور فرمایئے کہ کیا یہ دونوں مضامین ایک ہی حقیقت کے دو نقش نہیں ہیں؟

﴿ وَلَوۡ تَقَوَّلَ عَلَيۡنَا بَعۡضَ الۡاَقَاوِيۡلِ ۙ۝ لَاَخَذۡنَا مِنۡهُ بِالۡيَمِيۡنِ ۙ۝ ثُمَّ لَقَطَعۡنَا مِنۡهُ
الۡوَتِيۡنَ ۖ۝ فَمَا مِنۡكُمۡ مِّنۡ اَحَدٍ عَنۡهُ حٰجِزِيۡنَ ۝ وَاِنَّهٗ لَتَذۡكِرَةٌ لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ۝ ﴾ (الحاقہ: ۴۴-۴۸)

"اور یہ پیغمبر بعض باتوں کو اپنی جانب سے گھڑ کر ہماری جانب منسوب کر دے تو بے شبہ ہم اس کا داہنا ہاتھ پکڑ لیں اور پھر اس کی گردن کی رگ کاٹ ڈالیں (قتل کر دیں) اور اس وقت تم میں سے کوئی بھی اس کو ہماری گرفت سے باز نہیں رکھ سکتا۔"

تورات کی پیش گوئی اور آیات قرآنی کے مسطورۂ بالا تطابق کے بعد تحدی (چیلنج) کے ساتھ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ بشارات میں ذکر کردہ مجموعۂ صفات کا مصداق ذات اقدس ﷺ کے ماسوا کوئی دوسری ہستی تاریخی دنیا میں نہیں پائی جاتی یہ مجموعہ صفات نہ حضرت مسیح علیہ السلام پر صادق آتے ہیں نہ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام پر اور نہ حضرت زکریا و یحییٰ علیہما السلام پر اور نہ دوسرے انبیاء بنی اسرائیل پر صادق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب علماء یہود سے اس کے متعلق دریافت کیا جاتا ہے تو وہ ایک "منتظر ہستی" کے مزید انتظار کے ماسوا

Marfat.com

دوسرا کوئی جواب نہیں رکھتے اور خاتم الانبیاء ﷺ کو اس کا مصداق نہ سمجھنے میں بے دلیل انکار اور خموشی کے علاوہ ان کے پاس اور کچھ نہیں ہے اسی طرح نصاریٰ بھی حضرت مسیح علیہ السلام کو اس بشارت کا مصداق ثابت کرنے میں مجموعہ صفات کے پیش نظر عاجز و درماندہ نظر آتے اور صاف اور واضح باتوں کو دوراز کار تاویلات کا جامہ پہنا کر اعتراف حقیقت سے گریز کرنا چاہتے ہیں۔

اور تورات استثناء ہی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک نغمہ باب ۳۱ میں مذکور ہے جو انہوں نے موت سے چند لمحات قبل بحکم الٰہی بنی اسرائیل کو سنایا۔ اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ میدان تیہ میں اپنی قوم کو جمع کرو اور خدا کا یہ پیغام سناؤ کہ جب بنی اسرائیل خدا کے وعدے کے مطابق شہروں میں جا بسیں گے تو حکومت، تمول اور رفاہیت میں بدمست ہو کر خدا کی نافرمانیوں میں مبتلا ہو جائیں گے حتیٰ کہ بت پرستی سے بھی باز نہیں رہیں گے۔ پس جب ان کی حالت اس درجہ ابتر ہو جائے گی تو میں ان سے خفا ہو جاؤں گا اور ان سے اپنا منہ چھپا لوں گا اور اس کے بعد میری غیرت حق حرکت میں آئے گی اور میں بھی ان (بنی اسرائیل) کو ایک ایسی قوم کے ذریعہ خفا کروں گا اور ان سے اپنی نعمت (نبوت) چھین کر اس قوم کو بخش دوں گا جو ان پڑھ [1] اور تمدن سے دور، بے عقل، خانہ بدوش ہوگی جس کو تم اور دنیا کی قومیں "متمدن جماعت" نہ سمجھیں گی۔ اس کے بعد باب ۳۳ میں اس نغمہ کی تکمیل ان الفاظ کے ساتھ کی گئی ہے:

تم اس بشارت یا پیغمبرانہ پیشین گوئی کے لیے تاریخ ماضی پر نظر ڈالو اور دیکھو کہ بنی اسرائیل کی متمردانہ سرگرمیاں، باغیانہ اور سرکشانہ شرانگیزیاں جب حد سے زیادہ متجاوز ہو گئیں اور انہوں نے مسیح علیہ السلام ہدایت جیسی جلیل القدر ہستی کو بھی رد کر دیا اور حضرت یحییٰ علیہ السلام جیسے مقدس پیغمبر کو قتل کر ڈالا تو ان کی جگہ خدا نے کس قوم کو پسند کیا کس کو شرف رسالت سے نوازا اور کس نے ساری کائنات میں حیرت زا انقلاب بپا کر کے سچی خدا پرستی اور نیک عملی کا غلغلہ بلند کر دیا اور بنی اسرائیل نے کس کے عظمت و جلال کو دیکھ کر حاسدانہ اس کے روکنے کی سعی کی۔ کیا یہ عرب قوم نہیں تھی اور کیا یہ محمد ﷺ کی مقدس ہستی اور ان کی قوم نہ تھی جس پیغمبر نے دنیوی وسائل و اسباب کی نظر میں اُمی "ان پڑھ" ہونے کے باوجود متمدن قوموں کے ظالمانہ و جابرانہ تمدن کو فنا کے گھاٹ اتار کر اس عظیم الشان عادلانہ تمدن کی بنیاد ڈالی کہ ہر قسم کے اسباب و وسائل کے فقدان اور موانع کے باوجود جس کی عظمت و سرعت رفتار نے ماہرین فلسفہ تاریخ کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ اسلام کی دعوت و اصلاح اور انقلاب، دنیائے تاریخ کی مستثنیات میں سے ہے۔ یہی وہ اُمی اور گلہ بان قوم تھی جو ایک "اُمی" کی خدا پرستانہ تعلیمات سے تربیت پا کر چند ہی برسوں میں دنیا کی قوموں کی تربیت و اصلاح کے لیے "بہترین معلم" ثابت ہوئی اور اونٹوں اور بکریوں کے چرانے والے دیکھتے ہی دیکھتے انسانوں کے چرواہے بن گئے اور بنی اسرائیل کی ہمہ قسم کی حاسدانہ اور معاندانہ جدوجہد اس کی راہ ترقی میں پرکاہ کی برابر بھی سنگ راہ نہ بن سکی تو کیا تاریخ کے ان ابھرے ہوئے نقوش کے بعد بھی اس انکار کے لیے کوئی گنجائش رہ جاتی ہے کہ تورات کی اس پیشین گوئی کا مصداق محمد ﷺ اور بنی اسمٰعیل علیہ السلام کے

---

[1] کتاب مقدس کے قدیم نسخوں میں "ان پڑھ" کا لفظ تمام زبانوں میں موجود ہے مگر بعد کے ایڈیشنوں میں اس کی جگہ کہیں "بے عقل" اور کہیں اسی کے مترادف الفاظ پائے جاتے ہیں حاصل اگرچہ پھر بھی وہی رہتا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ قرآن میں محمد ﷺ کی صفت اُمی اور آپ کی قوم کی "اُمیین" مذکور ہے جس کا لفظی ترجمہ "ان پڑھ قوم" ہوتا ہے اس لیے محض اس لئے کہ پیشین گوئی کا یہ صاف تطابق باقی نہ رہے قدیم لفظ کو بدل کر اس قسم کے الفاظ رکھ گئے۔ مختلف ایڈیشنوں کی اس قسم کی لفظی تحریفات کے لیے میزان الحق کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔

Marfat.com

ماسوا کوئی اور ہستی ہے؟ نہیں ہر گز نہیں۔ یہی وہ اوصاف اور واضح حقیقت ہے جس کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۱۵۷ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ِ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ كَلِمٰتِهٖ وَ اتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝۱۵۸ ﴾

(الاعراف: ۱۵۷۔۱۵۸)

"پس میں ان کے لیے رحمت لکھ دوں گا) جو الرسول (محمد ﷺ) کی پیروی کریں گے کہ وہ نبی اُمی [1] ہوگا (یعنی دنیا کے سلسلہ تعلیم و تعلم کے لحاظ سے ان پڑھ ہوگا اور) اس کے ظہور کی خبر وہ اپنے یہاں تورات اور انجیل میں لکھی پائیں گے وہ انہیں نیکی کا حکم دے گا اور برائی سے روکے گا اور پسندیدہ چیزیں حلال کرے گا اور گندی چیزیں حرام ٹھہرائے گا اور اس بوجھ سے نجات دے گا جس کے تلے وہ دبے ہوں گے اور ان پھندوں سے نکالے گا جن میں گرفتار ہوں گے تو جو لوگ ان پر ایمان لائے اس کے مخالفوں کے لیے روک ہوئے (راہ حق میں) اس کی مدد کی اور اس روشنی کے پیچھے ہوئے جو اس کے ساتھ بھیجی گئی ہے (یعنی قرآن) سو وہی ہیں جو کامیابی پانے والے ہیں (اے پیغمبر!) تم لوگوں سے کہو: اے افراد نسل انسانی! میں تم سب کی طرف بھیجا ہوا آیا ہوں، وہ خدا کی آسمانوں کی اور زمینوں کی بادشاہت اسی کے لیے ہے، کوئی معبود نہیں مگر وہی ایک ذات، وہی جلاتا ہے، وہی مارتا ہے پس اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول اور نبی اُمی پر کہ اللہ اور اس کے کلمات (یعنی اس کی تمام کتابوں) پر ایمان رکھتا ہے اس کی پیروی کرو تا کہ کامیابی کی راہ تم پر کھل جائے۔"

اور تورات استثناء میں ہے:۔

"اور یہ وہ برکت ہے جو موسیٰ (علیہ السلام) مرد خدا نے اپنے مرنے سے آگے بنی اسرائیل کو بخشی اور اس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا، فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی۔"

موسیٰ علیہ السلام نے یہ بشارت بھی بنی اسرائیل کو اپنی موت سے قبل ایسی حالت میں سنائی تھی کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کی وداعی حالت کو

---

[1] اُمی لفظ اُم کی جانب منسوب ہے جس کے معنی ماں کے ہیں، اہل عرب یہ لفظ اس شخص کے لئے بولتے ہیں جس نے پڑھا لکھا نہ ہو گویا وہ ماں کے پیٹ سے آج ہی پیدا ہوا ہے، اہل عرب چونکہ عام طور سے ان پڑھ تھے اس لئے اُمیین کہلائے اور پیغمبر اسلام نے بھی چونکہ "وحی الٰہی" کے ذریعہ تعلیم و تربیت کے ماسوا دنیا کے اسباب تعلیم و تعلم کے لحاظ سے کسی کے سامنے زانوائے ادب تہہ نہیں کیا اس لئے ان کی صفت بھی اُمی رہی، آپ ﷺ نے خود بھی یہ ارشاد فرمایا: ((نحن امة امية لا نكتب ولا نحسب))

Marfat.com

دیکھ کر دل تنگ اور دل گیر ہو رہے تھے اور یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اب خداوند خدا موسیٰ علیہ السلام جیسا کوئی پیغمبر مبعوث نہ کرے گا۔

سینا جو طور۔ کے نام سے مشہور اور وادی سینا میں واقع ہے اور زبان حال سے شہادت دے رہا ہے کہ آگ کی جستجو کے بہانے موسیٰ علیہ السلام کو یہیں خدا سے ہم کلام کا شرف حاصل ہوا تھا اور ﴿ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴾ کا مظاہرہ میرے ہی سینہ پر ہوتا رہا ہے اور شعیر (ساعیر یا سراۃ) اس پہاڑی سلسلہ کا نام ہے جو عرب میں سب سے زیادہ طویل اور شام سے یمن تک شمالاً وجنوباً پھیلا ہوا ہے اور القدس (یروشلم) کے سامنے ہو کر گزرتا ہے، یہیں وہ جگہ ہے جو بیت اللحم کے نام سے آج بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت مبارک کی گواہ اور بعثت مسیح علیہ السلام کا مناد ہے اور فاران عبرانی (جرو) میں عرب کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو حجاز کے نام سے مشہور ہے یہی مقام اس وادی غیر ذی زرع (بن کھیتی کی سرزمین) کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہے جس کو مکہ کہتے ہیں اور جو بہت مشہور و معروف ہے اور مقام ولادت و بعثت ہے خاتم الانبیاء محمد ﷺ کا۔

اس تفصیل کے بعد پیشین گوئی کا مطلب واضح ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا خدائے برتر کی صداقت وہدایت کا پیغام نور ہدایت بن کر سینا سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شکل میں نمودار ہوا اور سراۃ (شعیر) پر حضرت مسیح علیہ السلام کی صورت میں طلعت افروز ہوا اور فاران پر محمد ﷺ کا رخ انور بن کر جلوہ گر ہوا۔

فراعنہ کی طویل و مدید غلامی سے اس خانوادۂ نبوت (بنی اسرائیل) کے قلوب میں یاس و حرمان نے ایسی جگہ کر لی تھی کہ اب ان کو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ اس بنجر زمین پر خدا کی رحمت کی بارش ہو گی اور حجابہائے تاریک سے "نور ہدایت" اپنی نمود دکھلائے گا۔ اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صدائے حق گویا نور ہدایت کی وہ نمود تھی جس نے صدیوں بعد پھر ان کے گھرانے پر رونمائی کی اور موسیٰ علیہ السلام کے بعد اگرچہ بہت انبیاء علیہم السلام احیائے حق کے لیے مبعوث ہوئے مگر حضرت مسیح علیہ السلام کے وجود گرامی نے جس شان و عظمت کے ساتھ اس درمیان کی پیدا شدہ اندھیاریوں کا پردہ چاک کر کے ہدایت و رشد کی روشنی چمکائی گویا وہ طلوع تھا اس نور ہدایت کا جو موسیٰ علیہ السلام کی حیات طیبہ میں اپنی نمود دکھا چکا تھا اور جس کے ذریعہ آسمان ہدایت کے اُفق میں صبح سعادت نے شب ظلمت سے جھانکنا شروع کر دیا تھا اور تاریخ شاہد ہے کہ یہی نور ہدایت بنی اسرائیل سے منتقل ہو کر جب بنی اسمٰعیل تک پہنچا تو خاتم الانبیاء محمد ﷺ میں اس طرح جلوہ گر ہوا کہ فاران کی چوٹیوں سے جب اس کی کرنیں کائنات کے چہار جانب پھیلیں تو تمام عالم انسانی کو روشن و منور بنا دیا اور ظلمت شرک و کفر کو مٹا کر نور توحید سے ہر گوشۂ عالم کو تاباں و درخشاں کر دیا۔ چنانچہ تورات میں مذکور اس حقیقت کو قرآن عزیز نے اس سے زیادہ بہتر اور معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ ادا کیا ہے:

﴿ وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝ ﴾ (التین: ۱۔۶)

"شاہد ہے (وہ مقام جو مرکز ہے) انجیر و زیتون کے باغوں (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقام ولادت "بیت اللحم") اور شاہد ہے طور سینا اور شاہد ہیں یہ بلد امین "مکہ" یقیناً ہم نے انسان کو بہترین مخلوق بنایا پھر اس کو انتہائی پستی میں پھینک دیا ماسواء

ان انسانوں کے جو ایمان لائے اور کام کیے نیک پس ان کے لیے اجر ہے بے منت (یعنی خدا کا فضل اور رضا اور جنت)۔"

الواو للشہادۃ ، واؤ کا استعمال شہادت کے لیے بھی ہوتا ہے عربیت کا مشہور قاعدہ ہے اور اس قسم کی شہادت اکثر ایسے مواقع کے لیے مخصوص ہے کہ متکلم جس حقیقت کو ظاہر کرنا چاہتا ہے مختلف وجوہ کی بنا پر مخاطب کو اس کے سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے تب بعض بدیہی اور محسوس مثالیں دے کر مخاطب کے لیے اس حقیقت کا سمجھنا آسان بنا دیتا ہے۔ سورۂ والتین کی آیات میں بھی صورت حال ایسی ہی ہے اس لیے کہ بتلانا یہ مقصود ہے کہ خدائے تعالیٰ نے انسان کو بہترین مخلوق بنایا ہے اس کے باوجود اگر سچا خدا پرست اور نیک کردار نہیں ہے تو انجام کار وہ انتہائی پستی میں پھینک دیا جائے گا اور اس کی حقیقت چوپاؤں سے بھی بدتر ہو جائے گی ﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ﴾ مگر یہ کہ سچا خدا پرست اور نیک اعمال ثابت ہو تو پھر انسانیت کے بلند سے بلند درجہ کا مستحق اور بے حساب و بے منت خدا کی نعمتوں کا مستوجب ہے، ظاہر ہے کہ یہ بات کافی تفکر و تدبر کی محتاج ہے۔ ایک ہستی تمام مخلوقات سے اپنی تخلیق و تکوین میں "احسن" بھی ہو اور پھر قعر مذلت کی گہرائیوں میں بھی پھینک دی جائے اس لیے بطور شہادت نہایت لطیف پیرایہ میں تین مشہور اور نمایاں دور ہدایت کا ذکر کر کے اس جانب توجہ دلائی کہ اگر تاریخ کا مقصد یہ ہے کہ ماضی کے آئینہ میں مستقبل کی تصویر دیکھی جا سکے تو ان ہر سہ ادوار تاریخ کا مطالعہ کرو اور دیکھو کہ خدائے برتر نے کائنات کی رشد و ہدایت کا شرف "انسان" ہی کو بخشا اور پھر غور کرو کہ وہ بھی انسان ہی تھے جنہوں نے خدا کے پیغمبروں کی پیروی میں سچی خدا پرستی اور نیک عملی اختیار اور نتیجہ یہ نکلا کہ روز قیامت کے فیصلہ سے قبل بھی اسی دنیا میں انہوں نے عزت، شرافت، حکومت سب کچھ پایا اور آخرت کا اجر تو بے منت و بے حساب الگ رہا اور وہ بھی انسان ہی تھے جو سرکشی، بغاوت اور پیغمبرانہ تعلیم کے خلاف فساد انگیزی کی بدولت آخرت سے پہلے ہی ذلت و رسوائی اور ہلاکت و بربادی کے قعرہائے مذلت سے دوچار ہوئے اور جہنم کے اسفل سافلین سے جو واسطہ آئندہ پڑنے والا ہے وہ جدا ہے۔ پس اگر ان حقائق کو پیش نظر رکھو گے اور تاریخ ماضی کے ان اوراق کو دیدۂ عبرت سے دیکھو گے تو پھر تمہاری یہ حیرت، اعتراف حقیقت سے بدل جائے گی اور آئینہ عقل و فکر میں یہ سب کچھ روشن ہو جائے گا۔ تورات کی بشارت کے یہ الفاظ بھی خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہیں:

"وہ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں آتشی شریعت ان کے لیے تھی۔"

قابل توجہ اس لیے ہے کہ جب ہم تاریخ کے اس واقعہ کا مطالعہ کرتے ہیں کہ رمضان ۸ ہجری مطابق جنوری ۶۳۰ء میں فتح مکہ کی غرض سے جب محمد ﷺ روانہ ہوئے ہیں تو دس ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم جلو میں تھے اور آتشی شریعت یعنی "جہاد بالسیف کا حکم الٰہی.... ان کے ہاتھ میں تھی" تو قدرت الٰہی کے اس اعجاز کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ جس ذات برتر نے موسیٰ علیہ السلام کی لسان حق سے ان جملوں کو ادا کرایا۔ اسی نے محمد ﷺ کے حق میں اس کو کر دکھایا ﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾ تو کیا کسی حق پرست حق آگاہ کو ذرا سا بھی تامل ہو سکتا ہے کہ بلاشبہ موسیٰ علیہ السلام کی بشارت کا مصداق خاتم الانبیاء محمد ﷺ ہی کی ذات گرامی ہے۔

تورات کی یہ اور اسی قسم کی دوسری بشارات ہیں جن کے پیش نظر بعثت محمد ﷺ سے صدیوں پہلے یہود کو نبی آخر الزماں کا انتظار تھا اور وہ یہ یقین رکھتے تھے کہ اب وہ وقت دور نہیں ہے کہ نور ہدایت "آفتاب عالمتاب" بن کر جلوہ گر ہونے والا ہے، اسی لیے جب کبھی ان کے اور مشرکین کے درمیان جنگ پیش آ جاتی تو کہا کرتے تھے کہ وہ وقت قریب آ رہا ہے کہ نبی آخر الزماں مبعوث ہوں

Marfat.com

گے اور ہم ان پر ایمان لاکر ان کی قیادت میں تم سے حق و باطل کی جنگ کریں گے اور کامیاب ہوں گے۔ چنانچہ جب قومی اور نسلی تعصب اور بغض وحسد کی بناء پر انہوں نے آفتاب ہدایت کی روشنی سے منہ پھیر لیا اور آنکھیں بند کرلیں تو قرآن عزیز نے ان کو (یاد ایام) کے ساتھ ملزم ومجرم بناتے ہوئے یہ کہا:

﴿وَ لَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ یَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ۚۖ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۫ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ ۝۸۹﴾ (البقرہ: ۸۹)

"چنانچہ جب ایسا ہوا کہ اللہ کی طرف سے ان کی ہدایت کے لیے ایک کتاب نازل ہوئی اور وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی تھی جو پہلے سے ان کے پاس موجود ہے تو باوجود یکہ وہ (تورات کی پیشینگوئیوں کی بناء پر اس ظہور کے منتظر تھے، اور) کافروں کے مقابلہ میں اس کا نام لے کر فتح ونصرت کی دعائیں مانگتے تھے لیکن جب وہی جانی بوجھی ہوئی بات سامنے آ گئی تو صاف انکار کر گئے اور مخالفت پر کمر باندھ لی پس ان لوگوں کے لیے جو دیدہ ودانستہ کفر کی راہ اختیار کریں اللہ کی لعنت ہے۔"

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ محمد ﷺ کی بعثت سے پہلے ایک دفعہ قبیلہ غطفان اور یہود کے درمیان جنگ ہوئی تو خیبر کے یہود ان کے مقابلہ میں فتح ونصرت کے لیے یہ دعا مانگتے تھے۔ [1]

اللھم انا نسئلك بحق محمد النبی الأمی الذی وعدتنا ان تخرجه فی اخر الزمان ان تنصرنا علیھم.

"خدایا! ہم تجھ سے اس نبی اُمی کا واسطہ دے کر دعا مانگتے ہیں جس کے متعلق تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ وہ آخر الزماں ہوں گے۔"

اور علی ازدی سے منقول ہے کہ "یثرب" (مدینہ) کے یہود ہمارے مقابلہ کے وقت اکثر یہ دعا کرتے تھے:

اللھم ابعث ھٰذا النبی یحکم بیننا و بین الناس.

"خدایا! اس نبی موعود کو مبعوث فرما جو ہمارے اور لوگوں (مشرکوں) کے درمیان حق کا فیصلہ کردے۔" [2]

اور عقبہ ثانیہ میں جب مدینہ کے ستر اشخاص آپ ﷺ سے دعوت اسلام کی حقیقت معلوم کرنے آئے اور آپ ﷺ نے ان پر حقیقت حال ظاہر فرمائی تو انہوں نے اسی وقت ایک دوسرے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، بلاشبہ یہ وہی پیغمبر ہیں جن کی بعثت سے متعلق ہم اکثر یہودی علماء سے سنا کرتے ہیں [3] اور کیا اس تاریخی پہلو سے ان اقوال کی صداقت پر روشنی نہیں پڑتی کہ جب رومیوں کے ہاتھوں بنی اسرائیل کی آخری اور فیصلہ کن تباہی عمل میں آئی تو آخر شام، فلسطین، شرق اُردن یمن جیسے شاداب و زرخیز علاقوں کو چھوڑ کر وہ کون سی اہم وجہ تھی جس نے یہود کے نمایاں اور مشہور قبائل بنو قریظہ اور بنو نضیر (وغیرہ) کو یثرب اور نواح یثرب میں آباد ہونے کی ترغیب دی یقیناً صرف ایک ہی وجہ تھی اور وہ یہ کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور انؑ کے بعد اپنے انبیاء کی بشارات میں یہ بھی سنا تھا کہ اس "منتظر ہستی" کا ظہور یثرب اور نواح یثرب میں ہوگا۔ مگر وائے بدبختی کہ قبول حق کا سب سے بڑا مانع ان کو یہ پیش آیا کہ

[1] البدایہ والنہایہ ج ۲ عن البیہقی [2] بدائع الفوائد ج ۲ از مسند بزار [3] تفسیر ابن کثیر ج ۱

Marfat.com

قومی، جماعتی اور نسلی حسد نے ان کو اس کی اطاعت سے باز رکھا۔ حتیٰ کہ جب انصار رضی اللہ عنہم میں سے بعض حضرات علماء یہود کے سامنے یہ کہہ گزرتے کہ ہم نے تو اس نبی امی پر ایمان لانے کی بات سب سے پہلے تمہاری ہی زبانی سنی تھی اور اس کے ظہور سے قبل تم ہی اس کے چرچے کیا کرتے اور ان کتابوں سے متعلق بشارات سنایا کرتے تھے پھر اب کیا ہوا کہ جب اس کا ظہور ہوا تو تم انکار کر بیٹھے تو وہ علانیہ جھوٹ بول دیتے اور کہتے کہ ہم کو یاد نہیں کہ کب ہم نے تم سے ایسی باتیں کہی تھیں۔ [1]

تورات کی طرح عہدنامہ جدید (اناجیل) میں بھی تحریف لفظی معنوی کے باوجود نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے متعلق یہ بشارات ملتی ہیں۔ متی کی انجیل میں ہے:

لیکن بہت سے اول آخر ہو جائیں گے اور آخر اول ○ کیونکہ آسمان کی بادشاہت اس گھر کے مالک کی مانند ہے جو سویرے نکلا تا کہ اپنے انگوری باغ میں مزدور لگائے اور اس نے مزدوروں سے ایک دینار روز ٹھہرا کر انہیں اپنے باغ میں بھیج دیا○ پھر پہر دن چڑھے کے قریب نکل کر اس نے اوروں کو بازار میں بیکار کھڑے دیکھا○ اور ان سے کہا تم بھی باغ میں چلے جاؤ جو واجب ہے تمہیں دوں گا پس وہ چلے گئے پھر اس نے دو پہر اور سہ پہر کے قریب نکل کر ویسا ہی کیا اور کوئی ایک گھنٹہ دن رہے پھر نکل کر اوروں کو کھڑا پایا اور ان سے کہا تم کیوں یہاں تمام دن بیکار کھڑے رہے○ انہوں نے اس سے کہا اس لیے کہ کسی نے ہم کو مزدوری پر نہیں لگایا۔ اس نے ان سے کہا۔ تم بھی باغ میں چلے جاؤ۔ جب شام ہوئی تو باغ کے مالک نے اپنے کارندے سے کہا کہ مزدوروں کو بلاؤ اور پچھلوں سے لے کر پہلوں تک انہیں مزدوری دے دو○ جب وہ آئے جو گھنٹہ بھر دن رہے لگائے گئے تھے تو انہیں ایک ایک دینار ملا جب پہلے مزدور آئے تو انہوں نے یہ سمجھا کہ ہمیں زیادہ ملے گا اور ان کو بھی ایک ہی دینار ملا تو گھر کے مالک سے یہ شکایت کرنے لگے کہ ان پچھلوں نے ایک ہی گھنٹہ کام کیا ہے اور تو نے انہیں ہمارے برابر کر دیا جنھوں نے (ہم نے) دن بھر کا بوجھ اٹھایا اور سخت دھوپ سہی○ اس نے جواب دے کر ان میں سے ایک سے کہا: "میاں میں تیرے ساتھ بے انصافی نہیں کرتا، کیا تیرا مجھ سے ایک دینار نہیں ٹھہرا تھا جو تیرا ہے اٹھا لے اور چلا جا، میری مرضی یہ ہے کہ جتنا تجھے دیتا ہوں اس پچھلے کو بھی اتنا ہی دوں○ کیا مجھے روا نہیں کہ اپنے مال کو جو چاہوں سو کروں؟ یا تو اس لیے کہ میں نیک ہوں بری نظر سے دیکھتا ہے○ اس طرح آخر، اول ہو جائیں گے اور اول آخر○

اس بشارت میں حضرت مسیح علیہ السلام نے مثالی رنگ میں اقوام و امم عالم کی عملی زندگی اور خدا کی جانب سے ان پر اجر و ثواب کا مرقع پیش فرمایا ہے پہلے مزدور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قبل کی دنیا کے لوگ ہیں اور دوسری جماعت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت بنی اسرائیل مراد ہیں۔ تیسرا گروہ نصاریٰ ہیں اور چوتھی جماعت خاتم الانبیاء محمد ﷺ کی امت ہے، کائنات ارضی کی عمر کے لحاظ سے پہلی دوسری اور تیسری جماعت کے مقابلہ میں محمد ﷺ کی امت کا زمانہ حیات یوں سمجھئے گویا دن کا آخری حصہ ہے اور اجر و ثواب میں اس آخری امت کو پہلی امتوں کے مقابلہ میں برابر کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے یہاں ان کو دوسری تمام امتوں پر برتری حاصل ہے اس لیے کہ اگرچہ ان کا وجود حیات امتوں کے آخر میں ہوا ہے لیکن چونکہ یہ خدا کے آخری پیغام "قرآن" کی حامل اور "سرخیل انبیاء"

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۱

Marfat.com

رسلؑ کی امت ہیں اور تمام امتوں سے ان کے رسول ﷺ پر ایمان لانے کا وعدہ و میثاق لیا گیا ہے۔ لہٰذا حیات دنیا کے لحاظ سے گو ان کا زمانہ آخر ہے مگر مرتبہ اور عظمت کے اعتبار سے وہ سب سے اول ہیں۔ یہی ہے مراد بشارت کے پہلے اور آخری جملہ کی یعنی "بہت سے اول آخر ہو جائیں گے اور آخر اول اور اس طرح آخر اول ہو جائیں گے اور اول آخر۔"

نبی آخرالزماں ﷺ نے بھی ٹھیک اسی طرح ایک مثال بیان فرمائی ہے جو بخاری میں منقول ہے: "دوسری امتوں کے مقابلہ میں دنیا کے اندر تمہاری مثال ایسی ہے جیسا کہ دن کے طویل عرصہ میں عصر (شام) سے غروب آفتاب کے وقت کی، اہل تورات (یہود) کو تورات عطا کی گئی اور انہوں نے اس پر عمل کیا حتیٰ کہ وہ دوپہر ڈھلے عاجز رہ گئے (یعنی خدا کی تعلیم حق کو فراموش کر بیٹھے) تب ان کو مالک نے ایک قیراط مزدوری دے دی اور پھر اہل انجیل (نصاریٰ) کو کام پر لگایا اور انہوں نے دوپہر ڈھلے سے عصر (شام) تک کام کیا اور پھر وہ بھی عاجز رہ گئے تب ان کو بھی مالک نے ایک ایک قیراط مزدوری دے دی، آخر میں ہم کو قرآن ملا اور ہم نے دنیا کی زندگی کے دن غروب ہونے تک کام کیا۔ تب مالک نے ہم کو دو دو قیراط عطا کیے اس پر پہلوں نے شکایت کی کہ ہم نے زیادہ محنت کی مگر تو نے ان کو اور ہم کو برابر کر دیا۔ مالک نے کہا میں نے تمہاری مزدوری میں سے تو کم نہیں کیا۔ تب مالک نے فرمایا: تو پھر میری یہ مرضی ہے کہ میں اپنے پاس سے جس کو چاہوں (مزدوری کی کیفیت و نوعیت کے فرق اور کام کی صلاحیت و استعداد کے پیش نظر) زیادہ دوں۔ فهو فضل اوتيه من اشاء

اور امم ماضیہ و اقوام سابقہ کے مقابلہ میں امت محمدیہ کی یہی فضیلت ہے جس کو قرآن نے بصراحت اس معجزانہ اسلوب میں بیان کیا ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران: ۱۱۰)

"تم (تمام امم و اقوام میں) بہترین امت ہو جو کائنات انسانی (کی خدمت) کے لیے وجود میں لائی گئی ہے۔ تم لوگوں کو بھلائی کا حکم کرتے ہو اور برائیوں سے باز رکھتے ہو۔"

بہر حال آخری جماعت کا اول ہو جانا اگر اس کا مصداق امت محمد ﷺ نہیں تو اور کون ہے جس کا ذکر تورات کی ان بشارات میں ہو رہا ہے اور جس کی تصدیق "نبی امی" اور قرآن دونوں کر رہے ہیں، عقلاً بھی یہ فرق مراتب واضح ہے اس لیے کہ جبکہ محمد ﷺ تمام انبیاء و رسل کے بعد مبعوث ہوئے اور آپ ﷺ کے قبول کرنے والوں میں آپ ﷺ کی قوم سے بھی زیادہ دنیا کی دوسری اقوام و امم کے افراد شامل ہیں تو یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی فرد یا جماعت پہلے سے کسی مذہبی جماعت میں شامل ہے تو اس کے لیے جدید دعوت حق کو قبول کرنے میں قومی، جماعتی اور نسلی عصبیت و غرور سب سے بڑی رکاوٹ بن کر سامنے آ جاتا ہے۔ پس جو شخص اس رکاوٹ کو پاؤں تلے روند کر دعوت حق پر "لبیک" کہتا ہے وہ بلاشبہ اس کا مستحق ہے کہ اپنے اپنے زمانہ میں پہلی صداقتوں پر ایمان لانے والوں کے مقابلہ میں اس کو دو چند بلکہ چند در چند اجر و ثواب عطا ہو۔

اور انجیل یوحنا میں ایک بشارت اس طرح مسطور ہے:

"اور یوحنا کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے "کاہن" اور "لیوی" یہ پوچھنے کو اس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے تو

Marfat.com

اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں انہوں نے اس سے پوچھا کہ پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا نہیں ہوں، کیا تو وہ نبی ہے اس نے جواب دیا نہیں پس انہوں نے اس سے کہا پھر تو کون ہے تا کہ ہم اپنے بھیجنے والوں کو جواب دیں کہ تو اپنے حق میں کیا کہتا ہے؟" ❶

اس پیشین گوئی کا تاریخی زمانہ وہ ہے جب حضرت یحییٰ (یوحنا علیہ السلام ❷) اپنی صدائے حق سے بنی اسرائیل کو مسحور کر رہے تھے اور حضرت مسیح علیہ السلام کے ظہور کی بشارت دیتے تھے اس وقت یہود کے مقدسین کی ایک جماعت ان کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے یہ سوالات کیے۔

سوالات میں تین پیغمبروں کے متعلق ان سے دریافت کیا گیا کہ وہ ان میں سے کون ہیں مگر انہوں نے انکار کیا وہ ان تینوں میں سے کوئی نہیں ہیں تو یہ سوالات ظاہر کرتے ہیں کہ یہود تین یا دو پیغمبروں کے ظہور کے منتظر تھے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے، حضرت ایلیا ❸ کے اور ایک ایسے پیغمبر کے جس کا ذکر ان کے درمیان اس درجہ مشہور تھا کہ انہوں نے سوالات کے وقت دو ناموں کی طرح نام لینا ضروری نہیں سمجھا اور صرف "وہ نبی" کہنا ہی کافی خیال کیا۔

یہ بشارت اس درجہ واضح اور صاف ہے کہ نصاریٰ بجز بے دلیل انکار کے تاریخ کے اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہیں کہ اگر محمد ﷺ "وہ نبی" کا مصداق نہیں ہیں تو پھر کون ہے۔ کیا معاملہ کی صورت یہ نہیں ہے کہ جس طرح یہود ظہور مسیح علیہ السلام کے منتظر تھے مگر ان کی آمد پر از راہ حسد ان کو رَدّ کر دیا، اسی طرح یہود و نصاریٰ دونوں "وہ نبی" کی شہرت عام کے پیش نظر اس کے ظہور کے سخت منتظر ہونے کے باوجود اس کی بعثت وظہور کے نسلی وقومی عصبیت کی بدولت منکر ہو گئے۔ چنانچہ اسی حقیقت کو قرآن حکیم نے اس طرح بیان کیا ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾ ﴾ (البقرہ: ۱٤٦)

"وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب عطا کی وہ تم کو اس طرح "پیغمبر حق" پہچانتے ہیں جیسا اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور بلاشبہ ان میں سے ایک فریق حق کو چھپاتا ہے اور وہ خوب جانتے ہیں کہ وہ حق کو چھپا رہے ہیں۔"

یوحنا کی انجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کی وصیت بھی محمد ﷺ کی بشارت کے لیے شاہد عدل ہے، فرماتے ہیں:

"تم میں سے کوئی مجھ سے نہیں پوچھتا کہ تو کہاں جاتا ہے؟ بلکہ اس لیے کہ میں نے یہ باتیں تم سے کہیں تمہارا دل غم سے بھر گیا ○ لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے

---

❶ باب ۱۶ آیات ۱۹۔۲۲

❷ یوحنا عبرانی میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کا نام ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایک حواری کا نام بھی ہے جن کی جانب یوحنا منسوب ہے۔

❸ کہا جاتا ہے کہ کتب قدیمہ میں ایلیا بھی محمد ﷺ کی صفت منقول تھی اور اس لیے خواص علماء یہود ایلیا اور فارقلیط کو ایک ہی تسلیم کرتے تھے مگر بعد کی تحریفات کی بدولت ایک اور "منتظر ہستی" کا اضافہ ہو گیا اور وہ الیاس علیہ السلام ہیں۔ یہود نے اب یہ گھڑ لیا کہ حضرت الیاس علیہ السلام کا دوبارہ ظہور ہو گا اور اس کے لیے اناجیل میں بھی دو کی جگہ تین کے ظہور کا ذکر نظر آتا ہے۔

پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا اور وہ آ کر دنیا کو گناہ اور راست بازی سے اور عدالت کے بارہ میں قصور وار ٹھہرائے گا۔"❶

یہ بشارت حضرت مسیح علیہ السلام کی وصیت ہے اور تمثیلی استعاروں اور تشبیہوں کی بجائے واضح الفاظ میں ایک "موعود پیغمبر" کی خبر دیتی ہے اور موعود ہستی کی جن صفات کا اس میں ذکر ہے وہ حرف بحرف خاتم الانبیاء محمد ﷺ پر صادق آتی ہیں۔

حضرت مسیح علیہ السلام حواریوں اور شاگردوں کو دیکھ رہے ہیں کہ وہ ان کی جدائی سے کس درجہ متاثر ہیں دل غم سے بھرے ہوئے ہیں آنکھیں پرنم ہیں، حسرت و یاس چہرے سے ٹپک رہی ہے کیوں؟ کیا اس لیے کہ ایک انسان ان سے جدا ہو رہا ہے نہیں، نہیں بلکہ خدا کا ایک ہادی، نبی و رسول، پیغمبر صداقت کی وداعی گھڑیاں قریب ہیں اور اب نہیں کہا جا سکتا کہ دنیا ایسی مقدس ہستیوں سے بہرہ ور ہو گی یا نہیں کیونکہ منکروں اور باطل پرستوں نے خدا کی اس نعمت کی کوئی قدر نہ کی اور اس کو رَدّ کر دیا۔ اس غم آگیں منظر میں حضرت مسیح علیہ السلام ان کو تسلی و تشفی دیتے اور یقین دلاتے ہیں کہ "میرا جانا تمہارے لیے" فائدہ مند" ہے" اور پھر اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں "اگر میں نہ جاؤں تو وہ "مددگار" تمہارے پاس نہ آئے گا" یعنی میرا کائنات ارضی پر یہ قیام اس "مددگار" کی آمد کے لیے تاخیر کا باعث ہو رہا ہے جس کا آنا تمہارے لیے اس درجہ مفید ہے کہ بایں محبت و خلوص میرا جانا ہی تمہارے لیے فائدہ مند ہے" پھر اس کی معرفت کے لیے مزید باتیں بیان فرمائیں کہ وہ دنیا کو گناہوں (برائیوں) سے باز رکھے گا راست بازی کا حکم کرے گا اور افراط و تفریط کی ان روشوں کے خلاف جو انسانی دنیا کے ہر معاملہ میں رگ و ریشہ کی طرح پھیلی ہوں گی "عدل" سے گریز پر مجرم اور قصور وار ٹھہرائے گا۔

قدرتی طور پر اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ ہستی کون ہے جو ان مجموعہ صفات کا مصداق بن سکے۔ علماء نصاریٰ کہتے ہیں کہ اس سے مراد "روح القدس" ہے اور وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے قبر میں جی اٹھنے اور آسمان پر باپ کے پاس چلے جانے کے بعد شاگردوں پر نمودار ہوئی لیکن جب اس باطل تاویل پر ان سے یہ کہا گیا کہ ماضی یا مستقبل میں کون سا زمانہ آ چکا ہے یا آئے گا جس پر بشارت کا یہ جملہ صادق آ سکے جو دراصل پوری وصیت کی روح ہے "وہ آ کر دنیا کو گناہ سے اور راست بازی سے اور عدالت کے بارے میں قصور وار ٹھہرائے گا" اور کس طرح یہ عبارت صرف اس نور پر صادق آ سکتی ہے جو شاگردوں پر (روح القدس) ایک کبوتر کی شکل میں نازل ہو کر دکھلائی گئی۔

یہ وصیت تو اس تاویل کے برعکس صاف یہ ظاہر کر رہی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام ایک ایسے عظیم المرتبہ، جلیل القدر پیغمبر کے ظہور کی بشارت سنا رہے ہیں جس کی آمد کائنات انسانی کے لیے حضرت مسیح علیہ السلام کی موجودگی سے بھی زیادہ سود مند ثابت ہو گی اور جو ایک مرتبہ پھر کائنات کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلائے گی اور اس کی تعلیم حق کا معیار سر تا سر "عدل" پر مبنی ہو گا کہ یہی تمام اخلاق کریمانہ اور شعبہ حیات کے لیے اساس اور بنیاد کار ہے اور اس حقیقت پر نظر رکھتے ہوئے جب ہم تاریخی مذاہب سے دریافت کرتے ہیں کہ اس کا مصداق کون ہے تو اس کے ماسواء اور کوئی جواب نہیں ملتا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد وصیت میں مذکور اوصاف کی مصداق ہستی محمد ﷺ کے ماسواء کوئی ظہور میں نہیں آئی۔ یہی مقدس ہستی ہے جس نے ایسے زمانہ میں جبکہ دنیا کی قوموں اور ان کی سوسائٹیوں میں

❶ باب ۱۶

Marfat.com

"عدل" ایک بے معنی شے رہ گئی تھی اور جب کہ سچی نیک عملی اور خدا پرستی، قومی اور اجتماعی زندگی سے خارج ہو چکی تھی دنیاء انسانی کو یہ پیغام سنایا:

﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۞﴾ (النحل: ۹۰)

"بیشک اللہ حکم دیتا ہے "عدل" کا "احسان" کا قرابت داروں کے ساتھ سلوک کا اور یقیناً منع کرتا ہے فحش کاموں اور باتوں سے۔ اور بغاوت وسرکشی سے وہ تم کو نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت قبول کرو۔"

اور یہی وہ مقدس ہستی ہے جس کے ظہور کی بدولت اس کی امت کا مقصد حیات یہ ظاہر کیا گیا:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران: ۱۱۰)

"(اے امت محمد ﷺ) تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی خدمت) کے لیے عالم وجود میں لائی گئی ہے تم لوگوں کو بھلائی اور نیکیوں کا حکم کرتے اور ان کو برائیوں سے باز رکھنے کی تلقین کرتے ہو۔"

مضمون وصیت کے اس نمایاں پہلو کے ماسواء ایک اور روشن اور واضح بات اس وصیت یا بشارت میں وہ جملہ ہے جس میں موعود ہستی کو ایک خاص وصف کے ساتھ یاد کیا گیا ہے یہ وصف اگرچہ جدید ایڈیشنوں میں "مددگار"۔ "وکیل"۔ "معزی" اور "شفیع" ہے، لیکن قدیم یونان، فرنچ، لیٹن اور انگریزی تراجم میں "پیراکلیوتاس" اور عبرانی (جبرو) اور عربی تراجم میں "فارقلیط" پایا جاتا ہے جو عربی لفظ احمد کے ہم معنی اور مرادف ہے۔

یہ بات تو علماء نصاریٰ اور ہر ایک تاریخ دان کے نزدیک متفق علیہ اور مسلم ہے کہ موجودہ اناجیل میں سے کوئی ایک بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی اصل انجیل نہیں ہے بلکہ جن ناموں سے یہ منسوب ہیں ان کے بھی اصل نسخے نہیں بلکہ تراجم ہیں اور یہ کہ مسیح علیہ السلام کی انجیل کا اور یجنل (اصل) نسخہ قدیم جبرو (عبرانی) زبان میں تھا اس لیے یہ دعویٰ بسہولت کیا جا سکتا ہے کہ اور یجنل نسخہ میں یہ لفظ بلا شبہ احمد ہی ہوگا۔ جیسا کہ سورۂ صف میں قرآن عزیز نے حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ قول نقل کیا ہے:

﴿وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّأْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗٓ أَحْمَدُ﴾ (الصف: ٦)

اور دلیل یہ ہے کہ موجودہ انجیل کے تراجم میں فارقلیط اسی لفظ احمد کا ہم معنی اور مرادف لفظ اختیار کیا گیا مگر جب علماء نصاریٰ نے یہ دیکھا کہ صداقت خاتم الانبیاء محمد ﷺ کے لیے کتاب مقدس سے بصراحت تام بہت بڑی دلیل ہاتھ آئی اور علماء اسلام کی جانب سے ہم پر قوی حجت قائم ہوئی جاتی ہے تو بعد کے ایڈیشنوں میں لفظ فارقلیط یا پیراکلیوتاس نکال دیا گیا اور اب اس کی جگہ کبھی ناصر (مددگار) کبھی وکیل، کبھی شفیع اور کبھی معزی (تسلی دینے والا) لکھا جانے لگا تاکہ واضح نام کی بجائے ایک ایسی صفت آ جائے جس کا اطلاق بغیر کسی تعیین کے ہر ایک ذات حق پر ہو سکے۔ اناجیل کے قدیم وجدید نسخوں اور پھر قدیم وجدید کے مختلف ایڈیشنوں میں لفظ فارقلیط اور اسی قسم کی دوسری گوناگوں تحریفات کا مطالعہ کرنا ہو تو اس کے لیے میزان الحق اور الفارق کا مطالعہ از بس مفید ہے یہاں

Marfat.com

اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے کہ اناجیل کے عربی تراجم میں مسطورہ بالا الفاظ کی بجائے فارقلیط تھا صرف یہ ایک ثبوت کافی ہے کہ ایک صدی قبل کے عربی نسخہ میں جو لندن سے ۱۸۴۴ء میں شائع ہوا تھا یہ لفظ یوحنا باب ۱۴ آیت ۱۶ میں موجود تھا "والھلب من الاب فیعطیکم فارقلیطا اخر۔"

تاہم علماء نصاریٰ کی اس واضح تحریف کے بعد بھی ان کا مقصد حل نہیں ہوسکتا اور ایک مرتبہ ان سے پھر یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ اس بشارت میں لفظ فارقلیط (احمد) کی جگہ مسطورۂ بالا الفاظ میں سے ہی کوئی لفظ سہی مگر جبکہ اس بشارت کا مصداق روح القدس کا کبوتر کی شکل میں شاگردوں پر نمودار ہو جانا" کسی طرح نہیں بنتا تو پھر حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد تاریخ ادیان میں وہ کون سی ہستی ہے جس کو اس کا مصداق سمجھا جائے۔ کیا علماء نصاریٰ اس بے دلیل انکار کے ساتھ کہ اس کا مصداق ذات اقدس محمد ﷺ نہیں ہیں جرأت کر کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں ہستی اس مجموعہ صفات کا مصداق تھی یا آج ہے یا آئندہ آئے گی۔ نہیں وہ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ان کے پاس اس انکار کے لیے صرف یہی ایک مثبت دلیل ہے کہ روح القدس اس کا مصداق ہے کاش کہ وہ قدرت بھی رکھتے کہ روح القدس کو انسانی شکل میں کائنات کی ہدایت کے لیے لاسکتے کہ وہ پیغمبرانہ صداقت کے ساتھ لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتی برائیوں سے روکتی اور عدل ترک کر کے افراط وتفریط کی راہ بد اختیار کرنے پر لوگوں کو قصور وار ٹھہراتی تب شاید ان کا یہ قول الفاظ بشارت کی مطابقت کرسکتا ورنہ تو یہ روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اس بشارت کو ذات اقدس ﷺ کے حق میں تسلیم نہ کرنا صرف نسلی، قومی اور جماعتی گروہ بندی سے پیدا شدہ عصبیت وحسد کا نتیجہ ہے۔

اس سے قطع نظر ہم تسلیم کیے لیتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی انجیل میں احمد (فارقلیط) کی بجائے مسطورہ بالا الفاظ ہی میں سے کوئی لفظ تھا تب بھی اس کا مصداق خاتم الانبیاء ﷺ کے ماسوا کوئی نہیں ہوسکتا اس لیے کہ قرآن عزیز نے مختلف مقامات پر نبی اکرم ﷺ کے جو اوصاف حمیدہ بیان کیے ہیں وہ ان ہی مسطورۂ بالا الفاظ کے ہم معنی ہیں مثلاً سورۂ توبہ میں آپ ﷺ کو عزیز، رؤف، رحیم کہا گیا ہے:

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝﴾ (التوبہ: ۱۲۸-۱۲۹)

"(ایمان والو!) تمہارے پاس (اللہ کا) ایک رسول آگیا ہے جو تم ہی میں سے ہے تمہارا رنج وکلفت میں پڑنا اس پر بہت شاق گزرتا ہے وہ تمہاری بھلائی کا بڑا ہی خواہش مند ہے وہ ایمان والوں کے لیے شفقت رکھنے والا، رحمت والا ہے (اے پیغمبر!) اگر اس پر بھی یہ لوگ سرتابی کریں تو ان سے کہہ دو میرے لیے اللہ کا سہارا بس کرتا ہے کوئی معبود نہیں ہے مگر صرف اس کی ذات، میں نے اس پر بھروسہ کیا وہ تمام عالم ہستی کی جہانداری کے عرش عظیم کا خداوند ہے۔"

اور سورۂ انبیاء میں ارشاد ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ۱۰۷)

Marfat.com

"اور ہم نے تجھ کو نہیں بھیجا مگر جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر۔"

اور اگر صحیح احادیث کی تصریحات کو بھی ان آیات کی تفسیر کے طور پر شامل کر لیا جائے تب تو اناجیل کے تراجم میں مذکورہ اوصاف بعینہٖ آپ کو مل جائیں گے مثلاً الشافع المشفع الشفیع، الناصر (مددگار) وغیرہ۔

پھر اسی باب کی آیت ۱۳ کو اس مضمون کے ساتھ اگر ملائیے تو معاملہ اور زیادہ واضح اور صاف ہو جائے گا حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں:

"لیکن جب وہ سچائی کی روح آئے گا تو تم کو سچائی کی راہ دکھائے گا اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔"

غور فرمائیے کیا یہ مضمون "روح القدس" پر صادق آ سکتا ہے جس نے چند شاگردوں پر ظاہر ہو کر اپنی نمود دکھلائی یا ایسی ہستی پر جو لوازم بشریت سے متصف ہونے کے باوجود کائنات انسانی میں رہ کر سچائی کی راہ دکھلائے اور امور غیب سے متعلق خدا نے جو کچھ بتلایا ہے (علامات قیامت، جنت و جہنم، حشر و نشر وغیرہ کی تفصیلات) اس کو مخلوق خدا تک پہنچانے اور پھر معلوم کرو تاریخ ماضی سے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد محمد ﷺ کے علاوہ کون آیا جس نے خدا سے بھٹکے ہوئے انسانوں کا رشتہ دوبارہ خدا سے ملایا اور ادیان و ملل کی گم شدہ صداقتوں کو قرآن کے ذریعہ روشن و نمایاں کیا، کیا موافق و مخالف دونوں شہادتیں اس پر متفق نہیں ہیں کہ اس کی قوم دوست و دشمن سب ہی اس کو "الصادق الامین" کہہ کر پکارتے تھے اور کیا انجیل کا یہ فقرہ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا اور قرآن کی یہ آیت ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝﴾ وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتا، جو کچھ کہتا ہے اس وحی سے کہتا ہے جو خدا کی جانب سے اتاری جاتی ہے، ایک ہی مقدس ہستی کی تقدیس حیات اور صداقت قول و عمل کے دو عکس نہیں ہیں پس سچائی کی روح میں لفظ "روح" سے فائدہ اٹھا کر اور بقیہ تمام مضمون بشارت سے آنکھ بند کر کے اس کو "روح القدس" کہہ دینا علمی دیانت ہے؟ ہرگز نہیں۔

غرض وصیت یا بشارت حضرت مسیح علیہ السلام کی جانب سے واضح اور صاف اعلان ہے۔ ظہور قدسی صفات ﷺ کا اور اس کا انکار بداہت کا انکار اور تعصب بیجا کی دلیل [1] بشارات النبی ﷺ کا یہ باب بہت وسیع ہے اور چھٹی صدی ہجرت میں ایک مسیحی عالم سعید بن حسن اسکندرانی نے جب کتاب مقدس میں ان بشارات کو دیکھ کر اسلام قبول کیا تو محیط النظر ایک مستقل کتاب اسی موضوع پر تصنیف کی اور ہمیشہ سے علماء اسلام بھی اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ لکھتے رہے ہیں حتیٰ کہ بعض علماء نے ہندوؤں کی قدیم کتابوں اور مجوس کے قدیم نوشتوں میں بھی "منتظر ہستی" سے متعلق جو کچھ مذکور ہے اس کو بشارات النبی ﷺ میں شامل کیا ہے مگر ہم اسی قدر پر اکتفا کرتے ہوئے قرآن عزیز کی ان آیات پر اس مضمون کو ختم کر دینا چاہتے ہیں جو نزول قرآن کے وقت سے یہود و نصاریٰ کے سامنے برابر اعلان کرتی رہی ہیں کہ قدیم سماوی کتابوں میں اس مقدس پیغمبر کا تذکرہ برابر رہا ہے اور چونکہ خدا کی تقدیر یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اس کا آخری اور کامل و مکمل قانون اسی ذات اقدس ﷺ کے ہاتھوں کائنات ہست و بود تک پہنچے گا۔ اس لیے از بس ضروری

[1] اس پیشینگوئی میں فارقلیط سے مفصل محققانہ بحث کے لیے میزان الحق از مولانا رحمت اللہ (نور اللہ مرقدہ) الفارق، ہدایۃ الحیاری اور رسالہ تہذیب الاخلاق مضمون فارقلیط قابل مراجعت ہیں۔

تھا کہ اس کا ذکر پہلے نوشتوں میں ہوتا کہ جب اس کے ظہور کا وقت آ پہنچے تو تمام صادق ادیان و ملل سے متعلق امتیں میثاق الٰہی کے مطابق اس پر ایمان لائیں اور اس کی پیش کردہ صداقت اور قانون ہدایت "قرآن" کو اپنے لیے راہ عمل بنائیں۔ چنانچہ سورۂ الفتح میں ارشاد ہے:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا ؗ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۛۚ وَ مَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۛ﴾ (الفتح: ۲۹)

"محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ (صحابہ رضی اللہ عنہم) ان کے ساتھ ہیں وہ منکروں پر سخت ہیں اور آپس میں نرم خو ہیں۔ (اے مخاطب!) تو ان کو دیکھے گا (خدا کے سامنے) جھکنے والے سجدہ کرنے والے اور اس طریقہ سے خدا کے فضل اور اس کی رضاء کے خواہش مند ہیں ان کی نشانی یہ ہے کہ ان کے چہروں (پیشانیوں) پر سجدے کے نشانات ہیں، تورات اور انجیل میں ان کا ذکر اسی طرح ہے۔"

یہ ذکر انجیل برنابا میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے اور آپ ﷺ کی صفات بہت نمایاں الفاظ میں مذکور ہیں لیکن وہ نصاریٰ کے نزدیک متروک ہے مگر جیسا کہ سابق میں کہا جا چکا ہے اس کا ترک کسی دلیل پر قائم نہیں ہے بلکہ وہ اور بعض دوسری اناجیل کا ترک محض ایک فال کی بناء پر ہوا جو اسی غرض سے نکالی گئی تھی۔ اور سورۂ شعراء میں ہے:

﴿وَ اِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ؕ۱۹۲ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۙ۱۹۳ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۱۹۴ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ؕ۱۹۵ وَ اِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ۱۹۶﴾ (الشعراء: ۱۹۲-۱۹۶)

"اور یقیناً یہ (قرآن) جہانوں کے پروردگار کا اتارا ہوا ہے، اس کو روح الامین (جبرئیل علیہ السلام) نے (خدا کی جانب سے) تیرے قلب پر نازل کیا تاکہ تو (خدا کے نافرمانوں کو) ڈرانے والوں میں سے ہو یہ صاف عربی زبان میں ہے اور اس کا ذکر پہلوں (گذشتہ پیغمبروں) کی کتابوں میں ہے۔"

اور ایک مرتبہ خود نبی اکرم ﷺ نے انہی بشارات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

((دعوة ابی ابراهيم و بشرٰی عيسٰی)).

"(یعنی) میں اپنے باپ ابراہیم (علیہ السلام) کی دعا ہوں اور عیسیٰ مسیح (علیہ السلام) کی بشارت ہوں (یعنی) دعاء خلیل اور نوید مسیحا۔"

قرآن عزیز نے دعا ابراہیم علیہ السلام کا ذکر اس طرح کیا ہے:

﴿رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۱۲۹﴾ (البقرہ: ۱۲۹)

"اے ہمارے پروردگار! ان (اہل عرب) ہی میں سے ایک رسول بھیج، جو ان پر تیری آیات پڑھے اور ان کو کتاب اور

Marfat.com

حکمت سکھائے اور ان کو (ہر قسم کی برائیوں سے) پاک کرے بے شبہ تو غالب اور حکمت والا ہے۔"

اور بشارت مسیح علیہ السلام کا ذکر سورۂ صف میں اس طرح منقول ہے:

﴿وَ اِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝﴾ (الصف: ٦)

"اور (وہ وقت قابل ذکر ہے) جب عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام) نے کہا: "اے بنی اسرائیل! میں تمہاری جانب اللہ کا رسول (ایلچی) ہوں تصدیق کرنے والا ہوں توراۃ کی جو میرے سامنے موجود ہے اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمد (فارقلیط) ہوگا پس جب ان کے پاس وہ (خدا کا پیغمبر) دلائل لے کر آیا تو یہ کہنے لگے یہ تو کھلا جادو ہے۔"

صبح سعادت:

تاریخ ادیان وملل شاہد ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ظہور پر تقریباً چھ صدیاں گزر چکی ہیں اور معمورۂ عالم خدا کے پیغمبروں کی معرفت حاصل کی ہوئی صداقت حق کو فراموش کر چکا ہے تمام کائنات انسانی خدا پرستی کی بجائے مظاہر پرستی میں مبتلاء ہے اور ہر ملک میں نوع انسانی سے لے کر نوع جمادات تک کی پرستش سرمایہ نازش بنی ہوئی ہے۔ کوئی انسان کو اوتار (خدا) کہہ رہا ہے تو کوئی خدا کا بیٹا۔ ایک اگر مادہ پرست ہے تو دوسرا خود اپنی آتما (روح) کو ہی خدا سمجھ رہا ہے۔ سورج کی پوجا ہے، چاند اور تاروں کی پرستش ہے، حیوانوں، درختوں اور پتھروں کی عبادت ہے، آگ، پانی، ہوا، مٹی کے سامنے ناصیہ فرسائی ہے غرض کائنات کی ہر شے پرستش اور پوجا کے لائق ہے اور نہیں ہے تو صرف ذات واحد قابل پرستش نہیں ہے نہ اس کی احدیت کا تصور خالص ہے اور نہ صمدیت کا۔ اس کو اگر مانا بھی جاتا ہے تو دوسروں کی پرستش اور عبادت کے ذریعہ وہ اگر خالق موجودات ہے تو دوسروں کے واسطہ اور احتیاج کے ساتھ مادہ، روح اور ترکیب سب ہی باتوں کا محتاج ہے وہ اگر مالک موجودات ہے بھی تو انسان، حیوان، درخت، پتھر کے بل بوتہ پر، غرض ساری دنیا میں اصل کارفرمائی مظاہر کی تھی اور "ذات حق" صرف نام کے لیے، حقیقت سے چشم پوشی تھی مگر مجاز کے ساتھ ذوق عشق، ذات حق سے بعد تھا مگر، مظاہر سے قربت سرمایہ، سعادت، خالق سے بیگانگی تھی مگر مخلوقات کی عبادت گزاری شعار عام تھا اور ہر طرف

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ﴾

"ہم ان کو نہیں پوجتے مگر اس لیے تاکہ وہ خدا کی جانب ہماری قربت کا ذریعہ بن جائیں۔" کا مظاہرہ نظر آتا تھا۔

یہی وہ تاریک دور تھا جس میں "سنت اللہ" یعنی خدا کے قانون ہدایت وضلالت نے ماضی کی تاریخ کو پھر دہرایا اور غیرت حق نے فطرت کے قانون ردعمل (Reaction) کو حرکت دی یعنی آفتاب ہدایت برج سعادت سے نمودار ہوا اور چہار جانب چھائی ہوئی شرک وجہالت اور رسم ورواج کی تاریکیوں کو فنا کر کے عالم ہست وبود کو علم ویقین کی روشنی سے منور کر دیا۔

Marfat.com

۹ ربیع الاول مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء کی صبح، وہ صبح سعادت تھی جب مدنیت و حضارت سے محروم، بن کھیتی کی سرزمین مکہ کے ایک معزز قبیلہ قریش (بنی ہاشم) میں عبداللہ بن عبدالمطلب کے یہاں آمنہ بنت وہب کے مشکوئے معلیٰ سے آفتاب رسالت محمد ﷺ نے ظہور کیا۔

خدایا! صبح کیسی سعادت افروز تھی جس نے کائنات ارضی کو رشد و ہدایت کے طلوع کا مژدۂ جانفزا سنایا اور وہ ساعت کیسی مبارک و محمود تھی جو معمورۂ عالم کے لیے پیغام بشارت بنی، عالم کا ذرہ ذرہ زبان حال سے نغمے گا رہا تھا کہ وقت آ پہنچا کہ اب دنیاء ہست و بود کی شقاوت دور اور سعادت مجسم سے عالم معمور ہو، ظلمت شرک و کفر کا پردہ چاک ہو اور آفتاب ہدایت روشن و تابناک ہو۔ مظاہر پرستی باطل ٹھہرے اور خدائے واحد کی توحید مقصد حیات قرار پائے۔

دنیا تو کیا ملک، قبیلہ اور خاندان کو بھی یہ علم نہ تھا کہ مذاہب عالم جس آفتاب رسالت کے طلوع ہونے کے منتظر ہیں وہ اس غیر متمدن سرزمین اور عبدالمطلب کے گھرانے سے جلوہ گر ہوگا کہ اس کی ولادت باسعادت کو خاص اہمیت دیتے اور تاریخ ولادت کو اپنے سینہ میں محفوظ رکھتے مگر جس خالق کائنات کے نوشتہ تقدیر نے اس کو مقدس ہستی بنانے کا فیصلہ کیا۔ اسی کے ید قدرت نے ولادت باسعادت کے لیے ایک معجزانہ تاریخی نشان بھی ظاہر کر دیا اور وہ اصحاب الفیل کا واقعہ تھا۔

معتبر اور مستند روایات شاہد ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی ولادت اس واقعہ سے چند ماہ بعد ہوئی۔ [1]

یہ واقعہ جن خصوصیات کا حامل ہے ان کے پیش نظر یہ عرب کے لیے عموماً اور اہل حجاز کے لیے خصوصاً نہایت عجیب اور حیرت زا تھا۔ اور اس لیے وہ کبھی اس کو فراموش نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اس کا نام ہی عام الفیل (یعنی ہاتھیوں والا سال) رکھ دیا۔ مگر وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ دراصل یہ واقعہ ایک (نشان) ہے اس جلیل القدر ہستی کے ظہور کا جو ایک روز تمام معمورۂ انسانی کو مرکز توحید اور قبلہ ابراہیمی پر جمع کر دے گی اور اس کو غیر اللہ (بتوں) کی آلودگیوں سے پاک کر کے توحید الٰہی کے نغموں کے لیے مخصوص کرائے گی۔ کیونکہ یہی وہ پہلا مقام ہے جو صرف خدائے واحد کی پرستش کے لیے بنایا گیا۔ یہ مندر نہیں تھا کہ مورتی کی پوجا کی جائے، یہ گرجا اور کلیسا بھی نہ تھا کہ یسوع مسیح علیہ السلام اور کنواری مریم علیہا السلام کے مجسموں کے سامنے سر جھکایا جائے نہ یہ آتش کدہ تھا آگ کو نور کا مظہور قرار دے کر اس کی پرستش کی جائے اور نہ یہ صلوات یہود تھا کہ حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا کر اس کی تقدیس کے نغمے گائے جائیں بلکہ یہ تو خدا اور صرف ایک خدا کی عبادت کے لیے بنایا گیا تھا:

﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ ﴿٩٦﴾﴾ (آل عمران: ۹۶)

غرض بعثت کے بعد جب قدرت کے اعجاز نما ہاتھوں نے عام الفیل میں آپ ﷺ کی ولادت کا راز سربستہ آشکارا کر دیا تب دنیا نے یہ سمجھا کہ ابرہۃ الاشرام اور اس کے لشکر سے کعبۃ اللہ کی یہ حفاظت اس لیے تھی کہ وہ وقت قریب آ پہنچا جب دوبارہ یہ مقدس مقام خدائے واحد کی عبادت اور توحید خالص کی مرکزیت کا شرف حاصل کرنے والا ہے پس جو طاقت بھی اس مقصد عظیم سے تصادم ہوگی خود ہی پاش پاش ہو کر رہ جائے گی۔

---

[1] واقعہ کی تفصیلات قصص القرآن ج ۳ میں گزر چکیں۔

Marfat.com

ابرہہ عیسائی تھا اور اہل عرب (قریش) مشرک، پھر کون کہہ سکتا ہے کہ ابرہہ اور اس کے لشکر کی بربادی قریش کی نصرت و حمایت کے لیے تھی، نہیں! بلکہ اس لیے سب کچھ ہوا کہ مشیت الٰہی کے خلاف ابرہہ کی خواہش تھی کہ یمن (صنعاء) میں جو خوبصورت گرجا (القلیس) باپ، بیٹا، روح القدس (تثلیث) کے فروغ دینے کو بنایا گیا تھا مرکز توحید "کعبۃ اللہ" کی جگہ وہ مرجع خلائق بنے اور اس مقصد کی خاطر اس نے انہدام کعبہ کے لیے لشکر کشی کی اِدھر قریش یعنی سارا عرب اس کی مقاومت سے عاجز و درماندہ تھا، ابرہہ وقت کے تمام جنگی اسلحہ اور سروسامان کا مالک اور قریش ان سب سے یکسر محروم، تب غیرت حق حرکت میں آئی اور دنیا نے دیکھ لیا کہ دنیوی طاقت کے گھمنڈ پر مشیت الٰہی سے ٹکرانے والا خود ہی فنا کے گھاٹ اتر گیا اور محور توحید "کعبہ" خدائی حفاظت کے سایہ میں اس طرح قائم رہا۔

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ یَّخْشٰی ﴾ (النازعات: ٢٦)

"بلاشبہ اس بات میں بڑی ہی عبرت ہے اس شخص کے لیے جو خوف خدا رکھتا ہے۔"

قرآن عزیز نے سورۃ الفیل میں اسی حقیقت کو معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ نقل کیا ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ كَیْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ ۝ اَلَمْ یَجْعَلْ كَیْدَهُمْ فِیْ تَضْلِیْلٍ ۝ وَّ اَرْسَلَ عَلَیْهِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ ۝ تَرْمِیْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝﴾

(الفیل: ١۔٥)

"(اے پیغمبر!) کیا تجھے نہیں معلوم کہ تیرے پروردگار نے ہاتھیوں والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ کیا ان کے فریب کو ناکام نہیں بنا دیا؟ اور ان پر فوج درفوج پرند بھیج دیے، وہ پرند ان پر کنکریاں پھینکتے تھے پھر (خدا نے) ان ہاتھیوں والوں کو کھائے ہوئے بھس کے مانند کر دیا۔"

بہر حال عام الفیل، نبی اکرم ﷺ کی ولادت باسعادت کا سال ہے اور یہ واقعہ آپ ﷺ کے ظہور قدسی کا سب سے بڑا قریبی نشان ہے اور یہ حقیقت اس شخص پر بخوبی عیاں ہے ﴿لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَ هُوَ شَهِیْدٌ﴾ جس کے پاس قبول حق کے لیے دل ہے یا وہ حاضر دماغی کے ساتھ امر حق کی جانب کان لگائے ہوئے ہے۔"

تاریخ ولادت کی تحقیق:

تمام ارباب تاریخ و سیر کا تین باتوں پر کلی اتفاق ہے ایک یہ کہ ولادت کا سال "عام الفیل" تھا چنانچہ سیرت و مغازی کے مشہور امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ اور جلیل القدر محدث و مؤرخ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ جمہور کی یہی رائے نقل کرتے ہیں:

و کان مولدہ علیہ الصلوٰۃ والسلام عام الفیل و ھذا ھو المشھور عن الجمھور و قال ابراھیم بن منذر الحزامی و ھو الذی لا یشك فیہ احد عنمائنا انہ علیہ الصلوٰۃ والسلام وُلِدَ عام الفیل۔ [1]

---

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۲٦١

"جمہور کے نزدیک یہی قول مشہور ہے کہ نبی ﷺ کی ولادت عام الفیل میں ہوئی اور ابراہیم بن منذر کہتے ہیں کہ اس بات میں کسی عالم کو بھی شک وشبہ نہیں کہ نبی علیہ السلام عام الفیل میں پیدا ہوئے۔"

والمجتمع علیه انه علیه السّلام ولد عام الفیل۔ ❁

"اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ محمد ﷺ عام الفیل میں پیدا ہوئے۔"

اور دوسری اور تیسری بات یہ کہ آپ ﷺ کی ولادت ربیع الاوّل کے مہینے میں دوشنبہ (پیر) کے دن صبح صادق کے وقت ہوئی:

وهذا مالا خلاف فیه انه ولد ﷺ یوم الاثنین ثم الجمهور علی ان ذلك كان فی شهر ربیع الاول۔ ❁

"اور اس پر کلی اتفاق ہے کہ آپ ﷺ دوشنبہ (پیر) کے دن پیدا ہوئے، پھر جمہور کا یہ بھی فیصلہ ہے کہ ربیع الاوّل کا مہینہ تھا۔"

قال ابوقتادة رضی الله عنه ان اعرابیًا قال یا رسول الله ما تقول فی صوم یوم الاثنین فقال ذلك یوم ولدتُ فیه و انزل علیّ فیه۔ ❁

"ابوقتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: گاؤں کے ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ ﷺ پیر کے دن کے متعلق کیا فرماتے ہیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ وہ دن ہے، جس میں میری ولادت ہوئی اور جس میں مجھ پر سب سے پہلی وحی نازل ہوئی۔"

لیکن اہل سیر وتاریخ اس بات میں مختلف الرائے ہیں کہ ربیع الاول کی کون سی تاریخ تھی عوام میں تو مشہور قول ہے کہ ۱۲ ربیع الاوّل تھی اور بعض کمزور روایات اس کی پشت پر ہیں اور اکثر علماء ۸ ربیع الاوّل کہتے ہیں لیکن صحیح اور مستند قول یہ ہے کہ ۹ ربیع الاوّل تاریخ ولادت ہے اور مشاہیر علماء تاریخ وحدیث اور جلیل المرتبہ ائمہ دین اسی تاریخ کو "صحیح" اور "اثبت" کہتے ہیں، چنانچہ حمیدی، عقیل، یونس بن یزید، ابن عبداللہ، ابن حزم، محمد بن موسیٰ، خوارزمی، ابوالخطاب ابن دحیہ، ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن کثیر، ابن حجر عسقلانی، شیخ بدرالدین عینی جیسے مقتدر علماء کی یہی رائے ہے۔

محمود پاشا فلکی نے (جو قسطنطنیہ کا مشہور ہیئت داں اور منجم گزرا ہے) ہیئت کے مطابق جوزائچہ اس غرض سے مرتب کیا تھا کہ محمد ﷺ کے زمانہ سے اپنے زمانہ تک کے کسوف وخسوف (سورج گرہن و چاند گرہن) کا صحیح حساب معلوم کرے، پوری تحقیق کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ سن ولادت باسعادت میں کسی حساب سے بھی دوشنبہ (پیر) کا دن ۱۲ ربیع الاول کو نہیں آتا۔ بلکہ ۹ ربیع الاول ہی کو آتا ہے اس لیے بلحاظ قوت وصحت روایات اور باعتبار حساب ہیئت ونجوم ولادت مبارک کی مستند تاریخ ۹ ربیع الاول ہے۔ ❁

اصحاب فیل کے واقعہ سے کس قدر عرصہ بعد ولادت ہوئی؟ متعدد اقوال میں سے مشہور قول یہ ہے کہ پچاس دن بعد ظہور قدسی ہوا ہے:

وقیل بخمسین یومًا و هو اشهر۔ ❁

❁ تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۲۶۱ ❁ ایضاج ۲ ص ۲۶۱ ❁ مسلم

❁ ۸ اور ۹ کا اختلاف حقیقی نہیں ہے بلکہ مہینے کے ۲۹ اور ۳۰ کے حساب پر مبنی ہے اور جبکہ حساب سے ثابت ہو گیا کہ صحیح تاریخ ۲۱ اپریل تھی تو ۸ کے متعلق تمام اقوال دراصل ۹ کی تائید میں پیش ہو سکتے ہیں۔

❁ فتح الباری ج ۶ وتاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۲۶۰

Marfat.com

"ایک قول یہ ہے کہ اصحاب فیل کے واقعہ سے پچاس دن بعد ولادت باسعادت ہوئی اور یہی قول زیادہ مشہور ہے۔"

نسب مبارک:

نبی اکرم ﷺ عربی النسل ہیں اور عرب کے معزز قبیلہ قریش کی سب سے زیادہ مقتدر شاخ بنی ہاشم سے ہیں، قرآن عزیز نے اہل عرب کو خطاب کرتے ہوئے متعدد مقامات پر آپ ﷺ کے عربی نژاد ہونے کا ذکر کیا ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۗ﴾ (الجمعہ: ۲)

"(خدا) وہ ذات ہے جس نے امیین (ان پڑھ لوگوں) میں سے ہی ایک رسول بھیج دیا جو ان پر اس کی آیات پڑھتا اور ان کا تزکیہ کرتا اور ان کو الکتاب (قرآن) اور حکمت سکھاتا ہے۔"

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ﴾ (التوبہ: ۱۲۸)

"بلاشبہ تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول (محمد ﷺ) آیا۔"

﴿اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ (آل عمران: ۱۶۴)

"جب کہ بھیج دیا اللہ نے ان میں ایک رسول جو بلحاظ نسب ان ہی میں سے ہے۔"

﴿وَ كَذٰلِكَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَ مَنْ حَوْلَهَا﴾ (الشوریٰ: ۷)

"اسی طرح ہم نے آپ ﷺ پر قرآن کو بزبان عربی اتارا ہے تاکہ (اے محمد ﷺ) تم مکہ والوں اور ان کے گرد و پیش کے بسنے والوں کو (برائیوں سے) ڈراؤ۔"

﴿اَعْجَمِیٌّ وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ ۝﴾ (النحل: ۱۰۳)

"کیا (اس قرآن کو سکھا دیتا ہے کوئی عجمی) اور حالت یہ ہے کہ یہ واضح عربی زبان میں ہے۔"

ماہرین انساب عرب کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ ﷺ حضرت اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام کی نسل سے ہیں اس لیے کہ قریش بغیر کسی اختلاف رائے کے عدنانی، ہیں اور عدنان کے اسماعیلی ہونے میں دو رائے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

عرب کے علم الانساب کے مشہور عالم محدث ابن عبدالبر تحریر فرماتے ہیں:

واجمعوا ان محمداً رسول اللہ ﷺ من ولد عدنان و ان عدنان من ولد اسمٰعیلؑ و ان ربیعة و مضر من ولد اسمٰعیل۔ ❶

"اور علماء انساب کا اس پر اتفاق ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ عدنان کی نسل سے ہیں اور عدنان اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل سے ہے

---

❶ القصد والامم ص ۲۲ والانباہ علی قبائل الرواہ ص ۴۶

Marfat.com

اور ربیعہ اور مضر بھی اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں۔"

علماء انساب نے نسب نامہ کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے:

محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔

اور والدہ کی جانب سے آپ ﷺ کا نسب نامہ کلاب پر جا کر پدری سلسلۂ نسب کے ساتھ مل جاتا ہے یعنی آمنہ بنت وہب بن عبدمناف بن زہرہ بن کلاب، کلاب کو حکیم بھی کہتے ہیں۔

البتہ عدنان اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے درمیان سلسلہ کے ناموں سے متعلق ماہرین انساب کی آرا مختلف [1] ہیں اس لیے نبی اکرم ﷺ نے اس کے متعلق ارشاد فرما کر "کذب النسابون" (نسب بیان کرنے والوں نے غلط بیانی کی ہے) کسی رائے کی توثیق نہیں فرمائی اور اپنے سلسلہ نسب کے متعلق صرف اس قدر ارشاد فرمایا ہے:

ان اللہ اصطفی کنانۃ من ولد اسمٰعیل واصطفی قریشا من کنانۃ واصطفی من قریش بنی ھاشم واصطفانی من بنی ھاشم۔ [2]

"اللہ تعالیٰ نے اسماعیل علیہ السلام کی نسل میں سے کنانہ کو ممتاز بنایا اور کنانہ میں سے قریش کو عزت وعظمت بخشی اور قریش میں سے بنی ہاشم کو امتیاز عطا فرمایا اور بنی ہاشم میں سے مجھ کو منتخب فرمایا۔"

گویا اس طرح سلسلہ نسب کے صرف ان حصوں کی تصدیق فرمائی جو ماہرین انساب کے درمیان بلا خلاف مسلم تھے۔

اسلام نے نسبی تفاخر اور اس پر مبنی سماجی رسم ورواج کو بہت بڑا گناہ اور جرم قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے خدا کے یہاں فضیلت کا معیار "ایمان اور عمل صالح" ہے اور وہاں حسب ونسب کی کوئی پرسش نہیں ہے، نیز نسبی تفاخر اسلام کے بنیادی قانون "اخوت اسلامی" کے قطعاً منافی ہے اس لیے اسلام کے اجتماعی دستور میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، تاہم واقعاتی طور پر تاریخ یہ پتہ دیتی ہے کہ ہمیشہ انبیاء ورسل علیہم السلام اپنی قوم اور اپنے ملک کے معزز خاندان میں سے ہوتے رہے ہیں، حکمت خداوندی کا یہ فیصلہ غالباً اس لیے ہوا کہ قوموں اور ملکوں کے رسم ورواج اور نسبی تفاخر کے خلاف ان کی دعوت حق اور ان کا پیغام صداقت کہیں ذاتی مفاد کے لیے نہ سمجھ لیا جائے اور اس طرح اس کا اخلاقی پہلو کمزور نہ ہو جائے مثلاً کسی سماجی زندگی میں ذات پات کی تقسیم اور کاسٹ سسٹم اس طرح موجود ہے کہ اس کی وجہ سے بعض انسان بعض کو حقیر وذلیل سمجھنے لگے ہیں تو اگر اس قوم یا ملک میں کوئی پیغمبر اس خاندان سے تعلق رکھتا ہو جس کو قومی اور ملکی رواج نے نیچ اور پست اقوام کا لقب دے رکھا ہے ایسی حالت میں اس ظلم صریح باطل کوشی کے خلاف اس پیغمبر کی صدائے حق اتنی سرعت کے ساتھ کامیاب نہ ہوتی جس قدر اس حالت میں ہو سکتی ہے جس کو وہ خود اس قوم ملک کے اونچے خاندان سے تعلق رکھتا ہو اور صرف ایک اسی خاص مسئلہ میں نہیں بلکہ اس کے پیغام حق کی تمام اصلاحات میں یہ فرق ضرور نظر آئے گا۔

بہرحال یہ حکمت ہر مقام اور ہر موقع پر مفید ہو یا نہ ہو عرب کے حالات وواقعات کے لیے از بس مناسب اور مفید ثابت ہوئی چنانچہ صدائے اسلام نے جب اپنی انقلابی اور اصلاحی گرج سے روحانیت کی خفتہ کائنات میں تہلکہ ڈال دیا تو ایک جانب نبی اکرم ﷺ

[1] البدایہ والنہایہ ج ۲ [2] مسلم

نے اہل عرب کو یہ سنایا کہ جہاں تک خاندانی امتیاز کا تعلق ہے تو میں قریشی بھی ہوں اور ہاشمی بھی، اور یہ امتیاز تمہارے نقطہ نظر سے بہت بلند ہے مگر میری نگاہ میں اس کی حیثیت صرف یہ ہے: "ولا فخر، یہ کوئی فخر کرنے کی چیز نہیں ہے۔" اور دوسری جانب نسبی تفاخر کی بنیادوں کے انہدام اور مساوات انسانی کی دعوت عام کے لیے اس خدائی فرمان کا اعلان کر کے کائنات انسانی کی تمام تاریک ذہنیت کے خلاف انقلاب عظیم برپا کر دیا:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ﴾ (الحجرات: ۱۳)

"لوگو! میں نے تم سب کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے (یعنی تخلیق انسانی کی ابتدا آدم اور اس کی بیوی حوا (علیہما السلام) سے ہوئی ہے) اور تم کو خاندانوں اور قبیلوں میں صرف اس لیے بانٹ دیا ہے کہ آپس میں (صلہ رحمی کے لیے) پہچان اور معرفت کا طریقہ قائم کر لو (اور اصل یہ ہے کہ) بلاشبہ اللہ کے نزدیک وہی عزت والا ہے جو تم میں سے پرہیزگاری کی زندگی بسر کرنے والا ہے۔"

اور حجۃ الوداع کے موقع پر جب آپ ہزارہا صحابہ رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں وداعی پیغام سنا رہے ہیں اور اسلام کے بنیادی اصول کے استحکام کے لیے اہم وصایا پیش فرما رہے تھے اس حکم خداوندی کی تائید میں یہ انقلاب آفریں پیغام بھی ارشاد فرمایا:

ان اللہ یقول ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ﴾ فلیس لعربی علی عجمی فضلٌ و لا لعجمی علی عربی فضلٌ و لا لاسود علی ابیض فضل و لا لابیض علی اسود فضل الا بالتقوٰی یا معشر القریش لا تجیئوا بالدنیا تحملونها علی رقابکم و یجیٔ الناس بالاٰخرۃ فانی لا اغنی عنکم من اللہ شیئًا .... الخ ❶

"اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: "اے افراد نسل انسانی! بلاشبہ ہم نے تم کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور ہم نے تمہارے درمیان خاندان اور قبائل بنا دیے ہیں تاکہ (صلہ رحمی کے لیے) تعارف پیدا کرو بلاشبہ تم میں اللہ کے نزدیک وہی برگزیدہ ہے جو زیادہ متقی (نیک کردار ہے) پس (خوب یاد رکھو کہ) نہ عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت ہے اور نہ عجمی کو عربی پر کوئی برتری حاصل ہے نہ کالے کو گورے پر کوئی فضیلت ہے اور نہ گورے کو کالے پر کوئی بزرگی۔ بلکہ ان سب کے لیے فضیلت کا معیار صرف تقویٰ (نیک عملی) ہے۔ اے گروہ قریش! ایسا نہ ہو کہ تم (خاندانی فخر کے زعم باطل کی وجہ سے قیامت میں) دنیا کو کاندھے پر لاد کر لاؤ اور دوسرے لوگ (نیک عملی کی بدولت) آخرت کا سامان لے کر آئیں، واضح رہے کہ (تمہارے محض قریشی ہونے کی وجہ سے) میں تم کو خدا کے فیصلے سے قطعاً بے پرواہ نہیں بنا سکتا (خدا کے یہاں تو صرف عمل ہی کام آئے گا)۔"

اور ایک مرتبہ نسبی فخر کے خلاف تبلیغ حق کرتے ہوئے اس کو "جاہلی تعصب" فرمایا اور مسلمانوں کو اس سے بچنے کے لیے سخت

---

❶ مجمع الفوائد جلد ۱ از معجم طبرانی کبیر

Marfat.com

تاکید فرمائی۔ ارشاد فرمایا:

((ان الله تعالیٰ قد اذهب عنكم عبية الجاهليته و فخرها بالاباء و انما هو مؤمن تقی او فاجر شقی الناس كلهم بنو ادمر و ادمر خلق من تراب)). [1]

"اللہ تعالیٰ نے (دعوت اسلام کے ذریعہ) تمہارے درمیان سے جاہلیت کے تعصب اور نسبی فخر کو مٹا دیا ہے اور اب انسان یا نیکوکار مومن ہے اور یا بدکار پاپی، سب انسان آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور آدم علیہ السلام کی پیدائش مٹی سے ہوئی ہے، (پھر فخر کرنے کا کیا موقع ہے)؟"

اسی مقدس تعلیم کا نتیجہ تھا کہ اسلام کے دور اولین میں نہ ذات پات کا کوئی سوال باقی رہ گیا تھا اور نہ خاندانی تفاخر کی کوئی حیثیت سمجھی جاتی تھی اور اس صدائے حق نے غلاموں تک کو سروری بخش دی تھی، چنانچہ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی سالاری لشکر اور امامت جہاد، بلال حبشی رضی اللہ عنہ کے لیے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ارشاد "سید هذه الامة" "اس امت کا سردار" قریش اور ہاشمی صحابہ کے درمیان ایک عجمی انسان ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی جلالت وعظمت، صہیب رومی رضی اللہ عنہ اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی رفعت و بلندی مرتبت اور اسی قسم کے ہزاروں واقعات تھے جو چشم فلک نے آنکھوں سے دیکھے اور تاریخ نے آغوش صفحات میں محفوظ رکھے ہیں مگر وائے بدبختی کہ بیرونی اثرات اور عرب سے باہر عجمی ماحول نے ایک عرصہ کے بعد مسلمانوں کو پھر اسی لعنت سے دوچار کر دیا۔ جس کا مرثیہ اقبال مرحوم کو اس طرح کرنا پڑا۔ ع

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانہ میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

سرور دو عالم ﷺ نے یہ فرما کر ((انما هو مومن تقی او فاجر شقی)) اس مسئلہ کو اس درجہ صاف کر دیا تھا کہ مسلمان کی زندگی میں کبھی اس کے برعکس زندگی کا کوئی اثر پڑنا ہی نہیں چاہیے تھا، ذات پات تو صرف اس لیے تھیں کہ چھوٹے چھوٹے حلقوں میں باہمی تعارف، صلہ رحمی اور حسن سلوک کا معاملہ ایک دوسرے کے ساتھ بآسانی ہو سکے، ورنہ کیسی ذات، کہاں کا خاندان؟ کون برادری؟ یہاں تو صرف دو ہی فطری اور نیچرل تقسیمیں ہیں یا "نیکوکار" یا "بدکار" کسی قوم، کسی خاندان اور کسی ملک کا انسان ہو اگر "سچی خدا پرستی" اور نیکوکاری رکھتا ہے تو وہ سب ایک برادری اور ایک قوم ہیں اور اگر مشرک و کافر اور بدکار پاپی تو یہ سب ایک گروہ اور ایک ٹولی ہیں۔

یتیمی:

خاتم الانبیاء محمد ﷺ کے والد ماجد کا نام عبداللہ اور والدہ ماجدہ کا نام آمنہ تھا۔ ابھی آفتاب ہدایت نے کائنات ہست و بود میں طلوع نہیں کیا تھا اور حضرت آمنہ کی مشکوئے معلیٰ اس ودیعت کی امین ہی تھی کہ والد ماجد کا انتقال ہو گیا اور ارباب سیرت کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ایک قافلہ تجارت کے ساتھ شام تشریف لے گئے تھے، واپسی میں جب قافلہ مدینہ (یثرب) پہنچا تو وہ بیمار ہو گئے اور

---

[1] ابوداؤد ۔ ترمذی

اس لیے اپنے ننھیال بنی نجار میں قیام پذیر رہے قافلہ جب مکہ پہنچا تو عبدالمطلب نے بیٹے کے متعلق دریافت کیا قافلہ نے ان کی بیماری اور مدینہ میں قیام کا واقعہ کہہ سنایا۔ تب عبدالمطلب نے اپنے بڑے بیٹے حارث کو دریافت حال کے لیے مدینہ بھیجا، حارث جب مدینہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ نے ایک ماہ چند روز بیمار رہ کر داعی اجل کو لبیک کہہ دیا۔ واپس آ کر جب حارث نے باپ کو حادثہ کی اطلاع دی تو عبدالمطلب اور تمام خاندان کو اس صدمہ جانکاہ نے بے حال کر دیا۔ کیونکہ عبداللہ اپنے باپ اور بھائیوں کے بہت چہیتے تھے۔

غرض جب ولادت باسعادت ہوئی تو اس سے قبل ہی آپ ﷺ کو یتیمی کا شرف حاصل ہو چکا تھا، چنانچہ قرآن نے آپ ﷺ کی یتیمی و دنیوی وسائل سے محرومی کے باوجود آغوش رحمت کردگار میں نشوونما پا کر ہادی عالم بننے کا معجزانہ اختصار کے ساتھ سورہ والضحیٰ میں تذکرہ کیا ہے:

﴿ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۞ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۞ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۞ ﴾ (الضحی: ۶-۸)

”(اے پیغمبر!) کیا تجھ کو خدا نے یتیم نہیں پایا پھر اپنی آغوش (رحمت) میں جگہ دی اور کیا تجھ کو ناواقف نہیں پایا، پھر تجھ کو (کائنات کی ہدایت کے لیے) ہدایت ماب بنایا اور کیا تجھ کو (ہر قسم کے وسائل سے محروم و محتاج نہیں پایا) پھر تجھ کو (ہر قسم کی سروری دے کر) غنی بنا دیا۔“

بقول حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ ان آیات میں عجیب و غریب اعجاز اور اسلوب بیان کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کے تمام ارتقائی مدارج کا تذکرہ ہے تم سمجھتے ہو، کہ ﴿ فَاٰوٰى ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ پروردگار عالم نے آپ ﷺ کو رہنے سہنے کی صورت پیدا کر دی یا آپ ﷺ کو بے یار و مددگار نہیں رہنے دیا، یہ بھی صحیح ہے مگر اس کلام ربانی کی اصل روح یہ ہے کہ اس نے ذات اقدس ﷺ کو ہر قسم کے مادی اسباب و وسائل سے بے پرواہ رکھ کر اپنی آغوش رحمت میں لے لیا اور آپ ﷺ کے نشوو ارتقاء کو خالص اپنی تربیت میں کامل و مکمل کیا۔ [1] اور ﴿ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ﴾ کی تفسیر کو خود قرآن ہی نے دوسری جگہ روشن کر دیا ہے مثلاً سورۂ شوریٰ میں ہے:

﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ ﴾ (الشوریٰ: ۵۲)

”اور اسی طرح ہم نے تیری جانب اپنے ”امر“ کی روح کا القاء کیا (حالانکہ اس سے پہلے) نہ تو کتاب (قرآن سے واقف تھا اور نہ ایمان (کی حقیقت) سے، لیکن ہم نے اس کو ”نور“ (روشنی) بنا دیا ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں (اس کی صلاحیت و استعداد کے پیش نظر) اس کے ذریعہ ہدایت دیتے ہیں۔“

اور آیت ﴿ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ﴾ میں دنیوی احتیاج و غناء کا ذکر روح کلام نہیں ہے بلکہ اس جانب اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

---

[1] تفسیر ابن کثیر

آپ ﷺ کو قربت و کمال کا وہ مرتبہ عظمیٰ عطا فرمایا ہے کہ مادی اور روحانی ہر قسم کی احتیاج سے بالاتر بنا کر صفات حمیدہ اور اخلاق کریمانہ کی مثل اعلیٰ "غنا" سے بہرہ ور بنا دیا، یہی وہ غنی ہے جس کا خود ذات اقدس ﷺ نے اس طرح ذکر فرمایا ہے:

((لیس الغنٰی عن کثرۃ العرض ولٰکن لغنٰی عن النفس)).

"غنا مالداری کی بہتات کا نام نہیں ہے حقیقی غنی "نفس کا ماسوی اللہ سے مستغنی ہو جانا" ہے۔"

عمر مبارک ابھی چھ سال ہی کی تھی کہ آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ آمنہ کا بھی انتقال ہو گیا بی بی آمنہ آپ ﷺ کو آپ کے ننھیال (مدینہ) میں لے کر گئی تھیں، واپسی میں مقام ابوا میں بیمار ہو گئیں اور چند روز علیل رہ کر وہیں انتقال فرمایا اور سن مبارک ابھی آٹھ منزلیں ہی طے کر پایا تھا کہ دادا عبدالمطلب نے بھی دنیا سے منہ موڑ لیا اور اس طرح عہد طفلی ہی میں وسائل تربیت اور دنیوی اسباب کفالت سے محرومی نے گویا مشیت الٰہی کی جانب سے یہ اعلان کر دیا کہ جس ذات قدسی صفات کو خدائے واحد نے خالص اپنی تربیت کے لیے منتخب کر لیا ہے کیسے ممکن ہے کہ اس کو دنیوی اسباب و وسائل تربیت کا محتاج بنائے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک یتیم و یسیر اور مادی وسائل سے محروم ہستی کو اپنے لیے چن کر کس طرح اپنی ربوبیت کاملہ کا مظہر بنایا۔ سورہ انشراح میں اس حقیقت کو اچھوتے انداز میں بیان فرمایا:

﴿ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۙ۝۱ وَ وَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۙ۝۲ الَّذِیْۤ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۙ۝۳ وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ؕ۝۴ ﴾ (الانشراح: ۱-۴).

"کیا ہم نے (قبول حق و صداقت کے لیے) تیرا سینہ نہیں کھول دیا اور (معرفت الٰہی کی حقیقی طلب اور قوم اور کائنات انسانی کی بے راہ روی پر ان کی ہدایت کی تڑپ کا) وہ بوجھ ہم نے تجھ سے دور کر دیا جس نے تیری کمر توڑ رکھی تھی اور ہم نے تیرے ذکر کو کائنات ہست و بود میں بلند کر دیا۔"

"شرح صدر" یہ کہ اب وسائل تعلیم و تعلم کے ذریعہ حاصل ہونے والے تمام علوم و معارف اس عطاء الٰہی اور وہبی معرفت و علم کے سامنے ہیچ ہو کر رہ گئے ہیں جس کی سمائی کے لئے ہم نے تیرے سینہ کو کھول دیا ہے، اب علوم و معارف کے بحر ناپید اکنار بھی ہوں تو تیرے سینہ کا دامن وسیع ان کے لیے کافی و وافی ہے اور اسی "شرح صدر" نے معرفت الٰہی کے تمام پوشیدہ گنجینے تجھ پر وا کر دیے اور وہ سارا بوجھ تیرے سینہ پر سے ہٹ گیا جس نے تیری کمر کو اس لیے شکستہ کر رکھا تھا کہ قلبی جستجو اور دلی تڑپ کے باوجود تو اس سے قبل نہیں جانتا تھا کہ معرفت الٰہی کی راہ مستقیم کون سی ہے اور گم کردہ راہوں کی راہنمائی کی سبیل کیا ہے؟ مگر اب یہ سب کچھ روشن ہو جانے کے بعد ہم نے عالم بالا و پست میں تیرے ذکر کو وہ بلندی اور رفعت عطا فرمائی کہ تیرا مقام ؏

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

قرار پایا، چنانچہ نام احمد و محمد ﷺ ہے اور مقام، مقام محمود، سورۃ الحمد وظیفہ حیات ہے اور لواء حمد قیامت میں طغرائے امتیاز ؏

حسن یوسفؑ، دم عیسیٰؑ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

Marfat.com

یہی نہیں بلکہ "قرآن کی تجدید دعوت" کے ذریعہ تیری صدائے حق نے اعتقاد و عمل اور ایمان و کردار کی راہ سے تمام دنیا کے نظام ہائے اجتماعی و سماجی میں جو عظیم الشان انقلاب بپا کر دیا اور سوسائٹی کے ہر شعبہ کی پرانی اور فرسودہ بساط کو الٹ کر جو نئی بساط بچھا دی اس نے تیرے ذکر کو وہ رفعت و برتری عطا کی کہ کوئی قوم، کوئی مذہب اور کوئی جماعت کسی نہ کسی شکل میں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

بت پرستی سے نفرت، خلوت پسندی اور عبادت الٰہی کا ذوق :

عہد طفولیت سے ازدواجی زندگی کے ابتدائی مراحل تک کے حالات و واقعات تفصیل کے ساتھ کتب سیرت و حدیث میں منقول ہیں۔ اس لیے وہیں لائق مراجعت ہیں۔ مختصر یہ کہ دادا عبدالمطلب کے انتقال کے بعد آپ ﷺ کے چچا ابوطالب آپ ﷺ کے ساتھ بہت انس رکھتے تھے اور زندگی بھر آپ ﷺ کی رفاقت کا حق ادا کرتے رہے۔ انبیاء و رسل کی سنت کے مطابق آپ ﷺ نے اپنی روزی کا بار کسی پر نہیں ڈالا اور دنیوی مشاغل میں آپ ﷺ نے بکریاں بھی چرائیں اور تجارت بھی کی، شام کے مشہور تجارتی شہر بصریٰ میں بھی اس غرض سے تشریف لے گئے اور پچیس سال کی عمر میں یہی سفر حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے عقد کا باعث ہوا، آپ ﷺ خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مال تجارت مضاربت پر بصریٰ کی منڈی میں لے گئے، خدیجہ رضی اللہ عنہا کا غلام میسرہ بھی رفیق سفر تھا، اس درمیان میں آپ ﷺ کی صداقت و امانت، ایک یہودی راہب کی بشارت اور بیش بہا منافع تجارت کا جو تجربہ اور مشاہدہ کیا تھا میسرہ نے وہ سب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے کہہ سنایا چنانچہ یہی تاثر ازدواجی رشتہ کا باعث بن گیا۔

اب زندگی میں ایک اور انقلاب ہوا کہ آپ ﷺ کو خلوت گزینی کی طرف رغبت ہوئی اور غار حرا میں روز و شب بسر ہونے لگے، بت پرستی سے شروع ہی سے نفرت تھی اس لیے کبھی نہ کسی صنم کے آگے سر جھکایا اور نہ کسی ایسی مجلس میں شرکت فرمائی جو صنم پرستی کے میلے کہلاتے تھے، اب خلوت میں فطرت سلیم جس طرح راہنمائی کرتی خدائے واحد کی عبادت کرتے مگر ایک خلش سینہ میں ایسی تھی جو اس حالت میں بھی بے چین ہی رکھتی، اکثر یہ سوچ کر تڑپ جاتے تھے کہ میری قوم خصوصاً اور دنیاء انسانی عموماً کس طرح خدائے واحد کو چھوڑ کر صنم پرستی اور مظاہر پرستی میں مبتلا ہے اور یہ کہ اخلاق کی دنیا کس طرح اُلٹ گئی ہے آخر وہ کونسا نسخہ کیمیاء ہے جو اس حالت میں انقلاب پیدا کر دے اور سچی خدا پرستی اور نیک عملی پھر ایک مرتبہ اپنی نمود دکھلائے۔

یہی جذبات و تاثرات تھے جو قلب مضطرب میں موجزن تھے اور خلوت کدۂ حرا میں انہی کیفیات کے ساتھ ذات اقدس ﷺ مصروف یاد الٰہی رہتی اور جب کئی کئی دن اس طرح گزر جاتے تو کبھی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا حاضر ہو کر آذوقہ حیات دے جاتیں اور کبھی خود بنفس نفیس جا کر چند روز کا سامان خورد و نوش لے آتے اور حراء میں پھر مشغول عبادت ہو جاتے، چنانچہ چودہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی آج حرا زبان سے اس کیف آگیں منظر کا شاہد ہے جس کا لطف اس نے برسوں اٹھایا ہے، مشہور محدث و مؤرخ حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ ان مختصر الفاظ میں حسن و خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے:

و انما کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یحب الخلا و الانفراد عن قومه لما یراھم علیه من الضلال المبین من عبادة الاوثان و السجود للاصنام و قویت محبة للخلوة عند مقاربة ایحاء اللہ الیه صلوات اللہ و سلامه علیه۔ [1]

[1] البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۵

Marfat.com

"اور رسول اللہ ﷺ (دور شباب میں) خلوت پسند ہو گئے تھے اور قوم سے الگ تنہائی میں وقت گزارتے تھے کیونکہ وہ قوم کی اس کھلی گمراہی کو دیکھ کر" کہ وہ بت پرستی میں مبتلا اور بتوں کے سامنے سجدہ گزار ہے" کڑھتے تھے اور جوں جوں آپ ﷺ پر وحی الٰہی کے نزول کا زمانہ قریب ہوتا جاتا تھا (مشیت الٰہی سے) اسی قدر آپ ﷺ کی خلوت پسندی میں اضافہ ہوتا جاتا، صلوات اللہ وسلامہ علیہ "اس ذات اقدس ﷺ پر خدا کی رحمتیں اور سلامتی نازل ہو۔"

بہرحال یہی وہ خلوت کدۂ عبادت تھا جہاں ذات اقدس ﷺ پر سب سے پہلے "وحی الٰہی" کا نزول ہوا اور بالترتیب سورۂ اقراء اور سورۂ مدثر کی چند آیات سنانے کے لیے بشیر ونذیر بنا دیا۔

حقیقت وحی:

یہ "وحی" و "تنزیل" کیا ہے جس کو "نبوت ورسالت" کے خصائص میں سے کہا جاتا ہے اور یہ "منصب نبوت ورسالت" کیا شے ہے جس کا "وحی وتنزیل" کے ساتھ اتنا گہرا اور قریبی تعلق ہے کہ منطقی اصطلاح میں "لازم وملزوم" کہا جا سکتا ہے اور اس اصطلاحی گفتگو سے قطع نظر سادہ الفاظ میں اس سوال کو کیوں نہ اس طرح پیش کر دیا جائے کہ کائنات انسانی کے ہر معاملہ میں جبکہ حسن وقبح کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کے لیے فطرت نے ہم کو "جوہر عقل" عطا کر دیا ہے اور انسان کے اندر کی یہ سرچ لائٹ (Search Light) ہر ایک مادی شعبۂ حیات میں رہنمائی کرتی ہے تو پھر "رسول ونبی کے ذریعہ پیغام الٰہی" کی حاجت کیا ہے؟ اور عالم روحانیات کے مسائل اور معرفت الٰہی کے حصول میں تنہا "عقل" ہی کیوں کافی نہیں سمجھی جاتی؟ یہی وہ سوال ہے جس کے حل ہو جانے پر "وحی" اور "نبوت" دونوں کی حقیقت بھی خود بخود واضح ہو جا سکتی ہے۔

اس سوال کو حل کرنے کے لیے پہلے ایک تمہید قابل توجہ ہے اور دراصل وہی اس مسئلہ کی کلید ہے۔

تم جب کائنات کے وجود وخلق کو عمیق فکر ونظر سے مشاہدہ کرتے ہو تو یہ حقیقت ہر جگہ ابھری ہوئی نظر آتی ہے کہ خالق کائنات نے اپنی ربوبیت کاملہ کے فیض وعطا سے ہر شے کو جس طرح وجود بخشا اور خلق کیا اس کو "ہدایت" (راہنمائی) سے بھی سرفراز کیا ہے اور اگر یہ نہ ہوتی تو کائنات کا وجود وخلق مہمل اور بیکار ہو جاتا، کیونکہ یہی "ہدایت" ہر ایک جاندار پر زندگی اور معیشت کی راہ کھولتی، ان کی حیات کو مفید بناتی اور ضروریات حیات کی طلب وحصول میں راہنمائی کرتی ہے اور یہی ناموس فطرت کا وہ فیض عام ہے جس کے بغیر کوئی مخلوق بھی سامان حیات اور وسائل تربیت سے استفادہ نہیں کر سکتی ورنہ وجود وحیات کی یہ گرمجوشیاں ہی ظہور پذیر ہو سکتیں۔

"مچھلی کے جائے کن تیرائے" اسی حقیقت کی جانب اشارہ ہے، وہ جب اس دنیا میں آنکھ کھولتے ہیں تو خود بخود پانی میں تیرنے لگتے اور اپنی غذا کی جستجو میں مصروف ہو جاتے ہیں، پرندوں کے بچے انڈے سے باہر آتے ہی ہوا میں اُڑنے کی کیوں کوشش کرتے نظر آتے ہیں، حیوان اور انسان کا بچہ جب اس کارگاہ ہستی میں قدم رکھتا ہے تو بھوک وپیاس دور کرنے کے لیے ماں باپ سے تعلیم حاصل نہیں کرتا بلکہ خود بخود ماں کے سینہ پر منہ رکھ کر غذا کے خزانہ سے دودھ کیوں چوسنے لگتا ہے۔ آخر یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے؟ تم کہتے ہو کہ یہ فطرت کا قانون ہے جو ان سب کو "فیض ہدایت" سے فیض یاب کر کے مخلوق کی نشوونما کا سامان مہیا کرتا ہے، یہ "ہدایت" بلے جو ہر حرکت حیات میں اپنا کام کر رہی ہے اور یہ "فیض ہدایت" ہے جو خالق کائنات کی جانب سے مخلوقات کی نشوونماء کے لیے "فیض عام" ہوا ہے۔

Marfat.com

لیکن ابھی وسعت نظر کو آگے بڑھنے دیجئے اور قدرت حق کے مشاہدہ کے لیے تیز گام ہوجیے تو کارگہ قدرت اور نوامیس فطرت کی کرم فرمائیاں اور زیادہ جلوہ آرا نظر آئیں گی۔ اور تم دیکھو گے کہ یہ "ہدایت" بھی دوسری موجودات کی طرح ارتقائی درجات رکھتی ہے اور ہر ایک درجہ اپنی افادیت کی نمود جدا رکھتا ہے۔ چنانچہ اس راہ میں سب سے پہلے "وجدان کی ہدایت" سامنے آتی ہے اور یہ طبیعت حیوانی کے "فطری اور باطنی الہام" کا نام ہے، یہی وہ ابتدائی درجہ ہے جو بچہ کو قید ہستی میں آنے کے فوراً بعد ہی کسی خارجی تعلیم وتربیت کے بغیر اس کی غذا کا پتہ دیتا اور اسباب حیات کے لیے معلم بنتا ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جو انسان کی ارتقائی منزل پر پہنچ کر اور "ضمیر کی آواز" "اندر کی صدا" بن کر حقائق کی معرفت کے لیے خارجی دلائل و براہین سے زیادہ قوی حجت ثابت ہوتی ہے۔ اس کے بعد "ہدایت حواس" کا درجہ ہے یہ پہلے درجہ سے بلند ہے اور اس کی عطاء و بخشش سے ہر ایک ذی روح دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے، چھونے کی قوتیں حاصل کرتا ہے اور ان کے ذریعہ کائنات عالم میں اپنی افادیت اور استفادہ دونوں کو ترقی دیتا ہے۔

قدرت حق کی جانب سے یہ دونوں درجے انسان اور حیوان دونوں کو عطاء ہوئے ہیں اور دونوں کی یکساں طور پر راہنمائی کرتے ہیں، مگر ان دونوں سے بلند ایک درجہ اور ہے جو "ہدایت عقل" کہلاتا ہے اور صرف "انسان" ہی کے لیے مخصوص ہے اور یہ بھی پہلے دو درجوں کی طرح بدیہی اور فطرت کے قوانین ونوامیس میں نمایاں جگہ رکھتا ہے۔ یہی وہ "ہدایت" ہے جو انسان کو بقیہ تمام حیوانات سے امتیاز بخشتی، اس کے سامنے فکر ونظر اور ترقیوں کی راہیں کھولتی ہے اور اسی کی بدولت وہ "اشرف المخلوقات" کہلانے کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔

عطیہ الٰہی "ہدایت" کے یہ تینوں درجے اپنے اپنے حلقۂ اثر میں حضرت انسان کی راہنمائی کا حق ادا کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ "وجدان" اس میں سعی پیہم کا جوش وولولہ پیدا کرتا ہے "حواس" اس کے لیے معلومات فراہم کرتے ہیں اور "عقل" اس کو جزئیات و کلیات کا علم بخشتی اور ان سے متعلق احکام ونتائج ترتیب دیتی ہے۔

غرض یہی وہ "ہدایت" ہے، قرآن عزیز نے جس کا ذکر انسانی تخلیق وتربیت کے سلسلہ میں کیا ہے، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے باہمی مکالمہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدائے برحق کی ربوبیت کاملہ کا جس طرح اظہار فرمایا ہے اس کا ذکر یوں کیا ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے:۔

﴿ رَبُّنَا الَّذِیْۤ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ۝ ﴾ (طٰہٰ:۵۰)

"ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی بناوٹ دی پھر اس پر راہ عمل کھول دی۔"

اور سورۂ اعلیٰ میں ہے:

﴿ الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۪ۙ وَ الَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ۪ۙ ﴾ (الاعلیٰ:۲۔۳)

"وہ پروردگار جس نے ہر چیز پیدا کی پھر اس کو درست کیا پھر ہر وجود کے لیے ایک اندازہ ٹھہرادیا، پھر اس پر راہ عمل کھول دی۔"

اور سورۂ بلد میں ہے:

﴿ اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَیْنَیْنِ ۙ﴿۸﴾ وَ لِسَانًا وَّ شَفَتَیْنِ ۙ﴿۹﴾ وَ هَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ ۚ﴿۱۰﴾ ﴾ (البلد: ۸۔۱۰) ❶

"کیا ہم نے اس کو (دیکھنے کے لیے) دو آنکھیں نہیں دیں اور کیا (بولنے کے لیے) زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے، اور ہم نے اس کو اچھی اور بری دونوں راہیں دکھا دیں۔"

اور سورۂ دہر میں ہے:

﴿ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِیْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِیْعًۢا بَصِیْرًا ﴿۲﴾ اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ﴿۳﴾ ﴾ (الدھر: ۲۔۳)

"ہم نے انسان کو (مرد و عورت کے) ملے جلے نطفہ سے پیدا کیا جس کو (ہم) مختلف حالتوں میں پلٹتے ہیں پھر اسے سننے والا اور دیکھنے والا بنا دیا، ہم نے اس پر راہ عمل کھول دی، اب یہ اس کا کام ہے کہ شکر گزار بنے یا ناشکر گزار۔"

مگر یہ بات بھی بہت صاف ہے کہ ہدایت کے ان ہر سہ مراتب "وجدان" "حواس" "عقل" کی راہ عمل اپنے اپنے دائرۂ عمل ہی تک محدود ہے یعنی "وجدان" ایک جاندار کے اندر زندگی کے لیے جوش عمل اور سعی مسلسل ولولہ تو پیدا کر سکتی ہے مگر حیوان یا انسان سے باہر محسوسات خارجیہ کا ادراک اور علم اس کے دائرۂ عمل سے خارج ہے، اسی طرح "ہدایت حواس" محسوسات کا ادراک ضرور پیدا کر دیتی ہے لیکن یہ اس کے احاطۂ عمل سے باہر ہے کہ وہ محسوسات کے نتائج و احکام اور جزئیات سے کلیات کا اور کلیات سے جزئیات کا استنباط کر سکے کیونکہ یہ کارفرمائی "ہدایت عقل" سے متعلق ہے جو عام حیوانات کے لیے نہیں بلکہ صرف انسان کے ساتھ ہی مخصوص ہے۔

تو "ہدایت عقل" اگرچہ پہلی دونوں ہدایات کے مقابلہ میں بلند مرتبہ رکھتی اور کائنات کی بلند ترین ہستی (حضرت انسان) کی راہنمائی کرتی ہے تاہم اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ "عقل" کا دائرہ وسیع تر ہونے کے باوجود پھر محدود ہے کیونکہ یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ عقل جو کچھ اور جس قدر بھی نتائج و احکام کا استنباط و استخراج کرتی ہے اس کا دائرہ محسوسات ہی تک محدود رہتا ہے اور حواس خمسہ (قوت باصرہ، سامعہ، لامسہ، شامہ، ذائقہ) نے اپنی اپنی خدمات انجام دے کر جو کچھ ہمارے لیے فراہم کیا ہے "عقل اسی پر اپنا تصرف کرتی اور کر سکتی ہے لیکن یہ بات کہ محسوسات کی سرحد سے پرے کیا کچھ ہے اور اس پردے کے پیچھے کیا ہے؟ اس مقام پر پہنچ کر "عقل" بھی عاجز و درماندہ ہو کر رہ جاتی ہے اور یہ "درجہ ہدایت" بھی اس سلسلہ میں ہم کو کسی قسم کی روشنی پہنچانے سے معذور نظر آتا ہے۔

علاوہ ازیں اگر وجدان کی تکمیل کے لیے حواس اور حواس کی تکمیل کے لیے عقل کی ہدایت موجود نہ ہوتی تو انسان ہرگز ان مدارج ارتقاء اور مراتب رفیع پر نہ پہنچ پاتا جن تک آج پہنچا ہوا ہے اور آئندہ جن تک پہنچنے کے لیے میدان عمل میں گامزن ہے، اگر انسان

---

❶ اس آیت میں وجود کائنات کے چار مراتب بیان کر کے قرآن نے ایک عظیم الشان "حقائق علمیہ" کا ایک باب کھول دیا ہے یہ چار مراتب بالترتیب "خلق، تسویہ، تقدیر، ہدایت" ہیں اور یہی چار مراتب خلاصہ حقائق ہیں خلق یہ کہ وجود بخشا، تسویہ یہ کہ اس کی استعداد کے مطابق اس کی درست کاری کی، تقدیر یہ کہ ہر شے سے متعلق اس کے بدء خلق سے اس کے نتیجہ حیات تک کے لیے پہلے سے ایک مقررہ اندازہ طے کر دیا اور ہدایت یہ کہ اس پر ہر قسم کی راہ عمل کھول دی۔ تفصیلات کتب تفاسیر میں مطالعہ فرمائیں۔

Marfat.com

میں وجدان کی قوت نہ ہوتی تو کس طرح حواس کی دنیا تک اپنی حیات کو پہنچا سکتا اور اگر محسوسات کے ادراک کے لیے حواس کی قوتیں نہ ہوتیں تو انسان کس طرح اپنی ذات سے خارج اشیاء کا ادراک کرسکتا اور ترقی کے لیے کوئی قدم اٹھا سکتا اور جبکہ حواس کے وسائل ادراک محدود ہیں، اور نہ صرف محدود بلکہ بسا اوقات گمراہی اور غلطی میں مبتلا کر دیتے ہیں مثلاً ہم کو طویل فاصلہ کی بڑی سے بڑی چیز چھوٹی نظر آتی ہے یا خلط صفراء کے بڑھ جانے سے شیریں سے شیریں چیز ذائقہ میں تلخ معلوم ہوتی ہے یا فاصلہ ہونے کی وجہ سے ہم رنگوں کے امتیاز میں اکثر غلطی کر جاتے ہیں تو ان تمام حالتوں میں، عقل کی ہدایت، کام آتی اور صحیح راہنمائی کرتی ہے اور اصل حقیقت کو پیش نظر لاتی ہے، وہ کہتی ہے کہ اگر طویل فاصلہ کی بناء پر تم کو "جہاز" ایک چھوٹی سی چیز نظر آتا ہے تو یہ نگاہ اور قوت باصرہ کا قصور ہے ورنہ جہاز ایک لمبی چوڑی اور بڑی شے کا نام ہے، اسی طرح شیریں اور تلخ کا فیصلہ کرتی ہے اور کہتی ہے کہ حقائق میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی شیریں ہر حالت میں شیریں ہے، اس لیے ذائقہ کی یہ تلخی مرض کی وجہ سے ہے غرض حواس کی غلطیوں سے محفوظ رکھ کر اصل حقیقت کو واضح کرنا "عقل کی ہدایت" کا فریضہ ہے اس لیے ہم ایک قدم اور آگے بڑھا کر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس سے قطع نظر...... کہ عقل محسوسات کی حدود سے آگے کچھ نہیں جانتی...... انسان کی عملی زندگی کے تمام حالات میں عقل کی ہدایت بھی کافی اور موثر ثابت نہیں ہوتی اس لیے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ نفس انسانی، جذبات، رجحانات اور قسم قسم کی خواہشات سے متاثر و مغلوب ہے بلکہ اکثر یہ مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ جب "عقل" اور "جذبات" کے درمیان کشمکش ہوتی ہے تو فتح "جذبات" ہی کی ہوتی ہے اور "عقل" درماندہ ہو کر رہ جاتی ہے۔

تو ان حالات میں "عقل" ہی تقاضا کرتی ہے کہ یہاں "عقل سے بھی بلند" اور کوئی درجہ ہونا چاہیے جو عقل سے زیادہ موثر رہنما اور ہر قسم کی کوتاہیوں سے پاک اور بے لوث ثابت ہو۔

اس تمہید کا حاصل یہ نکلا کہ انسان محسوسات کے دائرہ میں محدود رہ کر بھی اور ماوراء محسوسات کے ادراک کے لیے بھی "ہدایت عقل" سے بلند (ایک چوتھے) درجہ ہدایت کا محتاج ہے تو اب لائق غور و فکر ہے یہ بات کہ جس "رب العالمین" نے اپنی ربوبیت کاملہ سے انسان کے ارتقائی کمالات کی حاجات و ضروریات کے پیش نظر ہدایت وجدان سے بلند ہدایت حواس اور ہدایت حواس سے رفیع ہدایت عقل عطا فرمائی تو جبکہ عقل کی ہدایت بھی خاص حدود سے آگے نہیں جاسکتی اور حصول کمالات اور اعمال کے صحیح ضبط و نظم کے لیے ہی کافی نہیں ہے۔ نیز ماوراء محسوسات کے عدم علم کے باوجود اس کے انکار پر کوئی مثبت علمی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس وجدانی جذبات و احساسات اور شعور نفس اس کے "حقیقت" ہونے کا پتہ دیتے ہیں تو کیا اس خدائے برحق کی ربوبیت اور فیض رحمت کے لیے یہ منافی نہ تھا کہ وہ انسان کو "ہدایت عقل" سے بلند کوئی "مرتبہ ہدایت" عطا نہ کرے؟ ضرور منافی تھا اور اس لیے ایسا نہیں ہوا بلکہ اس نے اس کو ایک اور بلند تر مرتبہ "ہدایت وحی" بخشا، یہ مرتبہ ہدایت اپنی راہنمائی میں ہر قسم کی کوتاہیوں اور خطاء و قصور سے مامون و محفوظ ہے کیونکہ یہ خدا کی جانب سے ہر شے کی حقیقت کا علم و یقین عطا کرتا ہے اور ہدایت وحی کے افاضہ کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسی مقدس ہستی کو جو ہر قسم کے گناہوں اور عیوب سے "معصوم" ہوتی ہے اس مقصد کے لیے چن لیتا ہے کہ وہ اس کی جانب سے کائنات انسانی تک "ہدایت وحی" کو پہنچا دے، اس لیے یہ مقدس ہستی ایک جانب لوازم بشریت کے ساتھ مقیدرہ کر دوسرے انسانوں کی طرح "انسان" اور "بشر" کہلاتی ہے اور دوسری جانب عیوب و ماثم سے "معصوم" رہ کر خدا کے ساتھ وہ تعلق رکھتی

ہے جو دوسرے مقدس سے مقدس انسانوں کو بھی حاصل نہیں ہوتا اور اس طرح خدا اور اس کے بندوں کے درمیان افاضۂ "ہدایت وحی" کے لیے ایلچی اور واسطہ بنتی ہے، ایسی حقیقت کا نام مذہب کی اصطلاح میں "نبوت و رسالت" ہے۔
قرآن حکیم نے ہدایت کے اس مرتبہ عالی کا جگہ جگہ ذکر کیا ہے۔ حسب ذیل چند شواہد ملاحظہ ہوں:

﴿وَ اَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَیْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى﴾ (حٰم السجدہ: ۱۷)

"لیکن قوم ثمود تو اسے بھی ہم نے راہ حق و ہدایت دکھلائی تھی لیکن اس نے اندھے پن کو پسند کیا اور "ہدایت" کی راہ نہ چلی۔"

﴿قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَ اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝﴾ (الانعام: ۷۱)

"(اے پیغمبر!) کہہ دیجئے، یقیناً اللہ کی ہدایت ہی "حقیقی ہدایت" ہے اور ہم سب کو اس کا حکم دیا گیا ہے کہ تمام کائنات عالم کے پروردگار کے آگے سر عبودیت جھکا دیں۔"

﴿وَ الَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝﴾ (الروم: ۶۹)

"اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں سعی و جانفشانی کی تو ضرور ہے کہ ہم بھی ان پر اپنی راہیں کھول دیں اور بلاشبہ اللہ ان لوگوں کا ساتھی اور مددگار ہے جو نیک کردار ہیں۔"

﴿اِنَّ عَلَیْنَا لَلْهُدٰى ۝ وَ اِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَ الْاُوْلٰى ۝﴾ (اللیل: ۱۲-۱۳)

"بلاشبہ یہ ہمارا کام ہے کہ ہم رہنمائی کریں (ہدایت وحی عطاء کریں) اور یقیناً آخرت اور دنیا دونوں ہمارے ہی لیے ہیں۔"

ارتقائی نقطۂ نظر سے "ہدایت وحی" اور مسئلہ نبوت و رسالت کی وضاحت کے لیے اشہب فکر کو یوں بھی مہمیز کیا جا سکتا ہے کہ جب کہ یہ عقلی اور عملی نظریہ مسلمات میں سے ہے کہ "بقاء انفع" یا "بقاء اصلح" کے فطری قانون کے مطابق کائنات کی گوناگوں موجودات میں ہر ایک شے اپنے موجود رہنے کے لیے کوئی "حکمت و مصلحت" ضرور رکھتی ہے اور حکیم مطلق کا قانون فطرت کسی شے کو اسی وقت تک باقی رکھتا ہے جب تک اس کا وجود "نافع" اور "مفید" ہونے کی صلاحیت رکھتا اور جس غرض و غایت کے لیے اس کو پیدا کیا گیا ہے اس کو پورا کرتا ہے اور اسی قانون "بقاء انفع و اصلح" سے یہ بات بھی بہت واضح اور نمایاں طور پر ثابت ہوتی ہے کہ "نفع اور افادیت" کا سب سے اہم جزو یہ ہے کہ ہر شے اپنے سے بلند مخلوق اور سلسلۂ مخلوقات میں سے ہر نوع اپنے سے بلند نوع کی بقاء کے لیے مفید و معاون ثابت ہو، پس جبکہ حضرت انسان کو عقل بھی موجودات عالم کی سب سے بلند مخلوق اور مدارج ارتقاء کی بلند ترین کڑی تسلیم کرتی ہے اور اسی قانون کی رو سے موجودات عالم کی ہر شے اس کی خدمت، اس کے نفع اور اس کی افادیت میں مصروف عمل نظر آتی ہے تو یہ کیوں کر ممکن تھا کہ اشرف المخلوقات (انسان) کا وجدان، اس کے جذبات عالیہ اور اس کے افکار و خیالات کی پرواز جبکہ عالم مادیات سے کہیں زیادہ بلند اور رفیع ہیں اور اس کی عقل یہ جاننے کے باوجود کہ وہ ماوراء مادہ سے ناواقف ہے پھر بھی اس پردہ کے پیچھے کچھ ہونے کا احساس رکھتی اور اس کی معرفت کے لیے چسک محسوس کرتی ہے۔ فطرت الٰہی کا فیضان اور بقاء انفع کا ناموس اس کو عالم مادیات و محسوسات ہی کے اندر محصور رکھتا، اگر ایسا ہوتا تو بلاشبہ فطرت "بخیل" ٹھہرتی بلکہ یہ فطرت کا بہت بڑا ظلم ہوتا اور یہ ظاہر ہے کہ

Marfat.com

تنہا عقل اس کو اس منزل تک پہنچانے کے لیے قاصر و نا کام ہے لہٰذا از بس ضروری تھا کہ "فطرت الٰہی" اس کی رہنمائی کے لیے مزید کوئی سامان مہیا کرتی اور انسان کی ذہنی وفکری ترقیوں کو درجۂ تکمیل تک پہنچاتی۔ پس ماوراء مادہ علوم و معارف اور کائنات انسانی کی فلاح و نجات کے مقصد عظیم کے لیے عقل کی رہنمائی کا یہی وہ فیضان الٰہی ہے جس کو قرآن کی اصطلاح اور مذہبی بول چال میں "وحی نبوت" کہا جاتا ہے اور آیات ذیل اسی حقیقت کا اعلان کرتی ہیں:

﴿ وَ اُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ ﴾ (الانعام: ۱۹)

"اس نے (خدا نے) مجھ پر اس قرآن کی وحی کی تاکہ اس کے ذریعہ تمہیں (اہل عرب کو) اور انہیں جن تک اس کی تعلیم پہنچ جائے (ربع مسکون کو) "انکار اور بدعملی کے نتیجہ سے" ڈراؤں۔"

﴿ اِنَّاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ كَمَاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى نُوْحٍ وَّ النَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ عِيْسٰى وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْنُسَ وَ هٰرُوْنَ وَ سُلَيْمٰنَ ۚ وَ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۚ وَ رُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَ رُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ؕ وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۚ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴾ (النساء: ۱۶۳-۱۶۵)

"(اے پیغمبر!) ہم نے تمہاری جانب اسی طرح "وحی" بھیجی جس طرح نوح علیہ السلام پر اور ان نبیوں پر جو نوح علیہ السلام کے بعد ہوئے بھیجی تھی، اور جس طرح ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولاد یعقوب، عیسیٰ ایوب، یونس، ہارون، سلیمان (علیہم السلام) پر بھیجی اور داؤد کو زبور عطاء فرمائی، نیز خدا کے وہ رسول جن کا حال ہم (قرآن میں) پہلے سنا چکے ہیں اور جن کا حال ہم نے تمہیں نہیں سنایا، اور (اسی طرح) اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا جیسا کہ واقعی طور پر کلام کرنا ہوتا ہے، یہ تمام رسول (خدا پرستی اور نیک عملی پر) خوش خبری دینے والے اور (انکار حق پر) ڈرانے والے تھے (اور اس لیے بھیجے گئے تھے) کہ ان کے آنے (اور نیک و بد بتلانے) کے بعد لوگوں کے پاس کوئی حجت باقی نہ رہے جو وہ خدا کے حضور پیش کر سکیں (یعنی یہ عذر کر سکیں کہ ہمیں راہ حق کی طرف کسی نے دعوت نہیں دی تھی) اور خدا (اپنے کاموں میں) سب پر غالب ہے اور (اپنے تمام کاموں میں) حکمت والا ہے۔"

﴿ وَ لَمَّا جَآءَ عِيْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَ لِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴾ (الزخرف: ۶۳-۶۴)

"اور جب عیسیٰ علیہ السلام خدا کی) نشانیاں لے کر آیا، کہا "میں تمہارے پاس حکمت و دانائی لے کر آیا ہوں اور اس لیے آیا

Marfat.com

ہوں کہ بعض ان باتوں کو جن کے متعلق تمہارے درمیان اختلاف ہے صاف صاف بیان کر دوں، پس اللہ کے متقی بندے بن جاؤ اور میری پیروی کرو (اس بات میں کہ) بیشک اللہ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے پس اسی کی عبادت کرو کہ یہی سیدھا راستہ ہے۔"

﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَکُمْ بُرْھَانٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا ۝ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَ اعْتَصَمُوْا بِہٖ فَسَیُدْخِلُھُمْ فِیْ رَحْمَۃٍ مِّنْہُ وَ فَضْلٍ وَّ یَھْدِیْھِمْ اِلَیْہِ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا ۝﴾ (النساء: ۱۷۴۔۱۷۵)

"(اے افرادِ نسلِ انسانی!) تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے برہان (دلیل و حجت) آ گئی اور ہم نے تمہاری طرف واضح اور آشکارا روشنی بھیج دی پس جو لوگ اس پر ایمان لائے اور انہوں نے اس کا سہارا مضبوط پکڑ لیا تو وہ انہیں عنقریب اپنی رحمت کے سایہ میں داخل کر دے گا اور ان پر اپنا فضل کرے گا اور انہیں اپنے تک پہنچنے کی راہ دکھائے گا۔ ایسی راہ جو بالکل سیدھی راہ ہے۔"

قرآن نے ان آیات میں "ہدایت وحی" کو "حکمت" "برہان" (حجت و دلیل اور نور مبین) (آشکار روشنی) کہا ہے تاکہ یہ بخوبی واضح ہو جائے کہ جس طرح محسوسات و مادیات کے لیے "عقل" کو "روشنی" اور "دلیل راہ" کہا جاتا ہے اسی طرح عقل کے دائرۂ حدود سے آگے کے لیے "ہدایت وحی" یہی حیثیت رکھتی اور یہی خدمات انجام دیتی ہے۔

"ہدایت وحی" کی ضرورت پر اب تک جو کچھ کہا گیا اگر اس کے علاوہ مزید اضافہ مطلوب ہو تو مبدأ فیاض کے اس لطیف و حسین فیضان کے متعلق اس روشن پہلو سے بھی نظر کی جا سکتی ہے کہ جب ہم حواس کی قوتوں کا فکر عمیق سے مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت صاف نمایاں نظر آتی ہے کہ ناموس فطرت نے یہاں ایک قوت کے عملی نظام کو اس طرح سانچہ میں ڈھالا ہے کہ انسان کے اندر ودیعت کی ہوئی قوت حواس اس وقت تک اپنا صحیح عمل نہیں کر پاتی جب تک خارج سے اس کی مدد نہ کی جائے۔ مثلاً قوت باصرہ دیکھنے کی قوت کا نام ہے اور تم اس سے اپنی زندگی میں برابر کام لیتے رہتے ہو اور اس بحث سے قطع نظر" کہ جو شے باہر موجود ہے وہ آنکھ کے باریک پردوں پر اپنا عکس ڈال رہی ہے یا آنکھ کے پردوں میں جو روشنی ہے وہ اندر سے بشکل شعاع نکل کر موجود خارجی کو متاثر کر رہی ہے، اور اس کو ہم "دیکھنا" کہتے ہیں۔ "تم" نے بھی اس پر ضرور غور کیا ہوگا کہ جب تم کسی قسم کی بھی روشنی میں ہوتے ہو تو اپنی قوت باصرہ کی استعداد کے مطابق جس شے کو دیکھنا چاہتے ہو دیکھتے ہو لیکن جوں ہی تاریکی کا شکار ہو جاتے ہو اور شب دیجور کے ساتھ ابر سیاہ کے پردے روشنی پر چھا جاتے ہیں اس وقت حلقۂ چشم میں قوت باصرہ کی موجودگی کے باوجود تم یہ کہا کرتے ہو کہ "ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا" تو آخر بینا ہوتے ہوئے ایسا کیوں کہتے ہو؟ تمہارا جواب اس وقت یہ ہوتا ہے کہ قانون قدرت نے یہی مقرر کر دیا ہے کہ باطنی قوائے عمل اس وقت تک اپنا صحیح کام نہیں کرتے جب تک خارج سے اس سلسلہ کی مدد نہ پہنچے۔ اس لیے قوت باصرہ کی باطنی قوت بھی محتاج ہے کہ دیئے (چراغ) کی روشنی سے لے کر ماہتاب و آفتاب تک جس حیثیت کی بھی روشنی ہو اپنا عملی مظاہرہ کر سکے گی اور یہی حال دوسرے حواس کا بھی ہے۔

Marfat.com

پس اگر یہ صحیح ہے اور بلاشبہ صحیح ہے کہ خدائے واحد کا قانونِ قدرت اور ناموس فطرت اپنی وحدت کی جلوہ نمائی کا مظاہرہ کائنات مادی اور عالم روحانی میں یکساں طور پر کرتا رہتا ہے تو بے تامل یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگرچہ اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ "عقل" حضرت انسان کے اندر کی وہ روشنی ہے جس کو ید قدرت نے انسانیت کے ارتقائی منازل پر گامزن ہو کر انسانیت کی "مثل اعلیٰ" اور "مقصد عظیم" کو پانے کے لیے ودیعت کیا ہے، مگر مسطورۂ بالا قانون یہاں بھی اسی طرح کارفرما ہے جیسا کہ قوائے حواس میں کارفرما نظر آتا ہے یعنی اگر "عقل" عالم محسوسات و مادیات کے دائرے میں اپنا عملی مظاہرہ کرنا چاہتی ہے تو وہ محسوسات خارجی کی مدد کی ضرور محتاج رہتی ہے، مثلاً اس کا یہ فریضہ ہے کہ جزئیات کے ذریعہ "کلی" کا استخراج کرے، لیکن وہ ایسا جب ہی کر سکے گی کہ خارج میں اس سلسلہ کی جزئیات کا ایک بڑا ذخیرہ اپنے حقائق اصلیہ کو اس کے سامنے پیش کرے۔ پس اگر عقل کی روشنی اور ان حقائق کے درمیان وہم، خیال اور ظن کے تاریک پردے حائل ہو جائیں تو عقل کی روشنی ہرگز اپنا صحیح کام نہیں کر سکتی۔ اسی طرح جب وہ ماوراء محسوسات (روحانیات) کی جانب اپنی روشنی کو متوجہ کرتی ہے تو یہی اوہام، ظنون، خیالات اور جذبات فاسدہ کے تاریک پردے، اس کے اور عالم روحانیات کے درمیان عموماً حائل ہو جاتے ہیں، اور وہ اکثر وبیشتر ان سے مغلوب ہو کر گم کردہ راہ ہو جاتی اور معرفت حق اور معرفت باطل کے درمیان فرق و امتیاز سے عاجز نظر آتی ہے۔ ایسی حالت میں خالق کائنات کی رحمت کاملہ اور ربوبیت تامہ اس کو خاسر ونا کام نہیں چھوڑتی اور خارج سے اس کی پوری مدد کرتی ہے اور یہی وہ خارج کی روشنی ہے جو نبی اور پیغمبر کے ذریعہ کائنات انسانی تک پہنچی، اور دین و مذہب کی زبان میں "وحی روشنی" کہی جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن عزیز نے اسی حقیقت کو نمایاں کرنے کے لیے جگہ جگہ وحی کو "نور" (روشنی) سے تعبیر کیا ہے:

﴿ يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ۝ ﴾ (النساء: ۱۷۴)

"(اے افرادِ نسل انسانی!) تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے برہان (دلیل وحجت) آ گئی اور ہم نے تمہاری جانب واضح اور آشکارا "روشنی" (وحی الٰہی بشکل قرآن) بھیج دی۔"

﴿ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝ ﴾ (المائدہ: ۱۵)

"اللہ کی جانب سے تمہارے پاس (حق کی) "روشنی" آ چکی اور ایسی کتاب آ گئی جو (اپنی ہدایتوں میں نہایت) روشن کتاب ہے۔"

﴿ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ يَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ ﴾
(التوبہ: ۳۲)

"یہ لوگ (مشرکین، یہود، نصاریٰ) چاہتے ہیں "اللہ کی روشنی" کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں حالانکہ اللہ یہ "روشنی" پوری کیے بغیر رہنے والا نہیں اگرچہ کافروں کو پسند نہ آئے۔"

﴿ وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ﴾ (ابراهیم: ۵)

Marfat.com

"اور (دیکھو واقعہ یہ ہے کہ) ہم نے اپنی نشانیوں کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا تھا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکالے اور "روشنی" میں لائے۔"

﴿وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِيْمَانُ وَ لٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۲﴾﴾

(الشوریٰ:۵۲)

"اور اسی طرح ہم نے تیری جانب اپنے "امر" میں سے "روح امر" کی وحی بھیجی حالانکہ اس سے قبل تو نہیں جانتا تھا کہ کیا ہے کتاب؟ اور نہیں جانتا تھا کہ کیا ہے ایمان؟ لیکن ہم نے اس کو (قرآن کو) نور (روشنی) بنایا، ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ان کو اس کے ذریعہ راہ دکھاتے ہیں، اور اے پیغمبر! بلاشبہ تو (لوگوں) کو سیدھی راہ کی جانب راہنمائی کرتا ہے۔"

پھر اس مسئلہ کی اہمیت پر ایک دوسرے پہلو سے بھی فکر ونظر کی ضرورت ہے وہ یہ کہ ہم اس عالم ہست و بود میں روز وشب کے مشاہدات وتجربات سے یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہوتے ہیں کہ یہاں ہر شے کی کیفیت وکمیت یا اس کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے ایک "ترازو" یا "پیمانہ" ضرور ہے اور یہ کہ ہر ایک "پیمانہ" اور ہر ایک "ترازو" اپنے اندر ایک خاص صلاحیت رکھتا اور اپنی صلاحیت کے مطابق ہی اشیاء کے ناپ تول میں کام دے سکتا ہے مثلاً موتی اور جواہرات کے تولنے کے لیے ایک خاص ترازو (کانٹا) ہے، اب اگر ہم یہ چاہیں کہ اس میں شکر، روئی، غلہ جیسی چیزوں کو تولیں تو ظاہر ہے کہ اس کے لیے یہ نہیں، بلکہ دوسری قسم کا ترازو کام دے گا، یا مثلاً کپڑا، زمین وغیرہ جیسی اشیاء کی پیمائش کے لیے ہم ایک خاص قسم کا پیمانہ (گز) استعمال کرتے ہیں۔ پس اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس سے حرارت و برودت کی بھی پیمائش کرلیں تو اس کے لیے یہ نہیں بلکہ دوسرا پیمانہ تھرمامیٹر ❶ کام میں لانا ہوگا، اور اسی طرح ہوا کے دباؤ اور سطح کی اونچائی معلوم کرنے کے لیے بیرومیٹر ❷ اور زلزلوں اور بھونچالوں کی حالت دریافت کرنے کے لیے سیسومیٹر ❸ اور آواز کی مقدار وقوت کی پیمائش کے لیے فونومیٹر ❹ جدا جدا قسم کے پیمانے استعمال کرنے ہوں گے کیونکہ ان کی اپنی صلاحیت و استعداد کار کا یہی فطری تقاضا ہے کہ اگر اس کے خلاف ان کا استعمال کیا جائے گا تو یا تو قطعاً بیکار ثابت ہوں گے اور یا صحیح حقیقت نہ بتلاسکیں گے حالانکہ ان سب کا ایک ہی کام ہے یعنی "ماپ تول" اور ایک ہی نام ہے "ترازو اور پیمانہ" مگر ہر شے کی حقیقت اور اس کی کیفیت وکمیت کے پیش نظر چونکہ ان سب کی صلاحیت کار کی حدود متعین ہیں لہٰذا ان میں سے کوئی ایک بھی اپنی حدود سے متجاوز ہو کر کارآمد ثابت نہیں۔

قانون قدرت کی کارفرمائی کو رہنما بنا کر اگر ہم اسی نقطۂ نظر سے آگے قدم بڑھائیں اور خالص مادیات سے گزر کر معنویات کی حدود پر جا پہنچیں تو یہاں بھی وہی کرشمہ قدرت نظر آتا ہے یعنی انسان کی انفرادی واجتماعی حیات کے لیے رحمت کردگار نے جو پیمانے مقرر کیے ہیں، اور جن کو وجدان، حواس اور عقل کہا جاتا ہے ان میں بھی جدا جدا صلاحیتوں کے اعتبار سے حدود منقسم ہیں، مثلاً پیمانہ "وجدان" انسان کی صرف اسی کیفیت وحالت سے متعلق ہے جو قدرت کے ہاتھوں نے اس کے وجود کے ساتھ ساتھ اس میں ودیعت

❶ ThermaMeter ❷ BeroMeter ❸ SesisoMeter ❹ PhoneMeter

Marfat.com

کر دی ہے اور حواس کا پیمانہ ان ہی اشیاء سے تعلق رکھتا ہے جو دیکھنے، سننے، چکھنے، چھونے اور سونگھنے میں آ سکتی ہیں اور پیمانہ "عقل" ان دونوں سے آگے عالم مشاہدات و محسوسات کے حقائق اور ان کی کیفیات کے جانچنے ان کے درمیان امتیاز پیدا کرنے، ان سے نتائج اخذ کرنے اور ان پر احکام صادر کرنے کی خدمت انجام دیتا ہے۔

پس اگر ہم چاہیں کہ "وجدان" سے "حواس" اور "حواس" سے "عقل" کا کام لیں تو خود عقل ہی کے نزدیک ایسا کرنا غلط ہوگا، کیونکہ یہ قانون فطرت کی مقررہ حدود کی خلاف ورزی کے مرادف ہے جس کے اقدام پر ناکامی کے ماسوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

لیکن عقل انسانی اس کے آگے نہ جاننے کے باوجود پھر جاننے کی جستجو رکھتی اور اپنی ترقی کو اس کے اندر محدود نہیں سمجھتی، نیز تمام خارجی دلائل سے بڑھ کر انسان کے اندر کی قوی تر حجت و برہان "وجدان" ان ہر دو عالم سے بھی بلند تر عالم کے وجود کا جو پتہ دیتی ہے اس کے پیش نظر ہم وسعت نظر کا قدم اور آگے بڑھاتے اور مسطورۂ بالا عالم معنویات سے لطیف تر معنوی عالم کا کھوج لگانا چاہتے اور اس کائنات سے اپنا رشتہ جوڑنا چاہتے ہیں، جہاں حسن، صداقت اور محبت [1] (ذات حق کی صفات ربوبیت، عدالت اور رحمت) اپنی جلوہ آرائیوں سے اس کائنات کو بھی منور کر رہی ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں پہنچ کر پیمانہ عقل بھی کوتاہ ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کی رفعت پرواز وہاں تک رسائی نہیں کر پاتی، خصوصاً ایسی حالت میں کہ انسانوں کے درمیان "عقل" کا اس درجہ تفاوت موجود ہے کہ ایک شخص کی عقل اس کو نہ صرف ممکن الوقوع سمجھتی ہے بلکہ اس کو وجود پذیر کر دکھاتی ہے بلکہ تفاوت عقلی کی بوالعجبیوں کا تو یہ حال ہے کہ ایک ہی شخص کی عقل ایک وقت جس بات پر ناممکن کا فتویٰ صادر کر دیتی ہے دوسرے وقت میں اسی بات کو ممکن سمجھنے لگتی ہے تو جب پیمانہ عقل کا عالم محسوسات میں یہ حال ہے تو عالم غیب تک اس کی رسائی معلوم؟ اور پھر جس پیمانہ کے توازن کو غیر متوازن بنانے کے لیے وہم و خیال اور جذبات کا سیل رواں موجیں مارتا رہتا ہو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ خارج سے مدد و یاری کے بغیر "عقل" معرفت الٰہی اور علوم غیب تک رسائی حاصل کر سکتی ہے؟

پس انسان کی بیچارگی و درماندگی کے اس مقام پر بھی رحمت کردگار اپنے فیضان سے اس کو محروم نہیں رکھتی اور معنوی اور روحانی حقائق کی معرفت کے لیے ایک مقدس ہستی (پیغمبر) کے ذریعہ اس کو عقل سے بھی رفیع و لطیف پیمانہ "ہدایت وحی" عطا کر دیتی ہے۔ تاکہ انسان "سعادت و شقاوت" میں امتیاز کرنے کے بعد حیات سرمدی اور "نجات ابدی" کو پا سکے۔

قرآن عزیز نے "وحی الٰہی" کو یہی حیثیت دیتے ہوئے سورۂ شوریٰ میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿اَللّٰهُ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَ الْمِیْزَانَ ؕ﴾ (الشوریٰ: ۱۷)

"اللہ وہ ہے جس نے حق کے ساتھ کتاب (قرآن) کو نازل کیا اور اتارا "میزان" (ترازو) کو یعنی دین حق کو جو حق و باطل کے لیے ترازو اور پیمانہ ہے۔"

---

[1] آج کل علمائے جدید میں یہ بحث جاری ہے کہ سائنس نے اپنی حدود کو اس طرح محدود رکھا کہ اس کے دائرہ میں حسن، صداقت اور محبت کی کوئی قدر و قیمت نظر نہیں آتی اور اس لیے وہ خدا کی ہستی کی معرفت ضروری نہیں سمجھتی مگر یہ سائنس کا کمال نہیں ہے بلکہ نقص ہے جو آج نہیں تو کل ضرور پورا ہو کر رہے گا۔

Marfat.com

چنانچہ شاہ عبدالقادر صاحب (نوراللہ مرقدہ) موضح القرآن میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"ترازو فرمایا دین حق کو جس میں بات پوری ہے نہ کم نہ زیادہ۔"

صاحب وحی کی معرفت کی وجدانی دلیل:

"ہدایت وحی" یا "نبوت و رسالت" کی حقیقت و اہمیت پر گزشتہ سطور میں کوتاہ قلمی کے باوجود جو کچھ سپرد قرطاس کیا گیا اس کی تکمیل کے لیے اس سوال کو بھی حل کرنا از بس ضروری ہے کہ جب کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ وہ "حامل وحی" ہے اور "خدا کا پیغمبر اور ایلچی" تو اس کے دعوائے صدق و کذب کی معرفت کا کون سا طریقہ ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ "علم الکلام" کے ماہرین (متکلمین) نے اس معرفت کے لیے بہت سے دلائل و براہین پیش کیے ہیں اور اس مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر اس پر معرکۃ الآراء بحثیں کی ہیں تاہم وہ اپنے طرز استدلال میں اصطلاحی فلسفیانہ اسلوب رکھتی ہیں جس کو ہم "مذہبیات" و "روحانیات" میں خاص اہمیت دینے کو آمادہ نہیں ہیں کیونکہ اس راہ میں وہی اسلوب بیان مفید، دل نشین اور جاذب قلوب ہوسکتا ہے جس کی بنیاد و نہاد وجدانی طرز استدلال پر رکھی گئی ہو اور عقلیت کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے اصطلاحی فلسفہ و منطق کی قیود میں اس کو پابہ زنجیر نہ کر دیا گیا ہو اور یہ اس لیے کہ معرفت الٰہی اور معرفت علوم غیبیہ کے لیے دلیل "وجدان" سے زیادہ دوسری کوئی دلیل و برہان مؤثر نہیں ہے، اسی حکمت بالغہ کے پیش نظر قرآن عزیز کے تمام عقلی استدلالات..... جن پر غور کرنے کے لیے "قرآن" عقل و فکر اور تدبر کو مخاطب بناتا ہے..... کی بنیاد بھی "وجدان" پر قائم کی گئی ہے البتہ یہ قرآن حکیم کا اعجاز بلاغت ہے کہ ان وجدانی دلائل کو اگر کوئی فلسفی دقیق فلسفیانہ طریق استدلال کے سانچہ میں ڈھال کر زیر بحث لانا چاہے تو یہ وجدان پر مبنی استدلالات اسی اہمیت و قوت کے ساتھ اپنی صداقت اور ثمرہ و نتیجہ کو اس رنگ میں بھی تسلیم کرا لیتے ہیں۔

غرض "وجدان" اس سوال کا جواب یہ دیتا ہے کہ تم مدعی نبوت کی زندگی کو "صداقت کی کسوٹی" پر خوب کسو اور اگر آج وہ ہستی تمہارے سامنے نہیں ہے تو تعصب اور نسلی و جماعتی حسد سے پاک اور بے لوث ہو کر بے لاگ تاریخی حقائق سے دریافت کرو، پس اگر تم پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ اس کی قبل از دعوائے نبوت زندگی کا ہر شعبہ حیات صداقت و حقانیت کا مظہر ہے اور ہر ایک شعبۂ زندگی بے داغ صداقت کا پیکر اور نہ صرف اسی قدر بلکہ اس کا وجود ہر قسم کی بداخلاقیوں، گناہوں اور آلودگیوں سے پاک اور "معصوم" ہے اور اخلاقی بلندیوں کا مخزن اور ان ہی کیفیات و حالات کے ساتھ اس نے جانے بوجھے لوگوں میں زندگی کا بڑا حصہ گزارا ہے تو پھر اس کے دعوائے صداقت میں شک و شبہ کرنا عقل سلیم کے خلاف ہوگا کیونکہ عقل بآسانی یہ فیصلہ کرتی ہے کہ جس ہستی نے اپنی مدت حیات کے طویل عرصہ میں نازک سے نازک موقعوں پر بھی کبھی ایک لمحہ کے لیے انسانی دنیا پر جھوٹ نہ بولا ہو، آخر دماغی و قلبی انقلابات کی وہ کونسی تاریخ ہے جس کی بنا پر ایسی باہوش و حواس ہستی کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ وہ خالق کائنات "خدائے برحق" پر کذب بیانی اور افترا پردازی کے لیے یک بیک آمادہ ہو جائے، چنانچہ قرآن عزیز نے اسی حقیقت کو سورۂ یونس میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

﴿قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَ لَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ

Marfat.com

الْمُجْرِمُوْنَ ۞﴾ (یونس: ۱۶-۱۷)

"اور تم کہو" اگر اللہ چاہتا تو میں قرآن تمہیں سناتا ہی نہیں اور تمہیں اس سے خبردار ہی نہ کرتا (مگر اس کا چاہنا یہی ہوا کہ تم میں اس کا کلام نازل ہو اور تمہیں اقوام عالم کی ہدایت کا ذریعہ بنائے) پھر دیکھو، یہ واقعہ ہے کہ میں اس معاملہ سے پہلے تم لوگوں کے اندر ایک پوری عمر بسر کر چکا ہوں کیا تم سمجھتے بوجھتے نہیں؟ پھر اس سے بڑا ظالم کون ہے جو باندھے اللہ پر بہتان یا جھٹلائے اس کی آیتوں کو، بیشک بھلا نہیں ہوتا گنہگاروں کا۔"

"صاحب وحی" کی صداقت کی یہ ایسی بہترین کسوٹی اور دلیل ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ نے ۶ھ میں پادشاہان دنیا کے نام اسلام کی دعوت و پیغام کے سلسلہ میں والا نامے بھیجے تو وقت کی سب سے بڑی طاقت (رومن امپائر) کے بادشاہ ہرکلیوس (ہرقل) کے پاس حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ نامہ مبارک لے کر پہنچے تب اس نے بھی جب آپ ﷺ کی صداقت کو پرکھنا چاہا تو سب سے پہلے اسی وجدانی دلیل کو "معیار صداقت" ٹھہرایا اور صورت حال یہ پیش آئی کہ اس نے سرکاری حکام سے دریافت کیا، یہاں کوئی حجازی قافلہ موجود ہے جس سے اس ہستی کے متعلق معلومات حاصل ہو سکیں؟ اتفاق سے ابوسفیان (جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) کی سرکردگی میں ایک تجارتی قافلہ مقیم تھا۔ چنانچہ ان لوگوں کو شاہی دربار میں طلب کیا گیا اور ہرکلیوس نے رئیس التجارۃ (ابوسفیانؓ) سے نبی اکرم ﷺ کے متعلق چند سوالات کیے جن میں سب سے اہم سوال یہ تھا کہ "وہ تمہارے اندر ہی پلا بڑھا نہ رہا سہا ہے تو کیا تم نے اس کی زندگی کے اس طویل دور میں کبھی جھوٹ کا شائبہ پایا ہے؟" ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: "کبھی نہیں بلکہ اس کے برعکس وہ اپنی قوم میں "الصادق الامین" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے" یہ سن کر ہرکلیوس نے یہ کہا:

و سألتك هل كنتم تتهمونه بالكذب قبل ان يقول ما قال فذكرت ان لا فقد اعرف انه لم يكن ليذر الكذب على الناس ويكذب على الله. (بخاری ج ۱)

"میں نے تجھ سے یہ بھی دریافت کیا: کیا کبھی اس کے اس دعویٰ سے قبل تم نے اس کو جھوٹا پایا ہے؟" تو نے کہا: "کبھی نہیں" تب میں نے یقین کر لیا کہ جو ہستی انسانوں پر جھوٹ کہنے کو آمادہ نہ ہو وہ کبھی خدا پر جھوٹ نہیں بول سکتی۔"

"جو ہستی انسانوں پر جھوٹ کہنے کو آمادہ نہ ہو وہ کبھی خدا پر جھوٹ نہیں بول سکتی۔" دیکھیے یہ جملہ اس سلسلہ میں وجدان انسانی کا کس درجہ صحیح ترجمان ہے کہ ہرکلیوس نے بھی تمام عقلی و نقلی دلائل سے الگ ہو کر وجدان کے تقاضے سے پہلی دلیل جو پیش کی وہ وہی تھی جس کو وجدان کے خالق (خدائے برتر) نے اپنے پیغمبر سے (صداقتِ دعویٰ کے لیے) پیش کرائی۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ان آیات کی تفسیر اسی حقیقت کی روشنی میں اس طرح کی ہے:

"پھر آیت (۱۶) میں صداقت نبوت کی ایک سب سے زیادہ واضح اور وجدانی دلیل بیان کی ہے..... فرمایا، ساری باتیں چھوڑ دو، صرف اس بات پر غور کرو کہ میں تم میں کوئی نیا آدمی نہیں ہوں جس کے خصائل و حالات کی تمہیں خبر نہ ہو، تم ہی میں سے ہوں اور اعلان وحی سے پہلے ایک پوری عمر تم میں بسر کر چکا ہوں، یعنی چالیس برس تک کی عمر کہ عمر انسانی کی پختگی کی کامل مدت ہے اس تمام مدت میں میری زندگی تمہاری آنکھوں کے سامنے رہی بتلاؤ اس تمام عرصہ میں کوئی ایک بات بھی تم نے سچائی اور امانت کے خلاف مجھ میں دیکھی؟ پھر اگر اس تمام مدت میں مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ کسی انسانی معاملہ میں جھوٹ بولوں تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اب خدا پر بہتان

Marfat.com

باندھنے کے لیے تیار ہو جاؤں اور جھوٹ موٹ کہنے لگوں، مجھ پر اس کا کلام نازل ہوتا ہے؟ کیا اتنی سی موٹی بات بھی تم نہیں پا سکتے؟

تمام علماء اخلاق ونفسیات متفق ہیں کہ انسان کی عمر میں ابتدائی چالیس برس کا زمانہ اس کے اخلاق وخصائل کے اُبھرنے اور بننے کا اصل زمانہ ہوتا ہے جو سانچہ اس عرصہ میں بن گیا پھر بقیہ زندگی میں بدل نہیں سکتا پس اگر ایک شخص چالیس برس کی عمر تک "صادق وامین" رہا ہے، تو کیونکر ممکن ہے کہ اکتالیسویں برس میں قدم رکھتے ہی ایسا کذاب ومفتری بن جائے کہ انسانوں پر ہی نہیں بلکہ ﴿فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ﴾ "آسمان وزمین کے پیدا کرنے والے خدا" پر افترا کرنے لگے؟

چنانچہ اس کے بعد فرمایا: دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے جو شخص اللہ پر افتراء کرے اس سے بڑھ کر کوئی شریر نہیں اور جو صادق کو جھٹلائے وہ بھی سب سے زیادہ شریر انسان ہے اور شریر ومفتری انسان کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اب صورت حال نے یہاں دونوں فریق پیدا کر دیے۔ اگر میں مفتری علی اللہ ہوں تو مجھے ناکام ونامراد ہونا پڑے گا، اگر تم سچائی کے مکذب ہو تو تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا ہے، فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے اور اس کا قانون ہے کہ مجرموں کو فلاح نہیں دیتا۔

چنانچہ اللہ کا یہ فیصلہ صادر ہو گیا، جو مکذب تھے ان کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہا، جو صادق تھا اس کا کلمہ صدق آج تک قائم ہے اور قائم رہے گا۔ [1]

بہرحال "صاحب وحی" کے دعوائے صداقت کی یہ وجدانی دلیل عقل سلیم اور فکر مستقیم کی نگاہ میں "علم الیقین" پیدا کرنے کے لیے کافی ووافی ہے، تاہم بقیہ شرائط یعنی صداقت تعلیم نزول وحی کا ادعاء اور مخالفین کے مقابلہ میں تحدی (چیلنج) اور تحدی کا ایفاء "مدعی نبوت ورسالت" کے لیے یہ تمام امور بھی ازبس ضروری ہیں اور اپنی جگہ تفصیل طلب اور قابل لحاظ ہیں اس لیے کہ ان شرائط کے پیش نظر ہی نبی اور مصلح کے درمیان امتیاز، نبی اور ساحر وشعبدہ باز کے مابین فرق بین اور نبی اور متنبی میں تضاد قائم کیا جا سکتا ہے۔ [2]

بعثت :

غرض خاتم الانبیاء ﷺ کی حیات طیبہ کے انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں کا یہ حال تھا کہ ایک جانب خلوتہائے راز میں معرفت الٰہی کے لیے استغراق، صراط مستقیم کی جستجو، نوع انسانی کے اصلاح حال کی تڑپ اور طلب تھی اور دوسری جانب افراد قوم و ملک کے ساتھ راست گفتاری، صداقت شعاری، حسن معاملت اور اصابت فکر جیسے اخلاق کریمانہ وصفات حمیدہ سے متصف معاشرتی زندگی کا مظاہرہ تھا اور ان امتیازات کی وجہ سے ہر فرد کی نگاہ میں آپ ﷺ کی وہ قدر ومنزلت تھی کہ باتفاق رائے "الصادق الامین" کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے اور کل جو دشمنی ان کو محمد رسول اللہ ﷺ سے دعوائے نبوت کی بناء پر ہوئی وہ آج محمد ﷺ بن عبداللہ کے ساتھ قطعاً نہیں تھی اور سب ہی ان کی تقدیس وتطہیر کے قائل تھے۔

یہی حالات وواقعات تھے جبکہ عمر مبارک چالیس منزلیں طے کر چکی تھی، رمضان کا مہینہ تھا اور آپ ﷺ غار حرا میں مشغول عبادت تھے کہ اچانک آپ ﷺ کے سامنے جبرئیل علیہ السلام فرشتہ نمودار ہوا اور اس نے بشارت دی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ

---

[1] ترجمان القرآن ج ۲ ص ۱۵۰

[2] یہ مباحث علم کلام میں قابل مراجعت ہیں لیکن قصص القرآن کی تمام جلدوں کے مطالعہ سے یہ کل بحث تسلی بخش تفصیلات کے ساتھ مل جائیں گے۔

Marfat.com

کو ثقلین کی رشد و ہدایت کے لیے چن لیا اور رسالت و پیغمبری کے منصب کبریٰ پر فائز کیا۔

یہ واقعہ چونکہ نوع انسانی کی تاریخ میں حیرت زا انقلاب کا باعث ثابت ہوا اور اس نے ذات اقدس ﷺ کو معراج رفعت کی اس حد پر پہنچا دیا جہاں عالم ادیان و ملل کے تمام اصلاحات و انقلابات اس ہستی کا فیض رحمت نظر آتے ہیں اس لیے تاریخ و حدیث کے روشن صفحات نے اس واقعہ کی تمام تفصیلات کو بسند صحیح اپنے سینہ میں محفوظ رکھا ہے، چنانچہ فن حدیث و تاریخ اسلام کے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور و مقبول کتاب الجامع الصحیح میں صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی سند سے اس واقعہ کو جن الفاظ میں نقل کیا ہے اس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

نبی اکرم ﷺ پر شروع میں سچے خوابوں کا سلسلہ جاری رہا۔ کوئی خواب آپ ﷺ نہیں دیکھتے تھے مگر وہ اپنی تعبیر میں اس درجہ روشن اور صحیح ثابت ہوتا تھا جیسا کہ طلوع صبح کے لیے سفیدۂ صبح کا ظہور ہوتا ہے پھر آپ ﷺ کو خلوت محبوب ہوگئی اور حراء میں مشغول عبادت رہنے لگے۔ گاہے گاہے آپ ﷺ اہل و عیال کے پاس بھی تشریف لے آتے تھے، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کے لیے کچھ توشہ تیار کرتیں اور آپ ﷺ اس کو لے کر پھر غار میں واپس تشریف لے جاتے، اسی طرح حرا میں مشغول استغراق و عبادت تھے کہ اچانک ایک روز آپ ﷺ پر خدا کا فرشتہ نمودار ہوا اور کہنے لگا: "اِقْرَاء پڑھئے۔" نبی اُمی نے کہا: "مَا اَنَا بِقَارِی، میں پڑھنا نہیں جانتا" پیغمبر ﷺ ارشاد فرماتے تھے "کہ جب میں نے فرشتہ سے یہ کہا تو اس نے مجھ کو گرفت میں لے لیا جس کی شدت سے مجھ کو تکلیف محسوس ہونے لگی اور پھر چھوڑ کر مجھ سے دوبارہ کہا "پڑھئے" اور میں نے وہی جواب پھر دیا "میں پڑھنا نہیں جانتا" تب اس نے پھر وہی عمل کیا، اور گرفت چھوڑ کر تیسری مرتبہ پھر پہلا جملہ دہرایا اور میں نے بھی وہی سابق جواب دیا غرض تین مرتبہ یہی گفتگو اور یہی عمل ہوتے رہنے کے بعد چوتھی مرتبہ فرشتہ نے (سورۂ اقراء کی) یہ چند آیتیں تلاوت کیں:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝۳ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝۴ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝۵﴾ (العلق: ۱۔۵)

"اپنے اس پروردگار کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا۔ اس نے انسان کو خون بستہ سے پیدا کیا، پڑھ اور تیرا پروردگار بہت کرم کرنے والا ہے جس نے قلم (تحریر) کے ذریعہ (انسان کو) علم سکھایا، انسان کو وہ سب کچھ سکھایا جس سے وہ ناواقف تھا۔"[1]

غرض نبی اکرم ﷺ نے ان آیات کو دہرایا اور یہ آپ ﷺ کے ذہن نشین ہوگئیں، اس کے بعد جب حراء سے فارغ ہوئے تو یہ حالت کہ قلب (شدت وحی سے) کانپ رہا تھا، آپ ﷺ نے مکان میں داخل ہوتے ہی فرمایا: "مجھ کو کپڑا اڑھاؤ" (حضرت) خدیجہ رضی اللہ عنہا نے فوراً کپڑا اوڑھا دیا، جب آپ ﷺ کو سکون ہوا تو خدیجہ رضی اللہ عنہا کو تمام واقعہ کہہ سنایا اور پھر فرمایا: خشیت

---

[1] حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں بہت ہی لطیف بات ارشاد فرماتے ہیں، موضح القرآن میں لکھتے ہیں: اول جبرئیل علیہ السلام وحی لائے تو یہ پانچ آیتیں، حضرت (محمد ﷺ) نے کبھی لکھا پڑھا نہ تھا اس لیے (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا کہ قلم سے بھی علم وہی دیتا ہے یوں بھی (یعنی بغیر وسائل بھی وہبی طور پر) وہی دے گا۔

علی نفسی۔ "مجھے جان کا خوف ہے۔" ❶ (حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے یہ سن کر عرض کیا: "قسم بخدا! خدا آپ ﷺ کو ہرگز رسوا نہیں کرے گا کیونکہ آپ ﷺ صلہ رحمی کرتے ہیں، مہمانوں کی مہمانداری، بیچاروں کی چارہ گری فرماتے اور مفلس کے لیے ذریعہ معاش مہیا کرتے ہیں اور حق رسی کی کڑی سے کڑی مصیبت میں مددگار بنتے ہیں۔ اس گفتگو کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نبی اکرم ﷺ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، ورقہ زمانہ جاہلیت کے ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے سچی عیسائیت کو قبول کر لیا تھا، عبرانی زبان سے واقف اور انجیل کی کتابت کیا کرتے تھے اور بہت ضعیف العمر اور نابینا تھے (حضرت) خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ورقہ سے کہا: برادر من آپ اپنے بھتیجے کا واقعہ تو سنیئے۔" ورقہ نے دریافت حال کیا، تب نبی اکرم ﷺ نے گزرا ہوا واقعہ سنایا، ورقہ نے سنا تو کہا: ھٰذا الناموس الذی کان ینزل علی موسٰی۔ یہ وہ فرشتہ (جبرئیل علیہ السلام) ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی الٰہی لے کر آیا کرتا تھا۔ کاش کہ میں اس وقت تک زندہ رہوں جب تیری قوم تجھ کو تیرے وطن (مکہ) سے نکالے گی۔" آپ ﷺ نے دریافت کیا: "کیا میری قوم مجھ کو وطن سے بے وطن کرے گی" ورقہ نے کہا: "بیشک ایسا ہوگا اور جس پیغام کے لیے خدا نے آپ ﷺ کو پیغمبر بنایا ہے اس خدمت پر جو بھی مامور ہوا اس کے ساتھ یہی صورت پیش آئی ہے، پس اگر وہ وقت میری زندگی میں آیا تو میں پوری قوت کے ساتھ تیری حمایت کروں گا" مگر ورقہ کو یہ وقت نہیں آیا اس سے قبل ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ ❷

حدیث بخاری اور بعض مستشرقین کی کوتاہ اندیشی:

صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں نزول وحی کی وجہ سے نبی اکرم ﷺ پر فوری تاثر ہوا اس کو خود زبان مبارک سے اس طرح ظاہر کیا گیا ہے ((انی خشیت علی نفسی)) اور پھر اس کے متصل ہی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے تسکین دہ الفاظ منقول ہیں تو یہ واقعہ کا ایسا پہلو ہے جس کی فطری صداقت اور غیر مصنوعی سادگی خود بخود دل میں اتر جاتی ہے اور واقعہ کا نقشہ اس طرح سامنے آ جاتا ہے کہ ایک صادق و امین ہستی اپنی پاک اور بے لوث زندگی کے ساتھ ایک غار میں محو استغراق ہے، اس کے قلب میں خدائے برتر کے لیے عشق سے سرشار جذبہ عبودیت موجزن ہے، وہ شرک اور گناہوں کی آلودگیوں سے نفور و بیزار گوشہ تنہائی کو پسند کر کے پہاڑ کے ایک غار میں سرگرم عبادت ہے، یہ سلسلہ اگرچہ عرصہ سے جاری ہے مگر اچانک ایک روز خدا کا فرشتہ (جبرئیل علیہ السلام) جو ہمیشہ سے خدا کے پیغمبروں کے پاس وحی لے کر آتا رہا ہے، اس پر ظاہر ہوتا ہے اور وحی الٰہی کی پیغام رسانی کرتے ہوئے اس کو نبوت و رسالت کی بشارت دیتا ہے۔ یہ ہستی چونکہ اس سے قبل اس منصب جلیل کی حقیقت سے ناآشنا تھی اس لیے اس حیرت زا خبر اور وحی الٰہی کی عظیم ترین روحانی قوت کے زبردست اثر نے جو فوری انقلاب ذات اقدس ﷺ میں پیدا کیا اس کی وجہ سے تشویش اور گھبراہٹ کا رونما ہونا ایک فطری بات تھی "خشیت علی نفسی" کی مراد یہ نہیں تھی کہ جان کا خوف آپ ﷺ کو پریشان کیے ہوئے تھا، ایک عربی نژاد، قریشی الاصل اور شخصی شجاعت کے مالک سے اس قسم کی توقع کیسے ہو سکتی ہے؟ بلکہ مطلب یہ تھا کہ وہ اس بار عظیم کو برداشت بھی کر سکے گا یا نہیں، چنانچہ اس اعلیٰ تاثر کو اس مقدس انسان کی رفیقہ حیات خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے محسوس کرتے ہوئے اس کے اخلاق کریمانہ اور اوصاف حمیدہ کا ذکر کیا اور کہا کہ ایسی ہستی ناکام زندگی کے لیے نہیں ہوتی اور خدا کبھی آپ ﷺ کو رسوا نہیں کرے گا، اور

❶ یعنی مجھے یہ خوف ہے کہ شاید میں وحی کے بار کو برداشت نہ کر سکوں۔
❷ بخاری باب کیف بدء الوحی علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

Marfat.com

پھر اس مقدس پیغمبر کو ورقہ کے پاس لے گئیں تا کہ ایک ایسے شخص سے جو عرصہ سے خدا کی وحی اور خدا کی کتاب کا ذکر کرتا رہتا ہے اس اجمال کی تفصیل معلوم کریں۔

اس صاف اور سادہ بات کو دیکھیے اور پھر بعض مستشرقین یورپ کی اس مضحکہ خیز نکتہ چینی پر نظر ڈالیے جو تعصب اور کوتاہ نظری کی عینک لگا کر کی گئی ہے۔

اگر پیغمبر اسلام پر حراء میں وحی الٰہی کا نزول اور فرشتہ کا ظہور ہوا ہوتا تو پھر آپ ﷺ وحی الٰہی سے فیضیاب ہو کر اور منصب رسالت کی بشارت سن کر یہ کیوں فرماتے "انی خشیت علی نفسی" اور خدیجہ رضی اللہ عنہا کو تسکین دینے کی ضرورت پیش نہ آتی کیا آپ ﷺ کو خدا پر بھروسہ نہیں تھا۔

ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا، حقیقت حال کیا تھی اور اس کو رنگ و روغن دے کر کیا بنا دیا؟ یہاں نہ خدا پر عدم اعتماد کی کوئی جھلک ہے اور نہ فرشتہ کے ظہور اور وحی کے نزول پر ریب و شک کا معاملہ ہے بلکہ اس حقیقت کے اعتراف ہی کی وجہ سے جو صورت حال پیدا ہو گئی تھی اس کا ایک فطری تاثر ہے جو آپ ﷺ کی صداقت کا مزید ثبوت فراہم کرتا ہے، کیونکہ اگر اس کے برعکس کہیں آپ اس واقعہ کو اس طمطراق کے ساتھ پیش فرماتے کہ گویا ذات اقدس ﷺ کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ جانی بوجھی بات ہے تب البتہ اس کی گنجائش ہو سکتی تھی کہ اس شخص نے (دعوائے نبوت کے لیے) پہلے سے ایک منصوبہ قائم کر رکھا تھا، اور حراء کی خلوتیں بھی اسی مقصد کے لیے تھیں۔ چنانچہ اب موقع دیکھ کر اس نے یہ اعلان کر دیا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور مجھ پر وحی آتی ہے۔

بہر حال اس مسئلہ پر ہم نے مختصر طور پر جو کچھ لکھا ہے علماء اسلام نے مختلف اسالیب بیان کے ساتھ اسی حقیقت کا اظہار فرمایا ہے مثلاً: مشہور محدث و مفسر حافظ عماد الدین بن کثیر (رحمہ اللہ) فرماتے ہیں: [1]

ثم قال: ((لقد خشیت علی نفسی)) و ذلک لانہ شاھد امراً لم یعھدہ قبل ذلک ولا کان فی خلدہ۔

"آپ ﷺ نے فرمایا: ((لقد خشیت علی نفسی)) یہ اس لیے فرمایا کہ آپ ﷺ نے ایک ایسی حقیقت کا آج مشاہدہ کیا کہ اس سے قبل اس سے واقف نہیں تھے اور نہ کبھی آپ ﷺ کے دل میں یہ خیال گزرا تھا کہ ایسا کچھ پیش آئے گا۔"

اور حکیم الامہ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کی لطیف توجیہ کا حاصل یہ ہے:

"پھر آپ ﷺ پر غار حراء میں حق (وحی) کا نزول ہوا جب فرشتہ اور آپ ﷺ کے درمیان سلسلہ کلام ختم ہو گیا تو آپ ﷺ پر ایک خاص کیفیت طاری ہوئی جس کو ہم اپنی زبان میں "تشویش و اضطراب" سے تعبیر کرتے ہیں اور حقیقت میں یہ ایک نفسیاتی کیفیت تھی جس کا پیش آنا فطری تھا اس لیے کہ جب نزول وحی کی وجہ سے آپؐ کے بشری قویٰ پر ملکوتی صفات نے اثر کیا تو دو متضاد قوتوں کے درمیان تصادم اور پھر ملکوتی قوت کے غلبہ کی وجہ سے آپ ﷺ کے اندر تشویش پیدا ہو جانا یقینی تھا، یہی وجہ ہے کہ ابتداء نزول وحی کے بعد کچھ مدت تک وحی کا سلسلہ منقطع رہا کیونکہ انسان بشریت اور ملکیت دو جہات کے درمیان محصور ہے، پس جس ہستی کی بشریت پر ملکوتی صفات غالب آ کر اس کو ظلمتوں سے نور کی جانب لے جاتی ہیں تو جس قوت کے ساتھ یہ غلبہ اپنا اثر کرتا ہے انسان اپنے اندر اسی شدت کے ساتھ بشریت و ملکیت کے

---

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۳ ص ۷

Marfat.com

کے درمیان تصادم اور تزاحم محسوس کرتا ہے اور شدت تصادم کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی ملکوتی قوت و استعداد کو اس درجہ کامل و مکمل کر دے جو منصب نبوت و رسالت کے لیے ضروری ہے حتیٰ کہ اس کی قوت بشری (قوت بہیمی وحیوانی) قوت ملکوتی کے ہاتھ میں پوری طرح تابع واور منقاد ہو جاتی ہے، اور اب وہ ہستی جس کو فیضان نبوت سے سرفراز کیا گیا ہے مطمئن اور تصادم کی کشمکش سے بالاتر ہو کر اس منصب جلیل (نبوت و رسالت) کی خدمت کے قابل ہو جاتی ہے۔" [1]

بشریت اور نبوت کا باہمی تعلق:

"نبوت" اور "بشریت" کے درمیان اس درجہ نازک رشتہ ہے کہ قرآن حکیم کی "تعلیم" سے قبل پیروان مذاہب و ادیان نے اس راہ میں بھی اعتدال کو ترک کر کے افراط اور تفریط کو اسوہ بنا لیا تھا اور اس بارہ میں ان کو سخت ٹھوکر لگی تھی، چنانچہ بعض پیروان مذہب نے یہ دیکھ کر کہ نبی اور رسول باوجود اس امر کے کہ وہ انسان اور بشر کی شکل و صورت رکھتا ہے لیکن ساتھ ہی افراد انسانی سے جدا ایسی خصوصیات کا حامل نظر آتا ہے جو مجاہدات و ریاضات کے ذریعہ سے بھی دوسروں کو حاصل نہیں ہوتیں، اس لیے دراصل وہ بشر نہیں بلکہ خدا یا خدا کا بیٹا ہے جس نے انسانوں کی نجات کے لیے جامہ بشریت اختیار کر لیا ہے۔ [2] اس کے برعکس دوسری جماعت نے یہ کہا کہ نبوت و رسالت کوئی منصب نہیں ہے کہ خدا کی جانب سے "عطیہ مناصب" کی طرح دیا جاتا ہو بلکہ اخلاق کریمانہ اور صفات حمیدہ کا وہ اعلیٰ درجہ ہے جو ہر ایک انسان اپنی روحانی جدوجہد سے حاصل کر لے سکتا ہے اور کہتے ہیں کہ اگرچہ عطا و بخشش ہر شے کے لیے اسی کی جانب (خدا کی جانب) سے ہے لیکن کسی شے کا بطور "منصب" عطا ہونے کی حدود میں محدود رہنا اور روحانی جدوجہد سے ہر شخص کے حاصل کر لینے کے لیے اس کا دروازہ کھلا رہنا ان دونوں باتوں کے درمیان جو فرق ہے ہمارا خیال یہ ہے کہ "نبوت" بھی اور درجات روحانیت کی ہی طرح ہے اور عطاء منصب کی شکل میں خاص امتیاز نہیں رکھتی۔

قرآن حکیم نے اس افراط و تفریط کو ختم کرنے کے لیے "نبوت و رسالت کی حقیقت کو" بہت عمدہ طریقوں سے آشکارا کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے انسان کی راہنمائی کے لیے جو مختلف درجات ہدایت کا سلسلہ قائم کیا ہے اس کا اعلیٰ درجہ "ہدایت وحی" کا ہے اور یہ انسان کی روحانیت اور مقصد حیات کی کامرانی کا کفیل و ضامن ہے اور جبکہ ہدایت کا یہ سلسلہ "انسانی راہنمائی کے لیے" ہے تو عقل سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ درجہ "انسان" ہی کو بخشا جائے لیکن کیا ہر شخص کو جدا جدا بخش دیا جائے۔ نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ یہاں درجات عقل مختلف ہیں اور درجات استعداد میں بھی تنوع موجود ہے اس لیے از بس ضروری ہے کہ کسی خاص ہستی کو اس کے لیے چن لیا جائے تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس انتخاب کی نوعیت کیا ہونی چاہیے یہ کہ جو عمدہ صلاحیتوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مجاہدات اور ریاضیات کے ذریعہ نفس پر قابو پائے یا یہ کہ خدائے تعالیٰ جس کو یہ درجہ عطا فرمائے اس کی صلاحیتوں اور اس کی استعدادات کی تخلیق ہی اس طرح کر دے کہ صدق و امانت اس کا مایہ خمیر بنا ہوا ہو اور خارجی مجاہدہ اور ریاضت کا محتاج نہ ہو۔ یہ جدا امر ہے کہ خدائے برتر کے سامنے اظہار عبودیت اور تقرب الی اللہ کے لامتناہی فیض سے فیض یاب ہونے کے لیے

---

[1] حجۃ البالغہ ج ص ص ۱۵۳ [2] اوتار اور ابن اللہ کا عقیدہ دراصل ایک سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں۔

Marfat.com

اس سلسلہ کو بھی کلیۃً ترک نہ کرے۔ تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ عقل و بصیرت اس فیصلہ کو حق بجانب سمجھتے ہیں کہ یہاں دوسری شکل عمل میں آنی چاہیے اس لیے کہ جس طرح خدائے برتر کے مقررہ قانون قدرت نے "ہدایت وحی" سے پہلے کے مختلف درجات ہدایت کو انسان کے مجاہدہ و ریاضت پر موقوف نہیں رکھا اور اس بخشش و فیض کو حسب حال "عطیہ الٰہی" کی حیثیت میں رکھا ہے یعنی "وجدان" "حواس" اور "عقل" ان سب درجات ہدایات کا جب یہی حال ہے کہ وہ جدوجہد سے نہیں بلکہ "عطیۂ الٰہی" سے ملتے ہیں تو "ہدایت وحی" بھی جس کو بخشا جائے وہ بطور "منصب و عطیہ" کے ہی عطاء ہو، البتہ یہ از بس ضروری ہے کہ جس کو بھی بخشا جائے اس کی روحانی صلاحیتیں اور استعدادات ہر طرح اس منصب کی اہل ہوں اور ایسی ہستی کو عطاء نہ ہو کہ اس کی صلاحیت و استعداد عطاء کرنے والے کی بے سلیقگی پر چشمک زن ہو۔

غرض نبی اور "رسول" اس ہستی کو کہتے ہیں جو لوازم بشریت کے ساتھ اپنے تقدس و طہارت اور اخلاق حسنہ و اوصاف حمیدہ کے اس بلند مقام پر فائز ہو اور اس کے صفات صدق و امانت اس درجہ مسلم ہوں کہ اس کو "بشر معصوم" کہہ سکیں، وہ نہ خدا ہوتا ہے اور نہ ابن خدا بلکہ خدا کی جانب سے "ہدایت وحی کا حامل" مخلوق خدا کے لیے "خدا کا ایلچی" اور ان کی ہر قسم کی "رشد و ہدایت کا کفیل" ہو، چونکہ وہ بشر ہے اس لیے افراد نسل انسانی سے تعلق رکھتا ہے، اور چونکہ ہر قسم کی آلودگیوں اور گناہوں سے پاک اور "معصوم" ہے اس لیے اس کو اللہ سبحانہ، کے ساتھ ہم کلامی کا شرف حاصل ہے۔ پس نبوت و رسالت کا بشریت کے ساتھ یہی وہ تعلق ہے جو ہر قسم کی افراط و تفریط سے بری اور حقیقت حال کے لیے آئینہ دار ہے اور اسی حقیقت کو نبی اکرم ﷺ نے خود زبان وحی ترجمان سے ظاہر فرمایا ہے: ((انما انا قاسم واللہ یعطی)) خدا دینے والا ہے اور میں تقسیم کرنے والا ہوں۔ یعنی ایک جانب خدا سے "وحی ہدایت" حاصل کرتا ہوں اور دوسری جانب خدا کے بندوں تک اس کو پہنچا دیتا ہوں یہی میرا فریضہ رسالت و نبوت ہے اور اسی حقیقت کو قرآن حکیم نے مختلف اسالیب بیان کے ساتھ اس سلسلہ کے غلط کار لوگوں کی ہدایت کے لیے اس طرح بیان کیا ہے:

﴿ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴾ (بنی اسرائیل: ۹۳)

"کہہ دیجیے، پاکی ہے میرے پروردگار کے لیے، میں نہیں ہوں مگر انسان، اور خدا کا ایلچی (رسول)۔"

﴿ قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۛۚ وَ مَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۛۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴾ (الاعراف: ۱۸۸)

"وہی ہو کر رہتا ہے جو خدا چاہتا ہے اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو ضرور ایسا کرتا کہ بہت سی منفعت بٹور لیتا اور (زندگی میں) کوئی گزند مجھے نہ پہنچتا، میں اس کے سوا کیا ہوں کہ ماننے والوں کے لیے (گناہوں کی پاداش عمل سے) خبردار کرنے والا اور (نیک عمل پر) بشارت دینے والا ہوں۔"

﴿ قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۛؕ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِيْ نَبِيًّا ۙ وَّ جَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ﴾ (مریم: ۳۰-۳۱)

"(عیسیٰ علیہ السلام نے) کہا: میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھ کو (ہدایت انسانی کے لیے) کتاب دی اور مجھ کو "نبی" بنایا اور اس

نے مجھ کو بابرکت کیا، خواہ میں کسی جگہ ہوں۔"

﴿فَأْتِيَاهُ فَقُولَا إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۖ قَدْ جِئْنَاكَ بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكَ ۖ وَالسَّلَامُ عَلَىٰ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَىٰ ۞﴾ (طٰہٰ: ۴۷)

"(موسیٰ و ہارون) اس (فرعون) کے پاس جاؤ اور کہو ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ پس بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ رخصت کردے اور ان پر سختی نہ کر۔ ہم تیرے پروردگار کی نشانی لے کر تیرے سامنے آگئے ان پر سلامتی ہو جو سیدھی راہ اختیار کرے۔"

﴿رُّسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۞﴾ (النساء: ۱۶۵)

"یہ تمام رسول (خدا پرستی و نیک عملی کے نتائج کی) خوشخبری دینے والے اور (انکار حق کے نتائج سے) ڈرانے والے تھے (اور اس لیے بھیجے گئے تھے) کہ ان کے آنے (اور نیک و بد بتلانے) کے بعد لوگوں کے پاس کوئی حجت باقی نہ رہے جو وہ خدا کے حضور پیش کرسکیں اور (خدا اپنے کاموں میں) سب پر غالب ہے اور (تمام کاموں میں) حکمت والا ہے۔"

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۞ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ۞﴾ (الاحزاب: ۴۵-۴۶)

"اے نبی! بلاشبہ ہم نے تجھ کو بھیجا ہے (حق پر) گواہی دینے والا اور (نیکی کے انجام پر) بشارت دینے والا اور (بدی کے انجام سے) ڈرانے والا اور بلانے والا اللہ کی راہ کی طرف اس کے حکم سے اور بھیجا روشن چراغ بنا کرے۔"

﴿عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا ۞ إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا ۞ لِّيَعْلَمَ أَن قَدْ أَبْلَغُوا رِسَالَاتِ رَبِّهِمْ﴾ (الجن: ۲۶-۲۸)

"وہ (خدا) غیب کی تمام باتوں کا جاننے والا ہے پس وہ اپنے غیب (کے معاملات) پر کسی کو خبردار نہیں کرتا مگر جس کو پیغمبر بنا کر چن لے، پس بلاشبہ وہ (خدا) اس رسول کے آگے اور پیچھے نگہبان چلاتا ہے (یعنی اس کو اس بات سے محفوظ رکھتا ہے کہ خدا کی دی ہوئی خبر میں شیطان یا اس کا نفس کوئی ملاوٹ کرسکے اور اس کو شبہ پڑ جائے کہ یہ خدا کی وحی ہے یا کچھ اور) تاکہ خدا یہ ظاہر کردے کہ انہوں نے (رسولوں نے) بلاشبہ اپنے پروردگار کے پیغام (ٹھیک ٹھیک) پہنچا دیئے۔"

ان آیات کی تفسیر میں حضرت شاہ عبدالقادر صاحب (نوراللہ مرقدہ) یہ تحریر فرماتے ہیں:

"یعنی رسول کو خبر دیتا ہے غیب کی، پھر چوکیدار (فرشتے) رکھتا ہے اس کے ساتھ کہ اس میں شیطان دخل نہ کرنے پاوے اور اپنا (رسول کا) نفس غلط نہ سمجھے یہی معنی ہیں اس بات کے کہ پیغمبروں کو عصمت ہے اوروں کو نہیں اور ان کا معلوم "بے شک"

Marfat.com

ہے اوروں کے معلوم میں شبہ ہے۔"

"نبی" اور "رسول" سے متعلق مسطورہ بالا افراط وتفریط کے ساتھ ساتھ مشرکین عرب ایک نئی گمراہی میں مبتلاء تھے وہ کہتے تھے کہ اول تو "پیغمبر" کا وجود ہی ہمارے لیے اچنبھے کی بات ہے، اور اگر یہ اچنبھا ہونا ہی تھا تو اس کے لیے ہماری طرح کا ایک انسان ہی کیوں چنا گیا کیوں ایک "فرشتہ" نہ بھیجا گیا اور اگر انسان ہی بھیجنا تھا تو یا تو مکہ اور طائف کی کسی متمول سرمایہ دار ہستی کو پیغمبر بنایا جاتا ورنہ اس کو ہی غیب سے خزانے اور بے نظیر باغات عطاء کیے جاتے تب ہم سمجھتے کہ بیشک یہ خدا کا فرستادہ ہے:

﴿وَ قَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۙ اَوْ يُلْقٰۤى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ؕ﴾ (الفرقان: ۷-۸)

"اور وہ (مشرکین) کہتے ہیں یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس کے ساتھ آسمان سے فرشتہ اترتا اور وہ خدا کے پیغام سے خبردار کرتا یا ایسا کیوں نہ ہوا کہ (ہماری آنکھوں دیکھتے) اس پر آسمان سے خزانہ اتر آتا یا قدرتی باغ ہوتا کہ وہ (ہر وقت مرضی کے مطابق) اس سے (پھل) کھاتا۔"

﴿وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّاۤ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ يَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ وَ جَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ؕ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَ كَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ۠﴾ (الفرقان: ۲۰)

"اور ہم نے تجھ سے پہلے بھی ایسے ہی پیغمبر بھیجے تھے جو کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے (یعنی پیغمبری کے لیے بشریت منافی نہیں ہے بلکہ انسانوں کے لیے انسان ہی کو پیغمبر ہونا چاہیے) اور ہم نے (انسانوں میں سے انسان ہی کو پیغمبر بنا کر) ایک دوسرے کی آزمائش کا سامان کر دیا کہ آیا تم صبر و استقامت کا ثبوت دیتے ہو یا نہیں اور تیرا پروردگار بلاشبہ (انسانوں کے کردار کا) دیکھنے والا ہے۔"

﴿وَ قَالُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ؕ وَ لَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۝ وَ لَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّ لَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝﴾ (الانعام: ۸-۹)

"اور وہ کہتے ہیں اس پر (محمد ﷺ) پر کیوں فرشتہ نہیں اتارا گیا اور اگر ہم فرشتہ اتارتے تو البتہ (نتائج اعمال کا) فیصلہ کر دیا جاتا اور پھر وہ مہلت نہ دیے جاتے اور اگر ہم اس کو فرشتہ کر دیتے تو بھی (انسانوں کی ہدایت کے لیے) اس کو بصورت انسان ہی ظاہر کرتے اور (اس طرح) ہم پھر ان لوگوں کو اس شبہ میں مبتلاء کر دیتے جس میں اب مبتلا ہیں۔"

اس جگہ ان کی گمراہی کو دو دلائل سے واضح کیا ہے ایک یہ کہ ایمان واعتقاد کی زندگی سرتاسر "غیب" سے متعلق ہے پس اگر انسان کو اسی عالم میں عالم غیب کے معاملات کا مشاہدہ کرا دیا جائے اور پھر بھی وہ انکار پر جما رہے تو خدا کا قانون "امہال" (مہلت کا قانون) نافذ نہیں ہوگا بلکہ نتائج اعمال کا فوراً ہی ظہور ہو کر رہے گا اور ان کے لیے بھی مضر ہے اور خدا کی حکمت رحمت و ربوبیت کے بھی خلاف ہے دوسری دلیل یہ کہ انسانی دنیا میں اگر فرشتہ کے ذریعہ "ہدایت وحی" کو بھیجا جائے تو انسان کس طرح اس سے مانوس ہو سکتے

Marfat.com

ہیں، پھر اگر اسے بھی انسان ہی کی شکل میں بھیجیں تو شبہ کرنے والوں کا شبہ اسی طرح قائم رہے گا۔ اس لیے عقل ونقل دونوں فیصلہ یہی ہے کہ ہدایت کے لیے "انسان" ہی کو مبعوث ہونا چاہیے۔

﴿وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ قُلْ لَّوْ كَانَ فِى الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۝﴾

(بنی اسرائیل: ۹۴-۹۵)

"اور لوگوں کے پاس جب ہدایت آ پہنچی تو ان کو ایمان لانے سے کسی بات نے نہیں روکا مگر اس نے کہ وہ کہتے ہیں" کیا خدا کسی بشر کو پیغمبر بنا کر بھیجے گا" اے پیغمبر! کہہ دیجئے اگر زمین پر انسانوں کی جگہ فرشتوں کی آبادی ہوتی اور وہ اس پر چلتے پھرتے تو ہم ضرور ان کے لیے آسمان سے فرشتہ کو ہی رسول بنا کر بھیجتے۔"

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِىْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ۷-۸)

"اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پہلے بھی جن پر وحی نازل کی ہے وہ انسانوں کے سوا اور کچھ نہیں تھے پس (اے معترضین!) اگر تم نہیں جانتے ہو تو جاننے والوں سے دریافت کر لو اور نہ ہم نے ان کو بے جان (دھڑ) بنایا تھا کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ وہ (خدا کی طرح) ہمیشہ رہنے والے تھے۔"

بہرحال ان آیات میں قرآن عزیز نے علمی اور تاریخی دونوں قسم کے دلائل سے یہ صاف کر دیا کہ کائنات انسانی کی ہدایت کے لیے "انسان" کا نبی اور ہادی ہونا فطری بات ہے اور اس لیے اقوام ماضیہ میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔

پھر اس مسئلہ کی جانب بھی توجہ کی ہے کہ نبوت و رسالت کا تعلق سرداری، سرمایہ داری اور جتھ بندی سے کچھ نہیں ہے اور اس کے لیے جن فطری اعلیٰ ملکات و استعدادات کی ضرورت ہے ان کے پیش نظر اللہ تعالیٰ ہی خوب واقف ہے کہ کون اس "منصب" کا اہل ہے:

﴿وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۭ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ۭ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝﴾ (الزخرف: ۳۱-۳۲)

"اور وہ کہتے ہیں یہ قرآن کیوں ان دو بستیوں (مکہ اور طائف) کے کسی سردار پر نازل نہیں ہوا، (تو) کیا تیرے پروردگار کی رحمت کو یہ تقسیم کرنے والے ہیں، نہیں، بلکہ ہم نے ہی ان کے درمیان ان کی دنیوی معیشت کو تقسیم کیا ہے اور ہم نے ہی بعض انسانوں کو بعض پر بلندی درجات عطاء کی ہے تاکہ بعض بعض کے مسخر رہیں (یعنی بعض مقتدی ہوں اور بعض مقتدیٰ، بعض پیغمبر ہوں اور بعض اُمتی) اور تیرے پروردگار کی رحمت (نبوت) اس (دولت و ثروت) سے (کہیں زیادہ) بہتر ہے

Marfat.com

جو وہ خزانہ کیے ہوئے ہیں۔"

﴿ وَ اِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِىَ رُسُلُ اللّٰهِ ؔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ ﴾ (الانعام: ۱۲۴)

"اور جب ان کے پاس خدا کی جانب سے کوئی آیت آتی ہے تو یہ (مشرکین) کہتے ہیں "ہم اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہم کو بھی وہی چیز (وحی) نہ دی جائے جو خدا کے رسولوں کو دی گئی (لیکن ایسا نہیں ہوسکتا اس لیے کہ) اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ اپنے منصب رسالت کو کس کے سپرد کرے۔"

اور یہ بات تو بہت واضح اور صاف ہے کہ جس شخص کو کوئی منصب عطاء کیا جائے تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہر طرح اس کے لیے جوہر قابل اور اہل ہونا چاہیے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر ایک جوہر قابل کو وہ "منصب" ملے کیونکہ معطی کی مصلحت ہی خوب فیصلہ کرسکتی ہے کہ کس کو ملے اور کس کو نہ ملے چہ جائیکہ جو ہر قابل بھی نہ ہو۔ اس لیے ضروری ہوا کہ جو نبی اور رسول ہو وہ ہر حیثیت سے "انسان کامل" اور گناہوں سے "معصوم" ہو لیکن یہ ضروری نہیں کہ جو شخص بھی اخلاق حمیدہ اور روحانی مجاہدات کے ذریعہ "تقدیس" کا درجہ حاصل کرسکا ہو وہ منصب نبوت پر بھی ضرور فائز ہو۔

بہرحال نبوت "منصب" ہے۔ "ڈگری" نہیں ہے، اور اس لیے جن کو دیا بھی جاتا ہے ان کو متنبہ کردیا جاتا ہے کہ یہ تم پر فضل خداوندی ہے ورنہ اگر وہ تم سے اس کو سلب کرلینا چاہے تو تمہاری طاقت بلکہ کائنات کی طاقت سے باہر ہے کہ پھر یہ تم کو مل سکے۔

﴿ وَ لَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِىْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ۙ﴿۸۶﴾ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ﴿۸۷﴾ ﴾ (بنی اسرائیل: ۸۶-۸۷)

"اور (اے پیغمبر!) اگر ہم چاہیں تو جو تجھ پر ہم نے وحی کی ہے اس کو چھین لیں اور پھر تجھ کو کوئی بھی ایسا کارساز نہ ملے جو ہم پر زور ڈال سکے، لیکن (یہ جو سلسلہ وحی جاری ہے تو) اس کے سواء کچھ نہیں ہے کہ تیرے پروردگار کی رحمت سے ہے اور یقین کر کہ تجھ پر تیرے پروردگار کا بڑا ہی فضل ہے۔"

نبی اور مصلح:

مسطورۂ بالا تفصیلات سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ چونکہ "نبی" اور "رسول" کو براہ راست خدائے برتر سے شرف مکالمت حاصل ہوتا ہے یا خدا کا معصوم فرشتہ خدا کی وحی لاکر سناتا ہے اس لیے اس کا ذریعہ علم "علم یقین" کا درجہ رکھتا ہے جس میں شک وشبہ کی مطلق گنجائش نہیں رہتی اور اس کے علاوہ تمام ذرائع علم یقین کے اس درجہ سے نیچے ہیں بلکہ ان کی افادیت "ظن" سے آگے نہیں بڑھتی اس لیے اگر ایک مرد صالح اپنی قوم یا نوع انسانی کی اصلاح حال کے لیے کوئی قدم اٹھائے تو مقدس سے مقدس تر ہونے کے باوجود اس کے اپنے طریقہ اصلاح میں غلطی کا وقوع اور امکان دونوں موجود رہتے ہیں بلکہ بعض اوقات وہ ایسی فاش غلطی کرگزرتا ہے کہ اس سے فائدہ پہنچنے کی بجائے قوم کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے اس لیے ایک "نیکوکار مصلح" یہ کبھی دعویٰ نہیں کرتا کہ وہ اصلاح حال کے لیے جو

Marfat.com

کچھ اپنی جانب سے کہتا ہے غلطی سے پاک ہے مگر ایک "نبی" اور "رسول" کے لیے از بس ضروری ہے کہ وہ یہ بھی اعلان کرے کہ میں خدا کی جانب سے اصلاح حال کے لیے خدا کا پیغام رساں ہوں اور یہ بھی دعویٰ کرے کہ وہ جو "تعلیم اصلاح" پیش کر رہا ہے، خدا کا فرمودہ ہے اور اس لیے ہر قسم کی غلطی اور لغزش سے پاک اور محفوظ ہے وہ یہ نہیں کہے گا کہ یہ میرے دل کی آواز ہے یا اندر سے جو آواز آتی ہے اس کا نتیجہ اور ثمرہ ہے بلکہ صاف صاف یہ کہے گا کہ اس میں میرا اپنا کچھ نہیں میں تو صرف ایلچی اور پیغامبر ہوں یہ جو کچھ بھی ہے خدا کا فرمان اور اس کی "وحی" ہے۔

چنانچہ قرآن عزیز نے جگہ جگہ ان دونوں باتوں کو واضح کیا ہے وہ کہتا ہے کہ ہر ایک پیغمبر کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اعلان کر دیں کہ خدا نے ان کو اپنی "ہدایت وحی" کے لیے چن لیا ہے اور وہ خدا کے پیغمبر ہیں اور یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ جو کچھ ان پر وحی کیا جاتا ہے اس کو حرف بہ حرف امت تک پہنچائیں۔ حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّ لٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَ اَنْصَحُ لَكُمْ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۶۱۔۶۲)

"(نوح علیہ السلام) نے کہا اے میری قوم! مجھ کو گمراہی سے کوئی واسطہ نہیں ہے بلکہ میں تو تمام کائنات کے پروردگار کی جانب سے بھیجا ہوا ہوں تم تک اپنے پروردگار کی جانب سے پیغام پہنچاتا ہوں اور تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں اور میں اللہ کی باتوں میں سے وہ باتیں جانتا ہوں جن سے تم بے خبر ہو۔"

اور حضرت ہود علیہ السلام اور قوم کے درمیان مکالمہ میں حضرت ہود علیہ السلام نے یہ اعلان فرمایا:

﴿قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّ لٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَ اَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ۝﴾ (الاعراف: ۶۷۔۶۸)

"(ہود علیہ السلام نے) کہا: اے میری قوم! میں بے وقوف نہیں ہوں لیکن میں جہانوں کے پروردگار کی جانب سے بھیجا ہوا ہوں میں اپنے پروردگار کا پیغام تم تک پہنچاتا ہوں اور میں تمہارا خیر خواہ ہوں اور (پیغام الٰہی اور خیر خواہی میں) صاحب امانت ہوں۔"

اور حضرت صالح علیہ السلام نے یہ فرمایا:

﴿قَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَ نَصَحْتُ لَكُمْ وَ لٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ۝﴾

(الاعراف: ۷۹)

"(صالح علیہ السلام نے) کہا: اے قوم! بلاشبہ میں نے تم کو اپنے پروردگار کا پیغام پہنچا دیا اور تمہاری خیر خواہی کی مگر تم خیر خواہی کرنے والوں کو ناپسند کرتے ہو۔"

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر سے یہ ارشاد فرمایا:

Marfat.com

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ؕ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَ لَا يُبْصِرُ وَ لَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ۝ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝﴾ (مریم: ۴۱-۴۳)

"اور یاد کرو کتاب (قرآن) میں ابراہیم کا حال، بلاشبہ تھا وہ بہت ہی صادق اور نبی جب اس نے اپنے باپ سے کہا: "اے باپ! ایسی چیز کی پوجا کیوں کرتا ہے جو نہ سنتی ہے نہ دیکھتی ہے اور نہ تجھ کو کسی (نقصان) سے بے پرواہ کرتی ہے (یعنی بت پرستی کیوں کرتا ہے؟) اے باپ! بلاشبہ مجھ کو علم (وحی) سے وہ حصہ ملا ہے جو تجھ کو حاصل نہیں ہے پس میری پیروی کر میں تجھ کو سیدھی راہ دکھلاؤں گا۔"

اور لوط علیہ السلام نے اپنی قوم سے مکالمہ کرتے ہوئے یہ فرمایا:

﴿اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ۝﴾ (الشعراء: ۱۶۱-۱۶۴)

"جب کہا ان سے ان کے بھائی (لوط) نے کیا تم پرہیزگاری اختیار نہیں کرتے بلاشبہ میں تمہارے لیے خدا کا بھیجا ہوا ہوں (اور اس پیغامبری میں) صاحب امانت ہوں پس اللہ سے ڈرو اور میری پیروی کرو۔"

اور حضرت یعقوب و یوسف علیہما السلام کے ایک طویل حیرت زا واقعہ کے ضمن میں یعقوب علیہ السلام کا وہ مقولہ بھی منقول ہے جس میں انہوں نے اپنے بیٹے یوسف علیہ السلام کو وحی الٰہی کے ذریعہ یہ بشارت دی ہے کہ جس طرح خدا نے تیرے باپ دادا، ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کو پیغمبری عطا فرمائی اسی طرح تجھ کو بھی اس منصب جلیل سے سرفراز کرے گا۔

﴿وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَ عَلٰۤى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَاۤ اَتَمَّهَا عَلٰۤى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝﴾ (یوسف: ۶)

"اور اسی طرح تیرا پروردگار تجھ کو چن لے گا اور تجھ کو تعبیر رؤیا کا علم بخشے گا اور تجھ پر اپنی نعمت (نبوت) کی تکمیل کرے گا اور اولاد یعقوب پر (جو اس کے اہل ہوں گے) جیسا اس نے اس سے پہلے تیرے باپ دادا ابراہیم، اسحاق پر اس (نبوت) کو پورا کیا بیشک تیرا پروردگار جاننے والا ہے حکمت والا ہے۔"

اور پھر یوسف علیہ السلام کی تبلیغ و دعوت کا اس طرح قرآن میں مذکور ہے:

﴿يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (یوسف: ۳۹-۴۰)

"اے میرے قید کے رفیقو! کیا بہت سے آقا اور خداوند بہتر ہیں یا یکتا خدا کی ذات جو ہر شے پر غالب ہے تم اس کے سوا جس کو پوجتے ہو ان کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے گھڑ لیے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے کوئی دلیل نہیں اتاری اور حکم تو خدا کے سوا کسی کا نافذ نہیں، اس نے یہی حکم دیا ہے کہ اس کے سواء کسی کی عبادت نہ کرو، دین کی سیدھی راہ یہی ہے۔ لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔"

اور حضرت شعیب علیہ السلام نے اصحاب ایکہ کے سامنے یہ اعلان کیا:

﴿كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ۝﴾ (الشعراء: ۱۷۶-۱۷۹)

"اصحاب ایکہ نے پیغمبروں کو جھٹلایا، جب ان سے شعیب (علیہ السلام) نے کہا: کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے، بلاشبہ میں تمہارے لیے (خدا کی جانب سے) صاحب امانت پیغامبر ہوں پس اللہ سے ڈرو اور میری پیروی کرو۔"

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے دربار میں بے دھڑک یہ اعلان فرمایا:

﴿وَ قَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝﴾ (الاعراف: ۱۰۴-۱۰۵)

"اور موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا: اے فرعون! بلاشبہ میں جہانوں کے پروردگار کا پیغمبر ہوں میرے لیے یہی لائق ہے کہ میں خدا کے بارے میں حق کے سواء کچھ نہ کہوں، میں تمہارے پروردگار کی طرف سے "دلیل" لے کر آیا ہوں، پس تو میرے ساتھ بنی اسرائیل کو (آزاد کر کے) بھیج دے (جن کو صدیوں سے غلام بنا رکھا تھا)۔"

اور حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے واقعہ میں سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کو دعوت اسلام کے لیے جو نامہ مبارک تحریر فرمایا تھا اس کا اسلوب بیان یہ ہے:

﴿اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَ اِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَ اْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ۝﴾ (النمل: ۳۰-۳۱)

"یہ سلیمان (علیہ السلام) کی جانب سے ہے اور یہ شروع ہے اللہ کے نام سے جو رحمٰن ہے رحیم ہے بات یہ ہے کہ مجھ پر اپنی بلندی و برتری کا اظہار نہ کر (کیونکہ میں بادشاہ نہیں بلکہ پیغمبر ہوں) اور میرے پاس خدا کی فرمانبردار بندی بن کر حاضر ہو۔"

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل ایک علاقہ میں خدا کے چند نبی دعوت و تبلیغ اسلام کے لیے مامور کیے گئے تھے انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا:

﴿قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ۝ وَ مَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝﴾ (یٰس: ۱۶-۱۷)

"انہوں نے کہا ہمارا پروردگار (خوب) جانتا ہے کہ بلاشبہ ہم تمہاری جانب اس کے بھیجے ہوئے ہیں اور ہمارے اوپر اس

Marfat.com

سے زیادہ کوئی ذمہ داری نہیں کہ امر حق کا صاف اور کھلا پیغام پہنچا دیں۔"

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بار بار بنی اسرائیل کے سامنے یہ اعلان فرمایا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور میری بتلائی ہوئی راہ کے سوا کوئی راہ مستقیم نہیں کیونکہ میں جو کچھ بھی پیش کر رہا ہوں خدا کا فرمودہ ہے:

﴿قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۙ﴾ (مریم:۳۰)

"(عیسیٰ علیہ السلام نے) کہا بلاشبہ میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھ کو "کتاب" عطا کی ہے اور اس نے مجھ کو "نبی" بنایا ہے۔"

﴿وَ اِذْ قَالَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ﴾ (الصف:٦)

"جب کہا عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) نے اے بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمہاری جانب خدا کی جانب سے بھیجا ہوا ہوں (رسول ہوں)۔"

اور خاتم الانبیاء محمد ﷺ کی دعوت و تبلیغ میں تو جگہ جگہ یہ حقیقت بہت نمایاں نظر آتی ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ۙ وَّ دَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا﴾ (الاحزاب:۴۵-۴۶)

"اے نبی! بلاشبہ ہم نے تجھ کو (حق کے لیے) گواہ اور (نیک عملی کے لیے) بشارت دینے والا اور (بدعملی کے نتائج سے) ڈرانے والا اور خدا کے حکم سے اس کی جانب بلانے والا اور (ہدایت و صراط مستقیم کے لیے) روشن چراغ بنایا ہے۔"

﴿قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعَا ا۟لَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ كَلِمٰتِهٖ وَ اتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ (الاعراف:۱۵۸)

"(اے محمد ﷺ) کہہ دیجئے "اے لوگو! بیشک میں تم سب کی جانب اللہ کا بھیجا ہوا ہوں، اسی کے لیے ہے بادشاہت آسمانوں کی اور زمین کی کوئی خدا نہیں ہے مگر صرف وہی یکتا ذات، (وہی) زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول "نبی اُمّی" پر جو خود اللہ پر اور اس کی باتوں پر ایمان لاتا ہے اور اس کی پیروی کرو تا کہ تم راہ پاؤ۔"

﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۫﴾ (آل عمران:۱۹)

"بلاشبہ اللہ کے نزدیک (ہمیشہ سے) دین (حق) اسلام ہی ہے۔"

﴿وَ مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ﴾ (آل عمران:۸۵)

"جو شخص اسلام کے ماسواء کو دین بنانا چاہے تو خدا کے یہاں وہ مقبول نہیں ہے۔"

Marfat.com

غرض پیغمبر اور نبی کے لیے از بس ضروری ہے کہ وہ اپنی دعوت اصلاح اور تعلیم حق پر خود بھی ایمان لائے اور کائنات کے سامنے بھی یہ اعلان کرے کہ یہ "پیغام ہدایت" اور یہ "تعلیم حق" میری جانب سے نہیں بلکہ خدا کی جانب سے ہے اور اسی نے مجھ کو اپنا ایلچی بنا کر اس کی دعوت کے لیے بھیجا ہے یہ جو کچھ ہے سب خدا کا اپنا ہے میں تو صرف اس کی جانب پکارنے والا ہوں اور اس میں شک وشبہ کا کوئی سوال ہی نہیں ہے اور یہ ہر قسم کی لغزش وخطاء سے پاک "علم یقین" اور "وحی الٰہی" ہے جس کے متعلق خدا کا یہ فیصلہ ہے:

﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۖ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ۝﴾ (حٰمٓ السجدہ: ۴۲)

اور

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝﴾ (النجم: ۳۔۴)

لیکن "مصلح غیر نبی" کو یہ مجاز حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی دعوت اصلاح کے بارہ میں یہ دعویٰ کرے، کیونکہ اس کی یہ دعوت اصلاح یا کسی پیغمبر اور نبی کی "ہدایت وحی" کی پیروی میں ہوگی، تب تو اس کی حیثیت ایک یاددہانی کرنے والے کی ہے اور یا ہدایت وحی کے اتباع کے ساتھ اس کے اپنے اجتہاد اور ضمیر کی آواز کا بھی دخل ہوگا تو اس کے اس حصہ اصلاح کا لغزش، خطاء بلکہ بعض اوقات غلط روی سے بھی محفوظ رہنا لازمی اور ضروری نہیں ہے۔

کیفیت وحی:

وحی سے متعلق جو حقائق سپرد قلم ہو چکے ہیں ان میں ایک یہ اضافہ بھی قابل توجہ ہے: عربی میں وحی کے معنی "مخفی اشارہ" کے ہیں، گویا یہ فطرت الٰہی کی وہ سرگوشی ہے جو ہر ایک مخلوق پر اس کی راہ عمل کھولتی ہے، چنانچہ قرآن نے شہد کی مکھی کے نظام بیت کے متعلق فطری ہدایت کو لفظ "وحی" سے ہی تعبیر کیا ہے:

﴿وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ ۝﴾

(النحل: ٦٨)

"اور تیرے پروردگار نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ان ٹٹیوں میں جو اسی غرض سے بلند کی جاتی ہیں اپنے لیے چھتے بنائے۔"

اور مذہب ودین کی اصطلاح میں اس الہام کو کہتے ہیں جو خدائے برتر کی جانب سے نبی اور پیغمبر پر اس طرح القاء یا فرشتہ کے ذریعہ نازل کیا جاتا ہے کہ اس مقدس ہستی کو اس کے منجانب اللہ ہونے کا روز روشن سے بھی زیادہ یقین حاصل ہو جاتا ہے اور کسی قسم کے بھی شک وشبہ اور تردد کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور اسی لیے وہ تحدی کے ساتھ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ "خدا کی وحی" اور اس کا بخشا ہوا "علم یقین" ہے نزول وحی کی یہ صورت کس طرح پیش آتی ہے اور کون سے وہ طریقے ہیں جن کے ذریعہ نبی معصوم کو خدا کی وحی کا علم ہوتا ہے؟ قرآن عزیز اس کے متعلق یہ کہتا ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ

Marfat.com

بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝ (الشورٰی : ۵۱)

"اور کسی انسان کے لیے یہ صورت ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے (اس دنیا میں بالمواجہہ) گفتگو کرے مگر یا وحی (کے القاء) کے ذریعہ یا پس پردہ یا بھیج دے فرشتہ کو پس وہ اس کی (خدا کی) اجازت سے اس پر وحی لا اُتارے جو اس کی (خدا کی) مرضی ہو بلاشبہ وہ (خدا) بلند و بالا حکمت والا ہے۔"

غرض "وحی" ایک خاص ذریعہ علم کا نام ہے جو خدا کی جانب سے اس کے نبیوں اور رسولوں کے لیے مخصوص ہے اور اس کا تعلق براہ راست عالم قدس اور عالم غیب سے ہے اسی بنا پر اگرچہ انبیاء و رسل کو اس کی معرفت اور اس کے منجانب اللہ ہونے کا یقین کامل آفتاب عالمتاب سے زیادہ بدیہی ہوتا ہے لیکن وہ اس کو حقیقی کیفیت کو دوسروں پر تشبیہ و تمثیل ہی کے ذریعہ واضح کر سکتے ہیں۔ چنانچہ جب بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت اقدس ﷺ سے نزول وحی کی کیفیت کے متعلق سوالات کیے تو آپ ﷺ نے یہ جوابات ارشاد فرمائے:

((احیانا یاتینی کصلصلة الجرس)) "کبھی یوں معلوم ہوتا ہے گویا گھنٹہ کی مسلسل گونج ہے۔"

((دوی کدوی النحل)) "(کبھی) جس طرح شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے گونج پیدا ہوتی ہے اس طرح کی گونج محسوس کرتا ہوں۔"

((واحیانا یتمثل لی الملك رجلا فاعی مایقول)) "اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فرشتہ انسان کی شکل میں ظاہر ہو کر مجھ کو خدا کی وحی سناتا ہے اور میں اس کو محفوظ کر لیتا ہوں۔"

ان جوابات میں کیفیت وحی کو اگرچہ قریب الفہم بنانے کی کافی کوشش کی گئی ہے پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حقیقی کیفیت کو خدا اور خدا کے پیغمبر کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں پا سکتا اور پیغمبر اس حقیقت کا اذعان اور اس کے منجانب اللہ ہونے پر غیر متبدل یقین تو رکھتا ہے لیکن غیر نبی پر حقیقی کیفیت کو واضح کرنے سے معذور ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اس لیے کہ یہ صورت حال تو دنیا کی بن دیکھی اشیاء کے بارہ میں صبح سے شام تک ہم مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً جس شخص نے سیب کو نہیں دیکھا اور نہیں چکھا اس کے سامنے دیکھنے اور چکھ لینے والا اگرچہ سیب کی حقیقت کا بہتر سے بہتر نقشہ بھی پیش کر دے اور اس کے رنگ، مزہ، خوشبو، لطافت وغیرہ کی تعبیر بحد کمال بھی پہنچا دے تب بھی وہ شخص سیب کو آنکھ ۔۔ دیکھنے اور زبان سے چکھ لینے والے کے مقابلہ میں کسی طرح اس کی حقیقی کیفیت سے آگاہ نہیں ہو سکتا وہ بلاشبہ سیب کے متعلق صحیح علم تو حاصل کر سکتا ہے لیکن حقیقی ذوق کو ہرگز نہیں پا سکتا اسی طرح نبی کی تعلیم و تلقین سے ہم "وحی" کے متعلق ایک اجمالی علم ضرور حاصل کر لیتے ہیں لیکن اس کی حقیقی کیفیت کو نہیں پا سکتے۔

نبی اکرم ﷺ نے قرآن میں مسطور ہر سہ اقسام وحی میں سے پہلی قسم ((الا وحیا)) کے متعلق یہ بھی ارشاد فرمایا ہے: ((وھو اشدہ علی فیفصم عنی وقد وعیت ما قال)) اور وحی کی یہ صورت مجھ پر بہت سخت گزرتی ہے پھر جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے تو وحی الٰہی نے جو کچھ کہا ہوتا ہے وہ سب مجھے محفوظ ہوتا ہے" یعنی جب فرشتہ بشکل انسان تمثل اختیار کر کے وحی الٰہی لاتا ہے یا ((من وراء حجاب)) براہ راست خدائے برتر سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوتا ہے تو یہ دونوں صورتیں آپ ﷺ پر آسان ہوتی ہیں مگر "القاء وحی" کی پہلی شکل سخت گزرتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کے متعلق علماء حق یہ ارشاد فرماتے ہیں:

خالق کائنات نے انسان کو لوازم بشریت کی قیود و شروط کے ساتھ اس درجہ پابند بنا دیا ہے کہ انبیاء و رسل جیسی مقدس اور

Marfat.com

معصوم ہستیوں کو بھی اپنی تطہیر و تقدیس کے باوجود ان اثرات سے متاثر ہوئے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے اس لیے جب ان پر ندا کی وحی کا نزول ہوتا اور ایسی حالت میں ان پر عالم قدس کے تمام اثرات چھا جاتے اور انوار و تجلیات کی آغوش میں وہ حضرت حق سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرتے ہیں تو اس حالت میں ان پر دو قسم کی کیفیتوں میں سے ایک کیفیت ضرور طاری ہوتی ہے ایک یہ کہ اس کے بشری خواص کو مغلوب کر کے اس کی روحانی کیفیات کو عالم قدس کی جانب اس درجہ بلند اور رفیع کیا جائے کہ وہ حضرت حق کی وحی کے اثرات قبول کرنے اور محفوظ رکھنے کے قابل ہو سکے اور چونکہ جذب و انجذاب کی اس خاص حالت اور عالم آب و گل سے عالم قدس کی جانب اس مخصوص رفعت میں بشری خصوصیات اور روحانی مؤثرات کے درمیان سخت قسم کا تصادم پیدا ہو جاتا ہے اس لیے اس تصادم اور تزاحم سے نبی پر ابتداءً ایک اضطرابی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ جب یہ تصادم ختم ہو کر یہ عالم قدس کے تمام پاک اور لطیف اثرات اس ہستی پر چھا جاتے ہیں اور وہ ان میں محو اور مستغرق ہو کر لذت وحی کو پا جاتی ہے تو پھر یہ اذیت و تکلیف یک لخت جاتی رہتی ہے اور اس کی مسرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی اور یہ سب کچھ چند دقیقوں میں ہو گزرتا ہے۔

یہی وہ صورت وحی ہے جس کی کیفیات کو ذات اقدس ﷺ نے ((صلصلة الجرس)) اور ((دوی النحل)) کی تمثیلات میں سمجھانے کی کوشش فرمائی ہے تمثیلات میں اس پہلو کے اختیار کرنے کی وجہ بھی مسطورۂ بالا حقیقت ہے اس لیے کہ اس صورت خاص میں جب بشری حواس و ادراکات پر عالم قدس کے روحانی اثرات کا غلبہ ہوتا ہے تو اول حواس و ادراکات میں اضطراب و بے چینی پیدا ہو جاتی ہے اور حاسہ سمع کہ جس کا تعلق سماعت وحی سے ہے وہ شروع میں ایک خاص قسم کی گونج محسوس کرتا ہے جو اس عالم پست سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتی اور اس کے بعد وہ "وحی الٰہی" کی اصل کیفیت سے لذت اندوز ہوتا اور اس کو "علم یقین" اور "اذعان حق" کے ساتھ پا لیتا ہے کیونکہ عالم قدس کے قوی مؤثرات اس پر غالب آ کر "وحی الٰہی" کے حصول کا ہر طرح اہل بنا دیتے ہیں مگر دوسروں پر اس حقیقت کے تمام و کمال سمجھانے میں ان علامات و اثرات کے اظہار سے آگے نہیں جاتا جن کو ابھی ((صلصلة الجرس)) اور ((دوی النحل)) کی تعبیرات میں سن چکے ہو۔ وحی الٰہی کی اس نوع کے علاوہ دوسری ہر دو انواع "یعنی وراء حجاب کلام الٰہی کی سماعت یا فرشتہ کے ذریعہ وحی کے نزول" میں صورت حال برعکس ہوتی ہے اور اس وقت نبی کے بشری خواص کو عالم قدس کی جانب رفعت دینے اور عالم خاک و گل سے عالم نور کی جانب جذب و انجذاب سے متاثر کرنے کی تکلیف نہیں دی جاتی بلکہ عالم قدس کی تمام کیفیات خود، ہبوط و نزول کرتی اور نبی کی روحانیت کو متاثر بناتی ہیں اور یا فرشتہ بحکم حضرت حق اپنے ملکوتی جسد کو جامہ انسانیت کے ساتھ متمثل کر لیتا اور عالم قدس کے اثرات اور بشری خواص میں امتزاج پیدا کر کے نبی کے حضور حاضر ہوتا اور وحی الٰہی کی تلاوت کرتا ہے اور اس لیے ان دونوں صورتوں میں نبی اور رسول کو پہلی قسم کے تصادم سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔

کیفیت وحی اور بعض مستشرقین کی گمراہی:

چونکہ یورپ کے دور علمی کی بنیاد خالص مادیات پر قائم ہے اور روحانی علوم اور ماوراء مادیات کے ناقابل انکار حقائق کے لیے وہ کوئی جگہ دینے کو آمادہ نہیں ہے، اس لیے بعض مستشرقین نے جب وحی الٰہی کی پہلی قسم کے متعلق نبی اکرم ﷺ کے وہ اقوال سنے جن کا ذکر ابھی ہو چکا ہے اور وہ حالات پڑھے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ نزول وحی کی اس خاص صورت میں آپ ﷺ کرب اور

Marfat.com

اضطراب محسوس فرماتے اور سردی کے ایام میں آپ ﷺ کی پیشانی پر پسینہ آجاتا اور آپ ﷺ پر بے خودی کے سے آثار نظر آنے لگتے تو انہوں نے یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی کہ یہ نزول وحی کی کیفیت نہیں ہوتی تھی بلکہ (العیاذ باللہ) آپ ﷺ کو ہسٹریا کا دورہ ہو جاتا تھا۔

مستشرقین پرزور الفاظ میں آپ ﷺ کی صداقت و امانت کو تسلیم کرتے ہیں، آپ کی تعلیمات حق کو سراہتے اور کائنات انسانی کے لیے آپ کی تعلیمات کو "تعلیم کامل" مانتے ہیں، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ کے دعویٰ "الہام و وحی الٰہی" کا انکار کرتے اور کیفیت وحی کو مرض سے تعبیر کرتے ہیں۔ ﴿ سُبۡحٰنَکَ ہٰذَا بُہۡتَانٌ عَظِیۡمٌ ۝ ﴾

درحقیقت یہ حضرات یا تو از راہ تعصب ناقابل انکار تعلیم حق کے تسلیم کے ساتھ ساتھ ایک ایسی بات کہنا چاہتے ہیں جس سے تعلیم حق (اسلام) پر کاری ضرب لگ سکے اور تعصب کے الزام سے بھی بچ جائیں اور یا پھر اس علمی حقیقت سے بے بہرہ ہیں جس کو تفصیل کے ساتھ ہم ابھی ظاہر کر چکے ہیں کہ نزول وحی کی یہ کیفیت "مرض" نہیں تھا بلکہ اپنے اثرات اور محرکات کی بناء پر ایک فطری صورت حال تھی جس کا پیش آنا از بس ضروری تھا اور دراصل یہ کیفیت دماغ، حواس اور اعضائے انسانی کو مفلوج نہیں بناتی تھی جیسا کہ ہسٹریا وغیرہ میں ہوتا ہے بلکہ اس کے برعکس تمام مادی قویٰ میں روحانی کوائف کی ایسی برقی رو دوڑا دیتی ہے جس سے چند لمحات کے بعد ان کے اندر ایسی زبردست اور مافوق المادہ قوت پیدا ہو جاتی تھی جس کے ذریعہ اس ہستی (نبی) میں عالم قدس سے پوری طرح وابستہ ہو کر خدا کی وحی اور اس کے کلام کو سننے اور قلب و دماغ میں بخوبی محفوظ رکھنے کی صلاحیت رونما ہو جائے۔ چنانچہ اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے اس کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی ارشاد فرمایا:

((فیفصم عنی وقد وعیت ما قال)).

"شدت و کرب کی یہ کیفیت جلد ہی مجھ سے زائل ہو جاتی ہے اور میں وحی الٰہی کو تمام و کمال محفوظ کر لیتا ہوں۔"

کیا ہسٹریا کے دوروں کا کوئی مریض ایسا پیش کیا جا سکتا ہے جس پر ایک جانب مرض کا مسلسل حملہ ہو رہا ہو اور دوسری جانب وہ علمی و عملی صلاحیتوں معاشی و معادی حکمتوں، اور دینی و دنیوی رفعتوں کے لیے ایسا کامل و مکمل دستور و آئین اور اعمال و افکار پیش کر رہا ہو، کائنات جس کا جواب نہ رکھتی ہو اور دوست و دشمن دونوں اس کی رفعت و بلندی کا اعتراف کرتے ہوں؟ کیا دماغی فتور جو کہ ہسٹریا کا ثمرہ اور نتیجہ ہے اور دماغی رفعت و بلندی جس کے ثمرات حیرت زا اور عملی دنیا میں وقیع سے وقیع تر ہوں دونوں یکجا جمع ہو سکتے ہیں؟ اور اگر نہیں ہو سکتے اور بلاشبہ نہیں ہو سکتے تو حقیقت حال کو نظر انداز کرتے ہوئے "وحی الٰہی سے متعلق" مستشرقین کا یہ دعویٰ کس درجہ حقیر اور بے وقعت ہو جاتا ہے صاحب عقل و بصیرت اس کا خود اندازہ لگا سکتے ہیں؟

نزول وحی کا پہلا دور:

نبی اکرم ﷺ پر سب سے پہلے سورۂ علق کی یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿ اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ۝ اِقۡرَاۡ وَ رَبُّکَ الۡاَکۡرَمُ ۝ الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ ۝ ﴾ (العلق: ۱۔۵)

Marfat.com

"پڑھو! اپنے پروردگار کے نام سے، جس نے پیدا کیا، پیدا کیا انسان کو خون بستہ سے، پڑھو! اور تیرا پروردگار جو سب سے زیادہ برگزیدہ ہے وہ ہستی ہے جس نے سکھایا لکھنا، سکھایا انسان کو وہ سب کچھ جو وہ نہیں جانتا تھا۔"

ان آیات میں یہ بتلایا گیا ہے کہ حضرت انسان جو خدا کی سب سے بہتر اور سلسلہ کائنات کی سب سے ترقی یافتہ مخلوق ہے اور اسی وجہ سے وہ کائنات ہست و بود میں "خلیفۃ اللہ" کے منصب پر سرفراز کیا گیا ہے اس کی خلقی کمزوریوں کا یہ حال ہے کہ اس کی نمود کی ابتداء آب نجس اور خون بستہ سے ہوئی ہے لیکن قدرت حق نے جب اس کو مقام رفیع بخشنے کا ارادہ کیا اور "اسفل سافلین" کے لائق مخلوق کو "درجات علیا" پر فائز کرنا چاہا تو اس کو وہ صفت اعلیٰ عطا فرمائی جو صفات الٰہی میں مبداء الصفات ہے یعنی اس کو "صفت علم کا مظہر" بنایا اس کو "قلم کے ذریعہ" لکھنا سکھایا اور علوم و عرفان کا مہبط و محور ٹھہرایا پھر اس جانب بھی اشارہ کیا کہ یہ سلسلۂ اسباب و مسببات حصول علم کے تین ہی طریقے ہیں "ذہنی، لسانی، رسمی" اور علم ذہنی الفاظ اور رسوم و نقوش کا محتاج نہیں ہوتا اور علم لسانی علم ذہنی کا محتاج ہے مگر رسوم و نقوش کتابت سے بے نیاز اور علم رسمی، رسم الخط اور نقوش کا بھی محتاج ہے پس اگر "علم رسمی" کا کسی جگہ مذکور ہو تو لسانی اور ذہنی علوم کا ذکر خود بخود ہو جاتا ہے کیونکہ یہ اپنے سے بلند ہر دو علوم کے لیے بہترین معبر ہے اور ظاہر ہے کہ علم رسمی "قلم" کا محتاج ہے لہٰذا قرآن عزیز نے ﴿عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ کہہ کر لطیف پیرایہ بیان میں اس پوری حقیقت کو واضح کر دیا اس کی مزید تشریح ﴿عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ﴾ سے کر دی اور اس معجزانہ اسلوب کی غرض و غایت یہ ہے کہ ایک جانب "علم" اور "نبوت" کے درمیان کیا علاقہ ہے اس کا اظہار ہو جائے اور دوسری جانب انسان کو اپنے مقصد حیات کا صحیح علم ہو جائے۔

نزول وحی کا دوسرا دور :

غار حراء میں منصب نبوت سے سرفرازی کے وقت سورۂ علق کی یہ چند آیات نازل ہو کر وحی الٰہی کا سلسلہ منقطع ہو گیا، حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہوا کہ حراء میں فرشتہ کے ظہور اور وحی کے نزول سے فوری طور پر نبوت و رسالت کے جو خصائص و اثرات ذات اقدس ﷺ پر وارد ہوئے ہیں وہ اچھی طرح راسخ ہو جائیں اور صلاحیت و استعداد نبوت و رسالت کی تکمیل ہو جائے تاکہ آئندہ سلسلۂ وحی کے قوی موثرات و محرکات پیغمبر ﷺ کے بشری خواص کے اجنبی نہ رہیں اس لیے کچھ عرصہ کے لیے نزول وحی کا سلسلہ بند رہا۔ اسی کو مذہب کی اصطلاح میں "فترت وحی" کہتے ہیں۔

لیکن ذات اقدس ﷺ کو حراء میں پیش آمدہ کیفیت و صورت حال سے جو فطری تشویش پیدا ہوتی تھی جب اس نے سکون و طمانیت کی شکل اختیار کر لی تو نزول وحی کی روحانی کیفیات نے اس درجہ لطف اندوز کیا کہ آپ ﷺ اس "فترت" کو برداشت نہ کر سکے اور لطیف و عمیق جذبات نے اس حد تک اضطراب و بے چینی کی شکل اختیار کر لی کہ گاہ گاہ ناموس اکبر (جبرئیل امین علیہ السلام) ظاہر ہو کر آپ ﷺ کو صبر و تسکین کی دعوت دیتے اور یقین دلاتے تھے کہ اپنی تمام لطافتوں اور حسن و کمال کے ساتھ نبوت و رسالت کا یہ سلسلہ آپ ﷺ کی ذات کے ساتھ وابستہ ہو چکا ہے اور "فترت" کا یہ دور محض عارضی ہے اس لیے آپ اندوہگیں نہ ہوں تب آپ تسکین پاتے اور وقت موعود کے منتظر رہتے کہ کچھ عرصہ بعد نزول وحی کا دوسرا دور شروع ہوا اور سب سے اول سورۂ مدثر کی یہ آیات نازل ہوئیں۔ ❶

❶ فترۃ کا زمانہ کس قدر رہا ہے اس سلسلہ میں چھ ماہ سے ڈھائی سال تک کے متعلق روایات پائی جاتی ہیں اور محدثین کا رجحان چھ ماہ کی طرف زیادہ ہے۔

﴿يَاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ﴿۱﴾ قُمْ فَاَنْذِرْ ۙ﴿۲﴾ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ ۙ﴿۳﴾ وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۙ﴿۴﴾ وَ الرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۙ﴿۵﴾ وَ لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۙ﴿۶﴾ وَ لِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۙ﴿۷﴾﴾ (المدثر: ۱۔۷)

"اے کملی پوش اٹھ (اور لوگوں کو گمراہی کے انجام سے) ڈرا اور اپنے پروردگار کی عظمت وجلال کو بیان کر اور لباس کو پاک کر اور بتوں سے جدا رہ اور زیادہ حاصل کرنے کی نیت سے حسن سلوک نہ کر اور اپنے پروردگار کے معاملہ میں (اذیت و مصیبت پر) صبر اختیار کر۔"

ان آیات نے گویا انسانی مقصد حیات کی تکمیل کر دی کیونکہ سورۂ علق میں کہا گیا تھا کہ انسانیت کبریٰ کے لیے "صحیح علم" شرط ہے، یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ علم صحیح کی رفعت و بلندی کے اعتراف کے باوجود انسانیت کی تکمیل اس وقت تک ناممکن ہے کہ علم صحیح کے ساتھ "عمل صحیح" بھی موجود ہو اس لیے کہ اگر علم صحیح ہے اور عمل صحیح مفقود تو اس کی افادیت معطل اور بیکار ہے اور اگر عمل ہے اور علم صحیح ندارد تو وہ عمل موجب زیان و نقصان ہے، رشد وہدایت اور صراط مستقیم کے لیے دونوں ہی کا وجود ضروری ہے اور تب ہی "انسان" "انسانیت کبریٰ" حاصل کر سکتا ہے۔

غرض جس طرح سورۂ علق کی آیات نے "علم نافع" کی جانب اشارات کیے اسی طرح سورۂ مدثر نے "عمل نافع" کی اساسی تفاصیل ظاہر کی ہیں خدا کی ہستی اور اس کی ربوبیت کاملہ کا عملی اعتراف، باطنی طہارت و پاکیزگی کا کمال ظاہری طہارت و پاکی کا لزوم، بے غرض اور بے لوث اخلاق حمیدہ کی اساس "احسان" پر استقامت اور قبول حق اور نیک عملی کے نتائج پر "صبر" ان آیات کا حاصل ہیں اور یہی وہ بنیادی امور ہیں جن میں علم حق اور عمل صحیح کی تمام کائنات سمو دی گئی ہے۔

نیز ذات اقدس ﷺ کے لیے سورۂ علق اور سورۂ مدثر کا یہ خطاب اور پیغام حق، اشارہ ہے اس جانب کہ یہ نظام عمل منصب رسالت کے لیے "تکمیل نفس" اور دعوت رشد وہدایت کے لیے "مرتبہ اولین" کی حیثیت رکھتا ہے اور یہی مستقبل قریب میں "بعثت عامہ" کا باعث ثابت ہوگا۔

اعلانِ دعوت وارشاد کی پہلی منزل:

کلام الٰہی کے اس حکم کے بعد جو کہ تبلیغ و دعوت حق کا پہلا پیغام تھا دعوت وارشاد نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اب ذات حق نے سورۂ شعراء کی آیات نازل فرما کر نبی اکرم ﷺ کو یہ فیصلہ سنایا کہ سب سے پہلے اہل قرابت اور رشتہ داروں کو دعوت حق دیجئے کہ دوسروں پر بھی اس کا اثر پڑے اور یوں بھی قریش اور بنی ہاشم کے قبول حق کا اثر تمام عرب قبائل پر پڑنا لازمی ہے اس لیے کہ وہ سب قبائل کے سرخیل اور سرگردہ ہیں اور ساکنان حرم ہونے کی وجہ سے تمام عرب پر ان کا دینی اور دنیوی اثر ہے۔ سورۂ شعراء میں ہے:

﴿وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۙ﴿۲۱۴﴾ وَ اخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ﴿۲۱۵﴾ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۚ﴿۲۱۶﴾ وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۙ﴿۲۱۷﴾ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ

تَقُوْمُ ۝۲۱۸ وَ تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ۝۲۱۹ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۲۲۰﴾ (الشعراء: ۲۱۴۔۲۲۰)

"اور (اے پیغمبر!) اپنے قریبی ناتے والوں کو (گمراہی سے) ڈرا اور جو مسلمان تیرے پیرو ہیں ان کے لیے اپنے بازوؤں کو پست رکھ (یعنی نرمی اور تواضع سے پیش آ) اگر وہ نافرمانی کریں تب تو ان سے کہہ دے میں تمہارے ان اعمال (بد) سے بری ہوں اور غالب رحم کرنے والی ذات پر بھروسہ کر جو تجھ کو اس وقت بھی دیکھتی ہے جب تو اس کی بارگاہ میں کھڑا ہوتا ہے اور اس وقت بھی جبکہ تو سجدہ کرنے والوں میں مل کر اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے بلاشبہ وہ سننے والا جاننے والا ہے۔"

گویا یہ "تکمیل علم وعمل" اور "منصب رشد وہدایت کے فیضان" کے بعد دوسرا درجہ تھا، جس میں اعلانِ حق اور دعوت اسلام کی عملی صورت اختیار کرنے کے لیے تحریک کی گئی، چنانچہ صحیح روایات شاہد ہیں کہ آپ ﷺ نے صفا کی چوٹی پر کھڑے ہو کر اس زمانہ کے طریق اعلان کے مطابق "یا صباحا" "یا صباحا" کہہ کر خانوادۂ قریش کو پکارا اور جب سب جمع ہو گئے تو ایک مثال دے کر سمجھایا کہ بلاشبہ میں خدا کا پیغمبر اور رسول اور صراط مستقیم کے لیے ہادی برحق ہوں ارشاد فرمایا:

"لوگو! اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کی پشت پر ایک لشکر جرار جمع ہے اور تم پر حملہ کے لیے آمادہ، تو کیا تم مجھ کو صادق سمجھو گے۔ (او مصدق؟)) لوگوں نے کہا ہم نے تجھ کو "الصادق الامین" پایا ہے تو جو کچھ کہے گا حق اور صداقت پر مبنی ہو گا تب آپ ﷺ نے فرمایا: تو لوگو! میں تم کو خدائے واحد کی جانب بلاتا ہوں اور اصنام پرستی کی نجاست سے بچانا چاہتا ہوں، تم اس دن سے ڈرو، جب خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے اعمال و کردار کا حساب دینا ہے۔" [1]

یہ صدائے حق جب قریش کے کانوں میں پہنچی تو وہ حیران رہ گئے اور باپ دادا کے دین "بت پرستی" کے خلاف آواز سن کر برافروختہ ہونے لگے گویا سب میں ایک آگ سی دوڑ گئی اور سب سے زیادہ آپ ﷺ کے حقیقی چچا ابولہب کو طیش آیا اور غضبناک ہو کر کہنے لگا:

تبالك سائر اليوم اما دعوتنا الا بهذا.

"تو ہمیشہ ہلاکت ورسوائی کا منہ دیکھے کیا تو نے اس غرض سے ہم کو بلایا تھا۔" [2]

عجب منظر ہے کہ چند گھڑیاں پہلے جس محمد بن عبداللہ کی صداقت و امانت اور خصائل حمیدہ سے ساری قوم متاثر رہ کر اس کی عظمت وعزت کرتی اور اس کے ساتھ والہانہ محبت کا اظہار کرتی تھی وہی آج اس اعلان پر "کہ میں محمد رسول اللہ ہوں" یکلخت بیگانہ و نفور اور خون کی پیاسی بن گئی۔

دعوت وارشاد کی دوسری منزل:

سیرت کی کتابوں میں پڑھ آئے ہو کہ نبی اکرم ﷺ نے خاندان اور برادری کے لوگوں کو راہ حق دکھانے اور ان کی ایمانی اور اخلاقی حالت درست کرنے کی خاطر کیا کچھ نہیں کیا مگر قریش کے چند اصحاب کے سوائے کسی نے آپ ﷺ کی دعوت پر لبیک نہ کہا

---

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۳ ص ۳۸

[2] سورۂ لہب کا نزول ابولہب کی اسی گستاخانہ جرأت کے انجام بد کا اظہار کرتا ہے۔

Marfat.com

اور عداوت وبغض کو اپنا شعار بنائے رکھا تب دعوت وارشاد نے ترقی کے تیسرے زینہ پر قدم رکھا اور ذات حق کی جانب سے حکم ہوا: اے داعی حق! خاندان اور برادری کے انکار وجحود سے متاثر وغمگین نہ ہو اور اپنی مفوضہ خدمت پر استقامت کے ساتھ قائم رہو کیونکہ سعادت وشقاوت تمہارے قبضہ میں نہیں ہے تمہارا کام تو صرف ابلاغ (پہنچانا) ہے۔ البتہ اب خاندان کے دائرہ سے آگے بڑھ کر مکہ اور اطراف مکہ کے قبائل واقوام کو بھی یہ پیغام حق سناؤ اور دعوت وارشاد کا یہ تحفہ ان کے سامنے بھی رکھو تاکہ جو سعید روحیں "پیغام حق" کے لیے مضطرب اور بے چین ہیں وہ اس پر لبیک کہہ کر تسکین پائیں اور روح تشنہ کو آب حیات سے سیراب کریں۔

﴿وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا﴾

(الانعام: ۹۲)

"اور (دیکھو) یہ کتاب (قرآن) ہے جسے ہم نے (توراۃ کی طرح) نازل کیا، برکت والی اور جو کتاب اس سے پہلے نازل ہو چکی ہے اس کی تصدیق کرنے والی اور اس لیے نازل کی تاکہ تم اُم القریٰ (یعنی شہر مکہ) کے باشندوں کو اور ان کو جو اس کے چاروں طرف ہیں (گمراہیوں کے نتائج سے) ڈراؤ۔"

﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى﴾ (الشوریٰ: ۷)

"اور اسی طرح ہم نے تم پر قرآن نازل کیا زبان عربی میں تاکہ (گمراہیوں کے نتائج سے) ڈراؤ شہر مکہ کے باشندوں کو اور ان کو جو اس کے آس پاس ہیں۔"

چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے تبلیغ حق کو مکہ کی تحدید سے آزاد کر کے اطراف مکہ کے لیے عام کر دیا اور طائف، حنین اور یثرب (مدینہ) تک اپنی صدائے حق کو پہنچایا بلکہ مہاجرین کے ذریعہ حبشہ کے عیسائی بادشاہ اصحمہ تک کو کلمہ حق سنایا۔

بعثت عامہ :

اس کے بعد دعوت وارشاد کی وہ تیسری منزل پیش آئی جو "بعثت محمدی" کا نصب العین اور مقصد وحید، اور تمام انبیاء ورسل علیہم السلام کے مقابلہ میں ذات اقدس محمد ﷺ کی بعثت کے لیے طغرائے امتیاز تھی، یعنی خدائے برتر نے آپ کی بعثت کو "بعثت عام" قرار دیا اور حکم ہوا کہ آپ ﷺ نہ صرف قریش کے لیے، نہ صرف اُم القریٰ (مکہ) اور اطراف مکہ کے لیے نہ صرف عرب کے لیے نبی و رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں بلکہ آپ ﷺ کی بعثت تمام کائنات انسانی کے لیے ہوئی ہے اور آپ ﷺ عرب وعجم اور اسود واحمر سب کے لیے پیغامبر اور خدا کے ایلچی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝۲۸﴾ (سبا: ۲۸)

"اور ہم نے آپ کو کائنات انسانی کے لیے پیغام دے کر بھیجا ہے (اعمال نیک پر) خوش خبری سنانے اور (اعمال بد پر) لوگوں کو ڈرانے کے لیے اور اکثر (جاہل) لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔"

﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۝۱﴾ (الفرقان: ۱)

Marfat.com

"پاک اور برتر ہے وہ ذات جس نے حق و باطل کے درمیان تمیز دینے والی کتاب نازل فرمائی اپنے بندے محمد ﷺ پر تاکہ وہ تمام جہان والوں کو (انجام بد سے) ڈرائے۔"

دعوت اسلام کا مجمل خاکہ اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی تقریر:

نبی اکرم ﷺ سرزمین عرب میں مبعوث ہوئے اس لیے فطری طریق کار کے پیش نظر سب سے اول قوم عرب ہی ان کی دعوت وارشاد کا مخاطب قرار پائی تاکہ جو قوم کل چوپایوں کی گلہ بان تھی نور نبوت سے مستنیر ہو کر کائنات انسانی کی گلہ بان بن جائے اور خدائے برتر کے سب سے بزرگ تر پیغمبر ورسول کے سایہ رحمت میں تربیت پا کر کائنات ہدایت کے لیے "خیرامۃ" کا لقب پائے۔ تو اب دیکھنا یہ ہے کہ عرب جیسی سرکش، جاہل، تمدن و حضارۃ سے یکسر محروم اور اخلاقی وملی جذبات واحساسات سے قطعاً منحرف قوم پر "اسلام کی دعوت" نے فوری طور پر کیا اثر کیا تاکہ ہم بآسانی یہ اندازہ کر سکیں کہ جس مذہب کے بنیادی اصول وعقائد اور افکار واعمال نے ایسی قوم کے تمام شعبہ ہائے حیات میں حیرت زا اور عظیم الشان انقلاب پیدا کر کے اس کو روحانی دنیا کا انسان بنا دیا اس مذہب کی صداقت کے لیے تنہا یہ ایک کارنامہ ہی روشن دلیل بن سکتا ہے۔

مشرکین مکہ کی پیہم مخالفت ایذاء رسانی اور ہولناک طریقہ ہائے عذاب نے جب مسلمانوں کی ایک مختصر جماعت کو افریقہ کے مشہور ملک حبشہ کی جانب ہجرت پر مجبور کر دیا اور وہ عیسائی حکمراں اصحمہ کی حکومت میں پناہ گزین ہو گئے تو سرداران قریش اس کو بھی برداشت نہ کر سکے اور اصحمہ کے دربار میں مشاہیر کا ایک وفد بھیج کر یہ مطالبہ کیا کہ وہ مسلمانوں کو اس لیے ان کے حوالہ کر دے کہ یہ بد دین ہو کر اور باپ دادا کے دین کو چھوڑ کر قوم میں تفرقہ پیدا کرنے کا باعث بنے اور یہاں رہ کر بھی حکمران کے دین کے مخالف ہیں۔

اصحمہ نے وفد کا مطالبہ سن کر مسلمانوں کو جواب دہی کے لیے دربار میں طلب اور اسلام کے متعلق دریافت حال کیا، تب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے اسلام سے متعلق تقریر فرمائی اور اس کی مقدس تعلیم کا مختصر اور جامع نقشہ کھینچ کر اصحمہ کو حقیقت حال سے آگاہ کیا۔ یہی وہ تقریر ہے جو دراصل عرب کے دور جاہلیت اور قبول اسلام کے دور کی انقلابی کیفیت کا مجمل مگر بہترین خاکہ ہے۔ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بادشاہ اور درباریوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

"بادشاہ! ہم پر ایک طویل تاریک زمانہ گزرا ہے اس وقت ہماری جہالت کا یہ عالم تھا کہ ایک خدا کو چھوڑ کر بتوں کی پرستش کرتے تھے اور خود ساختہ پتھروں کی پوجا ہمارا شعار تھا مردار خوری، زنا کاری، لوٹ مار، قطع رحمی صبح وشام کا ہمارا مشغلہ، ہمسایوں کے حقوق سے بیگانہ، رحم وانصاف سے ہم ناآشنا اور حق وباطل کے امتیاز سے ہم ناواقف، غرض ہماری زندگی سرتا سر درندوں کی طرح تھی کہ قوی ضعیف کو کچلنے اور توانا، ناتواں کو ہضم کر لینے کو اپنے لیے فخر اور طغرائے امتیاز سمجھتا تھا۔

رحمت خدا کا کرشمہ دیکھیے کہ اس نے ہمارے اندر ایک بزرگ پیغمبر مبعوث کیا جس کے نسب سے ہم واقف جس کی صداقت، امانت وعصمت پر دوست ودشمن دونوں گواہ، جس کی قوم نے اس کو "محمد الامین" کا لقب دیا، وہ آیا، اور اس نے ہم کو خدا کی توحید کا سبق دیا خدائے واحد کی جانب بلایا اس نے بتلایا کہ خدا کا کوئی سہیم وشریک نہیں وہ شرک سے پاک ہے بت پرستی جہالت کا شیوہ ہے اس لیے قابل ترک ہے اور صرف خدائے واحد ہی کی عبادت حق عبدیت ہے اس نے ہم کو حق گوئی اور صداقت شعاری کی تلقین کی اور صلہ رحمی کا حکم فرمایا، ہمسایوں اور کمزوروں کے ساتھ حسن سلوک سکھایا، قتل و

Marfat.com

غارت کی رسم بد کو مٹایا، زنا کاری کو حرام اور فحش کہہ کر اس ننگ انسانیت عمل سے ہم کو نجات دلائی، نکاح میں محارم اور غیر محارم کا فرق بتایا، جھوٹ بولنے، ناحق مال یتیم کھانے کو حرام فرمایا، نماز اور خیرات و صدقات کی تعلیم دی اور ہر حیثیت سے ہم کو حیوانیت کے قعر مذلت سے نکال کر انسانیت کبریٰ کے مرتبہ پر پہنچایا۔

بادشاہ! ہم نے اس مقدس تعلیم کو قبول کیا اور اس پر صدق دل سے ایمان لائے یہ ہے ہمارا وہ قصور جس کی بدولت یہ مشرکین کا وفد تجھ سے مطالبہ کرتا ہے کہ تو ہم کو ان کے حوالے کر دے۔"[1]

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے اسلام کے صاف اور سادہ مگر روشن اصول کو جب اصحمہ کے سامنے جرأت حق کے ساتھ پیش کیا تو حبشہ کے حکمران نے مسلمانوں کو اپنی پناہ سے نکال کر وفد کے حوالہ کرنے سے انکار کر دیا اور پھر حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے خوش الحانی کے ساتھ سورۂ مریم کی چند آیات تلاوت کیں تو نجاشی حبشہ بے حد متاثر ہوا اور آبدیدہ ہو کر اسلام کی صداقت پر ایمان لے آیا اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے دست حق پرست پر مشرف باسلام ہو گیا۔

یہ ہے دعوت اسلام کا مختصر خاکہ جس نے دنیا کے شب رنگ اور تاریک ترین خطہ انسانی کو ایک بہت ہی قلیل عرصہ میں مثل آفتاب تابناک اور روشن ترین بنا دیا۔ اس خاکہ میں اعتقادات، اخلاق اور اعمال حسنہ کا وہ تمام عطر موجود ہے جس کو قرآن عزیز نے مختلف سورتوں میں حسب حال اور مناسب مقام پر بکثرت بیان کیا ہے بلکہ پورا قرآن انہی روشن حقائق کا ہادی اور مرشد ہے۔

قرآن اور تجدید دعوت:

نبی اکرم ﷺ کی بعثت جبکہ بعثت عام ہے تو از بس ضروری ہوا کہ کائنات انسانی کی رشد و ہدایت کے لیے خدا کا جو پیغام آپ ﷺ کے ذریعہ آئے وہ آخری پیغام ہو اور کامل و مکمل پیغام ہو اور فطرت کے ایسے سانچے میں ڈھلا ہوا ہو کہ عقل سلیم اور فطرت مستقیم تمام کائنات انسانی کے لیے اس کو ابدی اور سرمدی پیغام یقین کرے اسی پیغام الٰہی کا نام "القرآن" یا "الکتاب" ہے۔

قرآن کی تعلیم اور اس کی دعوت و اصلاح کی حقیقت معلوم کرنے سے قبل چند لمحات کے لیے مذاہب عالم کی تاریخ پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

قرآن کے نزول سے قبل کائنات انسانی پر چار مذہبی تصور حاوی اور فکر و نظر ذہنی پر اثر انداز تھے: ہندومت۔ مجوسی۔ یہودی اور مسیحی۔

ہندومت تصور الٰہی کے متعلق خواص اور عوام کے لیے دو جدا جدا تخیلات رکھتا تھا خواص کے لیے وحدۃ الوجود[2] اور عوام کے لیے اصنام پرستی، وحدۃ الوجود کا تصور اس درجہ فلسفیانہ تھا کہ خدا کا صحیح تصور کسی طرح اس راہ سے ممکن نہ تھا اس لیے کہ اگر ایک جانب وہ ہر وجود کو خدا یا خدا کا جزء مانتا ہے تو دوسری جانب خدا کے لیے کوئی محدود و متعین تخیل بتانے سے عاجز تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندومت کے تمام اسکولوں (مذاہب) میں اصنام پرستی ہی کو مذہبی امتیاز رہا اور وہ توحید خالص کو مقبول خواص و عوام نہ بنا سکا۔ چنانچہ ویدک دھرم، بدھ مت، جین مت وغیرہ بلکہ جدید اصلاحی اسکول (مذہب) آریہ سماج سب کے سب توحید خالص کے تصور سے خالی ہیں۔

[1] سیرت ابن ہشام جلد اول و تاریخ ابن کثیر ج ۳

[2] یہاں وہ وحدت الوجود مراد ہے جو یوگیانہ تصور کا نچوڑ ہے۔

Marfat.com

مجوسی مذہب کا اعتقادی تصور تو صاف صاف "ثنویت" کی بنیادوں پر قائم ہے یعنی وہ خدا کے تصور و تخیل کو خیر و شر کی جدا جدا دو متقابل قوتوں میں تقسیم کر دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ نور اور خیر کا خدا "یزداں" اور ظلمت و شر کا "اہر من" ہے اور اس طرح خدائے خیر اور خدائے شر دو خدا کائنات ہست و بود پر متصرف اور باہم متقابل ہیں۔

یہودی مذہب اگرچہ خدا کے تصور میں مدعی توحید رہا ہے لیکن موجودہ تورات کے اوراق شاہد ہیں کہ اس کی نگاہ میں خدا کی ہستی تجسم سے پاک نہیں ہے اسی لیے تورات کا تخیلی خدا کہیں حضرت یعقوب علیہ السلام سے کشتی لڑتا نظر آتا ہے اور یعقوب علیہ السلام اس کو پچھاڑ دیتا ہے، اور کہیں اس کی انتڑیوں میں درد ہونے لگتا ہے اور وہ اس کی وجہ سے چیختا نظر آتا ہے، کبھی وہ بنی اسرائیل کو اپنی چہیتی بیوی بنالیتا ہے تو کبھی مصر سے خروج کے وقت بادل اور آگ کا ستون بن کر بنی اسرائیل کی راہنمائی کرتا نظر آتا ہے اور کبھی اس کی آنکھیں دُکھنے آجاتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اور اس تصور کا آخری مظاہرہ حضرت عزیر (عزرا) علیہ السلام کو خدا کا بیٹا تسلیم کرنے پر منتج ہوجاتا ہے۔

اسی طرح مسیحی تصور بھی تجسم و تشبہ کے چکر میں آکر حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مان لیتا اور اس طرح مشرکانہ عقیدہ "اوتار" کا تخیل اپنالیتا ہے اور اقانیم ثلثہ (تثلیث) اور مریم پرستی میں حقیقی خدا پرستی کو گم کر بیٹھتا ہے خدا کی ہستی سے متعلق یہ وہ تصورات تھے جن میں دنیا کے بڑے بنیادی مذاہب نزول قرآن کے وقت مبتلا نظر آتے ہیں۔

ان سب مذاہب میں توحید حقیقی سے غفلت نے رسالت یعنی دعوت حق کے داعی کی شخصیت کے متعلق بھی غلط تصورات پیدا کر دیے تھے چنانچہ ہندوستان کے مذہبی تصور میں تو رسالت و نبوت اپنے صحیح معنی میں نظر ہی نہیں آتی اور وہ نبی و رسول کے مفہوم سے ہی یکسر ناآشنا نظر آتا ہے اور مجوسی، یہودی اور مسیحی مذاہب کے معتقدات میں اگر یہ تصور پایا بھی جاتا ہے تو افراط و تفریط کی شکل میں کبھی "ابن اللہ" ہو کر اور کبھی "بداخلاق و بداعمال انسان" کا پیکر بن کر جیسا کہ تورات میں حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی بیٹیوں کا ان کے ساتھ اختلاط کا واقعہ مذکور ہے (العیاذ باللہ من ھذہ الخرافات والافتراءات)

گویا ان کے نزدیک یا تو "رسول" اور داعی حق کی شخصیت کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی اور یا پھر خدا، خدا کا اوتار اور خدا کا بیٹا بن کر سامنے آتی ہے اور اس لیے جس طرح وہ حقیقی توحید سے بیگانہ نظر آتے ہیں اسی طرح رسالت و نبوت کے صحیح تصور سے بھی محروم ہو چکے ہیں۔

اسی طرح عالم آخرت کے متعلق بھی ان مذاہب کے تصور کی دنیا افراط و تفریط سے خالی نہیں تھی بعض مذاہب میں تو کائنات انسانی مختلف چولوں کے چکر میں گرفتار نظر آتی اور آواگون (تناسخ) کے ناقص فلسفیانہ نقطہ نگاہ کا رہین منت بنی ہوئی ہے اور ایک حد پر پہنچ کر "برہم" یعنی خدا میں جذب ہوجانا نجات کا آخری نقطہ متعین کیا جاتا ہے۔ نیز خیر و شر کی جزا و سزا کے بارہ میں ایک قادر مطلق خدا نہیں بلکہ ایک جبری قانون میں جکڑی ہوئی مجبور ہستی کا تصور پیش کرتا ہے اور بعض اگرچہ تناسخ کے غلط عقیدہ سے جدا یوم معاد اور یوم حساب کے تصور سے آشنا بھی ہیں لیکن ان کے نزدیک بھی عالم آخرت کا معاملہ اعمال صالحہ و سیئہ یا افعال و کردار کے حق و باطل کی جزا و سزا سے وابستہ نہیں ہے بلکہ نسلی امتیازات اور جماعتی فرقہ بندی اور یا پھر کفارہ کے ساتھ مربوط ہے۔

ان چار بنیادی مذاہب عالم کے علاوہ مشرکین اور فلاسفہ کی بعض ایسی جماعتیں بھی تھیں جو نہ خدا کی ہستی کی قائل ہیں اور نہ عالم آخرت کی اور خدا کی ہستی پر اگر ایمان بھی رکھتی تھیں تو سینکڑوں ہزاروں بلکہ بے تعداد بتوں کی باطل پرستی کے ساتھ ملوث و مجروح۔

غرض یہ تھے مذاہب عالم کے وہ ذہنی تصورات اور فکری معتقدات جن پر کائنات انسانی کی روحانی اور سرمدی سعادت کا مدار سمجھا جاتا تھا اور جو بلاشبہ اپنے نتائج وثمرات کے لحاظ سے کائنات انسانی کو مشعل ہدایت دکھا کر "انسانیت کبریٰ" کے درجہ تک پہنچانے اور انسانوں کا خدا کے ساتھ حقیقی معبود وعبد ہونے کا رشتہ قائم کر کے دین ودنیا کی خیر وفلاح تک پہنچانے میں قطعی تہی دامن تھے۔

ان ہی حالات میں "اسلام" کی دعوت وتبلیغ یا "تعلیم حق" نے رونمائی کی اور کائنات انسانی کے ہر شعبہ حیات میں گوناگوں انقلاب پیدا کر کے نیا عالم پیدا کر دیا اور آفتاب ہدایت کی روشنی سے منور بنا کر اس کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔

توحید:

نبی اکرم ﷺ نے خدا کے کلام (قرآن) کے ذریعہ سب سے پہلے اسی عقیدۂ توحید پر روشنی ڈالی اور توحید خالص کی حقیقت واضح کر کے تمام کائنات انسانی کو اس کی جانب دعوت دی۔

قرآن عزیز کی دعوت توحید کا حاصل یہ ہے کہ اللہ ایک ایسی ہستی کا نام ہے جو اپنی ذات وصفات میں ہر قسم کے شرک سے پاک اور وراء الوراء ہے، نہ اس کا کوئی سہیم وشریک ہے اور نہ اس کا ہمتا وہمسر، اس لیے "ابنیت" کا عقیدہ ہو یا "اوتار" کا، صنم پرستی ہو یا ثنیت وتثلیث، یہ سب باطل ہیں وہ یکتا وبے ہمتا ہے، باپ، بیٹا اور اس قسم کی نسبتوں سے پاک ہے، پرستش کے قابل وہ خود ہے نہ کہ اس کے مظاہر اور اس کی مخلوقات، وہ جس طرح تجسم وتشبہ سے بالاتر ہے اسی طرح اس کا نہ کوئی مقابل ہے اور نہ کوئی حریفانہ سہیم۔

﴿ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ ﴾ (البقرہ: ۲۵۵)

"اللہ" اس ہستی کا نام ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود اور خدا نہیں ہے، اللہ وہ ہے کہ اس کے سوا کوئی نہ خدا ہے نہ معبود، وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے اور زندگی کا بخشنے والا۔"

﴿ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَیْـًٔا ﴾ (النساء: ۳۶)

"پس تم اللہ ہی کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ۔"

﴿ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ⑬ ﴾ (لقمان: ۱۳)

"اللہ کا کسی کو شریک نہ بنا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔"

﴿ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ ﴾ (البقرہ: ۱۶۳)

"اور خدا تمہارا ایک ہی ہے۔"

یہ اور اسی مضمون کی بے شمار آیات ہیں جو قرآن عزیز میں توحید خالص کی داعی اور منادی ہیں لیکن سورۂ اخلاص یا سورۂ توحید میں جس معجزانہ اختصار کے ساتھ توحید سے متعلق موجودہ مذاہب کے ناقص اور غلط تصورات کو باطل کرتے ہوئے توحید خالص کی تعلیم دی گئی ہے۔ وہ خود اپنی نظیر ہے:

Marfat.com

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ لَمْ يَلِدْ ۙ وَ لَمْ يُوْلَدْ ۙ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۚ﴾

(الاخلاص: ۱۔۴)

"(اے محمد ﷺ) کہہ دیجئے اللہ یکتا ذات ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا اور نہ اس کا کوئی ہمسر اور سہیم و شریک ہے۔"

ایک مرتبہ توحید سے متعلق مذاہب عالم کی تعلیم پر اور نظر کیجئے اور پھر ان چند مختصر آیات کو غور و فکر کے ساتھ ملاحظہ فرمائیے تو آپ اندازہ کر سکیں گے کہ پہلی دو آیات میں توحید خالص کا صحیح اور حق تصور پیش کر دیا گیا ہے، قرآن کہتا ہے کہ اللہ ایسی ہستی کا نام ہے جو یکتا و بے ہمتا ہے، ساری کائنات اس کی محتاج ہے اور وہ ہر قسم کی احتیاج سے پاک اور بے نیاز ہے وہ صمد ہے یعنی مجموعہ کمالات صرف صمدیت کا حصہ ہے اور بس۔

اس کے بعد وہ نصاریٰ اور یہود سے مخاطب ہو کر شمع ہدایت دکھاتا ہے کہ اللہ اس ہستی کو کہتے ہیں جو باپ اور بیٹے جیسی فانی نسبتوں سے بالاتر ہے وہ نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا، تعالی اللہ علوا کبیرا اور اسی طرح ہندو دھرم سے کہتا ہے کہ ایسی لازوال ہستی کی مقدس شان اس سے بلند و بالا ہے کہ وہ کسی انسان یا حیوان کے جسم میں محدود ہو کر "اوتار" کہلائے یا اس معبود مطلق کے ساتھ چھوٹے معبودوں کا سلسلہ قائم کر کے کسی مخلوق کو اس کا سہیم و شریک ٹھہرایا جائے۔ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ اور وہ مجوس اور ویدک دھرم کے ان پجاریوں کو مخاطب کرتا ہے جو اس کو یزداں کہہ کر اہرمن کو اس کا مقابل حریف تسلیم کرتے ہیں یا روح (جیو) اور مادہ (پرکرتی) کو خدا کے ساتھ ازلی و ابدی (قدیم و غیر مخلوق) کہہ کر ان چیزوں کو خدا کا کفو اور ہمسر بتلاتے ہیں اور کہتا ہے ﴿وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۚ﴾ خدا اس ہستی کا نام ہے جس کا نہ کوئی ہمسر اور حریف ہے اور نہ اس کی طرح انادی (قدیم) اور غیر مخلوق ہے۔

غرض قرآن عزیز نے خدا کی ذات واحد سے متعلق ان تمام نسبتوں کا قطعی انکار کر کے جو توحید خالص کے کسی طرح بھی معارض ہوتی تھیں اس کو یکتا اور بے ہمتا ظاہر کیا ہے اور اس طرح شرک فی الذات اور شرک فی الصفات کا قلع قمع کر دیا ہے اور شرک فی الالوھیۃ اور شرک فی الربوبیۃ کے خلاف توحید اور صرف توحید کو ہی اسلام کا بنیادی تصور قرار دیا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ جس طرح قرآن نے توحید کے تمام اطراف و جوانب کو نقص و خام کاری سے پاک کر کے حقیقی توحید کے تصور کی جانب راہنمائی کی اور ہر قسم کے تجسم سے وراء الوراء بتلا کر توحید کامل کی جانب دعوت دی اسی طرح اس نے توحید کے اس فلسفیانہ عقیدہ کو بھی باطل ثابت کیا جو اس باب میں تفریط کی حد تک بڑھ کر صفات الٰہی کا بھی منکر ہو گیا اور کہنے لگا کہ وہ قادر ہے بغیر قدرت کے، خالق ہے بغیر خلق کے، بصیر ہے بغیر رویت کے، سمیع ہے بغیر سمع کے وغیرہ وغیرہ۔ اس عقیدہ کا حاصل یہ ہے کہ خدا ایسی ہستی کا نام ہے جس کے لیے "تعطل" لازم ہے جیسا کہ پہلی تعلیمات کا حاصل یہ تھا کہ کسی نہ کسی رنگ میں خدا کے لیے تجسم ضروری ہے۔

قرآن نے کہا کہ پہلی کیفیت اگر افراط پر مبنی تھی تو یہ تفریط پر قائم ہے اس لیے کہ ایک ذات کے لیے متعدد صفات کمال کا ہونا ذات کی وحدت پر اثر انداز نہیں ہے اس لیے بلاشبہ وہ سمیع و بصیر ہے، سنتا ہے اور دیکھتا ہے، لاریب وہ قدرت کاملہ کے ساتھ قادر ہے اور صفت رحم و کرم کے ساتھ رحیم و کریم ہے البتہ اس کی صفت سمع و بصر، صفت رحم و کرم وغیرہ صفات کا انسانی صفات سمع و بصر

Marfat.com

سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے اور جس طرح وہ اپنی ذات میں بے ہمتا اور یکتا ہے اسی طرح صفات میں بھی ہے:

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴾ (الشوریٰ: ۱۱)

"اس (خدا) کی کوئی مثال نہیں اور یہ حقیقت ہے کہ وہ سنتا ہے، دیکھتا ہے۔"

غور فرمائیے کہ کس معجزانہ تعبیر کے ساتھ ایک ہی آیت اور ایک ہی جملہ میں اس کی صفات کمالیہ کا اعتراف بھی مذکور ہے اور یہ بھی وضاحت موجود ہے کہ خدا کی ان صفات کو انسانی صفات کی طرح نہ سمجھو بلکہ اس کی ذات کی طرح اس کی صفات بھی ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ﴾ کے عنوان سے معنون اور انسانی صفات کی حقائق کے مقابلہ میں بے مثال و بے نظیر ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدائے برتر کی توحید جب ہی حقیقی توحید کہلا سکتی ہے کہ اس میں نہ تجسم کا عقیدہ شامل حال ہو اور نہ تعطل کا کہ یہ دونوں افراط و تفریط کی راہیں ہیں بلکہ عقیدہ یہ ہو کہ اللہ اپنی ذات میں بھی بے ہمتا و یکتا ہے اور اپنی صفات میں بھی اور وہ ہر طرح کے شرک و کفو سے پاک اور برتر ہے۔

رسالت:

توحید حقیقی کے ثبوت کے بعد قرآن نے "رسالت" کے بنیادی عقیدہ کی اصلاح بھی ضروری سمجھی اور اس نے بتلایا کہ کسی تعلیم کے حسن و قبح میں معلم کی شخصیت کو بہت بڑا دخل ہوتا ہے کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ اچھی تعلیم کا معلم بدعمل انسان ہو یا بری تعلیم کا معلم نیکوکار، اور جبکہ یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ خدا ہر ایک انسان کے ساتھ براہِ راست ہم کلام نہیں ہوتا تو از بس ضروری تھا کہ کائنات انسانی کی ہدایت کے لیے ایک انسان ہی کو معلم بنایا جائے اور وہی خدا کی جانب سے رسالت اور پیغامبری کا فرض انجام دے۔

پس بشری اوصاف سے متصف یہ انسان نہ خدا ہوگا اور نہ خدا کا بیٹا یا خدا کا اوتار بلکہ بشر اور انسان ہی رہے گا نیز خدا کے پیغامبر ہونے کی وجہ سے پاکی اور تقدس کا جو رشتہ اس کو خدا کی درگاہ سے وابستہ کیے ہوئے ہے اس کے پیش نظر اس کی ہستی کا نہ انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کو دوسرے انسانوں کے مساوی کہا جا سکتا ہے اس لیے قرآن نے جگہ جگہ مسیح ابن مریم اور عزیر (علیہما السلام) کے متعلق اس حقیقت کو واضح کیا کہ وہ خدا کے مقدس رسول ہیں۔ خدا یا خدا کے بیٹے نہیں ہیں۔ نیز یہ بھی بتلایا کہ اگر ایک انسان تمہاری طرح کھاتا بھی ہے اور پیتا بھی اور بازاروں میں چلتا پھرتا، خرید و فروخت کرتا اور گھر میں اہل و عیال کے ساتھ معاشرتی زندگی بسر کرتا ہے تو اس سے یہ کیسے لازم آ گیا کہ وہ خدا کا فرستادہ "رسول" نہیں ہے اور کس طرح یہ جائز ہے کہ ایک صادق و امین ہستی کے اس دعویٰ کو تم محض قیاس کی بناء پر جھٹلا دو کہ وہ خدا کا رسول نہیں ہے۔

قرآن نے ان حقائق کو جن صاف اور واضح تعبیرات کے ساتھ بیان کیا ہے گذشتہ صفحات میں آپ ان کا مطالعہ فرما چکے ہیں۔ پس جس کتاب میں نبوت و رسالت سے متعلق صحیح تصور موجود نہ ہو وہ کبھی اپنی مذہبی تعلیمات کی صداقت کی مکمل تصویر نہیں پیش کر سکتی، یہی وہ عقیدہ ہے جس کی حقیقت میں "ایمان بالرسل" "ایمان بالکتب" "ایمان بالملائکہ" سب بنیادی عقائد سمٹ کر جذب ہو جاتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ جبکہ ہدایت انسانی کے لیے خدائے تعالیٰ اپنی پیغامبری کے لیے ایک انسان اور بشر کو ہی چن لیتا ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انسان نے جب سے اس کائنات میں قدم رکھا ہے اسی وقت سے رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ قائم ہے:

﴿ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ﴾(فاطر: ۲۴)

"کوئی گروہ یا جماعت ایسی نہیں ہے کہ جس میں ہماری جانب سے نذیر (پیغامبر) نہ گزرا ہو۔"

﴿ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴾(الرعد: ۷)

"اور ہر قوم کے لیے ہادی آئے ہیں۔"

﴿ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ﴾(المؤمن: ۷۸)

"ان میں سے بعض کے واقعات کا ہم نے قرآن میں تذکرہ کر دیا ہے اور بعض ایسے ہیں جن کا تذکرہ قرآن میں نہیں کیا۔"

اور یہ یقین لانا بھی ضروری ہے کہ جبکہ خدا ایک ہے اور اس کی تعلیم ایک تو بلاشبہ تمام پیغمبرانِ خدا کی بنیادی تعلیم بھی ایک ہی رہی ہے اور اس لیے اگر خدا کے کسی ایک برحق نبی و رسول کا بھی انکار کر دیا گیا تو گویا اس نے پوری دعوت قرآنی کا انکار کر دیا پس یہ ایمان ضروری ہوا:

﴿ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ﴾(البقرہ: ۲۸۵)

"ہم خدا کے پیغمبروں میں پیغمبر ہونے کے لحاظ سے کسی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے (کہ ایک کو مان لیں اور دوسرے کا انکار کر دیں)۔"

لہٰذا جب تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا از بس ضروری ہوا تو ان پر نازل شدہ تمام کتب سماویہ پر بھی ایمان لانا جزء ایمان ہو گا ورنہ تو ایک جانب سے ایمان لا کر دوسری جانب سے اس پیغمبر کی صداقت کا انکار لازم آئے گا اور جب رسالت اور رسالت کے ساتھ کتب سماویہ پر ایمان حقیقت ثابتہ بن جائے تو ملائکۃ اللہ پر اس لیے ایمان لانا ضروری ہو گا کہ خدا کے ان پیغمبروں نے یہ صاف صاف اعلان کیا ہے کہ خدا کی جانب سے ان پر یہ وحی خدا کا فرشتہ لے کر آتا ہے تو اب یا ہم اس پیغمبر کی صداقت کا انکار کر دیں اور یا پھر بن دیکھے فرشتہ پر اس لیے ایمان لے آئیں کہ بتلانے والی ہستی اپنے کردار و اعمال میں ہر طرح صادق و امین اور امراض دماغی و قلبی "جنون و سحر" سے ہر طرح پاک ہے اور ضروری نہیں ہے کہ جس شے کو آنکھوں نے نہ دیکھا ہو اور کانوں نے نہ سنا ہو وہ حقیقت میں بھی غیر موجود ہو کیونکہ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ کسی شے کے عدم علم سے اس شے کا عدم لازم نہیں آتا یعنی یہ ضروری نہیں کہ جس بات کو ہم نہیں جانتے وہ واقعہ میں بھی موجود نہ ہو۔

یوم آخرت:

نبی اکرم ﷺ نے خدا کے آخری اور مکمل پیغام قرآن کے ذریعہ تیسری بنیادی اصلاح "یوم آخرت" سے متعلق فرمائی۔

Marfat.com

مذاہب عالم اس سلسلہ میں بھی راہ مستقیم سے روگرداں اور افراط و تفریط کے بحر ظلمات میں پھنسے ہوئے تھے یا تو آواگون ❶ (تناسخ) کے چکر میں یوم آخرت کے اس تصور سے قطعاً بیگانہ ہو چکے تھے اور قیامت (پرلے) کا تعلق انسانی اعمال کی جزاء وسزا اور یوم الحساب سے غیر متعلق سمجھ چکے تھے اور یا پھر اس دن نجات کا مدار اور جزاء وسزا کا معیار اعمال وکردار کی جگہ نسل وخاندان اور سوسائٹی کی معاشرتی گروہ بندی پر سمجھ بیٹھے تھے اور "کفارہ" کو عقیدہ بنا کر حساب ومحاسبۂ اعمال سے مطمئن ہو چکے تھے۔ اور مشرکین اور بعض فلاسفہ نے تو یوم آخرت کے وجود ہی کا انکار کر دیا تھا اور ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ آج کا مردہ انسان کل کس طرح زندگی اختیار کرلے گا اور سینکڑوں اور ہزاروں برس کی بوسیدہ ہڈیاں یوم حساب میں کس طرح جسم بن کر اپنی روح کے لیے لباس بن سکیں گی۔

قرآن نے نازل ہو کر دنیاء انسانی کو بتایا کہ اس صاف اور واضح بات کے سمجھنے میں آخر تم پر کیوں وحشت طاری ہوتی ہے اور کیوں تمہاری عقل اس کو نہیں تسلیم کرتی کہ جس خالق کائنات اور بدیع السماوات والارض نے نمونہ اور نقشہ کے بغیر یہ عجیب و غریب عالم آفرینش کر دیا وہ بلاشبہ اس پر قادر ہے کہ ماضی میں مخلوق اور حال میں مردہ بوسیدہ ہستی کو مستقبل میں دوبارہ وجود عطا فرما دے اور اس کے منتشر اجزاء کو جمع کر کے دوبارہ وہی ہیئت جسمانی عطا اور سابق روح کو اس میں واپس کر دے۔

---

❶ اس موقع پر اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں سے متعلق اگرچہ بحث کرنے کی گنجائش نہیں ہے تاہم اس قدر سمجھ لینا ضروری ہے کہ تناسخ (آواگون) کا عقیدہ اس اساس پر قائم ہے کہ ہر ایک انسان کی موجودہ زندگی سابق میں کیے ہوئے اعمال کا ثمرہ اور نتیجہ ہے ورنہ کائنات میں یہ تنوع ہرگز نہ ہوتا کہ کوئی انسان ہے تو کوئی حیوان اور کوئی نباتات و جمادات نیز انسانوں میں کوئی غلام ہے تو کوئی جاہل اور کوئی صحت یاب ہے تو کوئی مریض اور کوئی امیر کبیر ہے تو کوئی مفلس ومحتاج وغیرہ وغیرہ۔

اس عقیدہ کا مقصد یہ ہوا کہ بغیر عمل وکردار کے اگر عالم میں یہ تغیرات موجود ہیں تو یہ خدا کی صفت عدل کے منافی ہے لیکن عقیدہ کی خام کاری اور بطلان کی مختلف وجوہ میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ اگر روح اپنے اعمال کی وجہ سے مختلف جون بدل کر ان تغیرات عالم کا باعث ہے جو مجموعہ کائنات کے حسن کا باعث ہیں اور جس کی بدولت یہ پورا کارخانہ مکمل نظام کے ساتھ وابستہ نظر آتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان کے لئے فطری اور نیچرل طور پر گنہگار، بدکار اور بداعمال ہونا ازبس ضروری ہے تاکہ مجموعہ کائنات کا یہ حسن نہ صرف یہ کہ پیدا ہو بلکہ قائم رہے جس کا تغیرات اور تنوعات پر مبنی ہونا ازبس ضروری ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہہ دیجئے کہ جون بدل کر آواگون کی زندگی اگر اعمال کی جزاوسزا سے متعلق ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت انسان کے لئے نیکوکار بننے کی جگہ زیادہ سے زیادہ بدکار رہنا چاہیے تاکہ آئندہ نظام عمل میں یہ تنوع باقی رہے جس کا باقی رہنا عقل وفطرت کے مطابق ہے ورنہ تو حیوانات، نباتات، جمادات کے فقدان سے انسانی دنیا کا یہ سارا کارخانہ درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔

تناسخ کے ناقص فلسفیانہ عقیدہ پر یقین رکھنے والوں نے اس حقیقت کو یکسر فراموش کر دیا ہے کہ ایک چیز اپنی انفرادیت کے لحاظ سے خواہ کتنی ہی قبیح اور بری معلوم ہو لیکن مجموعہ کائنات کے پیش نظر اس کا وجود بھی اپنے اندر ضرور حسن رکھتا ہے مثلاً تل (خال) اپنے رنگ وروپ میں کیسا ہی سیاہ فام کیوں نہ ہو لیکن محبوب کے رخسار پر نہ خود حسین بن جاتا ہے بلکہ حسن محبوب کو دوبالا کر دیتا ہے اور حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ جیسے صوفی کو "خال محبوب پر سمرقند و بخارا" بخش دینے پر آمادہ کر دیتا ہے۔

اسی طرح عالم وکائنات میں انفرادی طور پر کسی کا مریض ہونا، اپاہج ومعذور ہونا، ناقص الخلقت ہونا وغیرہ گو قبیح اور قابل افسوس نظریات ہوں مگر مجموعہ کائنات کے حسن کے لئے فطری (نیچرل) ہیں اور اس تنوع پر ہی دنیا کے نظام کا بقاء ہے اور خالق کائنات کے کمالات آفرینش کا آئینہ دار۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونق چمن — اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

Marfat.com

یا تو صاف کہو کہ اس کائنات کو کسی بلند و بالا ہستی نے پیدا نہیں کیا جس کو خدا (اللہ) کہتے ہیں اور اگر یہ مانتے ہو تو یہ قطعاً عقل کے خلاف ہے کہ جو ابتدائی آفرینش کر سکے وہ اس آفرینش کو دوہرا نہ سکے:

﴿وَ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا ۝ اَوَ لَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ يَكُ شَيْئًا ۝﴾ (مریم: ۶۶-۶۷)

"اور انسان کہتا ہے کہ بھلا جب میں مر گیا تو کیا میں (قبر سے) زندہ نکالا جاؤں گا۔ کیا انسان یہ یاد نہیں کرتا کہ ہم نے پہلے اسے پیدا کیا حالانکہ وہ کوئی چیز نہیں تھا۔"

﴿وَ ضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّ نَسِيَ خَلْقَهٗ ؕ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَ هِيَ رَمِيْمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْۤ اَنْشَاَهَاۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَ هُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُۨ ۝﴾ (یٰسین: ۷۸-۷۹)

"اور ہماری نسبت باتیں بنانے لگا اور اپنی پیدائش کی حقیقت کو بھول گیا، کہتا ہے کہ ہڈیاں جب گل کر خاک ہو گئی ہوں تو کون ہے جو ان کو زندہ کر کے کھڑا کر دے (اے محمد ﷺ) کہہ دیجئے کہ جس نے ان ہڈیوں کو اول بار پیدا کیا تھا وہی ان کو زندہ کرے گا اور وہ سب کا پیدا کرنا، جانتا ہے۔"

یہ مشرکین مکہ تھے جو خدا اور خالقیت خدا کے تو قائل تھے مگر دوسری زندگی کے منکر و کافر اور جاحد تھے۔ پھر اس نے ان کو بھی مخاطب کیا جو کہتے تھے کہ آخرت کا تصور اس لیے فضول ہے کہ یہ کائنات کسی کی مخلوق ہی نہیں مادہ اور اس کی حرکت یونہی ازل سے ابد تک کائنات کا روپ و رنگ اختیار کیے ہوئے ہے اور حرکت و کشش دو قوتیں اس نظام عالم کے ہر قسم کے تنوعات کے کفیل ہیں۔ قرآن نے کہا، یہ گمراہ کن تصور ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے وہ یہ کہ عقل اور سائنس کے خلاف یہ سمجھ لیا گیا کہ ذرات مادہ (اجزاء اثیریہ) میں شعور اور ارادہ نہ ہونے کے باوجود حرکت، قوت استعداد اور کشش کے ذریعہ خود بخود ایسی اشیاء وجود پذیر ہو سکتی ہیں جن کا مواد (میٹریل) ان ذرات میں موجود نہیں یعنی مادہ میں بالقوہ بھی نہ شعور ہے اور نہ ارادہ، نہ جذبات ہیں نہ احساسات، نہ ادراکات ہیں اور نہ عقل و تمیز، ورنہ تو جسم کو بالقوہ ان صفات کا حامل کہنا بجا ہوتا، لیکن یہ مسلمات میں سے ہے کہ جسم کو نہ شعوری کہہ سکتے ہیں نہ جذباتی، نہ ذی ادراک کہا جا سکتا ہے اور نہ ذی عقل و صاحب تمیز پس دلیل "وجدان" جو فطری دلائل میں سب سے مضبوط اور نیچرل دلیل ہے، وہ اس حقیقت کو تسلیم کراتی ہے کہ جبکہ تمام موجودات عالم میں "انسان" موجودات عالم کی ارتقائی ہستی اور اشرف الموجودات ہے اور اس میں جذبات، حسیات، ادراکات، شعور اور عقل جیسے لطیف اوصاف موجود نظر آتے ہیں حالانکہ بلاشبہ مادہ کی قوت و استعداد میں یہ معدوم تھے، تو اس میں قطعاً شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ انسان سے بلند ضرور ایک ایسی ہستی موجود ہے جو قدرت و ارادہ کی علی الاطلاق مالک اور تمام موجودات کی خالق ہے اور اس میں بھی کوئی ریب و شک نہیں کہ انسان ایسی ذی عقل و ذی شعور اور صاحب ارادہ ہستی کی تخلیق محض بے فائدہ نہیں ہے اور اس کی زندگی کے اعمال اور کردار بے وجہ اور مہمل نہیں ہیں اور جبکہ ہم اس دنیا میں انسانوں کے اعمال و کردار کی جزاء و سزا کا مظاہرہ نہیں دیکھتے تو وجدان ہی ہمارے لیے رہنمائی کرتا ہے کہ ایک ایسا دن ضرور مقرر ہے

Marfat.com

جب کائنات انسانی اپنے اعمال و کردار کی جزاء و سزا کا نتیجہ و ثمرہ پائے گی اور اسی کو یوم القیامہ، یوم الآخرہ اور یوم الحساب کہتے ہیں، چونکہ یہ دن اپنی پائیداری اور قیام کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے اس لیے یوم القیامہ کہلاتا ہے اور چونکہ دنیائے موجودہ کے بعد ہے اس لیے یوم الآخرہ ہے اور چونکہ جزاء و سزا اور اعمال کے محاسبہ پر مشتمر ہوگا اس لیے یوم الحساب ہے:

﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ ۙ عٰلِمِ الْغَيْبِ ۚ ﴾ (سبا: ۳)

"اور منکرین کہتے ہیں کہ قیامت ہم کو تو کبھی نہیں آئے گی۔ اے محمد! ﷺ کہہ دیجئے، ہاں ہاں مجھ کو اپنے پروردگار کی قسم جو عالم الغیب ہے قیامت تو تم کو ضرور پیش آ کر رہے گی۔"

﴿ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۝۳۶ ... الٰی ... اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓي اَنْ يُّـحْيِۦ الْمَوْتٰى ۝۴۰ ۧ ﴾ (القیامۃ: ۳۶، ۴۰)

"کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ وہ مہمل اور بیکار چھوڑ دیا جائے گا کیا خدا اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کر دے؟"

﴿ وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝۱ۙ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝۲ۙ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝۳ۙ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝۴ۡ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝۵ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝۶ۭ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۝۷ۭ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ۝۸ۧ ﴾ (التین: ۱۔۸)

"گواہ ہے انجیر و زیتون (کے باغات سے سرسبز و شاداب وہ مقام بیت اللحم جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی) اور گواہ ہے طور سیناء (جہاں موسیٰ علیہ السلام کو نبوت سے سرفرازی نصیب ہوئی) اور گواہ ہے یہ بلد امین (مکہ جہاں محمد ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی) کہ بلاشبہ ہم نے انسان کو بہتر سے بہتر قوام سے بنایا پھر اس کو نشیبوں کے سب سے نیچے مقام پر دھکیل دیا مگر وہ انسان جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان کے لیے بے منت و احسان اجر و ثواب ہے تو اب وہ کیا بات ہے جو تجھ کو دین (قیامت) کے جھٹلانے پر آمادہ کرتی ہے کیا اللہ حاکموں میں سے بہتر حاکم نہیں ہے۔"

اور سچ تو یہ ہے کہ قرآن عزیز کہتا ہے کہ آخرت کے انکار پر منطقی دلائل قائم کرنے اور سفسطہ اور غلط روش کو اختیار کر کے ادھر اُدھر بھٹکنے کی آخر ضرورت کیا ہے جبکہ انسان کی سب سے قریب اور سب سے زیادہ مضبوط دلیل "وجدان" خود بخود اس جانب راہنمائی کرتی ہے کہ یہ نظام عالم جس طرح حیرت زا اور محیر العقول نظام فطرت سے منظم اور قوانین فطرت کے ہاتھوں میں مسخر ہے، ہو نہیں سکتا کہ یہ خود رو نظام ہو اور جبکہ اس کا کوئی خالق ضرور ہے تو اس نے خیر و شر کے ثمرات و نتائج کے لیے بھی ضرور کوئی وقت مقرر کیا ہے ورنہ یہ کامل و مکمل نظام ثمرہ اور نتیجہ کے پیش نظر ایک مہمل شے ماننی پڑے گی۔ پس نتیجہ اور ثمرہ کا وہ دن ہی "یوم آخرت" کے نام سے موسوم ہے جو نہ تناسخ کے چکر سے وابستہ ہے اور نہ ازلیت و ابدیت عالم کا حامل بلکہ جس طرح عالم کی ہر شے کا ایک آغاز ہے اور ایک انجام، اسی طرح خود اس پورے عالم کا بھی ایک آغاز اور انجام از بس ضروری ہے۔

پس مومن اور مسلم وہی ہے جو توحید خالص، رسالت کے صحیح تصور اور یوم آخرت پر یقین کامل، کے سر رشتہ کے ساتھ پیوستہ

Marfat.com

ہو اور یہی وہ تین بنیادی عقائد ہیں جو دین کے حقیقی تصور یعنی ایمان باللہ، ایمان بالرسل، ایمان بالکتب، ایمان بالملائکہ، ایمان بالقدر اور ایمان بالآخرہ سب ہی پر حاوی ہیں اور یہی وہ دین کامل ہے جس کی تشریح قرآن عزیز نے سورۂ بقرہ کے آخری رکوع میں اس طرح کی ہے:

﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ ۫ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۫ وَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ٭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ ﴾ (البقرہ: ۲۸۵)

”رسول محمد (ﷺ) ایمان رکھتے ہیں اس شے پر جو اس پر ان کے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے (یعنی قرآن) اور ہر ایک (ایماندار) ایمان رکھتا ہے خدا پر، فرشتوں پر، سماوی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر، (وہ کہتے ہیں خدایا) ہم تیرے پیغمبروں کے درمیان کسی ایک کو بھی پیغمبر تسلیم کرنے کے سلسلہ میں فرق نہیں کرتے اور کہتے ہیں ہم نے تیرا حکم سنا اور اس کی پیروی کی، اے پروردگار ہم تجھ سے مغفرت کے خواہاں ہیں اور ہم کو آخر کار تیری ہی جانب لوٹنا ہے۔“

مابعد الطبیعاتی عقائد و افکار سے متعلق قرآن حکیم کی یہی وہ اصلاحی اور انقلابی تعلیمات تھیں جن کو نبی اکرم ﷺ نے اول عرب کے سامنے روشناس کیا اور پھر تمام کائنات انسانی تک پہنچا کر مذاہب کی دنیا ہی بدل ڈالی اور اسلام کی اس دعوت توحید نے مذاہب عالم میں ہلچل پیدا کر دی اور کسی نہ کسی رنگ میں ان کو توحید حقیقی کے اس ارتقائی نقطہ کی جانب جھکنا پڑا اور اس نے صرف یہی نہیں کیا کہ خدا اور اس کے بندوں کے درمیان رشتہ معبودیت و عبودیت ہی کو صحیح نقطۂ نظر پر استوار اور عقائد اور مابعد الطبیعاتی افکار کے رخ روشن کو آشکارا کر دیا، بلکہ اس نے ”ایمان اور عمل صالح“ کو دین کی بنیاد بنا کر اخلاق، معاشرت، معاش، غرض مذہب اور اجتماعی سیاست سب ہی کو اصلاح و انقلاب کے سانچے میں ڈھال کر دنیا کی صحیح راہنمائی کا حق ادا کر دیا۔

یہ بحث چونکہ طویل الذیل ہے اور آیت ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ کی تفسیر کے ضمن میں شرح و بسط کی محتاج، اس لیے یہ مقام اس کی وسعت کو برداشت نہیں کر سکتا۔